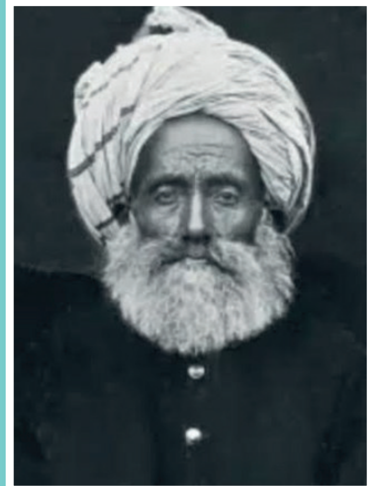
انمول یادیں

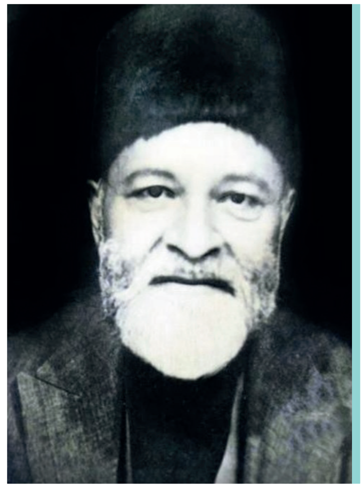


میاں عبدالسمیع نون

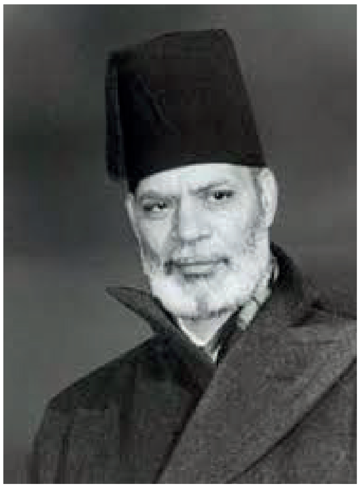
ایڈووکیٹ سرگودھا



حضرت صاحبزادہ عبداللطیف صاحب شہیدؓ



حضرت میر محمد اسماعیل صاحبؓ



حضرت چوہدری سر محمد ظفراللہ خان صاحبؓ



حضرت صاحبزادہ مرزا مظفر احمد صاحب



حضرت صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب



حضرت مرزا عبدالحق صاحب



ثاقب زیروی صاحب



لیفٹننٹ جنرل عبدالعلی صاحب



ملک فیروز خان نون صاحب

انمول یادیں

مؤلفہ
میاں عبدالسمیع نون، ایڈوکیٹ سرگودھا

نام کتاب	انمول یادیں
مرتبہ	میاں عبدالسمیع نون،ایڈوکیٹ سرگودھا
ناشر	قندیل پبلیشر ،لندن
تعداد	300
مقام اشاعت	لندن
سال اشاعت اوّل	جولائی 2023ء

ملنے کا پتہ:

بشارت احمد چدھڑ

فون:00447944075667

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَحۡمَدَ الۡمَوۡعُوۡدِ

فہرست مضامین



تعارف

از حافظ مظفر احمد

مکرم عبد السمیع نون صاحب ایڈووکیٹ سرگودھا کے روزنامہ الفضل میں شائع شدہ علمی وادبی، دینی وتاریخی اور سیرت نگاری پر مشتمل مضامین اور تقاریر کا عمدہ مجموعہ قارئین کے سامنے ہے۔ جو اپنی عمدگیٔ مضمون، زبان کی شستگی، تحریر کی سلاست اور روانیٔ جذبات کے اعتبار سے اپنا تعارف آپ ہیں۔ مگر موصوف سے تعلق اور ان کے صاحبزادے کے اصرار پر یہ تعارفی سطور تحریر کر رہا ہوں۔

مرحوم کا پیشہ زمینداری اور وکالت رہا، ذاتی شوق سیاحت تھا۔ مگر ان کی جولانیٔ قلم سے ان کا ذوق صحافت بھی خوب عیاں ہے کہ حضرت سلطان القلم کے باصلاحیت قلمکار تھے۔

ان کے زیر نظر مضامین کو ان کی زندگی کا بکھرا سا سفرنامہ یا حاصل مطالعہ سمجھ لیجئے یا پھر اسے ان کی غیر مرتب سی آپ بیتی کا نام دے دیجئے۔ یہ بہرحال ماننا پڑتا ہے کہ باوجود اپنے اندر موجود تکرار کے یہ مضامین نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ داستان گوئی کی سی دلکشی رکھتے ہیں کہ پڑھنے والا بار بار کہہ اٹھتا ہے:

؎ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

ضلع سرگودھا کے ایک غیر معروف سے دیہات حلال پور نوناں کے اس باسی کی صلاحیتوں کا یہ نکھار جہاں خلافت احمدیہ کی برکات کا مرہون منت ہے وہاں زمانۂ طالبعلمی میں قادیان دارالامان کے پاکیزہ ماحول کی تاثیر بھی اس میں شامل تھی جس کے نتیجہ میں موصوف اپنی اس قلمکاری کے ذریعہ عالم احمدیت میں شہرہ آفاق ہو کر زندہ جاوید ہو گئے۔

موصوف اپنے علاقہ کے ایک دینی زمیندار ''نون'' گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے دادا گاؤں کے نمبردار اور مذہبی رجحان رکھتے تھے۔ ان سے آپ کے والد میاں عبدالعزیز نون صاحب نے مسیح ومہدیؑ کے زمانہ کے نشانوں میں رمضان میں چاند سورج گرہن کے ظہور کا حوالۂ حدیث سنا ہوا تھا جو 1894ء میں پورا ہوا۔ میاں صاحب موصوف نے 1903ء میں اپنی نوعمری کے زمانہ میں ہی اسی نشان سے متاثر ہو کر قادیان کا سفر کیا اور خاندانی مخالفت کے باوجود قبول احمدیت کا جرأت مندانہ فیصلہ کر کے استقامت کے ساتھ اس پر ڈٹ گئے۔ جس کی دائمی برکات خود انہیں اور پھر ان کی اولاد کو بھی نصیب ہوئیں۔

مکرم عبدالسمیع نون صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد بزرگوار میاں عبدالعزیز نون صاحب نمبردار مخلص رفیق حضرت بانیٔ جماعت احمدیہ کے آغوش میں ہوئی، دوسرے بزرگ جن سے آپ نے فیض صحبت پایا وہ آپ ہی کے گاؤں کے معروف عالم مولانا محمد اسماعیل صاحب ہلالپوری تھے جن کا ایمان افروز ذکر خیر موصوف نے کیا ہے۔

پھر آپ کی خوش قسمتی کہ میٹرک کے بعد قادیان میں قائم ہونیوالے تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ کی سعادت پائی۔ جہاں کالج کے پرنسپل حضرت مرزا ناصر احمد صاحب کی شفقتوں اور دیگر جلیل القدر اساتذہ کی صحبت اور رہنمائی سے فیض پایا۔ قادیان میں آپ کے سرپرست اپنے نواحی گاؤں ادرحمہ کے حضرت مولانا شیر علی صاحب آپ کے لیے فرشتۂ رحمت بنے رہے جن کی تحریک پر ہی آپ نے ایف اے کے بعد کالج چھوڑنے کی بجائے گریجوایشن مکمل کی تھی۔ اس فرشتہ سیرت بزرگ کا بھی خوبصورت ذکر ان مضامین میں ہے۔

1944ء سے 1947ء تک خلافت ثانیہ کے بابرکت دور میں قادیان دارالامان کی مقدس بستی کے پاکیزہ ماحول میں گزارے ہوئے چند سال میاں عبدالسمیع نون صاحب کو کندن بنا گئے۔

وہی زمانہ طالبعلمی جس میں ایک دفعہ آپ کو بیت المبارک میں اپنے پیارے آقا حضرت مصلح موعودؓ کے پاؤں دبانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ آپ اس دور کی ایمان افروز مجالس عرفان کا کیا خوب نقشہ کھینچتے ہیں کہ ان مجالس میں کبھی حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی دائیں جانب شہ نشین پر حضرت چوہدری سر محمد ظفراللہ خان صاحب عقیدت و نیازمندی سے ہمہ تن گوش ہوتے، تو کہیں قدموں میں فرشتہ سیرت مولانا شیر علی صاحب ایک مجسمہ انکسار بن کر حاضر ہوتے تو کہیں دیگر بزرگان سلسلہ جلو میں موجود ہوتے اور حضور کی زبان فیض رحمان سے علم و معرفت کے لعل و گہر پا کر اپنی قسمت پر نازاں ہوتے۔ اس موقع پر نون صاحب کا یہ شعر بھی بڑا برمحل ہے:

کیسی کیسی محفلیں تھیں کیسے کیسے لوگ تھے
وہ سنہرا دور ماضی اب پلٹ سکتا نہیں

اس بابرکت دور کی خوبصورت یادیں بھی ان مضامین کا حصہ ہیں۔ 1952ء میں اپنے شفیق استاد حضرت مرزا ناصر احمد صاحب کی تحریک پر نون صاحب نے لاہور قیام کیا اور اسی دوران لاء کالج سے ایل ایل بی کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کر لیا۔ پھر حضور کی نوازشات خلافت سے پہلے اور بعد میں جو انہیں نصیب ہوئیں، ان کا خوشگوار ذکر بھی لائق مطالعہ ہے۔

دراصل تعلیم الاسلام کالج کے زمانۂ طالبعلمی سے ہی قادیان میں قائم ہونے والے ربط و پیہم کے نتیجہ میں نون صاحب کو خلافت احمدیہ اور خاندان حضرت مسیح موعودؑ کے ساتھ والہانہ عقیدت و عشق تھا۔ محبت کے اس سفر کا حال رقم کرتے ہوئے انہوں نے خاندان حضرت مسیح موعودؑ کے افراد کے علاوہ اس دور کے بزرگان سلسلہ کے بھی احوال اپنے خاص اسلوب تحریر میں بیان کیے ہیں۔ یہ انداز حضرت مرزا

طاہر احمد صاحب کو بھی بہت پسند آیا۔

چنانچہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے مکرم نون صاحب کے نام اپنے ایک مکتوب گرامی میں ان کے علمی وادبی ذوق اور شعری صلاحیتوں کا کیا خوب ذکر فرمایا:

''آپ کا خط ملا۔آپ کو جانتا تو بہت دیر سے ہوں اور جتنی دیر سے جانتا ہوں ہمیشہ آپ کو اچھا پایا اور آپ سے ملنے میں ہمیشہ طبعی خوشی محسوس کی لیکن جن دنوں میں ملا کرتا تھا ان دنوں میں اتنا نہیں جان سکا جتنا نہ ملنے کے دنوں میں آپ سے تعارف ہوا ہے۔طبعاً آپ اپنی اندرونی شخصیت کو پردے میں رکھتے ہیں اور مجالس میں اپنی علمی اور زوقی اور روحانی صلاحیتوں کو اچھالتے نہیں ہیں۔اس لیے سوائے اس کے کہ کسی کے ساتھ بہت گھل مل کر اٹھنا بیٹھنا ہو کم ہی لوگ جو آپ کو جانتے ہیں آپ کو پہچانتے ہوں گے۔میں تو اتنا نہیں پہچان سکا جتنا آپ کے خطوں کے آئینے میں آپ کو دیکھ کر اور آپ کے ایک مضمون کو پڑھ کر جو آپ نے چوہدری عزیز احمد صاحب باجوہ مرحوم کی یاد میں آپ نے لکھا تھا، گہرا احساسِ شناسائی پیدا ہوا ہے۔افسوس ہے کہ اتنے سال ضائع ہو گئے ورنہ پتہ ہوتا کہ آپ کا علمی ادبی ذوق اتنے اعلیٰ پائے کا ہے تو آپ کے ساتھ اتنی پُرلطف مجالس لگ سکتی تھیں جو نہ لگ سکیں۔اس ایک خط میں ہی جو اس وقت میرے پیش نظر ہے آپ کی تحریر کی سلاست اور دلکشی اور جاذبیت اور بہت گہرا اثر رکھنے والا سمویا ہوا غم کسی اعلیٰ درجہ کے شعری کلام سے کم نہیں لیکن اس پر مستزاد یہ کہ آپ نے بہت ہی لطیف اور اعلیٰ پائے کے شعری انتخاب سے اس خط کو مزین کر کے اسے مزید نور بخشا ہے۔اقبال عظیم کے شعر سے تو مجھ پر وجد طاری ہو گیا۔یہ شعر تو یوں لگتا ہے جیسے اس کی زندگی کا ماحصل ہوا اور وہ ایک طویل سال جس کا اس نے مرثیہ کہا ہے وہی ایک طویل سال اس کی زندگی کا سب سے زیادہ باثمر سال ثابت ہوا ہو۔

اسی طرح آپ کا پنجابی شعروں کا انتخاب بہت گہرا گداز رکھتا ہے اور اس کا یہ شعر

عمر مری تو لمے دسدے
وعدے تیرے پل دو پل دے

تو اسی مزاج کا شعر ہے جس مزاج نے اقبال عظیم کے شعر کو عظمت بخشی ہے۔

(مکتوب حضور انور مورخہ 24 جنوری 1994)

اور اقبال عظیم کا وہ شعر ہے:

پچھلا برس عظیم بہت ہی طویل تھا
میں بوڑھا ہو گیا ہوں اسی ایک سال میں

بہرحال اس عاجز کونون صاحب سے یہ تعارف تو تھا کہ وہ بڑے سخن شناس اور نکتہ رس ہیں۔ان کی وسیع المشربی،مہمان نوازی اور دلنوازی کا بھی اعتراف تھا۔حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کے ایک دوسرے خط سے یہ راز بھی کھلا کہ نون قبیلہ کے اس نفیس اور باذوق جاٹ کوسخن شناسی کے ساتھ شعری شغف بھی تھا،حضور نے موصوف کی صاحبزادی کی شادی پر کہا ایک شعر سراہتے ہوئے فرمایا:

آپ نے عزیزہ امۃ الحفیظ کی شادی پر جو شعر کہا وہ تو ماشاءاللہ بڑا اچھا شعر ہے اور مجھے بہت پسند آیا ہے۔بے ساختہ بے تکلف لیکن بڑا ہی پُراثر۔'' (مکتوب حضور انور 6اپریل 1993ء)

زیرِنظر متنوع موضوعات پر موصوف کی تحریری کاوش ادب وصحافت کی عمدہ شاہکار ہی نہیں،ان کے شعری ذوق کا بھی خوبصورت نمونہ ہیں جس میں آپ نے جگہ جگہ برمحل اور برجستہ اشعار کے استشہاد سے اپنی تحریر کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ہر چند کہ ان متفرق مضامین میں بعض جگہ واقعات کا تکرار ہے مگر قندِ مکرر کی طرح کہ ہر دوسری جگہ بیان کردہ واقعہ میں کچھ نہ کچھ تفصیل مزید بھی بیان ہوگئی ہے۔اللہ تعالیٰ موصوف کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ان کی اولاد کو بھی ان کی اعلیٰ اخلاقی اقدار نصیب ہوں اور وہ خلافت احمدیہ سے وابستہ رہ کر نسلاً بعد نسل اس کی برکات سے حصہ پانے والی ہو۔اللہ تعالیٰ موصوف کا یہ مجموعۂ مضامین بھی نافع الناس اور ان کے لیے صدقہ جاریہ اور دعاؤں کا ذریعہ بنادے۔آمین

والسلام

خاکسار

حافظ مظفر احمد

ایڈیشنل نظارت اصلاح وارشاد مقامی ربوہ



پیش لفظ

طاہر مہدی امتیاز احمد وڑائچ

مجھے مکرم ومحترم چچا میاں عبدالسمیع نون صاحب کے متعلق اپنے خیالات کو تحریر کرنے کی جسارت کو کہا گیا ہے۔مکرم میاں صاحب کی متعلق ان کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ بھی زیر قلم کرنا یا بیان کرنا بہت نازک کام ہے۔میں کہاں اور میری قابلیت کہاں۔بہرحال کوشش کرتا ہوں۔

مجھے پہلی دفعہ آپ کے گھر جانا یاد ہے۔1965 یا1966 کی بات ہے میں ابھی پرائمری میں تھا ایک دفعہ مکرم والد صاحب مکرم چوہدری ظفر اللہ خاں صاحب وڑائچ کے ساتھ یاد ہے۔میں اس وقت پانچویں جماعت میں تھا۔میں والد صاحب کے ساتھ منت سماجت کر کے ان کے ساتھ سرگودھا گیا۔انہوں نے اپنے کام کئے۔کچہری گئے مکرم ومحترم میاں صاحب سے بھی ملے۔اس زمانہ میں سفر عموماً بذریعہ ٹرین سے ہوا کرتے تھے۔مکرم والد صاحب مجھے ساتھ لے کر سیٹیلائٹ ٹاؤن ان کے گھر گئے۔اس زمانہ میں آپ کی کوٹھی بڑی وسیع وعریض تھی۔مجھے یاد ہے میں نے وہاں کھانا بھی کھایا تھا۔

زمیندارہ ماحول ہونے کی وجہ سے جو بھی کچہری کا کام ہوتا بحیثیت احمدی وکیل ہونے کے ہمارے خاندان کا،ان کے ذمہ ہوتا۔مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں اپنے چچا مکرم چوہدری نصراللہ خاں صاحب کے ساتھ کچہری گیا۔انہوں نے بات کی،اپنے تہہ بند کے کونے سے بندھی گھتلی سے کچھ نکالا اور ان کے سپرد کر دیا۔جو انہوں نے دیا آپ نے رکھ لیا۔

ہمارے گھر میں اکثر مکرم میاں صاحب کا ذکر چلتا۔مکرم چچا جان اور والد صاحب ایک دوسرے کو بھائی کہتے۔میری والدہ بھی ان کو بھائی ہی کہہ کر سلام کرتیں۔ایک دفعہ ہم آپ سے بڑی اعلیٰ نسل کی گائے مع بچھڑی مکرم میاں عبدالسمیع نون صاحب سے خریدی جو بہت مہنگی تھی،آپ نے مروت پر صرف چند سو روپے لئے۔بہت اعلیٰ نسل کی اور بابرکت گائے تھی۔وہ گائے ہمارے پاس کئی سال رہی۔

جلسہ سالانہ اور کئی دوسرے مواقع پر ربوہ مکرم والد صاحب کے ساتھ گھر تشریف لاتے۔ہم آپ کی مجلس سے خوب لطف اٹھاتے۔آپ کی گفتگو میں خاندان حضرت مسیح موعود علیہ السلام ساتھ محبت وعشق پر مبنی واقعات سنتے۔والد صاحب کو کہا کرتے کہ تم مجھ سے بازی لے گئے ہو۔ایک بیٹا (خاکسار) مربی سلسلہ بنا۔دوسرا (مکرم محمد اقبال احمد صاحب) حافظ قرآن اور مربی سلسلہ۔خاندان حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے تما افراد سے عشق کی حد تک محبت تھی۔حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ؒ کی لندن ہجرت کے بعد آپ اکثر حاضر ہوتے۔

بڑے خوش اور ہشاش بشاش ہوتے۔

میں 2006 کے بعد کئی بار قادیان جلسہ پر گیا۔ مہدی کی بستی میں آپ جس خلوص اور جذبہ سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے، سامعین عش عش کرتے۔ وہ آپ ہی کا خاصہ تھا۔ اللہ ان کی ترجمانی قبول فرمائے اور اس کا اجر آپ کو اور آپ کی اولاد کو دے۔ آمین

بھلوال ہائی سکول کے قریب ہونے کی وجہ سے یاد ہے کہ قریبی رشتہ داروں اور دوستوں کے بچے یہاں رہ کر ہی پڑھتے۔ چک 2 کے لالہ جہاناں، برادرم سردار خاں ساہی (والد صاحب کے ماموں زاد بھائی)، ماموں زاد بشیر احمد، اقبال صاحب، خالہ زاد، محمد اعظم ولد سردار جمبولیا حال چک ۱۵ جنوبی، دوست محمد شیخ ادرحماں، میاں عبدالسمیع نون، نذر محمد ولد عبداللہ نمبردار ودھرا چک نمبر ۹ میں رہ کر پڑھے۔ یہ بچپن بھی مجھے یاد ہے۔

والد صاحب اور مکرم چچا عبدالسمیع صاحب ہائی سکول میں ہم جماعت تھے۔ 1942 میں انہوں نے میٹرک پاس کیا۔

نومبر 2007 میں مکرم والد صاحب دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے اچانک اللہ کے حضور حاضر ہو گئے۔ میں آپ کو اطلاع نہ کر سکا۔ اگلے دن مجھے فون آیا۔ ہچکی بندھی ہوئے تھی۔ سخت ملال میں تھے۔ کہنے لگے:

''ظالمہ مینوں نہیں یودسیا۔ مینوں دسیں ہا۔ میں آوونداآپنے بھرانوں لحد وچ رکھیداں ویکھدا۔ دو چُلو مٹی قبر تے پاوندا۔ اوہدی قبر تے دعا کردا، تے مینوں ڈنڈھ پووندی۔ میں اگلے جہاں اُس نوں کی آکھساں جے میں تینوں لحد وچ بھی نہ رکھیا تے نہ دو مٹھاں مٹی سَٹی۔ مٹی وچ وی نہ رکھیا تے ناں تیری قبر تے ہتھ چُکیا۔''

میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ میرے پاس معذرت کے الفاظ نہ تھے۔

اگلے دن تشریف لائے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ میں نے بھی ارادہ کر لیا میں آپ سے مسلسل رابطہ رکھنے کی کوشش کروں گا۔ کبھی کبھار سرگودھا جاتا تو حاضر ہوتا۔ مکرم چچا جی جب بھی ربوہ تشریف لاتے تو میں حاضر ہو جاتا۔

مجھے مکرم و محترم محمد خاں صاحب جو آپ کے جونیئر تھے ربوہ تشریف لائے، ایک لفافہ دیا کہ اس میں مکرم میاں صاحب کے مضامین ہیں ان کو ٹائپ کرانا ہے۔ میں نے حامی بھر لی۔ جب کام شروع کیا اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کی ٹائپ سیٹنگ کرائی۔ مسودہ ایک ہزار صفحات سے بڑھ گیا۔ کتاب تکمیل کے آخری مراحل میں تھی۔ مکرم و محترم میاں بصیر صاحب کے حوالہ کی۔ انہوں نے واپس تھما دی اور کہا کہ طباعت کا بندوبست کراؤ۔ انہی ایام میں میری گرفتاری ہو گئی اور میں تین سال ناکردہ الزام کے تحت اسیر رہا۔ حضور انور ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کے ارشاد پر ملک چھوڑا۔ 2019 میں مکرم برادرم میاں بصیر نون صاحب کا لندن میں بلاوا ملا کہ مسودہ کہاں ہے! مسودہ میرے وہم و خیال میں بھی نہ تھا۔ اللہ بھلا کرے میرے ساتھیوں کا، انہوں نے کسی گہرائی سے نکال لیا جو میں نے مکرم برادرم

بشارت احمد صاحب کے حوالے کر دیا۔

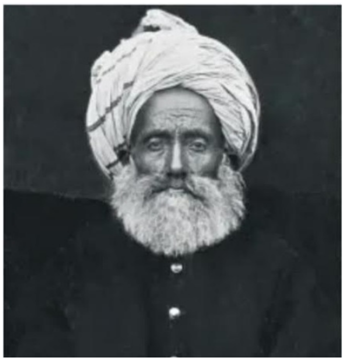
اسی عرصہ میں مکرم برادرم محمد حیدر صاحب نے مجھے ایک بنڈل پاکستان سے بھجوایا اس کو کھنگالا تو وہ مضمون وار مضامین تھے جو مکرم و محترم چچا جان کے تھے۔ میرے پاس اثاثہ ہیں۔ میں اکثر ان میں سے مضامین کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ ان کی بھنک جامعہ احمدیہ کے ایک استاد کو مل گئی ہے وہ بھی اس کا مطالعہ کرر ہے ہیں۔ ان کی بھنک مکرم برادرم اشفاق احمد صاحب آف نواب شاہ کو بھی مل چکی ہے۔ میرا ان سے وعدہ ہے کہ آپ کی امانت ہے بھجوا دوں گا۔ مگر میرے ملک کے حالات اس کے متحمل نہیں ہو سکتے اور خطرہ ہے کہ امانت لے جانا والا مطار پر ہی نہ دھر لیا جائے۔

مکرم چچا جان کے پروئے ہوئے موتیوں کے سامنے میرے ان ٹوٹے ہوئے الفاظ کی کیا حیثیت ہے۔ مکرم برادم بشارت احمد صاحب کے احترام میں چند سطور پیش ہیں۔

خاکسار

طاہر مہدی امتیاز احمد وڑائچ

مینیجر الفضل انٹرنیشنل لندن



شہید کابل

گریباں چاک دامن تار تار اور طوق گردن میں
سوئے مقتل ترا کس شان سے دیوانہ جاتا ہے

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ! مدیر محترم! ہفت روزہ ''لاہور'' کی 22راگست 1987ء کی اشاعت میں مخدوم ومحترم چودھری عزیز احمد صاحب باجوہ سینئر ایڈووکیٹ سپریم کورٹ کا ایک مضمون ''انسانیت کے خلاف جُرم'' شائع ہوا۔ یہ مضمون بصیرت افروز اور عبرت انگیز واقعات پر مشتمل ہے۔ سُقراط، ابوالمغیث بن منصور اور محمد سعید سرمد کے روحانی مقامات عالیہ اور مقامِ جذب کا عرفان نہ رکھنے والوں نے اُن کے ساتھ سفا کانہ سلوک کیا۔ آخری دو بزرگوں کے ساتھ بہیمانہ برتاؤ تو اسلام کے نام پر خود اسلام کے نام لیواؤں نے کیا اور اُن کے سر قلم کر دیئے گئے۔ ؎

بنا کر دند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن!
خُدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

آخر میں فاضل مضمون نگار نے مختصراً حضرت سیّد عبداللطیف صاحب شہید کا تذکرہ کیا ہے مگر یقین مانئے اس غیر معمولی اختصار نے میری مطالعاتی تشنگی کو دوچند کر دیا۔ نہ جانے یہی کیفیت چودھری صاحب محترم کے اور کتنے قارئین کی ہوگی۔ اس لئے چند سطور چودھری صاحب موصوف کے مضمون کے تسلسل ہی میں پیش خدمت ہیں۔ شاید اُس بزرگ و پاک باز شخص کے ذکر خیر سے میری تر دامنی کا بھی کسی قدر مداوا ہو جائے۔

حضرت شہید کابل کے ایک صاحبزادے حضرت سیّد محمد طیب صاحب لطیف سے مجھے 30 سال قبل تعارف نصیب ہوا جو بعد ازاں موصوف کی شفقت و مروت کے باعث گہرے روابط میں ڈھل گیا۔ حضرت صاحبزادہ صاحب اکثر میرے یہاں تشریف لاتے اور مجھے اُن کی زبان سے کئی مرتبہ ''متذکرہ شہادت'' کی تفاصیل سُننے کا موقع ملا۔

1903ء میں جب اُن کے والد بزرگوار (حضرت صاحبزادہ عبداللطیف) شہید کئے گئے۔ صاحبزادہ محمد طیب صاحب کی عمر 8، 9 سال تھی اور اُنہیں تفاصیل شہادت خوب یاد تھیں۔ پھر جب اس مبارک ومظلوم خاندان کو جلاوطن کر کے ترکستان بھیج دیا گیا تو اس وقت بھی صاحبزادہ محمد طیب ہمراہ تھے۔ واپسی پر اُنہیں بھی زنداں میں ڈال دیا گیا تھا۔ حضرت صاحبزادہ عبداللطیف کی شہادت کے بعد اُن کے پسماندگان کو ایک لمبے عرصہ تک ''ضبطی جائیداد'' جلاوطنی اور قید و بند کے مصائب جھیلنا پڑے جو تکالیف اور جس قدر تکالیف اُنہیں

برداشت کرنا پڑیں اُن کی رُو سے تو وہ گویا ''زندہ درگور'' ہی تھے۔ اپنے اسی تاثر کے تحت میں صاحبزادہ محمد طیب صاحب کو ''زندہ شہید'' کہا کرتا تھا۔

افسوس کہ خواہش اور کوشش کے باوجود ہر دفعہ یہ معاملہ کسی نہ کسی وجہ سے مؤخر ہوتا رہا اور وہ مجھے تمام واقعات شہادت اِملا نہ کرا سکے۔

خاندانی کوائف

حضرت صاحبزادہ عبداللطیف کے والد گرامی کا نام سیّد محمد شریف تھا۔ صاحبزادہ صاحب 1840ء میں افغانستان کے صوبہ خوست کے ایک گاؤں ''سیّدگاہ'' میں پیدا ہوئے۔ ''سادات'' کی جائے رہائش ہونے ہی کی وجہ سے اس کا نام ''سیّدگاہ'' تھا۔ جو دریائے شمل کے کنارے واقع ہے۔

آپ بہت بڑے زمیندار اور رئیس تھے۔ آپ کی اراضی 6، 7 ہزار کنال کے لگ بھگ تھیں۔ افغانستان کے علاوہ موضع ''سرائے نورنگ''، ضلع بنوں میں بھی آپ زرعی زمین کے مالک تھے۔ حضرت شہید موصوف ایک جیّد عالم باعمل، متقی، پرہیزگار اور قرآن کریم کے عاشق تھے۔ ہزارہا احادیث نبویؐ آپ کو زبانی یاد تھیں۔

آپ حضرت سیّد علی ہجویریؒ المعروف بہ داتا گنج بخشؒ کی نسل میں سے تھے جن کا شجرہ آگے حضرت علی المرتضیٰؓ سے جا ملتا ہے۔ از حد دریا دِل اور سخی تھے۔ مہمان نواز ایسے کہ اکثر و بیشتر 50، 60 مہمان فروکش رہتے جن کے خورد و نوش کا شایانِ شان اہتمام ہوتا۔ امیر حبیب اللہ والئی افغانستان جب 1901ء میں تخت نشین ہوا تو اُس تاریخی شاہانہ تقریب میں بادشاہ کی دستار بندی حضرت شہید کابل ہی سے کرائی گئی تھی۔ دربار میں بادشاہ کے تخت پر دائیں جانب نشست آپ کے لئے مخصوص ہوتی تھی۔ امیر عبدالرحمان کے دَورِ حکمرانی میں بھی حضرت شہید مرحوم کو یہی اوّلین بلند مقام و مرتبہ اور اعزاز حاصل تھا۔ 1894ء میں ہندوستان اور افغانستان میں حد فاصل کے تعین کے لئے جو اعلیٰ سطح کا وفد افغانستان کی جانب سے بھیجا گیا تھا اس میں گورنر شریں دل کے ہمراہ حضرت موصوف بھی تھے۔ اسی کارروائی کے دوران میں ہندوستانی وفد کے ساتھ آئے ہوئے ایک کلرک ''سیّد چن بادشاہ'' نے آپ کے ارشاد کی تعمیل میں ''آئینہ کمالاتِ اسلام'' نامی تصنیف آپ کی خدمت میں پیش کی جس کے مطالعہ سے آپ مصنف کے تمام دعاوی کی صداقت کے قائل ہو گئے۔ اکتوبر 1902ء میں آپ پنجاب میں وارد ہوئے اور تین، چار ماہ اپنے مُرشد و مقتدا کی صحبت میں اکتساب فیض کے بعد واپس وطن روانہ ہو گئے۔ علمائے ظاہر نے بادشاہ وقت امیر حبیب اللہ خاں اور نائب السلطنت نصر اللہ خاں کو بہت اُکسایا، بھڑکایا اور ورغلایا۔ آپ کے روحانی مرتبے سے آگہی کے باعث بادشاہ ذاتی طور پر آپ کے خلاف کسی قسم کی معاندانہ کارروائی کے حق میں نہیں تھا لیکن اس دَور میں مُلّا افغانستان پر چھایا ہوا تھا۔ بالآخر بادشاہ مُلاؤں کے سامنے بے بس ہو گیا۔ جب علماء نے ''صاحبزادہ ملامت

باشد'' کا فتویٰ داغا اُس وقت بھی بادشاہ نے آپ سے ''رجوع کرنے'' کے لئے اصرار کیا مگر وہ استقامت کا کوہِ گراں، عالی مقام وقوی الایمان بزرگ جس کی رگوں میں حضرت امام حسینؓ اور حضرت شیرِ خُدا علی المرتضٰیؓ کا پاک اور غیرت مند خون دوڑ رہا تھا۔ اُس نے اپنے آباؤ اجداد کی سنت پر عمل کرتے ہوئے ''ہر چہ بادا باد'' کہہ کر بادشاہ کی جان بخشی کی اس آخری پیش کش کو بھی ٹھکرا دیا۔

قیدِ تنہائی کے بعد

چنانچہ آپ کو چار ماہ تک ایک غلیظ قید خانے میں قیدِ تنہائی میں رکھا گیا اس حالت میں کہ ہمہ وقت پاؤں میں وزنی بیڑیاں ہوتیں اور ڈیڑھ من سے زائد وزنی زنجیر میں جسم گردن سے کمر تک جکڑا ہوا رہتا۔ یہ ساری عقوبتیں اس معصوم اور ناز و نعم میں پلے ہوئے مظلوم کے لئے صرف اس لئے تھیں کہ وہ کسی طور جادۂ حق سے روگرداں ہو جائے لیکن دنیا پرستوں کی کوئی چال بھی تو کامیاب نہ ہوئی۔

حضرت سیّد ہجویر (داتا گنج بخشؒ) نے کسی ساعتِ خاص میں اپنے خالق و مالک کے عشق میں سرشار ہو کر یہ شعر کہا تھا ؎

جاں بخواھم داد اندر کوئے تُو
گر مرا آزار آید یا بلاہا

اللہ اللہ حضرت کی خواہش حضرت صاحبزادہ سیّد عبداللطیف کے ذریعہ کس شان سے پوری ہوئی۔ منہم من قضیٰ نحبہ و منہم من ینتظر۔ محبوب سُبحانی حضرت نظام الدین اولیاء نے شہدائے راہِ حق کا نقشہ یوں کھینچا ہے ؎

بانگِ منصور از کُجا و دارِ منصور از کُجا
خود زدی بانگِ ''انا الحق'' خود سردار آمدی

سوئے مقتل روانگی

شہر کابل کے شیر دروازہ کے باہر جانب جنوب ایک قبرستان ہے اس میں حضرت شہید مرحوم کو سنگسار کرنے کے لئے ایک گڑھا کھودا گیا۔ پھر اس عاشق قرآن اور عالم ربانی کی ناک چھید کر اس میں رسی ڈال کر کھینچتے ہوئے پا بجولاں اس قبرستان میں لایا گیا جہاں ہزاروں لوگوں کا اجتماع تھا۔ اس گڑھے میں آپ کو کمر تک گاڑ دیا گیا جس کے بعد قاضی شہر کے تتبع میں آپ پر پتھروں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ روایت ہے کہ جب پہلا پتھر پیشانئ مبارک پر لگنے سے خون کا فوارہ چھوٹا تو آپ نے بآواز بلند کلمۂ شہادت کے بعد سورہ یوسفؑ کی یہ آیت تلاوت فرمائی:۔

''انت ولی فی الدنیا و الاخرۃ توفنی مسلما و الحقنی بالصالحین''

اور پھر چند ہی ثانیوں میں وہ نورانی چہرہ پتھروں کے تودے میں اوجھل ہو گیا۔ یہ 17 / ربیع الثانی 1321ھ بمطابق 14 / جولائی

1903ء کا دن تھا۔ وجدان وایمان کی رُو سے اُس دن کو منحوس ترین بھی کہا جا سکتا ہے مبارک ترین بھی۔ منحوس اس لحاظ سے کہ ایک معصوم اور پاکباز انسان کو نہایت درندگی اور سفا کی سے شہید کر دیا گیا اور مبارک اس اعتبار سے کہ خدا کا ایک اور برگزیدہ بندہ اُس روز جاں گسل ابتلاء میں سے کامیاب و کامران نکلا اور کمال صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جان راہِ حق میں جان آفریں کے سُپرد کر دی۔

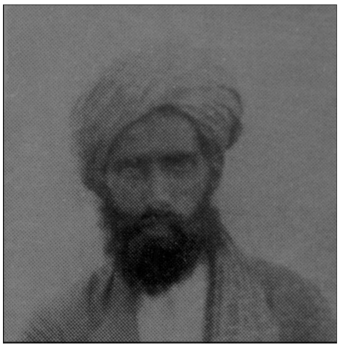
سیّد موصوف کی شہادت کے بعد شاہ کابل امیر حبیب اللہ خاں اُس کے بھائی سردار نصراللہ خان اور فتویٰ فروش علماءسوء کے عبرتناک انجام کی تفاصیل ایک ضخیم کتاب کی متقاضی ہیں جنہیں مؤرخ کبھی نظرانداز نہیں کر پائے گا۔ کابل کے دامنِ حکمرانی پر خدا پرستوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دینے کے نہ جانے کتنے بدنما داغ ہیں۔ حضرت سیّد عبداللطیف شہید سے پہلے حضرت مولوی عبدالرحمن کو شہید کیا جا چکا تھا۔ آپ کے بعد حضرت نعمت اللہ خاں، مولوی عبدالحلیم اور قاری نورعلی صاحب کو بھی انتہائی بربریت سے شہید کر دیا گیا۔

اخبار ''نوائے وقت'' (میگزین سیکشن) میں اگلے دن ایک افغان مجاہد کا انٹرویو شائع ہوا تھا جس کے مطابق ساٹھ ہزار سے زائد افراد کابل کے پل چرخی قید خانہ میں مارے جا چکے ہیں اور تین سال کے عرصہ میں روسیوں کی بمباری اور لڑائی میں پانچ لاکھ سے زیادہ مرد و زن قتل کئے جا چکے ہیں۔ ممکن ہے اس اندازے میں کچھ مبالغہ آمیزی بھی ہو لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ افغانستان برباد ہو چکا ہے۔ اس پر ہر طرف سے آگ برس رہی ہے۔ جانے ابھی اُسے ان معصوموں کے خون ناحق کا اور کتنا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ اے کاش وہ اب بھی ایک فنافی الرسول کے اس ''انتباہ'' پر عمل کرنے کی توفیق پالے ؎

آنکھ کے پانی سے یارو کچھ کرو اس کا علاج
آسماں اے غافلو اب آگ برسانے کو ہے

(ہفت روزہ ''لاہور'' 12؍ستمبر 1987ء)

۞۞۞۞۞۞۞۞۞



حضرت مولوی محمد اسماعیل صاحب ہلال پوری

آج میں نے ارادہ کیا ہے کہ حضرت مولوی محمد اسماعیل صاحب ہنجرا ہلال پوری جو ''مولوی فاضل منشی فاضل'' مشہور تھے کے حالات پر مشتمل ایک مقالہ سپرد قلم کروں کسی بلند پایہ بزرگ کی نسبت اظہار کرتے وقت قدرتی طور پر ایک احساس کمتری پیدا ہوتا ہے کہ کہاں وہ روشنی کا مینار اور کہاں میں ایک دیہاتی ناتراشیدہ کندہ۔ بھلا میں کسی عالم ربانی کی توصیف کیا بیان کرسکوں گا اور پھر آجکل کے دور میں اظہار پر بھی ناروا پابندیاں عائد کی گئی ہیں میں صرف مشاہدات کی زبان سے ہی بات کروں گا لیکن اس میں بھی قدم قدم پر تعزیر کا خوف ہے۔

حضرت مولوی محمد اسماعیل صاحب کے والد بزرگوار کا نام مولوی محمد بخش صاحب تھا۔ ذات جٹ ہنجرا تھی ہلال پور نوناں تحصیل بھلوال میں پیدا ہوئے۔ حضرت موصوف کو بچپن ہی سے بلا کا حافظہ ذہن رسا اور ہر معاملے کی گہرائی تک پہنچنے والی بصیرت عطا ہوئی تھی آپ کے والد صاحب بلکہ سارا خاندان با اصول عالمانہ فضیلت، جاہ وجلال عزت ووقار کا حامل تھا گاؤں کے کسی گلی کوچے سے مولوی محمد بخش صاحب گزر رہے ہوں تو بڑے چھوٹے مرد وزن سبھی احتراماً صف آراء ہوجاتے تھے اور جب تک مولوی صاحب دور نہ نکل جاتے تھے سبھی لوگ عقیدت واحترام کی تصویر بنے کھڑے رہتے۔ حضرت مولوی محمد اسماعیل صاحب بڑے پختہ عالم تھے ابتداء میں احمدیت کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھتے تھے۔

موضع ہلال پور نوناں جو تخت ہزارہ کے نواح میں ضلع سرگودھا اور گجرات کی سرحد پر واقع ہے۔ ایک کوردیہہ تھا۔ نہ کوئی سڑک نہ راستہ نہ ریل کا اس طرف گزر۔ لوگ چوبیس، پچیس میل کا پیدل سفر کرکے بھلوال تک پہنچتے جہاں سے اوائل بیسویں صدی میں ایک ریلوے لائن گزری اور یہی واحد ذریعہ مواصلات تھا۔ اس موضع میں راقم الحروف کے پڑدادا حضرت حافظ غلام مصطفی صاحب جو قرآن و حدیث کے اچھے عالم تھے انہوں نے دارقطنی کی حدیث پڑھ کر سنائی ہوئی تھی جس میں ماہ رمضان میں سورج اور چاند کو گرہن لگنے کا ذکر ہے۔ حضرت حافظ صاحب خود تو وفات پاچکے لیکن میرے والد صاحب میاں عبدالعزیز صاحب نون نے جب وہ علامت ظاہر ہوئی خود قادیان جاکر حضرت بانی سلسلہ کی زیارت کی اور یہ زمانہ اوائل 1903ء کا تھا۔ چنانچہ میرے ابّا بتاتے تھے کہ نگہ جو پڑی تو اسیر دام ہوگئے فرماتے تھے کہ مجھے کسی دلیل کی حاجت نہ رہی اور صرف ایک ہی کسوٹی مجھے ملی تھی جس پر مَیں نے فوراً ہی فیصلہ کردیا اور وہ یہ تھی۔ ؎

عشقِ الٰہی وسّے منہ تے ولیاں ایہہ نشانی

حضرت مولوی محمد اسماعیل صاحب میرے ابّا جان کے ہم عمر اور یک رنگ دوست بھی تھے لیکن انہیں اس طرف بوجہ عالمانہ پس منظر کے فوری توجہ نہ ہوئی۔

ایک دن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ حضرت میاں حسن محمد صاحب بافندہ سکنہ ادرحمہ جو چھوٹے سے گدھے پر سوار ہو کر جو ان کے لئے ناقۃ اللہ کا کام دیتا تھا روزانہ دعوت الی اللہ کے سفر پر نکل جاتے تھے۔ ایک روز ظہر یا عصر کی نماز کے وقت ہمارے گاؤں ہلال پور کی مسجد میں نماز پڑھنے لگے غالباً آئینہ کمالاتِ اسلام ان کے پاس تھی نماز شروع کی تو وہ ساتھ ہی مصلے پر رکھ دی۔ حضرت مولوی محمد اسماعیل صاحب پہلے سے نماز پڑھ رہے تھے جب انہوں نے نماز ختم کی تو پاس پڑی کتاب پر نگہ پڑی اُٹھا کر ایک دو ثانیے میں کچھ حصہ پڑھا۔ زیادہ سے زیادہ ایک دو صفحات پڑھے ہوں گے کیونکہ روایت ہے کہ کوئی صفحہ الٹا نہیں تھا جہاں سے کتاب کھلی وہیں سے دیکھتے رہے اور پھر یہاں حسن محمد صاحب کے نماز ختم کرنے سے پہلے ہی اُسی جگہ کتاب رکھ دی وہ اپنے والد صاحب سے بے حد مرعوب تھے لیکن اس کتاب کے محض سرسری سے دیکھنے کی معجزانہ تاثیر نے یوں دل پلٹ دیا کہ اسی روز بیعت کا اعلان کر دیا پہلے بھی میرے والد صاحب کے ہمنشین تھے اب تو محفلیں جمنے لگیں لیکن حضرت بڑے مولوی صاحب کے ادب کے لحاظ سے چھپ چھپ کر بیٹھتے کہ بڑے مولوی صاحب کو ان دونوں کا باہم مل بیٹھنا گوارہ نہیں تھا بلکہ برملا کہتے تھے کہ ''عزیز و نے اسماعیلو نوں پٹ سُٹیا'' یعنی عبدالعزیز (میرے والد صاحب) نے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کو گمراہ کر دیا ہے۔ میرے ابّا نمبردار تھے۔ یوں بھی صاحب وجاہت اور کسی مخالفت سے خوف زدہ نہیں ہوتے تھے لیکن بڑے مولوی صاحب کے احترام کے پیش نظر خفیہ ملاقاتیں حضرت مولوی محمد اسماعیل صاحب سے کرتے تھے تا مولوی محمد بخش صاحب اپنے بیٹے پر زیادہ ناراض ہو کر گھر سے نکال دینے وغیرہ کا اقدام نہ کر بیٹھیں۔ اگرچہ حضرت مولوی صاحب نے ہر چہ بادا باد کہہ کر اس میدان میں قدم رکھا تھا اور انہیں عواقب سے کبھی پریشانی نہ ہوئی تھی لیکن حضرت مولوی محمد اسماعیل صاحب نے تو

''درکلامے تو چیزاست کہ دیگراں را دراں نیست''

کا نظارہ دیکھا ہوا تھا اور وہ ایک ہی نظر میں گھائل ہو چکے تھے۔ حضرت مولوی صاحب بہت تیز قدم تھے انہوں نے ایمان وایقان کی منازل نہایت سرعت کے ساتھ طے کیں لیکن ہلال پور اپنی تنگ دامنی اور کوتاہ فکری کے باعث حضرت موصوف کی جولانیوں کے لئے یکسر ناکافی تھا وہ تو ایک پہلوان از پہلوانانِ حضرت جلیل تھا اس کے لئے تو کھلا میدان مطلوب تھا ہلال پور میں تو حضرت باوا نانک کی سی حالت تھی کہ ؎

کوئی دن تو پردہ میں مستور تھا
زباں چپ تھی اور سینہ میں نور تھا

لیکن خدا والے اس میں زیادہ عرصہ نہیں گزار سکتے اور پھر ؎

پھر آخر کو مارا صداقت نے جوش
تعشق سے جاتے رہے اس کے ہوش

سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر عازم قادیان ہو گئے اور جاتے ہوئے نہ اپنی زرعی زمین کا کچھ خیال نہ مکانات کا فکر اور نہ ہلال پور اور اس کے نواح میں دیہات میں بسنے والوں کی عقیدت واحترام نے قدم روکے اور ایک گونہ دیوانگی کی حالت میں نفع ونقصان کے خیالات اور معاشی مشکلات سے یکسر بے نیاز ہو گئے اور گویا اس ''دیوانگی'' میں جا داخل ہوئے جس کو اُن جیسے عاشق ہی سمجھ سکتے ہیں ؎

یہ دیوانگی عشق کا ہے نشاں
نہ سمجھے کوئی اس کو جز عاشقاں

میں نے اپنے ابا جان کی معیت میں بہت چھوٹی عمر میں قادیان جانا شروع کیا اور وہاں پر حضرت مولوی محمد اسماعیل صاحب کے ہاں ہی اکثر بیشتر وقت گزرتا۔ ہاں ہم کچھ حصہ وقت حضرت مولانا شیر علی صاحب کے دولت خانہ پر بھی گزارتے تھے موصوف کے ساتھ بھی میرے ابا کے گہرے برادرانہ تعلقات تھے اس کی تفصیل ذرا طویل ہے اور کسی اور موقع پر قارئین کی خدمت میں پیش کروں گا۔

پھر حضرت مولوی محمد اسماعیل صاحب کی ذرہ نوازی اور وفا کیشی کا یہ عالم کہ قادیان تشریف لے جانے کے بعد اور وہاں پر علمی اور روحانی کارہائے نمایاں سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ اپنے مولد ہاں اس کو ردیہہ ہلال پور کو بھی بھولے نہیں تھے اور اپنی گونا گوں مصروفیات سے پہلو چھڑا کر ایک آدھ روز کے لئے ہلال پور تشریف لاتے احمدی تو آں موصوف کے گاؤں میں ورود سے بے حد مسرور ہوتے ہی تھے غیر از جماعت لوگ بھی بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ ملتے تھے۔ مجھے ہلال پور میں ایک جگہ پر بیٹھ کر بسم اللہ الرحمان الرحیم کے معانی اپنے دستِ مبارک سے لکھ کر سمجھائے یہ 35-1934ء کا واقعہ ہے اس چھوٹے سے واقعہ سے ایک طرف تو اس عاجز پر آپ کی نوازشاتِ کریمانہ کی جھلک دکھائی دیتی ہے تو دوسری طرف آپ کی معلمانہ اور مربیانہ شان کی ایک تڑپ بھی نظر آتی ہے۔

آپ کے بلند کردار کے شاہد ابھی تک کئی لوگ ہلال پور میں بھی زندہ موجود ہیں ایک خاص وصف فیاضی اور سخاوت کا تھا جس سے آپ متصف تھے اور گاؤں میں آپ کی جود وسخا کی مثالیں بہت بکھری پڑی ہیں اس مختصر سے تعارفی مضمون میں حضرت علامہ ہلال پوری کی سیرت نگاری تو مطلوب نہیں نہ ہی میں اس کا اہل ہوں لیکن حضرت موصوف کے میرے ابا کے ساتھ عدیم المثال مخلصانہ برادرانہ تعلقات تھے جن کا ایک حصہ میں نے بھی باوجود کم عمری کے مشاہدہ کیا اس لئے اپنی علمی کم مائیگی کے باوجود اپنے آپ کو مقروض سمجھتا رہا ہوں کہ

ایسے محسن اور مربی کا کچھ بھی ذکر نہ کرسکوں جس نے ایک کوردیہہ ہلال پور کو گویا ساری دنیا میں شناخت کروادی۔ حضرت مولوی صاحب کے تلامذہ کا دائرہ بہت وسیع ہے اور وہ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اس نسبت سے اہل ہلال پور کو مَیں نے اپنے سیاحتی دورہ جات کے دوران انگلینڈ، جرمنی، فرانس، سوئٹزرلینڈ اور امریکہ وغیرہ میں بھی مصروف عمل پایا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ عمویم مکرم حضرت مولوی صاحب ہلال پور سے عازم قادیان ہونے والے تھے کہ مجھے ہلال پور سے مڈھ رانجھہ آٹھ، نو میل کی مسافت کے لئے آں موصوف کے پیچھے گھوڑے پر سوار ہو کر لاری پر سوار کرانے کی ڈیوٹی میرے ابّا جان نے سپرد کی۔ ہم ہلال پور سے رات کے تیسرے پہر روانہ ہوئے تھے کوئی اڑھائی تین گھنٹے کی مسافت تھی ہلال پور روانہ ہوتے ہی قرآن کریم کی تلاوت حضرت مولوی صاحب نے شروع کی اور مڈھ رانجھہ تک مسلسل پڑھتے گئے لیکن اتنی محویت کے ساتھ اور اتنی شیرینی کے ساتھ کہ وہ حظّ میں آج بھی نصف صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود اپنے دل و دماغ میں عطر بیزی کرتا محسوس کرتا ہوں۔ کاش کوئی وسیلہ میسر ہوتا تو اس وقت اس ایمانی حلاوت کا ریکارڈ کر لیتا۔ آپ حافظ قرآن تو نہیں تھے لیکن قرآن کریم کا اتنا کثیر حصہ یاد تھا کہ اڑھائی تین گھنٹے تک مسلسل تلاوت کرتے رہے۔ اس سے حضرت مولوی صاحب کے قرآن کریم کے ساتھ عشق کا اندازہ لگایئے لیکن میرے ٹوٹے پھوٹے الفاظ اس جذب و کیف کو بیان کرنے سے یکسر قاصر ہیں جو اس فنافی اللہ کے لحن میں تھا۔

میں کم سن تھا لیکن طفلانہ کم علمی اور کم فہمی کے باوجود ایسا محسوس کر رہا تھا کہ ایک خواص قرآن حکیم کے روحانیت کے سمندر میں غوطہ زن ہے اور انمول موتی اپنے دامن میں اکٹھے کر رہا ہے۔ پھر مجھے حضرت مولوی صاحب کی زندگی کا وہ دن اور مقام بھی نہیں بھولتا جب میرے والد صاحب ایک مقدمہ میں مبتلا تھے اور پیشی بھگتنے کے لئے ضلع کچہری سرگودھا آئے تو قادیان سے وہ یارِ باوفا بھی آن پہنچا اور دونوں ایسے شیر و شکر ہو گئے کہ مقدمہ کی پیروی کا کوئی فکر نہ رہا چند منٹ بعد وہ خدا ترس اور خدا رسیدہ بزرگ دعاؤں میں ایسا مشغول ہو گیا کہ اسے چپ و راست کی کچھ خبر نہ رہی۔ میں دعاؤں میں ایسی محویت اور اضطرار دیکھتا اور محسوس کرتا رہا اور خود بھی حضرت مولوی صاحب کی اقتداء میں جو بن پڑا زیر لب پڑھتا رہا کچھ دیر کے بعد میرے ابّا عدالت سے باہر آئے اور یہ مژدہ سُنایا کہ مقدمہ کا فیصلہ ان کے حق میں ہوگیا ہے سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں!

آج سوچتا ہوں تو حیرت میں ڈوب جاتا ہوں کہ ایسے مجسم ایثار و وفا دنیا میں کتنے ہوں گے نایاب نہیں تو کمیاب بہت ہیں جو اپنے دوست کے دنیاوی جھمیلوں میں ملوث ہونے پر بھی سراپا دعا بن جاتے ہیں اور اپنے **نعم المجیبون** رب سے نہایت درجہ اضطرار اور بے قراری کے ساتھ تائیدات سماوی کی بھیک مانگتے ہیں۔

آخر میں یہ میرا مختصر سا مقالہ ایک اور لحاظ سے بالکل تشنہ رہے گا اگر میں ان بزرگوں کے ایک تیسرے وفا شعار ساتھی جو وہ بھی حضرت

اقدس کے رفقاء میں شامل تھے یعنی حضرت ملک علی حیدر صاحب اعوان آف دوالمیال ضلع چکوال کا ذکر نہ کروں۔ یہ تینوں گویا ایک مثلث کے تین زاویے تھے۔ مجھے کم عمری میں ان تینوں کی مجالس میں بیٹھنے اور اپنی اہلیت کے مطابق اُن سے لطف اندوز ہونے کے مواقع بھی ملے یوں لگتا تھا کہ ان تینوں پر اکتفا نہیں تھا بے شمار موتی تھے جنہیں ایک لڑی میں پرو دیا گیا تھا اور یہ پھر ایک سلک مروارید کی صورت اختیار کر گئے تھے۔

آج وہ موتی نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں اور اپنا اپنا وقت گزار کر خالقِ حقیقی سے جا ملے ہیں اس مختصر سے نوٹ لکھنے سے میری غرض یہ ہے کہ ہم جو اُن علماء ربانی کے پسماندگان میں شمار ہوتے ہیں اُن کے اس اخلاقی اور علمی ورثے سے بھی حصہ پائیں اور علمی میدانوں میں بھی سب سے آگے رہیں تا جب تاریخ کا قاری ان بزرگ علماء کے حالات اور ان کی نادر تصنیفات کا مطالعہ کرے تو ہم پر حقارت سے نظر ڈالتے ہوئے کہ

سلف جن کے وہ تھے خلف اُن کے یہ ہیں

اللہ تعالیٰ بچائے اور اللہ تعالیٰ خود ہمارا کفیل و کارساز ہو۔

(روزنامہ الفضل ربوہ مورخہ 27/فروری 1989ء صفحہ 3 تا 4)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁



خان بہادر ملک صاحب خان صاحب نون

(ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر)

ملک صاحب خان صاحب نون جو ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر فائز رہے اور پھر ریٹائرڈ ہوئے۔ انہیں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ''خان بہادر'' اور ''ایم بی ای'' کے خطابات ملے ہوئے تھے۔ انہوں نے بہت عرصہ قبل حج کرنے کی سعادت بھی پائی تھی بلکہ سردار خان نامی نجی ملازم کو بھی حج کرالائے تھے۔ دنیاوی مناصب، خطابات یا دینی مناسک کا ذکر کرنے سے ہمیشہ نفور رہے۔

عام لوگوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ انہوں نے حج کیا ہوا ہے۔ میری موجودگی میں کسی دیہاتی نے ''حاجی صاحب'' کہہ کر مخاطب کیا تو ناراض ہوئے کہ اگر عبادتوں کے لحاظ سے نام رکھنا ہے تو پھر ''نمازی صاحب'' بھی کہا کرو یا روزہ بھی رکھتا ہوں تو اس نسبت سے پکارا کرو۔ نمائش سے حد درجہ نفرت تھی۔ ایک مرتبہ ایک ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر کو مجھے ہمراہ لے کر ملنے گئے تو چونکہ وہ آپ کا واقف نہیں تھا میں

نے چاہا کہ چِٹ پر آپ کا نام لکھ کر اس کے چپڑاسی کو دوں۔ چنانچہ میں نے ''ملک صاحب خان نون ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر'' لکھا تو چٹ مجھ سے لے لی کہ آپ صرف میرا نام بتا دیں میری ڈپٹی کمشنری سے متعلقہ افسر کو کوئی غرض نہیں ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ جب ہمیں کمرہ عدالت کی طرف گلباز نامی چپڑاسی نے بڑھتے دیکھا تو صاحب مذکور کو اس نے بتا دیا اور جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر صاحب مودّب کھڑے تھے۔ مجھے اور ملک صاحب کو ڈائس پر بیٹھنے کی دعوت دی۔

آپ کا سن پیدائش 1882ء تھا۔ قصبہ بھلوال سے شمال مغرب کی جانب دس میل کے فاصلے پر آپ کا ملکیتی گاؤں فتح آباد داخلی بنی شاہ بالا ہے۔ تحصیل ہیڈکوارٹر کے شمال مغربی کونے میں نون قوم کے گیارہ دیہات آباد ہیں۔ جو ایک ایک سربراہِ خاندان کی واحد ملکیت ہے۔ ملک صاحب خان صاحب کا گاؤں موسومہ فتح آباد سرگودھا شہر سے 35 میل کی مسافت پر ہے۔

بھیرہ شہر ملک صاحب کے گاؤں سے 9،8 میل کے فاصلہ پر دریائے جہلم کے بائیں کنارے واقعہ ہے۔ وہاں ایک توحید پرست عبادت گزار اور گوشہ نشین بزرگ حضرت قریشی غلام حسین صاحب رہتے تھے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ملک صاحب حضرت قریشی صاحب کے ساتھ عقیدت کا تعلق رکھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ جب میں سکول اور کالج سے چھٹی پر آتا تو گھوڑے پر سوار ہو کر سیدھا قریشی غلام حسین صاحب کے پاس پہنچتا اور ان کی صحبتِ صالحہ سے مستفید ہوتا۔ یہ اسی بزرگ کی صحبت کا فیض تھا کہ ملک صاحب لڑکپن سے ہی پنجگانہ نمازوں کا التزام کرتے تھے۔ ذرا عمر بڑھی تو تہجد کی نماز جو شروع کی تو سوائے سفر یا شدید بیماری کے پھر ناغہ نہ کیا۔

نون خاندان سرگودھا کے روؤسا میں اونچے نمبر پر شمار ہوتا تھا۔ بڑی بڑی جاگیروں کے مالک ہونے کے علاوہ چونکہ سارا نون خاندان اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اس لئے سول اور فوج میں اس خاندان کے اکثر افراد اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ قیام پاکستان سے بہت عرصہ پہلے کی بات ہے کہ نواب سر محمد حیات خان صاحب نون والد سر ملک محمد فیروز خان صاحب نون کمشنر کے منصب پر متمکن تھے جب ہندوستانی افسر شاذ ہی کمشنری کے عہدہ تک پہنچ پاتا تھا۔ سابق وزیر اعظم سر ملک فیروز خان صاحب نون جو ملک صاحب خان صاحب نون کے رشتہ میں بھتیجے تھے وہ گورنر مشرقی پاکستان اور پھر وزیر اعظم پاکستان بھی مقرر ہوئے۔ مگر خاندان میں ملک صاحب خان صاحب نون کی تقویٰ شعاری، زہد و تعبد اور ایمانی جرأت کی وجہ سے انہیں ایک خاص منفرد اور ممتاز مقام حاصل تھا۔

میرے مشاہدے کی بات ہے کہ خاندان کی اور اونچی سطح کی محفل میں یہ سادگی شعار بزرگ آتا دکھائی دیتا تو سارا خاندان دورویہ صف آرا ہو جاتا اور سبھی خورد و کلاں بے حد عزت اور عقیدت کا اظہار کرتے۔

ملک صاحب خان صاحب نون ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوئے تو دوران ملازمت امرتسر میں 1923ء - 1924ء میں سٹی

مجسٹریٹ تعینات ہوئے۔ ابھی احمدیت کے متعلق متعصّبانہ رویہ ہی رکھتے تھے اور اس طرف کچھ بھی رجحان نہ تھا کہ ایک انقلاب آفریں شب ایسا رُوح پرور واقعہ رونما ہوا جس نے گویا ملک صاحب کی ہستی کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ تعصّبات اس طرح صاف ہو گئے جس طرح لوح پر سے پرانے نقوش یکسر مٹا دیئے جاتے ہیں۔

وہ راتوں رات کیا ماجرا گزرا اس دلنواز واقعہ کی تفصیل درج کرنے کے لئے الفضل کے کالم موجودہ حالات میں متحمل نہیں ہو سکتے اور بجائے اس کے کہ میں اس مؤقر جریدہ کے لئے کوئی اشکال یا الجھاؤ پیدا کروں میں اس نورانی شب اور اس کے بعد آنے والے آسمانی نوروں سے منور دن کے ذکر کو کسی اور مناسب وقت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ جناب ملک صاحب محترم کے متعلق اگر کوئی قلمکار اس شبینہ واقعہ کو نہ لکھ سکے تو گویا ملک صاحب موصوف کے بارہ میں وہ کچھ بھی نہیں لکھ سکا۔

قارئین کرام کی طبائع میں یہ قرار واقعی تجسس اور سوال پیدا ہوگا کہ اگر اتنا ہی ضروری واقعہ ہے تو اسے چھپایا کیوں جا رہا ہے۔

یہ بات سچ ہے کہ اس میں ہرگز ہرگز کوئی ایسی بات نہیں جو اخلاق کے معیار پر پوری نہ اترتی ہو۔ نہ ہی بظاہر اس میں کسی کے دل کو دُکھانے کا شائبہ تلاش کیا جا سکتا ہے بلکہ یہ مبارک ذِکر میرے قلم سے تفصیل کے ساتھ بیان ہوا تو بعض نازک طبائع پر گراں گزرے گا۔ اس لئے میں اس قرض کو کسی اور ذریعے سے ہی چُکا دوں گا۔

1923ء یا 1924ء کی بات ہے ملک صاحب احمدیت میں داخل ہوئے۔ ان کی بیگم صاحبہ جو موضع ہڈالی کے ایک رئیس ٹوانہ خاندان کی خاتون تھیں وہ بھی آپ کی ہم مشرب تھیں۔ پھر تو اس مثالی جوڑے نے تیز تیز قدم سے سلوک کی منازل طے کرنا شروع کیں۔

مجھے ملک صاحب کے قریب رہنے کا ایک لمبے عرصہ تک موقعہ ملا۔ میرے ساتھ برادرانہ شفقت کرتے تھے بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ بھائیوں میں بھی ایسی محبت والفت کم یاب ہوگی جو میرے ساتھ تھی تو مبالغہ نہ ہوگا۔ کیونکہ آجکل بھائیوں کی باہمی محبت کوئی مثالی مقام نہیں رکھتی۔ مَیں حد درجہ مشفقانہ نوازشات اور الطافِ کریمانہ کا مورد رہا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میرا مشورہ خواہ کتنا ہی حقیر ہوتا ضرور قبول فرما لیتے۔ میرا طریق یہ رہا کہ کبھی اُن کے ساتھ بحث نہیں کرتا تھا۔ اگر کوئی ذاتی یا جماعتی مشورہ ماننے سے ایک دفعہ انکار کر دیتے تو ذرا مختلف طریق سے پیش کرنے پر فوراً مان لیتے۔

12، 13 سال کا عرصہ تو سرگودھا میں ہمارا اس طرح گزرا کہ روزانہ یا میں ان کے دَرِ دولت پر حاضر ہوتا اور یا پھر موصوف میرے ہاں تشریف لاتے اور اس دوران اکثر ذکرِ خیر حضرت فضل عمر اور حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب کا چھیڑتے۔ حضرت چودھری

سر محمد ظفر اللہ خان صاحب سے بھی بہت محبت تھی۔فرماتے تھے ان کی والدہ ماجدہ نے مجھے اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا اور میں بڑے لاڈ سے انہیں کہتا تھا کہ ''بے بے'' جتنی دعائیں سر ظفراللہ کے لئے کرتی ہیں اتنی میرے لئے بھی کیا کریں۔وہ فرماتی تھیں میں آپ سمیت پانچوں بیٹوں کے لئے روزانہ دعائیں کرتی ہوں۔

1949ء میں ملک صاحب نے حضرت فضل عمر کے اعزاز میں اپنی کوٹھی واقعہ سول لائن سرگودھا میں ظہرانہ دیا۔شہر کے روؤسا، افسرانِ اعلیٰ اور جماعت کے کچھ دوست بھی مدعو تھے۔اس روز ایک لطیفہ ہوا۔ڈپٹی کمشنر سرگودھا مسٹر نیاز احمد تھے اور ایس۔پی مسٹر ٹیری Terry انگریز تھے۔ایس۔پی صاحب نے ڈپٹی کمشنر صاحب کو یاددلایا کہ آج لنچ نون صاحب کے گھر ہے۔ڈی۔سی صاحب نے یونہی کہہ دیا یا شاید یاد نہ رہا کہ کون سے ''نون صاحب'' ٹیری صاحب نے فی البدیہہ جواب دیا کہ

"Sahib Khan is only Noon All other Noons are afternoon"

(صاحب خان نون ہی دراصل نون ہے۔باقی تو آفٹر نون ہیں)۔یہاں یہ لطیفہ بہت عرصہ چلتا رہا۔

گویا ایک انگریز افسر کے دماغ کی پیداوار تھا لیکن اس کے کئی پہلو واقعی معنیٰ آفرین اور حقیقت پر مبنی تھے۔ملک صاحب خان صاحب اپنے زہد وتعبد،تقویٰ شعاری، انفاق فی سبیل اللہ اور ایمانی جرأت وغیرت کے اظہار کے لحاظ سے ''Only Noon'' کہلانے کے صحیح حقدار تھے۔ملک صاحب موصوف حد درجہ سادگی پسند تھے۔لباس بھی سادہ اور گفتگو بھی بے تکلف سادہ اور بامقصد سادگی کے ساتھ نظافت کا بھی نہایت درجہ خیال رکھتے تھے۔طبیعت میں انکسار تھا لیکن اس کے ساتھ وقار کا امتزاج ایک نیا رنگ پیدا کر دیتا تھا۔

سابق وزیر اعظم ملک سر فیروز خان صاحب نون اپنی کوٹھی ''الوقار'' واقعہ مسلم ٹاؤن لاہور میں سکونت پذیر رہے۔آخری سالوں میں بہت بیمار رہے لیکن مجھے ہر دو ہفتہ کے بعد فون کرتے۔حضرت فضل عمر اور ملک صاحب خان صاحب کی خیریت دریافت کرتے اور اپنا سلام پہنچانے کی تاکید کرتے۔ایک مرتبہ ملک صاحب خان صاحب کی صحت کا حال جو پوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ صحت اللہ تعالیٰ کے فضل سے اچھی ہے۔اس پر سر ملک فیروز خان صاحب نون نے کہا کہ ان کی صحت تو اچھی ہی ہونی ہے وہ باقاعدہ ورزش جو کرتے ہیں۔میں نے کہا کہ نہیں ورزش تو آجکل کوئی نہیں کرتے۔فرمانے لگے کہ بھائی صاحب پانچ وقت نہیں بلکہ چھ وقت بلا ناغہ نمازیں ادا کرتے ہیں اور اس عمر میں یہ کافی ورزش ہے۔

نوٹ: اگرچہ سر ملک فیروز خان صاحب نون رشتہ میں جناب ملک صاحب خان صاحب نون کے بھتیجے تھے لیکن ہم عمری کے باعث عموماً ''بھائی صاحب'' کہہ کر پکارتے تھے۔

ملک صاحب کی سادگی اور بے تکلفانہ عادات کی کئی شیریں مثالیں میرے ذہن میں مستحضر ہیں لیکن طوالت کے خوف سے فی الحال انہیں چھوڑتا ہوں۔ انفاق فی سبیل اللہ اور اطاعتِ امام کے دو ایک واقعات بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

جب ربوہ آباد ہوا تو ملک صاحب نے دارالضیافت کے قریب ایک رہائشی کوٹھی تعمیر کر لی تھی اس محلہ کے باسیوں نے خانہ خدا کی تعمیر کرنا چاہی تو تجویز ٹھہری کہ جن لوگوں کے مکانات اس محلہ میں ہیں وہ چندہ اکٹھا کر کے ایک بیت الذکر تعمیر کر لیں۔ چنانچہ چندہ حاصل کرنے کے لئے ایک دوست سرگودھا ملک صاحب کے ہاں تشریف لائے۔ ملک صاحب نے لاگت کا تخمینہ معلوم کیا تو سستے زمانے کی بات ہے دس ہزار روپے بتایا گیا۔ ملک صاحب نے یہ ساری رقم اپنی جانب سے ہی ادا فرما دی۔ اس خانۂ خدا کا نام ''محمود'' ہے۔ پھر خیال آیا کہ دارالیمن میں حضرت صاحب نے نہایت رعایتی نرخوں پر غرباء کو پلاٹ دیئے ہیں۔ وہ لوگ بڑی مشکل سے اپنے گھر تعمیر کر سکیں گے۔ چنانچہ دارالیمن میں ''البیت'' خانۂ خدا ملک صاحب نے خود بنوا دیا۔ چندوں میں بے حد باقاعدہ تھے۔

ایک مرتبہ جلسہ سالانہ سے واپس تشریف لائے تو تحریک جدید کے کارناموں کے بارہ میں کوئی رپورٹ انہیں بہت پسند آئی۔ واپس آ کر مشورہ کیا کہ بڑی بڑی فتوحات نصیب ہو رہی ہیں۔ اس کے لئے چند ہزار روپے سالانہ چندہ دینا تو ہرگز کافی نہیں ہے۔ فرمایا نقد رقم اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ دو مربع نہری اراضی جو پختہ سڑک مابین سردار پور نون اور بھلوال پر واقعہ تھی تحریک جدید کے نام منتقل کرا دی جو جلد بعد ہی تحریک جدید نے فروخت کر دی تھی۔

قریباً دس روز قبل مجھے ملک فاروق احمد صاحب نون جو ملک صاحب موصوف کے عزیز تھے کی وفات کے موقع پر اُدھر جانے کا اتفاق ہوا تو دیکھا کہ وہ اراضی جو ملک صاحب نے تحریک جدید کو ھبہ کی تھی اس میں شاندار باغ اور گل بوٹے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ سب ملکیت تو ان خریداروں کی تھی جنہوں نے تحریک جدید سے وہ دو مربع اراضی خریدی تھی۔ لیکن اللہ کی رحمت سے کیا بعید جو اس قطعہ اراضی میں اُگنے والے شیریں ثمر اور دیگر اثمار اتنی بڑی جائیداد اللہ کی راہ میں قربان کرنے والے فدائی کی جھولی میں ہمیشہ ہمیش پڑتے رہیں۔

آیئے اب اطاعتِ امام کا ایک نہایت ایمان افروز واقعہ بھی سُن لیجئے۔

حضرت فضل عمر رتن باغ لاہور میں قیام فرما تھے کہ ملک صاحب کے چھوٹے بھائی میجر ملک سردار خان صاحب نون اور جناب ملک سر فیروز خان صاحب نون کے ساتھ ملک صاحب خان صاحب کا کوئی خاندانی تنازعہ پیدا ہو گیا۔ ایسی شکر رنجی تک نوبت پہنچی کہ خاندان میں کوئی شادی کی تقریب جو ہوئی تو ملک صاحب ناراضگی کی وجہ سے شامل نہیں ہوئے تھے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں ملک صاحب

نون قبیلہ کے سردار مانے جاتے تھے۔ تقریب شادی میں ان کی عدم موجودگی کو سب نے بہت ہی محسوس کیا اور تو نون صاحبان کی کوئی پیش نہ گئی البتہ دونوں صاحبان یعنی سابق وزیراعظم ملک سر فیروز خان صاحب اور میجر ملک سردار خان صاحب نون حضرت فضل عمر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بڑی افسردگی اور پریشانی سے ذکر کیا کہ بڑے ملک صاحب ناراض ہیں اور ہمیں تو ان سے بات کرنے کی بھی ہمت نہیں ایک آپ کی ذات ہے جو خاندان کی اس پراگندگی اور انتشار کو دور کرسکتی ہے۔ حضرت صاحب کے ان دونوں نون صاحبان کے ساتھ دیرینہ مراسم تھے۔ حضور نے فرمایا کہ میں کوشش کروں گا۔

ملک صاحب خان صاحب نے مجھے خود یہ واقعہ سنایا کہ حضرت فضل عمر نے مجھے رتن باغ طلب فرمایا اور حکم دیا کہ دونوں ملک صاحبان یعنی سر محمد فیروز خان صاحب اور میجر سردار خان صاحب سے جا کر معافی مانگیں اور پھر مجھے آ کر رپورٹ دیں۔ ملک صاحب فرماتے تھے کہ مجھے حضور کے اس حکم سے وقتی طور پر صدمہ پہنچا کہ حضور نے مجھ سے تو کوئی وضاحت طلب ہی نہیں فرمائی نہ کوئی بات سُنی اور نون صاحبان سے معافی مانگنے کا حکم دے دیا ہے لیکن فرماتے تھے کہ بلا چون و چرا اسی وقت سر فیروز خان کی کوٹھی گیا۔ ملک صاحب نے جب مجھے اپنی کوٹھی میں داخل ہوتے دیکھا تو بھاگ کر آئے اور میری موٹر کا دروازہ کھول کر میرے ساتھ لپٹ کر زار و قطار رونے لگے اور کہتے جاتے تھے کہ ''میں قربان جاؤں اس مرزا صاحب پر جس نے مجھ پر یہ احسان کیا ہے''۔ ملک سر فیروز خان صاحب نون روتے جاتے تھے اور ملک صاحب خان صاحب سے معافی مانگ رہے تھے۔ ادھر ملک صاحب نے کہا کہ مجھے حضور نے معافی قبول کرنے کے لئے نہیں بلکہ معافی مانگنے بھیجا ہے۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ ان حالات میں بھلا کدورت کہاں باقی رہ سکتی تھی۔ چند منٹ کے بعد ملک صاحب خان صاحب نے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا اور اجازت چاہی کہ میں نے ابھی چھوٹے بھائی ملک میجر سردار خان صاحب کے پاس جا کر ان سے بھی معافی مانگنی ہے اور پھر حضور کو رپورٹ پیش کرنی ہے۔

چنانچہ میجر سردار خان صاحب کی کوٹھی واقعہ گلبرگ تشریف لے گئے۔ وہ تو چھوٹے بھائی تھے۔ یہی صورت وہاں پر ہوئی۔ دونوں بھائی ایک دوسرے سے لپٹ کر رو رہے تھے اور میجر صاحب حضرت فضل عمر کے احسان عظیم کا ذکر کرتے تھکتے نہیں تھے۔ دل صاف ہو گئے غلط فہمی دور ہوگئی۔ ملک صاحب خان صاحب اُسی روز حضرت فضل عمر کی خدمتِ اقدس میں پیش ہوئے اور یہ ساری رپورٹ سُنائی۔ اب حضور نے اپنے بظاہر یکطرفہ حکم صادر فرمانے کی مصلحت اور حکمت بیان فرمائی۔ فرمایا ملک صاحب آپ کو میرا حکم عجیب تو لگا ہوگا کہ آپ کی بات سنے بغیر عمر میں چھوٹے عزیزوں سے معافی مانگنے کا حکم دے دیا۔ حضور نے دو وجوہات بیان فرمائیں ایک تو یہ کہ میں حکم اپنے ارادتمند مرید کو ہی دے سکتا تھا جس کے لئے میرے حکم کی پابندی واجب تھی۔ دوسرے یہ کہ حضرت خاتم الانبیاء **فداہ نفسی** کی بشارت کے مطابق دو روٹھے ہوئے بھائیوں میں سے جو پہل کرے اور صلح کا قدم پہلے اُٹھائے وہ پانچ سو سال پہلے جنت میں جائے گا۔ اس لئے

حضور نے فرمایا کہ ملک صاحب آپ ہر طرح سے فائدے میں رہے۔ جناب ملک صاحب فرماتے تھے کہ مجھے حضور کی گفتگو اس قدر دل کو بھائی کہ میں نے حضرت صاحب کا دلی شکریہ ادا کیا۔ حضور نے واپسی پر معانقے سے سرفراز فرمایا اور اس طرح ایک بہت بڑا خاندان حضرت فضلِ عمر کی دُعا اور برکت سے انتشار اور افتراق سے محفوظ ہو گیا۔

ملک صاحب خان صاحب 17 رجولائی 1966ء کو 84 سالہ متقیانہ زندگی گزار کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ آپ کی نماز جنازہ اور تدفین آپ کے ملکیتی گاؤں فتح آباد میں ہوئی۔ سرگودھا سے مکرم جناب مرزا عبدالحق صاحب ایڈووکیٹ کی سرکردگی میں بہت سے دوستوں نے اور ربوہ سے سیّدی حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب ایدہ اللہ اور حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب نے بھی نماز جنازہ میں شرکت فرمائی۔ غروب آفتاب کے وقت جبکہ میت کو لحد میں اتارا جا رہا تھا تو کسی کا شعر بے اختیار زبان پر آ تا رہا۔ ؎

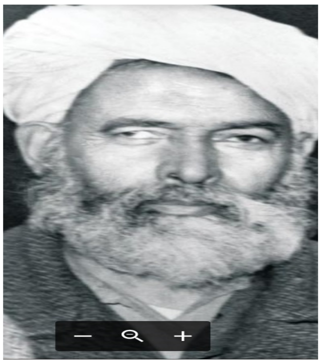
مٹی میں چراغ رکھ دیا ہے

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے وافر رحمت کا سلوک فرمائے اور جو قندیل ملک صاحب موصوف نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے روشن کی تھی اور جو اُن کی وفات کے ساتھ ہی ٹمٹمانے لگی تھی اور پھر اسے بجھتے دیر نہ لگی تھی۔ اے کاش وہ پھر روشن ہو جائے اور ملک صاحب کے اُٹھ جانے سے جو خلاء پیدا ہوا ہے وہ ہماری قوم کے کسی فرد کے ذریعہ پھر پورا ہو جائے۔ مجھے نون قوم کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے اس محرومی سے دوہرا قلق محسوس ہو رہا ہے۔

آپ کی وفات کے بعد نون خاندان میں سفارتوں اور وزارتوں کے دور تو چلتے رہے۔ چند سال قبل ضلعی سیاست میں ایک ایسا مرحلہ بھی آیا کہ کہا جانے لگا کہ ''نون'' ہی ضلع کی سیاست کے رُوحِ رَواں ہیں اور آپ کے ہی ایک عزیز کو وفاقی سطح کا بہت بڑا لیڈر تصور کیا جانے لگا لیکن جو بہار اس درویش صفت انسان کے زمانے میں دیکھی وہ ان دنیاوی عظمتوں کے باوجود پھر دیکھنا نصیب نہیں ہوئی۔

میں مکرر درخواست کرتا ہوں کہ قارئین کرام دُعا کریں کہ ہمارے خاندان کی کھوئی ہوئی بہار پھر لوٹ آئے۔

(روزنامہ الفضل ربوہ مورخہ 15/اپریل 1989ء صفحہ 4 تا 6)



حضرت مولانا شیر علی صاحب ''رانجھا''

تاریخ کی بعض نامور شخصیتیں اقدارِ عالیہ کی اس طرح ترجمان بن جاتی ہیں کہ ان کا نام لیجئے تو ذہن میں وہ اقدار یک بیک جگمگا اُٹھتی ہیں اور جب ان اقدار کا ذکر کیا جائے تو ان کی شخصیت بے اختیار آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت حضرت مولانا شیر علی صاحب کی تھی جو زہد وتعبد تقویٰ وخداشناسی عجز وانکساری اور خاکساری ودلنوازی کا ایک پیکر تھے۔

چشم من بسیار گرد ید است و کم کم دیدہ است
اَیں قدر عالی وقارے خاکسار ے ایں چنیں

محکمہ مال کے بندوبستی ریکارڈ کے مطابق ضلع شاہ پور (حال سرگودھا) کے تین Main Tribes (بڑی قومیں) رانجھے، گوندل اور جنجوعے تھیں۔ حضرت مولوی صاحب رانجھہ قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ رانجھہ قوم بدقسمتی سے جبر وتشدد قتل وغارت اور فساد انگیزی کی علامت بن گئی ہے۔ اسی قوم کے ایک فرد مولوی نظام الدین صاحب کے ہاں دو بیٹے پیدا ہوئے۔ بڑے کا نام حضرت حافظ عبدالعلی صاحب اور چھوٹے بیٹے کا نام نامی حضرت مولانا شیر علی صاحب۔ دونوں بھائی خلیق ومنکسر مزاج، روبخدا اور تقویٰ شعار۔ حضرت عبدالعلی صاحب سے کسی نے پوچھا تھا کہ دونوں بھائیوں میں سے بڑا کون ہے تو حضرت حافظ صاحب نے جواب دیا کہ عمر میں تو مَیں بڑا ہوں لیکن اصل میں بڑا شیر علی ہی ہے۔ مولوی نظام الدین صاحب موضع چاوہ سب تحصیل بھیرہ کے رہنے والے تھے۔ آپ کے قبیلہ کے کچھ لوگ ہنوز وہیں آباد ہیں۔ آپ زرعی اراضیات کے مالک تھے لیکن انیسویں صدی عیسوی کے وسط کے قریب یہ خاندان چاوہ سے ترک سکونت کر کے موضع ادرحماں تھانہ کوٹ مومن میں آباد ہوگیا۔ چاوہ اور ادرحماں کا باہمی فاصلہ 34،35 میل ہے۔ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ تبدیلی سکونت کن وجوہات کے باعث عمل میں آئی۔ حضرت مولوی صاحب کا شجرہ نسب معلوم کرنے اور ان کی مملوکہ اراضیات کی تفصیل دیکھنے کی غرض سے میں نے موضع چاوہ کا 92۔1891ء بلکہ 1865ء کے بندوبست مال کا ریکارڈ کھنگالا لیکن اس سلسلے میں بسیار تلاش کے باوجود زیادہ کامیابی نہ ہوئی تو میرے ذوق نے تسکین کی ایک راہ نکال لی کہ شاید تیرے اجداد سے سلسلہ نسب منقطع کر کے تجھ سے شروع کیا جائے گا۔......کی آسمانی پیش خبری مولوی صاحب کے آقا ومرشد کی تقلید میں خود مولوی صاحب کے حق میں بھی پوری ہورہی ہو واللہ اعلم باسرارہٖ۔ ایسے لوگ صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ہاں اسی وقت جب آسمانی (ناقوس) بجتا ہے اور اللہ کا فرستادہ وہ خزائن لٹانے آتا ہے جو ''ہزاروں سال سے مدفون'' چلے آئے تھے اور وہ لقائے الٰہی کے جام کے جام لنڈھاتا ہے اور اللہ کے درویش وہ ''نان''

کھاتے ہیں جو خاص انہی کے لئے اتارا جاتا ہے اور وہ آسمانی مائدے سے لطف اندوز ہو کر مست ہو جاتے ہیں تو وہ مامور الٰہی ان کی اس حالت مستی کو دیکھ کر دل ہی دل میں مسرور ہوتا ہے اور کہتا ہے۔ ؎

وہی مئے ان کو ساقی نے پلا دی
فسبحان الذی اخزی الاعادی

حضرت مولوی صاحب کی پیدائش 24/نومبر 1875ء کو ہوئی۔ ابھی 21 برس کے تھے جب حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے دست مبارک پر بیعت کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ روز سعید 6/مارچ 1897ء کا تھا۔ ہاں وہی دن جس دن آریہ سماج کا لیڈر شاتم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پنڈت لیکھرام قہری تجلی کا شکار ہوا۔ اُدھر دین حق کا دریدہ دہن دشمن ہلاک ہوا ادھر حضرت شیر علی دین کو دنیا پر مقدم رکھنے کا عہد کر کے دینِ حق کی خدمت کے لئے کمر بستہ لشکر میں آ شامل ہوا۔ **ستعرف یوم العید و العید اقرب**۔ یہ الٰہی کلام ہے اور الٰہی کلام کے کئی بطون ہوتے ہیں۔ عام معروف معنوں اور مفہوم کے لحاظ سے عید کے دوسرے روز آریہ سماجی دشمن رسول کی ہلاکت جو کلام الٰہی کی صداقت کا عظیم الشان نشان تھا۔ یہ بہت بڑی عید تھی اور اُسی روز حضرت شیر علی کا جماعت مبائعین میں داخل ہونا بھی عید کی خوشی سے کم نہیں تھا۔ یہ توارد بڑا مبارک تھا اور حضرت مولوی صاحب نے دین حق کی تائید اور کلام اللہ کے شرف کے لئے جس طرح اپنی ساری زندگی صرف کی اور جماعت احمدیہ کی سربلندی کے لئے جو خدماتِ جلیلہ پیش کیں اُن سے آپ کی بیعت کرنے کا دن بھی واقعی یوم العید ثابت ہوتا ہے۔

یوں تو حضرت مولوی صاحب کا فیض عام تھا اور بلا تمیز خویش و اغیار ہر کوئی اس چشمۂ حیواں سے سیراب ہوتا تھا لیکن میرے والد حافظ عبدالعزیز صاحب نون کے ساتھ آں موصوف کے خصوصی برادرانہ تعلقات تھے۔ میرے ابّا عمر میں حضرت مولوی صاحب سے پانچ سال چھوٹے تھے لیکن اس کے باوجود میرے ابّا کو آپ ''بھائی عبدالعزیز'' کہہ کر پکارتے تھے۔ ان نوازشات کریمانہ کی اوّل وجہ تو ہمسائیگی کا تعلق تھا۔ ہمارا گاؤں ہلال پور نوناں اور ادرحمہ اڑھائی میل کی مسافت پر ہیں اور دونوں مواضعات کی اراضیات کی حدود ملتی ہیں دوسرے یہ کہ حضرت مولوی صاحب کی ننھیال وہیں تھے اور دونوں کی مائیں ایک ہی گاؤں کی ہونے کی وجہ سے باہم متعارف اور گویا بہنیں ہی تھیں۔ تیسری وجہ کرم یہ تھی کہ حضرت مولوی صاحب کی شادی موضع بدر رانجھہ میں ہوئی تھی اور یہ گاؤں بھی اڑھائی میل کی مسافت پر ہلال پور نوناں سے ہے۔

آج کے مشینی دور میں ایسی نسبتیں عام طور پر مدنظر نہیں رکھی جاتیں لیکن گزشتہ صدی جس میں یہ بزرگ ہوئے اس زمانے میں ایسے علائق بھی برادرانہ تعلقات کی استواری اور استحکام کے لئے کافی سمجھے جاتے تھے۔ اگرچہ سب سے قوی اور محکم رشتہ تو وہ تھا جس میں یہ

دونوں ''بھائی''، حبل اللہ کے پکڑنے کے بعد منسلک ہو گئے تھے اور ہمارے آقا کے الفاظ میں ''ایک پیٹ میں سے دو بھائی''۔

میں بچپن ہی سے نہ صرف حضرت مولوی صاحب سے متعارف تھا بلکہ الطافِ کریمانہ کا مورد رہا 1944ء میں ٹی آئی کالج کا اجراء قادیان میں ہوا تو میں فرسٹ ایئر کلاس میں جا داخل ہوا۔ کالج کا ہوسٹل محلہ دارالانوار کی ایک کوٹھی میں تھا جس کے سامنے حضرت فضل عمر کی کوٹھی ''دارالحمد'' میں ترجمہ قرآن کریم کا دفتر تھا وہیں پر حضرت مولوی شیر علی صاحب ترجمہ قرآن کریم کا کام کرتے تھے۔ پھر تو ہر روز ہی ملاقات کا شرف حاصل ہونے لگا۔ آپ کی طبیعت علیل ہوتی تو ''بیت الانوار'' میں نماز کے لئے نہ جا سکتے تھے اور مجھے دفتر میں بلوا لیتے کہ یہیں پر باجماعت نماز پڑھتے ہیں آپ کے دفتر میں ایک بزرگ غالباً نام حضرت عبدالرحیم صاحب شرما تھا (مولانا عبدالکریم صاحب شرما مربی سلسلہ عالیہ احمدیہ کے والد بزرگوار۔ ادارہ) جو ہندومت چھوڑ کر احمدیت میں داخل ہوئے تھے وہ اس مختصر سی باجماعت نماز کے تیسرے نمازی ہوتے تھے ایک روز لطیفہ ہوا شرما صاحب قعدہ میں تھے حضرت مولوی صاحب نے سمجھا کہ نماز سے فارغ ہو کر بیٹھے ہیں۔ شرما صاحب نے ایک بھاری بھرکم اوورکوٹ پہنا ہوا تھا۔ حضرت مولوی صاحب نے نماز کے لئے مسح کرنا چاہا تو کوٹ میں سے گرد نکلی اور مولوی صاحب نے مسح کر لیا لیکن مولوی صاحب کے ''دوہتھڑ'' سے شرما صاحب کے جسم نے پھریری لی۔ اب مولوی صاحب کو احساس ہوا کہ شرما صاحب حالتِ نماز میں تھے آپ بے حد نادم اور متاسف ہوئے اور اونچی آواز سے استغفار پڑھتے رہے۔ پھر جب شرما صاحب نے سلام پھیرا تو بڑی لجاجت اور ندامت کے ساتھ معذرت کرنا شروع کی تو کرتے ہی گئے۔ شرما صاحب نے معذرت طلبی میں اس قدر تکرار سے خجالت محسوس کی اور وہ کہتے جاتے تھے کہ حضرت کوئی بات نہیں۔ مجھے کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔ مگر مولوی صاحب تھے کہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھی سے مسلسل معافی مانگتے رہے۔

حضرت مولوی صاحب کے محاسن کا شمار تو ممکن نہیں آپ کے روحانی بلند و بالا مقام کو تو آپ کا خالق و مالک ہی جانے لیکن آپ کی زندگی پر نظر ڈالنے سے آپ کے دو اوصاف خاص طور پر اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ اوّل شانِ عبودیت، دوم شفقت علی خلق اللہ۔ ان صفات کی کئی شیریں مثالیں میرے قلب و ذہن پر مرتسم ہیں لیکن میں طوالت کے خوف سے کئی واقعات چھوڑ رہا ہوں۔

جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے کہ کوٹھی دارالحمد قادیان میں آپ کے ساتھ نمازیں پڑھنے کے کئی مواقع ملے۔ میں نے مشاہدہ کیا کہ جب وہ اللہ کا بندہ اپنے آسمانی آقا کے حضور کھڑا ہوتا تو وہ ایک عجیب کیف و مستی کے عالم میں کھو جاتا تھا۔ وہ دنیا و مافیہا سے یکسر غافل، دربارِ الٰہی میں حاضر ہو کر اس قدر الحاح سے مناجات کرتا اور درد سے تڑپتا کہ مرغ بسمل کی مثال بھی ناقص نظر آتی ہے۔ سیّدنا حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے اس حالت کی کیا خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔ ؎

جس سوز میں ہیں اس کے لئے عاشقوں کے دل

اتنا تو ہم نے سوز نہ دیکھا کباب میں

قیام میں سورۃ فاتحہ پڑھتے تو درمیان میں وہ......کا اس قدر تکرار کرتے اور سوز وگداز میں گوندھی ہوئی دردناک پکار بلند ہوہو جاتی اور سینہ انتہائی جوش میں اس طرح کھول رہا ہوتا تھا جس طرح ہنڈیا تیز آنچ سے ابلنے لگتی ہے۔ رکوع وسجود کے مناظر بھی دیدنی اور ناقابل فراموش۔ ؎

ختم کر دی ایک ہی سجدے میں ساری بندگی
جھک گیا جب سر نہ اُٹھا آستانِ یار سے

''تضرعاً وخفیۃً'' کا دلفریب ودلگداز نقشہ آج بھی آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ ''التحیات'' میں بیٹھتے تو اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد جب **''السلام علیک ایھا النبی''** پر پہنچتے تو وہ عاشقِ رسول اپنی ساری توانائیوں اور اپنے سارے علم ومعرفت کو عجز وانکسار میں ڈھال کر اب اپنے آقا رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور سلام وپیام میں منہمک ہے۔ بار بار سلام عرض کرتا ہے اور تھکتا نہیں۔ اس کا انداز حد درجہ مؤدبانہ اور والہانہ ہے یوں معلوم ہوتا کہ غلام اپنے آقا کی بلائیں لے رہا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں پہنچ کر وہ ایسا بےخود ہوجاتا ہے کہ اب اس کی مناجات ''خفیۃ'' کی حد بست سے بھی آزاد ہوگئی ہے۔ اسے اپنے چپ وراست کا کچھ ہوش نہیں رہا۔ آواز میں سوز اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اب یہ رازِ محبت کوئی راز نہیں رہا۔ ؎

مجھے ہوش کب تھی رکوع کی مجھے کیا خبر تھی سجود کی
تیرے نقشِ پا کی تلاش تھی کہ میں جھک رہا تھا نماز میں

ہاں یہ نسخہ اس کے آقا ومرشد کا آزمودہ ہے۔ کثرت کے ساتھ درود بھیجنے کے نتیجہ میں فرشتے نور کی مشکیں لئے حاضر ہوگئے تھے اور **ذٰلک ماصلیت علی محمدٍ** کی آسمانی تصدیق ہمراہ لائے تھے۔

حضرت مولانا شیر علی اپنے فطری حجاب وانکسار کسر نفسی کے باعث یہ تو ظاہر نہ کرتے تھے کہ درود شریف کی برکت سے آسمانی نوروں سے انہیں کتنا حصہ ملا تھا لیکن وہ اس نور کو تو چھپا نہیں سکتے تھے جو عشقِ الٰہی اور عشق رسولؐ کے نتیجہ میں ان کے منہ پر برستا تھا حصرت بانی احمدیت نے کیا خوب فرمایا۔ ؎

ہر کہ عشقش دردل و جانش فتاد
ناگہاں جانے در ایمانش فتاد
عشق حق گردد عیاں بر روئے اُو

بوئے او آید زبام و کوئے اُو

شدید بیماری نے راہ روک لی ہے تو شاید کبھی ناغہ ہوا ہو ورنہ روزانہ ''بیت المبارک'' میں مغرب کی نماز ادا فرماتے جہاں پر حضرت فضل عمر بعد نماز مجلس عرفان میں رونق افروز ہوتے سبھی کی خواہش ہوتی کہ اگلی صفوں میں جگہ ملے لیکن یہ عجز کا پیکر ایسی خواہش سے بھی یکسر بیگانہ و بے نیاز ہے جوتیوں میں بیٹھنے کو جگہ ملی تو اسے وہی جگہ دل پسند ہے۔ ؎

یہ تیرا کرم کچھ کم نہیں مجھے در سے اپنے ہٹا نہ دے
صف نعل میں جو جگہ ملی تو جہاں ملی ہے وہیں سہی

صوفیاء نے لکھا ہے کہ تذلل وانکساری کا اختیار کرنا سلوک کی منازل طے کرنے کے لئے بہت ضروری ہے اور یہ سبق حضرت شیر علی کو خوب یاد تھا۔ حضرت مولوی صاحب کے علاوہ دیگر سینکڑوں بلکہ ہزاروں رفقاء کرام کی علیٰ قدر مراتب یہی شان تھی۔ ؎

فروتنی است دلیل رسیدگانِ کمال
کہ چوں سوار بہ منزل رسد پیادہ شود

یہ سب بزرگ آسمانِ روحانیت کے روشن ستارے تھے جنہوں نے اپنے دور میں کہکشاں کا ساسماں پیدا کر دیا تھا۔ ان کی بڑی بھاری اکثریت دنیا سے اُٹھ گئی ہے۔ باقی چند ایک ہیں جو وہ بھی چراغ سحری ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمروں میں بے انداز برکت دے۔ حضرت مولانا شیر علی کی شانِ عبودیت کی ایک جھلک بیان ہوئی۔

اب آپ کی فیض رساں دلداری اور شفقت علیٰ خلق اللہ کا بھی کچھ تذکرہ ہو جائے۔ آپ اولیاء اللہ کی اس صنف میں سے تھے جو خشک زاہد نہیں ہوتے بلکہ ان کے جسموں میں محبتوں کا امرت گردش کرتا رہتا ہے۔ یہ لوگ ایک شیریں چشمۂ رواں ہوتے ہیں جو اپنے تیز بہاؤ سے زرخیز زمینوں اور ثمر دار بستانوں کو ہی سیراب نہیں کرتے بلکہ بنجر کلر اور شور اراضیات کی بھی آبپاشی کرتے جاتے ہیں۔ ان کے در کا سائل کبھی نامراد نہیں لوٹتا۔

قادیان کے زمانہ قبل از تقسیم ملک کی بات ہے ایک شخص چوہدری مراد رانجھہ سکنہ نورانوالی تحصیل بھلوال 1947ء کے موسم گرما میں حضرت مولوی صاحب کے پاس جا مہمان ٹھہرا ہے وہ پہلے آپ سے متعارف نہ تھا۔ رانجھہ قوم کا واسطہ دیا ہوگا۔ ان دنوں جناب چوہدری عزیز احمد صاحب سرگودھا میں سب جج تعینات تھے۔ چوہدری مراد کو اپنے کسی تنازعہ کے سلسلہ میں جناب باجوہ صاحب کی امداد کی ضرورت تھی۔ آپ جوڈیشنل افسر کے نام خط دینا بھی پسند نہ فرماتے تھے اور چودھری مراد کی دلداری بھی بہرحال مطلوب تھی۔ چنانچہ آپ نے مجھے کالج سے بلوا کر محترم باجوہ صاحب کے نام خط دیا کہ میں باجوہ صاحب موصوف کو خط دوں اور گزارش کروں کہ کسی افسر

سے اسی کا کام اگر جائز سمجھیں تو کروادیں۔ چنانچہ میں یہ مکتوب گرامی لے کر سرگودھا پہنچا۔ مکرم باجوہ صاحب کو خط دیا اور زبانی پیغام بھی دیا۔ اس خط کا کاتب بھی اللہ تعالیٰ کے خاص چنیدہ دوستوں میں سے تھا اور مکتوب الیہ بھی بڑا ہی نیک سخت تقویٰ شعار اور فیض رساں شخص تھا۔ یہ چٹھی رسانی کی ڈیوٹی خود میرے لئے باعث برکت بن گئی کہ جناب باجوہ صاحب سے تعارف بڑھتا گیا اور آنمکرم نے برادر بزرگ کے طور پر میری تعلیم وتربیت میں دلچسپی لینا شروع کی اور جب میں نے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا تو تاکیدی خط کے ذریعہ مجھے گوجر خان طلب فرمایا جہاں پر کہ آپ تعینات تھے اور پھر عدالت کی کارروائی دیکھنے اور وکلاء کے دلائل سننے اور اُن سے تعارف حاصل کرنے کے انمول مواقع میسر آئے۔ جناب باجوہ صاحب کی یہ کرم فرمائیاں وکالت کا پیشہ شروع کرتے وقت میرے لئے راہنما ثابت ہوئیں لیکن ان سے بڑھ کر اس بزرگ اور عادل جج کی شبانہ روز دعائیں ہیں جن سے میں نے وافر حصہ پایا اور یہ سلسلہ اب تک قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی جناب پاک سے بہترین صلہ عطا فرمائے اور اس فرشتہ سیرت بزرگ حضرت مولانا شیر علی صاحب رانجھا کو اپنے قرب کا اعلیٰ ترین مقام عطا فرمائے اور ہم سب کو سلف صالحین کی حسنات کا حقیقی وارث بنائے۔

(روزنامہ الفضل ربوہ مورخہ 23/جولائی 1989ء صفحہ 3 تا4)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁



حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکی

تصوف اور روحانیت کا ایک بڑا نام

حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکی ہمارے دور کے علم ومعرفت تصوف وروحانیت کا ایک بڑا نام ہے۔ آپ کی ولادت موضع راجیکے تحصیل پھالیہ ضلع گجرات میں ہوئی۔ یہ گاؤں پھالیہ سے گجرات جانے والی سڑک پر پھالیہ سے پندرہ میل کی مسافت پر مین روڈ سے ڈیڑھ فرلانگ ہٹ کر ہے۔

کچھ عرصہ کی بات ہے میں سرگودہا سے گجرات جارہا تھا کہ مشہور قصبہ منگووال کے قریب سڑک پر ''راجیکے'' کا بورڈ دیکھتے ہی غیر شعوری طور پر میری موٹر کار رُک گئی اور میں اس گاؤں کے بلکہ اس سارے علاقے کی روح رواں، شش جہات صفات کے حامل عاشق الٰہی اور عاشق رسولؐ، علم ومعرفت کے سمندر، سادگی، خاکساری اور بے نفسی کے پیکر، مجسم دُعا، معجزات اور تائیدات سماوی کے شاہد ومشہود حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکی کی حسین یادوں میں کھو گیا۔ کچھ دیر سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر پُرانے بیتے ہوئے واقعات کی جگالی کرتا رہا۔ چشمِ تصور میں کبھی حضرت مولوی صاحب درس قرآن کریم کے دوران معارف لٹاتے نظر آئے تو کبھی کسی غم والم میں گھرے

ہوئے شخص کی درخواست پر دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا کر کمال عاجزی اور انکساری سے ربّ دو جہاں کے حضور فریاد کناں دکھائی دیئے۔

موضع راجیکے میں میری کوئی واقفیت نہیں تھی اور نہ ہی بھرے گاؤں میں میرا کوئی ہم خیال تھا تا ہم کشاں کشاں اس گاؤں چلا گیا میں نے حضرت مولوی صاحب کے رشتہ داروں سے ملاقات کی۔ آپ کا رہائشی مکان جو اب آپ کے بڑے بھائی میاں شرف دین صاحب کی اولاد کی ملکیت ہے وہ دیکھا پھر میں نے وہ مخصوص کمرہ دیکھنے کی خواہش کی جس میں حضرت مولوی صاحب آرام فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ میں نے سارا وقت اسی کمرہ میں ہی گزارا۔ حضرت موصوف کے عزیزوں نے بڑی محبت کا سلوک کیا اُنہوں نے اس کمرہ میں ایک پلنگ دکھایا جو مولوی صاحب نے خود اپنے لئے بنوایا تھا اور جب آپ راجیکے تشریف لاتے تو اسے استعمال فرماتے تھے۔ پھر میرے پوچھنے پر اُس ''بیت الذکر'' کی نشاندہی کی گئی جو عین آپ کے مکان کے سامنے تھی جہاں پر آپ نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ میں نے بھی اسی بیت الذکر میں ظہر اور عصر کی نمازیں ادا کیں۔

میں راجیکے گاؤں کی گلیوں میں گھوما پھرا مجھے اس گاؤں کے گلی کوچے بڑے ہی پیارے لگ رہے تھے اور وہاں کے لوگ بھی۔ کئی لوگوں سے ملاقاتیں کیں بعض ان میں سے حضرت موصوف کے رشتہ دار بھی تھے اور وہ عمر رسیدہ لوگ جو حضرت مولوی صاحب کے گاؤں میں ورود کے مواقع پر اکثر آپ کی صحبت صالحہ سے فیضیاب ہوتے تھے۔ حضرت مولوی صاحب کے برادر اکبر میاں شرف دین صاحب کی بہو مسماۃ حاکم بی بی صاحبہ بہت ہی بزرگ خاتون ہیں انہوں نے مادرانہ شفقت کا سلوک کیا اور اپنے نواسے خاور اعجاز جو کالج کے طالب علم ہیں کی موجودگی میں ملاقات کا شرف عطا کیا۔ یہی وہ نیک بخت خاتون ہیں جنہیں سب سے زیادہ آپ کے قرب اور خدمت کی سعادت نصیب ہوتی تھی۔ انہوں نے آپ کی فیاضی، انکساری، سادگی اور غربا پروری اور قبولیت دُعا کے بڑے دلکش واقعات سنائے اور جب وہ یہ واقعات سنا رہی تھیں تو ان پر اور چارکس حاضرین پر رقت اور ربودگی چھا گئی تھی۔ عزیز خاور اعجاز بھی بہت سعید نوجوان ہے مجھے اس میں خاندانی نجابت کی خوشبو آ رہی تھی۔ دونوں نے میرے ہاں سرگودہا میں آنے کی دعوت قبول فرمالی اور اسی اگست کے دوران لے کر آنے کا وعدہ کیا۔ میں نے محترمہ حاکم بی بی صاحبہ کے بیان فرمودہ واقعات نوٹ کر لئے تھے جو بڑے ہی ایمان افروز ہیں اور بے تکلفانہ گھریلو ماحول میں وقوع پذیر ہوئے اور اب تک کہیں طبع نہیں ہوئے اور نہ ہی کہیں بیان ہوئے۔ وہ ایک طویل مگر شیریں داستان ہے لیکن الفضل کے کالموں میں اتنی گنجائش نہیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے تو کسی اور ذریعہ سے بیان کروں گا۔

''راجیکے'' گاؤں مجھے ایک عام بستی نہیں لگ رہی تھی اس کے سنگ وخشت اور درودیوار نے مجھے ایک عجیب غیر مرئی کیف عطا کر دیا تھا۔ ایک طرف اس گاؤں کی خوش بختی پر رشک آیا کہ اس میں ایک خدا کا بہت پیارا بندہ پیدا ہوا اور انہی گلیوں میں پھرتا پھراتا جوان ہوا۔ آسمانی رسی پر اس کا ہاتھ جو پڑا تو اس نے بڑی عقیدت اور مضبوطی کے ساتھ اسے تھام لیا۔ ایسا کہ وہ وفا اور اخلاص کی علامت بن گیا

اوراس نے ایک ہی جست میں بڑی طویل اور کٹھن سلوک کی راہیں طے کرلیں۔ ؎

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

مجھے بتایا گیا کہ نواحی دیہات سعداللہ پور، دھدرہا اور گڈھووغیرہ میں آپ اکثر دعوت الی اللہ کے لئے جایا کرتے تھے اور کہ اطراف و جوانب میں ایک گاؤں بھی ایسا نہیں جس میں حق وصداقت کی تائید میں آسمانی نشانات نازل نہ ہوئے ہوں جن کی کسی قدر تفصیل ''حیات قدسی'' میں بھی ملتی ہے لیکن وہ تو صرف نمونہ مشتِ ازخروارے تھے۔

خالق سے پیار کی ایک روشن علامت مخلوق الٰہی سے محبت ہوتی ہے۔ اس مخلوق کے جذبۂ خیرخواہی سے مغلوب ہوکر یہ سادہ اور منکسر المزاج اللہ کا بندہ ٹھیٹھ دیہاتی لباس میں ملبوس، دیسی جوتی، کمر میں تہہ بند کھلا کرتہ اور سر پر عمامہ بھی نہیں بلکہ سادہ سی پگڑی لیکن اس غیر دلکش ظاہر کے حامل شخص کا باطن انتہائی خوبصورت، چہرے پر مقبولان الٰہی کی نورانی علامتیں لئے ہوئے کرہ ارض کا گز بنے مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب سارے غیر منقسم ہندوستان میں دیوانہ وار گھومے اور بڑی وارفتگی اور دلی تپش کے ساتھ مخلوق کو اپنے خالق سے ملانے کی کوشش کرتے رہے۔ اس میدان میں آپ کے کارہائے نمایاں کی فہرست بہت طویل ہے لیکن ایک ایک واقعہ آب زر سے لکھنے کے لائق۔

تقسیم ملک سے بہت پہلے کی بات ہے کہ میں نے آریہ سماج کے مقابل پر بھلوال میں آپ کو گوہرافشانی کرتے سُنا تھا۔ حضرت ملک عبدالرحمن صاحب خادم بھی آپ کے ساتھ تھے۔ ایک اجلاس سے قبل سر بازار آپ نے نماز پڑھائی تھی۔ اس نماز کا خاص ایک رنگ تھا اس کا دلگداز سوز آج تک نہیں بھولا۔

آپ کے علم کے کمالات کا بیان مجھ سے ہرگز ممکن نہیں ہے۔ پنجابی، اردو، فارسی اور عربی پر عبور تھا۔ ان میں تقریر وتحریر ایسی روانی سے فرماتے کہ گویا مادری زبانیں ہیں۔ پھر ان ساری زبانوں میں آپ کے پُر معارف اشعار بھی ملتے ہیں۔ اگر مخالف کبھی اپنے علم کی نمائش کرتا یا تکبر میں مبتلا ہوکر تعلّی کرتا نظر آیا تو آپ کی ایمانی غیرت نے اُسے سرِ مجلس للکار دیا اور اسی مجلس میں عربی منقوط، غیر منقوط اور کبھی مشری اور غیر مشری نثر اور نظم لکھنے کا چیلنج دے دیا۔ اس اللہ کے پیارے کو تو آسمانی تائیدات حاصل تھیں۔ مخالف بیچارہ بھلا کیا مقابلہ کرتا کہ وہ تو اس نعمت سے یکسر محروم ہوتا۔

پھر جہاں قرآنی علوم کا مقابلہ ہو تو قرآن نے خود ہی فیصلہ کردیا ہوا ہے کہ اس کے علوم مطہرِ بندے ہی حاصل کرسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے دور کا ''طاہر'' اور ''مطہر'' آسمانی اور قرآنی علوم کے خزائن لُٹا رہا ہے۔

اس کی ایک ایک تحریر اور تقریر معارف اور علوم کی ایک کان ہے اور اس کے مخالف سے جب کچھ بن نہیں پڑتا تو آتش حسد سے جل بھُن کر گالیوں پر اتر آتا ہے ؎

غرورِ زید نے سکھلا دیا ہے واعظ کو
کہ بندگانِ خدا پر زبان دراز کرے

اے کاش بے بصیرت لوگ یہ راز سمجھ لیتے کہ جسے خاک نشینی ہی نہ آتی ہو اس کے لئے عرش پروازی کا دعویٰ اس کی جان اور ایمان کے لئے زبردست خطرہ ہے۔ ؎

ایں نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ ایم

حضرت علامہ راجیکی صاحب کی نیک شہرت اور نامی ملک کی جغرافیائی سرحدوں سے آزاد ہو کر چار دانگ عالم میں پہنچ چکی ہے وہ شخص اپنی ذات میں ایک انجمن تھا لیکن سراپا کردار۔ کاش کوئی صاحبِ حال قلمکار آپ کی صحیح تصویر کشی کر سکے۔

جماعت احمدیہ کی تاریخ اُن عظیم المرتبت انسانوں سے بھری پڑی ہے جنہوں نے تپتے صحراؤں اور سنگلاخ زمینوں کو گلعذاروں اور سبزہ زاروں میں بدل دیا اور انہوں نے جو باغ اُگائے اور پودے لگائے انہیں اپنے خون سے سینچا ؎

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم
جنید و شبلی و عطار ھم مست

میں نے تقسیم ملک ہند سے 4 سال قبل کا عرصہ دارالامن والامان میں گزارا۔ ''رفقاء کرام'' کی کثیر تعداد زندہ موجود تھی۔ اپنا یہ حال تھا کہ کبھی ایک بزرگ کے قدموں میں جا بیٹھتا اور کبھی دوسرے محبوب الٰہی سے اکتساب فیض کرتا۔

کسی کی معصومیت کی داد دینا چاہی تو اسے ''فرشتہ'' کے نام سے پکارا کسی کی دین حق کے معرکہ میں للکار بھا گئی تو اسے ''غضنفر'' کا نام دیا اور ان سب کے ماتھے کا جھومر ''پسرش یادگار'' اور حسن و احسان میں اپنے مقدس باپ کا مثیل و نظیر جس کا نام بھی محمود تھا اور کام بھی محمود۔ غرض اس چمنستان کی بڑی دلفریب بہار دیکھی جو اب دنیا کے صفحہ پر ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ اب ایک ہی حسرت ہے اور ایک ہی تمنا کہ جب دم واپسیں آئے تو ہمارا گدا نواز آقا جو عفو بھی ہے اور غفور بھی ہمیں بغیر حساب اسی محفل میں جانے دے۔

(روزنامہ الفضل 10ستمبر 1989ء)

۞۞۞۞۞۞۞۞۞

کریم ابن کریم

حضرت سیّد محمد طیّب صاحب لطیف

علاقہ خوست میں دریائے شمل کے کنارے ''سید گاہ'' وہ بلند بخت گاؤں ہے جس میں ایک شخص پیدا ہوا جو عالی نسب بلند ظرف شجاع علم وفضل میں یکتا وفا اور ایثار کا پیکر تھا جس نے خاک وخوں میں غلطاں ہو کر ایک تاریخ ساز دور کی بنیاد رکھی جو قیامت تک کے لئے اللہ کی راہ میں جان کا نذرانہ پیش کرنے والوں کے لئے بہترین نمونہ اور روشن مشعل کا کام دیتا رہے گا۔ آپ کا نام نامی حضرت شہزادہ عبداللطیف صاحب تھا۔ جنہوں نے اپنی جان جانِ آفرین کے حضور جس دلیری اور خوشدلی سے پیش کی اس کی مثال نایاب ہے۔

زیر ایں موت است پنہاں صد حیات

میرے پاس وہ الفاظ کہاں کہ اس روشنی کے مینار کے اوصاف بیان کرسکوں اور اگر اس کی جسارت کروں بھی تو جبر و استبداد کی تعزیریں تلوار کی صورت سر پر لٹکتی نظر آتی ہیں۔ اے کاش میرا شکستہ قلم اُس پاکباز شہزادے کی تصویر کشی میں آزاد ہوتا کئی لوگوں کی مغلظات لکھنے والی قلمیں اور دشنام طرازی کرنے والی زبانیں تو جو چاہیں کریں لیکن میں اس پاک اور نیک فطرت شہزادے کا ذکر خیر کروں۔ حضرت موصوف کے بلند و بالا شانِ روحانی کا کچھ اندازہ اس سے کریں کہ حضرت سلطان القلم نے فرمایا:

''میں کن الفاظ سے اس بزرگ کی تعریف کروں جس نے اپنے مال اور آبرو اور جان کو میری پیروی میں یوں پھینک دیا کہ جس طرح کوئی رڈی چیز پھینک دی جاتی ہے''۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ 10)

پھر حضور انور نے اُس پاکباز شہزادے کو ان الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا۔

نقد جان از بہر جاناں باختہ
دل ازیں فانی سرا پرداختہ

(ترجمہ) اپنے معشوق کی خاطر اپنی جان لٹا دی اور اس فانی گھر سے دل کو موڑ لیا۔

بنگر ایں شوخی ازاں شیخ عجم
ایں بیاباں کرد طے از یک قدم

(ترجمہ) اس شیخ عجم کی یہ شوخی دیکھ کہ اس نے بیابان کو ایک ہی قدم میں طے کرلیا۔

ایں چنیں باید خدا را بندۂ

سرپئے دلدار خود افگندۂ

(ترجمہ) خدا کا بندہ ایسا ہی ہونا چاہئے جو اپنے دلربا کی خاطر اپنا سر اُڑا دے۔

اس بزرگ باپ کے بزرگ بیٹے حضرت صاحبزادہ سیّد حافظ محمد طیّب صاحب لطیف نے 1958ء کے موسم گرما کی ایک سہ پہر میرے گھر پر دستک دی۔ آپ کے ہمراہ حضرت سیّد عبداللطیف صاحب کے حقیقی بھتیجے صاحبزادہ عبدالرب صاحب بھی تھے۔ میں باہر نکلا تو دیکھا دو بزرگ کھڑے ہیں۔ پہلے باہم تعارف نہیں تھا۔ ان کے چہروں سے خاندانی نجابت اور ان کی پیشانیوں سے نورِ ایمانی کی چمک دمک دیکھی جو بقول نسیم سیفی بزبان حال کہہ رہی تھیں

کسی کے حُسنِ نظر کی کرنیں سجا رہی ہیں جبیں ہماری
جبھی تو ہم ہیں شفق کی سرخی جبھی تو رنگِ سحر ہیں یارو

میں انہیں اپنے گھر کے اندر لایا انہوں نے بتایا کہ وہ ربوہ سے آئے ہیں رہنے والے سرائے نورنگ ضلع بنوں کے ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ حضرت سیّد عبداللطیف صاحب کے خاندان سے؟ تو اثبات میں جواب ملا۔ تو میں سراپا تشکر بن گیا کہ کس بزرگ خاندان کے بزرگ میرے گھر تشریف فرما ہیں اور وہی حال ہوا جو نسیم سیفی صاحب موصوف نے کہا تھا

تم آؤ تو میں کاہکشاں رہ میں بچھادوں
بکھرے ہوئے تاروں کی ہر اک روک ہٹا کر

حضرت صاحبزادہ سیّد محمد طیّب صاحب نے سرگودھا میرے ہاں آنے کی غرض بتائی کہ صاحبزادہ عبدالرب صاحب کا پٹھان ملازم کسی مقدمہ اقدام قتل میں ماخوذ ہوا اور سرگودہا کی عدالت میں مقدمہ زیر تجویز تھا مجھے اس کی پیروی پر مامور کیا گیا۔ میں شکر بجالایا کہ ان عالی نسب بزرگوں سے تعارف کی راہ تو نکلی۔

عدو شرّے بر انگیزد کہ خیرے مادراں باشد

وہ پٹھان اقدام قتل کا ارتکاب نہ کرتا تو شاید میں خوست کے شہزادوں کے تعارف سے محروم ہی رہتا۔

دوسرے ہی روز میں نے خصوصی گزارش کر کے پٹھان کو ضمانت پر رہا کروایا اور ربوہ بھجوادیا پھر ان کی صلح ہوگئی اور مقدمہ خارج ہوا۔ میری یہ ناچیز خدمت اس پاکباز صاحبزادے کو بھا گئی ورنہ چند ٹکوں کے عوض بھی تو ہم وکیل لوگ یہ کام کر ہی دیتے ہیں۔ اس میں میری کوئی بقراطی نہیں تھی۔

اس کے بعد آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا اور میں بڑے عرصہ تک احسانات اور شفقت کے سلوک کا مورد رہا اور مجھے آپ کی

(صاحبزادہ صاحب موصوف کی) صحبت صالحہ کے انمول مواقع میسّر آئے۔ اکثر میرے ہاں قیام فرماتے اور اپنی شیریں بیانی سے نوازتے۔ میں نے مشاہدہ کیا کہ ان میں کمال کی بے نفسی، خودستائی اور خودنمائی سے سخت نفرت۔ حتّٰی کہ حضرت سیّد عبداللطیف صاحب کا پسر بھی ظاہر کرتے ہوئے حجاب محسوس کرتے تھے۔ میرے ساتھ شفقت و مودّت میں بے تکلفی کا رنگ آ گیا تھا۔ چنانچہ میں نے پوچھ ہی لیا کہ حضرت شہزادہ سیّد عبداللطیف صاحب کا بیٹا ہونا تو موجب صدافتخار ہے۔ آپ اس کے اظہار میں جھجکتے کیوں ہیں۔ فرمایا کہ میں اس نسبت کا ذکر کرتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کمزور انسان ہوں۔

عبادات دلی شوق اور خشوع و خضوع سے بجالاتے تھے بڑی عمر میں قرآن کریم حفظ کیا۔ ہمارے گھر قیام کے دوران امامت کرواتے۔ آپ کی نماز کا ایک ایک رکن، کیا قیام اور سجود اور کیا قعدہ سبھی ایک خاص عاشقانہ اور والہانہ رنگ رکھتے تھے جن کا بیان تو ناممکن ہے جنہوں نے مشاہدہ کیا وہ اسے عمر بھر بھول نہیں سکتے۔ قرآن کریم کی تلاوت کی بالکل جُدا گانہ طرز تھی وہ دلکش لحن اور لَے اور دلربا ترتیل پھر کہیں سننے میں نہیں آئی ممکن ہے آپ کے خاندان کے کسی فرد نے ورثہ میں پائی ہو۔ تلاوت قرآن کریم کے سامعین پر عجیب جذب و کیف کی حالت طاری ہوجاتی تھی اور آپ بھی کسی اور عالم میں ہی ہوتے تھے۔

حضرت اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گہرا عشق تھا جو آپ کی ہر ایک تحریر اور ہر بات سے ظاہر ہوتا تھا۔ بڑے مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔

میں نے بھی آپ کی دعاؤں سے بہت سارے فیوض حاصل کئے۔ جب جولائی 1903ء کو آپ کے والد بزرگوار کو سنگسار کیا گیا تو اس وقت آپ کی عمر آٹھ، نو برس کے قریب تھی۔ پھر اس مقدس خانزادہ کے باقی ماندہ سارے مظلوم افراد کو ترکستان کی طرف پاپیادہ جلا وطنی کا عرصہ گزارنے کے لئے طویل اور کٹھن سفر پر بھجوا دیا گیا۔ حضرت سیّد محمد طیّب صاحب بھی اس ستم رسیدہ قافلہ میں شامل تھے پھر جب کئی سالوں کے بعد واپس کابل بلوائے گئے تو ابھی وہاں غصّہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا اور انہیں جیل میں ڈال دیا گیا۔

فرماتے تھے چرخی پل کابل کا جیل خانہ ایک عقوبت خانہ تھا جو سخت غلیظ تھا۔ مچھروں اور حشرات الارض سے اٹا رہتا تھا جن کے کاٹنے سے جسم لہولہان رہتا تھا جس کی وجہ سے جیل میں سب کو شدید بخار رہتا تھا۔ کھانے کے لئے جو کچھ ملتا تھا وہ کھانا نہیں ہوتا تھا بلکہ کچھ اور ہی ہوتا تھا۔ غرض جیل میں ناقابل برداشت صعوبتیں اُن شہزادوں کو جھیلنا پڑیں جو ناز و نعم کے پلے ہوئے تھے اور جن کے مہمان خانہ میں پچاس، ساٹھ افراد روزانہ کھانا کھایا کرتے تھے۔ جب کبھی پیشی بھگتنے کے لئے جیل سے باہر لایا جاتا تو فاقہ کشی بیماری اور نقاہت کے باعث چند قدم چلنا بھی دشوار ہوتا تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ کو جب جیل سے کپڑے دھلوانے کے لئے پہنچائے گئے تو لہو سے لت پت کپڑے دیکھ کر صدمے سے سخت نڈھال ہوگئیں۔ 14ر جولائی 1903ء کے روز ان کے ابّا تو

نقد جاں از بہر جاناں باختہ

اپنی جان کا نذرانہ لے کر اپنے خالق و مالک کے حضور حاضر ہو گئے لیکن خاندان کے باقی افراد کی طرف سے سالہا سال تک روزانہ جانی قربانی پیش کی جاتی رہی۔ یہ تو موضع سیّدگاہ کے پاک خاندان کا مختصر تذکرہ تھا اور بھی چند نیک فطرت رُو بخدا اللہ کے پیارے راہِ حق میں متاعِ جان قربان کر گئے۔ لاریب وہ بڑے بلند نصیبے والا گروہ تھا جس نے اس راہ میں جان کی بازی لگا دی اور حق و صداقت پر بڑے عزم اور استقلال کے ساتھ ڈٹے رہے۔ یہ چند ''شاتان'' تھیں جو ذبح کی گئیں پر ان کے پائے ثبات میں تزلزل نہ آیا۔

ہمت مرداں نمودید آفریں صد آفریں
کشتہ گشتید و نگشتید از صراط المستقیم

صاحبزادہ سیّد محمد طیّب صاحب اپنے والد اور اپنے سمیت اپنے خاندان پر ڈھائے جانے والے مظالم بہت کم بیان فرماتے تھے بڑے اصرار کے ساتھ گزارش کی جاتی تو بیان فرماتے۔

ایک مرتبہ میرے ہاں سرگودھا میں قیام فرما تھے۔ چودھری قائم دین صاحب قائم مقام ڈپٹی کمشنر تھے۔ انہوں نے حضرت صاحبزادہ محمد طیّب صاحب کو اپنے ہاں مدعو کیا اور خواہش ظاہر کی۔ 14 / جولائی 1903ء اور اس کے بعد وقوع پذیر ہونے والے واقعات سنائیں۔ حضرت موصوف نے واقعات سنائے اور دوران گفتگو امیر حبیب اللہ خان کی تعریف کی کہ وہ شخص متعصب اور ظالم نہیں تھا ملّا کے دھوکے میں آ گیا تھا تو اس نے ظلم کئے۔ اس پر محترم چوہدری صاحب سخت متعجب ہوئے کہ یہ وہ شخص جس کا باپ قتل کیا گیا خود اس پر اور دوسرے افراد خاندان پر ہر قسم کے جبر و ستم روا رکھے گئے۔ قیمتی جائیدادیں چھین لیں۔ ان کی عمر کا طویل حصّہ جلاوطنی اور قید و بند میں گزرا جس دوران انہیں ناگفتنی مصائب جھیلنا پڑے مگر یہ خدا کا بندہ آج بھی اس ظالم کی تعریف کر رہا ہے۔

چوہدری صاحب فوت ہو چکے ہیں لیکن جتنا عرصہ اس ملاقات کے بعد وہ زندہ رہے بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ حضرت صاحبزادہ صاحب کا ذکر کرتے رہے۔ اپنے قاتل کی تعریف کرنا غایت درجہ بلند کردار کی علامت ہے اور اس کے ساتھ مال و جان کی قربانیاں بڑی دلیری کے ساتھ اور استقامت کے ساتھ پیش کرنے کے باوجود اپنے آپ کو لاشئے سمجھنا اولیاء اللہ کی شان ہے ؎

جنہیں ہے دعویٰ سرفرازی سروں پہ ان سب کے دھول ڈالو
کہ تاجِ سر ہے انہیں کا حصّہ جو راہ گزاروں میں خاک پا تھے

آؤ سب مل کر دُعا کریں کہ مقبولان الٰہی کی جو وردی سیّدنا حضرت شہزادہ عبداللطیف صاحب کو پہنائی گئی اور عزّ و شرف کا جو تاج آپ کے سر مبارک پر 14 / جولائی 1903ء کو سجایا گیا آپ کی اولاد اور ورثاء بلکہ ہم سب اس کے حفاظت کرنے والے ہوں اور جب کبھی اس

کی چمک دمک یا رعنائی میں کمی محسوس ہونے لگے تو اپنے خون سے اسے پھر صیقل کردیں۔

اے زمین و آسماں کے خالق و مالک ہمیں اس کی توفیق عطا فرما۔

رہے شاد تیری دنیا میرا دل دُکھانے والے
میرے اشک کر رہے ہیں یہ دُعا مچل مچل کے

(روزنامہ الفضل 7؍دسمبر 1989ء)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

جلسہ سالانہ قادیان 1989ء



قادیان میں دوسری صدی کے پہلے جلسہ میں شمولیت کے لئے 17؍دسمبر 1989ء کو قریباً 800 مرد و زن کا ایک قافلہ براستہ اٹاری لاہور سے روانہ ہوا میں بھی اس قافلے میں شامل تھا۔ ہمارا قافلہ ساڑھے بارہ بجے رات کے قریب قادیان پہنچا۔

قادیان سے کچھ دوست استقبال کے لئے اٹاری بھی پہنچے ہوئے تھے اور قادیان پہنچے تو جہاں بسوں کا قافلہ رکا وہاں بھی خدام تشریف لائے ہوئے تھے انہوں نے ہمارا سامان بسوں سے اتارنے اور جائے قیام پر پہنچانے میں مدد کی۔ جونہی قادیان پہنچے نعروں کی صداؤں سے فضا میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا۔ منارۃ المسیح اور احمدیہ محلہ میں چراغاں کا منظر بڑا دلفریب تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ہندو اور سکھ سبھی احمدیوں کی مسرتوں میں شریک ہیں اگر دنیا بھر میں ہر جگہ ایسی رواداری اور قوت برداشت پیدا ہو جائے تو فرقہ وارانہ فسادات کی کبھی نوبت نہ آئے۔ احمدیہ بازار میں بغیر کسی جُبہ دستار کے اور بغیر کسی شہ نشین کے ایک درویش شہزادے کو فٹ پاتھ پر بیٹھے دیکھا جہاں وہ مہمانوں کے قیام و طعام کے انتظامات کی نگرانی کر رہا تھا۔ دسمبر کی یخ بستہ رات ایک بجے کا وقت بڑا دل پسند تعجب ہوا لیکن معاً خیال آیا

کس باپ کا بیٹا ہے کس دادے کا پوتا ہے

اس کے دادا جان کو ربانی حکم ہوا تھا بہت لوگ آئیں گے حتیٰ کہ راستوں میں گڑھے پڑ جائیں گے نہ تھکنا اور نہ ماندہ ہونا اسے یہ صفات اور حسنات ورثے میں ملی تھیں۔

میں نے آگے بڑھ کر سلام کہا معانقہ ہوا اور مجھے اور میرے دو ساتھیوں کو ''الدار'' میں قیام کی خصوصی اجازت ہوئی۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

الدار پہنچے تو قلب وروح مسرتوں سے بھر گئے ایسا محسوس ہوا کہ ثریا پر پہنچ گئے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے کہ جب ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ضمانت دی تھی۔

ہمیں ایک کمرہ دیا گیا جس کے دائیں طرف وہ کمرہ تھا جس میں 12 رجنوری 1889ء کو حضرت فضل عمر کی پیدائش ہوئی تھی اور بائیں جانب وہ مبارک کمرہ جس میں سیدنا حضرت مسیح موعودؑ مورخہ 13 رفروری 1835ء کو بروز جمعہ پیدا ہوئے تھے۔ محترم صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب کا یہ احسان عمر بھر یاد رہے گا اور اس کا بدلہ دینے کی تو ہم میں ہرگز ہرگز استطاعت نہیں ہے ہمارے پاس بھلا وہ آسمانی نعماء کہاں؟ 1944ء میں جب میں قادیان کالج میں داخل ہوا تو میاں صاحب سے تعارف ہوا تھا آپ میرے ہم عمر تھے۔ اور بس

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
او بہ منزلہا رسید و ماہنوز آوارہ ایم

اس کمرہ میں چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں کھانے، چائے اور مزید بستر کے بارہ میں خادم نے دریافت کیا۔ ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی شکریہ ادا کیا وہ خادم دوبارہ آیا کہ ایک بستر اور لے لیں سردی بہت ہے۔ حضرت اقدس کے زمانہ کا وہ واقعہ آنکھوں کے آگے پھر گیا کہ مہمان توقع سے زیادہ آ گئے جاڑے کی رُت تھی مہمان خانے کا انتظام حضرت صاحب کے اپنے ہاتھ میں تھا۔ خادم بار بار آتا کہ مزید بستر درکار ہیں اور حضور نے جتنے بستر گھر میں موجود تھے سب اٹھوا دیئے حتیٰ کہ حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب کے لئے بھی اور خود حضرت اقدس کے لئے بھی کوئی بستر نہ بچا۔ مہمان خانے میں کسی خادم نے بھانپ لیا حضور کا اپنا بستر بھی مہمانوں کے لئے حضور نے بھجوا دیا ہے چنانچہ انہیں ندامت ہوئی اور وہ بستر لے کر حضور کے گھر پر پہنچے حضرت اقدس سے معذرت کی حضور نے فرمایا یہ بستر آپ لے جائیں ''محمود'' سو گیا ہے اور میں نے اس کے اوپر اپنا چغہ ڈال دیا ہے اور مجھے رات زیادہ نیند بھی نہیں آتی۔ آرام سے میری رات بسر ہو جائے گی اور اس وقت حضور دونوں ہاتھ سردی کی وجہ سے اپنی بغلوں میں دبائے کھڑے تھے۔ چنانچہ بستر واپس بھجوا دیا گیا اس کے علاوہ بھی دلداری، اکرام ضیف اور دلربائی کی کئی حسین مثالیں ذہن میں اس وقت بھی مستحضر ہیں سب کا بیان ممکن نہیں۔

برسوں کی گرد میں بھی وہ منظر دھلے رہے
دل پر کئے تھے نقش جو تیری نگاہ نے

''الدار'' کو ڈیڑھ صدی قبل اللہ حکیم وعلیم نے اپنی تجلیات کے لئے چن لیا تھا الٰہی نشانات ومعجزات اس کثرت سے اس مقامِ مبارک پر نازل ہوئے کہ موسلا دھار بارانِ رحمت سے بھی تشبیہ دیں تو یہ مثال ناقص اور کمتر ٹھہرے گی۔

ہم تین دن وہاں مقیم رہے اور اس کے در و دیوار پر نظریں جمی کی جمی رہیں۔ چشم تصور نے اللہ کے اس مقدس بندہ کو ٹہلتے ٹہلتے کبھی نظم اور کبھی نثر لکھتے دیکھا۔ روشنائی کی دوات ایک اونچے کونہ میں رکھی ہوئی ہے علم وعرفان کے لعل اور موتی چن چن کر گویا لڑی میں پرو رہے ہیں۔ جنہوں نے قلوب واذھان میں ایک روحانی انقلاب پیدا کر دیا۔ نگاہوں کے زاویے بدل ڈالے، رسوم ورواج جو گویا لوگوں کے گلے کا طوق بنے ہوئے تھے ایک ہی ضرب سے سب پاش پاش کر ڈالے اور ایک ایسا پاک معاشرہ عمل میں آیا جس کی اعلیٰ اور اکمل مثال قرونِ اولیٰ میں ہی ملتی ہے کبھی وہ لکھتا ہے ''اے میرے خدا اپنے منہ کے صدقے اپنے بندہ کی خبر لے ہم نے تمام دنیا کا ظلم برداشت کیا مگر تیری جدائی کی ہمیں برداشت نہیں''۔

کبھی وہ مژدہ سناتا ''کہ اب دینِ حق کے باغ میں پھل لگیں گے''۔

جذبات کا ہجوم اور خیالات کی بارات تھی پھر میں نے دیکھا کہ سیدہ حضرت اماں جانؓ یہاں ''الدار'' میں قیام فرما ہیں اور آپ کی مبشر اولاد بھی اسی الدار میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ حسن واحسان میں اپنے باپ کا مثیل ہے ہاں وہی جو جلد جلد بڑھا اور اسیروں کی رستگاری کا موجب ہوا جسے علوم ظاہری وباطنی سے پُر کیا گیا تھا۔

گزرا وہ جس چمن سے فضائیں مہک اٹھیں
بے کیف منظروں کو بھی رعنائی دے گیا

آپ کی یاد آئی تو ایک رات گئے بیت المبارک کی کھلی چھت پر چلا گیا۔ جہاں سیدنا حضرت فضلِ عمر مغرب وعشاء کی نمازوں کے درمیان مجلس عرفان میں جلوہ افروز ہوتے تھے کچھ دیر وہاں مجلس عرفان کا مزہ لیا بہت دیر وہاں اکیلا کھڑا رہا اس چھت کی شمالی جانب دروازے سے میرا محبوب راہ نما عطر بیزی کرتا ہوا نہ نکلا۔ پھر میں نے چھت کے ایک کونے میں جوتیوں کے پاس ایک بزرگ کو ڈھونڈا جو اللہ کی نگاہ میں بلند مقام ''فرشتہ'' تھا لیکن خاکساری اور عاجزی کا پیکر وہی جس نے ایک عید کے موقع پر جب حضرت اقدس مسیح موعودؑ نے باغ میں نماز عید پڑھائی تو اپنی سفید دھلی ہوئی پگڑی کے شملہ سے حضور کی جوتیوں پر سے گرد صاف کی شاید اس اعزاز کے پانے کی وجہ سے ہی اسے جوتیوں کے پاس بیٹھنے میں سکون ملتا تھا۔ یوں بھی آگے بڑھ بڑھ کر بیٹھنا اسے فطرتاً ناپسند تھا۔ میری حسرتیں بڑھتی گئیں مجھے نہ وہاں آقا نظر آیا نہ کوئی غلام۔

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

ہم بھی آسمانوں کے کنگروں تک اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور حضرت رسول عربی ﷺ کی صداقت کی آواز پہنچانا چاہتے ہیں۔ میں ابھی بیت المبارک کی چھت پر حضور کے زمانے کے روح پرور واقعات کی جگالی کر رہا تھا سردی سے ٹھٹھر رہا تھا لیکن اس یادگار مقام سے نیچے آنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ 19/دسمبر کی ٹھنڈی رات نصف شب سے قبل دل و دماغ پوری طرح سیدنا حضرت فضل عمر کی یاد کی گرفت میں تھے۔

یہ دل ذرا سا دل تری یادوں میں کھو گیا
ذرّے کو آندھیوں کا سہارا ہے ان دنوں
تم آسکو تو شب کو بڑھا دوں کچھ اور بھی
اپنے کہے میں صبح کا تارا ہے ان دنوں

میں الدار کے معزز اور مبشر باسیوں کا ذکر کر رہا تھا حالات کی مجبوری تھی بات دور نکل گئی مجھے وہاں ایک ''چاند'' بھی نظر آیا جسے اپنے ''سلطان القلم'' مقدس باپ سے ''قلم'' ورثے میں عطا ہوا تھا اس قلم سے نکلی ہوئی ہر ایک تحریر ہر ایک مضمون اور ہر ایک تصنیف لاجواب ثابت ہوئی اسے اپنے اور اپنے باپ کے آقا و مطاع حضرت سیدنا مکی و مدنی ﷺ سے سچا عشق تھا اور اس کا اظہار اکثر ہوتا رہا لیکن اس کی عدیم المثال تصنیف ''سیرت خاتم النبیین'' اس کے عشق صادق کی شاہد ہے۔ سیرت کی یہ کتب فاضل مصنف نے حضور ﷺ کے عشق میں ڈوب کر لکھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے اسے اس ''قمر'' کے طلوع ہونے سے قبل علم تھا کہ یہ رسول اللہ کا عاشق صادق ہوگا۔

اس سال جلسہ سالانہ قادیان کے منتظمین کے اندازے کے مطابق گذشتہ برس کے جلسہ کے مقابل پر تین گنا مہمان آئے تھے۔ مہمانوں کی یہ کثرت کئی وجوہات کی بناء پر تھی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہجر و فراق میں ماہ و سال گذارنے والوں نے ایک حسین خواب دیکھ رکھا تھا۔

جانی پہچانی سی خوشبو ہے فضا میں زاہد
زلف محبوب یقینا کہیں لہرائی ہے

مگر ان خوابوں کی تعبیر کب ظاہر ہوگی اسے عالم الغیب والشہادۃ ہی جانے۔

اب جی رہے ہیں ہجر کی تاریکیوں کے ساتھ
مدت ہوئی ہے دوستو وصل سحر ہوئے

جب زیارت محبوب کی خواہش پوری ہوتی نظر نہ آئی تو کسی کا یہ شعر مستعار لے کر اسے ہی اپنی درخواست بنالیا۔

بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم
پس ازاں کہ من نہ مانم باچہ کار خواہی آمد

بیت المبارک میں خواتین اور بیت الاقصیٰ میں مردوں کے لئے نمازوں اور باجماعت تہجد کا انتظام تھا رات گئے مردوں کو بیت المبارک اوراس کے ساتھ بیت الدعا جانے کی اجازت ہوتی تھی اس وقت مستورات کا داخلہ ادھر ممنوع تھا۔ بیت الدعا میں ایک شب دو نفل ادا کرنے کا موقع اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا اللہ تعالیٰ کی شان کریمی اور گدا نوازی سے کیا بعید جو ہم جیسے گناہ گاروں کی مناجات بھی قبول فرما کر ہمیشہ ہمیش کے لئے راضی ہوجائے۔ اور ہمیں ہر قسم کی نافرمانی اور بے وفائی کرنے سے محفوظ رکھے۔

جلسہ گاہ محلہ ناصر آباد جو بہشتی مقبرہ کے قریب ہے کے وسیع احاطہ میں تھا جب کہ عورتوں کا جلسہ گاہ بہشتی مقبرہ سے ملحق باغ میں۔ تقاریر کا معیار بہت اعلیٰ ایک سے ایک بڑھ کر کس کس کا ذکر کیا جائے۔

فیضان خاتم النبیین پر صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب کی تقریر بڑی فاضلانہ تھی اگرچہ زبان سلیس تھی مگر جذب وکیف میں ڈوبی ہوئی تھی اور ایسی محویت سے تقریر کی گئی اور سنی گئی کہ مسلسل درود شریف کا ورد جاری رہا اور آنکھیں بھیگی رہیں۔ ظہر عصر کی نمازیں جلسہ گاہ میں اور باقی تین نمازیں بیت الاقصیٰ میں صاحبزادہ صاحب موصوف پڑھاتے تھے۔ قرآن کریم کے مختلف مقامات سے تلاوت کرتے اور اس میں سوز، عمدہ ترتیل اور سادگی غرض یہ کہ ہر خوبی موجود ہوتی۔ پھر ماحول روح پرور۔ یہ چند دن جو کہ مرکز سلسلہ میں گزارے زندگی کے یادگار دن تھے۔ روحیں پگھل پگھل کر آستانہ الوہیت پر بہہ رہی تھیں۔ حاضرین جلسہ کی عبادات میں خشوع وخضوع مناجات میں الحاح اور درد وکرب کا منظر دیدنی تھا۔ وہی لوگ اس قلبی ارادات کو سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے کبھی اس کوچہ میں قدم رکھا ہو۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

قلم اس کیف ووجدان کا حال بیان کرنے سے عاجز ہے۔

جلسہ میں سکھ معززین بہت آتے رہے ایک سکھ نے تو ہمارے ایک دوست کو بتایا تھا کہ ظہر عصر کی نمازیں ہمارے ساتھ صاحبزادہ صاحب موصوف کی اقتداء میں پڑھیں اور معمر سکھ دوست کو میں نے دیکھا کہ ہاتھ میں لاٹھی لئے ہمارے سامنے سے گزر کر سٹیج کی طرف بڑھے جہاں پر صاحبزادہ میاں وسیم احمد صاحب بیٹھے تھے۔ جوں ہی میاں صاحب پر اس سکھ بزرگ کی نگاہ پڑی تو ہاتھ سے سوٹی نیچے زمین پر رکھ دی اور میاں صاحب کو اپنے طریق پر دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ میاں صاحب اٹھے اور ان کا ہاتھ پکڑ لیا تو اس بوڑھے سکھ نے میاں صاحب کے ہاتھ کے بوسے لئے۔ مختصر کوئی بات کی اور پھر واپس آ کر اپنی لاٹھی سنبھالی اور اسے لے کر جلسہ کے پنڈال میں جا بیٹھے۔

جلسہ گاہ کی کارروائی سے قبل حضرت صاحب کا ایک خصوصی روح پرور پیغام پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ پھر حضور انور کی ارسال کردہ میاں محمد بخش صاحب کے پنجابی کے منتخب اشعار پر مشتمل ایک کیسٹ بھی سنائی گئی۔

پہلے بھی حضور نے میاں محمد بخش صاحب کے شعر

دشمن مرے تے خوشی نہ کریئے سجنا وی مر جانا
ڈیگر تے دن گیا محمد اوڑک نوں ڈب جاناں

کے پہلے مصرعہ سے ایک خطبہ شروع فرمایا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضور انور جناب میاں محمد بخش صاحب کے کلام کو پسند فرماتے ہیں چنانچہ واپس وطن پہنچتے ہی آپ کے مستند اور مصدقہ کلام کی تلاش شروع کی اور اس سلسلہ میں جہلم اور کھڑی شریف آزاد کشمیر جانا بھی ضروری ہو گیا ہے۔ جو اس پنجابی صوفی شاعر کا مدفن ہے۔

19ر دسمبر کی رات بیت الاقصیٰ میں جناب چوہدری شبیر احمد صاحب وکیل المال کی زیر صدارت ایک محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی ربوہ سے صدر مجلس کے علاوہ راجہ نذیر احمد صاحب ظفر کی نعت بہت پسند کی گئی۔ مقبوضہ کشمیر سے آئے ہوئے احمدی شعراء کے کلام نے بہت داد لوٹی۔ کراچی سے ہمارے مایہ ناز شاعر جناب عبید اللہ صاحب علیم کے کلام کی بے حد مقبولیت کے باعث انہیں دو نظمیں پڑھنے کی خصوصی اجازت صدر مجلس نے دی۔ سب شعراء کرام کے اسماء گرامی بھی یاد نہیں۔ کلام ایک سے ایک کا بڑھ کر تھا۔

یہ ایک یادگار مشاعرہ تھا۔ حشو وزوائد سے پاک کلام دردمند دلوں کی صدا دلوں سے نکلی اور سیدھی دلوں پر جا اتری۔ اے کاش اس روح پرور اور ایمان افروز محفل کی کارروائی ریکارڈ ہو سکی ہوتی تو میں اپنے ٹیڑھے میڑھے الفاظ کی تائید میں اسے پیش کر دیتا۔

20ر دسمبر کو جلسہ کا آخری دن تھا۔ صبح ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ چنانچہ مردانہ جلسہ کی کارروائی بیت الاقصیٰ میں اور زنانہ جلسہ کی کارروائی بیت المبارک میں ہوئی اختتامی خطاب محترم صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب ناظرِ اعلیٰ کا تھا وہی اس اجلاس کی کارروائی کے دوران صدر مجلس تھے۔ آپ کا خطاب بڑا جامع لیکن موسم کی خرابی کے باعث مختصر تھا۔

آخر میں اختتامی دعا ہوئی۔ دعا شروع کرانے سے قبل اپنے اور ہم سب کے محبوب کی بانیلِ مرام واپسی کے لئے بڑے موثر اور درد انگیز الفاظ میں تحریک کی اور یہی سب سامعین کے دل کی آواز تھی۔

دگر بہار نہ باشد مرا بہار توئی

پھر کیا ضبط کہ سب بندھن ٹوٹ گئے۔ مرغان بسمل کی تڑپ دیدنی تھی اپنے سمیع و مجیب مالک سے بہت کچھ مانگا اور یقین ہے کہ وہ بے حساب عطا کرے گا۔ 21ر دسمبر کو دو بسوں پر مشتمل 90ر افراد کا قافلہ 9 بجے صبح کے قریب قادیان سے روانہ ہوا۔ صاحبزادہ صاحب موصوف مہمانوں کو الوداع کہنے کے لئے اس جگہ جہاں بسیں کھڑی تھیں تشریف لائے ہر ایک مہمان سے ملاقات کی اور جب

روانگی کے لئے قافلہ تیار ہو گیا تو آپ ہی نے دعا کروائی اور یہ قافلہ بار بار قادیان آنے کی تمنائیں مہجور دلوں میں لئے روانہ ہوا بہت دور تک قادیان کے در و دیوار نظر آتے رہے پھر آگے کئی میل تک مینارہ ......ضوفشانی کرتا رہا اور نظریں مسلسل اسی پر جمی رہیں اس دوران دلوں سے بڑی دردمندی کے ساتھ دعائیں نکلتی رہیں۔ تین دن قبل ہمارا قادیان پہنچنا بھی عجیب ایک روحانی کیف عطا کر گیا تھا اور 21 دسمبر کو وہاں سے واپسی ایک گونہ مستی کے عالم میں ہو رہی تھی۔ اس روز مرزا غالب کا قول بڑا موزوں اور پیارا لگ رہا تھا۔

وداع و وصل جداگانہ لذّتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

(روزنامہ الفضل 28 فروری 1990ء صفحہ 5 تا 6)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

جہلم کا ایک سفر



مرزا عبداللطیف صاحب کا ایک مضمون ''ایک سفر'' کے عنوان سے الفضل 10 مئی 1990ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے جس میں حضرت مولوی برہان الدین صاحب جہلمی کا بھی ذکر تھا اور حضرت مسیح موعودؑ کے ایک فوجداری مقدمہ کا بھی جو حضور کے خلاف جہلم کی عدالت میں زیر سماعت رہا۔

اس مضمون میں مرزا عبداللطیف صاحب نے لکھا کہ حضور انور کے خلاف مقدمہ کی اصل مسل تو دفتری ضابطہ کے مطابق ایک عرصہ گزرنے کے بعد تلف ہو چکی ہے لیکن اس مسل کا اندراج موجود ہے۔

دفتری یہی صورت حال ہوتی ہے کہ بعض دائمی امسلہ ہوتی ہیں اور تلف نہیں کی جاتیں اور غیر دائمی امسلہ ایک عرصہ گزرنے کے بعد تلف کر دی جاتی ہیں لیکن خلاصۂ احکام۔ الزام علیہ کا نام و پتہ جرم جس کے تحت کارروائی کی گئی اور نتیجہ آخیر ایک رجسٹر میں درج کر لیا جاتا ہے۔

جہلم کے کوئی دوست اگر یہ کوائف ہی حاصل کر کے شائع کروا دیں تو ازدیادِ علم کے علاوہ قلب و روح کی بالیدگی کا بھی موجب ہو گا خصوصاً آجکل یہ تفصیلات بہت ضروری ہیں تا ہمارے دوست ان کا مطالعہ کر کے اپنی یادیں تازہ کر لیں کہ وہ ہی نہیں اُن کا آقا بھی ناکردہ جرائم میں ملوث کیا گیا تھا اور مخالفین کی شدید تڑپ تھی کہ حضور کو عدالتوں میں گھسیٹ کر نعوذ باللہ رُسوا کریں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے

بندوں کے خلاف ہر قسم کے مکر کو ناکام بنا دیتا ہے اور بدخواہ ہمیشہ ہی نامراد رہتے ہیں۔

ہمارے ایک دوست مکرم قریشی ضیاء الدین صاحب ایڈووکیٹ ہوتے تھے۔ فوت ہو چکے ہیں۔ انہوں نے حضرت اقدس کے خلاف مقدمات کی امسلہ کی نقول حاصل کر کے انہیں شائع کرنے کا بیڑہ اُٹھایا تھا لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ یہ کام ادھورا چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو گئے کافی عرصہ قبل مجھے ملے تھے اور انہوں نے اس سلسلہ میں اپنی کاوشوں کا ذکر کیا تھا اس کے لئے انہوں نے ویزا لے کر ہندوستان کا سفر بھی اختیار کیا تھا اور بہت محنت کر کے مقدمات کی نقول حاصل کی تھیں وہ جہلم بھی اس سلسلہ میں گئے تھے۔ کاش ان کا اکٹھا کیا ہوا مواد ان کے ورثاء یا اور کوئی صاحبِ دل شائع کر دے تو بلا شبہ یہ ایک تاریخی کارنامہ ہوگا۔ مرزا صاحب کے مضمون میں یہ روایت بھی درج ہے کہ ضلع کچہری جہلم کے احاطہ میں ایک پرانا بڑ کا درخت ہے جس کے سائے میں حضور مقدمہ کی پیشی بھگتنے کے انتظار میں تشریف فرما ہوتے تھے۔ یہ گرمیوں کا موسم ہوگا اور میں نے تاریخ میں پڑھا ہے کہ ایک مرتبہ تو 17 رجنوری 1903ء کے روز حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ جہلم میں تشریف فرما تھے اور اس سفر میں آپ کے ایک جان نثار اور معزز رفیق حضرت شہزادہ سیّد عبداللطیف صاحب رئیس آف خوست بھی آپ کے ہمرکاب تھے۔ ظاہر ہے یہ جاڑے کی رُت تھی۔ نہ معلوم اس مقدمہ کی کارروائی کتنی طوالانی تھی۔

الغرض گرمیوں میں عدالت کے انتظار میں بڑ کے درخت کے نیچے حضور کے رونق افروز ہونے کی شہادت تو میسر آ گئی لیکن سردیوں میں حضور جس مقام پر تشریف فرما رہے آج کون ہوگا جو اس مقام کی نشاندہی کرے؟

(روزنامہ الفضل 30 راکتوبر 1990ء صفحہ 5)

۞۞۞۞۞۞۞۞۞

مکرمہ سردار بیگم صاحبہ

موت سے رستگاری نہیں لیکن الٰہی تقدیر کے مطابق میرے صدمات میں وقفے بھی نہ پڑے۔ مَیں دو بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں۔ تھوڑے عرصے میں دونوں بہت پیار کرنے والی، میرے لئے دعائیں کرنے والی بہنیں داغ فرقت دے گئیں اور مَیں تنہائی کا شکار ہوں۔ بڑی بہن زینب بیگم قریباً ایک سال قبل فوت ہوئیں اور آپا سردار بیگم 25 رنومبر 1990ء کو دارِ فانی سے عالم بقا کو روانہ ہوئیں۔ ہر شئے فانی ہے۔ بس رب ذوالجلال کا نام ہی باقی رہے گا۔

کچھ عرصہ سے بیمار تھیں۔ وفات سے دس بارہ روز قبل میں اپنی بہو بیٹیوں کو لے کر ربوہ حاضر ہوا۔ اپنے ہمراہ سرگودھا لے آنے اور علاج کروانے کی خواہش ظاہر کی۔ خدا کی قدرت اس روز طبیعت بہت بہتر تھی۔ خود ہی بتایا کہ ناصر دواخانہ ربوہ سے دوائیاں منگوائی ہیں

جن سے بہت افاقہ ہے۔ان کا اکلوتا بیٹا عزیز بشارت احمد لندن میں مقیم تھا۔اسے بھی فون پر تسلی دینے کی تاکید کی۔ہم سبھی خوش تھے کہ بحالیٔ صحت کے نمایاں آثار تھے۔اس کے تین چار روز بعد پھر پیغام آیا کہ بشارت احمد کو فون کر کے بلالیں۔اس سے قدرتی طور پر تشویش ہوئی چنانچہ ہم سبھی 23؍نومبر کو ملنے ربوہ حاضر ہو گئے۔اسی روز علی الصبح عزیز بشارت احمد پہنچ چکا تھا۔ہمیں ماں بیٹے کی ملاقات کی گھڑیوں کا حال بتایا گیا اس کی منظر کشی کی تو قلم میں طاقت نہیں وہ بظاہر وصل کی حالت دائمی جدائی اور فراق کی خبر دے رہی تھی۔بقول غالب ؎

ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

اس روز کافی دیر میں آپا کے پاس بیٹھا رہا۔چند لمحوں کے لئے الگ ہوا تو فوراً بلوا کر سامنے بٹھالیا۔کچھ دل کی باتیں کہہ ڈالیں جنہوں نے مجھے بے حد افسردہ کر دیا۔زبان سے باتیں تو کم ہوئیں۔خاموش نگاہوں نے بہت کچھ سنا دیا۔میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں پہلی سی چمک نہیں تھی جیسے اندر کچھ بجھ سا گیا تھا۔ان نظروں میں حسرت بھی تھی پیار بھی تھا۔پیغام اور وصایا بھی تھیں۔ایک قسم کی وارننگ بھی تھی۔میں غم کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔سوچ رہا تھا کہ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے خود ہی انہوں نے منجدھار میں کشتی کھینچنے سے ہاتھ کھینچ لیا ہے اور اپنے آپ کو طوفانی لہروں کے سپرد کر دیا ہے۔مجھے ان سے بے پناہ محبت ملی تھی۔اس محبت کے وزن کے نیچے پسا ہوا محسوس کرتا تھا۔دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ ؎

غم حیات سے فرصت کبھی ملی تو مَیں
تری نظر کے سوال و جواب لکھوں گا

ضبط کے بندھن ٹوٹ رہے تھے میں نے اس حالت کو چھپانے کی بہتیری ناکام کوشش کی۔

میں آپا سے عمر میں چھوٹا تھا بہت دعائیں لیں۔پیارلوٹا اب میرے ماں باپ کی آخری نشانی مجھے اکیلا چھوڑ چلی تھی۔ان کی بیماری میں ان کے بیٹے بشارت احمد اور دونوں بیٹیوں سلیم اختر اور نصرت نے بڑی جاں فشانی سے خدمت کی۔اللہ کریم ان تینوں کو اپنی شفقت کی گود میں لے لے۔وہی ہمارا آخری سہارا ہے۔

میری یہ بہن عبادات بڑے شوق سے کیا کرتی تھیں۔قرآن کریم سے تو عشق تھا ساری عمر بچیوں کو قرآن پڑھایا۔بچپن میں کچھ عرصہ عمویم مکرم حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کے زیر سایہ قادیان میں خانگی طور پر تعلیم و تربیت حاصل کی۔قرآن کریم پڑھانے کا شوق اسی مقام پاک سے نصیب ہوا۔دل حساس تھا مگر ہر قسم کے تعصّبات سے پاک۔دشمنوں سے بھی بہتر سلوک روا رکھا۔میں اپنی زندگی میں پُرنم آنکھوں سے بڑے حسین اور پیاروں کو دل پر پتھر رکھ کر خدا حافظ کہہ چکا ہوں۔دل حزیں پر یہ بوجھ بڑھتے ہی جا رہے ہیں جبکہ

صدمات کے برداشت کی طاقت گھٹتی جا رہی ہے۔ میں ان غموں کے بوجھ تلے دب کر ختم ہو گیا ہوتا۔ ؎

’پر خدا کا ہاتھ اب اس دل کے ٹھہرانے کو ہے‘

کسی کہنے والے نے تو موت کے پے بہ پے صدمات آنے پر کہہ دیا تھا۔ ؎

دل محترم کوئی اَور غم غمِ رفتگاں نہیں چاہئے

مگر میں تو یہ نہیں کہتا کیونکہ مجھے کسی ''اور غم'' کے جھیلنے کی کہاں تاب ہے جو میں اپنے ذرہ نواز آسمانی آقا سے التجا کرتا ہوں کہ اب ہمیں ''کوئی غم'' نہ دے کہ یہ بھی تیری قدرت کاملہ سے ہرگز بعید نہیں ہے۔ ؎

ہمیں بس ہے تری درگہ پہ آنا
مصیبت سے ہمیں ہر دم بچانا

کہ تیرا نام ہے غفار و ہادی 25 رنومبر اتوار کا دن تھا 12 بجے کے قریب فون پر یہ المناک خبر ملی کہ آپا جان نے موت پر کمند پھینک دی ہے۔ دُور ونزدیک سب عزیزوں کو فون کئے۔ ہم سب گھر کے افراد ربوہ پہنچے۔ ادھر آبائی گاؤں ہلال پور اور ننھیال کے قصبہ للیانی سے اعزہ کثیر تعداد میں پہنچ گئے۔ غسل کے بعد کفن میں ملبوس ہوئیں تو بوجھل دل کے ساتھ آخری ملاقات کے لئے حاضر ہوا مگر وہ ہاتھ مجھے پیار کرنے کے لئے نہ اُٹھ سکے اور یہ حسرت میرے سینے میں پھانس کی طرح اٹک گئی۔ ؎

نہ طریق آشنائی نہ رسوم جام و بادہ

چہرہ دیکھا تو اس پر کھیلتی ہوئی طمانیت بتا رہی تھی کہ بہتر دنیا سے بلاوا آنے پر روح کو تسکین نصیب ہوئی ہے اور موت کی وادی میں اس طرح خوش دلی سے جا گھسیں جس طرح دن بھر کی مشقت کا ٹوٹا ہوا راہی ایسے گھر پہنچ جائے جہاں اس کے عزیز اسے خوش آمدید کہنے کے لئے منتظر کھڑے ہوں۔

میں قارئین کرام سے بصد منت درخواست کرتا ہوں کہ دعا کریں اللہ تعالیٰ میری بہن کے درجات بلند کرے اور پسماندگان کا ہمیشہ حافظ و مددگار رہے۔ اے خدا تو ایسا ہی کر۔ ؎

گزر تو جائے گی تیرے بغیر بھی لیکن
بہت اداس بہت بے قرار گزرے گی

(روزنامہ الفضل ربوہ مورخہ 15 ردسمبر 1990ء صفحہ 7)

۞۞۞۞۞۞۞۞۞

حسن رضا گردیزی سے ایک ملاقات

روزنامہ الفضل کی 30 ستمبر 1990ء کی اشاعت میں محترم مولانا محمد منور صاحب کا ایک مضمون بعنوان ''دو احمدی دکاندار'' شائع ہوا جس میں غلام رسول صاحب افغان شیر فروش قادیان اور جناب مولانا خورشید احمد صاحب مالک خورشید یونانی دواخانہ ربوہ کی تجارت اور بیع وشریٰ کے سلسلہ میں دیانتداری کی مثالیں بیان کیں۔

تجارت، کاروبار اور ملازمتوں میں اللہ کے فضل سے ہمارے بھائیوں اور بزرگوں نے بڑی ایمان افروز اور رُوح پرور روشن روایات قائم کی ہیں۔ اگر ان کا یکجائی طور پر ریکارڈ تیار کر لیا جائے تو آنے والی نسلوں کے لئے نہایت نیک نمونہ اور مشعلِ راہ ثابت ہوں گی۔

مجھے ایک غیر از جماعت دوست مکرم سیّد حسن رضا صاحب گردیزی کے ایسے ہی دو بیان کردہ وہ واقعات یاد آتے ہیں جناب گردیزی صاحب جب چنیوٹ میں تحصیلدار تھے، بڑے علم دوست، شاعر اور ادیب، سرکاری فرائض سے فارغ ہو کر بس میں بیٹھ کر ربوہ پہنچ جاتے۔ وہاں پر حضرت سیّد مختار احمد صاحب شاہ جہاں پوری سے اپنے اشعار کی اصلاح لیتے۔ علم وادب کی محفل جمتی۔ اُس سے مستفید اور محظوظ ہوتے۔

پھر سیّدنا حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب کے گھر تشریف لے جاتے۔ حضرت صاحب کے ماموں کے ساتھ گردیزی صاحب کے دوستانہ تعلقات تھے۔ اس نسبت سے حضور سے شفقت اور محبت سے پیش آتے۔ محترم گردیزی صاحب پہلے تحصیل بھلوال میں بھی تحصیلدار رہ چکے تھے اور میرے واقف تھے اس لئے جب سرگودھا تشریف آوری ہوتی مجھے شرف ملاقات بخشتے۔ مَیں بھی جب ملتان جاتا انہیں ضرور ملتا۔ کچھ عرصہ قبل میرا جب ملتان جانا ہوا تو اپنے ایک سول جج دوست کے ساتھ محترم گردیزی صاحب کی ملاقات کی غرض سے اُن کے مکان پر حاضر ہوا۔ وہاں بھی ایک مجلس اپنے عروج پر تھی۔ گویا دربارِ عام تھا۔ حاضرین مجلس سے میرا تعارف کرایا اور پھر ربوہ کا ذکر شروع کر دیا۔ اوّل تو اپنے اکلوتے بیٹے حیدر عباس صاحب کا ذکر چھیڑا کہ وہ سکول سے بھاگ کھڑا ہوا تھا، تعلیم سے یکسر لا پرواہ۔ گردیزی صاحب قدرتی طور پر سخت پریشان تھے کہ بقول گردیزی صاحب فرشتے کی شکل میں ایک انسان ظاہر ہوا اُس نے سیّد حیدر عباس کو تعلیم کی راہ پر چلانے کی حامی بھری۔ پہلے تو گردیزی صاحب کو یقین ہی نہ آیا کہ وہ کیونکر ایسی معجزنما تبدیلی لا سکتے ہیں لیکن پھر اُسے اتالیق بنانے پر رضامند ہو گئے وہ اتالیق تھے مولانا محمد اشرف صاحب (داماد حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب ہلال پوری) گردیزی صاحب نے مشاہدہ کیا کہ دن کے وقت وہ اُن کے بیٹے کو تعلیم دیتے رات کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ کے حضور تضرعانہ دُعائیں کرتے۔ چنانچہ اللہ مجیب الدعوات نے مولوی صاحب موصوف کی دُعائیں قبول فرمائیں اور حیدر عباس بڑے اچھے نمبروں پر میٹرک میں کامیاب ہؤا اور پھر کالج میں بھی کامیابی سے تعلیم مکمل کی۔

دوسرا واقعہ اسی مجلس میں محترم گردیزی صاحب نے سنایا۔فرمایا کہ مَیں اکثر چنیوٹ سے ربوہ اپنی علمی اورادبی تشنگی کی تسکین کے لئے آیا کرتا تھا۔حضرت سیّد حافظ مختار احمد صاحب شاہجہانپوری کے علم وفضل کے کئی واقعات حاضرین کو سنائے پھر فرمایا کہ کام ودہن کی آزمائش کے لئے حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب کے در دولت پر حاضر ہوتا وہاں حضور ہمیشہ ہی مشروبات وماکولات سے تواضع فرماتے۔ ایک روز اڈا لاریاں ربوہ سے بس سے اُتر کر تانگہ لیا کوچوان کو پہلے صاحبزادہ صاحب موصوف کی کوٹھی پر جانے کو کہا۔وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ آں موصوف شہر سے باہر تشریف لے گئے ہوئے ہیں تانگہ رُکا کھڑا تھا اُسی پر سوار ہو کر مَیں حضرت حافظ صاحب کی قیام گاہ پر پہنچ کر تانگے سے اُترا اور کوچوان کو تین روپے پیش کئے کوچوان نے ایک روپیہ رکھ لیا دو روپے واپس کر دیئے۔گردیزی صاحب حیران ہوئے کہ شاید کوچوان تین روپوں پر راضی نہیں ہوا۔استفسار پر اُس نے بتایا کہ میری اُجرت ہی ایک روپیہ بنتی ہے۔مَیں زیادہ وصول نہیں کر سکتا۔ تحصیلدار صاحب نے بااصرار اُسے دو روپے مزید لینے کو کہا مگر اُس نے انکار کر دیا۔تحصیلدار صاحب نے کہا بھائی اپنی مرضی سے دے رہا ہوں لے لیں مگر اُس نے جواب میں کہا کہ نہ صاحب مَیں نے اپنا حق لے لیا ہے میرا رزاق میرا خدا ہے وہی میری ضرورتوں کا کفیل ہے۔ مَیں وہ دَر چھوڑ کے کسی مصنوعی رزاق کا سہارا نہیں لیتا۔یہ واقعہ مزے لے لے کر گردیزی صاحب نے حاضرین کو سُنایا اور پھر بڑے جوش سے فرمانے لگے کہ تانگے والے رکشہ والے یا ٹیکسی ڈرائیور جیسا رویہ رکھتے ہیں وہ آپ سب کو معلوم ہے۔اب ربوہ کے اس تانگے والے کو میں ''کافر'' کہوں کیا اُس کا نمونہ دینِ حق کے صحیح پیروکار کا نہیں۔اگلے روز مورخہ 13/اکتوبر 1990ء کو مَیں بہاولپور سے واپسی پر گردیزی صاحب سے اُن کے مکان واقعہ محلہ شاہ گردیز پر ملنے کے لئے گیا۔حسب دستور بڑے ہی تپاک سے ملے۔مَیں نے بتایا کہ گزشتہ محرم کے مہینے میں آپ ایک مذاکرہ میں ٹیلیویژن پر تقریر کر رہے تھے آپ کی تقریر ہمیشہ دلچسپ اور مؤثر ہوتی ہے آپ کو چاک و چوبند دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔گردیزی صاحب نے ربوہ کی یادیں بیان کرنا شروع کیں اس میں سیّدنا حضرت حافظ مرزا ناصر احمد صاحب کی محبت وشفقت کا بطورِ خاص ذکر کیا علم وعمل کی ایک خوبصورت تصویر بقول گردیزی صاحب کے حضرت علامہ مولانا راجیکی صاحب کی صورت میں دیکھی۔اردو عربی اور فارسی سب علوم کا بحرِ ذخار لیکن بے نفسی اور سادگی اور انکسار کا مجسمہ۔

پھر انہوں نے بتایا کہ مَیں اپنی علمی اشکال کو لے کر حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا۔موصوف کے علم وفضل اور محبت وشفقت کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا اور کئی واقعات اور مثالیں حضرت میاں صاحب کی مروت کی بیان کیں۔مَیں بھی ان سب بزرگوں کی صحبت سے مستفیض ہوا کرتا تھا۔

گردیزی صاحب جوں جوں گزرے ہوئے زمانے کے شیریں واقعات بیان کر رہے تھے مَیں ایسے محسوس کر رہا تھا جیسے ابھی ابھی اُن کی محفل سے اُٹھ کر آیا ہوں بڑی حسرت کے ساتھ کسی کا یہ شعر میرے ہونٹوں پر رقص کرنے لگا ؎

وہ پھول سے لمحے بھاری ہیں اب یاد کے نازک شانوں پر
جو پیار سے تم نے سونپے تھے آغاز میں اک دیوانے کو

یہ ملاقات بڑی یادگار تھی گردیزی صاحب نے ساری میٹھی یادوں کو مضمون کی صورت لکھ کر مجھے بھجوانے اور الفضل میں شائع کروانے کا وعدہ کیا۔

اللہ تعالیٰ میرے اس شفیق دوست کو اس کی توفیق بخشے اور صحت والی دراز عمر عطا فرمائے۔اے اللہ تو ایسا ہی کر۔ ؎

بڑا جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

(روزنامہ الفضل 10 / مارچ 1991ء)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁



محمد زبیر نون ہلال پوری

محمد زبیر میری بڑی بہن زینب بیگم کا چھوٹا بیٹا تھا۔اس کے والدین چند سال قبل فوت ہو چکے ہیں اوائل 1980ء میں وہ کینسر سے شدید بیمار ہوا حتیٰ کہ جان کے لالے پڑ گئے میں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کو دعا کے لئے تار دیا اور یہ الفاظ لکھے:

Nothing can be Done for Zubair

اور دعائے خاص کی درخواست کی پھر ربوہ جا کر بیت الکرام کوٹھی پر دستک دی کہ وہاں ماں سے زیادہ شفقت کرنے والی ہستی رہتی تھیں وہ مجھ پر کیوں مہربان تھیں اس میں میری ہرگز کوئی خوبی نہیں تھی اور نہ میں اپنا کوئی استحقاق سمجھتا تھا اس کے مقدس ماں باپ سے اس کو غریب پروری اور بندہ نوازی اور فیض رسانی کے اوصاف حسنہ ورثہ میں ملے ہوئے تھے وہ تھیں حضرت اماں جان سیّدہ نواب امۃ الحفیظ بیگم صاحبہ الغرض حضرت سیّدہ ممدوحہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میری پریشان حالی پر مادر مہربان کو ترس آیا میں نے تفصیل زبیر کی بیماری کی عرض کی تو چند ثانیئے کے توقف کے بعد اپنے رب کریم پر توکل کرتے ہوئے بڑے وثوق کے ساتھ اور بڑی پرشوکت آواز میں فرمایا کہ تم بےفکر ہو جاؤ اللہ تعالیٰ محمد زبیر کو ضرور شفا دے گا۔سچی بوٹی پلانا شروع کر دیں۔ ؎

یہاں آؤ وہ نورِ جاودانی دیکھتے جاؤ نمودِ حسنِ یارِ لامکانی دیکھتے جاؤ
درِ رحمت سے اٹھتی ہے گھٹا جب ابرِ رحمت کی ٹپک پڑتا ہے شعلوں سے بھی پانی دیکھتے جاؤ

محمد زبیر نوعمری ہی سے عبادت میں بہت شغف رکھنے والا اور دعا گو تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیاروں کی دعاؤں کو قبول فرماتے ہوئے زبیر کی حالت میں بہتری کے آثار پیدا فرما دئے اب اسے ہوش آ چکا تھا بخار بھی کم ہوتے ہوتے ٹوٹ گیا تھا میں اس کے پاس میو ہسپتال کے کمرے میں گیا تو حضرت سیّدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ کے یہ اشعار پڑھ رہا تھا اور آنسو بہا رہا تھا۔ ؎

مایوس کبھی تیرے سوالی نہیں پھرتے
بندے تری درگہ سے خالی نہیں پھرتے
ہر آن ترا حکم تو چل سکتا ہے مولیٰ
وقت آ بھی گیا ہو تو وہ ٹل سکتا ہے مولیٰ
تقدیر یہی ہے تو یہ تقدیر بدل دے
تُو مالکِ تحریر ہے تحریر بدل دے

اللہ تعالیٰ کے فضل و رحم کا ایسا کرشمہ فلک نے دیکھا جیسا کہ گزشتہ صدی کے آخر میں عبدالکریم جسے باولے کتے نے کاٹا تھا اور پھر اس پر باولہ پن کے آثار ظاہر ہو چکے تھے تو اسے لاعلاج قرار دیا گیا اور محمد حیات کو طاعون کی بیماری کا شدید حملہ ہوا اور اطباء اس کی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے مگر اللہ شافی نے اپنے مقبول بندے کی دعا قبول فرماتے ہوئے انہیں شفا عطا فرما دی۔

المختصر اللہ تعالیٰ نے معجزانہ رنگ میں محمد زبیر کو صحت بخش دی اور پھر اسے تیرہ سال تک مہلت عطا فرمائی وہ پانچ بیٹیوں کا باپ تھا اور ان کی تعلیم و تربیت اس نے حتی المقدور نہایت عمدہ طریق پر کی اس پر 91-1990ء میں راہ مولیٰ میں مقدمہ بنا مقدمہ کافی دیر چلتا رہا اور محمد زبیر اپنے کینسر زدہ جسم کے ساتھ پیشیاں بھگتتا رہا بالآخر اسے قید اور جرمانے کی سزا ہوئی قیاس ہے کہ اس مقدمہ کی صعوبتوں کا بھی اس کی آخری بیماری کے شدت اختیار کرنے میں بہت دخل تھا مگر زبیر اللہ کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو اپنی خوش بختی یقین کرتا تھا اور وہ کبھی ان سے پریشان نہ ہوا۔ بلکہ اس کا قدم آگے ہی بڑھتا رہا اور اس نے اپنی صحت اور زندگی کی کوئی پرواہ نہ کی۔ ؎

دریا کی زندگی پر صدقے ہزار جانیں
مجھ کو نہیں گوارا ساحل کی موت مرنا

1992ء میں اس نے بڑی چاہت سے اپنا پاسپورٹ بنوایا اور قادیان کے جلسہ سالانہ میں میرے ہمراہ شریک ہوا ہم قادیان پہنچے تو محترم صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب نے الدار میں قیام کا بندوبست کروا دیا۔ مجھے محمد زبیر کی کمزوری اور موذی بیماری کی وجہ سے سفر کے دوران تشویش رہی مگر زبیر کو تو گویا دونوں جہان کی نعمتیں میسر آ گئی تھیں۔ میں نے اسے مسرت اور امتنان کے آنسو بہاتے بھی دیکھا وہ رات کا

کافی حصہ نوافل پڑھنے میں گزارتا اورعبادات میں اس کواضطراری حالت نصیب ہوتی تھی۔

قادیان میں شعائر کی زیارت اسے نصیب ہوئی تو آنکھوں سے مسلسل جھڑی لگی رہی۔پھر جس طرح بیت الدعا میں مرغ بسمل کی طرح تڑپ تڑپ کراس نے مناجات کیں وہ روح پرور نظارہ مجھے کبھی بھول نہیں سکتا وہیں قادیان میں ہی اس نے فیصلہ کیا کہ آئندہ سال اپنی بیوی اور بچیوں کو ہمراہ لائے گا اور کہتا تھا کہ اس نعمت عظمٰی سے اہل وعیال کو محروم رکھنا ان پر ظلم ہے واپس آتے ہی اپنے اس عزم کی تکمیل کی تیاری شروع کردی۔فرشتۂ اجل زبیر کی خواہشات اور عزائم پر کہہ رہا تھا کہ تمہیں اتنی مہلت ہی نہیں ملنی تمہاری بزم آرائیاں اور پررونق مجلسیں ختم ہونے والی ہیں۔کچھ عرصے سے مجھے محمد زبیر کی صحت وعافیت کے متعلق بہت فکر رہنے لگا تھا چنانچہ حضرت صاحب کی خدمت اقدس میں بھی اور دوسرے مستجاب الدعوات بزرگوں کی خدمت میں بھی دعا کی درخواستیں بھجواتا رہا۔

گاؤں سے ہر آنے والے سے محمد زبیر کی صحت کی تفصیل دریافت کرتا رہا کچھ دن اسے بخار ہوتا رہا جس سے عزیز کمزور ہو گیا۔میں اسے ملنے گیا تو اس نے بتایا کہ ایک رات مثانے میں شدید درد ہوا جب درد سے نڈھال ہو گیا تو حضرت صاحب کی عطا کردہ ہومیوپیتھی کی دوا کھالی جس سے اللہ کے فضل سے فوراً آرام آ گیا وہ حضور کی تجویز کردہ اور عطا کردہ ادویات متبرک سمجھ کر استعمال کرتا تھا اور اس سے بہت فائدہ ہوتا تھا۔23رجولائی 1993ءکو علی الصبح اس کا انتقال ہوا۔محترم ڈاکٹر شمیم احمد شیخ صاحب اور محترمہ پروفیسر ڈاکٹر فہمیدہ ناہید صاحبہ نے بے حد ہمدردی اور بےلوث ایثار اور محبت سے آخری وقت میں اس کا علاج کیا۔ان کے احسانات کا بدلہ ہم کسی قیمت نہیں چکا سکتے۔22اور 23رجولائی کی درمیانی شب محمد زبیر کی حالت کا ذکر ہے ہم اس کے سامنے بیٹھے تھے اس کی باتوں میں مٹھاس بھی تھی محبت اور پیار بھی تھا مگر آنکھوں میں چمک نہیں تھی باتیں بھی زیادہ نہ کر سکا۔ایسا معلوم ہوا جیسے اندر کا چراغ بجھ چکا تھا جب میں نے بتایا کہ حضرت اقدس کی خدمت میں فیکس دے آیا ہوں تو اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اسے حضور سے گہری وابستگی تھی اکثر حضور کی خدمت میں خطوط لکھتا اور جواب آتا تو بار بار پڑھتا اور کوئی ایک خط بھی خشک آنکھوں سے نہ پڑھ سکا۔ان آنسوؤں میں کیا کیا ہوتا تھا اور ایسے مواقع پر اشک برسانے کی کیا وجہ تھی یہ عشق ومحبت کی دنیا کے راز ہیں دیوانے اسے سمجھ سکتے ہیں فرزانوں کا اس کوچہ میں گزر ہی نہیں ہوتا۔عزیز زبیر کی وفات کے بعد اس کا جنازہ اس کے گاؤں ہلال پور لے جایا گیا۔میں نے جنازہ پڑھایا بہت سے دوست شامل ہوئے غیر احمدیوں نے شمویت کی۔قبر تیار تھی میں نے اس کے ماتھے پر آخری بوسہ دیا وہ بہت محبت کرنے والا تھا اور ہر محبت کرنے والے کی محبت کا جواب بڑھ کر دیتا تھا احمدیت کے لئے بہت غیرت مند اور اس کے استحکام کے لئے ہمیشہ کوشاں۔اس کی عمر کے آخری دو ماہ کے دوران اس کے نیک نمونہ سے متاثر ہو کر ستر ہ افراد نے بیعت کی اس کے رہائشی مکان کے ساتھ ہی قبر تیار کرائی گئی تھی جب قبر میں اس کو اتارا جا رہا تھا تو آنکھوں کے ساتھ دل بھی رو پڑا مگر اس خیال سے تسلی ہوئی کہ ایسے لوگ مٹی میں مل جانے کے باوجود چپ چاپ دلوں کے اندر واپس آ جاتے ہیں اور دلوں کی گہرائیوں میں چمکتے دمکتے رہتے ہیں۔

اپنے آپ کو سمجھایا کہ اس وقت دل مجروح ہے ایسے میں دعائیں بہت قبول ہوتی ہیں چنانچہ بہت دعا کی اے ارحم الراحمین آقا اس میرے پیارے سے پیار کرنا اور اپنے پیاروں کے قرب میں اسے جگہ دینا وہ احمدیت کے لئے بلند ہمتوں اور جواں جذبوں کا آئینہ دار تھا اس لئے وہ مجھے بہت پیارا تھا۔نہیں مجھے ہی نہیں وہ بہت لوگوں کا محبوب تھا چپکے سے رخصت ہوا بہت سے دل دھل گئے اس کی موت کا تذکرہ کرتے ہوئے دل بہت بوجھل ہوجاتا ہے کئی مرتبہ اس کے بعد ہلال پور گیا اوّل تو مسلسل دو ہفتوں تک بلکہ ایک ماہ تک چند دنوں کے وقفے کے بعد بچیوں کو ملنے اور صبر کی تلقین کرنے کے لئے جاتا رہا مگر انہیں وعظ کرتا کرتا آپ بے خود ہوجاتا اور مجھے ہلال پور الفت ومحبت کے لحاظ سے سونا سونا لگتا ہے مجھے اپنے گاؤں میں اور بھی کئی عزیزوں سے پیار ہے انہیں مجھ سے بھی تعلق خاطر ہوگا کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے مگر ؎

اک جانِ شہر تھا جو کہیں اور جا بسا
اب کچھ نہیں ہے چاہنے والوں کے شہر میں

میرے آقا حضرت خلیفۃ المسیح نے محمد زبیر کے لئے بہت دعائیں کیں اور انہی بزرگوں کی دعاؤں کو قبول فرما کر رب شافی نے اسے چودہ پندرہ سال تک موذی مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود مہلت عطا فرمائی۔حضور نے دوائیں بھی تجویز فرمائیں اور ان کے استعمال سے محمد زبیر کو اللہ کے فضل سے بہت افاقہ بھی ہوا پھر اس کی وفات پر حضرت صاحب نے بہت پیار ادعاؤں بھرا خط بھی لکھا۔تعزیت فرمائی کہ حضور روح وبدن دونوں کے ماہر طبیب ہیں یہ اوصاف کریمانہ اللہ کریم کی ودیعت ہیں اور بزرگ باپ اور مقدس دادا سے حضور کو ورثے میں ملی ہیں۔کس باپ کا بیٹا کس دادا کا پوتا ہے اللہ یہ برکتوں والا سایہ مدام ہمارے سروں پر سلامت رکھے اگر یہ نعمت ہمیں میسر رہی تو دنیا کے ہم وغم ہم برداشت کرلیں گے کہ یہ وجود ہمارے حقیقی ڈھارس کا موجب ہے۔ ؎

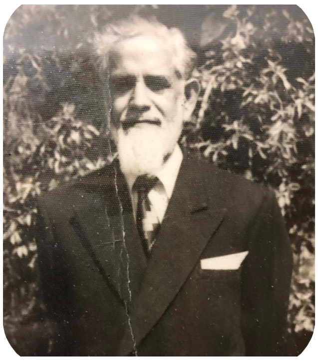
مری جسارت معاف کر دیں سمجھ کے دیوانہ محبت
کہ میرے جیسا حقیر بندہ بیاں کرے ہے مقام ان کا

قارئین کرام ہم سب پسماندگان کے لئے بھی دعائیں کریں اور جانے والی روح کی بلندی درجات کے لئے بھی۔ ؎

ہر پھول سرنگوں ہے تمہارے فراق میں
تم اپنے ساتھ لے گئے قسمت بہار کی

(روزنامہ الفضل ربوہ مورخہ 6 رجنوری 1994ء صفحہ 7،5)

۞۞۞۞۞۞۞۞۞۞



حضرت چوہدری عزیز احمد صاحب باجوہ

حضرت چوہدری محمد حسین صاحب باجوہ تلونڈی عنایت خان ضلع سیالکوٹ کے ایک معزز زمیندار خاندان کے فرد تھے انہیں حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کا رفیق ہونے کا اعزاز نصیب ہوا تو اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری کے ساتھ مناجات کرنے کا ایک انوکھا ایمان افروز اور دلکش انداز عطا ہوا۔ فرماتے تھے جب کوئی مشکل پیش آتی ہے تو وضو کر کے ایک کوٹھڑی میں اندر سے کنڈی لگا کر نفل پڑھنا شروع کر دیتا ہوں بیت میں گر کر انکسار اور تضرع کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ جب تک میری مراد پوری نہ ہوگی میں یہاں سے اُٹھوں گا نہیں اور یہیں مر کر ڈھیر ہو جاؤں گا۔

سر کو پاؤں پر دھرونگا
آنکھیں تلووں سے ملونگا
نقشِ پا کو چوم لونگا
میں تمہیں جانے نہ دونگا

اللہ تعالیٰ بھی رحیم و کریم اور ذرہ نواز آقا ہے ان کی دلداری فرماتا اور حاجات پوری فرما دیتا۔

نہ کی ہم نے کمی کچھ مانگنے میں مگر تم بخششوں کی کان نکلے

محترم چوہدری عزیز احمد صاحب باجوہ اسی خدا نما انسان کے صاحبزادے تھے میں جلسہ سالانہ پر قادیان گیا تو زیارت قبور کے دوران حضرت چوہدری محمد حسین صاحب باجوہ کے لوح مزار پر نظر پڑی تاریخ وفات یکم مارچ 1933ء تحریر تھی۔ ساتھ یہ شعر لکھا تھا۔

میری طرح نہ اک دن ابر بہار رویا
وہ ایک بار رویا میں بار بار رویا

میں نے وہاں دعا کی فارغ ہوا تو دیکھا کہ دو نوجوان خوش پوش سکھ میرے پیچھے کھڑے وہ شعر پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے مجھ سے اس کا مفہوم پوچھا جسے میں نے محترم چوہدری صاحب کی طرز دعا اور طریق عبادت کے پس منظر میں سمجھانے کی کوشش کی اس پر وہ متاثر اور متعجب ہوئے۔

محترم چوہدری عزیز احمد صاحب باجوہ سرگودھا میں سب جج تھے میرا پہلا تعارف 1947ء میں حضرت مولانا شیر علی صاحب نے

ایک دستی چٹھی کے ذریعہ کرایا تھا۔

دولتے ہست کہ یابی سر راہے گاہے

تقسیم ملک کا زمانہ تھا ہمارے ہاں ڈیڑھ سو کے قریب غیر مسلموں نے پناہ لی ہوئی تھی۔ محترم باجوہ صاحب امیر جماعت احمدیہ سرگودھا تھے میں نے ان سے غیر مسلموں کے انخلاء کے لئے ذکر کیا تو مجھے ''البیت'' سے ہمراہ لے کر ایک ہندو وکیل کے گھر چلے گئے۔ جو افسران متعلقہ سے رابطہ رکھتے تھے انہوں نے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور دوران گفتگو بڑی لجاجت کے ساتھ عرض کیا کہ عمدہ نیا صوفہ سیٹ بنوایا ہے آپ یہ قبول فرمالیں مگر حضرت چوہدری صاحب دیانتداری تقویٰ شعاری اور بے نیازی کے ایسے اعلیٰ مقام پر فائز تھے کہ اس پیشکش کو قبول کرنے کا ہرگز کوئی سوال نہ تھا وکیل صاحب نے قیمتاً وہ صوفہ دینے کی درخواست بھی کی وہ بھی نامنظور ہوئی فرمایا میں ظلم کی کوئی نشانی اپنے گھر میں نہیں رکھنا چاہتا۔

پھر اس سہ پہر مجھے ہمراہ لے کر ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر جا کر ملاقات کی اور غیر مسلموں کو ہمارے ہاں سے کیمپوں میں سرگودھا لانے کا بندوبست ہوا۔

اس دوران ایک سکھ کا آپ کو علم ہوا جو کہ منڈی بہاؤالدین کا رہنے والا تھا کسی کام کے سلسلہ میں سرگودھا آیا ہوا تھا کہ فسادات شروع ہو گئے اور وہ اپنے اہل وعیال سے کٹ کر سرگودھا میں محصور ہو کر رہ گیا تھا اور اسے منڈی بہاؤالدین پہنچانے کی کسی کو جرأت نہیں تھی۔ جب اس کی حالت زار محترم عزیز باجوہ صاحب نے دیکھی تو جان ''عزیز'' کو سخت خطرے میں ڈال کر اس ناواقف سکھ کو منزل مقصود پر پہنچانے کی حامی بھر لی۔ واحد وسیلہ ریل کا تھا جو گویا مسلم وغیر مسلم کے درمیان میدان کارزار کی صورت اختیار کر چکا تھا چنانچہ سکھ کو ہمراہ لے کر اپنا اور اس کا بھی خود سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ خرید کر گاڑی میں سوار ہو کر عازم منڈی بہاؤالدین ہوئے۔ سرگودھا سے منڈی تک دس ریلوے سٹیشن راستے میں پڑتے تھے کئی ریلوے سٹیشن پر سکھ کو دیکھ کر اس پر حملہ آور ہونے کی کوششیں بھی ہوئیں مگر یہ مرد قلندر گاڑی کے دروازے میں سینہ سپر کھڑا ہر ایک حملے کو پسپا کر دیتا۔ گاڑی سے اتر کر تانگے میں سوار ہوئے تو سخت خطرہ جان سے دوچار ہوئے مگر وہ شخص جو اپنے خالق ومالک کی خاطر مخلوق الٰہی پر حفاظت کے پر پھیلائے ہوئے تھا اسے تو جذبہ ایمانی نے وارفتہ اور مجنوں بنا دیا ہوا تھا وہ بھلا کب ڈرتا تھا میں آج بھی حیران ہوتا ہوں کہ ایک جج نے کیسا خطرہ مول لیا اور رشک آتا ہے اس جان نثار صاحب ایمان پر۔

میرے تعارف کی ابتداء تو 1947ء میں ہوئی تھی میں کالج کا طالب علم تھا میرے لئے محترم باجوہ صاحب نے ایک مربی اور استاذ کا روپ دھار لیا کبھی کبھی آمدورفت اور اکثر خط وکتابت کا سلسلہ چلتا رہا ہر معاملے میں راہ نمائی فرماتے اور حوصلہ افزائی بہت کرتے۔

پھر جب میں نے 1953ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کر لیا تو آپ نے مجھے گوجر خان طلب فرما کر عدالتی امور کی سرانجام دہی کی

تفصیلات اور پیشہ وکالت کے بارہ میں زریں ہدایات سے نوازا میں کئی روز وہاں رہا اور مجھے آپ کی وسعت علمی عظمت و بلندی کردار سے مستفید ہونے کے کئی انمول مواقع میسر آئے۔ میرے لئے صحبت صالح کے وہ لمحات سرمایہ حیات ہیں۔

کیسی کیسی محفلیں تھیں کیسے کیسے لوگ تھے
وہ سنہرا دور ماضی اب پلٹ سکتا نہیں

اس دوران مجھے انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی مثال نافہ مشک کی سی تھی جو اپنے وجود کا ثبوت خود ہی ہوا کرتی ہے عدالتی امور میں کسی کو مداخلت کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی لیکن یوں ایک فیض رساں شخص تھے دکھی اور ضرورت مند انسانیت کے لئے بہترین مونس وغم خواران کا چشمہ فیض ہمیشہ موج میں رہتا تھا ان دنوں ایک کتاب کی تصنیف میں مصروف تھے۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں Mohammadan law in theory and Practice آپ نے تحریر فرمائی جسے قبول عام کی سند ملی۔ میں نے تب جانا کہ ان کی تحریر نہایت پختہ، وسعت مطالعہ، تعمق فکر اور بہترین قوت استدلال کی مظہر ہے۔

جوں جوں قرب بڑھتا گیا میں نے ایسے محسوس کیا کہ جیسے ایک بند کلی کھل کر فضا کو معطر کرتی جاتی ہے۔ جناب باجوہ صاحب کی پہلودار شخصیت اور کردار کی عظمت اور اخلاق عظیمہ نے مجھے گرویدہ بنالیا۔ وہ صاف گو صاف باطن ایثار کا مجسمہ اور اقدار عالیہ کی آبرو تھے۔

اور میں نے کہا کہ یونان کا فلسفی دیوجانس کلبی دن کی روشنی میں چراغ لے کر انسان کی تلاش کرتا رہا اور اسے کوئی انسان نظر نہ آیا اگرچہ اس دور میں بھی قحط الرجال ہے اور ''انسان'' کم کم ہیں اگر دیوجانس کلبی کی نگہ باجوہ صاحب پر پڑ جاتی تو گھپ اندھیرے میں بھی انسان کی شناخت کے لئے اسے کسی چراغ کی حاجت نہ ہوتی اور باجوہ صاحب کے تقویٰ اور اخلاق حسنہ کی نورانی شعاعوں سے اس یونانی فلاسفر کی آنکھیں چندھیا جاتیں۔ ؎

مری جانب جونہی دیکھا کسی نے
نظر آنے لگے ہر جا دفینے

جتنا وقت ان کی صحبت صالحہ میں رہنے کا ملتا وہ میرے لئے بہترین سرمایہ حیات ہوتا۔ ان کی زبان میں عجیب قسم کی شیرینی تھی۔ ؎

ساقیا صحبت دیرینہ جو یاد آتی ہے
چشم نم صورت پیمانہ چھلک جاتی ہے

اوپر میں نے آپ کے شفقت علی خلق اللہ اور فیض رساں ہونے کا اشارہ کیا ہے اگرچہ آپ گوشہ نشین اور خلوت پسند درویش تھے تاہم میں نے ان کے اخلاق کریمانہ کے کئی مظاہر مشاہدہ کئے۔

5؍اکتوبر 1974ء میں سرگودھا میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک اُٹھی فسادیوں نے کئی گھروں اور دکانوں کو نذرِ آتش کیا۔ اس روز برادرم ڈاکٹر حافظ مسعود احمد صاحب کا رہائشی مکان اور کلینک اور اس میں موجود بہت قیمتی سامان بمعہ نئی موٹر کار اور موٹر سائیکل جلا کر خاکستر کر دیا گیا جو کچھ بچا وہ لوٹ لیا گیا۔

جب گھر کی آگ بجھی تو کچھ سامان بچا تھا جلنے سے
سو وہ بھی ان کے ہاتھ لگا جو آگ بجھانے آئے تھے

یہاں اس روز کے المناک اور دردانگیز واقعات کی تفصیل بیان کرنا مطلوب نہیں ہے۔ بلکہ یہاں ذکر یہ کرنا چاہتا ہوں کہ سینکڑوں میل دور بیٹھے ایک دردمند دل پر اس روح فرسا سانحہ کا کیا ردعمل ہوا۔ وہ دل درد و کرب سے تڑپ اُٹھا اور مجھے فوراً خط لکھا کہ یہ معلوم کر کے کہ حافظ مسعود احمد صاحب کے گھر کی کوئی چیز باقی نہیں بچی بہت دکھ ہوا ہے اور دل کو سخت دھچکا لگا ہے انہیں بحالی کے لئے رقم کی ضرورت ہوگی جو ان کے پاس نہیں ہے مزید تحریر فرمایا کہ میرے پاس میری بیٹی کی رقم پڑی ہے مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے دینے میں تامل نہیں کرے گی میں وہ رقم آپ کو بھجوا دونگا آپ یہ رقم محترم حافظ صاحب کی نذر کر دیں وہ رقم بڑی خطیر تھی اور کہ واپسی رقم کا میں بندوبست کر دونگا۔ حافظ صاحب پر اس رقم کی واپسی کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔ وہ خط میں نے برادرم حافظ صاحب کو دکھا کر محترم چوہدری صاحب کی پیشکش دھرائی مگر حافظ صاحب نے بھی یہ سبق نہیں پڑھا ہوا تھا اور ان کی نگاہ بھی ہمیشہ رزاق ذوالقوۃ المتین کی طرف ہی اٹھتی تھی۔

تو چاہے تو بھر دے داتا تو چاہے تو خالی رکھ
اور کہیں دامن پھیلانا میرے بس کی بات نہیں

اس قسم کے اور کئی واقعات میرے ذہن میں مستحضر ہیں جن سے باجوہ صاحب کی فطرتی فیاضی اور مخلوق خدا کے لئے ہر ایک شے قربان کرنے کے جذبہ کی عکاسی ہوتی تھی مگر طوالت کے خوف سے ان واقعات کے بیان کرنے سے دستکش ہوتا ہوں۔

مالی قربانی میں ہمیشہ پیش پیش رہتے۔ حصہ آمد کمال پابندی سے ادا کرتے دیگر طوعی چندہ جات اور عطایا اس کے علاوہ تھے۔ آمدنی قلیل تھی ایک بڑے کنبے کے کفیل تھے۔ رہن سہن سادہ تھا مگر ستھرائی اور نفاست میں کبھی جھول نہ آئی۔ اللہ کریم نے چہرہ بہت نورانی عطا فرمایا تھا اور ان کے دل کی روشنی اور ایمان کا نور ان کے چہرے سے منعکس ہوتا رہتا تھا ''عشق الٰہی وسّے منہ پر ولیاں ایہہ نشانی'' کے مصداق تھے۔

میں نے اوپر محترم باجوہ صاحب کی فیض رسانی کا ذکر کیا ہے ایک بہت عمدہ واقعہ یاد آ رہا ہے۔

ہوا یوں کہ دانتوں کے ڈاکٹر سیّد جنود اللہ صاحب ترکی نے اوّل اپنا ملک چھوڑا اور ہندوستان میں آ آباد ہوئے پھر 1947ء میں جب ہندو پاک کا بٹوارا ہوا تو آپ کو دوبارہ نقل مکانی کرنا پڑی اور سرگودھا آن پہنچے جناب باجوہ صاحب ان دنوں سرگودھا میں سب جج تھے سیّد جنود اللہ صاحب شکل و شباہت اور بول چال کے لحاظ سے بھی اپنے پیدائشی ملک کے سارے خدوخال رکھتے تھے۔ حضرت باجوہ صاحب کی دور بین نگہ ان کی کسمپرسی کی حالت پر پڑی اور ان کی دستگیری فرماتے ہوئے انہیں بلاک 12 سرگودھا میں ایک مکان اور دکان الاٹ کر دی۔ ڈاکٹر سیّد جنود اللہ صاحب ماہر دندان ساز تھے لیکن طبیعت میں خاصی لاپرواہی اور بے نیازی تھی۔

الاٹمنٹ کی چٹھی کی حفاظت نہ کر سکے اور وہ گم ہوگئی کئی سالوں بعد مستقل الاٹمنٹ کے حقوق کی تفویض کا موقعہ آیا تو چٹ نہ ملے۔ اب سیّد جنود اللہ صاحب سخت پریشان۔ تلاش بسیار کے باوجود اس چٹھی کا کوئی نام ونشان نہ دفتر میں نہ گھر سے ملا۔ ڈاکٹر سیّد جنود اللہ صاحب نے اپنی کج مج اردو میں مجھ سے حضرت چوہدری صاحب کے بارہ میں دریافت کیا کہ آج کل کہاں ہیں میں نے بتایا کہ وہ کئی مقامات سے ہوتے ہوئے اب جھنگ میں ایڈیشنل جج تعینات ہیں ڈاکٹر صاحب نے وہاں جانے کی ٹھان لی میں تو سمجھا کہ یونہی تکلیف ہی کر رہے ہیں وہ کیا کر سکتے ہیں۔ درمیانی عرصہ بارہ، تیرہ سال کے قریب گزر چکا تھا مگر نیت نیک اور دل بخل سے خالی ہو تو انسان ایک دکھی اور مجبور انسان کے کام آ ہی جاتا ہے جب سیّد جنود اللہ صاحب نے الاٹمنٹ کی چٹ کے ضیاع کا واقعہ سنایا اور جج صاحب سے پوچھا کہ آپ کو یاد ہے آپ نے ایک مکان اور دکان مجھے الاٹ کی تھی۔

اب ڈاکٹر ترکی صاحب کی ہیئت بھی ایسی تھی کہ وہ بھول نہیں سکتے تھے جج صاحب نے فرمایا یہ تو مجھے یاد ہے کہ بلاک 12 میں ایک مکان اور دکان آپ کو الاٹ کی تھی لیکن نمبر مجھے یاد نہیں ہیں۔ چنانچہ فوراً ایک سرٹیفیکیٹ ٹائپ کروا دیا جس میں لکھا تھا کہ اتنے سال قبل جب میں سرگودھا میں سب جج تھا تو مجھے یاد ہے کہ دندان ساز ڈاکٹر سیّد جنود اللہ کو میں نے ایک مکان اور دوکان بلاک 12 میں الاٹ کی تھی اور نیچے دستخط کر دیئے اور مہر لگا دی جب ایڈیشنل سیشن جج کا سرٹیفیکیٹ محکمہ الاٹمنٹ کو پیش کیا گیا تو اسے تسلیم کرتے ہوئے سیّد جنود اللہ صاحب کو مستقل الاٹمنٹ کا آرڈر مل گیا اور اس طرح ایک پریشان حال شخص کی مشکل حل ہوگئی۔ آج کل نفسا نفسی اور اخلاق حسنہ کے لحاظ سے بانجھ دور میں ایسے دل کے غنی انسانیت کے دکھوں کا بے لوث علاج کرنے والے اور دکھی اور مظلوم انسان کی دستگیری کرنے والے خدا پرست وجودوں کا دم غنیمت تھا۔

اپنے منصبی فرائض کی بجا آوری میں کردار ایسا شفاف اور نکھرا ہوا تھا جیسے تیز بارش کے بعد نیلگوں آسمان نکھر جاتا ہے عدل وانصاف کی اعلیٰ اقدار کا پورا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ مخلوق الٰہی کے ساتھ نہایت دردمندانہ بلکہ محسنانہ سلوک۔ اس وقت کی کئی شیریں اور دلآویز مثالیں عدل کی ذہن کے لاکر میں محفوظ ہیں جن کا بیان یہاں طوالت کے خوف سے نہیں کر رہا اس دور میں ہلدی کی گانٹھ لے کر پنساری

بن بیٹھتے ہیں لیکن محترم باجوہ صاحب جن کا مطالعہ وسیع بھی تھا اور عمیق بھی۔علم کی جستجو ساری عمر قائم رہی مگر یوں ایسی بے نفسی اور اپنی ہیچ مدانی کا اظہار کہ گویا کچھ بھی نہیں جانتے۔

عبادات کی ادائیگی میں نوعمری سے باقاعدگی تھی مگر شاید گھر کے سارے افراد کو بھی اس کا علم نہ ہو۔موجودہ معاشرے کی خودنمائی اور خودستائی کی روش اور انداز ان کی فطری اور جبلی راست روی اور بلند کرداری کے سخت منافی تھی انہوں نے اپنے آقا و مرشد کی یہ تعلیم حرز جان بنا رکھی تھی۔

بدتر بنو ہر ایک سے اپنے خیال میں
شاید اسی سے دخل ہو دارالوصال میں

اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں زندگی میں تو ایک دفعہ ''حضرت باجوہ صاحب'' خط میں لکھا تو خفگی کا اظہار فرمایا میں نے آئندہ احتیاط کرنا شروع کر دی اور کبھی ''حضرت'' کا لاحقہ آپ کے نام کے ساتھ نہ لگایا۔اگر میں یہ کہوں کہ علاوہ دیگر بزرگان سلسلہ کے آپ نے بھی مجھے اپنا قبلہ راست کرنے میں میری دستگیری اور راہنمائی فرمائی تو یہ عین حقیقت ہے۔

ہم سے بچھڑنے والے قافلے میں حضرت احمد کا ایک اور ''عزیز'' جو مجھے بہت ہی عزیز تھا شامل ہو گیا۔میں اپنی زندگی میں بڑے بڑے پیاروں کو الوداع کہہ چکا ہوں اور یہ فہرست بہت طویل ہوتی جا رہی ہے ساری عمر کی رفاقت اور یگانگت اور ممنونیت کے باوجود میری حرماں نصیبی کہ آخری دیدار بھی نہ کر سکا بلکہ مجھے تدفین کے دوسرے روز آپ کی وفات کا علم ہو سکا۔یہ صدمہ وفات کے صدمہ سے بھی بڑھ گیا ہے اگر آپ کے عزیزوں میں سے کوئی صاحب دل مجھے اطلاع دے دیتا تو نصف صدی کے یک طرفہ احسانات اور مربیانہ سلوک کا صلہ دینے کے لئے اگرچہ میں تہی دست ہی تھا مگر آنسوؤں میں لپٹی ہوئی بخشش کی دعا اور مزار پر تین مٹھی مٹی ڈال کر بقول شاعر

مٹھیوں میں خاک بھر کے دوست آئے بر دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

ہم بھی اپنی وفا کیشی کا بھرم رکھ لیتے مگر اس سے بھی محروم رہے اور اب ''بہ جنازہ گر یائی بہ مزار خواہی آمد'' پر عمل ہے۔

آخر میں دس بارہ سال قبل کا ایک واقعہ جس سے حضرت باجوہ صاحب کے اپنے مرشد و مقتدا اور حضور کی اولاد کے ساتھ عقیدت اور احترام کا ثبوت ملتا ہے تحریر کر کے اپنے اس بیان کو ختم کر دونگا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی ایک صاحبزادی صاحبہ کو قانونی مشورے اور امداد کی ضرورت پیش آئی تو انہیں قانون کی کئی کتابوں کے مصنف اور خصوصاً شرعی قوانین کے ماہر محترم چوہدری عزیز احمد صاحب سے استمداد کا مشورہ دیا گیا آپ ان دنوں بھی علیل تھے اور

نقاہت محسوس فرمارہے تھے عمر بھی اسی سال سے متجاوز ہورہی تھی اس فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے کئی بار ربوہ بھی انہیں حاضری دینا پڑتی تھی مگر کمال مسرت وافتخار کے ساتھ اس مہم کو سر کرنے کی حامی بھری مگر جب معاوضہ پیش کیا گیا تو سخت دل گرفتہ ہوئے اور حد درجہ بے نیازی بلکہ ایک گونہ بیزاری کا اظہار فرمایا جواب یہ تھا کہ بی بی صاحبہ دین و دنیا کی دولتیں آپ کے بزرگ باپ اور مقدس دادا کے صدقے اللہ نے عطا کی ہیں میں تو اس انتظار میں رہتا تھا کہ کوئی موقعہ میری حقیر خدمات پیش کرنے کا ملے آپ کبھی کسی شکل میں مجھے معاوضہ کی ادائیگی کا خیال نہ فرماویں۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ لاہور سے سرگودھا کئی بار آپ کو بس وغیرہ پر بھی تکلیف وہ سفر کی صعوبت اُٹھانا پڑی مگر سواری بلکہ ربوہ میں رہائش وغیرہ کی پیشکش بھی قبول کرنے سے معذرت کر لی اور اس محنت طلب کام کے لئے ذہنی اور جسمانی سخت مشقت اُٹھا کر کافی عرصہ بعد کامیابی حاصل کی مگر وہ زبانی شکریے کے بعد سزاوار نہ ہوئے اور جب کبھی میں نے اس کا تذکرہ کرنا چاہا تو ندامت محسوس فرماتے تھے اور کسی قسم کا احسان جتانے کا تو خیال بھی ان کے دل میں نہ گزرا۔

میری بہت طویل ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں اور میں ہر ملاقات کے بعد اپنے قلب و ذہن میں ایک جلا اور روحانی تازگی محسوس کرتا تھا میں نے اپنے نصف صدی کے قریب میل ملاپ کے دوران ان کو انکساری سادگی بے تکلفی اور فیض رسانی کا بہترین نمونہ پایا جب سے اس دور کے منافقین کے مکروہ چہرے دیکھنے کے مواقع ملے میں خصوصاً ان لوگوں کے جنہیں ''ظل سبحانی'' اور'' قادر مطلق'' کہلانے کا جنون تھا تو جناب باجوہ صاحب جیسے سراپا اخلاص و وفا اور اللہ کی رضا کی راہوں کے متلاشی بزرگوں کے اعلیٰ مقام کی حیثیت روشن ہوتی گئی۔

وہ نفرتوں کے سمندر میں اک جزیرہ تھا
تھکن سے چور پرندہ وہیں اترتا تھا

سکرات الموت سے پناہ مانگی گئی ہے مگر یہ سفر میرے ممدوح باجوہ صاحب کے لئے اس قدر سہل کر دیا گیا گویا کہ قدموں میں ریشم و کمخواب بچھا دئے گئے ہوں۔

مجھے آپ کے صاحبزادے عزیزم چوہدری کنور ادریس صاحب نے کراچی میں عندالملاقات بتایا کہ وفات سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل تک کام میں مصروف تھے اور روح قفس عنصری سے اس طرح پرواز کر گئی جس طرح پرندہ اپنے گھونسلے کی طرف شوق سے اُڑ کر پہنچتا ہے۔ موت کے سمندر میں اس سکون سے غوطہ لگایا کہ آس پاس کی لہروں کو بھی پتہ نہ چلا۔

دل کو سکون روح کو آرام آ گیا
موت آ گئی کہ دوست کا پیغام آ گیا

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جنت میں اپنے قرب کا مقام عطا فرمائے اور ہمیشہ آپ کے درجات بلند سے بلند تر کرتا چلا

جائے اور سب پسماندگان کو اپنی حفظ و پناہ میں رکھے اے خدا تو ایسا ہی کر

اے خدا بر تربت او ابر رحمت ہابار
داخلش کن از کمال فضل در بیت النعیم

(روزنامہ الفضل ربوہ مورخہ 22/اکتوبر 1993ء صفحہ 4تا5)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

قومی تنزل کی بدترین مثال

مدیر محترم! سلام مسنون!

کچھ عرصہ سے ملی پریس قومی اسمبلی کی خارجہ اُمور کی کمیٹی کے چیئرمین مولانا صاحب کے فرینکفورٹ (جرمنی) کے ایک اونچے ہوٹل میں دوروزہ قیام کرنے اور جرمن سکے کے برابر ایک لاکھ 47ہزار روپے ادا کئے بغیر غائب ہوجانے اور پھر ہوٹل کی انتظامیہ کے ''پی آئی اے'' اور پاکستانی سفارت خانے سے ادائیگی بل کا تقاضا کرنے کی خبر پڑھ کر یقیناً ہر غیرت منداور ذی شعور پاکستانی نے خفت اور ندامت محسوس کی ہوگی۔

ایک تو اس لئے کہ وزیراعظم کی وزیراعظم بیٹی کو اس عمامہ بہ سر مولوی میں کون سی علمیت وقابلیت نظر آئی کہ انہیں قومی اسمبلی کی خارجہ امور کی کمیٹی کا چیئرمین بنانا پڑا جسے اس مملکت عزیز (پاکستان) کی مخالفت ورثے میں ملی ہے۔جس ورثے کی حفاظت (نصف صدی کا عرصہ گزرجانے کے باوجود اپنے قول وفعل سے کرنے میں) مولوی صاحب ذرا باک محسوس نہیں کرتے اور جس کی علمیت کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے ''نام نامی'' اور وفاقی وزیر کے ''مساوی عہدے'' کے انگریزی زبان میں ''ہجے'' بھی نہیں کرسکتا۔

گر یہی مکتب است و ایں مُلّا
کار طفلاں تمام خواہد شُد

مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جاہے کہ میری نگاہ میں محترمہ وزیراعظم صاحبہ کا یہ انتخاب مردم شناسی کی صفت سے یکسر عاری ملک وملت کے مفادات کے سرتاسر منافی اور قرضوں تلے دبی ہوئی قوم کے ساتھ ایک گھناؤنے مذاق کے مترادف ہے۔

اُمور خارجہ کا جب بھی ذکر آئے تو بانیٔ پاکستان حضرت قائداعظم علیہ الرحمۃ کے گہرے ادراک باریک بین نگہ انتخاب اور مردم شناسی کی داد دینا پڑتی ہے۔جنہوں نے ایک نہایت بالغ نظر، چوٹی کے قانون دان اور خدا دوست شخص کو ملک کے پہلے وزیر خارجہ کا قلمدان سونپا۔جس کے ایک بزرگ مرشد نے اسے ''ظفراللہ باشی'' کی دُعا دے کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کامیابی وکامرانی کی نوید نوجوانی ہی

میں سُنادی تھی اور جوتمام عمر تقویٰ کی باریک راہوں ہی کا متلاشی رہا۔

چند ماہ قبل چودھری الطاف حسین (مرحوم) گورنر پنجاب نے نیوز اور جنگ کے وقائع نگاروں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ

قادیانی وزیر خارجہ کے دَور میں بھارت کشمیر کے بارے میں ''مُدعی'' بن کر اقوام متحدہ گیا اور ''مُجرم'' بن کر لَوٹا۔ اس کی اہلیت کے بارے میں کوئی بات نہیں کرسکتا! چودھری صاحب مرحوم نے مزید کہا کہ '' بھٹو بھی ٹھیک تھا مگر آخری وقت میں آ کر ''مُلّاں'' سے تباہ ہو گیا۔'' مجھے آج تک اس کا جواب نہیں ملا کہ بھٹو نے ایسا کیوں کیا؟

اور سینئر ایڈووکیٹ اور سابق وزیر سیّد ''احمد سعید کرمانی'' نے جب باؤنڈری کمیشن کی کارروائی کے دوران سر ظفر اللہ خاں کے پُر مغز دلائل اور لاجوابی تقریر سُنی تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ یہ شخص ''ساحر'' ہے۔ مگر آج اسی حرماں نصیب قوم کو یہ دن بھی دیکھنا نصیب ہوا کہ ''خارجہ اُمور'' کی گتھیوں کو سُلجھانے کی ذمہ داری مولانا صاحب کے ذمّہ ہے۔ اسے سیاسی مصلحت اندیشی کہیئے گا یا قحط الرّ جال۔ ''بہر حال یہ قومی تنزل کی بدترین مثال ہے''

مجھ ناچیز کو بھی متعدد دفعہ فرینکفورٹ، پیرس اور لندن کے اونچے ہوٹلوں میں چائے پینے اور کھانا کھانے کا اتفاق ہوا ہے۔ چونکہ مجھے ان کے رہائشی کمروں اور اُن کے ٹیرف کا بھی علم ہے اس لئے میرے نزدیک کھانے، پینے اور رہائش کا بل ڈیڑھ لاکھ روپے نہیں ہوسکتا۔ خدا جانے مولانا دو دنوں میں وہاں کیا ''اللّے تللّے فرماتے رہے ہیں۔''

اور دُکھ اس بات کا ہے کہ ملکی اخبارات نے اس سانحہ پر ایڈیٹوریل لکھے۔ کالم نگاروں نے اس مُلکی خفت و پشیمانی اور قومی اسمبلی کی خارجہ اُمور کی کمیٹی کے سربراہ کی اس فضول خرچی، اسراف اور بلانوشی کو اپنی نگارشات کا موضوع بھی بنایا مگر کیا مجال جو مولانا کی طرف سے کسی قسم کی وضاحت یا ردعمل کا اظہار ہوا ہو۔ اسے کہتے ہیں مالِ مفت دلِ بےرحم۔

خزائنِ الارض پاکستان کے امین ذرا سوچیں تو سہی اگر اُن کے ذاتی اموال کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا تو کیا وہ اسے برداشت کر لیتے؟ کیا یہ ملکی امانت کی کھلی خیانت نہیں۔ یہاں اکثریت کے گھمنڈ پر انہیں شائد کسی احتساب کا خوف نہ ہو مگر وہ دن بھی تو آنے والا ہے جب کوئی ''جمعیت'' اور ''پالتو جیالا'' کام نہ آئے گا۔ نہ ملکی دولت کے انبار ساتھ ہوں گے اور نہ یہ ذاتی جاگیریں۔ دولتیں اور بینک بیلنس کہ جن سے یہ حساب چُکایا جا سکے گا۔ ''اس دن تو ہر کوئی تہی دامن ہوگا اور اس مظلوم قوم کی پائی پائی کا حساب دینا ہوگا۔''

اے اربابِ اقتدار! اقتدار کی اس باگ کو خدائی امانت سمجھئے اور ہر قدم خُدائی احتساب سے ڈرتے ڈرتے اُٹھایئے۔

(لاہور۔22رجولائی1995ء)



ایک بے مثال قائد کا جاں فروش غلام

سیّدنا خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے 1934ء میں تحریک جدید اور دسمبر 1957ء میں وقفِ جدید کی بنا ڈالی ان بابرکت تحاریک کی عالمگیر افادیت اور روحانی ثمرات پر اس مختصر نوٹ میں کچھ عرض کرنا مقصود نہیں ہے۔ روزنامہ الفضل میں چند روز قبل مولانا عبدالباسط صاحب شاہد نے وقف جدید پر ایک مختصر مضمون کے دوران حضرت صاحب کے یہ الفاظ نقل کئے کہ ''یہ کام خدا تعالیٰ کا ہے اور ضرور پورا ہو کر رہے گا میرے دل میں چونکہ خدا تعالیٰ نے یہ تحریک ڈالی ہے اس لئے خواہ مجھے اپنے مکان بیچنے پڑیں میں اس فرض کو پورا کروں گا۔ خدا تعالیٰ...... میری امداد کے لئے فرشتے آسمان سے اتارے گا''۔

الفضل میں جنوری 1958ء میں جب مندرجہ بالا حضرت صاحب کا ارشاد ملک صاحب خان صاحب نون نے پڑھا تو فوراً مجھے اپنی کوٹھی 29 سول لائن سرگودھا پر طلب فرمایا میں گیا تو انہیں عجیب کیفیت اضطراب میں دیکھا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہوا ہے جس نے ملک صاحب کو مضطرب بنا دیا ہے اگلے ہی لمحہ الفضل کا پرچہ لے آئے اور وقف جدید کے بارہ میں اوپر درج کئے گئے اقتباس پڑھ کر فرط جذبات سے آبدیدہ ہو گئے۔ ذرا سنبھلے تو بتایا کہ میں نے حضرت صاحب کی خدمت میں خط لکھا ہے آپ نے کب اپنے مکان اور کپڑے دین حق کی ضروریات سے بچا کر رکھے ہوئے ہیں جواب بیچ دیں گے مکان اور سامان تو ہم گنہگاروں نے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں پہلے یہ بکیں گے اور دینی ضروریات پوری ہوں گی لیکن فی الوقت یہ حقیر سی رقم جو میرے پاس تھی ارسال خدمت کر رہا ہوں قبول فرماویں کافی عرصہ گزر گیا ہے اتنا ضرور یاد ہے کہ اچھی معقول رقم تھی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ جناب ملک صاحب کا چندہ تحریک جدید کے سلسلہ میں بھی یاد ہے تازہ ہے جلسہ سالانہ ربوہ سے واپس آئے تو فرمایا کہ اس سال حضرت صاحب نے دوسرے دن کی تقریر میں تحریک جدید کی کامیابیوں اور اس کے ذریعہ حاصل ہونے والے اللہ کے فضلوں کے اثمار کا تفصیل سے ذکر کیا تو مجھے سخت ندامت ہوئی ہے کہ تحریک جدید کی اہمیت کو میں نے نہیں سمجھا اور اس مد میں چند ہزار روپیہ سالانہ چندہ بالکل ناکافی ہے فرمایا نقد رقم تو میرے پاس موجود نہیں ہے البتہ دو مربع زرعی اراضی اس راہ میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ خلیفۃ المسیح الثانی کی خدمت میں ملک صاحب نے یہ پیشکش کر دی جو قبول ہوئی اور محترم چوہدری مشتاق احمد صاحب باجوہ مرحوم جو غالباً وکیل الزراعت تھے سرگودھا آئے اور تحریک جدید کے نام اراضی منتقل کرا لی اور بعد میں فروخت کر دی گئی۔

ملک صاحب خان صاحب نون 17 رجولائی 1966ء کو رحلت فرما گئے۔ میرے ساتھ بہت گہرے بے تکلفانہ اور قریبی روابط

تھے۔ میں نے ان میں بے نفسی، خاکساری، تقویٰ شعاری کی صفات اور احمدیت کے ساتھ اور خلفاء احمدیت کے ساتھ ایسی عقیدت دیکھی جس کی گہرائی ناپنے کے لئے کوئی مقیاس تلاش نہیں کیا جا سکتا۔

ملک صاحب نے کسی غیبی تحریک کے نتیجہ میں ربوہ میں دو بیوت اپنے خرچ سے تعمیر کرائی تھیں۔ دیگر خدمات دینیہ اس کے علاوہ تھیں اب یہ صدقہ جاریہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرتا رہے۔

(روزنامہ الفضل ربوہ مورخہ 3/ستمبر 1995ء صفحہ 4)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁



میرا خط نسبت ملاقات حضرت مصلح موعودؓ

مکرم عبدالسمیع نون صاحب ایڈووکیٹ سرگودھا سے تحریر کرتے ہیں:

28/جولائی کے الفضل میں محترم ملک جمیل الرحمن صاحب رفیق نے نون اور نون غنہ کے سلسلہ میں گوپی چند نارنگ کے موقف کی تصحیح کی اس مکتوب کو پڑھ کر مجھے 32 سال قبل کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ میں آپ کا پہلے ہی زیر احسان ہوں اگر میرا یہ عریضہ طباعت کے لائق سمجھیں تو ''نون غنہ اور میں'' یا جیسے آپ مناسب خیال فرماویں الفضل میں شائع کروا دیں۔

حضرت امام ثانی جب آخری بیماری میں صاحب فراش تھے تو 1964ء میں ملاقات کے لئے حاضر ہوا حضرت صاحب بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ ملاقاتی لائن بنا کر گزرتے جاتے اور سلام عقیدت پیش کرتے جاتے تھے۔ محترم مولانا عبدالرحمن صاحب انور ملاقاتیوں کے نام بتا رہے تھے۔ جب میں قریب ہوا تو مولانا موصوف نے ''عبدالسمیع نون سرگودھا سے'' عرض کیا حضرت صاحب نے مُسکرا کر فرمایا ''نون کہ نون غنہ'' اپنی تو یہ حالت ہوئی کہ ؎

مجھے دو جہاں کی دولت ملی وہ جو مسکرائے

یہ سوال یوں بھی جواب طلب تو تھا ہی نہیں اور اس دربار میں مجھے کچھ عرض کرنے کی کب طاقت تھی۔

محترم پرویز پروازی صاحب کا کلام انہی دنوں کہیں پڑھا تھا جو بزبان حال پردازی صاحب کا ہمزبان ہو کر میں بھی کہہ رہا تھا۔ ؎

باقی ہے کچھ اثر ابھی فریاد و آہ میں
میں باریاب ہو گیا اس بارگاہ میں
ایسا جلال کس کو ہوا ہے کبھی نصیب

یہ دبدبہ کہاں ہے کسی بادشاہ میں
بس اک نگہ کی مگر میں نے سمیٹ لیں
دونوں جہاں کی لذتیں اس اک نگاہ میں

(اگر ان ابیات کے خالق کوئی غلطی پائیں تو اصلاح فرمادیں اور مجھے معاف فرمادیں کہ نسیان اب بڑھ رہا ہے۔)

اس کے بعد مجھے کئی بار حضرت صاحب کی ملاقات اور زیارت کا شرف نصیب ہوا محترم مولانا انور صاحب کو نہ معلوم کیوں احساس ہوا کہ شاید نون کو نون غنہ کہنے سے یہ ملاقاتی اپنی سبکی جانتا ہوگا اور ہر بار مجھ سے پوچھ لیتے کہ حضرت صاحب کو میں یاد کرادوں کہ نون ہے یا نون غنہ میں کیا عرض کرتا سوائے اس کہ اگر نون غنہ نون سے کمتر ہے تو میں اس کے لائق بھی نہیں۔ یہ تو اس نابکار کی توقیر اور عزت افزائی ہورہی ہے پھر نون غنہ کا ذکر ہر ملاقات کے موقع پر محترم انور صاحب کرتے اور میرا آقا اس پر مُسکرا دیتا۔

عرصہ گزرا اس کے بعد نہ کسی نے نون غنہ کہا نہ میں نے سُنا اور اب کان اس شیریں اور دلنواز آواز کو ترستے رہتے ہیں۔

اے کاش موت کے بعد حضرت صاحب کے قدموں میں جگہ ملے اور پھر حضرت صاحب کی زبان مبارک سے ''نون یا نون غنہ'' کے الفاظ سنوں پھر میرا نصیبہ جاگ پڑے اور عرض کروں کہ آقا میں آپ کی خاک پا بن جاؤں تو زہے نصیب ورنہ آپ کا یہ غلام در تو اس لائق بھی نہیں۔ یہ میٹھی یادیں نہ بھولتی ہیں نہ برستی آنکھیں خشک ہوتی ہیں۔

بخش دی اس نے عشرت غم بھی
پھر بھی دل سوگوار اب تک ہے
اس کی خوشبوئے پیرھن توبہ
بوئے گل ناگوار اب تک ہے

(روزنامہ الفضل 12/اگست 1996ء)

نخلہ (جابہ) کا ایک سفر

احمدیہ ٹیلی ویژن مجور جماعت احمدیہ کے لئے وصل کی نوید لاتی ہے یہ فتح وکامرانی کی علامت ہے یہ ایک روحانی اور علمی مائدہ ہے جس کی افادیت کا اندازہ کرنا بھی آسان نہیں ہے کبھی کبھی ایسے بزرگوں کی گفتگو سننے کو ملتی ہے جو اللہ کے حضور پہنچ چکے ہیں۔ اس سے قلب و روح کی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔

اگلے روز میرے دیرینہ دوست مولانا ابوالمنیر نورالحق صاحب (وفات یافتہ) احمدیہ ٹیلی ویژن پر حضرت امام ثانی کے ساتھ کام کرنے کی میٹھی میٹھی یادوں کا تذکرہ کر رہے تھے اس دوران مولانا نے نخلہ (جابہ) ضلع خوشاب کے مقام پر قیام کے دوران کلام الٰہی کے ترجمہ کرنے میں حضرت صاحب کی مصروفیات اور محویت کا ذکر کیا ان دنوں حضرت صاحب کی طبیعت خراب تھی مگر کلام الٰہی کے ساتھ عشق کا یہ عالم کہ خدمت کلام الٰہی میں کسی قسم کی تاخیر یا التواء آپ کو منظور نہیں تھا۔

احمدیہ ٹیلی ویژن پر یہ تقریر سنتے وقت مجھے ایک واقعہ یاد آیا جو اسی زمانے کا ہے جس کا ذکر مولانا کر رہے تھے منگووالی ضلع سرگودھا کے ایک بڑے زمیندار تھے جو اس واقعہ سے کچھ عرصہ قبل حلقہ بگوش احمدیت ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک نئی کار خریدی یاد رہے کہ ان دنوں نئی کار شاذ ہی دستیاب ہوتی تھی۔ عام طور پر پُرانی کار کی خرید وفروخت ہوا کرتی تھی رائے امان اللہ صاحب کی یہ خواہش تھی کہ حصول برکت کے لئے اس زیرو میٹر کار میں پہلا سفر حضرت صاحب کی زیارت اور ملاقات کے لئے اختیار کیا جائے اور مجھے ہمراہ لے جانے پر اصرار کیا میں نے سوچا کہ حضرت صاحب علیل ہیں اور بے حد مصروف، اگر ملاقات نہ ہوسکی تو رائے صاحب کو مایوسی ہوگی۔ میں نے تجویز پیش کی کہ جناب ملک صاحب خان صاحب نون کو ساتھ چلنے کو کہا جائے اس طرح حضرت صاحب کی زیارت کا شرف حاصل ہونے کا امکان زیادہ ہوگا چنانچہ ملک صاحب موصوف میری گزارش پر ہمراہ چلے گئے۔ ہم ڈیڑھ گھنٹے بعد نخلہ میں پہنچ گئے۔ حضرت صاحب کی خدمت میں ملک صاحب نے اطلاع بھجوائی تو آپ جلد ہی تشریف لائے اور ہم تینوں زیارت وملاقات سے شاد کام ہوئے اور اپنے نصیب پر ناز کرتے رہے یہ آدھ گھنٹے کی ملاقات تھی۔ ملک صاحب نے حضرت صاحب سے طبیعت کا حال پوچھا تو آپ نے فرمایا بیمار ہوں اور پھر ترجمہ کلام الٰہی کا کام بہت محنت سے کرنا پڑتا ہے جس سے بے حد کمزوری ہوجاتی ہے۔

ملک صاحب خان نون صاحب بے تکلفی سے مگر بے حد احترام کے ساتھ حضرت صاحب سے گفتگو کیا کرتے تھے۔ بے ساختہ یوں گویا ہوئے کہ ''حضرت'' اپنی صحت کا خیال رکھیں۔ کلام الٰہی کی تشریحات جو پہلے ہی فرما چکے ہیں وہ اللہ چاہے تو ہماری نسلوں کے لئے بھی کافی ہیں لیکن آپ جیسا امام ملنا مشکل ہوگا خدا کے لئے آرام فرمایا کریں تا آپ کا بابرکت سایہ ہمارے سروں پر تادیر سلامت رہے۔ حضرت صاحب اس پر مسکرائے اور فرمایا ملک صاحب اپنی صحت کے لئے کلام الٰہی کے کام کو ادھورا تو نہیں چھوڑ سکتا۔

خادم اور مخدوم کی اس شیریں گفتگو سے ایسا روحانی حظ نصیب ہوا جس کی یاد چھتیس سینتیس سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود ذہن میں اس طرح تازہ ہے جیسے کل کی بات ہے۔ واپسی کی اجازت حاصل کر کے ہم اپنی خوش بختی پر فخر کرتے ہوئے اور بزبان حال یہ کہتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹے کہ

آپ کا روئے تابناک دیکھ کے خوش ہوں اس قدر

جیسے کہ میری گود میں ماہ تمام آ گیا

اب اس مختصر قافلے میں سے میں اکیلا دنیا میں رہ گیا ہوں۔ ملک صاحب خان نون صاحب کی یاد بہت آتی ہے شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ انہیں اور کوئی یاد کرنے والا نہیں ہے۔

مجھے ملک صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ کئی سفروں میں اکٹھے رہے۔ اس رئیس ابن رئیس کی عادات واطوار درویشانہ اور بے حد سادہ تھیں جو امراء کے لئے بطور خاص نمونہ ہیں۔ زھد وتقویٰ میں اعلیٰ مقام انہیں حاصل تھا امامت کے ساتھ گہری دلی وابستگی تھی۔ کچھ عرصہ قبل مجھے ملک صاحب کے بعض حالات الفضل میں شائع کرانے کی توفیق ملی تھی مگر ملک صاحب کے اس کشفی نظارے کو جس نے ملک صاحب کی زندگی میں ایک روحانی انقلاب برپا کر دیا تھا شائع کرانے پر قدغن ہے۔ ملک صاحب 1968ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے اور یوں تحصیل بھیرہ کی وسعتوں میں آباد نون قوم میں ایمان وایقان کی ایک ہی قندیل روشن تھی جو بجھ گئی۔ ؎

پہلے ہی کم تھی قریہ جاناں میں روشنی
اور اس پر کچھ چراغ بھی کم کر دیئے گئے

یہ ملک صاحب کی شان تقویٰ ہی تھی کہ نہایت سادہ لباس تہمد باندھے کھلے گریبان کا کرتہ پہنے پاؤں میں دیسی جوتی ہوتی جب ٹوانوں اور نون خاندان کے اجتماع میں جاتے جن میں فوجی کرنل بریگیڈ یئر ڈی آئی جی پولیس بلکہ خود وزیراعظم سر فیروز خان نون بھی ہوتے تو سبھی احتراماً کھڑے ہو کر صف بستہ ہو جاتے اور ملک صاحب خان صاحب کو جھک جھک کر سلام کرتے جاتے۔

یہ امر اطمینان کا باعث ہے کہ ان نون قوم کے رؤسا میں تعصب نام کی کوئی شے نہیں بلکہ ان کے اکثر بزرگوں کے حضرت امام اوّل اور حضرت امام ثانی کے ساتھ گہرے عقیدت مندانہ مراسم تھے اس کی بہت سی عمدہ مثالیں ان بزرگوں کی زبانی میں نے محفوظ کی ہوئی ہیں۔

ملک سر فیروز خان صاحب نون عمر کے آخری چند سالوں میں چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ ویل چیئر پر سیر کرتے تھے۔ اس حالت میں بھی ہر ہفتے مجھے فون کرتے۔ حضرت امام ثانی کی خیریت دریافت کرتے اور ''حضرت صاحب کے الفاظ ہی استعمال کرتے پھر ''بھائی جی'' یعنی ملک صاحب خان نون کا حال دریافت فرماتے اور ان دونوں ہستیوں کو سلام پہنچانے کا فرض مجھے سونپ دیا کرتے۔ ایک دن ملک صاحب موصوف نے ملک صاحب خان نون صاحب کی صحت کا حال دریافت کیا۔ میں نے کہا اللہ کے فضل سے ٹھیک ہیں۔ ملک سر فیروز خان صاحب نون نے فرمایا ان کی صحت تو ٹھیک ہوگی کیونکہ باقاعدگی سے ورزش کرتے ہیں۔ میں نے تعجب سے پوچھا کہ ورزش تو وہ نہیں کر سکتے ملک سر فیروز خان صاحب نے فرمایا۔ عزیزم دن میں چھ بار باقاعدگی سے عبادت کرتے ہیں۔ اس عمر میں یہ کافی ورزش ہے۔ انہیں علم تھا کہ نوعمری سے ملک صاحب خان صاحب پچھلی رات کی عبادت بھی کرتے تھے اور اس میں کبھی ناغہ

نہیں ہونے دیتے تھے۔

خدا کرے کہ اس غیر متعصب قوم میں بہت سے ''صاحب خان نون'' پیدا ہوں جو اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہوں اور تقویٰ کی راہوں پر چلنے والے ہوں۔ اے اللہ تو ایسا ہی کر۔

(روزنامہ الفضل ربوہ 28 دسمبر 1996ء)

۞۞۞۞۞۞۞۞۞

ممنونِ احسان

محترم جناب ایڈیٹر صاحب نے الفضل میں ''احسان اور احسان کا بدلہ'' کے عنوانات کے تحت ایک سلسلہ مکتوبات شروع کر رکھا ہے جس سے ان کی غرض یہ ہے کہ ''ایسے واقعات کو شائع کر کے احسان اور ممنونیت احسان کے جذبے کو وسیع سے وسیع تر کیا جائے۔''

میں 1945ء کا ایک واقعہ عرض کرتا ہوں جب میں نے ٹی آئی کالج قادیان سے F.A کا امتحان پاس کیا۔ آگے تعلیم جاری رکھنے کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ حضرت مولانا شیر علی صاحب ہم وطن ہونے اور موضع للیانی تحصیل بھلوال میں میرے اور حضرت مولوی صاحب کے ننھیال ہونے کی وجہ سے بطور خاص میرے ساتھ مربیانہ اور محسنانہ سلوک فرمایا کرتے تھے۔ میں آپ سے ملنے ان کے گھر بھی حاضر ہوا کرتا تھا دفتر اور بیوت میں تو زیارت اور ملاقات سے روزانہ ہی مشرف ہوتا تھا۔ ایک روز مجھے پتہ چلا کہ آپ کو تیز بخار ہے اور اسی وجہ سے دفتر تشریف نہیں لا سکتے چنانچہ مزاج پرسی کے لئے میں گھر پر حاضر خدمت ہوا آپ پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے طبیعت کا احوال دریافت کرنے کے بعد یہ ذکر آیا کہ آگے B.A میں داخل ہونے کا میرا ارادہ نہیں ہے کیونکہ ملازمت میں نے نہیں کرنا ہے بوڑھے والدین کے پاس رہنا ضروری ہے۔ حضرت مولوی صاحب اُٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گئے اور فرمایا بی اے تک ضرور تعلیم حاصل کرو ایک وقت آئے گا کہ تمہیں بی اے کی ڈگری کی ضرورت پیش آئے گی اس وقت بی اے کرنا تمہارے لئے ممکن نہیں ہوگا۔ حضرت مولوی صاحب کے اس ارشاد میں اس قدر تاکید آمیز جوش تھا کہ میں نے فوراً تعمیل فرمان کا وعدہ کر لیا اور پھر بی اے کر بھی لیا گریجوایشن کے چار سال بعد تک گاؤں میں رہا زمینداری کی طرف رجحان تھا سنگتروں کا باغ لگوایا اور انقلابی فارمر بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ 1952ء میں استاذی المکرم حضرت حافظ فاتح الدین صاحب کی ملاقات کی غرض سے رتن باغ لاہور پہنچا مغرب کی عبادت کے بعد ملاقات ہوئی تو ارشاد ہوا کہ تم واپس گاؤں نہیں جاؤ گے۔

اس شاہی فرمان کو ٹالنے کا کسے یارا تھا۔ دو تین روز بعد یونیورسٹی لا کالج میں داخلے کا اعلان ہوا تو مجھے تحریک ہوئی کہ میں لاء کالج میں

داخلہ لے لوں۔ میری یہ تجویز میرے مکرم استاد میرے مربی اور میرے محسن کو پسند آئی اور 1953ء کے نامساعد حالات میں مَیں نے بہت اعلیٰ پوزیشن میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کر لیا۔

تب آٹھ سال قبل حضرت مولانا شیر علی صاحب کے پُر جوش فرمان کی حکمت معلوم ہوئی 1945ء میں بی اے میں داخلہ نہ لیتا تو 1952ء میں گریجوایشن کرنا مشکل ہی نہیں میرے لئے قطعاً ناممکن ہوتا اور لا کالج میں داخلے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

حضرت مولوی شیر علی صاحب کے اس احسان عظیم نے میری زندگی میں انقلاب آفرین تبدیلی پیدا کر دی۔ ایسے خدا نما بزرگوں کے بارہ میں ہی یہ قول صادق آیا ہے کہ ؎

گفتہ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

یہ اور اس قسم کے کئی دیگر واقعات حضرت مولوی صاحب کے احسانات کی روشن مثالیں ہیں۔ آپ کے احسانات کا بہاؤ یکطرفہ اور اتنا تیز ہوتا تھا کہ اس کی نظیریں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

مگر آپ کے احسانات کا بدلہ دینے کی مجھ میں کب استطاعت ہے ہاں دل آج بھی ممنونیت کے جذبات سے لبریز ہے اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی اقتدا میں یہی عرض کرتا ہوں کہ ؎

میری طرف سے ان کو جزا ہائے خیر دے
کر رحم اے رحیم میرے حال زار پر

(روزنامہ الفضل ربوہ مورخہ 28رجنوری 1997ء صفحہ 4)

۞۞۞۞۞۞۞۞۞۞

ایک چھوٹی سی بات

''الفضل'' میں آپ نے جو اسلوب بھی اپنایا ہے بہت ہی مفید اور معلوماتی ہوتا ہے۔ میں الفضل کے محاسن کا ذکر تو کسی اور نشست کے لئے اُٹھا رکھتا ہوں۔ آج صرف ''ایک چھوٹی سی بات'' کی افادیت کے پیش نظر میں بھی ایک ''چھوٹی سی بات'' ہی عرض کرتا ہوں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بھرپور معانقہ ہو رہا ہے اور چونکہ پہچان نہیں ہوتی کسی شخص کا نام لے لیا جاتا ہے کہ آپ فلاں شخص کے بیٹے ہیں اور یہ قیاس آرائی اکثر و بیشتر بالکل غلط ہوتی ہے۔ اب جسے کسی غیر شخص کا بیٹا بتایا گیا ہے اس کی خفت چھپائے نہیں چھپتی بلکہ اچھی خاصی گالی بن جاتی ہے۔ ایسا اندازہ لگانے والے کی خام عقلی کے پیش نظر ندامت کے اظہار پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے لیکن بعض دفعہ اس کا بڑا

سخت اور افسوسناک ردّعمل بھی ظاہر ہوتا ہے اور نوبت لڑائی تک پہنچ جاتی ہے اس لئے تجویز یہ ہے کہ جب تک قطعی یقین نہ ہو کسی شخص کی ولدیت کے بارہ میں بے جا ٹنگ بندی سے اجتناب ہی کیا جائے۔ اگر کوئی صاحب ضرور اپنی علمیت جانچنا چاہیں تو ''مجوزہ والد'' کا نام لے کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا فلاں شخص کے ساتھ کیا رشتہ یا تعلق ہے۔

پھر بعض دوستوں کی عادت ہوتی ہے کہ بجائے اپنا تعارف کرانے کے پہیلیاں اور بجھارتیں ڈالنا شروع کر دیتے ہیں کبھی فون پر اور کبھی بالمشافہ ملاقات کے موقعہ پر۔ مثلاً سوال ہوتا ہے ''جانتے ہو میں کون ہوں'' اس سے مخاطب جو نہیں پہچان رہا ہوتا ہے اسے خواہ مخواہ امتحان میں ڈال دیا جاتا ہے۔

کیا اس سے بہتر نہیں کہ آتے ہی اپنا تعارف کرا دیا جائے اور اپنے آپ کو اتنا اہم شخص نہ سمجھ لیا جائے کہ سبھی لوگ آپ کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔

(روزنامہ الفضل ربوہ 2رفروری 1993ء)

4رنومبر 1896ء کو حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے اپنے رفیق خاص حضرت منشی ظفر احمد صاحب کے نام ایک مکتوب تحریر فرمایا۔ یہ مکتوب حضرت منشی ظفر احمد صاحب کے ہاں بیٹے کی پیدائش کے موقع پر تحریر کیا گیا تھا۔ یہ ایک پوسٹ کارڈ ہے۔ تحریر حضرت بانی سلسلہ کے دستِ مبارک کی ہے۔ اصل پوسٹ کارڈ محترم مظہر صاحب کے پاس موجود ہے۔ کچھ عرصہ قبل میں نے اس کی زیارت کی۔ فوٹو کاپی حاصل کر کے اس پر پلاسٹک کور چڑھا کر محفوظ کر لیا۔

یہ مکتوب ان تین مختصر جملوں پر مشتمل ہے ''لڑکا نوزاد مبارک ہو اس کا نام محمد احمد رکھ دیں۔ خدا تعالیٰ باعمر کرے۔''

اس متبرک دستاویز کا ایک ایک لفظ اپنے اندر کئی مبارک خبریں رکھتا ہے۔

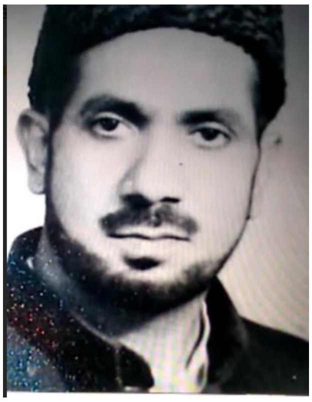
اس وقت خدا کے فضل سے 97 سال عمر ہے۔ اللہ تعالیٰ سمیع مجیب ہر روز اپنی شان ظاہر کر رہا ہے۔ وہ طبعی عمر کے لحاظ سے بوڑھا مگر اپنے علم و حلم اور دانشمندی اور دانشوری اور نوع انسانی کے لئے دردمندی اور غم خواری کے جذبات کے لحاظ سے اور اپنی سوچ اور فکر کے اعتبار سے اب بھی جواں مرد ہے۔

مَیں آخری بار 23رستمبر کو مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا بہت نحیف اور کمزور لگے مگر آواز میں وہی شوکت اور دلداری کے وہی حسین انداز۔ میں زیادہ دیر بیٹھنا نہیں چاہتا تھا لیکن ایک غیر مرئی کشش نے گویا مجھے وہاں باندھ رکھا تھا۔ برادرم ڈاکٹر حافظ مسعود احمد صاحب کے متعلق دریافت فرمایا تو مَیں نے ان کی علالت کا ذکر کیا۔ میرے لئے اور محترم ڈاکٹر حافظ صاحب کے لئے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ نہایت ادب کے ساتھ احباب جماعت سے اس مبارک اور فیض رساں وجود کی صحت و عافیت اور مزید ''باعمر'' ہونے کے لئے

دردمندی اور التزام کے ساتھ دُعا کی درخواست کرتا ہوں۔

(روزنامہ الفضل ربوہ 12 ر اکتوبر 1992ء)

محترم حافظ ڈاکٹر مسعود احمد



زندگی میں کچھ مقام ایسے آتے ہیں جب قوت گویائی آنسوؤں کی مرہون منت ہوتی ہے احساسات کی ترجمانی کے لئے قوت اظہار شرمندہ ہوجاتی ہے آنسو آنکھ میں اسی وقت آتے ہیں جب دل کو ٹھیس لگے تو اشک ہمیشہ دل کو کشید کر کے نکلتا ہے۔

دل غم سے بھرا ہوا ہے جذبات، ڈاکٹر بھائی کو فوت ہوئے مہینوں گزرنے کے باوجود منتشر، قلم ہے تو خام بلکہ شکستہ۔ یوں اس محسن کا اپنے آپ کو مقروض سمجھتا ہوں دعا کی تحریک کے لئے بہت پہلے کچھ تو لکھنے کی کوشش کرنا چاہئے تھی ایک بات دل بڑھاتی ہے کہ حضرت سلطان القلم کا غلام در ہونے کا دعویدار تو ہوں مگر پھر خوف سے کانپنے لگتا ہوں کہ کبھی نرا دعویٰ بھی کام آیا ہے پھر یہ بھی احساس کہ حافظ جی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے میں اس میں کیا اضافہ کر سکوں گا۔

مثلاً نسیم سیفی نے ایک قطعہ میں نہایت بلیغ الفاظ میں حافظ بھائی کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں میں کیا رنگ بھر سکوں گا ؎

خدمت انسان کی خاطر گزاری زندگی
سچ تو یہ ہے تھی رضائے ذات باری زندگی
تھا سعادت کی علامت نام بھی مسعود تھا
نیکیوں میں ہی کٹی ساری کی ساری زندگی

جب بھی کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تو ہر بار غم والم نے دل و دماغ پر ایسا غلبہ کیا کہ توفیق ہی نہ ہوئی اور کم علمی کا احساس اس پر مستزاد۔ آج ارادہ کیا ہے کہ جو کچھ بن پڑے لکھوں گا ضرور!

حافظ بھائی ایک مرد حق آگاہ تھا دکھی اور حاجت مند کا مونس و غم خوار۔ ایک فیض رسان ہستی انہیں ایک حساس دل عطا ہوا تھا زمانے کے ظلم و ستم خصوصاً آزادی فکر و خیال پر پابندیوں کی وجہ سے ان کے دل پر سخت چوٹ لگتی تھی۔

موجودہ دور کے معاشرے کی روش اور انداز کو دیکھ کر انہیں بہت دکھ ہوتا تھا کہ یہ ان کی فطری اور جبلی راست روی اور بلند کرداری کے خلاف تھا۔ وہ لاکھوں میں ایک تھا انہیں ملتے تو دل و دماغ کو حوصلہ ملتا۔ وہ تعصّبات کے ماحول میں فراخ دل جہالت کے دور میں علم و عمل

کا متوالا۔ مفادات کی سوسائٹی میں اپنے بلند نظریات کو عزیز از جان سمجھتا تھا قول و عمل میں کوئی تضاد نہ تھا بلکہ ان کا عمل ان کے قول اور زبانی عہد سے ہمیشہ آگے بڑھ جاتا تھا۔

یونان کا فلاسفر دیو جانس کلبی دن کی روشنی میں چراغ لے کر ہر راہ گیر کے چہرے کے قریب لا کر دیکھتا اور کہتا کہ مجھے انسان کی تلاش ہے اور کوئی انسان نظر نہیں آتا۔ یہ دور بھی کچھ ایسا ہی ہے جس میں انسان کم کم ہیں اگر وہ یونانی فلاسفر زندہ ہوتا اور اندھیری رات میں بھی اس کا گزر ادھر سے ہوتا تو اسے یہ شخص ایسی روشنی بکھیرتا نظر آتا جو ظلمتوں کے سینوں کو چیر کر دیو جانس کلبی کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔

ے

ڈھونڈتی پھرتی تھی شمع نور کو محفل کبھی
اب تو ہے خود شمع کو دنیا میں محفل کی تلاش

مجھے حافظ بھائی کو بہت قریب سے دیکھنے اور انہیں پڑھنے کا 40 سال کا طویل عرصہ نصیب ہوا۔ میں نے اسے تقویٰ کی باریک راہوں کا متلاشی پایا اور روشنی کا مینار، سنگ و خشت کا مینار ٹوٹ سکتا ہے یا ٹیڑھا ہو سکتا ہے مگر وہ تو زندگی بھر مستقیم رہا کیونکہ اس کا نظریاتی قبلہ درست تھا اور راست تھا اور اس کی چال کا ہر قدم تقویٰ پر ہی پڑتا تھا اس کا چشمہ فیض ہمیشہ موج میں رہتا تھا اور اس کی فیض رسانی سے اپنے ہی نہیں پرائے بھی بہرہ ور ہوتے تھے ہر چند کہ وہ عنایات کریمانہ خفیہ طریق پر بھی کرتے تھے مگر ہمیں ان کے قرب اور ہم نشینی کی وجہ سے کچھ نہ کچھ پتہ چل بھی جایا کرتا تھا۔

اس وقت بھی کئی مثالیں ذہن میں مستحضر ہیں تاہم ایک دو کا بیان ہی اس مختصر مضمون میں ممکن ہے ایک دن میں آپ کے پاس کلینک میں بیٹھا تھا کہ ایک نشہ باز مریضوں کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ حافظ صاحب تاڑ گئے کہ نشہ آور دوائی نہ ملنے کی وجہ سے بدحال ہو رہا ہے خاموشی سے اس کے پاس گئے اور دس روپے کے کچھ نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دئے اور وہ اُٹھ کر چلا گیا۔ میں نے کہا بھائی آپ نے نشہ باز پال رکھے ہیں کہنے لگے اسے نشہ کی پرانی لت ہے میں نے دیکھا کہ اس کی بری حالت ہو رہی ہے اگر فوراً مطلوبہ نشہ نہ ملا تو مر جائے گا یہ ایسی حالت ہو جائے تو یہاں آ جایا کرتا ہے اگر ایسی صورت میں اسے فوراً نشہ نہ ملے تو وہ ہلاک ہو جائے گا ان کی وفات کے بعد بہت سے لوگ جمع تھے اسی بات کا تذکرہ ہوا تو سیّد مسعود زاہدی صاحب سابق ایڈووکیٹ جنرل پنجاب نے بڑے وثوق سے کہا کہ یہ ہے عین انسانیت۔

ودود مارکیٹ کے آپ کے کئی کرایہ دار کرایہ بقایا دار رہتے تھے نہ خود مطالبہ کرتے تھے نہ بیٹوں کو وصولی کی اجازت دیتے تھے بلکہ بقایاداروں کو الٹا نقد رقوم دے دیا کرتے تھے۔ شہروں میں درجنوں ایسے ہیں جن کو نقد رقوم دی ہوئی تھیں ان میں ایک خانہ بدوش پٹھان

بھی تھا وہ تو حاجت مندوں کی تلاش میں رہتے تھے ایک روز بارش تھی تو ملازم کو ساتھ لے کر فروٹ خرید نے چلے گئے اس روز گرد بیٹھ جانے کی وجہ سے نئی وکونا کی سیاہ اچکن زیب تن کر لی فٹ پاتھ پر جا رہے تھے کہ ایک مولوی صاحب نے دیکھا تو کہا جو اللہ چاہے لیکن حافظ صاحب متوجہ نہ ہوئے واپسی پر پھر اسی مولوی صاحب نے وہی الفاظ دہرائے تو اس سے پوچھا مولوی صاحب کیا بات ہے اس نے کہا کہ جناب بڑی خوبصورت اچکن ہے خوب سجی ہے اس کو بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ گھر لائے فروٹ سے تواضع کی اور اچکن اسے پہنا کر وہی الفاظ دہرائے کہ جو اللہ چاہے آپ کو بھی اچھی لگ رہی ہے یہ آپ ہی پہنا کریں اور شاید معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ مولوی صاحب کون تھے فیاضی اور دریا دلی کا یہ واقعہ بھلا کسی تبصرے کا محتاج ہے۔

واقعات بہت ہیں بڑے روح پرور اور دلربا داستانیں ہیں مگران کے بیانات کے لئے کسی پرویز پروازی ایسے قلمکار کے طرز تحریر کی ضرورت ہے جن پر ہمیشہ مجھے رشک آتا ہے انہوں نے ایک مختصر مضمون شائع کروایا تھا مگر تشنگی ہی رہی۔ میں نے کئی بار کچھ لکھنے کی کوشش کی کبھی جذبات سے مغلوب ہو کر پرانی میٹھی یادوں میں کھو گیا اور لکھنے کا ہوش ہی نہ رہا کبھی اپنی کم علمی آڑے آ گئی اور اسی گومگو میں چھ ماہ کا طویل عرصہ گزر گیا۔

حافظ جی کی شخصیت پہلو دار تھی ان کے بہت سے معشوق تھے اور ان کے عشاق کی بھی کمی نہیں تھی۔ وہ کلام الٰہی کا سچا عاشق تھا جب وہ کلام الٰہی کے سرمدی نغمات الاپتا تھا تو خود بھی جھوم جاتا تھا اور سامعین پر بھی جذب وکیف کی حالت وارد ہو جاتی تھی اس نے اللہ کے اس آخری آسمانی صحیفہ سے اپنے سینہ و دماغ کو منور کر لیا تھا اور اس کے مطالب و معانی پر عمر بھر گہرا غور کیا کرتا تھا اس نے بیت مبارک قادیان میں ڈھلتی راتوں کے اوقات میں کلام الٰہی سنایا اور عشاء کے وقت بھی۔ شاید وہ یکتا حافظ تھا جس نے مسلسل 55 سے زائد سالوں میں بابرکت مہینہ میں اللہ کا کلام سنایا بابرکت ایام جوں جوں قریب آتے جاتے تھے وہ کمر ہمت کس لیتا اس پر جذب ومستی چھا جاتی پھر وہ اس مبارک مہینہ میں تو گویا کسی اور دنیا میں چلا جاتا تھا کلام الٰہی اس کی غذائے روحانی تھی اسے پڑھتے پڑھتے اس کے مضامین اس طرح اس کے قلب وروح پر وارد ہو جاتے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا اسے روحانی پر لگ گئے ہیں اور وہ کلام اللہ کو نازل کرنے والے اپنے خالق و مالک کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا ہے سامعین اور مقتدی بھی اپنی اپنی علمی اور روحانی استطاعت کے مطابق اس کے ہم سفر ہوتے تھے اس کیفیت کا بیان میری طاقت سے باہر ہے۔ حضرت فاتح الدین صاحب کا زمانہ تھا جلسہ سالانہ کے افتتاحی اجلاس میں انہوں نے تلاوت کی اس روز کی تلاوت میں معمول سے بھی بڑھ کر سوز تھا سامعین پر جوں جوں اللہ کی بخشش اور توبہ قبول فرمانے اور اس کی رحمت کے سایہ فگن ہونے کے مضمون کھلتے گئے وجد کی حالت طاری ہوتی گئی۔ دوسرے اجلاس میں سٹیج پر ہم دونو اکٹھے بیٹھے تھے کہ انہیں ایک مکتوب ملا جس میں افتتاحی اجلاس میں تلاوت کا ذکر تھا نیز اس کاتب سامع نے لکھا کہ میں نے اس دوران ایک نظارہ دیکھا کہ

فرشتوں نے سارے پنڈال پر رحمت کے اور مغفرت الٰہی کے پر پھیلا دئے ہیں۔مکتوب تو تفصیلی تھا حافظ جی نے پڑھ کر از راہ کرم مجھے بھی پڑھایا۔ایک دن میں نے بیماری کی شدت کے دوران پوچھ ہی لیا کہ اس بیماری کا حافظے پر کیا اثر پڑا ہے فرمایا اللہ کا کلام تو مجھے خوب یاد ہے گزشتہ رات سانس کی تکلیف کی وجہ سے سو نہیں سکا بلکہ لیٹنا بھی ممکن نہ تھا تو میں نے 18 سیپارے کلام الٰہی کے پڑھ لئے۔مجھے تعجب ہوا کہ اس قدر نقاہت کی حالت میں اور بیماری کے شدید دورہ کے باوجود اتنی تلاوت زبانی کرنے کی کیسے توفیق ملی تو ان کا جواب تھا کہ اس سے مجھے تکلیف اور بیماری کا احساس ہی بھول جاتا ہے اور دس دس سیپارے روزانہ تو اکثر پڑھتا ہوں۔

دنیا میں 74 سال کا عرصہ ایک نہایت ہی قابل رشک حالت میں گزارا دوستیاں نبھانے وفا پالنے اور حفظ مراتب کرنے کی کسی شخص کی مثال درکار ہو تو حافظ بھائی عمدہ نمونہ بن کر سامنے آتے ہیں۔وضع دار اور پر کشش شخصیت تھی۔1974ء میں ناکردہ گناہ میں دو مہینے کے قریب جیل کی صعوبتیں برداشت کیں۔ناز و نعم میں پلا ہوا بیٹا عزیز منصور احمد (ڈونا) بھی صاحب السجن تھا باپ بیٹے نے یہ ابتلا کا زمانہ بڑے صبر اور شکر اور دلیری سے گزارا بہت کوشش ہوئی کہ گھر کا کھانا بھجوایا جائے مگر بالکل نہیں مانے بڑی وجہ تو یہ بیان کرتے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس ابتلا سے گزارنا پسند فرمایا ہے تو اس سے فرار کی راہیں تلاش کرنا شاید موجب رضائے الٰہی نہ ہو۔دوسرے یہ کہ دین حق کے ''شیدائیوں'' نے نہ اس کی اجازت گوارا کرنا ہے نہ ہی کھانا لانے والا محفوظ رہے گا۔گویا وہی صورت تھی جو پنجابی شاعر نے کہا تھا

کجھ اونج وی راہاں اوکھیاں سن
کجھ گل وچ غم دا طوق وی سی
کجھ شہر دے لوک وی ظالم سن
کجھ مینوں مرن دا شوق وی سی

بہت سے واقعات کا تو میں خود شاہد ہوں ان کا یہ احسان تھا کہ مجھے اکثر اعتماد میں لیتے تھے ایک واقعہ کا ذکر عزیزہ بہن صفیہ اشرف صاحبہ نے ایک مطبوعہ مضمون میں کیا ہے اس کی تفصیل بیان کرنے سے میں رک نہیں سکتا۔ایک روز انہیں ملنے کے لئے ان کے جائے قیام پر گیا اور روزانہ ہی وہاں میں حاضر ہوا کرتا تھا تو اس روز کچھ لکھ رہے تھے اور باہر دروازے پر ایک موٹر کار کھڑی تھی۔

یہ موٹر کار حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب کی تھی انہوں نے ایک خط دے کر اپنے ڈرائیور کو بھیجا تھا حضرت صاحب کا وہ خط بھی مجھے پڑھایا جس میں یہ تاکید لکھی تھی آپ یہ کار ہمیشہ کے لئے رکھ لیں آپ کو سانس کی تکلیف رہتی ہے چلنا پھرنا مشکل ہے اور کہ میرے پاس متبادل انتظام سواری کا ہے وغیرہ۔

حافظ صاحب نے جواب لکھ کر مجھے یہ کہتے ہوئے دیا کہ حضرت صاحب کے بھائی ہیں اور بڑے حضرت صاحب کے صاحبزادے ہیں اگرچہ میرے تو چھوٹے بھائی ہیں کہیں کوئی ناروا یا ادب کے منافی بات نہ لکھ دی ہو اگر ایسا ہو تو وہ کاٹ دیں۔ اس خط میں لکھا تھا کہ 9x12 کا ایک کمرہ میری ساری کائنات ہے میں نے گھر سے نکل کے کہاں جانا ہے نہ کوئی پیشہ باقی رہا نہ دکان۔ نیز تعصّبات ایسے ہیں کہ آج بھی میں جس موٹر کار میں کسی ''پروانے'' کو نظر آؤں گا اسے جلا دیں گے۔ آپ کا شکریہ میں آپ کی قیمتی پیش کش ان وجوہ کی بنا پر قبول کرنے سے معذور ہوں اسے خاطر میں نہ لائیں نیز لکھا کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے وہ کہے گا ''او بے غیرت مسعود ساری عمر تمہیں میں نے موجیں کرائیں ذرا سا جھٹکا دیا ہے تو تم میری رحمت سے مایوس ہو گئے ہو کہ اب تمہیں دینے کے لئے میرے خزانے میں کوئی گنجائش نہیں ہے اور غیروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو۔''

''او بے غیرت مسعود'' کے الفاظ تو ہو بہو وہی ہیں باقی عبارت اگرچہ میرے دماغ کے لاکر میں محفوظ ہے تاہم کوئی لفظ آگے پیچھے ہو سکتا ہے۔ مفہوم بہر حال وہی ہے۔ حضرت صاحب کی وسیع حوصلگی ایثار اور فیاضی کی ایک زمانہ قسم کھاتا ہے۔ اپنے بھائی کے حالات معلوم کر کے قلب مطہر پر چوٹ لگی نہایت پیارا اور روح پرور خط لکھا کاش میں حافظ جی سے مانگ لیتا تو آج قارئین الفضل کی ضیافت طبع کے لئے پیش کر سکتا۔ موٹر کار پیش فرما دی اور ڈرائیور کو بس پر واپس آنے کا ارشاد فرمایا۔ آپ کے دل صافی میں تموج کی حالت کو تو اللہ علیم و خبیر جانے میں نے وہ خط پڑھا تو محبت و شفقت کے سمندر میں تلاطم کا کچھ اندازہ ہوا جو میرے اور آپ سب کے آقا و محبوب کے دل میں بپا تھا۔ ؎

آہ وہ حسن مقابل وہ جمال ہم نشیں
دامن موج ہوا میں اک بہشت عنبریں
گفتگو کچھ اس سلیقے سے کچھ اس انداز سے
دل بچانا سخت مشکل تھا کمند ناز سے

قریشی محمود الحسن صاحب۔ محمد اقبال پراچہ صاحب اور میں اکثر اکٹھے ملنے جایا کرتے تھے اس تنگ دامانی اور بے نوائی کے عالم میں بھی ہر بار فروٹ وغیرہ سے تواضع کرنے پر اصرار کرتے تھے ہمارے ساتھ بے تکلفی تھی انکار کریں تو ان کے دل حساس پر ایسی چوٹ لگتی تھی جسے ہم بھی بھانپ جاتے تھے اور ہمیں بھی تکلیف ہوتی تھی۔

سوچتا ہوں کہ یہ حافظ مسعود بلخ کا وہ جوان ہی تھا جس نے حضرت ابو یزید بسطامیؒ سے پوچھا تھا کہ حضرت قناعت کیا ہے انہوں نے فرمایا کہ قناعت یہ ہے کہ کچھ مل گیا تو کھا لیا کچھ نہ ملا تو خاموش رہا۔ اس سعادت مند نوجوان نے کہا کہ حضرت یہ تو بلخ کے کتے بھی کرتے

ہیں قناعت یہ ہے کہ کچھ مل گیا تو تقسیم کر دیا اگر کچھ نہ ملا تو شکر ادا کیا۔

حافظ بھائی سے میری دوستی کی ابتداء 1954ء میں ہوئی پھر رشتہ داری بھی ہوگئی۔ مجھے اس پر فخر رہا کہ میری خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود انہوں نے مجھے اپنا ہمدم و ہم راز بنالیا۔ میں اپنا حال زار ان سے چھپانے کی کوشش کرتا مگر وہ بلا کے قیافہ شناس تھے ضرور ٹوہ لگا لیتے اور پھر مسلسل دعاؤں سے مدد فرماتے ہر خوشی غمی میں ان کی شرکت میرے لئے باعث برکت اور حوصلہ افزائی کا موجب ہوا کرتی تھی اور اب ؎

کسی موسم میں جی لگتا نہیں ہے
تیرے آنے کا موسم ڈھونڈتے ہیں

اگرچہ ان کی طویل بیماری نے عرصے سے اداسی اور بے کیفی طاری کر رکھی تھی جسم ناتواں ہوتا جارہا تھا پر روح میں وہی تازگی۔ جب ملاقات کر کے اٹھتے تو مسرت اور ملال کے ملے جلے جذبات ہوتے تھے۔

آخر وہ دن آ گیا جب کلام الٰہی سے منور جسم و جان سے ان کی روح اپنے مالک کی طرف پرواز کر گئی یہ چل چلاؤ کی ریت بہت پرانی ہے اس سے کسی کو مفر نہیں۔ عالم پناہ اور تاجدار بھی رخصت ہوگئے اور ستم رسیدگان روزگار بھی چلے گئے مگر حافظ بھائی کی موت ایک عالم کی موت تھی ایسا محبت کرنے والا وجود ہمیں چھوڑ گیا جو عمر بھر نہیں بھولے گا ان کے رشتہ داروں اور چاہنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا سب سے تعزیت کرنا چاہی پھر غور کیا تو اپنے آپ کو سب سے زیادہ تعزیت کا مستحق پایا چنانچہ اپنے آپ سے ہی سرگوشیاں کر لیں۔ بہت عرصے کے بعد پیارے بھائی ودود احمد سے قلمی تعزیت کرنا ضروری سمجھا کہ وہ حافظ جی کے دل میں رہتا تھا لنڈن میں نہیں۔

حیرانگی کی بات ہے کہ اس تعصّبات کے دور میں ماتم پرسی کرنے والوں میں علماء شہر کا ایک بڑا گروہ بھی آیا سبھی بہت عزت اور ادب سے یاد کر رہے تھے وجہ ظاہر تھی کہ حافظ صاحب کا فیضان عام بلا تمیز و مذہب جاری رہتا تھا اس ادراک کے باوجود اتنے علما کی آمد میرے لئے حیرت کا موجب بنی رہی اور جگن ناتھ آزاد کا یہ شعر بہت یاد آتا رہا۔

کیا خبر کیا بات اس کے ''کفر'' میں پوشیدہ تھی
ایک ''کافر'' کیوں حرم والوں کو یاد آیا بہت

ودود مارکیٹ میں میرے بہت پیارے رہتے ہیں ان کو ملنے جایا کرتا ہوں مگر وہ پہلی سی کشش باقی نہیں رہی عزیزوں کا پیار بلاتا ہے تو حافظ بھائی کی غیر حاضری کی وجہ سے وہاں کا ماحول منجمد اور بانجھ سا لگتا ہے شامیں تھکی تھکی ہوئی لگتی ہیں اور ایک عجیب اداسی اور سراسیمگی ماحول پر طاری رہتی ہے۔

یا اللہ رحم فرما کوئی معجزہ دکھا کہ ان کے پسماندگان کو ان کی صفاتِ حسنہ فیاضی سے ودیعت فرما تا وہ نور جو نصف صدی تک اس مقام پر برستا رہا اب بھی اس کی ظلمتوں کو پاش پاش کر کے اس کے درودیوار اور سینہ و دل کو روشن کر دے اور حافظ بھائی کو اپنے فضل سے اپنے قرب کے اعلیٰ مدارج عطا فرمائے۔

اے خدا بر تربتِ او ابرِ رحمت ہا ببار
داخلش کن از کمالِ فضل دربیت النعیم
نیز مارا از بلا ھائے زماں محفوظ دار
تکیہ گاہ ما توئی اے قادر و ربِ رحیم

(روزنامہ الفضل ربوہ مورخہ 17/اپریل 1997ء صفحہ 3،7)



خان بہادر ملک صاحب خان صاحب نون ڈپٹی کمشنر (ر)

سب تحصیل بھیرہ میں نون قوم بارہ دیہات اور وسیع اراضیات کی مالک ہے ضلع سرگودھا کے رؤساء نمبر ایک پر اس کا شمار ہوتا ہے بہت عمدہ اور اعلیٰ قسم کے مختلف پھلوں کے باغات اُگانے میں علاقے کے زمینداروں سے سبقت لے گئے ہیں۔ سپاہ گری بھی ان کا پیشہ تھا اس قوم میں بڑے بڑے نامی فوجی افسر ہوئے اعلیٰ سول عہدوں پر بھی فائز رہے۔ سر فیروز خان صاحب نون کے والد نواب ملک حیات صاحب انگریزوں کے دور میں کمشنر تھے اور سر فیروز خان صاحب گورنر، وزیر اعلیٰ اور وزیر اعظم پاکستان ہوئے اسی رئیس خاندان میں سے ایک وہ بھی ہوئے جو دیانتداری اور بہادری اور راست روی اور راستبازی اور عبادت گزاری اور تقویٰ کی باریک راہوں کی تلاش میں ساری قوم اور برادری میں یکتا اور بے مثال تھے انہی کے متعلق ایک انقلاب آفرین واقعہ لکھنے کا ارادہ کیا ہے۔

یہ ملک صاحب خان صاحب نون تھے۔ جو ''ممبر برٹش ایمپائر'' اور ''خان بہادر'' کے خطاب یافتہ تھے۔ ڈپٹی کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ قریباً 60 سال کا واقعہ ہے امرتسر میں سٹی مجسٹریٹ تعینات تھے۔ ہر چند کہ پرانی ہے دلچسپ کہانی ہے وہاں کا ڈپٹی کمشنر ایک متعصب اور حاسد سکھ تھا نون صاحب رئیس ابن رئیس تھے نئی موٹر کار جو اس زمانے بہت شاذ ہی کسی کے پاس ہوتی تھی ملک صاحب کے پاس تھی اور پھر نجی نوکروں کا لشکر شکار کھیلنے کے لئے کتے اور اعلیٰ نسل کے گھوڑے ملک صاحب کے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ میں چار چاند لگا رہے تھے اور سکھ ڈپٹی کمشنر حسد میں جل بھن گیا اور ملک صاحب کو زِچ کرنے کے لئے اس نے ملک صاحب کو اتنا کام دے دیا جو تین

مجسٹریٹوں سے بھی ختم ہونے والا نہیں تھا اور اس کی غرض یہ تھی کہ ملک صاحب فرائض کی سرانجام دہی میں ناکام ہوں اور افسران بالا کو ان کی ناکامی کی رپورٹ بھجوادی جائے ملک صاحب بہت بہادر شخص تھے انہوں نے اس چیلنج کو قبول کیا اور عدالت کے ریٹائرنگ روم میں ڈیرہ ڈال دیا اور دن رات کام کر کے سارا کام بخوبی مکمل کر لیا۔

اسی دوران ایک رات ملک صاحب پچھلے پہر کی عبادت کے بعد اور فجر سے پہلے لیٹ گئے۔ایک رؤیا دیکھی جس کے نتیجہ میں احمدیت قبول کر لی۔

نوجوانی میں عبادات کے پابند تھے بلکہ آخر شب آہ وزاری کرنے کے عادی بھی تھے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو سونا کندن بن گیا۔لمبا قد شاہانہ چہرہ عطا ہوا تھا آنکھوں سے محبت اور شفقت کی پھوار برستی تھی کشادہ پیشانی ان کے وسیع قلب کی علامت تھی۔لباس تقویٰ خوب سجتا تھا۔غرباء پروری اور زخمی دلوں پر پھایہ رکھنا ان کا دستور تھا۔امام جماعت کی اطاعت میں بے حد محتاط تھے۔حضرت صاحب کی خواہشات کو بھانپ لینے کی کوشش میں رہتے اور اس راہ میں خاندانی وجاہت خان بہادری اور دنیاوی شان وشوکت اور جاہ وجلال کو چھوڑ کر عشق محبوب میں دیوانگی کی حدوں کو چھونے لگے مگر آقا کے آگے خاک نشینی نے ان کے رعب و دبدبہ اور عزت ووقار میں اور بھی اضافہ کر دیا۔میں نے وزیر اعظم پاکستان جناب ملک فیروز خان صاحب نون کو حد درجہ مؤدب طریق پر ان کے سامنے کھڑے دیکھا۔سچ ہے بات کہاں ملوکانہ فخر وجاہ میں ہے جو بات مرد قلندر کی اک نگاہ میں ہے۔

یہ نون صاحب ایثار واخلاص کے پیکر احمدیت کے لئے بڑی غیرت رکھتے تھے روساء ضلع اور اعلیٰ افسران میں اپنی شان تقویٰ کی وجہ سے ان کا مقام ومرتبہ ایک بلند وبالا محکم ستون کی مانند تھا۔غریب پروری ان کا خاص وصف تھا کسی ستم رسیدہ کا علم ہوتا تو اس کے سارے ہم وغم اپنے سینے میں منتقل کر لیتے اور پھر ڈنکے کی چوٹ اس کی مدد کے لئے کمر بستہ ہو جاتے اس ضمن میں ان کی بے خوفی اور بہادری اور دلیرانہ جدوجہد کی دلکش اور خوبصورت مثالیں میری گوش شنید اور چشم دید ذہن میں مستحضر ہیں مگر طوالت کا خوف بیان کرنے میں مانع ہے۔

حضرت صاحب کی جلسہ سالانہ کی تقریر سے متاثر ہو کر دو مربع نہری اراضی جو پختہ سڑک رونده سردار پور نون پر واقع تھی تحریک جدید کے نام منتقل کر دی۔

فقیر اپنا اثاثہ راہِ مولیٰ میں لٹاتے ہیں
کبھی یہ حوصلہ دیکھا نہیں ہے تاجداروں میں

84 سال کی عمر پائی بالآخر 17رجولائی 1966ء کو یہ عشق ووفا کا پیکر اور زہد وتقویٰ اور رضائے باری تعالیٰ کی راہوں کا مسافر اللہ

کے حضور حاضر ہو گیا۔ ؎

پہلے ہی کم تھی قریۂ جاناں میں روشنی
اور اس پہ کچھ چراغ بھی کم کر دیئے گئے

بہت سے احباب موضع فتح آباد نون میں ان کی الوداعی تقریب میں شمولیت کے لئے سرگودھا اور ربوہ سے تشریف لے گئے جن میں ہمارے موجودہ امام ہمام حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب اور حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب اور حضرت مرزا عبدالحق صاحب صوبائی امیر جماعت احمدیہ بھی شامل تھے۔

تدفین کے روز ہی یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ شمع جو امرتسر میں ایک رات کے پچھلے پہر اللہ کے حکم سے روشن ہوئی تھی اور پھر نصف صدی تک ضوفشانی کرتی رہی وہ ٹمٹمانے لگی ہے اور فتح آباد کی بستی جسے جناب ملک صاحب کی درخواست پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے قدموں نے بھی برکت بخشی تھی اس سے سرکاری نعماء اور برکات 17 رجولائی 1966ء کو چھینی جارہی تھیں۔

صدحیف 17 رجولائی کا 63 سال کے عرصے کے بعد تو اردبھی کتنا الم ناک بنا ہر انسان نے مرنا ہے اس لحاظ سے یہ انوکھا سانحہ نہیں تھا لیکن رونا اس پر آیا کہ ایک اہل کمال اُٹھ گیا ہے اور اس کی جگہ خالی ہوگئی ہے ملک صاحب کے باغ میں بڑی امیدوں کے صدقے میں بہار آئی تھی مگر افسوس کہ اسے خزاں میں بدلتے دیر نہ لگی اور فتح آباد پر وہ نامساعد زمانہ آیا کہ اس دور میں محبتیں نیلام ہوگئیں۔ اس دور میں وفاؤں کے بیوپار ہو گئے۔ میں جب کبھی موقعہ ملے تو اس بستی میں ملک صاحب کی قبر پر دعا کے لئے حاضر ہوا کرتا ہوں۔ نہ وہ وسیع اراضیات جو 47 مربع پر پھیلی ہوئی تھیں نہ وہ باغات نہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے اور نہ مال مویشی باقی رہے اب یہ بستی اور اس کی وسیع جائیدادیں غیروں کی ملکیت ہیں۔ آں قدح شکست آں ساقی نماند۔ چشم تصور میں 1966ء سے پہلے کی رونقیں کبھی دربار عالم کے نظارے کبھی خواص اور رؤساء ضلع اور اعلیٰ افسران کی عقیدتمندانہ حاضریاں کبھی جبر وستم کے پسے ہوئے لوگوں کی قطاریں کبھی علاقے کے فرعون صفت چوروں ڈاکوؤں اور وڈیروں سے مظلوموں سے لوٹے ہوئے اموال کی واپسی کی پر ہیبت اور پر جلال نظارے دیکھتا ہوں پھر وہ نظارہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے کہ کس طرح یہ رئیس نون اپنے آقا ومطاع کے قدموں میں نہال بیٹھ کر مسرتوں سے جھوم رہا ہے اور اسے بجا طور پر فخر محسوس ہو رہا ہے کہ کنواں پیاسے کے پاس چل کر آ گیا ہے۔

میری ٹوٹی پھوٹی عبارتیں نہ اس عاشق زار کے دل کا نقشہ کھینچ سکتی ہیں نہ اس کے اُٹھ جانے کے بعد در و دیوار کی حالت زار بیان کر سکتی ہیں۔ اس بستی کی بہاریں دیکھی تھیں اب پت جھڑ کا موسم دیکھا نہیں جاتا دل بیٹھنے لگتا ہے نحوستوں تاریکیوں اور اداسیوں نے اس مقام کو گھیر رکھا ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے مجھے تعلق قائم رکھنے کا تاکیدی ارشاد فرمایا تھا سو اس پر عمل ہے۔ اللہ کی رحمت سے کیا بعید کہ بھنے ہوئے بیج سے کبھی روئیدگی پھوٹ پڑے کہ وہ مردوں سے زندہ پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

میں قارئین کرام سے جناب ملک صاحب کی بلندی درجات کے لئے دعا کی درخواست کرتا ہوں نیز یہ بھی دعا کریں کہ ملک صاحب کے ایمان و ایقان کا ثمر کہ جو سونے کی ڈلی کی صورت تھا اور جو اب مٹی میں مل چکا ہے پھر اپنی چمک دمک دکھائے جیسے 30 برس پہلے تھا اب تو اس گاؤں کے در و دیوار اور اس کی حسرت و یاس میں ڈوبی ہوئی فضائیں گنگناتی محسوس ہوتی ہیں۔ ؎

آندھیو جاؤ اب کرو آرام
ہم خود اپنا دیا بجھا بیٹھے

یا اللہ رحم فرما۔

(روزنامہ الفضل ربوہ مورخہ 27 / جنوری 1998ء صفحہ 5)

۞۞۞۞۞۞۞۞۞



ٹی آئی کالج کے پرنسل سے قدرت ثانیہ کے مظہر ثالث تک

میں نے 1944ء میں ادھر میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ادھر قادیان سے عالی مقام منادنے ناقوس بجایا کہ ٹی آئی کالج میں اس سال فرسٹ ایئر میں داخلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ بچوں کو اس میں داخل کرا دیں۔ انٹرنس میں اچھے نمبروں کی وجہ سے گورنمنٹ کالج لاہور جس کی شہرت عروج پر تھی اور جہاں داخلے کو کامیابی کی کلید اور بلند نصیبے کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اس میں میرا داخلہ سہل تھا۔

مگر میرے ابّا جنہیں ''رفیق'' ہونے کا شرف حاصل تھا نے یہ سنہری مشورہ نما حکم دیا کہ قادیان کی درسگاہ کے پرنسپل حضرت صاحب کے فرزند اکبر مقرر ہوئے ہیں وہاں جاؤ۔ ان سے تربیت حاصل کرنے کا موقع ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ۔

اور ہم ''بلخ'' اور ''بخارا'' کو چھوڑ چھاڑ کر اس روایتی ''چوبارے'' پر جا پہنچے اور اپنے مرشد کے اس قول صادق کے مطابق کہ ہم تو بستے ہیں فلک پر اس زمین کو کیا کریں گو یا زمین کو چھوڑ کر ہم نے بھی ایک ''فلک'' پر جا بسیرا کیا۔ حضرت صاحبزادہ صاحب کو یوں تو پہلے بھی دیکھا ہوا تھا مگر پہلی مرتبہ جب کالج کے پرنسپل کی کرسی پر بیٹھے دیکھا تو اپنے انتخاب کی خوبی اسی لمحے ثابت ہو گئی۔

آنکھیں کہ جیسے نور کی ندی چڑھی ہوئی
چہرہ کہ جیسے پھول کھلا ہو گلاب کا

میں دل سے شکرگزار ہوں اپنے شفیق استاد جناب پروفیسر محمد علی صاحب کا جنہوں نے اگلے روز خط کے ذریعہ حضرت فاتح الدین کی یادداشتوں کو قلمبند کرنے کی طرف توجہ دلائی گو مجھے توجہ پہلے بھی تھی کئی بار نوٹ لکھے مگر ہر بار جذبات سے مغلوب ہوکر اوران شیریں واقعات کو یاد کرکے اور پھر اپنی محرومیوں اور اداسیوں میں ایسا ڈوب جاتا کہ یہ سلسلہ منقطع ہوجاتا رہا اب اس میری کاوش کا مقصد بھی کوئی سیرت نگاری یا سارے واقعات کی تفصیل بیان کرنا نہیں۔ بلکہ چند جستہ جستہ واقعات کا بیان کرنا مقصود ہے اس سے میرے بہت محبت کرنے والے استاد کے ارشاد کی تعمیل بھی ہوجائے گی اور مغفرت الٰہی کی تلاش بھی میرا مقصود ہے۔

کالج میں پہلا باقاعدہ خطاب

اگرچہ مختلف موضوعات پر حضرت صاحبزادہ صاحب کے حکیمانہ ارشادات سننے کے مواقع تو بہت ملتے تھے مگر داخلے کے چند ماہ بعد جب موسم گرما کی تعطیلات ہوئیں تو الوداعی تقریب منعقد ہوئی اس میں آپ نے ایک دلربا تقریر کی۔ اس کا نفس مضمون 54 سال کا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود اب تک نہیں بھولا۔ طویل تعطیلات کے لئے جہاں تعلیمی اور تربیتی پروگرام عطا فرمایا وہاں سیر و سیاحت کرنے اور عزیزوں دوستوں اور رشتہ داروں سے ملاقاتیں کرنے کی بھی تلقین فرماتے ہوئے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ''ولنفسک علیک حق'' کی لطیف تشریح بھی فرمائی۔

مجلس عرفان

قادیان کی ''بیت مبارک'' میں ایک علمی اور روحانی محفل مغرب اور عشاء کے درمیان منعقد ہوا کرتی تھی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رونق افروز ہوتے تھے۔ علم وعرفان کی گھٹائیں جو وہاں برستی تھیں۔ ان کی تفاصیل بیان کرنے کی گنجائش یہاں نہیں اور حق تو یہ ہے کہ مجھ میں اس کی ہرگز طاقت ہی نہیں ہے۔

اے کاش آجکل کی ایجادات اس زمانے میں موجود اور میسر ہوتیں تو وہ روحانی کیف جو اس قدوسیوں کی مجلس پر چھایا ہوتا تھا اور وہ غفران کی آسمانی چادریں جو اس مجمع پر تنی رہتی تھیں اور جس طرح وہ مہ تاباں اپنے ستاروں کے جھرمٹ میں بیٹھا نور بکھیرتا تھا اور آسمانی مائدہ تقسیم کرتا رہتا تھا۔ اس کو وہ ریکارڈ کرتیں اور اسے دیکھ دیکھ کر اور سن سن کر قیامت تک کے لوگ فیضیاب ہوتے رہتے۔ اس بدر کامل کے روبرو کچھ ہلال بھی تھے۔ آج بھی حضرت صاحب کے دائیں جانب شہ نشین پر بیٹھے حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب کو کمال توجہ اور عقیدت مندانہ انکساری کے ساتھ ہمہ تن گوش اپنے محبوب کے چہرہ مبارک پر ٹکٹکی لگائے بیٹھے دیکھ رہا ہوں اور اس لب مبارک

سے جو پھول جھڑتے تھے انہیں پوری احتیاط سے اپنی جھولی میں سمیٹتے دیکھتا ہوں شمار نہیں کرسکتا ان نیک بختوں کا جو دامن مراد بھر بھر کر اپنی بلند نصیبی پر فرحاں و نازاں وہاں آتے اور جاتے تھے۔ مگر اس ''فرشتہ'' ہاں اس مجسم انکسار اور عجز کا ذکر تو چھوڑ ہی نہیں سکتا جس کا نام نامی ''شیر علی'' تھا اس کا رتبہ اور مقام ہم عاجز کیا جانیں اس کا مالک ہی جانتا ہے۔ سب سے پیچھے جوتیوں میں بیٹھا ہے۔

شاید وہ اپنے آقا و مطاع کے اس پاپوش کی تلاش ابھی جاری رکھے ہوئے ہے جس کو مسیح موعود کی زندگی میں عید کے روز باہر باغ میں اس نے پالیا تھا اور پھر اپنی سفید براق پگڑی کے شملے سے صاف کرتا رہا تھا۔

اب وہ حضرت مسیح موعود کے حسن و احسان کے مثیل کی بزم میں بھی باقاعدگی کے ساتھ حاضر ہوتا مگر جوتیوں کی جگہ ہی اس کی دل پسند بیٹھنے کی جا تھی۔

اس کی خاک نشینی پر ہزار تخت و تاج قربان
بندہ پروری کے روح پرور انداز

سیّدی حضرت حافظ مرزا ناصر احمد صاحب بلاناغہ اس محفل میں موجود ہوتے تھے۔ آپ کی رہائش حضرت سیّدہ اماں جان کی کوٹھی میں تھی۔ جو محلہ دارالانوار کی آخری حد پر شہر سے کافی دور واقع تھی۔ ابتدا ہی میں حضرت موصوف نے مجھے بلایا ''نون'' ادھر آؤ اور میں حاضر ہو گیا۔ روایت ہے کہ خان عبدالاحد خان صاحب افغانی کو جب ان کے اور ہمارے آقا حضرت مصلح موعود بلاتے تھے تو قربانت شوم قربانت شوم کہتے حاضر ہوتے تھے۔ عملاً میں بھی یہی کہا کرتا تھا۔ اگرچہ الفاظ تو یہ نہیں ہوتے تھے۔ ارشاد ہوا میرے ساتھ میری کوٹھی پر چلو۔ حضرت سیّدہ بیگم صاحبہ اور صاحبزادہ میاں انس احمد صاحب جو پانچ چھ سال کے تھے ساتھ پیدل چل رہے ہوتے تھے۔ دونوں صاحبزادیاں چھوٹی تھیں ایک کو حضرت صاحب اٹھا لیتے اور ایک کو میں اور آپ کے مسکن پر پہنچتے یہ ہر شام کا معمول تھا اور پھر مجھے ہوسٹل واپس جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ مجھے اپنے ساتھ کھانے میں شامل فرماتے اور ایک الگ کمرہ مجھے ''الاٹ'' فرمادیا گیا۔ پھر کمال شفقت سے اس کمرہ میں میرے پاس تشریف لاکر مجھے مختلف قسم کی کتب عطا فرماتے اور مطالعہ کرنے کا ارشاد ہوتا۔

ہم انہیں دیکھ کے حیران ہوئے جاتے ہیں
خود بخود چاک گریبان ہوئے جاتے ہیں

محبت سے گھائل کیا آپ نے

اس خانوادہ کے افراد نے حضرت بانی احمدیت سے جو اس خاندان کا بھی بانی تھا عوام الناس کیلئے بھی بے عدیل رحمت اور الفت اور محبت کے جذبات ورثہ میں پائے تھے مگر اس حضرت ناصر الدین کو تو بطور خاص اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے رافت اور دلداری

اور دردمندی اور دلربائی کے اوصاف فراوانی سے ودیعت فرمائے تھے۔ کالج کے طلباء جو اکثر بیرون جات سے آئے تھے۔ مجھ ایسے کندہ ناتراشیدہ اور قادیان کی تہذیب وتربیت سے ناواقف اور عاری تھے پھر کئی غیر از جماعت طلباء بھی تھے۔ جنہیں سگریٹ وغیرہ پینے کی عادت پڑی ہوئی تھی جو اس پاک ماحول کے سراسر منافی تھی۔ جناب پرنسپل صاحب کو اللہ نے ایسی بارعب شخصیت عطا فرمائی تھی کہ کسی کو قواعد کی خلاف ورزی کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

ایک مثال ذہن میں محفوظ ہے۔ ایک نوجوان جو ناقابل اصلاح قرار دیا گیا تھا اور اس نے قادیان چھوڑ کر لاہور میں عافیت کی تلاش کی مگر اس نوجوان کا کوئی نشان نہ ملا۔

نئی بستیاں

1947ء میں ملکی بٹوارہ ہو گیا۔ کالج چھوٹا اور ہم نے بے سروسامانی کے عالم میں لاہور میں ایک حویلی نما مکان میں نہر کے کنارے آ ڈیرے ڈالے نہ کالج نہ بلڈنگ چند بوسیدہ کمرے ملے اور اسی کو درسگاہ بنالیا۔ ہمت مرداں کی داد دینا پڑتی ہے کہ ایسے میں بھی ہمت نہ ہاری۔ اسی طرح کمر بستہ چاق و چوبند اور پرعزم اور پراعتماد کبھی چند چار پائیاں جو وہاں رکھ لی گئی تھیں ان پر بیٹھ کر فاضل پروفیسر لیکچر دے رہے ہیں اور کبھی شاگردوں کے ساتھ نماز والی چٹائیوں پر ہی بیٹھے کلاس لے رہے ہیں۔ یہ حالات تو بہت سے لوگوں پر آئے مگر یہاں جو عزم کی پختگی علوہمتی اور چہروں کی شادابی نظر آتی تھی وہ اور کہیں ڈھونڈ ھنے سے نہیں ملتی تھی۔ ایسا کیوں نہ ہوتا ان طلباء اور ان کے اساتذہ کی پشت پر وہ مرد خدا بیٹھا تھا جس کی اولوالعزمی اور الٰہی بشارتوں پر یقین اور علوم ظاہری اور باطنی میں مہارت تامہ اور دل کی حلیمی اور اسیروں کی رستگاری کا موجب بننے کا خدائے علیم وقدیر خود شاہد تھا۔ وہ اللہ کے حضور حاضر ہو کر قوم وملت کے لئے کیا کیا مانگ رہا تھا۔

غرض ہمارا استاد ہمارا آقا ہمارا معلم اور ہمارا مربی ایسے للّٰہی سبق سیکھ کے گھر سے آتا تھا وہ خود بھی الٰہی نوشتوں پر مکمل ایمان وایقان اپنے غلاموں کو بھی منتقل کرتا رہتا تھا۔ وہ عام چٹائی پر ہمارے ساتھ بیٹھتا تھا گھر میں اس خوددار گھرانے میں عملاً فاقوں کی نوبت تھی۔ ایک کم سن معصوم صاحبزادے کے متعلق حسن واحسان میں اپنے مقدس باپ کے مثیل حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کو معلوم ہوا کہ وہ اس لئے رو رہا ہے کہ سربراہ خاندان نے صرف جو ایک چھوٹی سی چپاتی سب کے لئے مقرر فرمائی ہے اس سے اس کی بھوک نہیں مرتی اور حق بات یہ ہے کہ وہ کسی کے لئے بھی کافی نہیں ہوسکتی تھی تو حضرت صاحب نے فرمایا اور تو گنجائش نہیں اس کو ڈیڑھ چپاتی دے دی جائے اور میں صرف آدھی چپاتی پر گزارہ کرتا رہوں گا۔ وہ چند لقمے جن پر حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے لمبی مدت تک اکتفا فرمایا تھا آپ کے مثیل کے لئے بھی اس مماثلت کا پورا کرنا ضروری تھا یہ اس محبوبان الٰہی پر خاص اللہ کا فضل کہ خاک نشینی میں ہمدوش ثریا ہی بنے رہے اور فاقہ کشی نے بھی ان کے منہ پر برسنے والے نوروں میں اضافہ ہی کیا۔

اس دور کے ہمارے اکثر ساتھی تو واصل الی اللہ ہو چکے ہیں۔ خال خال باقی ہیں۔ یہی حال اساتذہ کرام کا ہے۔ محترم چوہدری محمد علی صاحب کو اللہ تا دیر سلامت رکھے کالج کے ابتدائی دنوں کی مبارک نشانی ہیں مرحوم صوفی بشارت الرحمن صاحب کی علم دوستی مربیانہ صفات اور اپنے شاگردوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کرنے اور پھر ان کی اصلاح کے لئے کوشاں رہنا کیسے بھول سکتا ہے۔ قرآن کریم کا ترجمہ سکھانے کا انہیں شوق تھا۔ سورۃ القصص سے ترجمہ سکھانا شروع کیا تھا۔ میں جب بھی تلاوت کرتے کرتے اس مقام پر پہنچتا ہوں تو اس بزرگ استاد کی میٹھی یادیں بے اختیار ستانا شروع کر دیتی ہیں۔

ساتھی طلباء کے ساتھ مرکزی اجتماعات کے موقع پر ربوہ میں ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں اور ہم بیتے دنوں کی یادیں تازہ کیا کرتے تھے۔ ظالم ہاتھوں نے یہ نعمت بھی چھین لی اور ہم پیاروں کی ملاقاتوں سے محروم ہو گئے۔

آقا اپنے غلام کے گھر

1965ء میں حضرت صاحبزادہ صاحب بحیثیت صدر صاحب انصاراللہ مرکزیہ اجلاس میں شرکت کے لئے سرگودہا وارد ہوئے حضرت امیر صاحب کی کوٹھی پر اجتماع تھا۔ ایک روز قبل حضرت مرزا عبدالحق صاحب نے فرمایا دوپہر کا کھانا کا تو انصاراللہ نے انتظام کیا ہوا ہے سہ پہر کی چائے کے لئے جماعت کا کوئی فرد گزارش کرسکتا ہے۔ چنانچہ میں نے فون کر کے درخواست کر دی۔ فرمایا مجھے تمھارے گھر آنے پر اعتراض نہیں اگر حضرت امیر صاحب اجازت دے دیں۔ میں نے عرض کیا کہ اس طرف سے مجھے اجازت عطا ہو چکی ہے۔ آپ نے منظور فرمالیا۔ مگر فرمایا شرط یہ ہے کہ میں تقریر وہاں نہیں کروں گا۔

چنانچہ آپ ازراہ کرم میرے غریب خانہ پر تشریف لائے۔ جماعت کے دوستوں کی تعداد کم تھی غیر از جماعت جن میں رؤسائے ضلع، جج صاحبان، مجسٹریٹ صاحبان اور سنیئر وکلاء 50/55 کے قریب مدعو تھے۔ میری کوٹھی کے لان میں انتظام تھا۔ آپ کی شخصیت میں کشش کا یہ عالم کہ موضع سکیسر کے ایک رئیس محمد اعظم صاحب لک نے مجھے کوٹھی کے گیٹ پر بلایا۔ شکوہ کیا کہ انہیں بلایا نہیں گیا۔ انہوں نے کہا میں چائے پینے نہیں آیا۔ میں میاں صاحب کی زیارت کے لئے صرف اس شوق میں بن بلائے آ گیا ہوں۔ بے تکلفی تھی میں نے معذرت کی اور انہیں ساتھ اندر لا کر اس پس منظر میں تعارف کرایا جب سب لوگ اکٹھے ہو گئے تو آپ نے مجھے بلا کر فرمایا۔ بہت اچھا اجتماع ہے۔ یہاں تو تقریر کرنا ضروری تھی۔ میں نے کہا آپ کے ارشاد کی تعمیل میں میں تو خاموش ہوں۔ ورنہ چاہتا تو میں بھی تھا۔

ہر ایک مہمان کے ساتھ بہت کھل کر باتیں ہوئیں اور ہر ایک مہمان کے ساتھ بے تکلفانہ گفتگو فرمائی۔ اس کے بعد بھی آپ نے بارہا خوشی سے ذکر فرمایا۔ کہ تمھارے ہاں غیر احمدی معززین بڑی خوشی سے آ جاتے ہیں۔

اس تقریب کے چند روز بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کا انتقال پر ملال ہوگیا۔اور صاحبزادی امۃ القدوس صاحبہ نے کیا خوب غم واندوہ میں ڈوبی ہوئی جماعت کی یہ کہہ کر ترجمانی کی کہ

اس کے دم سے اجالا تھا چاروں طرف
وہ گیا تو یہاں تیرگی چھا گئی
چاند روشن ہے اب بھی افق پر مگر
میرے سورج کو کس کی نظر کھا گئی

حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر صاحب خلیفۃ المسیح الثالث منتخب ہوئے۔دکھی دلوں کی تسکین کا موجب بنے۔اب میرے محبوب پرنسپل ہاں وہی ''موعود قافلہ'' قدرت ثانیہ کا تیسرا مظہر بن کر ساری جماعت کے سردار اور مطاع ہو گئے تھے۔

چپکے چپکے شباب ان پر آ ہی گیا
رفتہ رفتہ زمین آسمان ہو گئی
اس طرف حسن میں اک اضافہ ہوا
اس طرف اک تمنا جواں ہوگئی

حسن واحسان کی یادیں

ہم تو پہلے سے بھی زیادہ مؤدب اور محتاط ہو گئے کہ جس مقام پر آپ متمکن ہوئے تھے اس کا تقاضا یہی تھا مگر ادھر سے نوازشات کریمانہ کا یکطرفہ بہاؤ پہلے سے بھی زیادہ تیز ہوگیا۔ ہفتے میں ایک دفعہ اراضیات کی دیکھ بھال کے لئے تشریف لے جاتے تھے اور مجھے بھی ہر بار ہمرکابی کا شرف عطا فرماتے۔حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب اور محترم صاحبزادہ مرزا منیر احمد صاحب اگر ربوہ میں موجود ہوتے تو ہمراہ ہوتے۔ایک روز نصرت آباد کی زمینوں پر پھرتے پھرتے بہت دور نکل گئے وہاں ایک میں ہی ساتھ اکیلا تھا۔ایک احمدی نے پنجابی کی نظم ''او قادئیں والیا سائیاں'' آپ کو مخاطب کر کے بڑے موثر انداز میں ترنم سے پڑھی۔ وہ منظر بھی بڑا دلکش تھا کہ اب تک نہیں بھولا۔ پڑھنے والے نے ایسے سوز سے اشعار پڑھے کہ گویا کلیجہ نکال کے پیش کر دیا۔ایک روز آپ نے نصرت آباد میں بہت شکار کیا۔سیروں وزن کے پرندے تھے۔ایک پلاسٹک کے بڑے تھیلے میں خادم کی تحویل میں دے دیئے گئے۔کھادر فیڈر نہر کے پٹڑی پر قافلہ آ رہا تھا۔میں حضرت صاحب کی کفش برداری کے لئے آپ ہی کی گاڑی میں سوار تھا۔جب پختہ سڑک پر پہنچے تو میں نے عرض کیا اجازت ہوتو میں یہیں سے سرگودہا کی بس میں واپس چلا جاؤں۔فرمایا ہاں ٹھیک ہے۔قافلہ رُک گیا اور میں دست بوسی کر کے

اورآداب بجالا کر ویگن سے اترا تو بلایا ’’نون‘‘ میں گاڑی کے پاس آیا تو فرمایا۔ یہ شکار تمہارے لئے ہے۔ میں نے عرض کیا ’’جی سارا‘‘ فرمایا ’’ہاں سارا‘‘ پکڑلو میں نے شکریہ ادا کیا۔

میں سمجھا کہ قافلہ روانہ ہو رہا ہے۔ گاڑی سے ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ فرمایا ’’نون‘‘ ادھر آؤ میں حاضر ہو گیا۔ فرمایا اپنی بیوی سے کہنا اس کا پلاؤ پکائیں اور دیکھو سب نے ربوہ کی طرف منہ کر کے کھانا ہوگا۔

اے کاش مجھے اتنی عقل و دانش ہوتی جتنی عبدالاحد خان صاحب کو تھی۔ ہر بار طلب فرمانے پر قربانت شوم قربانت شوم کہتے ہوئے حاضر ہوتا۔ اب اس لفظ ’’نون‘‘ کو سننے کو کان ترستے ہیں اور میرا دل حسرتوں کا ایک مزار ہے۔

اے کاش میری غفلتوں اور کوتاہیوں اور بداعمالیوں پر عفو کی لکیر پھیرتے ہوئے میرا عفو، غفور اور رحیم اور ذرہ نواز آسمانی آقا مجھے اس برگزیدہ اور محبوب الٰہی کے قدموں میں جگہ دے دے اور وہ پھر مجھے ’’نون‘‘ کہہ کر پکاریں اور میں ’’قربانت شوم‘‘ ’’قربانت شوم‘‘ کہتا آپ سے اس طرح لپٹ جاؤں جیسے ایک بچہ وفور محبت و عشق سے اپنے مہربان باپ سے لپٹ جاتا ہے۔

مجسمِ دعا

میرا نواسہ اور برادرم ڈاکٹر حافظ مسعود احمد صاحب کا پوتا 24 دن کا تھا۔ برادرم حافظ صاحب نے ’’امری عبیدی‘‘ نام رکھا تھا۔ وہ روز پیدائش ہی سے لاغر تھا پھر تو روز بروز اس کی صحت گرنے لگی بیس روز کا ہوا تو PAF ہسپتال سرگودھا میں داخل کرا دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے ہر ممکن کوشش کی مگر ہر لمحہ اس کی صحت بگڑتی چلی گئی بالآخر ڈاکٹر حافظ صاحب خود بھی اور ان کی بیگم صاحبہ جو خود ماہر لیڈی ڈاکٹر ہیں اور ہسپتال کا ماہر ڈاکٹر سبھی عاجز آ گئے بچہ آکسیجن ٹینٹ میں تھا۔ محترمہ لیڈی ڈاکٹر صاحبہ گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آئیں اور میری بیوی کو کہا کہ تم حوصلے والی ہو تم اس کے پاس بیٹھو اور اس کی حالت حد درجہ تشویشناک ہو گئی تھی۔ میں شام کے وقت گھر آیا تو میں نے اسلام آباد حضرت صاحب کی خدمت میں دعا کی گزارش کرنے کے لئے فون کیا۔

پرائیویٹ سیکرٹری صاحب نے جواب دیا کہ اس وقت اوپر کوئی پیغام نہیں بھیجا جا سکتا کل ڈاک کے ساتھ ہی حضرت صاحب کو اطلاع دی جائے گی۔ میں جو پہلے ہی دل گرفتہ تھا اس جواب سے زیادہ ہی پریشان ہوا مگر قربان جاؤں اپنے خالق اور مالک کے جس نے نہ معلوم کیسے میری گزارش حضرت صاحب کے کانوں تک پہنچا دی اور صرف چند منٹ بعد حضرت صاحب کی طرف سے مجھے فون آیا کہ بچہ کی عمر کتنی ہے اور اسے بیماری کیا ہے ہم نے عرض کیا عمر 24 دن ہے اور پانی کا قطرہ اس کے جسم میں نہیں ہے۔

ہم کیا جانیں حضرت صاحب کو کیسے ہماری حالت سے اطلاع ہوئی۔ نہ ہمیں معلوم ہوا کہ میرا فون نمبر کس نے بتایا۔ اس فون کی واپسی سے ہماری جان میں جان آئی۔ اسی رات کو بچہ سنبھل گیا صبح وہ آکسیجن ٹینٹ سے باہر پڑا کھیل رہا تھا۔ ڈاکٹر حیران تھے۔ تیمارداروں کو

اس رحمت کے نشان کا پس منظر بتایا۔ پھر ڈاکٹروں سے بھی کیا چھپانا تھا۔ اسی صبح ہم ہنستے کھیلتے بچے کو خوشی خوشی گھر لے آئے اور روز بروز امری عبیدی کی صحت قابل رشک ہوتی گئی۔

ہم بچپن سے حضرت سیّدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ کا یہ کلام پڑھتے رہے تھے۔ ؎

ہر آن ترا حکم تو مل سکتا ہے مولیٰ
وقت آ بھی گیا ہو تو وہ ٹل سکتا ہے مولیٰ
تقدیر یہی ہے تو یہ تقدیر بدل دے
تو مالک تحریر ہے تحریر بدل دے

جب ہم سب نے محسوس کیا کہ اس عزیز کا وقت مرگ آ چکا ہے اور اب تقدیر سامنے دکھائی دے رہی تھی تو اس بندہ مضطر، ہاں اس محبوب الٰہی کی مناجات درگہ الٰہی میں پہنچی قبول ہوئی اور وقت ٹل گیا تقدیر بدل گئی اور مالک تحریر نے تحریر بدل دی۔

جس بات کو کہے کہ کروں گا یہ میں ضرور
ٹلتی نہیں وہ بات خدائی یہی تو ہے

یہ Return Call کیا شیئے ہے مجھے نامور جرنیل عبدالعلی ملک صاحب نے بتایا کہ انہیں دل کا دورہ پڑا اور راولپنڈی کے امراض قلب کے ہسپتال میں داخل کر دیئے گئے۔ اسی روز ساتھ والے کمرے میں ایک دریدہ دھن بھی داخل ہسپتال ہوا۔ جرنیل صاحب بتاتے تھے کہ ان کی بیگم صاحبہ تو فون پر بیٹھ گئیں اور حضرت امام سوئم کی خدمت میں درخواست دعا کرتی رہیں۔ ادھر بھی اضطرار پیدا ہوا اور پھر دن میں تین بار حضرت صاحب خود جرنیل صاحب کی خیریت دریافت فرماتے۔ جرنیل صاحب کو ایوان امامت کے اس ردِعمل سے یقین ہو گیا کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ چنانچہ وہ تو صحت یاب ہو کر شاداں وفرحاں اپنے گھر لوٹ آئے لیکن اس بدزبان دشمن کی میت داخلے کے دوسرے روز ہی وہاں سے نکلی۔

میں نے بغیر ترتیب کے اپنی خوش بختی کے کچھ ایسے واقعات کی روئیداد تحریر کی ہے جو میرے ذہن میں تازہ ہیں۔

کتنی بے ربط تھی عشق کی گفتگو
جب مرتب ہوئی داستان ہو گئی

مجھے تو یہ بھی علم نہیں کہ یہ ''داستان'' ہوئی بھی ہے کہ نہیں۔

الوداعی ملاقات

1982ء کی سخت گرمی کے دن تھے۔ تاریخ اور مہینہ یاد نہیں۔ میں کسی کام سے راولپنڈی گیا ہوا تھا۔ مغرب کے وقت اسلام آباد کوٹھی واقع شالیمار 3/8 پہنچا جہاں حضرت صاحب فروکش تھے۔ مجھے دیکھتے ہی پرائیویٹ سیکرٹری صاحب نے فرمایا اس وقت ملاقات نہیں ہوگی۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے تو کوئی درخواست ہی نہیں کی۔ میں نماز باجماعت ادا کرنے کی غرض سے حاضر ہوا تھا۔ حضرت صاحب نماز سے فارغ ہو کر سیڑھیوں پر اوپر تشریف لے جاتے ہوئے صاحبزادہ مرزا انس احمد صاحب کو ارشاد فرمانے لگے ''نون'' کو اوپر بھیج دینا چنانچہ میں اوپر گیا تو دوسری منزل کی شمال مشرقی جانب ایک کمرے میں ملاقات ہوئی۔ ان دنوں سرگودھا کی انتظامیہ ایک مسئلے پر زیادہ ہی ذکی الحس بنی بیٹھی تھی۔ جس کا مجھے علم تھا۔ آپ کی خدمت میں اس کی تفصیل میں نے عرض کی تو اسی سلسلے میں مجھے ہدایات دے کر ارشاد فرمایا۔

کہ پرسوں تک مجھے فون پر رپورٹ دینا۔ اور دیکھنا اوپر کے فون پر نہ کہ پرائیویٹ سیکرٹری کے نمبر پر اور پھر تاکید فرمائی کہ گھر سے کوئی فون اٹھائے تو کہنا میں نے ''ناصر احمد'' سے ہی بات کرنا ہے۔ ایک ہی دن میں وہ مسئلہ تو اللہ کے فضل سے بخوبی حل ہو گیا مگر میں آپ کی اس نوازش خسروانہ پر بے حد مسرور تھا پھر جب آپ کی توجہ اور دعاؤں سے کامیابی ہوئی تو میں نے حسب الحکم اوپر گھر میں فون کیا۔ صاحبزادہ مرزا انس احمد صاحب نے ریسیور اٹھایا اور ساتھ ہی کہا کہ بات مجھے بتادو مجھے اس کی اجازت عطا ہو چکی ہے۔ چنانچہ میں نے مفصل رپورٹ عرض کر دی جو آپ کی خوشنودی کا موجب بنی۔

آج یادوں کا کارواں ایسا چل پڑا ہے کہ کہیں پڑاؤ ہی نہیں کرتا۔ میری یہی خواہش بھی ہے کہ یہ یادیں تازہ رہیں۔ کبھی محو نہ ہوں اگرچہ ان کے ساتھ محرومیوں اور اداسیوں کا بھی ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چمٹا ہوا ہے اور اس سے دل غم و اندوہ سے بھر جاتا ہے۔ پر مقام شکر ہے کہ ہمیں اللہ نے بے سہارا نہیں چھوڑا۔ یہ اس کا کرم بے حساب کہ بقول ثاقب بھائی کے۔

ثاقب یہ کرم بھی کیا کم ہے ناصر جو لیا طاہر بخشا
ورنہ دیوانے مر جاتے سر ٹکرا کر دیواروں سے

مگر میرا وہ درد آشنا بھی برسوں سے سات سمندر پار جا بیٹھا ہے لوگ ہر سال جاتے ہیں چشمہ آب بقا سے براہ راست سیراب ہوتے ہیں۔ میں شکستہ پر اس سے بھی محروم ہوں اور اہل مغرب کو مخاطب ہو کر کہتا رہتا ہوں۔

دیار مغرب کے رہنے والو تمہیں مبارک ہو پاس رہنا
حضور محبوب عرض کر دو کسی کا یاں پر اداس رہنا

ہجر و فراق کی آنچ اتنی تیز ہے کہ اس نے میرے جسم و جان کو جھلس دیا ہے۔ ایسے میں بے بسی کے آنسو ہی میرے رفیق ہیں۔ میرے

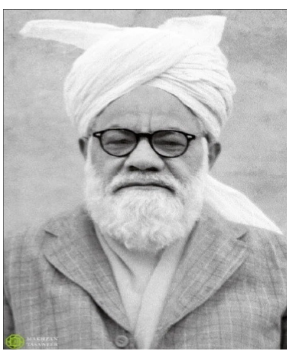
فلک پر میرا چاند بھی نظر نہیں آ تا گھپ اندھیرا ہے۔ مدتیں گزر گئیں میرے آقاومرشد نے جمال یار کا کچھ کچھ نشان تو چاند میں دیکھ لیا تھا اوراسی سے بے کل ہو گئے تھے۔اسی نسبت سے اس مادی چاند کو جب میں دیکھتا ہوں تو اپنے ’’قمر‘‘ کے خیالات میں کھو جاتا ہوں۔

یہ پورا چاند ترساتا بہت ہے
کہ پھر وہ شخص یاد آتا بہت ہے

ان ساری مجبوریوں اور اداسیوں اور تنہائیوں کا علاج میرے بس میں ہے نہیں۔ قادر کریم ہی ہم پر ترس کھائے اور راہ کی روکیں اٹھائے تو اٹھائے۔

(روزنامہ الفضل ربوہ مورخہ 21رجولائی 1998ءصفحہ 4، 7۔ مورخہ 22رجولائی 1998ءصفحہ 4)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁



صدرِ محفلِ ماہ رُخاں
حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب کی دلنشین یادیں

20راپریل 1893ء بروز جمعرات زمین وآسمان نے ایک ایمان افروز نظارہ دیکھا وہ مبارک صبح پھوٹی ادھر آفتاب نکلا تو ادھر آسمان روحانیت پر ایک مبشر چاند نمودار ہوا۔ اس کے علم وادب اس کے اخلاق کریمانہ اور ادبی اور فکری کمالات اور روحانی رفعتوں کا ایک عالم شاہد رہا ہے۔ وہ بلند مرتبت شخص اپنے موعود بڑے بھائی کا معتمد ترین رفیق دست راست اور مشیر خاص بنا۔ نظر عمیق تھی اور مشکل سے مشکل مسائل اور معاملات کی گہرائیوں میں اُتر کر ان کا حل نکال لینا اور پھر کمال تفصیل کے ساتھ اپنے مطاع اور آقا کی خدمت میں مودبانہ رپورٹ پیش کر دینا۔ اس طور پر کہ گویا ایک پٹڑی بچھا دیتے جس پر جماعت کی گاڑی کامیابی کی منازل طے کرتے ہوئے اپنے مقصد کو پا لیتی۔ یہ موہبت آپ کے لئے خاص تھی۔

اس مبشر شخص کا نام نامی ’’حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب‘‘ تھا۔ اس کے حقیقی مقام کو علیم وخبیر ہی جانے انسان کے قیاس اور اندازے اس کی قلبی طہارت بلند شان تقویٰ اور دنیاوی اور دینی علوم کی وسعتوں کے ادراک سے فروتر ہی رہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے اندرونی حسن وجمال کو اس کی خاکساری اور عجز اور خلوت پسندی نے بہت حد تک چھپائے رکھا تھا۔ تاہم اس کے حسن وجمال کی کوئی ایک آدھ جھلک ہم نے دیکھی تو بے اختیار ہم پکار اُٹھے کہ

تیرے چہرے کا نور اصلی ہے

چاند کی روشنی ادھاری ہے

آپ کی ستر سالہ زندگی کے شب و روز شاہد ہیں کہ بشارت الٰہیہ کے موافق آپ عشق الٰہی اور عشق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور شفقت علیٰ خلق اللہ کے جذبات سے معمور اور مخمور رہے۔

لاریب عشق رسولؐ میں ڈوب کر ''سلطان القلم'' کے اس وارث حقیقی نے جو موتی اور لعل وجواہر قرطاس پر بکھیرے ہیں وہ بے مثال ہیں۔قرآن کریم کے مطالب اور تفسیر بیان کرنے کے لئے ''مطہرون'' کی شرط ہے تو اصدق الصادقین اور سارے انبیاء اور راستگان کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح سیرت نگاری کے لئے بھی طاہر ومطہر ہونا اولین تقاضا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ آپ کی تصنیف سیرۃ خاتم النبیین نے اپنوں اور پرایوں سب سے خراج تحسین حاصل کیا۔آپ کی تحقیق اتنی گہری اور طریق استدلال اتنا مدلل اور دل نشین ہے کہ میں تقابلی مطالعہ سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کوئی مورخ اور سیرت نگار اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچا۔

حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب کے قلم کو زبردست غیبی قوت اور نصرت عطا ہوئی تھی۔آپ کی تحریرات بلحاظ تحقیق اور صحت معنوی کے اور کیا بلحاظ سلاست اور دل نشینی کے اور کیا بلحاظ ادبی اور علمی اعتبار کے ایسی بلند پایہ ہیں کہ کیا مجال کوئی لفظ آگے پیچھے کیا جاسکے۔یا کوئی بڑا ناقد کسی لفظی یا معنوی جھول کی نشاندہی کر سکے۔زبان تو ایسی کہ گویا ہر ہر لفظ پر ٹکسالی مہر لگی ہوئی ہے۔

آپ نے ایسا لٹریچر اپنی یادگار چھوڑا ہے جو قیامت تک کے لئے راہ ہدایت ہے اور ہمارے نوجوان اور ہمارے بوڑھے اور ہماری خواتین اور ہمارے مرد جب تک اس کا مطالعہ کرتے رہیں گے اپنے سینوں میں دلائل قویہ اور علم وعرفان کی شمعیں روشن رکھیں گے۔

آپ کی عمر 66 برس ہو رہی تھی کہ اس شخص کو جو ہمیشہ سے خلوت پسند رہا تھا اور کبھی پبلک جلسوں میں یا تقاریب میں مسند صدارت پر بیٹھنے یا تقریر کرنے پر رضامند نہیں ہوتا تھا۔کرسی نشینی سے نفور اور خاک نشینی اس کا دلپسند مقام تھا۔

اور جس نے ساری عمر علمی اور روحانی جہاد کے لئے قلم سے ہی کام لیا اور اس میں ہرگز کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ قلمی میدان کا نایاب شہسوار تھا۔اللہ کی حکمت بالغہ نے گھیر گھار کر اس کو 1959ء میں جلسہ سالانہ کے سٹیج پر لا کھڑا کیا۔پھر اس نے مسلسل چار سال تک ''ذکر حبیب'' کے موضوع پر ایسی تقاریر کیں کہ قریباً 40 سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی روح پرور کلمات کانوں میں اس طرح رس گھول رہے ہیں کہ جیسے کل کی بات ہو۔ہم نے لڑکپن میں اس موضوع پر حضرت مفتی محمد صادق صاحب کی دلوں کو موہ لینے والی تقریریں بھی سنیں۔اس عالی مقام ''رفیق'' کی زبان میں وہ شیرینی تھی اور طرز بیان ایسا سلیس رواں اور دل گداز جو اپنی مثال آپ تھا۔

حضرت مفتی محمد صادق صاحب اپنا اور اپنی والدہ ماجدہ کا واقعہ بیان فرما رہے ہیں کہ جب قادیان سے واپس سفر پر روانہ ہوئے تو

مہتمم لنگر خانہ روٹیاں لائے مگر کوئی رومال یا کپڑا نہ تھا جس میں روٹیاں باندھتے حضرت اقدسؑ نے اپنا عمامہ پھاڑ کر گز بھر کپڑا روٹیوں کے لئے دے دیا۔ یہ واقعہ بیان کر رہے ہیں۔ آنکھوں سے فرط محبت کے آنسو رواں ہیں اور اپنے حبیب کی یاد میں تڑپ رہے ہیں اور بیان ایسا روحوں کو پگھلا دینے والا کہ سامعین کو بھی گویا اسی مبارک محفل میں پہنچا دیا ہے۔

حضرت مسیح موعودؑ کی مہمان نوازی اور اکرام ضیف کا ذکر کرتے ہوئے حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب نے بھی مثلاً منی پور آسام کے ان دو مہمانوں کا ذکر بھی اپنی تقریر میں کیا جو مہمان خانہ کے کسی خادم کی بے اعتنائی سے اسی وقت غصے میں واپس جانے لگے تھے مگر جب حضرت اقدسؑ کو علم ہوا تو آپ تیز تیز قدم ان کے پیچھے پیدل تشریف لے گئے اور انہیں منا کر واپس لائے۔ مگر ہر ایک واقعہ کے ساتھ جو تبصرہ اور موعظت حضرت صاحبزادہ صاحب فرماتے ہیں۔ وہ سارے واقعہ کو چار چاند لگا دیتا ہے اور یہ حضرت موصوف ہی کا حصہ ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں تھا۔

اس اکرام ضیف کے واقعہ کو من وعن بیان کرنے کے بعد حضرت صاحبزادہ صاحب فرماتے ہیں۔

''اس واقعہ میں دلداری اور انکساری اور اکرام ضیف اور جذبات اخوت کا جو بلند معیار نظر آتا ہے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ مگر میں اس موقعہ پر ربوہ کے افسر مہمان خانہ اور دیگر عملہ کو ضرور توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ وہ اس لطیف روایت کو ہمیشہ مشعل راہ بنائیں اور مرکز میں آنے والے مہمانوں کو خدائی مہمان سمجھ کر ان کے اکرام اور آرام کا انتہائی خیال رکھیں اور ان کی دلداری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں اور مرکز کے مہمان خانہ کو روحانی مکتب سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو اس مکتب کا خادم تصور کریں......اب یہ مہمان خانہ جماعت کے ہاتھ میں ایک مقدس امانت ہے اور خدا تعالیٰ دیکھ رہا ہے کہ مرکزی کارکن اس کو کس طرح ادا کرتے ہیں۔ یہ امر خوشی کا موجب ہے کہ اب کچھ عرصہ سے مہمانخانہ کے انتظام میں کافی اصلاح ہے۔ مگر

''نرخ بالا کن کہ ارزانی ھنوز''

میں نے یہ تقریر ریکارڈ کی ہوئی ہے اور بے شمار مرتبہ سن چکا ہوں ہر بار آنسوؤں سے دامن بھیگ جاتا ہے۔ کیوں نہ ہو بیان مامور زمانہ کے اخلاق عالیہ کا اور بیان کرنے والا اس کا مبشر فرزند۔ ایک خاص کیفیت جو ان تقاریر میں ہے اور جو سننے سے تعلق رکھتی ہے صرف پڑھنے سے اس کیف اور عشق اور والہانہ انداز اور وارفتگی اور فریفتگی کا کیسے اندازہ ہو جو اس کو اپنے محبوب ومعشوق سے ہے۔

جب بھی حضرت رسول عربیؐ کا نام نامی آتا ہے تو یہ دیوانہ عشق سلام اور درود بھیجتے ہوئے ہمہ تن آرزو اور التجا بن جاتا ہے ہر بار آواز گلوگیر ہو جاتی ہے اور ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کے الفاظ کہتے ہوئے وہ کمال ادب اور عقیدت اور فریفتگی اور فدائیت سے لرز جاتا ہے اور اپنے آقا مکی و مدنیؐ پر درود اور سلام کہتے ہوئے اپنے سینے سے اپنا کلیجہ نکال کر گویا اس کے مبارک قدموں میں رکھ دیتا ہے۔ کاش یہ کیفیت

ہمارے سارے دوست اپنے کانوں سے سنیں اور عاشق صادق کی وارفتگی کا اندازہ لگائیں تاہمیں بھی درود شریف پڑھنے اور بھیجنے کا کچھ سلیقہ آئے۔ منہ سے الفاظ رٹنے سے تو کچھ فائدہ نہیں۔ سوچتا ہوں کہ ولادت ہو تو ایسی کہ خدائے خبیر پیدائش سے قبل اس کی روحانی رفعتوں کا مژدہ سنائے۔

زندگی گزاری تو عشقِ الٰہی اور عشقِ رسولؐ میں مست الست پھر جب وقت رخصت آیا اور نیک انجام کے متعلق متفکر ہوئے تو ماں باپ سے بڑھ کر پیار کرنے والے رب نے ''بے حساب'' کے الفاظ سے تشفی فرمادی۔ وقت اور زیادہ قریب آیا تو اپنے مقدس باپ کی طرح یہ پیغام بھی سن لیا کہ آؤ بلبل چلیں کہ وقت آیا'' 2 ستمبر 1963ء کو وفات ہوئی۔ چار پانچ ماہ قبل شروع مئی کے مہینے میں جب آپ کے بڑے صاحبزادے محترم مرزا مظفر احمد صاحب ربوہ سے راولپنڈی جانے لگے تو فرمایا۔'' مجھے کچھ عرصہ سے بعض منذر خوابیں آرہی ہیں تم بھی دعا کرنا''۔ صاحبزادہ صاحب موصوف نے ڈاکٹروں سے مشورہ کر کے اپنے ابّا جان سے عرض کیا کہ ابّا جان ڈاکٹر صاحبان کہتے ہیں کہ کوئی فکر کی بات نہیں تو فرمایا مظفر'' ڈاکٹروں کی رائے پر نہ جانا''۔

بھلا جنہیں رب علیم وخبیر تواتر سے خوشخبریں دے رہا تھا کہ'' اب چل چلاؤ ہے'' وہ ڈاکٹروں کی قیاسی رائے پر کیا یقین کرتے۔ اسی دوران آپ کی صاحبزادی محترمہ امۃ اللطیف صاحبہ نے کچھ دریافت کرنے کی کوشش کی تو فرمایا۔

''تم بچے ہو میں تفصیل نہیں بتلاتا تم لوگ گھبرا جاؤ گے۔''

پھر ایک خط میں ایک بزرگ کے نام لکھا کہ حضرت مسیح موعود کا یہ شعر میری زبان پر جاری ہوا ہے۔

بھر گیا باغ اب تو پھولوں سے
آؤ بلبل چلیں کہ وقت آیا

حضرت صاحبزادہ صاحب کے عجز وانکسار اور کسرِ نفسی کا نظارہ بھی کر لیں کہ یہ تقویٰ کی جان ہے ایک موقعہ پر فرمایا:

''یہ خاکسار حضرت مسیح موعودؑ کے گھر میں پیدا ہوا اور یہ خدا کی ایک عظیم الشان نعمت ہے جس کے شکریہ کے لئے میری زبان میں طاقت نہیں بلکہ حق یہ ہے کہ میرے دل میں اس شکریہ کے تصور تک کی گنجائش نہیں ہے۔''

پھر فرمایا:

''میں جب اپنے نفس میں نگاہ کرتا ہوں تو شرم کی وجہ سے پانی پانی ہو جاتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے ہمارے جیسے کمزور انسان کی پیدائش کی بھی بشارت کے قابل خیال کرتا ہے پھر اس وقت اس کے سوا سارا فلسفہ بھول جاتا ہوں کہ خدا کے فضل کے ہاتھ کون روک سکتا ہے۔''

بات ہو رہی تھی کہ حضرت مسیح موعودؑ بچوں سے پیار کے اظہار کے طور پر کسی بچے کا پہنچہ پکڑ لیتے تھے۔ حضرت میاں صاحب نے

فرمایا:

’’پہنچہ پکڑ کر خاموش ہو جانے کا واقعہ میرے ساتھ بھی (ہاں اس خاکسار عاصی کے ساتھ جو خدا کے مقدس مسیح کی جوتیوں کی خاک جھاڑنے کی بھی قابلیت نہیں رکھتا) کئی دفعہ گزرا ہے۔‘‘

ناشکری ہوگی اگر میں آں موصوف کی عنایات کریمانہ اور الطاف خسروانہ کا کچھ ذکر نہ کروں جو بغیر میرے کسی استحقاق کے اور میری کمزوریوں اور خطا شعاریوں کے باوجود مجھ پر یکطرفہ طور پر کی گئیں سوچتا ہوں کہ نہ میری کوئی دینی اور جماعتی حیثیت نہ دنیاوی مقام لیکن باران رحمت کا نزول ہو تو وہ جیسی پھولوں بھرے بستانوں پر برستی ہے اسی طرح روڑی پر بھی۔ اور گلاب کے پھول کو اپنی ساری رعنائیوں اور خوشنمایوں کے باوجود ساتھ جڑے ہوئے کانٹوں سے کبھی نفرت کا اظہار کرتے نہ دیکھا نہ سنا۔ اسی طرح احسانات ایک زور دار میٹھے ٹھنڈے چشمہ کی صورت ہمیشہ اس طرف سے ہی جاری رہے۔

میں قریباً ہفتے میں ایک بار ضرور حاضر خدمت ہوتا۔ ہر بار نہایت دل نشین رنگ میں نصائح فرماتے اور دعاؤں سے نوازتے۔ ایک روز میں اپنے مکان کی بنیادوں کے لئے دو اینٹیں لے کر حاضر خدمت ہوا آپ کرسی پر تشریف فرما تھے۔ اینٹیں گود میں رکھیں اور فرمایا۔

’’حضرت مسیح موعودؑ نے اس طرح ان اینٹوں کو گود میں رکھا جو مینارۃ المسیح کی بنیادوں میں نصب کی گئیں اور دعا کی تھی تم بھی میرے ساتھ شامل ہو جاؤ دعا کر لیں‘‘ اور پھر میرے مکان کے نقشے اور کمروں کے طول و عرض کے متعلق تفصیل سے گفتگو فرمائی اور قیمتی ہدایات سے نوازا۔ ان نصائح کو میں نے تعمیر مکان کے دوران بے حد مفید کار آمد اور مبارک پایا۔

میں ہمیشہ دعا کی غرض سے اور ضروری مشوروں کے سلسلہ میں آپ کو خطوط لکھتا تھا اور فوراً جواب سے سرفراز فرماتے۔ جس میں دعائیں بھی ہوتیں اور نہایت حکیمانہ مشورے بھی ہوتے۔ ہر ایک خط ایمانیات کا ایک انوکھا سبق دیتا تھا۔ اس میں اخلاقیات کے درس بھی ہوتے تھے اور دعائیں بھی اور درد کے دارو بھی۔ مگر وائے افسوس کہ

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

حسن انتظام حسن تدبیر اور سلیقے اور قرینے کے اوصاف کے حضرت صاحبزادہ صاحب کو بطور خاص ارزانی ہوئی تھی۔ حضرت مرزا عبدالحق صاحب نے آج سے قریباً ربع صدی قبل ایک واقعہ سنایا تھا کہ کسی میٹنگ سے فارغ ہوئے تو صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب نے اپنی کوٹھی بیت العافیت پر دعوت عصرانہ دی۔ حضرت مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ہم گھر گئے تو دیکھا کہ ہر شئے نہایت سلیقے اور قرینے نہایت صفائی اور ستھرائی سے رکھی تھی۔ حاضرین میں سے کسی صاحب نے حضرت صاحبزادہ کی اس وصف کی تعریف کی تو موصوف نے فرمایا کہ میری یہ عادت حضرت عموجان حضرت مرزا بشیر احمد صاحب سے مستعار لی ہوئی ہے۔

اور پھر اس سے بھی پہلے کا غیر از جماعت ڈاکٹر چوہدری عبدالعزیز صاحب سول سرجن کا واقعہ مجھے یاد ہے وہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب کی علالت کے دوران ربوہ طبی معائنہ کرنے اور علاج تجویز کرنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے واپسی پر نہایت خوشگوار حیرت کا برملا اظہار کیا کہ آپ کا سادہ سا کچا مکان ہے مگر صفائی اور ستھرائی اور سلیقہ کا جو اعلیٰ نمونہ اس گھر میں دیکھا وہ میں نے بڑے رؤسا اور وزراء کے محلات میں بھی نہیں دیکھا۔

نیز سول سرجن صاحب نے کہا کہ آج جس مریض کو میں نے دیکھا ہے یہ تو سارے علوم کا ایک سمندر ہے علم طب سے تو ان کا اتنا ہی واسطہ ہے کہ وہ خود بیمار ہیں مگر یوں لگتا تھا کہ اس بحر کے بھی وہ شناور ہیں۔ پھر اس نے آپ کے اعلیٰ اخلاق کی بے حد تعریف کی۔

میں اس محسن کی یاد تازہ کر کے ان کے درجات کی بلندی کے لئے دعاؤں کی تحریک کرتا ہوں تا اس طرح ہی شاید اس پاک روح کے احسانات کے قرض کا بوجھ کچھ ہلکا ہو سکے۔

(روزنامہ الفضل ربوہ مورخہ 18 ستمبر 1998ء صفحہ 7،4)

حضرت مصلح موعود کے جاں نثار عاشق
مکرم شیخ محمد اقبال صاحب پراچہ



مکرم شیخ محمد اقبال صاحب پراچہ بہت باغ و بہار طبیعت رکھتے تھے ان میں دینی غیرت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے ساتھ ان کی عقیدت تو والہانہ عشق تک پہنچ گئی تھی۔

میں نے 1954ء میں سرگودھا میں سکونت اختیار کی تو میں نے شیخ فضل الرحمن صاحب اور شیخ محمد اقبال صاحب دونوں بھائیوں کو جماعت احمدیہ سرگودھا کی دینی جدوجہد میں سرگرم عمل پایا۔ یہ دونوں بھائی ایک جان دو قالب کی بہترین تصویر تھے اور بظاہر یہ دو وجود ایک ہی اکائی تھے۔

اس سے پہلے جب سرگودھا کے کمپنی باغ میں جلسہ عام میں سیّدنا حضرت مصلح موعود نے تاریخی خطاب فرمایا تھا تو اس دوران اس مقدس مقرر اور سامعین کی حفاظت کے لئے جو حکمت عملی اختیار کی گئی وہ انوکھی بھی تھی اور قابل صد رشک بھی کہ پراچہ صاحبان نے اپنے اموال قربان کئے۔ حتیٰ کہ اپنی قیمتی بسوں کا جلسہ گاہ کے اردگرد ایک حصار بنا دیا اور اس بات کی ذرہ بھر پروا نہ کی کہ لاکھوں کی جائیداد کا کیا حشر

ہوتا ہے اوراس سے پہلے ربوہ کی آبادی کے دوران بھی اس سرفروشوں کے کارناموں کی کچھ تفصیل تاریخ احمدیت میں محفوظ ہو چکی ہے۔ یہ اس جوڑی کی خوش بختی تھی کہ صنعتی اور تجارتی امور کے سلسلے میں ان کے اور ہم سب کے مرشد ومطاع کی نگہ مردم شناس انہی پر پڑتی تھی اور یہ بھی اسے نعمت عظمیٰ یقین کرتے ہوئے تعمیل میں کمر بستہ ہو جاتے تھے۔ بنیادی طور پر تجارت پیشہ تھے۔ پاکستان بننے کے بعد شعبہ ٹرانسپورٹ کو خوب سنبھالا اور اسے ترقی دی۔

ان کی بسیں ضلع سرگودھا کے دور دراز کچے راستوں پر چلتی تھیں اور اس زمانے میں جب رسل وسائل کے ذرائع مفقود تھے۔ جماعتی رابطوں کے لئے یہی ایک وسیلہ تھے جہاں جماعتی پیغام پہنچانا ہوتا۔ پراچہ صاحب کا عملہ ایسی ذمہ داری سے یہ فرض سرانجام دیتا کہ حیرت ہوتی تھی اوراس ضمن میں ذراسی غفلت یا کوتاہی پراچہ صاحب کے لئے ناقابل برداشت ہوتی تھی اور ان کی خدمات صرف پیغام رسانی ہی پر موقوف نہیں تھیں۔ان کی بسیں جماعتی ڈیوٹی کے لئے ہر جگہ جانے کے لئے تیار ہوتی تھیں۔ان کی کار تو وقف تھی ہی جب وہ اس قابل نہ ہوتی تو میں نے بعض دفعہ صرف تین چار دوستوں کو لے جاتے ہوئے خالی بس کو دیکھا۔

اور جتنا بھی خرچ ہو جائے اس کی انہیں نہ صرف یہ کہ پرواہ نہیں تھی وہ ایسی خدمات سرانجام دے کر بے حد مسرت اور روحانی حظ اٹھاتے تھے۔ایک سال دریائے جہلم میں سیلاب آیا۔ابھی پانی پایاب ہی تھا کہ حضرت مصلح موعود کوہ مری سے واپسی پر خوشاب سے سرگودھا پہنچ گئے۔ چند گھنٹے بعد دریائے جہلم میں سیلاب کا ایسا خوفناک ریلا آیا جس سے سڑک کا راستہ مسدود ہو گیا اور حضرت صاحب کے قافلے کا ایک حصہ خوشاب سے آگے نہ آسکا۔جس میں حضرت سیّدہ اُم ناصر صاحبہ اور صاحبزادہ مرزا حفیظ احمد صاحب تھے۔حضرت صاحب ربوہ پہنچے تو سیلاب کی ہولناکیوں کی خبر آپ کو پہنچی ادھر پیچھے رہنے والے قافلے کی کوئی اطلاع نہیں آ رہی تھی۔آدھی رات کے وقت انتظار کے بعد حضرت صاحب خود عازم سرگودھا ہوئے اور سیدھے پراچہ صاحب کے مکان واقع بلاک نمبر 10 پر پہنچے کسی خادم نے پراچہ صاحب کو اطلاع دی یہ آدھی رات کے بعد کا سماں تھا سارا شہر محو خواب تھا۔

اس واقعہ کی تفصیل کئی بار پراچہ صاحب کی زبانی سنی۔ کہتے تھے میں ننگے پاؤں نیم بیداری کی حالت میں سڑک پر آیا اور اپنے محبوب آقا کو آدھی رات کے بعد سڑک پر کھڑے دیکھ کر بے حد پریشان ہو گیا مگر اپنے آپ کو سنبھالا دے کر حضرت صاحب سے صورت حال معلوم کر کے بصد ادب عرض کیا کہ میرے آقا۔اگرچہ سیلاب کا پانی بہت چڑھ چکا ہے تاہم ایک بالکل نئی زیرو میٹر بس جو سب سے زیادہ قابل اعتبار ہے اور ایک ماہر اور وفادار ڈرائیور کو ابھی خوشاب بھجواتا ہوں وہ اللہ چاہے تو قافلے کو بحفاظت ربوہ پہنچا دے گا۔

سمندر عزم پہ جو ہو گیا سوار تو پھر
اسے رکاب سے مطلب لگام سے کیا کام

کبھی بھی عشق میں سودے ہوا نہیں کرتے
جو جاں ہی دینے پہ آئے تو دام سے کیا کام

اس طرح نئی بس کے غرق ہو جانے کی ذرہ بھر پروا نہ کی اور ایک بس کیا اس وقت اپنی ملکیتی ہر شے حقیر نظر آ رہی تھی۔ ایک ہی تمنا تھی جو تڑپ کی صورت اختیار کر گئی تھی کہ میرے پیارے دلدار کو خیریت کی خبر ملے اور آپ کی پریشانی دور ہو اور آپ کا قلب مطہر تسکین پائے۔

اللہ کا لاکھ لاکھ احسان کہ جلد بعد ہی اس قافلے کے ریل گاڑی کے ذریعے ربوہ پہنچنے کی خبر آ گئی۔

پراچہ صاحب جس قوم سے تعلق رکھتے تھے یہ کاروباری پس منظر رکھتی ہے۔ یہ لوگ مال جمع کرنے اور اسے سنبھال کر رکھ کر گنتی کرتے رہنے اور بذل مال میں حد درجہ محتاط اور جزرس مشہور ہیں۔ مگر پراچہ صاحب نے آسمانی مفاد کا سبق پڑھا ہوا تھا اور وہ اس پر عامل بھی تھے۔

پراچہ صاحب نے دین کے لئے قربانیاں کرنے کے علاوہ اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کو اپنی اولاد پر ترجیح دیتے ہوئے بہت نوازا۔

محمد اقبال پراچہ صاحب نے طویل عمر پائی۔ ان کی غیرت دینی کے کئی واقعات ہیں۔ احمدیہ بیت الحمد نیو سول لائن میں ابھی ایک چھپر ہی ڈالا ہوا تھا۔ ہم وہاں نماز ادا کر کے بیٹھے ہوئے تھے کہ مخالفین کا ایک ریلا شمالی جانب سے حملہ آور ہونے کی نیت سے آگے بڑھ رہا تھا کہ یہ شخص تن تنہا ان کے سامنے سینہ سپر ہو کر انہیں للکارنے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے بارعب شخصیت عطا کی تھی۔ جب سوا چھ فٹ کے اُبھرتے ہوئے قد کے جوان کو اس طرح گرجتے دیکھا تو انہوں نے پسپا ہونے ہی میں عافیت جانی اور اس کے بعد مخالفین کو اس پر حملہ کرنے کی کبھی جرأت نہیں ہوئی۔

محترم شیخ اقبال صاحب پراچہ ہمیشہ اس ٹوہ میں رہتے کہ کب حضرت صاحب نے اس راہ سے گزرنا ہے اور پھر ہمہ تن آرزو بن جاتے کہ کسی طرح شرف دست بوسی نصیب ہو جائے۔

اگست 1956ء کا واقعہ ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی مری سے ربوہ جا رہے تھے کہ یہ سرفروش آپ کی سواری کی باگیں تھام لینے کے لئے راہ میں کھڑا تھا اور وہ عالی نسب امام بھی بندہ پروری، ذرہ نوازی اور دلداری میں یکتا تھا۔ پراچہ صاحب نے افراد قافلہ اور قافلہ سالار کے ساتھ مقامی جماعت کے کئی دوستوں کو بھی کینال ریسٹ ہاؤس میں ظہرانہ پیش کیا۔ اسی موقعہ پر حضرت مرزا عبدالحق صاحب نے اس عاجز پر یہ احسان کیا کہ حضرت صاحب سے میرا مفصل تعارف کرایا۔ میرے ساتھ حضرت صاحب نے ایک معاملے میں تفصیل

سے گفتگو فرمائی اور اس روز دو پہر کے وقت مجھ پر وہ بابرکت نظر پڑی جو صدیوں بعد کسی کو عطا ہوتی ہے اور اس طرح میں مورد کرم بے حساب تھا۔

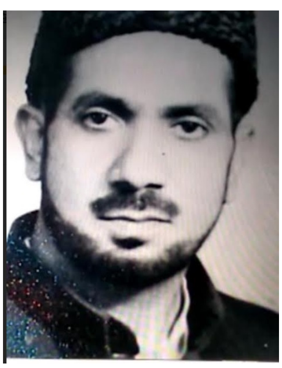
وہ کیا گفتگو تھی اور کیونکر مجھ پر نظر کرم پڑی یہ داستان طویل بھی ہے اور الفضل کے کالم ابھی بوجوہ اس کے متحمل بھی نہیں ہو سکتے۔ اتنا عرض کردوں کہ جو کچھ مجھے عطا ہوا ہے اس میرے عالی مقام مربی و مرشد کی توجہ خاص کے طفیل اور صدقے اور جو میں حاصل نہیں کر سکا وہ میری شامت اعمال ہے۔

یہ بھی مجھ پر بالواسطہ ہی سہی مگر میرے بھائی اقبال صاحب کا بہت بڑا احسان ہے اگر 22/اگست 1956ء کی دوپہر کو وہ حسن و احسان میں اپنے بے مثال باپ کا بے نظیر مثیل جس کا جلال اور جمال اس روز پورے جوبن پر تھا اور جس کے روح پرور کلمات نے میری روح کے کونے کونے کو مہکا دیا تھا۔ پراچہ بھائی کی درخواست پر سرگودھا میں قیام نہ فرماتے تو میں اس آسمانی انعام سے محروم ہی رہتا۔

اے جانے والے بھائی۔ اللہ تجھے اس کا بھی اپنی جناب پاک سے اجر دے۔

(روزنامہ الفضل ربوہ مورخہ 8/جنوری 1999ء صفحہ 5)

۞۞۞۞۞۞۞۞۞



قرآن کا عاشق، کلام اللہ کا خادم

محترم بھائی ڈاکٹر حافظ مسعود احمد صاحب

رمضان شریف کا مبارک مہینہ آتا ہے تو حافظ صاحب بہت یاد آتے ہیں کہ بموجب حکم نبویؐ کمر ہمت کس لیتے۔ داد و دہش تو گویا ہمیشہ ان کی روح کی غذا تھی مگر اس مہینے میں غربا پر بہت خرچ کرتے تھے۔ اکثر بلکہ ہمیشہ ہی چھپ چھپا کر۔ قرآن کریم تراویح میں قادیان میں لڑکپن سے سنانا شروع کیا۔ بیت المبارک میں سحری کے اوقات میں قرآن مجید تہجد میں ختم کیا اور کئی بار عشاء کی نماز کے بعد اور یہ مبارک سلسلہ تقسیم ملک کے بعد سرگودھا آنے پر جاری رہا اور پھر جب تک بستر سے اُٹھنے کی سکت رہی قرآن مجید سناتے رہے۔ 55 سال کے قریب مسلسل یہ آسمانی مائدہ تقسیم کیا اور شاید ہی یہ شرف اتنی طویل مدت تک تراویح میں کلام الٰہی سنانے کا کسی اور کو ملا ہو۔ ہم نے بھی 35، 40 سال تک انہیں رمضان شریف میں دیکھا چشمہ فیض موج میں ہوتا تھا۔ کلام الٰہی کو خوب سمجھتے تھے اور عرفان و آگہی سے اللہ کے کلام کو جب پڑھتے تھے تو ان پر وجدان طاری رہتا تھا اور سامعین پر بھی مسلسل ایک کیف روحانی مسلط رہتا تھا۔

حافظ صاحب نے قرآن کریم کو اپنی حیات مستعار پر پوری طرح قابض اور حاکم بنا لیا تھا اور یہی دستور مکتب عشق میں رائج ہے

ناممکن تھا کہ ان کی زبان سے تلاوت سنیں اور دل مچل مچل نہ جائے اور آنکھ امڈ امڈ نہ آئے۔ کوئی باقاعدہ حافظ قرآن سامع ان کی اقتدا میں نہیں ہوتا تھا البتہ ایک ایسا شخص جس نے قرآن کریم بہت پڑھا اور اس کے بہت سے حصے اسے یاد تھے۔ اور وہاں وہ ایک بے عدیل خادم کلام الٰہی نے عمر عزیز کے دس سال مسلسل چار گھنٹے بلا ناغہ روزانہ قرآن فہمی اور قرآن پر تدبر کرنے پر خرچ کر کے اللہ کے اس مکتوب سے اپنے عشق کا ثبوت دیا تھا۔ وہ مقتدی ہوتا تھا وہ حروف اور الفاظ کا حافظ تو نہیں تھا مگر مفاہیم اور مطالب کلام الٰہی اسے ازبر تھے۔ اس کا چشمہ فیض اب بھی جاری ہے اور ایک صدی کے قریب عمر ہو جانے کے باوجود اس میں کمی نہیں بلکہ مسلسل اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

سوچتا ہوں کہ یہ دو عاشقانِ کلامِ الٰہی جو سرگودھا کے حصے میں آئے یہ اس شہر بلکہ سارے ضلع کے لئے بھی ایک تعویذ کی حیثیت رکھتے ہین جن کی وجہ سے نامعلوم ہم کیسے کیسے مصائب اور نوائب الدھر سے بچ جاتے رہے۔ اللہ اس موخر الذکر بزرگ کی عمر وصحت میں برکتیں دے اور یقین ہے کہ عشق قرآن جوان کے روح و بدن میں سرایت کر چکا ہے اسی کی وجہ سے یہ طویل العمر ثمردار شجر ابھی بہار پر ہے۔ اللہ کرے کہ یہ خزاں سے ہمیشہ محفوظ رہے اور جو آج سے قریباً اڑھائی برس قبل اللہ کے حضور حاضر ہو گیا اس کو اللہ کریم اپنے قرب کے اعلیٰ مدارج عطا فرمائے۔ ڈاکٹر حافظ صاحب 1974ء میں قرآن کریم کا دور تراویح میں مکمل نہ کر سکے تھے۔ جب ان کا گھر اور سارا اثاثۃ البیت نذرِ آتش کر دیا گیا تھا۔ اس ناتمامی کا ساری عمر قلق محسوس کرتے رہے اس دن 18 واں روزہ تھا اور 24 پارے سنا چکے تھے۔ 5 راکتوبر 1974ء کو یہ نازونعم میں پلا ہوا طبیب ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں جس کا فرش بھی ناہموار اینٹوں کا ہی تھا معمولی سی دری اس پر ڈال کر ڈیرہ ڈال بیٹھا۔

اس دوران اسے ہر قسم کی مالی بھی اور سامان کی بھی پیشکش کی گئی مگر صبر اور قناعت کا وہ سبق اس نے پڑھا ہوا تھا کہ عزیز رشتہ داروں کی طرف سے بھی کوئی امداد قبول نہ کی۔ حتیٰ کہ موجودہ حضرت صاحب نے اپنی کار اس تاکید کے ساتھ بھجوادی کہ آپ کے پاس کوئی سواری نہیں ہے اور سانس پھولنے کی بیماری کے باعث آپ پیدل چل بھی نہیں سکتے۔ اس لئے یہ موٹر کار آپ ہی رکھیں۔ اتفاق سے میں ملاقات کے لئے ان کے پاس گیا تو حضرت صاحب کی چٹھی کا جواب لکھ رہے تھے۔ مجھے حضرت صاحب کا خط بھی دکھایا اور اس کا جواب بھی۔ اے کاش وہ دونوں خطوط میں نقل کر لیتا اور آج قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتا۔ ہر دو خطوط روح پرور اور ایمان افروز تھے جو ایک طرف وفا شعاری، ایثار اور محبت کا شاہکار تھا تو دوسری طرف بے نیازی قناعت اور راضی برضا رہنے اور توکل علی اللہ کی بہترین مثال۔

حافظ صاحب نے جواب میں لکھا کہ آپ میرے محسن اور میرے بھائی ہیں میرے آقا کے لخت جگر اور موجودہ امام وقت کے بھائی آپ کا احسان عمر بھر نہ بھولوں گا مگر 9x12 فٹ کا کمرہ میری ساری کائنات ہے۔ نہ گھر ہے نہ کلینک میں نے کہیں نہیں جانا ہوتا اور لکھا

کہ حضرت میاں صاحب میں جب یہ سوچتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔ اگر میں کسی سے کوئی شے آج اس بے بسی کے دور میں وصول کروں تو وہ کہے گا ''او بے غیرت مسعود''۔ ساری عمر میں نے تمہیں موجیں کرائیں۔ اگر ایک معمولی سا جھٹکا دیا ہے تو تمہیں اب شک پڑ گیا ہے کہ میرے خزانے میں تیرے لئے اب کچھ نہیں رہا ہے اور دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو۔ ممکن ہے کوئی لفظ آگے پیچھے ہو گیا ہو۔ مگر یقین سے کہتا ہوں مفہوم یہی تھا اور دعا کی درخواست پر مکتوب ختم کر دیا۔

اسی طرح آپ کے حقیقی ماموں چوہدری نثار احمد صاحب نے اپنے بیٹوں کے ذریعہ اور حضرت چوہدری عزیز احمد صاحب باجوہ سیشن جج نے میرے ذریعہ 70،70 ہزار روپے نقد پیش کرنا چاہے مگر بڑی لجاجت اور ممنونیت کے ساتھ معذرت کر دی اور ہر بار یہی رویہ تھا کہ کسی بندے سے نہیں مانگنا۔ اللہ ''مالک الملک'' پر ہی کامل توکل تھا۔

ایک اور خوبی یہ کہ جن کے متعلق یقین تھا کہ جن لوگوں نے انہیں زندہ جلانے کے لئے آگ بھڑکائی تھی ان کے خلاف بھی کبھی شکوہ زبان پر نہ لائے۔ بلکہ ایک شخص کو پیغام بھیج کر کہا کہ تم ضمانت کرالو پکڑے جاؤ گے۔

دنیا والوں نے انہیں بے گھر کیا بے در کیا پھر بھی ان کے قلب حب خلق سے معمور ہیں تیرے بندے اے خدا سچ ہے کہ کچھ ایسے بھی ہیں۔

اللہ نے بھی اپنی جود وعطا میں دیر نہ کی اور جلد جلد گھر بنا دیا جو ایک محل کی صورت ہے اور بیس سے زائد دکانوں پر مشتمل مارکیٹ بھی اور پہلے سے بڑھ کر سامان بھی اپنی جناب سے موهبت کیا۔ قریب دو ماہ جیل میں بند رہے۔ اس دوران بڑی صعوبتیں خوشدلی سے برداشت کیں۔ بہت ناقص خوراک دی جاتی تھی گھر سے کھانا منگوانا ممکن بھی نہیں تھا اور انہیں مصائب جھیلنے میں ایک سرور بھی حاصل تھا۔ ان دو ماہ کی مشکلات اور سختیوں نے صحت تباہ کر دی۔ اس کے بعد آپ مختلف عوارض کی وجہ سے صاحب فراش ہو گئے اور کافی عرصہ بستر علالت پر گزارا۔ طبیعت میں نفاست انتہا کی تھی عام طور پر اپنی بیماری کی حالت ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے اور اسی وجہ سے ملاقات کرنے سے بھی گھبرانے لگے مگر میں اور برادرم محمود الحسن صاحب قریشی اکثر حاضر ہوتے رہے۔

جب حالت یہ ہو گئی کہ ساری ساری رات جاگ کر گزار دیتے۔ سانس کی تکلیف کے باعث لیٹنا ممکن نہ ہوتا تھا۔ تکیے کے سہارے اکڑوں بیٹھے بیٹھے ساری رات بسر ہو جاتی۔ ایسے میں خوراک بھی برائے نام تھی۔

میں نے ایک روز پوچھا یادداشت کا کیا حال ہے کہنے لگے قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ یہ تو مجھے ابھی خوب یاد ہے۔ چنانچہ ایک رات میں (بیماری کے ہاتھوں آرام کا تو سوال نہیں تھا۔) میں نے 18 سیپارے ختم کر لئے ہیں اور کہ بیماری کے دوران بھی تیسرے دن تو قرآن شریف ختم کرتا ہوں۔ اس سے مجھے سکون ملتا ہے۔ کلام الٰہی کے ساتھ عشق کی ایسی مثال بہت کم ملے گی عام طور پر تو بیماری کے

باعث عبادات اور مطالعہ میں کمی آ جاتی ہے مگر یہ عجیب شخص تھا جس کا مذہب ہی عشق تھا۔

رمضان شریف میں قرآن کریم کا دور ختم کرنے اور تراویح میں کلام الٰہی سنانے کے شکرانے کے طور پر گھر پر مٹھائیاں تیار کروایا کرتے سارے مقتدیوں کی تواضع بھی کرتے اور کئی گھروں میں بھی بھجواتے۔ صد حیف کہ گردش زمانہ نے ان کی تلاوت کلام مجید کے روح پرور مناظر سے خصوصاً جب وہ اپنے آقا کی موجودگی میں سوز و وجدان میں ڈوب کر کرتے تھے ہمیں محروم کر دیا۔

دنوں مہینوں اور سالوں کی تیز رفتاری اور گزرتا وقت اس نیک طبیعت اور پارسا اور ایثار پیشہ شخص کی یاد کو دلوں سے نہ مٹا سکا ہے اور نہ ہی اس کی محبت میں کمی کر سکا ہے۔ آج نفسانفسی کا دور ہے ایسے میں کسی ایسی شخصیت کو یاد کرنا اور اس کی یاد میں آنکھوں کو نمناک کر لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ اعلیٰ قدروں کی اس ٹوٹ پھوٹ کے باوجود بے لوث محبت کرنے والے لوگ انسانوں کے قلوب سے کبھی غائب نہیں ہوتے اور اپنی شیریں یادوں کو تازہ بھی رکھتے ہیں اور اس کے اظہار پر مجبور بھی کرتے ہیں اور محبتوں اور خلوص اور قربانیوں کا انعام آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسوؤں کی صورت میں وصول کر لیتے ہیں۔

ہم نے حافظ صاحب کی جوانی کی ترنگ بھی دیکھی اور پھر کہولت اور ناتوانی اور طویل علالت کا دور بھی دیکھا مگر اللہ کی قدرت نے ایسا بلند حوصلہ عطا کیا ہوا تھا کہ جس نے دل چھوڑنے نہ دیا نہ کبھی مایوسی کی طرف رخ مڑا۔

مجلس مشاورت ہو یا جلسہ سالانہ افتتاحی تلاوت آپ کی ہوتی تھی اور یہ بجا طور پر انہیں فخر تھا کہ خلفاء ثلاثہ کے قدموں میں کھڑے ہو کر قرآن پڑھنے کی سعادت نصیب ہوا اور اکثر کہتے تھے کہ میرا اور تو عمل کوئی نہیں یہ علامت مغفرت الٰہی کی لگتی ہے۔ حالانکہ انفاق فی سبیل اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں ہمیشہ مستعد رہتے۔ اس کے علاوہ تمام تحریکات میں ایسی خوشدلی سے اور فراخی سے خرچ کرتے تھے کہ رشک آتا تھا۔ کسی کی مالی تنگی کا علم ہوا تو خود ہی امداد کے لئے پہنچ جاتے۔ شہر کے ایک بڑے وسیع کاروبار کے مالک نے ایک بڑی رقم قرض لی اور وہ وعدہ کے اندر ادا نہ کر سکا انہوں نے تو کبھی مطالبہ نہ کیا اور اسی دوران اس کی وفات ہو گئی۔ وہ میرا بھی واقف تھا۔ تھا غیر از جماعت۔ اس کی وفات کی خبر سنی تو فوراً اظہار تعزیت کے لئے میرے ساتھ اس کے مکان پر گئے۔ ابھی اس کی تدفین نہیں ہوئی تھی۔ مجھے کہا کہ اس کے والد کو کہہ آئیں کہ متوفی کو میں نے قرض معاف کر دیا ہے۔ آپ ادائیگی کے ذمہ دار نہیں ہیں۔

وہ بے حد ممنون ہوا کیونکہ اسے قرض بروقت ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے ندامت ہو رہی تھی اور وہ اپنے آپ کو زیر بار سمجھ رہا تھا۔

جب زیادہ بیمار پڑ گئے تو ایک کاپی نکلوائی اور اسے نذر آتش کرنے کے بعد کہا کہ میں نے جن لوگوں سے ادھار وغیرہ کی رقوم لینی تھیں وہ میں نے ان سب کو معاف کر دی ہیں۔

اور وہ رقوم اس کاپی میں درج تھیں۔ اگر کوئی ادائیگی کرنا چاہے تو ان سے کچھ وصول نہ کریں۔ چنانچہ ایک مقروض میری موجودگی میں

ان کی وفات کے بعد کراچی سے آئے اور ہزار ہزار روپے کے بہت سے نوٹ ان کے بیٹے کو ادا کرنا چاہے مگر انہوں نے کہا ابا جان منع کر گئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح دس ہزار روپے کی رقم ایک افغانی خانہ بدوش کو دی ہوئی تھی وہ بھی معاف کر دی۔

اور اس جود وسخا اور داد و دہش میں جماعت اور غیر جماعت میں کوئی فرق نہ تھا۔ جہاں دیکھا کسی انسان کو ضرورت ہے اور وہ تکلیف میں ہے اس کا بوجھ اٹھانے کے لئے اپنا کندھا پیش کر دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی بیماری اور وفات کا غم بہت سے دوسرے لوگوں نے بھی بے حد محسوس کیا۔

عبادت کی ادائیگی میں التزام اور باجماعت ادائیگی میں باقاعدگی ساری عمر کا دستور رہا اور اس پر سختی کے ساتھ عمل کیا۔ البیت میں نمازوں اور جمعہ کے روز بہت پہلے آ کر ذکر الٰہی میں مصروف ہو جاتے۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی البیت میں حاضری میں ہم ان سے سبقت لے گئے ہوں۔ جب دیکھا انتظار میں پہلے سے بیٹھے ہوتے۔ ایک دفعہ ذکر کیا قادیان میں اس سلسلہ میں بہت احتیاط کی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ سال کے بعد جائزہ لیا تو سال کی ساری نمازیں باجماعت البیت میں ادا کی گئی تھیں۔ ہمارے بزرگ اسلاف کی اس سلسلہ میں بڑی روح پرور اور دل آویز مثالیں ہمارے مشعل راہ ہیں اور حافظ بھائی ان بزرگ اسلاف کی روایات کے امین، دردوسوز کے سفیر اور عشق و وفا کے پیکر تھے۔

حافظ بھائی صاف ستھرا لباس پہنتے تھے۔ کسی نے ان کے دامن پر حسد، حرص، ہوس، انتقام یا تعصب کا کوئی داغ نہ دیکھا۔ وہ شخص دشمنوں کا بھی دل سے خیر خواہ تھا۔ کبھی چھوٹی یا سطحی بات نہ کی۔ وہ شب زندہ دار تھے اور تہجد گزار تھے۔ انہوں نے 60 سال کے طویل عرصہ کے دوران بلا معاوضہ مریضوں کا علاج کیا۔ شہر سے باہر بھی مریضوں کو دیکھنے جاتے مگر کبھی فیس قبول نہ کی۔ بلکہ بہت لوگوں کو دوائیاں بھی مفت دیا کرتے تھے۔

جب وہ قرآن سنا رہا ہوتا اور دعائیہ آیات آتیں تو اس کا حال اس کی آواز کی لرزش اور سوز سے معلوم ہو جاتا تھا اور ایسے لگتا کہ گویا اس کی روح پگھل کر آستانہ الوہیت پر گر گئی ہے اور جب تک اس کی مناجات قبول نہیں ہو جاتیں وہ اس چوکھٹ سے اپنا سر نہیں اٹھائے گا۔

حافظ صاحب کی پیدائش ایک سرفروش ''رفیق'' کے گھر ہوئی۔ پھر تعلیم و تربیت اس مقدس بستی میں ہوئی۔ جس میں بھاری اکثریت دین کو دنیا پر مقدم کرنے والوں کی تھی اور اس زمانے میں رفقا کرام کی بڑی تعداد وہاں سکونت پذیر تھی۔ ان سب کے سالار حضرت ''پسر موعود'' بھی تھے۔ چودھویں کے چاند کے مانند ان کی ضوفشانی پورے جوبن پر تھی۔ پھر وہاں ایک اور بھی ''چاند'' تھا جو وہ بھی آسمانی وعدوں کے مطابق آیا تھا۔ ایک ایک کا نام گنوانا اور لکھنا تو ممکن نہیں مگر میں نے تین سال تک وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک بدر

کامل کے جلو میں ایسے نجوم کا جمگھٹا تھا۔ جس سے آسمان روحانیت پر کہکشاں کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔

ایک روز وہ عالی مرتبت آقا نوجوانوں کی کسی تقریب میں تشریف لائے۔ تقریب کا انتظام ٹی۔ آئی ہائی سکول کے باہر گراؤنڈ میں کیا گیا تھا۔ 15، 20 کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ جو حضرت صاحب اور دیگر اکابرین اور اساتذہ کے لئے تھیں۔ نوجوانوں نے زمین پر ہی بیٹھنا تھا۔ چنانچہ ہم حضرت صاحب کی انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ سیّدنا حضرت مرزا محمود احمد صاحب تشریف لائے۔ ہمیں زمین پر بیٹھے دیکھا تو دل پر چوٹ سی لگی کہ نیچے کوئی صف یا دری تک نہیں تھی اور مٹی بہت تھی۔ آپ نے آتے ہی اپنے نیچے سے کرسی پیچھے ہٹا دی اور اس دھول پر بیٹھ گئے جس سے گرد بھی اڑی اور آپ کا سارا لباس بھی گرد آلود ہو گیا اور پھر اسی موضوع سے اپنا خطاب شروع فرمایا کہ ان نونہالوں کے لئے بیٹھنے کا مناسب انتظام کرنا ضروری تھا۔ ہم کرسیوں پر بیٹھیں اور یہ مٹی پر۔ فرمایا یہ تو ان کی عزت نفس کو کچل دینے کے مترادف ہے۔ اس طرح اپنے عمل سے اس خرابی کی اصلاح فرما دی اور اس میں کیا کلام ہو سکتا ہے کہ عملی نمونہ زبانی وعظ و نصیحت سے کہیں زیادہ موثر ہوتا ہے۔

الغرض اس بستی میں اخلاق عالیہ اور دینی اقدار اور آداب کے وہ سبق ملتے تھے کہ جس کی مثال کہیں اور تلاش کرنا سعی لا حاصل ہے۔ اور یہ متعلم یعنی ڈاکٹر حافظ مسعود احمد صاحب اسی دینی اور اخلاقی درسگاہ کے فارغ التحصیل تو تھے۔ ان بزرگوں کے تربیت یافتہ تھے جن کا خمیر زھد و تعبد تقویٰ اور طہارت اور اخلاق حسنہ اور آداب و اقدار سماوی سے اٹھایا گیا تھا۔ چنانچہ بظاہر چھوٹا سا واقعہ ہے لیکن ملاحظہ فرماویں کہ کیسا اس بچپن کے پاکیزہ ماحول کا رنگ اس حافظ قرآن پر چڑھا تھا۔

ہوا یوں کہ ہم پانچ افراد یعنی حضرت مرزا عبدالحق صاحب، حاجی محمد اقبال صاحب پراچہ، قریشی محمود الحسن صاحب، حافظ صاحب اور خاکسار راقم ایک جماعتی مقدمہ کے سلسلہ میں لاہور گئے ہوئے تھے۔ سردی کا موسم تھا۔ رات وہیں ایک ہوٹل میں شب باش ہو گئے موٹر کار حافظ جی کی تھی اور ڈرائیو بھی وہ خود ہی کرتے تھے۔ علی الصبح جب ہم سرگودھا کے لئے روانہ ہوئے تو محسوس کیا کہ حافظ صاحب پر نیند نے غلبہ کیا ہوا ہے چنانچہ ایک جگہ اتر کر پانی کے چھینٹے منہ پر ڈالے اور پھر سفر جاری رہا۔ اس کا سبب پوچھا تو اوّل تو ٹالتے رہے مگر ہم بھی کب پیچھا چھوڑنے والے تھے۔ حضرت مرزا صاحب سے الگ جا کر بتایا کہ میری عادت ہے کہ صرف دائیں کروٹ ہی سو سکتا ہوں اور اگر دائیں پہلو سوتا تو حضرت امیر صاحب کا پلنگ میری پشت کی طرف آتا تھا۔ یہ سوئے ادبی تھی کہ میں ان کی طرف پیٹھ کر کے سوؤں چنانچہ سرما کی ساری طویل رات جاگتے ہوئے گزار دی اور بعد میں اس وجہ سے نیند آتی رہی تھی۔

ممکن ہے کوئی منچلا نوجوان اس واقعہ کو ایک بلا وجہ تکلف یا غیر ضروری اور بے جا اظہار ادب قرار دے مگر جو لوگ اخلاص و اتقا کی باریک راہوں کے متلاشی ہوتے ہیں۔ وہ اسی طرح ہی اپنی سہولت آرام اور عافیت کی پرواہ کئے بغیر ان منزلوں کی طرف بڑھتے

رہتے ہیں۔ وہ نہ کسی کی تنقید کی پرواہ کرتے ہیں نہ وہ کسی کی تعریف وتوصیف کے محتاج ہوتے ہیں۔ آخر میں ایک معذرت کہ آج کے واقعات بے ترتیبی سے تحریر کئے ہیں۔ آج حافظ بھائی بے تحاشا یاد آئے تو جو ذہن میں آتا گیا۔ لکھتا گیا۔

کتنی بے ربط تھی عشق کی گفتگو
جب مرتب ہوئی داستاں ہو گئی

والا معاملہ ہے۔

یہ میری ٹوٹی پھوٹی عبارت اور آڑے ترچھے الفاظ میرے عقیدت اور ممنونیت کے چند پھول ہیں جو ان کی روح کو پیش کر رہا ہوں۔ غرض ایک ہی ہے کہ اس پیارے بھائی کے لئے احباب کرام دعا کریں اور ان کے درجات بلند ہوں اور راقم کے انجام بخیر ہونے کے لئے بھی مؤدبانہ درخواست دعا ہے۔

(روزنامہ الفضل ربوہ مورخہ 24/اپریل 1999ء صفحہ 5 تا 6)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

مجنون جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

آسمان روحانیت کے ’’قمر‘‘ کا ایک ٹکڑا گر پڑا

دنیا میں دہشت گردی کی اتنی وارداتیں ہوئیں۔ قتل وغارت گری اور بے گناہ قیمتی جانوں کے ضیاع کا سلسلہ اس طرح جاری رہا گویا یہ روزمرہ کا فرض ادا ہو رہا ہے۔

اس صدی کے پہلے ہی سال 1901ء میں حضرت صاحبزادہ عبداللطیف صاحب کے ایک شاگرد عبدالرحمن صاحب کو حق قبول کرنے کی پاداش میں گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا۔ پھر 14/جولائی 1903ء کو حضرت شہزادہ صاحب کو ملک افغانستان میں ہی چرخی پل جیل کابل کے ساتھ والے میدان میں جس وحشت اور درندگی سے سنگسار کیا گیا اس کی مثال بھی نہیں ملے گی اور جس کمال بہادری اور کمال استقامت اور کامل صبر کے ساتھ اپنی متاع جان حضرت شہزادہ صاحب نے اپنے خالق و مالک کے سپرد کر دی وہ بھی بیمثال ہے ’’اے عبداللطیف تیرے پر ہزاروں رحمتیں‘‘ تیری پاک روح اپنے خالق و مالک کے قدموں میں قربان ہونے کے لئے بیقرار تھی۔ اس لئے وہ کمال اطمینان کے ساتھ اس قتل گاہ کی طرف بڑھتی گئی۔

اس کے بعد 31/اگست 1924ء کو بھی اور 5/فروری 1925ء کو بھی کئی جانثاروں نے تاریخ افغانستان کے کئی درخشندہ باب اپنے

خون سے رقم کئے۔

اب یہ صدی جواختتام کو پہنچ رہی ہے اس میں سینکڑوں ''شاتان'' ذبح کی گئیں۔ سیّدنا حضرت خلیفۃ المسیح نے مسلسل خطبات کے ذریعہ ان روح پرور یادوں کو جو بھولی تونہیں تھیں کچھ مدھم ضرور ہوگئی تھیں پھر سے تازہ کر دیا ہے۔اب اس گلستان عشق و وفا میں پھر بہار آ گئی ہے۔

سچ ہے اقوام وملل کی کھیتیاں پانی سے نہیں خون سے سینچی جاتی ہیں۔راہ خدا میں ان جان پر کھیل جانے والوں کی تاریخ پر ہمیں بجا طور پر فخر ہے۔اللہ ان کے درجات بلند فرماتا رہے۔وہ ہمیں مسلسل دعوت عمل دے رہے ہیں اور بزبان حال کہہ رہے ہیں کہ ؎

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سر راہ سرخی مل گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سر بزم یار چلے گئے

آج کی نشست میں علم وادب کے جس نابغہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ ایک کم سخن وسیع النظر مومنانہ فراست بلندی کردار اور اخلاق حسنہ کا حامل جوان رعنا تھا جیسا کہ اوپر میں نے اظہار کیا ہے کہ اس صدی کے شروع میں کابل کی پہاڑیوں کی اوٹ میں حق کو قبول کرنے کے جرم میں جو قتل وغارت کا بازار گرم کیا گیا تھا۔وقتاً فوقتاً اس کا تسلسل جاری رہا۔

نہ بجھا سکیں انہیں آندھیاں جو چراغ ہم نے جلائے تھے
کبھی لو ذرا سی جو کم ہوئی تو لہو سے ہم نے اُبھار دی

اللہ کی راہ میں جان فدا کرنے اور خون بہانے کی داستان لرزہ خیز بھی ہے اور ایمان افروز بھی۔

صاحبزادہ مرزا غلام قادر صاحب کی والدہ محترمہ قدسیہ بیگم صاحبہ نے الفضل 7 رجون کی اشاعت میں کچھ حالات تحریر فرمائے ہیں جو برستی آنکھوں سے ہی پڑھ سکا ہوں لیکن اس کے مطالعہ سے یہ حیرت انگیز اور ایمان افروز حقیقت سامنے آئی کہ سیدہ ممدوحہ نے اتنی کاری ضرب کے صدمہ جانکاہ کے باوجود کمال صبر اور راضی برضاء الٰہی رہنے پر پورا عمل کیا اور اپنے لخت جگر کی اس جان کی قربانی پر باوجود شدید رنج والم کے اس لحاظ سے مسرت اور خوشی کا بھی اظہار کیا کہ ان کی گود کا پالا ہوا سپوت وہ پہلا فرزند مسیح موعود تھا جس نے اپنا جوان خون ملت کے کھیت کی آبیاری کے لئے پیش کر دیا۔

سیّدہ موصوفہ نے ایک جگر پاش کر دینے والا جملہ بھی اپنے مضمون میں شامل کیا کہ ''میرے بچے صبر اپنی جگہ اور ممتا اپنی جگہ''۔

اس میں شک نہیں کہ اس مقدس خاندان کی ممتا بھی بیمثال ہے اور صبر بھی بے نظیر ورنہ ہمارے ملک میں تو ایسے سانحات ہو جائیں تو سینہ کوبی اور بال نوچنے بلکہ زنجیر زنی تک نوبت آتی ہے مگر اس مقدس خانوادے کے مقتدا اور پیشوا نے تو آنسو بہانے کو بھی صرف اور

صرف ''پیش رب ذوالمنن'' تک ہی محدود کر دیا ہے اور سیّدنا حضرت مسیح موعود نے جماعت کی اصلاح اسی طور پر کی ہے کہ سارا ''بث وحزن'' اللہ قدیر وعزیز ہی کے حضور پیش کیا جائے اور کوئی شکوہ کہیں اور نہ ہو۔

اس جگہ میں اس صدی کے ابتدائی سالوں میں ہونے والے 14 ر جولائی 1903ء کے دردناک واقعہ کے متاثرین میں سے حضرت شہزادہ صاحب آف افغانستان کے بیٹے صاحبزادہ سیّد محمد طیب صاحب لطیف کے صبر جمیل کا ذکر کرنے سے نہیں رہ سکتا۔ 1903ء کے سنگساری کے واقعہ کے وقت ان کے اس بیٹے کی عمر اندازاً آٹھ نو سال تھی۔ ان کے والد کو تو 14 ر جولائی 1903ء کو حد درجہ سفاکانہ طریق پر قتل کر دیا گیا تھا لیکن خاندان کے بقیہ افراد پر بھی ظلم وستم کی وہ قیامت ڈھائی گئی جس کے سُننے سے بھی انسان پر وحشت طاری ہو جاتی ہے اور جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

58-1957ء کی بات ہے کہ صاحبزادہ سیّد محمد طیب صاحب لطیف اپنے چچا زاد بھائی صاحبزادہ عبدالرب صاحب کے ایک نجی ملازم کی ضمانت پر رہائی کرانے کے سلسلے میں سرگودھا میرے پاس تشریف لائے اور یہ پہلی ملاقات ہی گہری دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ وہ اکثر میرے پاس میرے اصرار پر شب باش ہوتے تھے اور اس دوران ان کے والد بزرگوار حضرت شہزادہ صاحب کی سنگساری اور اس کے بعد باقی افراد خاندان کی جلاوطنی اور پھر لمبے عرصہ تک گندی جیل میں ڈال دینے کے واقعات میں سنتا رہتا تھا۔

میں نے ایک بار یہ بھی گزارش کی کہ وہ کچھ زیادہ وقت نکال کر یہ حالات مجھے املا کرا دیں جس پر موصوف راضی ہو گئے لیکن اس کے بعد ان کی علالت طبع اور پھر وفات نے اس میری خواہش کی تکمیل نہ ہونے دی۔ گو میں نے محسوس کیا کہ انہیں اپنے خاندان کی قربانیوں اور مظالم کے بیان کرنے میں حجاب محسوس ہوتا تھا۔

اسی دوران سرگودھا میں چوہدری قائم دین صاحب جو بڑا عرصہ سرگودھا میں افسر مال رہے اور پھر قائم مقام ڈپٹی کمشنر سرگودھا بھی تعینات ہوئے۔ انہیں جب علم ہوا کہ حضرت شہزادہ صاحب مرحوم آف کابل کے بیٹے صاحبزادہ سیّد محمد طیب صاحب لطیف میرے پاس تشریف لائے ہوئے ہیں تو انہوں نے ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور علیحدگی میں 1903ء کے واقعات سننے کی اپنی دیرینہ تمنا کا اظہار کیا۔ چنانچہ ڈیڑھ گھنٹے تک چوہدری صاحب موصوف کی کوٹھی پر یہ ملاقات جاری رہی اور اس کے بعد جب تک چوہدری صاحب زندہ رہے حیرت اور حد درجہ پسندیدگی بلکہ عقیدت سے اس امر کا اظہار کرتے رہے کہ میں نے اس شخص سے ملاقات کی ہے اور حالات سنے ہیں جو نہ صرف سنگسار ہونے والے باپ کا بیٹا ہے بلکہ خود عملاً ہر روز حکومت افغانستان کی طرف سے موت کا سامنا کرتا رہا جس میں اس کے بہن بھائی ہی شریک نہیں تھے بلکہ بزرگ والدہ بھی اپنی ضعیف العمری کے باوجود تختۂ مشق ظلم وستم بنی رہیں لیکن مصائب جھیلنے والا شخص اس وقت کے شاہ کابل کے خلاف کوئی سخت لفظ کہنے کو تیار نہیں تھا۔ ہاں اتنا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا کہ باوجود کئی خوبیوں کے

بادشاہ ملاؤں کے بھرے میں آ گیا تھا اور اسی وجہ سے ان کے والد بزرگوار کو سنگسار کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

انہیں حیرت اس لئے ہوئی کہ بادشاہ کی ایسی متعصّبانہ اور مہلک کارروائیوں کے باوجود کوئی حرف شکایت متاثرین کے لب پر نہ آنا کمال صبر استقامت اور راضی برضا رہنے کی دلیل ہے۔

خوشبوئے تبسم چھین سکی نہ موت بھی جن کے ہونٹوں سے
ان دیوانوں کو تکتی ہیں حیرت سے ستم کی زنجیریں

یہ نوٹ صاحبزادہ مرزا غلام قادر احمد صاحب کی والدہ ماجدہ کے دردناک مگر نصیحت آموز مضمون سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ میرا یہ مختصر مضمون اس بلند مرتبت بطل احمدیت کی حسنات گنوانے کی کاوش تو نہیں ہے لیکن سیّدہ ممدوحہ کے مضمون میں جو یہ بیان آیا کہ ''امی اس گاڑی میں آپ نے کوئی کام نہیں کرنا۔ یہ انجمن کی گاڑی ہے اور مجھے چھوڑنے آئی ہے'' اس واقعہ سے موصوف کی امانت و دیانت سلسلہ احمدیہ کے اموال کی حفاظت کا گہرا احساس اور تقویٰ کی باریک راہوں کے متلاشی ہونے پر جو روشنی پڑتی ہے وہ کسی تبصرے کی محتاج نہیں۔

میاں غلام قادر احمد صاحب کو اس قدر احساس امانت و دیانت اپنے عالی مرتبت دادا عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم آسمان روحانیت کے چاند حضرت مرزا بشیر احمد صاحب سے وراثت میں ملا ہوا تھا جو قادیان ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر اس وقت تک داخل نہ ہوئے جب تک کہ ان کے لئے پلیٹ فارم کا ٹکٹ خریدا نہ گیا۔

یہ لوگ روشنی کے مینار تھے اور جتنا بھی گھپ اندھیرا ہو جائے یہ مشعلیں نور بکھیرتی رہیں گی اور دنیا ان کے اخلاق عالیہ اور حسنات سے تا قیامت فیض پاتی رہے گی۔

عجب گوہر ہے جس کا نام تقویٰ
مبارک وہ ہے جس کا کام تقویٰ
سنو ہے حاصل اسلام تقویٰ
خدا کا عشق مے اور جام تقویٰ

حضرت مسیح موعودؑ نے حضرت سیّد عبداللطیف صاحب آف سید گاہ افغانستان کے واقعہ قربانی پر تحریر فرمایا تھا کہ

''اے عبداللطیف تیرے پر ہزاروں رحمتیں کہ تو نے میری زندگی میں ہی اپنے صدق کا نمونہ دکھایا اور جو لوگ میری جماعت سے میری موت کے بعد رہیں گے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کیا کام کریں گے۔''

آندھیاں اور زلازل ہم پر پہلے بھی چل چکے ہیں مگر باوجود اپنی کمزویوں کے اور باوجود اپنی خطاشعاریوں کے ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ گرتے پڑتے اسی مستقیم راہ کو اختیار کریں گے۔ جسے 1901ء میں میاں عبدالرحمان نے اور 14 رجولائی 1903ء کو حضرت شہزادہ عبداللطیف نے اور 31 راگست 1924ء کو حضرت مولوی نعمت اللہ خان صاحب نے اور 5 رفروری 1925ء کو قاری نور علی صاحب اور مولوی عبدالحلیم صاحب نے افغانستان میں اور اس کے بعد سینکڑوں احمدیوں نے ملک پاکستان میں بھی اور بیرون پاکستان بھی اختیار کیا اور وہ احیاء میں شمار ہوئے اور اس صدی کے آخر میں میاں غلام قادر اسی گروہ جاں نثاراں میں شامل ہو گئے۔

تیرے نصیب میں آئی حیات لافانی
مکین خُلد برین تیری رفعتوں کو سلام

اے مرزا غلام قادر تو جی ہے جب ''احیاء'' سے تیری ملاقات ہوئی تو اپنے مقدس جدامجد کی خدمت میں دست بستہ عرض کرنا کہ بڑے ابّا آپ کی قائم کردہ جماعت اللہ کے فضل اور اس کی توفیق سے آپ کی انہی دعاؤں کی مستحق ہے جو آپ نے 1903ء میں حضرت شہزادہ صاحب کے لئے کی تھیں اور کہنا کہ میرے اور سارے جماعت کے روحانی باپ دیکھ کہ

آج پیراہن ہستی بھی کیا نذر جنوں
آخری تھا یہی ہدیہ تیرے سودائی کا

اور ہمارے چاروں خلفائے کرام نے جماعت کی تعلیم وتربیت بھی اس نہج پر کی ہے کہ اب وہ خطرات کے بادلوں سے گھبراتے نہیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دامن رحمت سے چمٹ کر آپ ہی کے الفاظ میں التجائیں کرتے رہتے ہیں کہ

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسی ڈگر پر چلنے کی توفیق بخشے جس پر ہمارے بزرگ چل کر سرخرو ہوئے اور فوز اور فلاح پا گئے۔ اے اللہ تو ایسا ہی کر اور اللہ کریم وقدیر میاں غلام قادر کے بزرگ والدین اور صابرہ وشاکرہ بیگم اور معصوم بچوں کی تولیت اور کفالت اپنے ہی ذمہ لے لے اور اپنی شفقت اور فضلوں کے ہاتھ سے ان مجروح دلوں کے سارے زخم مندمل فرما دے اور میاں مرحوم کی والدہ ماجدہ جو اگرچہ صبروشکر کی اعلیٰ مثال قائم کر رہی ہیں مگر فطری اور طبعی تقاضے بھی ساتھ ہی ہیں اور ان کے ساتھ ہجروفراق کے تیر اور اپنے لخت جگر کی جواناں مرگ کے روح فرسا نظاروں نے انہیں نیند سے محروم کر دیا ہے۔ اے ماں باپ سے بڑھ کر پیار اور شفقت اور محبت کرنے والے آسمانی آقا تو نے نیند کو ''سباتا'' بنایا ہے۔ انہیں نیند رات بھر نہ آئے تو یہ ان کے بس میں نہیں ہے۔ نہ یہ صبر کرنے کے خلاف ہے عرش سے سکینت اور اطمینان نازل فرما کر ان کے سارے رنج وکلفت دور فرما دے اور میٹھی نیند انہیں دے اور تو چاہے تو اس میں ان کے نور نظر سے بھی اور سیدہ ممدوحہ کے حضرت نانا ابا سے بھی ملاقاتیں کرا دے تا ان کے سارے حزن اور ملال دور ہو جائیں اور ان کی زندگی

میں ایسی بہاریں آئیں جس میں سارے غم واندوہ بھول جائیں۔

ہمارے آقا

تری قدرت کے آگے روک کیا ہے

(روزنامہ الفضل ربوہ مورخہ 6راگست 1999ء صفحہ 3 تا4)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

حضرت حافظ فاتح الدینؒ

محبتوں کا سفیر

موسم گرما 1944ء کی ایک شام بیت المبارک قادیان دارالامان کی چھت پر مغرب کی نماز کے لئے بیٹھے تھے کہ شمالی جانب سے ایک دروازہ کھلا وہاں سے ایک ''نور'' مجسم برآمد ہوا۔ یہ لفظ نور میرا عقیدتی اظہار نہیں ہے۔ یہ لفظ تو رب عرش نے خود استعمال کیا تھا۔ بلکہ وہاں تو لفظ نور کا تکرار فرمایا گیا۔ وہی آسمانی شخص جس کے آنے سے کئی محاورے بھی یکسر بدل گئے ''شش جہات'' صفات سے متصف تو سنتے آئے تھے یہ تو باون صفات کا حامل تھا اور وہ باون صفات حسنہ بھی اپنی ذات میں مرکب۔ وہ نمودار ہوا تو عشق ووفا اور اخلاص وایثار کا عطر فشاں جھونکا دلوں میں اُتر گیا۔ ہماری خوش بختی کہ بعد ادائیگی نماز وہ ایک شہ نشین پر رونق افروز ہوا۔

نہ معلوم مجھے کیسے جرأت ہوئی سوچتا ہوں کہ وارفتگی اور دیوانگی ہی ایسے کام کرواتی ہے۔ کسی سے نہ پوچھا نہ اجازت چاہی محبوب الٰہی کے قدموں میں جا بیٹھا اور اناڑی ہاتھوں کے ساتھ پیر دبانے شروع کئے مگر شکرِ خدا کہ مجھے کسی نے نہ روکا نہ ٹوکا۔ عشاء کی نماز کے لئے صفیں تیار ہوئیں تو میں خوشی سے جھوم رہا تھا جیسے متاع بے بہا کی کان ہاتھ آ گئی ہو۔

جب یہ روحانی محفل برخاست ہوئی تو میرے محسن اس دور کے پرنسپل نے اشارے سے بلایا اور پوچھا کہ تمہیں پاؤں دبانے کی مشق ہے۔ میرا جواب نفی میں سُن کر فرمایا یہ نہ ہو کہ حضرت صاحب کو بجائے آرام پہنچانے کے تکلیف کا موجب بنے ہو۔ یہ سوال ایسا تھا کہ میرا رنگ زرد ہو گیا مگر سنبھل کر ملتجیانہ انداز میں عرض کیا کہ نہیں جی ایسا نہیں ہوا ہوگا۔ اس پر مجھے روزانہ اس صدیوں بعد حاصل ہونے والے شرف کا پروانہ مل گیا۔ آج اس پر نصف صدی سے زائد کا عرصہ گزر گیا ہے۔ اپنی محرومیوں کے تصور میں کھو جاتا ہوں تو ایک بے تاب تمنا تڑپا دیتی ہے اور میں کبھی جاگتے ہوئے اور کبھی سوتے ہوئے کہہ اٹھتا ہوں۔

لا پھر وہ بادہ وجام اے ساقی

میں ایک گنوار اور سراسر بے ہنر بے ڈھنگے لباس میں ملبوس زبان و بیان میں بھی نہ کوئی حلاوت نہ دلکشی اور یہ میری انکساری نہیں میرا تکلف نہیں خدا شاہد کہ عین حقیقت ہے مگر مجھے میرے پیارے پرنسپل نے ہاں اس نافلہ موعود نے اپنی خصوصی غلامی کا شرف عطا کیا اور پھر اس مقدس خاندان کی یہ تو روایت چلی آئی ہے کہ جس کا ہاتھ پکڑا اسے عمر بھر نہ چھوڑا۔

میں نے بستر علالت پر جناب محمود مجیب اصغر صاحب کا مضمون 27/ اکتوبر کے الفضل میں پڑھا۔

''محبت سب کے لئے نفرت کسی سے نہیں''

تو اس سے میری دیرینہ یادوں اور بوڑھی سوچوں اور میرے مجروح سینے میں دبے ممنونیت اور عقیدت کے جذبات کو مہمیز ملی میں تڑپ اٹھا۔ کبھی دارالامان اور اس میں بسنے والے فرشتوں کو چشم تصور سے دیکھا تو کبھی اپنے اساتذہ جنہوں نے پدرانہ محبت اور شفقت کے ساتھ ہماری تعلیم وتربیت کی۔ کبھی ان کے علم وفضل کی یاد آتی ہے تو کبھی کبھی ان کا ہمارے فائدے کے لئے Serious ہو جانا بھی یاد ہے۔ ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ ہمارے واجب الاحترام بے بدل عالم جناب چوہدری محمد علی صاحب ہوا کرتے تھے۔ ان کی خوشنودی کا حصول تو ہمارا نصب العین تھا۔ اس لئے کہ ان کی ناراضگی کا اظہار ہوتا ہی اس وقت تھا جب ہم میں سے کسی سے ایسی حرکت سرزد ہوتی جو اس مقدس ادارے کے بلند و بالا معیار کے خلاف ہوتی۔ حضرت سیّدنا فاتح الدین ہمارے عالی نسب استاد ہمارے مربی ہمارے آقا نے کس طرح اس گلشن احمد کے پودوں کی آبیاری کی کہ معنوی اعتبار سے سوکھے سڑے پودے بھی ہرے ہو گئے۔ چہرہ ہمیشہ متبسم رہتا دل میں محبت ورأفت کا ایک سمندر موجزن رہتا تھا۔ ناراضگی کے اظہار کے لئے چہرہ پر سنجیدگی لانے کے لئے انہیں بہت تکلف کرنا پڑتا تھا مگر اظہار خفگی میں بھی الفت اور شفقت کا عنصر غالب ہوتا تھا۔ ؎

تیرا انداز تبسم ، تیرا عنوان بہار
جب کوئی پھول کھلا میں نے تجھے یاد کیا

خواجہ حسن نظامی نے ایک بزرگ کے بارہ میں لکھا تھا:

''سچے خدا کا سچا ولی۔ توحید کا سمندر۔ حقانیت کا طوطیٔ ہزار داستان پانچ دریاؤں کے ملک میں حواس خمسہ کو شیریں گفتار سے درس وحدت دینے والا غیر اللہ کی پرستش سے انکار کیا۔ مراسم جہالت کو توڑ ڈالا۔ کائنات کے ہر ذرے کو نظر توحید سے دیکھا۔ ایسی نظریں ادب کے لائق ہیں۔ پیار کے لائق ہیں۔ انسان اپنی سب قابلیتیں ان پر نثار کر دے۔''

(بحوالہ ہفتہ وار رسالہ ''لاہور'' 9/ مارچ 1991ء)

جب میں نے یہ اقتباس پڑھا تو میں نے بے ساختہ کہا کہ یہ تو میرے محبوب ناصر الدین کا سراپا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ والوں

کے اخلاق واعمال میں یک رنگی اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

ہم 1947ء تک اسی بستی میں رہے وہ بستی جو آج بھی میری خوابوں میں بستی ہے میرا وہ شہر تمنا جس کی گلیاں کوچے جس کی عبادت گاہیں جس میں بسنے والے لوگ کہیں قرنوں سے اُٹھ کر آئے تھے۔ میں کس کس کا نام لوں ایک سے ایک بڑھ کر اور اس زمانے میں ان کی تعداد ابھی بہت تھی۔ اب ان چہروں کو ترستے ہیں۔ ؎

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر

پھر یکا یک ملکی انقلاب کے نتیجے میں ہم اس جنت نشان مقام سے نکلنے پر مجبور ہو گئے عالی شان کالج کی عمارت اور لیبارٹریاں چھوڑ کر لاہور میں برلبِ سڑک جو ایک حویلی نما مکان میں وارد ہوئے وہی کالج اور وہی ہوسٹل جس میں کچھ چٹائیاں تھیں اور کچھ چار پائیاں۔ آج بھی وہ منظر آنکھوں کے آگے ہے کہ اساتذہ کسی چار پائی پر اور تلامذہ چٹائیوں پر بیٹھے لیکچر سن رہے ہیں۔

ہمارے قلب وروح تو مقدس بستی میں تھے جسم لاہور میں مگر کیا مجال جو مال ومنال کے چھن جانے یا اسباب اور سہولتوں کے میسر نہ آنے کا کوئی ملال۔ ہمارے درمیان مامور زمانہ کا لختِ جگر کوکب درّی کی مانند ضوفشانی کر رہا تھا۔ جہاں شمع ہو گی پروانے تو وہاں ہی حاضر ہو جائیں گے۔ انہیں کیا غرض کہ شمع کسی خستہ مکان میں پڑی ہے یا عالی شان عمارت میں کیونکہ عشاق تو نورانی الاٹ پر گرتے ہیں۔ اینٹ گارے پر نہیں ؎

ہوتی نہ اگر روشن یاں شمع رخ انور
کیوں جمع یہاں ہوتے سب دنیا کے پروانے

لاہور میں بڑی پُر لطف محفلیں برپا ہوئیں سیّدنا حافظ صاحب سے ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا۔ اس میں بھی آسمانی اخلاق کے مظاہر دیکھے۔ مگر اب انہیں چھوڑ کر ربوہ میں آتے ہیں۔ وہ جس کے بارہ میں اس کے بزرگ باپ اور مقدس دادا نے اس کی پیدائش سے بھی قبل خوش خبریاں سنائی تھیں۔ 1965ء میں وہ ہمارا امام ومطاع بن گیا۔ گو وہ پہلے بھی ہمارے دلوں پر حاکم ہی تھا مگر اب کے اس کی شان روحانی اور دلربائی کئی گنا بڑھ گئی اور ہم تو پہلے ہی غلام در تھے مگر اب غلامی کی کیفیت یکسر بدل گئی تھی۔

چپکے چپکے شباب ان پہ آ ہی گیا
رفتہ رفتہ زمین آسمان ہو گئی
اُس طرف حسن میں اک اضافہ ہوا

اِس طرف اک تمنا جواں ہو گئی

محترم محمود مجیب اصغر نے حضرت صاحب کے ایک لازوال ماٹو کا ذکر کیا ہے۔ احباب کو یاد ہوگا خصوصاً شعرائے کرام کو کہ آپ نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے دو مصرعے عطا کئے تھے یا آپ کو عطا ہوئے تھے۔ ایک یہ تھا۔

جان و مال و آبرو حاضر ہیں تیری راہ میں

اور دوسرا مصرعہ اس طرح تھا۔

تیرے حسن کے جلوے بے پایاں اک حسن کا جلوہ روز دکھا

شعرائے احمدیت نے اس پر طبع آزمائی کی جواز دیا دِعلم وایمان کا موجب ہوئی مگر میں اس جگہ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان دونوں مصرعوں میں حضرت صاحب کا اپنا چہرہ زیبا منعکس ہوتا نظر آ رہا ہے۔

ہم جو شعر گوئی کے وصف سے یکسر محروم ہیں اس دور میں ہماری بے بسی اور محرومی ایک چوٹ بن کر سینے میں لگتی تھی اور ہم سورۃ الشعرا کی آخری آیت میں مستثنیٰ شاعروں کی شان پر رشک کرنے لگے۔

پھر آپ نے مرکز میں بھی اور بیرون جات میں بھی موضوع خود عطا فرما کر علما کرام کو علمی اور روحانی تقاریر کرنے کی تلقین فرمائی پہلے مرکز سلسلہ میں آپ کی موجودگی میں تقریر ہوتی تھی اور ایک دن مقرر ہوتا تھا۔ جب باہر کی جماعتیں تقریر کرواتی تھیں۔

ایک دفعہ سرگودھا میں مجھے حضرت امیر صاحب نے تقریر کرنے کا ارشاد فرمایا۔ موضوع تو یاد نہیں مگر میں نے سمجھا کہ میں سیر حاصل مضمون بیان نہیں کر سکتا۔ چنانچہ یہ ترکیب ٹھہری کہ بیت المبارک ربوہ میں تقریر سن کر نقل اتاری جائے۔ وہاں حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب نے خطاب فرمایا۔ سیّدنا حضرت امام وقت خود تشریف فرما تھے۔ نقل را ہم عقل باید میں نے اس تقریر کے بعد حضرت مولوی صاحب سے اپنی مشکل کا ذکر کیا تو آپ نے کمال خوش دلی سے اپنے نوٹس مجھے عطا فرما دیئے۔ یوں حضرت مولوی صاحب کے ساتھ دیرینہ تعارف تھا۔ ان کی داد و دہش کے قابل رشک واقعات سنے ہوئے تھے مگر اس روز ہم سمجھے کہ ''ابو العطا'' نری کنیت ہی نہیں ہے بلکہ یہ الفاظ تو موصوف کے اخلاق حسنہ کے معنوی لحاظ سے بھی آئینہ دار ہیں۔

چند روز بعد انہی نوٹس کی مدد سے ہم نے سرگودھا میں تقریر کر ڈالی اور شروع ہی میں میں نے حضرت مولوی صاحب کی تقریر سے خوشہ چینی کا ذکر بھی کیا۔ پھر بھی سامعین کو ہمارے بارے میں خاصی غلطی فہمی ہوئی کہ گویا ہم بھی ''عالم'' بن گئے ہیں مگر شکر ہے ہمیں اب تک اپنی اوقات نہیں بھولی۔

سیّدنا حضرت حافظ صاحب کی زندگی میں ٹھہراؤ سنجیدگی اور زندہ دلی کا حسین امتزاج تھا۔ آپ کے ساتھ گزرے ہوئے دن میری

زندگی کی متاع عزیز ہیں جنہیں میں نے اپنے دل کے نہاں خانوں اور ذہن کے لاکر میں بیش قیمت خزانوں کی طرح محفوظ رکھا ہوا ہے۔ مجھے استاذی المحترم جناب مضطر صاحب کا ارشاد یاد رہتا ہے کہ حضرت ممدوح کے بارہ میں لکھتے رہا کرو۔ جب کبھی افسردگی اور اداسی کے لمحے مجھے زیادہ ہی ستانے لگتے ہیں تو اس خزانے کا سرمایہ میرے کام آتا ہے۔ میری یادوں کے موتی بہت ہیں ان کو پرونے کا کام ہی کرنا پڑتا ہے۔ وہ بھی کافی مشکل ہے۔

جیسا کہ برادرم مجیب اصغر صاحب نے اپنے مضمون میں محترم عبیداللہ علیم صاحب مرحوم کا شعر تحریر فرمایا ہے وہی صادق آتا ہے کہ ؎

لکھو تمام عمر مگر پھر بھی اے علیم
اس کو دکھا نہ پاؤ وہ ایسا حبیب تھا

اس محبتوں کے اتھاہ سمندر سے ایک چلو ہی بھر سکا ہوں۔ اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے تو ارادہ ہے کہ اپنے محبوب امام کا ذرا کھل کر ذکر کروں ظاہر ہے کہ ایسا ذکر جو 40 سالہ عرصہ حیات پر پھیلا ہوا ہے وہ کسی ایک مضمون یا مقالے میں تو نہیں سما سکتا نہ ہی کسی جماعتی آرگن میں اتنی گنجائش نکل سکے گی کیونکہ جو واقعات میرے ذہن میں اپنے ممدوح کے متعلق مستحضر ہیں وہ بھی ایک کتابچے کے متقاضی ضرور ہیں۔ لوگ چہروں کی سرجری کرواتے ہیں حال ہی میں ہم نے بھی دل پارہ پارہ کی رفوگری کروائی ہے کہ کچھ دن اور ساتھ دے تو میری مجوزہ کاوش شاید میرے لئے توشہ آخرت بن جائے۔ ؎

میں اس آندھی کو اب کیونکر چھپاؤں
یہی بہتر کہ خاک اپنی اڑاؤں

(روزنامہ الفضل 30 دسمبر 1999ء)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁



محترم صاحبزادہ مرزا منیر احمد صاحب کی یاد میں

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول کتنا سچا بلکہ کتنی صداقتوں کا جامع ہے کہ ''ولادت موت کی قاصد ہوتی ہے''۔ بیکن نے سیّدنا حضرت علیؓ کی ہی خوشہ چینی کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''اس کا پیدا ہونا موت کا سبب تھا بیماری تو بہانہ بنی''۔

موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ ہر ذی حیات کے لئے لازم ہے۔ مگر اس حقیقت کو سمجھ لینے اور جان لینے کے باوجود بعض جانے والوں کا

دکھ ایسا گہرا زخم لگا جاتا ہے جس پر مشکل ہی سے کبھی کھرنڈ بنتا ہے اور بقول شاعر زخم کے بھرنے تک ناخن بھی تو بڑھ آتے ہیں۔

کچھ عرصہ سے صاحبزادہ مرزا منیر احمد صاحب پسر حضرت ''قمرؔ'' روحانی صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب بیمار چلے آ رہے تھے اور عمر کے آخری حصے میں ربوہ میں ہی سکونت اختیار کر لی تھی۔ امسال گرمیوں کے موسم میں برادرم قریشی محمود الحسن صاحب اور میں انہیں ملنے کے لئے ربوہ گئے تو گو وہ سہارے سے ڈرائنگ روم میں خود چل کر تشریف لائے مگر ہم نے محسوس کیا کہ انہیں بیماری نے اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے۔ مگر پھر بھی

اس کی رعنائی مرے قلب حزیں سے پوچھئے

وہ بہت دلیر نڈر بلند ہمت والے اور مضبوط قوت ارادی کے مالک تھے اور وہ اللہ تعالیٰ کے خاص فضلوں کے سہارے ہی زندگی کے دن گزار رہے تھے۔

باوجود شدید علالت کے ہم نے اس روز محسوس کیا کہ ان کے محبت کے دریا میں لہریں اُٹھ اُٹھ کر کناروں سے چھلک رہی ہیں۔ مگر ہم جو برسوں سے بے تکلف محبت اور شفقت کے نظارے دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے اس مختصر اور وہ بھی آزردہ خاطر کرنے والی ملاقات سے دل گرفتہ ہو کر اُٹھ آئے۔ ربوہ میں آپ کی تشریف آوری کا علم ہوتا تو ربوہ پہنچ جاتے اور جہلم میں ہوتے اور آتش فراق کی لو تیز ہو جاتی تو دل کی لگی بجھانے کے لئے جہلم بھی کئی بار چلے گئے۔

محترم صاحبزادہ صاحب میں ایک کمیاب خوبی تھی کہ اپنے خاندانی اور ذاتی بلند و بالا مقام و منصب سے نیچے اُتر کر ہماری سطح پر آ کر ہم سے پیار کرتے اور یہ نزول ان کی طبیعت کے عین مطابق ہوتا تھا۔ ہم راز و نیاز کی ان محفلوں کو اپنا اعزاز یقین کرتے تھے اور جانتے تھے کہ یہ شخص کس باپ کا بیٹا ہے اور کس دادے کا پوتا ہے۔ ہر بار ان کی گفتگو ہماری دنیاوی اور روحانی امراض کا شافی علاج بن جاتی تھی۔ ان کی کس کس خوبی اور احسان کا ذکر کیا جائے اور کس کو چھوڑا جائے۔ ان کی رگوں میں وہ پاک خون گردش کر رہا تھا جو انہیں وراثت میں اس عالی مقام دادا سے عطا ہوا تھا اور ہم وہ جن کی دین و دنیا میں کوئی بھی حقیقت نہیں تھی۔ بقول شاعر

ہاتھوں پہ بہہ رہی ہے لکیروں کی آب جو
قسمت کا کھیت پھر بھی ہے بنجر پڑا ہوا

میں صاحبزادہ صاحب مرحوم کا یہ وصف بیان کرنا چاہتا ہوں کہ آپ خطوط کا جواب دینے میں بڑی پابندی اور مستعدی کا اظہار فرماتے تھے۔ جب نظر کی خرابی یا دیگر علالتوں کے باعث لکھنے کے قابل ہی نہ رہے تو خط املا کروا دیتے اور نیچے اپنے دستخط ثبت کرتے مگر پھر ایسی صحت بگڑ گئی کہ دستخط بھی نہ کر سکتے تھے۔ نیچے نوٹ تحریر ہوتا کہ محترم میاں صاحب نے یہ خط لکھوایا ہے لیکن جواب ضرور آتا۔ جن

میں اظہار محبت ہوتا۔ دُعائیں بھی ہوتیں۔ ملاقات کی خواہش بھی۔ یہ بظاہر چھوٹی سی بات ہے مگر یہ بنیادی دینی خلق ہے۔ موصوف اس کا اہتمام فرماتے تھے۔

میں نے 1944ء میں انہیں قادیان میں دیکھا تھا۔ پاکستان میں آ کر بلکہ ٹرانسپورٹ کے کاروبار میں جب داخل ہوئے تو سرگودھا میں قریبی تعارف پیدا ہوا۔ میں نے ان میں عالی خاندان کے اوصاف کریمانہ بہت کثرت سے مشاہدہ کئے اور یہ سب اس لئے تھا کہ ''دبستان احمد'' کے فارغ التحصیل تھے اور اس درس گاہ میں اعلیٰ اخلاق کریمانہ کا درس ملتا تھا۔ پھر اس باپ کی تربیت جو ایمان وایقان اخلاق فاضلہ اور علم وآگہی کا بہت بلند مینار تھا اسے خود عرش کے رب نے ''قمر'' کا لقب عطا فرمایا تھا۔ میں اس ''موعود قمر'' کی میٹھی ٹھنڈی چاندنی کے نور کی تفاصیل کا ذکر یہاں بیان نہیں کر سکتا۔ صرف اس نورانی وجود کی ایک شعاع نور کا تذکرہ کر کے آگے گزر جاؤں گا۔

تقسیم ملک کے بعد محترم صاحبزادہ مرزا منیر احمد صاحب کو دہلی کی دکان کے بدلے ایک دکان مال روڈ پر الاٹ ہوئی جو M.C.A ہال کے ملحق چوک میں واقع تھی۔ اس میں قیمتی پارچات کا کاروبار میاں صاحب نے شروع کیا۔ دکان کا نام ARSUCO تھا اور غالباً یہی نام دہلی میں متروکہ دکان کا ہوگا۔ جب حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد نے میاں منیر احمد صاحب کو بلا کر فرمایا۔ میاں رزق حلال کمانے کے لئے جو کاروبار تم کرنا چاہو بیشک کرو۔ مگر خیال رہے کہ میں حضرت مسیح موعود کے کسی فرزند کو کاؤنٹر پر بیٹھ کر فروخت کردہ مال کی قیمت وصول کرنے کے لئے بھی ہاتھ بڑھاتے دیکھنا پسند نہیں کرتا۔

قارئین کرام غور فرماویں کہ قیمت وصول کرنے کے لئے ہاتھ بڑھانا وہ عرف عام میں ہاتھ پھیلانے والی بات ہرگز نہیں۔ مگر اس قمر روحانی کو اپنا حق لینے کے لئے بھی ہاتھ بڑھانا پسند نہیں تھا۔ پھر ایک انفرادی شکل اس مقدس (مثال) خانوادے کے ایک فرد کی ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بہت عرصہ قبل کا ایک واقعہ محترم مرزا مبارک احمد صاحب نے اپنے ابا جان سیّدنا حضرت مصلح موعود کی سیرت کے اندرون خانہ حالات تحریر فرماتے ہوئے اپنی ایک تصنیف ''یادوں کے دریچے'' میں بیان کیا جو میں صاحبزادہ صاحب موصوف کے الفاظ میں ہی پیش کرتا ہوں۔

''آپ کے ناک کی حس بہت تیز تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بھینس یا گائے کے دودھ کا ایک گھونٹ لے کر بتا دیتے تھے کہ جانور نے کون سا چارہ کھایا ہے۔ کسی قسم کی بدبو کی برداشت نہیں تھی۔ غالباً اسی لئے آپ عطر کا استعمال عموماً کرتے اور اسی وجہ سے خود عطر بنانے کا شوق بھی فرماتے۔ جب کوئی نیا عطر بنتا تو اپنی بیویوں یا بچیوں کو بھی سنگھاتے اور پوچھتے کہ یہ عطر کیسا ہے۔ ایک دفعہ کوئی نیا عطر بنایا تو آپ نے ہماری بڑی بہن ناصرہ بیگم کو بلا کر کہا کہ ہاتھ آگے کرو۔ میں یہ عطر تمہیں لگاتا ہوں پھر بتانا کہ یہ کیسا ہے۔ ہماری ہمشیرہ نے اپنی ہتھیلی آگے کی تو فرمایا کہ اس طرح نہیں۔ اپنا ہاتھ اُلٹا کر کے میرے سامنے کرو۔ پھر عطر لگایا اور فرمایا کہ سیدھا ہاتھ آگے کرنے سے مانگنے کی عادت پڑ سکتی ہے۔ جو میں اپنی اولاد میں برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک چھوٹی سی بات میں کتنا بڑا

سبق دے گئے۔‘‘

حسیں کہنے کو گو سارا جہاں ہے
مگر تجھ سا حسیں کوئی کہاں ہے

میں نے اس واقعہ کو اپنی کئی نجی محفلوں میں بیان کیا ہے اچھے پڑھے لکھے اور فہمیدہ لوگوں نے ہمیشہ اس باریک بینی اور گہری نگاہ سے تعلیم اخلاق فاضلہ پر حیرت اور تحسین آفرین کا برملا اظہار کیا۔

او پر جو دو واقعات میں نے بھائیوں کی اس مقدس ’’جوڑی‘‘ کے تحریر کئے ہیں۔ اس سے دست دراز کرنے کے خلاف اور شان بے نیازی اور استغنا اور قناعت پسندی اور ہر حال میں رزاق ذوالقوۃ المتین آسمانی آقا کی رزاقی پر توکل کرنے کا جو دلکش اور دلفریب سبق بلکہ عملی نمونے ملتے ہیں۔ ان پر کسی تبصرے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

غالباً یہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب کی نصیحت ہی اپنا کام کر گئی اور میاں منیر احمد صاحب نے اس دکانداری سے اپنا دامن چھڑا لیا۔ پھر ان دنوں ٹرانسپورٹ کا کاروبار بڑی شہرت رکھتا تھا۔ آپ نے طارق ٹرانسپورٹ کمپنی کے نام سے اس شعبے میں بھی تھوڑے عرصے میں بڑا نام پیدا کیا۔

مگر پھر شاید اس کاروبار کے ایسے نقائص سامنے آئے جو آپ کے خاندانی وقار اور عظمت کے منافی تھے۔ اسے چھوڑ چھاڑ کر ’’پاکستان چپ بورڈ‘‘ کے نام سے جہلم میں ایک فیکٹری قائم کی اور پھر اس نے جو ترقیات کی منازل طے کیں وہ اس کی عالی ہمت اور اولوالعزم برلاس جوان کی زیرکی دانشمندی اور بارگاہ الٰہی میں قبولیت کی واضح علامت ہیں۔

اور اس ادارے کے ساتھ سینکڑوں آدمیوں کا روزگار وابستہ ہے۔ جنہیں عزت اور وقار کے ساتھ معقول آمدنی ہو رہی ہے۔ اس طرح محترم میاں صاحب کی یہ کاوش انشاءاللہ ایک صدقہ جاریہ بن کر ان کی بلندی درجات کا موجب بنتی رہے گی۔ ہم نے میاں صاحب موصوف کو بہت قریب سے دیکھا۔ ان میں فیاضی دوستداری اور وفا شعاری اور ایمانی غیرت کے جذبات فراواں تھے۔ شجاعت اور ایمان لازم ملزوم ہیں۔ کوئی اللہ کا بندہ ہم نے بزدل نہیں دیکھا۔

بڑے بڑے فتنوں نے سر اُٹھایا۔ میاں صاحب جہلم شہر سے بہت دور جنگل میں ڈیرہ ڈالے بیٹھے تھے۔ مخالفتوں کی آندھیاں آئیں مگر کیا مجال جو اس شیر دل شہزادے کے پائے استقامت میں ذرہ بھر لغزش آئی۔ وہ جہلم کے اونچے ٹیلے پر ایک چٹان کی صورت قائم رہا۔ حاسدوں اور بدخواہوں کو نامرادی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔

وہ ایک عظیم شخص تھا۔ اسے شہرت یا نام و نمود سے نفرت تھی۔ اپنے عظیم مقاصد کے حصول کے لئے بہادری اور خاموشی کے ساتھ نتیجہ خیز

جدوجہد جاری رکھی۔اس فکری سقوط اور ذہنی جمود کے دور میں اس کا دم غنیمت تھا۔وہ ایک غریب پرور باوفا دوست اور دینی غیرت رکھنے والا اور نہایت پیاری عادات اور خصائل کا مالک صاحبزادہ تھا۔

ملک مصر کے شاعر شوقی نے سچ ہی تو کہا تھا

الناس صنعان موتٰی فی حیاتھم

و اخرون ببطن الارض احیاء

یعنی کچھ لوگ زندگی میں بھی مردوں کی طرح بیکار ہی ہوتے ہیں اور دوسرے زمین میں دفن ہو جاتے ہیں پھر بھی زندہ رہتے ہیں اور حضرت سلطان باھو کا پنجابی کا قول بھی اسی مضمون کا ہے۔

''قومے قربان اونھاں توں قبر جنھاں دی جیوے''

آخری ہفتہ عشرہ تو قومے میں رہے۔میں ہر شام صاحبزادہ مرزا انس صاحب کی کوٹھی پر فون کر کے حالت کا پتہ کرتا رہا۔آخر یکم دسمبر 1999ء کو دوپہر کے وقت مجھے وہ خبر سنائی گئی جو کئی دنوں سے حقیقت بن کر مجھے ڈرا رہی تھی۔پھر بھی میں اسے سننے کو تیار نہ تھا بے اختیار آنسو ٹپ ٹپ گرے۔پھر شام کو ربوہ پہنچا میت کی زیارت کی۔جنازہ میں شرکت کی۔پھر دوبارہ الوداع کہنے کے لئے میت کے پاس گیا چہرے پر نور کی پھوار دیکھی تو اپنی حالت غیر ہو گئی۔

طویل بیماری اور پھر کئی دن تک قومے کی حالت پر غور کیا تو مجھے میاں صاحب کے والد بزرگوار ہاں وہی جن کی پیدائش سے پہلے ان کے مقدس باپ کو ان کے بارہ میں بشارت عطا ہوئی تھی۔ہاں وہی حضرت اماں جان کا ''بشریٰ'' ہاں وہی جو سلطان القلم کا وارث بنا۔ جس کے قلم سے موتی جھڑتے تھے۔وہ قلم جو حکیم وعلیم رب کے اشاروں پر چلتا تھا۔اس کی ایک دعا سامنے آئی جو یوں ہے۔

''اے اللہ تیرے وہ سارے بندے جو احمدیت کی پاک لڑی میں محبت اور اخلاص کے ساتھ پروئے ہوئے ہیں ......تو اس وقت تک ان سے موت روکے رکھ جب تک کہ تیری قدرت کا طلسمی ہاتھ ان کو گناہوں سے پاک وصاف کر کے تیرے قدموں میں حاضر ہونے کے قابل بنا دے۔تا کہ ان کی موت عروسی جشن والی موت ہو...... تیری اس عظیم الشان رحمت کی قسم ہے جو تیرے پاک مسیح کی بعثت کی محرک ہوئی کہ تو ایسا ہی کر۔''

ایسے نادر وجود کے چلے جانے سے دل کی افسردگی اور پژمردگی ناقابل فہم نہیں پھر بھی اسے سمجھایا کہ بڑا چاہنے والا موجود ہے جو کچھ ہوتا ہے اسی کے چاہنے سے ہوتا ہے اپنی غلامانہ حیثیت کا تعین کر لیں اور اس کے مالکانہ اور قادرانہ مقام کا صحیح ادراک ہو جائے تو رنج والم کیسا اور اس پر اتنا دکھ کیوں کہ جو ہم نے چاہا تھا وہ نہیں ہوا۔جسمانی موت سے نہ خدا کا پیغامبر محفوظ ہے نہ وقت کا سکندر، نہ ظل سبحانی بچا،

نہ کوئی تاجدار ہر ایک نے یہ جام پینا ہے۔اس پر اللہ کا شکر بجالائیں کہ ہمارے پیارے میاں صاحب کا انجام بخیر ہوا۔اللہ کریم ورحیم ان کو اپنے آباء کا قرب عطا فرمائے۔

میں غم زدہ بھی تھا، تھک بھی چکا تھا۔سر شام واپس سرگودھا کا سفر شروع ہوا۔اتنا سمجھانے بجھانے کے باوجود وحشت نے میرا پیچھا نہ چھوڑا اور تابش دھلوی سے ہم زبان ہوکر اپنی حالت کا یوں اظہار کیا:۔

کوئی تمنا پاس نہیں ہے کوئی تصور ساتھ نہیں ہے
کیسے کٹے گی یہ شب ہجراں آج اکیلے شام سے ہیں

(روزنامہ الفضل 13/مارچ 2000ء)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁



ثاقب زیروی کے ساتھ ایک دن

3/جون 2000ء کے ''لاہور'' میں بہاولنگر کے رانا محمد خاں صاحب کا مضمون بعنوان ''ثاقب زیروی کے ساتھ ایک اور شام'' پڑھا اور دل سے دعا نکلی ؎

تجھ کو اس لطف کی اللہ جزا دے ساقی

اس مضمون سے مجھے حوصلہ ہوا کہ زندہ وسلامت شخص کے بارے میں بھی لکھا جاسکتا ہے۔محترم رانا صاحب نے اپنے مضمون کی ابتداء 1939ء سے کی ہے۔مجھے تو اُن سے 1944ء میں حضرت حافظ مرزا ناصر الدین کے ذریعہ تعارف حاصل ہوا۔جب کالج کے سامنے کھلے میدان میں گھاس پر بیٹھ کر ثاقب صاحب کا کلام جوانی کی گھن گرج کے ساتھ اُن کے مخصوص انداز میں کئی بار سنا ؎

فردوس کو تیری بہاروں میں بسایا جائے گا
چنگاریوں کو دے کے لو شعلے بنایا جائے گا
اقصائے عالم میں ترا ہی گیت گایا جائے گا
وہ دن نہیں ہیں دور کچھ از فضل رب دو جہاں
اے قادیاں دارالاماں اُونچا رہے تیرا نشاں

حضرت حافظ صاحب کے ارشاد پر اُن کا یہ اشعار کئی دفعہ پڑھنا اب تک یاد ہے جب سامعین میں سے ہر ایک پر ایک ایسا کیف

طاری ہوجایا کرتا تھا گویا وہ دور بہت دور سماوی فضاؤں میں اُڑ رہے ہوں...... اللہ نے عمدہ نغمگی کے ساتھ جو گھن گرج عطا فرمائی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شیر دھاڑ رہا ہو۔ اس میں مردانگی بھی ہے رعب بھی ہے اور اس کے ساتھ شیرینی اور جذب و کشش بھی۔

تعارف نہ تھا

اُن کے اپنے مضمون کے مطابق جب 1939ء میں انہوں نے بیت اقصیٰ میں ''ساقی نامہ'' پڑھا جس کا مطلع تھا ؂

ساغر بادہ عرفان پلا دے ساقی
میری سوئی ہوئی تقدیر جگادے ساقی

اُس وقت اُن کا حضرت فاتح الدین سے تعارف نہ تھا۔ بس اس نظم کا پڑھنا تھا کہ اس مردم شناس حرف آشنا (ہاں وہی جو ہمت کا پہاڑ حوصلے کا دریا اور محبت کا سمندر تھا) کے قلب مطہر میں اس خوش بخت کو گوشہ نصیب ہوگیا اور پھر اس عالی نسب اور بلند مقام شخص نے محبت اور الفت کی وہ گھٹائیں برسائیں جسے ثاقب ہی بیان کریں تو کریں...... غرض ادھر اس گوہر نایاب کا اس گوہر شناس سے ایسا ملاپ ہوا کہ بڑھتا ہی چلا گیا حتیٰ کہ جب 1965ء میں حضرت صاحبزادہ صاحب منصب خلافت پر فائز ہوئے تو ادھر محبوبیت میں اضافہ ہوا ادھر یہ محب (بڑھ کر) عاشق صادق بن گیا ؂

چپکے چپکے شباب اُن پہ آ ہی گیا
رفتہ رفتہ زمیں آسماں ہو گئی
اُس طرف حسن میں اک اضافہ ہوا
اس طرف اک تمنا جواں ہو گئی

مصائب کا ذکر

رانا صاحب محترم نے اس مرد قلندر کو 1974ء میں جن مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہ ایک طویل داستان ہے جو دردناک سے بڑھ کر خونچکاں ہوگئی۔ مجھے تو صرف ''سرگودھے'' سے متعلقہ اُن کا ایک واقعہ یاد ہے جس میں مجھے براہ راست دلچسپی لینے اور پھر قادر کریم کی قدرت نمائی کا مشاہدہ کرنا نصیب ہوا...... موصوف ان دنوں لاہور میں ''روزنامچہ'' لکھا کرتے تھے جس میں تاریخوار اور شہروار اُن مظالم کا مختصراً تفصیل ہوتی تھی جن کے اُن دنوں احمدی نشانہ بنائے جاتے تھے کہ سرگودھا کے ایک شخص آتش زیر پا ہوگئے اور انہوں نے ایڈیٹر ''لاہور'' اور اس کے طابع م۔ش صاحب کے خلاف استغاثہ دائر کردیا اور نہ یہاں نہ لاہور میں کسی کو کانوں کان خبر ہونے دی اور سمنوں پر غیر حاضریاں ڈلوا کر دونوں کے ''وارنٹ بلاضمانت'' جاری کروالئے۔ جب علم ہوا تو ہم نے

ضمانت کروانے کی کوشش کی مگر مجسٹریٹ صاحب نے انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ مجھے اپنے آپ کو''کافر'' کہلانے کا شوق بھی نہیں اور نہ ہمت ہے۔

اُدھر دونوں ملزم شام کو ربوہ پہنچے اور حضرت مرزا ناصر احمد صاحب سے اس پریشان کُن صورت حالات کا ذکر کیا۔حکم ہوا صبح سرگودھا جانے سے پہلے مجھے مل کر جانا۔حاضری ہوئی تو فرمایا......''بے خطر اور بے فکر ہو جائیں کچھ نہ ہوگا''......ادھر ہم ضمانتوں کی درخواستیں تیار کر کے پٹواری سے تمام فردات لے کر (اور اپنی نمبرداری کی سند بھی لے کر) تیار۔تا کہ کوئی اعتراض باقی نہ رہے اور کوئی اڑچن حائل نہ ہونے پائے۔یہ دونوں بزرگ جب لاہور سے روانہ ہوئے ہوں گے تو لازماً پریشان تو ہوں گے کیونکہ جس طریق سے''وارنٹ گرفتاری بلا ضمانت'' جاری کروائے گئے اُس سے مخالفین کے ارادے تو ظاہر تھے......مگر رب الاسباب نے کچھ اور ہی سامان کر رکھے تھے۔ جونہی دوسری پیشی پر یہ بزرگ کچہری میں پہنچے۔ہمارے واجب الاحترم بار ایسوسی ایشن کے صدر ملک محمد اقبال نے دریافت کیا۔معاملہ کیا ہے؟ ملزموں نے انہیں تفصیل سنائی۔ادھر سے مستغیث بار رُوم میں اپنے وکلاء سمیت پہنچ گئے۔ملک محمد اقبال جو پرانے مسلم لیگی تھے ایک قابل تریں وکیل جو ہر جگہ اور ہر طبقہ میں قدر و منزلت سے دیکھے جاتے تھے) نے مستغیث سے کہا......''یہ کیا جانیں آپ کو تو ہم جانتے ہیں مجھے تو اب معلوم ہوا ہے اور میں حیران ہوں کہ''تحریک پاکستان'' کے ان جید کارکنوں کے خلاف استغاثہ دائر ہونے کی لعنت سرگودھے کے حصے ہی میں آئی تھی۔م ش صاحب دو دفعہ پاکستان کے لئے قید ہوئے ہیں اور ثاقب صاحب کی نظمیں''نوائے وقت'' میں پڑھ کر میں''مسلم لیگ'' میں شامل ہوا تھا اور اب تک مسلم لیگی ہوں۔چلو چل کر استغاثہ واپس لو اور مستغیث جو ملک صاحب کے احترام اور مقبولیت کو جانتا تھا کچھ نہ کہہ سکا اور اس نے عدالت میں پیش ہو کر بیان دے دیا۔استغاثہ خارج ہو گیا اور کوئی دس منٹ میں ہم آسمانی نوید کے گواہ بن گئے۔

عنوان میں دن

میں نے عنوان میں جس''دن'' کو موضوع گفتگو بنایا ہے وہ ابھی طلوع نہیں ہوا لیکن جناب ثاقب کے ساتھ''شاموں'' کا ذکر پڑھنے کے بعد یہ احساس قوی ہو جاتا ہے کہ وہ دن بھی ضرور طلوع ہوگا جس دن کے لئے میں نے اپنے گاؤں''ہلال پور نوناں'' میں ایک رہائشی مکان، ایک مہمان خانہ، ایک بارہ دری اور ایک سجدہ گاہ تعمیر کرا رکھی ہے۔ایک چھوٹی سی''بیت الذکر'' جو اپنے رقبے میں تعمیر کی گئی ہے نہ کسی غیر کے قبضے کا جھگڑا نہ ملکیت کا تنازعہ......مگر حضرت ابراہیم کی اولاد اگر قیامت تک خدا کے گھر تعمیر کرتی رہے گی تو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے اس کی اولاد کے ایک طبقہ کو کدالیں بھی دے رکھی ہیں۔یہ اور بات ہے کہ کدالوں والے تعمیر کرنے والوں کے مقابلے میں ہمیشہ نامراد ہی رہتے ہیں۔

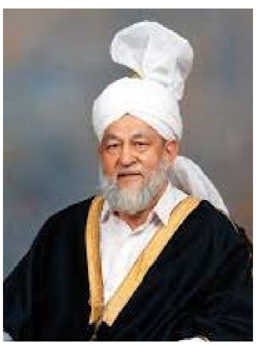
اب جسم آگے نکلتا جارہا ہے اور دل چند قدم پیچھے رہتا ہوا محسوس ہو رہا۔ مگر وہ دن ضرور طلوع ہوگا، وہ دن جو میں حضرت ثاقب کے ساتھ منانا چاہتا ہوں۔ میرزا غالب نے ناکردہ گناہوں کی جزا سزا کا فلسفہ بیان کیا تھا مگر میں تو اپنی اس زیر تکمیل آرزو کا اجر بھی رب کریم سے پانے کی قوی امید رکھتا ہوں کاش میری زندگی میں وہ دن آئے اور میں ثاقب صاحب ہی کے الفاظ میں کہوں۔ ؎

کتنی امیدوں کے صدقے میں بہار آئی ہے

(ہفت روزہ لاہور مورخہ 2 ستمبر 2000ء صفحہ 4)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

ان کی محفل میں تو کچھ اور ہیں آداب سخن
میرا افسانہ فقط دیدہ نم تک پہنچا



جرمنی اور انگلستان کا سفر اور حضور سے ملاقات کی دلگداز یادیں

بیسویں صدی کے آخری جلسہ سالانہ برطانیہ میں شرکت کا احوال

ویزے کے حصول میں یہ اعتراض تھا کہ پہلے ہر سال یورپ جاتے تھے کئی سال کا ناغہ کیوں کیا؟ اب اس اعتراض کی معقولیت پر جرح کرنے کا کسے یارا۔ میزبان اگر مہمان کے اپنے ہاں آنے پر معترض ہو تو مہماں کو بھلا کیا مجال۔ شاید مغرب والوں کو یہ شبہ پڑ گیا تھا کہ یہ ایک شخص ہی ہماری ساری آکسیجن پھانک جائے گا اور ہمارے لئے کچھ نہیں بچے گا مگر اس دفعہ اور کئی وجوہات یورپ کے سفر کی میری تمناؤں کو مہمیز لگا رہی تھیں۔

20 ویں صدی کے شروع میں میرے ابّا نے مشرق کی طرف ایک سفر کیا تھا۔ اس لئے کہ مشرق میں ایک شمع رخ انور روشن ہوئی تھی اور پدرم ''سلطان'' اس پر پروانہ وار قربان ہو گیا تھا۔ اب وہ شمع مغرب میں ضیاء پاشی کر رہی ہے تو مجھے بھی اس صدی کا اختتام اسی جذبے کے ساتھ کرنا چاہئے اور مغرب میں جا کر اس عہد کی تجدید کرنا ضروری ہے جو شروع صدی میں میرے بزرگ باپ نے کیا تھا۔

جب سے طائر نے مجبوراً اپنا نشیمن بدلا تو عارضی طور پر گویا تسبیح کے دانے کچھ بکھر سے گئے مگر شہد کی مکھیوں کی طرح جنہیں شکاری اپنے طمع و حرص کی خاطر اپنے اندوختہ سے محروم کر دیتا ہے اور اپنی کم عقلی سے سمجھتا ہے کہ یہ اب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر بکھر جائیں گی۔

وہ فوراً پھر ایک چھتے پر جمع ہو جاتی ہیں۔ ایک کم نظر کی خواہشات کے برعکس وہ راتوں رات ایک مرکز پر جمع ہو گئیں اور انہوں نے شہد بنانا شروع کر دیا۔

ورنہ اگر وہ یہ شفا بخش غذا تخلیق نہ کرتیں تو یہ دنیا روحانی موت مر جاتی۔ افسوس کہ یہ دنیا والے تاریخ عالم سے بھی کوئی سبق نہیں سیکھتے۔ جولیئس سیزر کو روم سے جلاوطن کر دیا گیا تو اس نے بھی کہا تھا کہ ''جہاں میں رہوں گا وہی روم ہوگا'' یہ تو ایک عزم و ہمت والے دنیا دار کی سوچ تھی مگر جس کی نگاہ ہر حال میں آسمان پر ہو اور وہیں سے اسے راہنمائی بھی حاصل ہوتی ہو اور دستگیری بھی اور نصرت بھی اور حفاظت بھی۔ نہ اس کی ہمسری کوئی کر سکتا ہے نہ اس کے ارادوں اور پروگراموں میں کوئی دنیا والا خواہ وہ کتنا ہی صاحب اقتدار کیوں نہ ہو کوئی روک ڈال سکتا ہے۔

صدی کا یہ آخری جلسہ اور اس میں شمولیت کی ایک طرف دلی آرزو جو تڑپ کی صورت اختیار کر چکی تھی دوسرے طرف کئی موانع۔ سب سے بڑی روک سفر کی اجازت نامہ نہ ملنے کا خوف، تفاصیل کیا عرض کروں اور اس سلسلے میں میری امداد کرنے والوں کے کن کن احسانات کا ذکر کروں مگر ناشکری ہوگی اگر جرمنی سے جناب عرفان خان صاحب اور عزیزم بشارت احمد، رانا محمد یوسف صاحب اور اسلام آباد سے رانا مبشر احمد صاحب کا بھی تذکرہ نہ کروں جنہوں نے میری بے حد مدد کی۔

ابھی برطانیہ کے بین الاقوامی جلسے میں شمولیت کے لئے سفر کرنے کی روکیں بدستور تھیں مگر آتش شوق سے پر پرواز عطا ہوئے۔ اس پر رب کریم کا جتنا شکر بجالاؤں کم ہے۔ ؎

وہ زباں لاؤں کہاں سے جس سے ہو یہ کاروبار

جرمنی میں آمد

ارادہ تھا کہ وسط جولائی کے قریب جرمنی پہنچوں گا۔ آگے محض اللہ کے کرم پر بھروسہ کہ وہ اُٹھا کر ٹلفورڈ برطانیہ پہنچا دے گا کہ عرفان احمد خان کا فیکس پر پیغام پہنچا کہ جولائی کے پہلے ہفتے میں جرمنی پہنچو کیونکہ یہاں جرمنی میں دوسرے ہفتے میں ادبی اور شعری نشست منعقد کرنے کے ارادے ہیں۔ اس بہی خواہ کی خواہش کے احترام میں 30 رجون کو ہی جرمنی وارد ہو گیا۔ میرا اکلوتا بھانجا عزیزم بشارت احمد باہیں کھولے میری انتظار میں تھا۔ اس نے جس قدر محبت اور ایثار اور دل نوازی کا سلوک کیا وہ اسی کا حصہ ہے۔ اللہ اسے اجر دے میں تو بدلہ دینے کی استطاعت نہیں رکھتا۔

وہاں سے کئی ممالک کی سیاحت اسی کی آرام دہ گاڑیوں میں کی۔ نام تو ''بشارت'' تھا ہی میرے اللہ نے اسے میرے لئے مجسم بشارت بنا دیا۔ ریل گاڑی کا سفر فرینکفرٹ سے ہمبرگ کا کیا۔ وہ بھی ریل گاڑی کی سہولتوں سے مستفید ہونے کی غرض سے ورنہ عزیز

بشارت احمد کی کار بھی حاضر اور وہ خود بھی۔ اور ہمبرگ بھی جو کھوکھر غربی کے میرے عزیزوں سے بھرا پڑا ہے۔ وہ بھی فون پر مسلسل اصرار کرتے رہے کہ ہم کار میں لے جاتے ہیں۔ عقل و دانش کا تو یہی تقاضا تھا کہ اطباء اور حکماء کے مشورے کے مطابق کسی ہمراہی کو طویل سفر پر ساتھ رکھنا چاہئے تھا۔ مگر ہم نے خمار بارہ بنکوی کا مشورہ صائب سمجھا جنہوں نے کہا تھا۔ ؎

عقل و دل اپنی اپنی کہیں جب خمار
عقل کی سنیئے دل کا کہا کیجئے

قیام ہمبرگ

ہمبرگ کا سفر ساڑھے تین گھنٹے میں ایسے کٹا جیسے گھر میں صوفے پر بیٹھے ہوں کار میں 7،6 گھنٹے صرف ہوتے۔ کیونکہ 600 کلومیٹر کی مسافت ہے۔ وہاں سیّدنا امام الزمان کے ایک ''غضنفر'' کے صاحبزادے رہتے ہیں۔ ہر چند کہ مجھے حضرت سیّد محمد سرور شاہ صاحبؓ سے ملاقاتوں اور ان کی اقتدا میں طویل رکوع وسجود کی سعادت دارالامان میں نصیب ہو چکی تھی اور ان کے روحانی مقام ارفع اور متقیانہ زندگی کے مشاہدے نے اس قندیل کی نورانی شعاعوں کا اندازہ بھی کرا دیا تھا جس کا وہ بزرگ ایک پروانہ ہی تو تھا۔ یہ ان کا گوشہ نشین بیٹا ہمبرگ میں کنج عزلت میں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا مگر محبت والفت اور ایثار مجسم۔ ہمیں دعاؤں سے نوازا۔ بلکہ اکثر مجھے ان کی دعاؤں سے وافر حصہ ملتا رہتا ہے۔ ہمارے فوٹو لئے، تصویر کشی تو ان کا دل کا بہلاوہ ہے۔ پھر مقدس اور نادر فوٹوز کا ایک البم عطا فرمایا جو ہمارے بزرگ اسلاف کی شیریں یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔

ہمبرگ کی آب و ہوا میں اور اس کی فضاؤں میں پیار و محبت کی تاثیریں ہیں یا ہمارے نصیبے میں وہاں کی مروتیں رکھی تھیں۔ وہاں امام صاحب علاقائی امیر صاحب بلکہ سارے صدور اور سیکرٹریان نے اتنی محبتوں کا اظہار کیا جس کا میں کسی طرح مستحق نہیں تھا۔ یہ بھی اس عاجز پر میرے عزیز و کریم رب کا احسان عظیم ہے۔ ہمبرگ کو کھوکھر غربی گجرات کے دوستوں نے بطور خاص اپنے آشیانوں کے لئے منتخب کیا ہے۔ اللہ نے انہیں اس مغربی گھونسلے میں بھی اور اس کی فضاؤں میں پرواز کے دوران بھی اپنے خالق و مالک کے ساتھ تعلقات کو استوار کرنے اور اپنے مرکز کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ بندھے رہنے کی توفیق بخشی ہے۔ خدا کرے کہ ان کی نگاہ ہمیشہ نشیمن پر رہے۔ ملک بہادر کھوکھر صاحب ہوں یا ملک الف خان، ملک اعجاز احمد ہوں یا ناصر احمد یا سعادت انہوں نے محبتوں اور الفتوں کے بازوؤں میں مجھے ایسے لے لیا جیسے ایک ماں کے بچھڑے ہوئے بیٹے آپس میں سالوں بعد ملے ہوں۔ یہی ہمارے مرشد کی تمنا تھی۔ پانچ دن وہاں بھی گزارے۔ جماعت احمدیہ کی وہاں کی پہلی عبادت گاہ میں نمازیں ادا کیں۔ پھر بیت الرشید اور ''مہدی آباد'' کے نام سے موسوم وسیع وعریض احمدیہ مراکز (جن میں سے موخرالذکر مرکز احمدیت سینتیس ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے) کو دیکھ کر اللہ کی قدرتوں اور غیب سے

ایک صدی قبل جوخوشخبریاں اس نے اپنے چنیدہ محبوب بندے کوعطا کی تھیں ان کی صداقت پرحق الیقین پیدا ہوا۔اللہ جانے کہ اس عالم الغیب نے ماموزمانہ کوکیا کیا نظارے ان کامیابیوں اوروسعتوں کے کرادیئے تھے کہ اس نے ایک صدی قبل ہی فرمادیا تھا۔

تری نعمت کی کچھ قلت نہیں ہے
تہی اس سے کوئی ساعت نہیں ہے
شمار فضل اور رحمت نہیں ہے
مجھے اب شکر کی طاقت نہیں ہے
یہ کیا احساں ہیں تیرے میرے ھادی
فسبحان الذی اخزی الاعادی

الغرض ہمبرگ میں گزری ساعتیں میرے لئے یادگار مسرتیں ہیں۔ مجھے ایک جماعتی عہدیداران کے اجلاس سے خطاب کا بھی اعزاز بخشا گیا۔یوں بھی وہاں کا قیام مسیح موعودومہدیؑ کی صداقتوں کے بیان سے خوشگواراورایمان افروزرہا۔

فرینکفرٹ میں ادبی نشست

فرینکفرٹ واپس آیا تو 16رجولائی کو بروز اتوارادبی اورشعری نشست کا اہتمام عزیزی عرفان احمد خان نے نہایت عمدگی سے کیا ہوا تھا۔ پہلے لنچ دیا اور پھر اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی۔تعلیم الاسلام کالج کے Old بلکہ Oldest بوائے کی حیثیت سے مجھے صدارت کے شرف سے نوازا گیا۔جس میں جناب مسعوداحمد صاحب دہلوی اورمحترم پروفیسر ناصراحمد صاحب پروازی نے نہایت عمدہ اور اثرانگیز تقاریرکیں۔جناب پروازی صاحب نے احمدی شعراءکا اپنے مخصوص انداز میں ان کے کلام کے نمونہ جات سے مزین تعارف کروایا اورخصوصاًبزرگ شاعرجناب ثاقب زیروی صاحب کے مقام ومرتبہ کاتفصیل سے ذکرکرنے کے بعدمیڈیا کےانہیں نظرانداز کردینے کی متعصّبانہ پالیسی کی ندامت کی اور بجاطور پر یہ باور کرایا کہ میڈیا کے اس رویے سے اس قلندرصفت اور درویش منش شاعراورادیب کی قدروحیثیت میں اضافہ ہی ہوا ہے کمی نہیں ہوئی۔

البتہ قوم کاوہ حصہ جوان کے کلام کا آج بھی عاشق ہےان کی سماعتوں کوجناب ثاقب صاحب کے وجدانگیز بیان وکلام سےمحروم رکھ کر ان پرظلم ضرورکیا گیاہے۔

میں نے افتتاحی اوراختتامی خطابات کے ذریعہ کچھ معروضات پیش کیں جن کا کچھ احوال ’’لاہور‘‘ کی اشاعت میں بشارت احمد چوہدری کے قلم سے چھپ چکا ہے۔فارسی زبان کوسمجھنے والے اب کم کم ہی رہ گئے ہیں۔آخر میں مشاعرے کے معیارکوبہتر بنانے کی

طرف جوتوجہ دلائی تو فارسی کے اس مقولے پر ہی اکتفا کیا کہ

''نرخ بالا کن کہ ارزانی ھنوز''

بین الاقوامی عدالت انصاف میں

جرمنی میں قیام کے دوران کچھ روز لکسمبرگ اور ہالینڈ کی بھی سیر کی۔خصوصاً دی ھیگ گئے تو وہاں کے دوستوں سے ملاقات کے علاوہ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس (Peace Palace) کے اندر گھوم پھر کر اسے دیکھا۔عدالتوں کے مختلف کمرہ جات میں گئے۔ ہماری گائیڈ ایک خاتون نے سارے سیاحوں کو اس عمارت اور اس کی تزئین و آرائش کی تاریخ اور عدالت کے طریقہ کار کی وضاحت کی۔

جب ہم نے اس صدی کی ساتویں دھائی کے اس بین الاقوامی عدالت کے صدر کے بارہ میں دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ پاکستانی تھے۔ اس نے حافظے پر زور دیا مگر نام بتانے سے قاصر رہی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ہم نے اس کی مدد کی۔جس پر اس نے ممنونیت کا اظہار کیا۔ یہ وہی نام گرامی فرزند پاکستان تھا جس کی ولادت کے ساتھ ہی بلکہ شاید اس سے بھی پہلے اس کی والدہ ماجدہ کو بشارت مل گئی تھی کہ وہ ''چیف جسٹس'' ہوگا۔اس عمارت میں جتنی دیر رہے بلکہ اس کے بعد بھی گھنٹوں اس کی ذات میں ظاہر ہونے والے نشانات آسمانی کو یاد کر کے چشم تصور سے اللہ عزیز وقدیر کی قدرتوں کے نظارے کرتے رہے۔ مادر وطن بلکہ سارے عالم اسلامی کے لئے اس کی قربانیوں اور کارناموں کی ایک متحرک فلم چلتی رہی۔

غرض ''امن محل'' کی سیاحت اور اس کی غلام گردشوں میں گھوم پھر کر ہم ماضی کی یادوں میں کھو گئے۔کبھی اس عظیم الشان ادارے اور اس کے مقاصد عالیہ کا خیال آتا اور پھر اس عدالت کے بے نفس جج اور پھر چیف جج کا جو موٹر کار رکھنے کو بھی تعیش میں شمار کرتا تھا وہ پیدل اس عدالت عظمیٰ میں پہنچ جاتا اور واپسی پر عام بس میں سوار ہو کر اپنی جائے رہائش میں پہنچ جانے میں وہ کسی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوتا تھا۔سادگی اور کم خرچی کی اس سنہری مثال پر ہماری قوم عمل کر کے ان غیر ملکی قرضوں کی زنجیروں سے آزاد ہوسکتی ہے۔اے کاش ہمیں صحیح ادراک نصیب ہو۔

دی ہیگ سے دوستوں کو الوداع کہا اور ہم کار کے ذریعہ ایمسٹرڈم سے ہوتے ہوئے سر شام گروس گراؤ جرمنی بخیریت تمام پہنچ گئے۔ برطانیہ کے ویزا کے حصول کے لئے جرمنی فارم داخل کیا تھا۔ دوسرے ملک سے کسی دیگر ملک کا اجازت نامہ مشکل سے ہی اور وہ بھی استثنائی صورتوں میں ہی ملتا ہے مگر میرا کیس شاید سب استثناؤں سے بڑھ کر تھا۔

قانون فطرت ہے کہ جوں جوں قریب جائیں آتش فراق زیادہ تیزی سے بھڑکتی ہے۔اب عملاً رود بار انگلستان ہی بیچ میں حائل تھی۔ ادھر میرا محبوب ادھر میں مہجور مجبور کئی خواہشیں اور کئی تمنائیں اور نہ پہنچ پانے کے اندیشے خوفناک ناگنوں کی طرح ڈرا رہے تھے۔ایسے میں آہ وزاری بہت کی۔ مناجات نے کیا کیا شکلیں اختیار کیں۔عرضداشت مانی جاتی ہو تو عجیب عجیب دلیلیں اور مضامین اترتے ہیں۔

بیسویں صدی کا آخری للّٰہی اجتماع ہے۔شروع صدی میں میرے والدمحترم نے جس نور کی شناخت کی توفیق پائی اور پھر عمر بھر کوئی ایک بھی ناغہ نہ ہوااور اس عاجز نے بھی جب سے ہوش سنبھالا اوّل غیر شعوری طور پر کھینچا چلا آتا رہا اور پھر جب عقل وشعور بلوغت کے قریب پہنچے تو میں نے محسوس کیا کہ جو روحانی سبق ان تین دنوں میں ملتے ہیں وہ گویا سال بھر کے لئے روحانی غذا جمع کر لینے کے مترادف ہے۔

خوشیوں کا ایک دن

اور پھر یہ رب کریم کا کرم بے پایاں کہ بچپن سے لے کر 1983ء تک نہ ان دنوں میں کسی بیماری نے نہ کسی دیگر سانحے نے ہمارے راہ روکی۔اگر اب فاقوں پہ فاقے پڑ رہے ہیں۔پرشکستگی کے باعث محرومیاں بڑھتی جارہی ہیں اوراب تو یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ قلب وروح بنجر ہو چکے ہیں۔بجا کہ M.T.A ایک آسمانی مائدہ بن کر ہمارے لئے نعمت عظمیٰ کی صورت میں نازل ہوئی ہے مگر درمیان میں اس کی سکرین کا حائل ہونا بھی زہر لگتا ہے۔

عشق ومحبت درمیان میں کسی پردے کو کب پسند کرتے ہیں۔راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر بھی مجیب اور مہربان مالک کو پکارا اور دن کو بھی تر آنکھوں سے۔اللہ بہترین اجر عطا فرمائے۔احباب فرینکفرٹ کو جنہوں نے میری تڑپ کو بھانپ لیا۔ہر طرح سے مدد کی اور بالآخر 25/جولائی 2000ء کی دوپہر کو یہ مژدہ جانفزا فون پر سنایا کہ ویزا مل گیا ہے۔میں جس حالت میں تھا اللہ شکور کے آگے سجدہ ریزہ ہو گیا اور وہ دن میرے لئے خوشیوں اور مسرتوں کا بے مثال دن بن گیا۔الحمدللہ۔

اگلے ہی روز رخت سفر باندھا اب نہ قریباً ایک ہزار میل کے موٹر کے سفر کی تھکان کا خوف نہ کوئی غم واندیشہ میرا دل جو اداسیوں اور تنہائیوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔وہ مسرتوں سے چھلک رہا تھا اور ایسا کیوں نہ ہوتا جب اس کی تمنائیں اور آرزوئیں پوری ہوتی نظر آرہی تھیں۔ ؎

آنکھیں سوکھی ہوئی ندیاں بن گئیں
اورطوفاں بدستور آتے رہے

مگر اس میں اب ہجر کی سوزشیں نہیں تھیں مرگ شادمانی کا خوف ضرور تھا۔اس مضمون کی وضاحت کی یہاں گنجائش نہیں۔

الختصر یہ طویل سفر بہت سہل محسوس ہوا اور سر شام ہم اپنی منزل مراد پر شاداں وفرحاں پہنچ گئے۔لندن میں قیام گیرٹ لین ٹوٹنگ میں رہا۔جہاں مقیم میری بھانجی اس کے میاں اور دونوں بچے میرے لئے دل وجان سے منتظر تھے۔27/جولائی 2000ء کو پہلی بار ٹلفورڈ میں واقع وسیع وعریض جماعتی مرکز''اسلام آباد''اور اس میں دفاتر جلسہ کو دیکھ کر روح وبدن شاداب ہو گئے۔اپنے اپنے کارڈ بنوائے۔

دفاتر میں خدمت کے جذبات سے سرشار رضا کاروں کو دیکھا تو وہی قادیان اور ربوہ کے دسمبر کے آخری عشرے کے نظارے نظر آئے۔ وہاں برطانیہ کے امیر جناب ڈاکٹر افتخار احمد ایاز صاحب سے ملاقات ہوئی ان سے ہمسائیگی کے رشتے کی وجہ سے دوہرا تعلق تھا۔ وہ ابتدائی طور پر میانی ضلع سرگودھا سے تعلق رکھتے ہیں لیکن وہ اپنے اخلاق واوصاف کی وجہ سے کسی ایسے سہارے کے محتاج نہیں تھے۔ بے حد تپاک سے ملے اور میرے ساتھ تصویر کھنچوانے کا شرف بخشا۔ بھلا ہوا بن ''غضنفر'' کا جو پاس ہی موجود تھے اور اپنے ''ہتھیاروں'' سے ہر دم لیس رہتے ہیں۔ انہوں نے فوٹو لیئے جو مجھے از راہ کرم بھجوا بھی دیئے۔

پھر جلسہ سالانہ کے تین دن تو گویا پل بھر میں گزر گئے اور ہاتھ ملتے اور کہتے رہے۔ ؎

وصل کا دن اور اتنا مختصر

دن گنا کرتے تھے اس دن کے لئے

ان دنوں محویت کا ایسا عالم کہ گویا گردش افلاک بھی رک گئی تھی اور زمین بھی اور آسمان بھی اس للٰہی اجتماع کے ایمان افروز نظارے کرنے میں مشغول تھے۔ ہمیں یہ ہوش ہی نہیں تھا کہ کس ماحول میں شب وروز گزر رہے تھے۔ وہ چند لمحے جو وہاں گزرے وہ انمول تھے۔ وہ انمٹ یادیں ہیں جو زندگی کے باقی دن میرے ساتھ ہی گزاریں گی۔ دل والوں کا نور سحر اور تاریکی شب سہیلیاں ہوتی ہیں۔ ان روح افزا لمحات کو یاد کر کے دیوانہ وار پکار اٹھتا ہوں۔ ؎

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو آگے دس مہینے ابھی باقی رہتے ہیں۔ حی وقیوم رب چاہے تو آئندہ سال پھر ''اسلام آباد'' میں آسمانی مائدہ نازل ہو گا۔ اس کی قدرت کاملہ اور رحمت بے پایاں سے ہرگز بعید نہیں کہ نوروں نہلائے ہوئے اس وجود کی پھر زیارت نصیب ہو جس کو دیکھنے سے ہر آنکھ سرسبز ہو جاتی ہے وہاں وہی جو خود بھی روح تک شاداب ہے اور دوسروں کو بھی شادابی سے حصہ بخشتا ہے۔ جناب عبیداللہ علیم صاحب گو پوچھتے رہے کہ ''تم کون ہو'' مگر انہیں بھی خوب معلوم تھا اور مجھے بھی یقین ہے کہ اس وقت صفحہ دنیا پر ایک ہی ایسا شخص ہے۔ اللہ اس کی صحت اور سلامتی میں برکت بخشے۔ آمین

بیت الفضل لندن میں نمازیں ادا کرنے کے لئے بروقت پہنچ جاتے رہے۔ یہ خواہش ہوتی کہ آتے جاتے بھی وہ نگاہ کرم ہم مجبوروں پر بھی پڑ جائے تو ہمارے بھی دن پھریں۔

تاریخ کے اوراق ایسے واقعات سے بھرے پڑے ہیں کہ اس محبوب دوراں اور اس کے مقدس باپ دادا نے بس ایک نگہ فیض بخش سے مردوں کو جلا بخشی اور پشتوں کے بگڑے ہوئے سنور گئے۔ چنانچہ ایک شام وہ نظر ہم پر بیت الفضل سے واپس لوٹتے ہوئے پڑ گئی اور

ہماری پژمردگی اور فرسٹریشن کا کچھ مداوا ہوگیا۔ دوپہر پانچ اگست کو ہماری ملاقات کا وقت مقرر تھا کیا کیا مضمون بنائے یہ یہ عرض کریں گے اپنی داستان غم سنائی جائے گی مگر جب کمرے میں داخل ہوا تو بے اختیار آنکھیں چھلک پڑیں۔ ان آنسوؤں میں طویل فرقت کا درد بھی تھا۔ پرانی آرزوؤں کے پورا ہونے پر مرگ شادمانی کے عالم کا نظارہ بھی جو کچھ واقعہ ہوا اس کی وجہ بیان کرنے کی ہر کوشش ناکام ہی ہوئی مگر صد حیف کہ آنسوؤں کی دھند میں اس رخ زیبا کو بھی جی بھر کر نہ دیکھ سکا۔ بات کرنے کا کیسے یارا تھا۔ داستانیں بھول گئیں سارے مضمون یادوں سے محو ہوگئے اور وہی حال ہوا جو اقبال عظیم کا ہوا تھا کہ ؎

ان کی محفل میں کچھ اور ہیں آداب سخن
میرا افسانہ فقط دیدہ نم تک پہنچا

مقررہ چند منٹ آنکھ جھپکنے میں ختم ہوگئے اور تشنگی کی شدت میں اضافہ ہی ہوا۔ بھلا میرے ایسے بلا کے تشنہ کا ایک گھونٹ یا ایک جام سے بھی کیا ہوتا۔ وہ تو یہ تمنا لے کر گیا تھا کہ ؎ میخانے کا میخانہ پیمانے میں رکھ دینا

میری حسرتوں میں اضافہ ہوا کیونکہ نہ جی بھر کے دیکھا نہ کچھ بات کی۔ بڑی آرزو تھی ملاقات کی۔

10 ر اگست 2000ء کو علی الصبح کی پرواز سے واپسی تھی 9 ر اگست 2000ء کی شام کو اس مکان یعنی 16 گریسن ہال روڈ اور اس کے نورانی مکین پر آخری نگاہ ڈالی حالت یہ تھی کہ دل خون ہو رہا تھا۔ محزون ہو رہا تھا۔

11 ر اگست کو لاہور پہنچے اور وہاں سے سرگودھا آئے۔ مغرب میں موسم معتدل تھا یہاں بلا کی گرمی جس کے ساتھ تازہ ملاقات کے بعد پھر مہجوری کا غم۔

(روزنامہ الفضل ربوہ مورخہ 20 ر اکتوبر 2000ء صفحہ 3 تا 4، 7)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

میری والدہ فتح بی بی صاحبہ

میں جب اپنی والدہ کے متعلق یہ نوٹ لکھنے لگا تو میں نے عنوان تجویز کیا ''میری ان پڑھ ماں'' مگر پھر قریباً ستر سال قبل لکھی جانے والی ایک کتاب ''میری والدہ'' کی یاد آئی تو میں نے اس خیال سے عنوان میں یہ تبدیلی کر لی کہ کتاب ''میری والدہ'' لکھنے والا ایک بلند پایہ ادیب و خطیب ایک مایہ ناز متوکل علی اللہ اور بے نفس بزرگ ایک قابل تقلید ''رفیق'' اور ان کی والدہ ماجدہ گو معمولی پڑھی لکھی مگر موحد اور تقویٰ کی باریک راہوں کی متلاشی اور وہ بھی ''رفیق'' تھیں۔

ضمناً عرض کرتا ہوں کہ یہ ''رفیق'' کی اصطلاح اس مقدس رشتے کو بیان کرنے سے قطعاً قاصر ہے اور جن کے لئے صحف میں موزوں اور مبارک اصطلاحیں موجود ہیں اور جن کو مجبوراً چھوڑ کر نظریہ ضرورت کے تحت یہ الفاظ اختیار کئے گئے ہیں۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا میں نے ''میری والدہ'' کے خدا رسیدہ بزرگ مصنف اور ان کی ''بے بے جی'' جو بے شمار اعلیٰ صفات کی مالکہ تھیں کی نقالی کرتے ہوئے اپنے اس مختصر سے مضمون کو بھی حصول برکت کے لالچ میں وہی نام دیا ہے ذرہ نواز آسمانی آقا کی بے پایہ رحمت سے کیا بعید جو وہ اس میری نقل اتارنے کی کاوش کو قبول فرمائے اور میری والدہ کو بھی اپنے قرب کا بہتر مقام عطا فرمائے اور میری خطاؤں سے بھی درگذر فرماوے۔

میری اماں کا نام فتح بی بی تھا۔ ان کے والد اور میرے نانا چوہدری سلطان محمود صاحب قصبہ للیانی تحصیل بھلوال میں وسیع زرعی اراضی کے مالک ہونے اور جبلی شرافت دیانت داری اور راست روی کے باعث عزت وشرف کا مقام رکھتے تھے۔ میری والدہ اور میرے اکلوتے ماموں فضل داد صاحب تھے جن کی اولاد ہوئی۔

مجھے اس اعتراف میں ہرگز کوئی حجاب یا احساس کمتری نہیں ہے کہ میری والدہ ان پڑھ دیہاتی خاتون تھیں نہ وہ جدید دنیا کے رجحانات سے آگاہ تھیں نہ وہ عادات واطوار میں ماڈرن رویے کی حامل تھیں نہ یہ ''اوصاف'' اس قدر ضروری ہیں کہ یہ موجود ہوں تو تب ہی ان کے متعلق کوئی نوٹ لکھا جائے۔ بلکہ ماں صرف ماں ہوتی ہے اور باقی اضافتیں ماں کے پیار اور اس کے شفقت اور اس کے سایہ کے مقابلے میں بے معنی اور ہیچ ہیں۔

یہ درست ہے کہ میری ماں الف با تو نہیں پڑھ سکتیں تھیں مگر تربیت کے گر اور درس شفقت خوب یاد تھے۔ صد حیف کہ میری نوعمری میں ہی میرے آنسو پونچھنے والا پلو میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

آج کا انسان اپنا غم غلط کرنے کے لیے سہاروں کی تلاش میں سرگرداں پھر رہا ہے کبھی ارباب اقتدار کی پناہ ڈھونڈتا ہے اور کبھی ناجائز دولت کو اپنے دکھوں کا مداوا خیال کرتا ہے پھر راہ سے بھٹک کر جام و پیمانہ میں گم ہو جاتا ہے۔ کاش اسے امام زمانہ کے ان پاک کلمات سے ہی راہنمائی حاصل ہو جائے اور وہ جان جائے کہ قادر کریم کا در کھٹکھٹانے میں اس کی نجات کا راز پوشیدہ ہے۔

اگر تم خدا کے ہو جاؤ گے تو یقیناً سمجھو کہ خدا تمہارا ہی ہے۔ تم سوئے ہوئے ہو گے اور خدا تمہارے لئے جاگے گا تم دشمن سے غافل ہو گے اور خدا اسے دیکھے گا اور اس کے منصوبے کو توڑے گا تم ابھی تک نہیں جانتے کہ تمہارے خدا میں کیا کیا قدرتیں ہیں۔

اور اللہ کے فضل ورحم کو جذب کرنے کی ایک سبیل والدین کی اطاعت اور خدمت ہے یہ بھی اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ میں نے ''رفیق'' کے گھر میں آنکھ کھولی اور مجھے اس ماں کی گود میسر آئی جو باوجود ان پڑھ ہونے کے زیرک دانا، معاملہ فہم اور بہادر خاتون تھیں۔ جوں جوں

عمر بڑھتی جاتی ہے یادداشت کمزور ہو رہی ہے مگر پرانی باتیں ذہن پر ایسی نقش ہیں جسے ستر سالوں کی گردش بھی مٹا نہیں سکی۔ ابھی وہ خمار نہیں بھولا جو جھولے میں لیٹ کر ماں کے محبت بھرے ہاتھوں سے ہلکورے کھانے میں آتا ہے۔ مقام شکر ہے کہ چند ٹیڑھے میڑھے الفاظ لکھنے اور کچھ پڑھنے کے قابل ہو گیا ہوں۔ حلقہ احباب میں کچھ وسعت آ گئی۔ رہن سہن میں بھی کچھ تبدیلی آئی۔ اگر کچھ عزیز پیار اور عزت سے بلاتے ہیں تو اس کی کمی کو پورا نہیں کر سکتے۔ نہ اس خواہش میں کبھی کمی آئی کہ کبھی تو کانوں میں عشق و محبت میں ڈوبتا ہوا ماں کی زبان سے ''میرا چبلو'' کا لفظ رس گھولے۔

دل کا ہر گوشہ تمہاری یاد سے آباد ہے
مجھ کو سب کچھ بھول جانے پر بھی سب کچھ یاد ہے

سوچتا ہوں کہ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کے پاس کس نعمت کی کمی تھی کہ ڈھلتی عمر میں بھی بے ساختہ یوں اظہار کیا کہ ''ماں کے بغیر گھر قبرستان لگتا ہے'' اور دوسرے بادشاہ نادرشاہ نے ماں کو پھول سے تشبیہہ دی۔

حضرت سیدالکونین رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حقیقی والدہ نہیں بلکہ رضاعی ماں تھیں ان کے آنے پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ادب سے کھڑے ہو جاتے تھے اور اپنی چادر ان کے لئے زمین پر بچھا دیتے تھے۔

آداب کے سلیقے کوئی اس معلم حقیقی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سیکھے۔ یہ سچ ہے کہ جو شخص ماں کی عاطفت کو نہیں سمجھا وہ اللہ تعالیٰ کی وراء الوراذات اعلیٰ واجل اور اس کے ادراک کو کب اور کیسے پائے گا۔ میرے والدین کی شادی 1900ء میں ہوئی۔ 1903ء میں میرے ابا میاں عبدالعزیز صاحب نون نے اس دور کے فرستادہ کہ ہاتھ پر بک جانے کا عہد کیا اور ان کی یہ قلبی واردات ہمارے خاندان میں ایک قابل صد ناز انقلاب لانے کا موجب بنی۔ جس سے ہماری چار پشتیں فیض یاب ہو رہی ہیں۔ اپنے آپ پر اور آنے والی نسلوں پر وراثتاً ملنے والی اس نعمت کو یاد کر کے اپنے بزرگ باپ کی روح کو سلام کرتا ہوں اور یہ دعا کرتا ہوں کہ ''اے میرے رب میرے والدین پر اسی طرح رحم فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھ پر رحم کیا''۔

گو کچھ عرصہ تک میری اماں متردد تو رہیں یوں میرے ''رفیق'' باپ کے نور ''رفاقت'' کی برکتوں سے ہمارے گھر میں کمال ہم آہنگی، وفا اور اخلاص کی خوشبو رچی بسی رہی۔ اور یہ خاندان مثالی اور نمونہ فردوس بنا رہا عمویم مکرم حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب فاضل ہلال پور کے ساتھ میرے ابا کے ہم وطن، ہم عمر اور ہم مشرب ہونے کے باعث مثالی برادرانہ گہرے تعلقات تھے۔ حضرت مولوی صاحب کی وفات 1939ء میں قادیان میں ہوئی تو میری اماں تعزیت کے لئے حضرت مولوی صاحب کی بیگم صاحبہ کے پاس'' (جن کے ساتھ میری والدہ کا خواہرانہ تعلق تھا) قادیان گئیں۔ یہ قادیان کا اماں جان کا پہلا سفر تھا۔ ان کو یہ دیکھ کر خوشکن حیرت ہوئی کہ تعزیت کے لئے

آنے والوں کے لئے حضرت مصلح موعودؓ کے گھر سے کھانا آتا تھا اور کھانا بھی با افراط اور لذیز اور بابرکت۔ آقا کا اپنے غلاموں کے ساتھ یہ سلوک۔ ہمارے ماحول میں تو اس کی مثال کہیں نہ دیکھی نہ سنی۔

یہاں الٹی گنگا بہتی دیکھی تو میری اماں کہتی تھیں خانوادہ اقدس کے متعلق میری سوچوں کے دھارے بدل گئے اور بغیر دیکھے ادب اور عقیدت کے جذبات پیدا ہوئے۔ جمعہ کا دن آیا تو مستورات کے ہمراہ ''مسجد'' میں جا پہنچیں اور ایک کھڑکی سے حضرت مصلح موعودؓ کی زیارت ہوئی تو زیرکی اور دانائی اور باریک بینی اور سب سے بڑھ کر اللہ کے فضل اور رحم نے اسی آن واحد میں فیصلہ کرا دیا اور وہی لمحہ میری پیاری اماں کی زندگی میں ایسی خوشگوار تبدیلی لایا جس نے ان کے جسم و روح ہی بدل ڈالے اور وہ آسمانی نعماء سے اپنی جھولی بھر کر واپس وطن آئیں۔

اس کے بعد 9 سال میری والدہ زندہ رہیں۔ ہر روز اس مبارک سفر جو وسیلہ ظفر بنا، کے ایمان افروز تذکرے اور ہر روز اللہ کی راہ میں ہر شے قربان کر دینے کے عزم۔

مجھے 1948ء میں اس مجسم شفقت اور سایۂ رحمت کے چھن جانے کا صدمہ بھی تھا اور ان کے انجام بخیر ہونے کی خوشی بھی۔ میں نے حتیٰ الوسع بہت علاج کرایا اور اماں کی صحت و عمر کے لئے اللہ کے حضور زاری بھی بہت کی۔ خدا کی تقدیر غالب آئی۔

مجھے اس لحاظ سے شدید محرومی اور احساس رہا جس نے نصف صدی کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود میرا پیچھا نہیں چھوڑا کہ میری خاطر اپنی ہر راحت اور آرام کو قربان کرنے والی اور حد سے بڑھ کر پیار کرنے والی میرے طالبعلمی کے زمانہ میں ہی دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اور ان کی زندگی میں میری گھر سے مسلسل غیر حاضری ان پر شاق گزرتی تھی مگر میرے طلب علم کے شوق کی راہ میں اپنے ہجر و فراق کے درد کو حائل نہیں ہونے دیتی تھیں۔

میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا اس لئے میں نے تو ان کا پیار بہت لوٹا۔ مگر اکلوتے بیٹے کا مہینوں تک منہ نہ دیکھنا اور تنہائی اور اداسی میں شب و روز سلگتے رہنا اور اف تک نہ کرنا ان کی حوصلہ مندی اور صبر اور خداداد بصیرت پر شاہد ہے۔ اور اس طرح میں بجائے ان کی کوئی خدمت کرنے کے دور رہنے کی وجہ سے ان کے لئے قلبی اذیت کا ہی موجب بنا رہا۔ 1948ء کی وہ رات بے پناہ تھی اور میں غریب تھا جب والدہ نے آخری ہچکی لی اور روح جسم سے جدا ہو گئی تو میں نے بے اختیار ان کے ماتھے کو اور پھر قدموں کو بوسے دیئے اور گویا یہ میری آخری سلامی تھی جو میں ان کے بلند مقام شفقت و محبت کو پیش کر سکا۔

پھر 1953ء میں جب میں ایل ایل بی کے آخری امتحان کی تیاری کر رہا تھا اور امتحان میں پانچ چھ دن باقی تھے تو میرے ابا جن کو اللہ نے اپنے کرم سے ''رفاقت'' کی خلعت سے سرفراز فرمایا تھا اور جو میرا مربی، میرا ہمراز اور دلدار تھا مجھے اکیلا چھوڑ کر اپنے آسمانی آقا

کے قدموں میں جا بیٹھا۔

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے۔ روز ایک چیز ٹوٹ جاتی ہے مگر قربان جاؤں اس ماں باپ سے بڑھ کر احسان اور انعام کرنے والے مالک الملک کے جس کے فضلوں اور احسانوں نے سارے زخم مندمل کر دیئے اور اس رحمن و رحیم رب کریم نے میرے ماں باپ سے کہیں بڑھ کر دلجوئی اور دلداری اور کرم اور رحم کا سلوک فرمایا۔

قارئین کرام سے کمال ادب اور دردمندی سے یہ التجا ہے کہ میرے والدین کی بلندی درجات اور میری ستر پوشی کے لئے دعا کریں کہ یہ نوٹ اسی غرض کے لئے لکھا ہے۔

(روزنامہ الفضل 15 رنومبر 2000ء صفحہ 4)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

دیوانگی۔فرزانگی

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ فرزانوں نے محفل کو بے کیف بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور رونق صحرا ہمیشہ ایک دیوانے پر ہی موقوف ہوتی ہے اسے ماہ وسال تو یادنہیں۔

خلافت ثانیہ کے آخری چند سالوں کا ذکر ہے کہ اس ''دیوانے'' کا محبوب بیمار تھا اس لئے دیوانے کی یہ تڑپ کہ وہ اس حسین اور نورانی چہرے کی زیارت کر سکے کسی طرح پوری نہیں ہو سکتی تھی اور اگر کہیں دوسرے تیسرے مہینے وہ اپنے معشوق کی ایک جھلک دیکھ بھی پا تا تو اس سے اس کے سینہ میں فراق اور مہجوری کی آگ کب ٹھنڈی ہو سکتی تھی۔

وہ زمانہ بھی اس پر گزرا تھا جب ہر جمعہ کے روز اس کا محبوب اسے دین و دنیا کی حکمتوں کے راز بتاتا تھا۔ اس کے لئے وہ ایک ایک ساعت کو یوں گن گن کر گزارتا اور جمعہ کا دن اس کے لئے عید کی خوشیوں سے کسی صورت کم نہیں ہوتا تھا۔ اس بیچارے کا اس میں قصور بھی نہیں تھا کہ اس نے 1944ء سے 1947ء تک تو قرب کی یہ انمول دولتیں خوب جی بھر کر لوٹی تھیں۔ ہر شام ''بیت'' مبارک کی چھت پر اس کا ''چاند'' ستاروں کے جلو میں ضوفشاں ہوتا۔ مگر عشق و مستی میں 24 گھنٹے کی علیحدگی بھی اس کے لئے جان گسل بن جاتی تھی۔ اس محفل میں ایک شام ادھر سے قوت جاذبہ نے اتنے زور سے کمند پھینکی ادھر یہ پہلے ہی اپنے محبوب سے چند گزوں کی دوری کو برداشت نہیں کر رہا

تھا۔ چنانچہ بغیر کسی سے اجازت ملنے کا انتظار کئے لپک کر اپنے پیارے کے قدموں میں جا بیٹھا اور اناڑی ہاتھوں سے پاؤں دبانے لگا۔ اس پر مجلس برخواست ہونے پر اعتراض بھی ہوا شاید اس زمانے میں تعلیم الاسلام کالج کے پرنسپل صاحب نے اس کی وارفتگی کو بھانپ لیا تھا۔ اس لئے سرزنش تو نہ کی اتنا ہی استفسار کیا کہ تمہیں پاؤں دبانے کی کچھ مشق بھی ہے؟

اس کا جواب نفی میں تھا مگر دیوانے سے تو ایسی حرکت ہی سرزد ہوگی۔ جو عقل و دانش سے باہر ہو۔ جناب پرنسپل کی نگاہ بھی تیز بہت تیز ظاہری کارکردگی سے بڑھ کر اس کے دل کی حالت پر پہنچی اور وہ پا گئے۔ کہ اسے منع کرنے پر اس کا دل ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ آپ خاموش رہے اور اسے گویا اس محبوب الٰہی کے قرب میں ہمیشہ بیٹھنے کا پروانہ عطا ہو گیا۔ وہ اپنے نصیبے پر خوشی سے جھومنے لگا۔ اور پھر اپنے ہاتھ دوستوں کو دکھاتا جس میں سے ''عطر سے ممسوح'' جسم کو چھونے سے اس کے ہاتھوں سے بھی خوشبو پھوٹتی رہی اب اس کی دیوانگی اور وارفتگی جمع ہو گئی تھی۔ اور کہیں سے خوشبو آئے وہ 52 صفات والے وجود کی محبتوں کو یاد کر کے بے خود ہو جاتا۔ جس کی محفل سے اٹھے اب 35 سال ہو گئے ہیں۔

مہ و سال کے گزرنے کے بعد اس کے محبوب کے یہ ہر روز کے جلوے نہ رہے۔ اب تو بیماری کے باعث وہ دیوانہ اپنے محبوب کی زیارت سے محروم ہو گیا اور اس کی شیریں آواز کو سننے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ جس نے اس کے قلب و روح کی کجیوں کو سیدھا کیا تھا۔ اسے پتہ چلا کہ لب دریا سے اپنے مسکن دو میل کی مسافت پر ایک ڈیرہ ہے۔ جہاں ہوا خوری کے لئے روزانہ موٹر میں وہ چاند اترتا ہے۔ مگر اسے تنبیہہ کر دی گئی کہ وہاں تک آنے کی اجازت نہیں مل سکتی مگر دیوانگی کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتی ہے۔ اس نے پرائیویٹ سیکرٹری صاحب سے انکسار بلکہ لجاجت کے ساتھ گزارش کی کہ وہ پختہ سڑک سرگودھا سے ڈیرہ احمد نگر جانے والے موڑ پر چپ چاپ کھڑا رہے گا وہ کوئی حرکت نہ کرے گا۔ اگر اس کی نگاہ رخ انور پر پڑ گئی تو اس کی قسمت کے الجھے ہوئے تار سیدھے ہو جائیں گے اور ایک بے نوا کی حسرت پوری کرنے کی اجازت دے دیں۔ تو اللہ تعالیٰ سے اجر پائیں گے اس کی خوش بختی کہ اس کی اجازت اسے مل گئی۔

پھر تو وہ روزانہ وقت کا اندازہ کر کے سرگودھا سے بس پر سوار ہوتا وقت سے پہلے مقررہ مقام پر اتر کر وہاں لب سڑک پر بیٹھ جاتا۔ گزرنے والے حیران ہوتے کہ یہ کوئی پاگل ہے ہر روز اس وقت اسی جگہ پر بیٹھا رہتا ہے جہاں سے بے تحاشا ٹریفک گزرتی رہتی ہے اور یہ گم سم بیٹھا گرد پھانکتا رہتا ہے اسے فرزانگی کے لفظ سے تو اسی روز سے چڑ ہو گئی تھی۔ جب اس کے آقا نے سر مجلس فرما دیا تھا۔ کہ

فرزانوں نے دنیا کے شہروں کو اجاڑا ہے

محبوب کی سواری نظر آتی تو ذرا راستے سے ہٹ کر مجسم عقیدت بنا کھڑا ہو جاتا نہ زبان سے کچھ کہتا نہ ہاتھ سے تعظیم بجا لانے کا اشارہ ہی کرتا یہ اسے منع کر دیا گیا تھا۔ یوں بھی یہ سواری اس شہنشاہ کی تھی جو بقول ڈاکٹر پروازی صاحب:

ایسا جلال کس کو ہوا ہے کبھی نصیب
یہ دبدبہ کہاں ہے کسی بادشاہ میں

قریباً 20، 25 منٹ اور کبھی اس سے زیادہ ڈیرے پر یہ قافلہ رکتا۔ اور پھر یہ ''پاگل'' موڑ کی دوسری طرف سرک کر کھڑا ہو جاتا۔ یہ پہلو اس لئے بدلتا رہتا تھا کہ اسے معلوم تھا کہ اس کا مطلوب موٹر کی عقبی نشست پر بائیں کھڑکی کے ساتھ بیٹھنے کا عادی ہے اسے وہ ''ناقہ'' بھی پیاری لگتی تھی اور وہ ستارے بھی پیارے تھے جو اس کے چاند کے گرد ہالہ بنائے رہتے تھے۔

اس کی ایک ہی تمنا تھی اور ایک ہی خواہش کہ اس کی نگاہ اس کے آقا کے نوروں سے منور چہرے پر پڑے اور اگر کبھی اس کی قسمت یاوری کرتی تو اس کے محبوب آقا کی نگہ صد ناز اس پر بھی پڑ جاتی۔ تو یہ خوشی سے جھوم جاتا اور سمجھتا تھا کہ کسی کی جوتیوں کی خاک ثریا پر پہنچ گئی ہے۔

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

جب تک وہ چاند تاروں بھری سواری نظروں میں رہتی وہ ٹک ٹک اسے دیکھتا رہتا جب نظروں سے اوجھل ہو جاتی تو یہ بوجھل دل کو لے کر اپنی قسمت پر نازاں اور فرحاں کسی بس میں سوار ہو کر واپس اپنے گھر پہنچ جاتا مگر حالت یہی ہوتی کہ

تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

یہ ہر روز کا اس کا معمول تھا اور کتنا عرصہ جاری رہا اب یہ اس کے ذہن سے گردش زمانہ نے محو کر دیا ہے۔

تیرے ہجر کی تھیں نشانیاں جو سنبھال کر میں نہ رکھ سکا

اسے 35، 36 سال کا عرصہ ہو گیا ہے اس کا وہاں سے اکثر گزر رہوتا ہے تو وہ سہانی یادیں اس کے دل کو زخم لگاتی ہیں۔ بعض دفعہ وہاں رک کر فضاؤں میں دیوانہ وار گھورتا رہتا ہمیشہ آنکھیں اس نظارے کو ڈھونڈتی ہیں اور بے اختیار وہ مجروح دل والا ایک اور ''مجروح'' ہی کا شعر گنگنانے لگتا ہے۔

وہ شہ خوباں کدھر ہے پھر چلیں اس کے حضور
زندگی کو دل کہیں اور دل کو نذرانہ کہیں
تشنگی ہی تشنگی ہے کس کو کہیئے میکدہ
لب ہی لب ہم نے تو دیکھے کس کو پیمانہ کہیں

عام طور پر دیوانگی اور شاعری کی حدود ملتی ہیں مگر اس دیوانے کو یہ اعتراف ہے کہ اس کو شعر کا ملکہ عطا نہیں ہوا۔ اس سلسلہ میں وہ ادھار سدھار پر گزارہ کر رہا ہے۔ آج بھی حالت زار کے اظہار کے لئے پھر اسے دست سوال دراز کرنا پڑا چنانچہ وہ اپنے محبوب مطلوب کو اسی طرح اور اسی زبان میں مخاطب کرتا ہے جس طرح اس صدی کے بہت بڑے صوفی مگر یادیار میں مست الست مہجوری کے دردوالم سے چور چور محب صادق یعنی ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحبؓ نے اسی مقدس خاندان کے بانی کے ہجر میں سلگتے ہوئے اشعار میں لکھا تھا۔ ایسے اشعار جن کا حرف حرف مخمور اور لفظ لفظ عشق و بیخودی میں ڈوبا ہوا ہے کہ آج اس کے نامدار محبوب کو رخصت ہوئے بھی تقریباً ایک تہائی صدی گزر چکی ہے۔

صدی گزری ہے فرقت میں تہائی
بھلا اتنی بھی کیا لمبی جدائی
مرے آقا مری اک عرض سن لو
نہیں رکتی ہے منہ پر بات آئی
ہوئے بدنام الفت میں تمہاری
رکھایا نام اپنا ''میرزائی''
یہی بدلہ تھا کیا مہر و وفا کا
کہ اتنی ہو گئی بے اعتنائی
وہ صورت دیکھتے تھے جس کو ہر روز
کچھ ایسی آپ نے ہم سے چھپائی
کہ آنا خواب تک میں بھی قسم ہے
نہ تھی گویا کبھی بھی آشنائی

آخر وہ وقت بھی آ گیا جب 1965ء کی ایک ظلمتوں بھری رات تھی چاند آسمان پر روشن تھا مگر اس کا چاند ڈوب چکا تھا۔ یہ رات بھر کف افسوس ملتا رہا۔ اس کا آنگن سونا ہو گیا۔ ہر بام اداس ہر دریچہ بے چانداور ہر گلی بے صدا ہو گئی تھی۔ اس کی جھولی جو لعل یمن سے چھلکتی رہتی تھی اب خالی ہو گئی تھی۔

ساقی تیرے کرم پہ مجھے ناز تھا بہت
ناکام جا رہا ہوں مقدر کی بات ہے

ادھر چاند ڈوبا ہے تو پھر ادھر سے ایک اور چاند طلوع ہوا۔ آخر خالق و مالک نے اپنی مخلوق کو گھپ اندھیرے میں تو نہیں رکھنا تھا۔ ٹوٹے دلوں کو پھر قرار آ گیا۔ عروۃ وثقی پر غم نصیبوں کا پھر ہاتھ پڑ گیا۔ دلربائی اور دلداری کے اس کے بھی عجیب طریقے تھے۔

غم والم کے پہاڑ سترہ سالوں میں اس دیوانے پر بھی اور سارے گروہ عاشقان پر ٹوٹے مگر اس چاند کی چاندنی میں وہ نور تھا اور اس کی نگاہوں میں وہ برکتیں تھیں کہ جس پر نگاہ کرم پڑ گئی اس کے سب اضطراب مسرتوں میں بدل جاتے وہ سوچتا ہے کہ یہ جو صادقوں کے مخالف انہیں ہمیشہ ''ساحر'' کہتے چلے آئیں ہیں تو وہ بھی غلط تو نہیں کہتے تھے اگرچہ وہ تو ازلی جھوٹے ہیں۔

ایک ''صادق'' خود اعتراف کرتا ہے کہ۔

''جادو'' ہے میری نظروں میں تاثیر ہے میری باتوں میں
میں سب دنیا کا فاتح ہوں ہاتھوں میں مگر تلوار نہیں

آخر ہر چاند بھی تو ڈوب جاتا ہے اور سورج بھی ڈوب جاتا ہے رہے نام اللہ کا یہ کریم ابن کریم ابن کریم بھی اپنے دیوانوں کو سوگوار چھوڑ کر اپنے پیدا کرنے والے کے قدموں میں جا بیٹھا۔

سچ کہا تھا عبیداللہ علیم نے، وہ رات بے پناہ تھی اور میں غریب تھا۔ جناب علیم صاحب سے اتنا اختلاف انکی روح سے معذرت کے ساتھ کہ اس بے پناہ رات میں وہ اکیلا ہی ''غریب'' نہیں تھا جس کو اس افتاد کا سامنا کرنا پڑا۔ بلکہ وہ اپنے اور غیروں سب سے محبت کرنیوالا ہاں وہی جسے نفرت کسی سے نہیں تھی۔ وہ تو کروڑوں دلوں کی دھڑکن تھا جو اچانک اس وحشت ناک خبر سے سکتے میں آ گئے تھے۔

ہمارے دکھوں میں اب بہت اضافہ ہو چکا تھا اور ہمارے درد لا دوا ہوتے چلے جا رہے تھے اور ہر زبان پر تھا کہ

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

عرش کے مالک کو اپنی مخلوق کی حالت زار ونزار پر پھر ترس آ گیا اور اس نے ایک حکیم حاذق کو ہی نازل فرما دیا۔ اس کے پاس سارے نسخے بیاض مسیحا کے تھے۔ جس میں مشرق اور مغرب اور شمال اور جنوب کے باسیوں نے شفا پائی۔ اس دیوانے کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں وہ بھی اس کا درد آشنا تھا مگر اس کی شومئی قسمت کہ اس نے دور بہت دور جا ڈیرے ڈالے۔ کم نصیب پاگل پھر اس دلدار اور دل ربا کی صحبتوں سے بھی محروم ہو گیا۔ وہ اسے شیشے کے اندر سے اپنا جلوہ دکھاتا ہے اس سے کبھی تو اس کی کچھ پیاس کم ہو جاتی مگر عشق کی آگ اور تیزی سے بھڑک اٹھتی ہے۔ یہ عشق ومحبت کی دنیا ہی الگ ہے اور اس کے اصول اور قوانین بھی انوکھے ہوتے ہیں۔ جنہیں عشق کی چاٹ لگی ہو وہی سمجھ سکتے ہیں۔

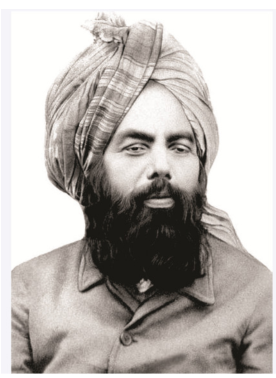
اللہ اسے تادیر سلامت رکھے اور دیوانے کو بھی مہجوری کا درد صبر سے کاٹنے کی توفیق بخشے۔ جب سے اسے گذشتہ ماہ اگست میں جلوہ جاناں کی ایک جھلک دیکھنی نصیب ہوئی (صد حیف کہ وہ دولت بہت جلد ہی اس سے چھن گئی)

اب پہلے سے بھی بڑھ کر اس کے ماحول میں اداسی چھائی رہتی ہے اس کی صبحیں زرد زرد اور شامیں تھکی تھکی سی محسوس ہوتی ہیں مہجوری کی ناگن نے اسے پھر ڈس لیا ہے اب اس کی ایک ہی تمنا ہے اور ایک ہی آرزو کہ اس پر شکستہ کو اپنے محبوب کا قرب عطا ہو اور وہ بجا طور پر فخر سے کہتا ہے کہ میرا محبوب محبوب خدا ہے ہاں وہی جس کے عشق نے اسے زندہ رہنے کا ظرف اور پندار بخشا اے زمین و آسمان کے مالک تیری قدرت کے آگے روک کیا ہے؟ جناب مصلح الدین راجیکی صاحب کا یہ شعر اب اس کی دعا بن گیا ہے۔

میری نیستی کا عالم تیرے کن کا منتظر ہے
مرے مہرباں دکھا دے فیکون کا نظارہ

(روزنامہ الفضل 5 رجنوری 2001ء صفحہ 5 تا 6)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁



فرزانوں نے دنیا کے شہروں کو اجاڑا ہے
آباد کریں گے اب دیوانے یہ ویرانے

حضرت مسیح موعود کے چند وفا شعار دیوانوں کا تذکرہ

جنہوں نے اپنا تن من دھن اس راہ میں قربان کر دیا

مراق مالیخولیا دیوانگی پاگل پن ایک دماغی مرض کے مختلف مراحل اور اقسام ہیں ان کے علاج کے لئے مینٹل ہسپتال ہر ملک میں موجود ہیں لیکن آج میں جس دیوانگی اور جس جنون کا ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ سراسر ایک مختلف جذبہ ہے لیکن کئی اقدار مشترک بھی ہیں۔ ہر قسم کے دماغی عارضے میں جس کا کوئی نام رکھ لیں نفع و نقصان اور کامیابی اور ناکامی بلکہ اپنے مقصود کو پا لینے میں زندگی کی بھی پرواہ نہیں ہوتی اور موت سے بھی کچھ خوف نہیں رہتا۔

اطباء اس مرض کی کئی تقسیمیں کریں گے میں ایک مختلف جہت سے اللہ اور رسول کے دیوانے اور دنیا کے دیوانوں کی موٹی تقسیم کر کے آگے بڑھوں گا۔ اللہ اور رسول کا دیوانہ نعرہ لگاتا ہے۔

اس راہ میں جان کی کیا پرواہ

جاتی ہے اگر تو جانے دو

پھراس قسم کے جنون میں اللہ کے سواکسی بڑے سے بڑے کا خوف یا ڈر نہیں رہتا۔غیر اللہ کا خوف اللہ کے مجنون کے دل میں تو داخل نہیں ہوسکتا خواہ وہ کوئی بادشاہ ہو،خواہ کوئی وزیر اعظم ،خواہ کوئی سر براہ حکومت ہو ان کے دل دنیاوی خوفوں سے آزاد ہو جاتے ہیں اور ہم وغم کے نزدیک نہیں بھٹکتے۔ایسے دیوانوں کے ہاں حساب کتاب اور جمع تفریق اور نفع ونقصان کے کوئی پیمانے ہی نہیں ہوتے وہ جانتے ہیں کہ اس راہ پر چلنے سے مال ودولت کا بھی نقصان ہوگا،اولاد کا بھی ضیاء ممکن ہے،اپنی جان کو سخت خطرے پیش آئیں گے غرض کئی آفات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر یہ اللہ کے دیوانے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے اور جو منزل مقصود متعین کر لیتے ہیں اسے پا لینے میں دیوانہ وار بڑھتے ہی جاتے ہیں ان کے راستے میں دیواریں کھڑی کی جاتی ہیں،کانٹے بچھائے جاتے ہیں مگر وہ اپنی دھن میں مست کسی رکاوٹ سے رکتے نہیں۔ثاقب بھائی ان کی حالت یوں بیان کرتے ہیں۔

دیوانے بھلا کب رکتے ہیں رستے میں کھڑی دیواروں سے
ہم ہنستے کھیلتے گزریں گے طوفانوں سے منج دھاروں سے

پھرایک اور جگہ فرماتے ہیں:

انہی کی راہ میں بچھایا کرتے ہیں خار اکثر زمانے والے
جولوگ ہیں تپتے ریگزاروں میں لالہ وگل کھلانے والے

الغرض یہ دیوانگی اور یہ جنون ایک ایسا قابل تعریف جذبہ ہے جسے مأ مورزمانے نے بھی مختلف مقامات پر تاریخی الفاظ میں بیان فرمایا ہے مثلاً فرمایا کہ

اے جنوں کچھ کام کر بیکار ہیں عقلوں کے وار

آج کی نشست میں چند ایک مجنونوں کے جنون کی وارداتوں کا ذکر کروں گا۔مجنون بھی وہ جن کے قدموں میں جان نچھاور کرنا عین سعادت ہے اور دیوانگی کے قصے بھی ایسے جن سے روح کو بالیدگی اور ایمان کو نور نصیب ہوتا ہے اپنے محبوب کی راہ میں وہ ایسے فنا ہو جاتے ہیں کہ وہ نام نہاد ایمان کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے اور اس کفر کو ترجیح دیتے ہیں جو انہیں محبوب ازلی کا دیدار کرادے۔چنانچہ اپنا اور واعظ کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ کبھی یوں بھی کہہ دیتے ہیں۔

مجھ پہ اے واعظ نظر کی یار نے تجھ پر نہ کی
حیف اس ایماں پہ جس سے کفر بہتر لاکھ بار

وہ کشتی دین کو ساحل پر پہنچانے کی تمنا رکھتے ہیں اور اس کے لئے بھی جنون کے ساتھ ساتھ اللہ قادر کے لطف و کرم کا ہی سہارا ڈھونڈتے ہیں وہ جانتے ہیں کسی بنئے کا حسابی جمع خرچ اس طوفان سے نہیں نکالے گا بلکہ جو اس طوفان میں غرق ہونے کے لئے تیار نہیں وہ اللہ کے لطف و کرم کو جذب نہیں کر سکتا اور اس کشتی کو پار نہیں لگا سکتا اور برملا اس کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مجھ کو دے اک فوق عادت اے خدا جوش و تپش
جس سے ہو جاؤں میں غم میں دیں کے اک دیوانہ وار

غرض یہ دیوانگی کا اک نشان ہے مگر عاشقوں کے بغیر اسے کوئی نہیں سمجھ سکتا آج میں اس دیوانگی اور جذبہ جنون کے چند مناظر قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔



رئیس الاطباء حضرت مولانا نورالدین مطب میں بیٹھے ہوئے ہیں اپنے آقا کا دلی سے ایک تار ملتا ہے کہ فوراً دلی پہنچ جاویں۔ اب عقل کہتی ہے کہ گھر جاؤ کپڑوں کا جوڑا ساتھ لے لو گھر والوں کو سفر پر جانے کا بتا دو۔ سفر خرچ پلے باندھو اور فوراً روانہ ہو جاؤ مگر جنون (عشق فراواں) میں تو کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے فوراً اُٹھے جوتے گھسیٹتے ہوئے پاؤں میں ڈالتے چلتے چلتے پگڑی باندھتے جاتے ہیں جیب میں ایک پیسہ نہیں کسی نے پوچھا تو فرمایا حضرت صاحب کا حکم ہے فوراً آؤ بس میں چل پڑا ہوں لفظ فوراً کے معنوں کی لغات ہی بدل کر رکھ دی۔ اللہ پر توکل کامل ہے۔ بٹالہ پہنچتے ہیں تو گاڑی کے چلنے میں کچھ تاخیر ہے کوئی آدمی دوڑتا ہوا آیا اور التجا کی کہ میری بیوی کو مہربانی فرما کر دیکھ لیں فرمایا کہیں نہیں جا سکتا کہ مجھے فوراً دہلی پہنچنے کا حکم ہے اس نے عرض کیا کہ حضرت صاحب گاڑی جانے میں آدھ گھنٹے کی تاخیر ہے میرا گھر پاس ہی ہے دس پندرہ منٹ میں واپس آ جاتے ہیں۔ بیمار کو دیکھا الٹے پاؤں واپس آئے تو اس شخص نے دہلی کا ٹکٹ اور کچھ رقم آپ کی جیب میں ڈالی۔ آقا حکم دے اور غلام کیسے اس کی تعمیل کرے یہ سبق کوئی ''حضرت نورالدین'' سے ہی سیکھے۔

اس واقعہ سے اخلاق عالیہ اور بلند پایہ اطاعت شعاری اور توکل علی اللہ کا ایک ایسا اسوہ ہمارے سامنے آتا ہے جس کی مثال کہیں قرون اولیٰ میں ہی ملے گی۔

1884ء میں ریاست کشمیر کے وزیراعظم کے ذریعہ ایک اشتہار ہاتھ لگا تو قادیان پہنچے چنانچہ اس وقت حضرت مسیح موعودؑ سیڑھیوں سے اترے تو فرماتے ہیں۔ میں نے دیکھتے ہی دل میں کہا کہ یہی مرزا ہے اور اس پر میں سارا ہی قربان ہو جاؤں۔

حضور نے فرمایا:

امید ہے کہ آپ جلد واپس آ جاویں گے حالانکہ میں ملازم تھا اور بیعت وغیرہ کا سلسلہ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ پھر میں آ گیا اور ایسا آیا کہ

یہیں کا ہو رہا۔ ایک بار حکم ہوا بھیرہ کا خیال ہی ترک کر دیں اور حضرت نور الدین فرماتے ہیں کہ

پھر اس کے بعد بھیرہ کا خیال دل میں کبھی بھول کر بھی نہ گزرا۔ دنیا میں عشق و وارفتگی کے کئی قصے سنے ہیں مگر ایسا نہ کوئی محب دیکھا نہ کوئی محبوب نہ کوئی عاشق نہ کوئی معشوق بلکہ یہاں تو جنوں نے یہ حال کر دیا تھا کہ عاشق معشوق بھی ہے اور معشوق عاشق بھی ہے۔ من و تو کا تو فرق یکسر مٹ چکا ہے۔ سلطان القلم ہی اس حالت کو بیان کر سکتے ہیں فرمایا:

''وہ ہر ایک امر میں میری اس طرح پیروی کرتا ہے جیسے نبض کی حرکت تنفس کی حرکت کی پیروی کرتی ہے''۔

اس قسم کے جنون کا ایک لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ ہر شے اپنے محبوب کے قدموں میں رکھ دیتے ہیں اور اپنے پاس کچھ بھی نہ رکھنے میں ہی راحت محسوس کرتے ہیں اور پھر بھی یہ احساس رہتا ہے۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

سیدنا نور الدین کی حالت عشق و جنون کا نظارہ آپ کے اپنے الفاظ میں کیجئے۔

''خاکسار بالکل نابکار اور خاکساری کے ساتھ نہایت ہی شرمسار بحضور حضرت مسیح الزماں عرض پرداز اس خادم با اخلاص اور دلی مرید کا جو کچھ ہے تمام آپ ہی کا ہے''۔

زن و فرزند و روپیہ آبرو و جان

میں جانتا ہوں کہ حضرت مولانا نور الدین نے کبھی شعر کہے مگر عشق و جنون ہر ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے تاریخ بتاتی ہے کہ آپ نے پچیس اشعار پر مشتمل آقا کے مداح میں عربی قصیدہ بھی لکھا۔

ادھر عاشق کا یہ حال تھا ادھر معشوق بھی وہ جو قدر دانی اور مردشناسی میں یکتا اور تنہا تھا۔ فرماتے ہیں:

''میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اعلیٰ درجہ کا (صدیق) دیا۔ جو راست باز اور جلیل القدر فاضل ہے اور باریک بین اور نکتہ رس اللہ تعالیٰ کا مجاہدہ کرنے والا اور کمال اخلاص سے اس کے لئے ایسی اعلیٰ درجہ کی محبت رکھنے والا کہ کوئی محب اس سے سبقت نہیں لے گیا''۔

گویا دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی شمع پروانے کی محبت کے لئے روشن تھی اور پروانہ شمع پر جان نچھاور کرنے کے لئے بے تاب تھا مگر نہ یہ شمع بجھنے والی تھی نہ یہ پروانہ ختم ہونے والا بلکہ وہ دونوں آج بھی زندہ ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گے۔

عشق و وفا کی داستانوں سے تو ہماری تاریخ بھری پڑی ہے میں چند کا ذکر ہی یہاں کر سکوں گا۔ اس سے میری غرض یہ ہے کہ ظاہر کروں کہ یہ دیوانگی وہ انمول جذبہ ہے جو بڑی بڑی مہمات سر کر لیتا ہے۔ جبکہ فرزانگی اس کے مقابل میں پانی بھرتی نظر آتی ہے۔

ماموریں من اللہ کو تو بطور خاص دیوانوں کی دیوانگی سے کام ہوتا ہے ہر طرف سے طعن و تشنیع اور طنز و استہزا کے تیر سینوں پر لینا اور اُف نہ کرنا یہ فرزانوں کا تو کام نہیں ہے۔ سچے عشق اور حقیقی لگن ہی کا نام دیوانگی ہے۔ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے ایک چھوٹے سے شعر میں علم و معرفت کا گویا سمندر بند کر دیا۔ فرماتے ہیں۔

یہ دیوانگی عشق کا ہے نشان
نہ سمجھے کوئی اس کو جز عاشقان

لیکن فارسی کے ایک شعر میں تو کئی سربستہ راز چند لفظوں میں سمجھا دیئے اور یہ بھی بتا دیا کہ دیوانہ کیا کیا کرتا ہے اور یہ بھی واضح فرما دیا کہ اس کے ساتھ پھر اللہ تعالیٰ کا کیا سلوک ہوتا ہے چنانچہ فرمایا۔

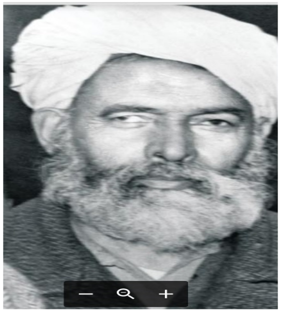
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی
دیوانہ تو ہر دو جہاں راچہ کند

خدایا تو اپنے دیوانے کو دونوں جہانوں کی نعمتیں ارزانی فرما دیتا ہے مگر تیرے ایک دیوانے نے دونوں جہانوں کی نعماء کو کیا کرنا ہے اسے تو تُو چاہئے۔ اوپر میں نے ایک دیوانے کا مختصر ذکر کیا ہے میرے شعور کا بیان 1944ء سے شروع ہوتا ہے۔ جب میں حصول تعلیم کے لئے اس گمنام بستی میں گیا جس میں ایک شخص ظاہر ہوا۔ جس کے ظاہر ہوتے ہی خزاں کا درد بہار میں تبدیل ہو گیا اور عنایات یار سے بادنسیم کے جھونکے آنے لگے۔ ہاں وہی جس کے آنے کے ساتھ سارے وہ درخت جن میں زندگی کی کچھ بھی رمق باقی تھی وہ سب ہرے ہو گئے اور ان میں اس قدر پھل پڑا کہ وہ میووں سے لد گئے وہاں لوگ دیکھے تو بدلے بدلے سے گویا زمینی ہیں ہی نہیں کوئی آسمانی مخلوق اتر آئی ہے۔

عبادت کے لئے گئے تو ایک ایک دیوانے کو اپنے محبوب سے راز و نیاز کرتے دیکھا۔ تو محسوس کیا کہ یہ اس دنیا سے اٹھ کر کہیں اور جا بسے ہیں۔ ہم اپنی کم فہمی کے باعث سمجھ نہیں سکتے تھے کہ یہ دو رکعت کتنے عرصے میں ختم ہو گی۔

مچھلی پانی میں تیرتی نہ کبھی تھکتی یا ہارتی ہے نہ یہ اپنے آسمانی آقا کے قدموں سے چمٹے ہوئے لقاء کے آب حیات سے سیراب ہو کر اس کیفیت سے باہر نکلنے کا نام لیتے ہیں لقا اور فنا کی اصطلاحات اور (ان کے) پوشیدہ مفہوم کو اپنے عمل سے واضح کر رہے تھے۔

مگر یہ دیوانے تو اس ایک ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بے خود ہو چکے تھے۔ جس نے کہا تھا اور خدا شاہد ہے سچ کہا تھا۔ کہ ہم تو بستے ہیں فلک پر اس زمین کو کیا کریں پھر وہ اکیلا ہی فلک پر نہیں گیا اس نے جن کا ہاتھ تھاما انہوں نے بھی فلک پر ہی بسیرا کر لیا تھا۔ ان میں سے ایک ''حضرت مولوی شیر علی'' تھے رانجھا قوم مولد ادرحماں ضلع سرگودھا۔



یاد رہے کہ رانجھا قوم ضلع سرگودھا کے پرانے بندوبستی ریکارڈ کے مطابق MAIN TRIBE ہے۔ یہ گویا اس ضلع کے اصل ''چوہدری'' ہیں۔انہیں ہم دیکھتے تھے کہ ہمیشہ صاف ستھرا لباس زیب تن کرتے سر پر سفید براق پگڑی ہوتی۔دیوانگی ہوتو چودھراھٹ کیسی۔یہ رانجھا قوم کا چودھری عید کے موقع پر باہر باغ کے میدان میں اپنے محبوب کے نعلین کو تلاش کر رہا ہے اور خوشی سے جھوم رہا ہے کہ اسے مقصود ہاتھ آ گیا۔عید کے دن کی اجلی پگڑی کے شملے سے اپنے معشوق کے جوتوں کو صاف کر رہا ہے۔

وہ نمود سے ہمیشہ نفور رہا یہ کام بھی چوری چھپے کر رہا تھا مگر کسی کی نگاہ پڑ گئی تو تاریخ میں یہ بظاہر چھوٹا سا واقعہ آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہاتھ لگا۔بھلا یہ کام کسی فرزانے کے کرنے کا ہے یہ دیوانے کا ہی کام تھا۔اے دیوانے تیری بظاہر چھوٹی سی مجنونانہ حرکت نے کتاب عشق میں ایک زریں باب کا اضافہ کر دیا اے عاشق صادق تجھ پر سلام پھر اسی انیسویں صدی کے گریجوایٹ کو اپنے محبوب ومعشوق کی وفات کے بعد بیت اقصیٰ کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔کہ حضرت ممدوح ایک روز ایک ستون کے ساتھ سہارا سے کھڑے دیکھے تھے وہیں یہ محب صادق اسی ستون کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا ہے اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو برس رہے ہیں۔یہ کیا ماجرا تھا۔بس معشوق کی یاد نے تڑپا دیا۔سچ ہے کہ عشق کے قوانین بھی نرالے ہیں اور اس کے تقاضے بھی انوکھے۔تنہا عقل کی تو ان تک پہنچ ہی نہیں ہے۔

میں نے ان جاگتی آنکھوں سے وہ روشنی کا مینار چودہ صدیوں کے انتظار کے بعد آنے والا معشوق تو نہیں دیکھا مگر عاشقوں کو کئی سال گزر جانے کے بعد بھی بسمل کی مانند تڑپتے دیکھا۔اور یہ ایک دو یا چند یا دس یا بیس نہیں تھے اس زمانے میں یہ آسمان کے ستاروں کی طرح گنے نہیں جاتے تھے اور آسمان روحانیت پر انہوں نے کہکشاں کا سا سماں پیدا کر دیا تھا۔اب ایک دیوانے کے اس واقعے کی بھلا کوئی عقلی دلیل یا توجیہہ ہوسکتی ہے؟

کسی کوچے سے ماموں زمانہ کا ایک یہ دیوانہ گزر رہا ہے ایک کم فہم بڑھیا اپنی آتش غضب اور تعصب سے مغلوب ہو کر چھت پر چڑھ جاتی ہے اور اس پر کوڑا کرکٹ پھینکتی ہے۔بجائے وہاں تیزی سے آگے نکل جانے کے وہی اس کے قدم رک جاتے ہیں ''مائی ہور پا مائی ہور پا'' کی صدائیں لگاتا ہے۔وہ بڑھیا بھی حیرت میں ڈوب تو گئی ہوگی کہ اسے میری بدتمیزی سے دکھ تو نہیں سکھ پہنچا ہے؟

پھر اسی دیوانے کو بدبختوں نے زمین پر گرا لیا اور اس کے منہ میں گوبر وغیرہ بھرنا شروع کر دیا وہ فرزانہ ہوتا تو نہ جانے اس کا کیا حال ہوتا۔چیختا چلاتا اور شاید ہاتھ جوڑتا کہ مجھے معاف کر دو۔مگر دیوانگی کی حدیں تو وہاں سے شروع ہوتی ہیں جہاں عقل ہار کر رک جاتی ہے۔ جوں جوں گند اس کے منہ میں ڈالتے ہیں وہ برابر کہتا جا رہا ہے۔

''اوئے برھانیاں ایہہ نعمتاں فیر کتھوں''

''اوئے برھانیاں تیرے ایڈے نصیب''

اے حضرت برہان الدین جہلمی تجھ پر سلام عشق الٰہی نے تیرے منہ کے ذائقے تک بدل ڈالے تھے اور تو صبر و استقلال کی چٹان نکلا گویا دونوں جہان کی نعمتیں اسے عطا ہو رہی تھیں ہاں ہاں یہ وہی نعمتیں تھیں جس کی بشارت اس کے پیشوا نے دی تھی۔

یہاں پہنچ کر مجھے پھر یہ خطرہ محسوس ہوا کہ میں نے جس دیوانگی کا ذکر چھیڑا ہے اسے کہیں حمق یا بیوقوفی سے گڈ مڈ نہ کر دیا جائے۔

اوّل تو حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ مومن کی فراست سے بچو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے یہی کافی ہے۔ اسی فرمان نبوی کی تشریح میں حضرت مصلح موعود نے فرمایا کہ ایمان اور بیوقوفی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے دیوانگی کا منبع و مصدر عقل اور حکمت اور دانش ہے جو اللہ والوں کے لئے عطیہ خداوندی ہے۔ جو ''ابوالحکم'' کی محرومی کی وجہ سے اسے ''ابوجہل'' بنا گئی۔ مگر حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی دانش و فراست نے رسول اللہ سے کسی قسم کی دلیل سننا بھی گوارا نہ کیا اور فوراً **امنا و صدقنا** کہہ دیا اور وہ ''صدیق'' کے منصب پر سرفراز ہو گئے۔

یہ تو ایک جملہ معترضہ ہی تھا بات ہو رہی تھی۔ دیوانگی اور اس کے نتائج کی۔ ایک دیوانہ حسب حکم حضرت مولانا نورالدین خلیفہ اوّل جماعتی فرائض کی انجام دہی کے لئے لاہور میں مقیم ہے اس کا بیٹا عمر تین سال نمونیہ میں مبتلا ہوا اور اس کی حالت تشویش ناک ہو گئی۔ اس کی اہلیہ نے بچشم اشکبار بچے کی مایوس کن حالت کے پیش نظر اپنے خاوند سے کہا۔ کہ ڈاکٹر محمد حسین صاحب یا ڈاکٹر یعقوب بیگ صاحب کو بلا کر فوراً دکھائیں۔ رات کا وقت ہے اور سخت سردی پڑ رہی ہے ادھر بچے کا سانس اکھڑ رہا ہے وہ دیوانہ درگاہ الٰہی کیسے اتنی دور جائے اور پھر ڈاکٹر صاحبان کو ایسے وقت میں کیونکر تکلیف دے اور وہ کیسے مریض کے پاس پہنچیں جب اہلیہ نے پھر اصرار کیا تو اس دیوانے کی زبانی ہی اگلی داستان سنئے:۔

''میں نے کہا کہ اس وقت ایک ڈاکٹر ہیں جو بیدار ہیں اور زیادہ قریب بھی ہیں ان سے عرض کرتا ہوں۔ انہوں نے مہربانی کی تو ممکن ہے بچے کو آرام آ جائے۔ میری بیوی نے پوچھا وہ کون ڈاکٹر ہیں۔ میں نے کہا وہ اللہ تعالیٰ کی خیرالراحمین اور واھب الشفاء ہستی ہیں۔ جو سب سے زیادہ قریب قادر و مطلق اور الراحمین ہیں اور کن کے حکم سے بچے کو بچا سکتے ہیں'' اس کے بعد میں وضو کر کے جائے نماز پر کھڑا ہو گیا دسمبر کا مہینہ اور سخت سردی پڑ رہی تھی۔ بچے کی حالت نزع کی تھی۔ میری روح جوش رقت سے گداز ہو کر آستانہ الٰہی پر بار بار جھکنے لگی اور نہایت عجز و انکسار اور تضرع سے بارگاہ اقدس میں طالب شفاء ہوئی۔

سلام پھیر کر نماز سے ابھی فارغ بھی نہ ہوا تھا کہ بچے کی حالت سنبھل گئی وہ چار پائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا...... پھر کھیلتا کھیلتا تھوڑی دیر میں سو گیا جب صبح اٹھا بیماری کا نام و نشان نہ تھا۔

اس واقعہ سے نامور ''دیوانے'' کے قرب الٰہی اور توکل الی اللہ اور قبولیت دعا پر یقین کے جو راز کھلتے ہیں وہ بھلا کسی تبصرے کے محتاج ہیں۔

عقل کی مانتے تو ڈاکٹروں کے گھروں کو ڈھونڈتے۔ ان کے پیچھے دوڑتے پھرتے۔ نہ معلوم آدھی رات کو کوئی ڈاکٹر ملتا نہ ملتا اور چونکہ بچہ قریب المرگ تھا اس لئے دور کے ڈاکٹر کی تلاش بے سود تھی۔ وہی شفاء بخش ''طبیب ازلی'' کام آیا۔ جو حبل ورید سے بھی قریب تر تھا۔ اور جس کے ''کن'' کہنے سے مرض رفع ہوگئی اور صحت لوٹ آئی۔ مگر عام حالات میں وسائل سے کام لینے کا حکم ہے اور تقدیر الٰہی کے ماتحت تدبیر کی راہ اختیار کرنا سنت نبویؐ ہے۔ اور تدبیر بھی ضروری ہے جو تقدیر الٰہی کی گویا ایک شاخ ہی ہے۔ مگر ایسے آڑے وقت میں جب کسی عادی وسیلے کے اختیار کرنے کی گنجائش ہی نہ ہو صرف تقدیر کے در پر بھی دستک دینے سے ہی ''فیکون'' کا نظارہ قادر کریم دکھا دیتا ہے۔ قرون اولیٰ میں بھی اور پھر گذشتہ 120 سالوں میں تقدیر الٰہی کے روح پرور نظارے تاریخ کے صفحات کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ یہ شخص عشق الٰہی سے مست اور اسی مے کے جام پر جام لنڈھایا کرتا تھا۔ جس کے متعلق ہمارے اور اس کے آقا نے کہا تھا ''وہی مے اس کو ساقی نے پلا دی'' ''وہی مے'' سے واضح اشارہ 1400 سالہ پرانی مے سے ہے اور اسی سے یہ بے خودی نصیب ہوتی ہے۔ جو سارے دنیاوی علائق کو چھوڑ کر اسی ایک در کے بھکاری بن جاتے ہیں اور وہ کہتے ہیں۔

ترے در کی گدائی سے بڑا ہے کون سا درجہ
مجھے تو بادشاہت بھی ملے تو میں نہ لوں ساقی

(المصلح موعود)

یہ دیوانہ اپنی مثال آپ ہی تھا وہ اپنا تعارف یوں کراتا ہے۔

میں ہاں غلام رسول دی ذات دا
راجیکے پنڈ میرا ضلع گجرات دا

دیوانوں کی یہ فہرست جو میرے علم میں اور میری یادداشت میں محفوظ ہے وہ بھی بہت طویل ہے میں ان اللہ والوں کے نہاں خانوں میں جو تلاطم برپا رہتا تھا اس کو کیا جانوں اس کی حقیقت تو ان کا علیم وخبیر مالک ہی جانتا ہے۔ ہم تو جب کہیں جام چھلک پڑتا تو اس کے چھینٹے ہی دیکھ پائے۔ ورنہ وہ اپنے دل کی حالت ظاہر ہی کب کرتے تھے۔ 1903ء کا دور ہے ایک شخص جو دورافتادہ کوردیہہ کا رہنے والا ہے معمولی پڑھا لکھا اس کے دادا نے جو حدیث شریف کے عالم تھے۔ 1894ء میں کسوف وخسوف کے علامات ظاہر ہونے پر حضرت رسولؐ عربی کی پیشگوئی کا ذکر کیا تھا۔ جو اس نوعمر لڑکے نے سنا ہوا تھا۔ 1903ء میں اسے کسی طرح اطلاع ملی اپنے والد سے سفر

کی اجازت مانگی اور کچھ زادِ راہ بھی۔ مگر والد نے جو بڑے سخت گیر اور بارعب زمیندار ہونے کے علاوہ عالم دین اور حافظ قرآن تھے۔ ایک سجادہ نشین کا نام لے کر ان کی بیعت کرنے کا حکم دیا۔ یہ چپ رہے پیدل چلتے چلتے ایک ریلوے اسٹیشن جس کا نام ''مومن'' ہے وہاں سے ریل میں سوار ہو کر لاہور اور امرتسر اور بٹالہ پہنچ کر پا پیادہ اپنے شہر تمنا جا پہنچے۔ ایمان کے اس متلاشی کے سفر کا آغاز بھی ریلوے اسٹیشن ''مومن'' سے ہوا یہ بھی ایک روح پرور اتفاق ہے اور نیک فال بھی۔

اور یہ خوش نصیب مسافر میاں عبدالعزیز تھا جو اپنے مقصد کو پا گیا۔ نور بصیرت نے راہنمائی کی۔ ہاتھ میں ہاتھ کیا دیا کہ اپنا کچھ بھی باقی نہ رہا۔ بتاتے تھے عقل نے گمراہ کرنے کی دلیلیں دیں۔ والد صاحب نمبردار ہیں۔ بڑی وسیع جائیداد کے مالک ہیں۔ ان کی حکم عدولی کر رہا ہوں گھر سے نکال دیں گے۔ جائیداد سے عاق کر دیں گے۔ بڑے سخت گیر ہیں۔ ہنر مجھے کوئی نہیں آتا کیا کروں گا مگر دیوانگی غالب آئی عقل کی نہ مانی اور وہی کیا جو کسی نے کہا ہے۔

عقل کی سنئے دل کا کہا کیجئے

کسی شے کی پرواہ نہیں واپس آئے کچھ چھپایا نہیں۔ اعلان عام اور اس پر والد کی سخت برہمی گاؤں کا پہلا نوجوان جس نے یہ ''جسارت'' کی تھی۔ بائیکاٹ کر دیا اپنوں نے بھی اور غیروں نے بھی مگر ایسے شخص کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا کہ جس کی روحانیت کی رو بجلی کے کرنٹ کی طرح جسم و جان میں سرایت کر چکی تھی۔ جس نے ہر قسم کے درد و الم اور نفع و نقصان سے بے پرواہ کر دیا تھا اور وارفتگی کا اور ہی عالم تھا۔ ایسی ایک متاع بے بہا ہاتھ لگ چکی تھی۔ جس کے مقابل دنیا کی جائیدادوں اور آسائشوں سے محرومی کا خوف دل کے قریب بھی نہیں پھٹک سکا۔ ایسے ہی دیوانوں کے متعلق حضرت مصلح موعود نے فرمایا تھا۔

تعریف کے قابل ہیں یا رب تیرے دیوانے

ہزاروں سال سے مدفون خزانے پر جس کے ہاتھ پہنچ گئے اسے اس دنیا کی جائیدادوں سے محرومی کا بھلا کیا غم ہوتا۔ 1926ء میں مجھے اس دیوانے سے یہ نعمت ورثے میں ملی۔ ایسا شخص جوان حالات میں سختیاں جھیل کر 1903ء میں اس ساقی کے ہاتھوں جام مے پی کر مست ہو گیا تھا اسے میں جذبہ ممنونیت سے مغلوب ہو کر ''سلطان'' کہتا ہوں۔ یہ مجھے احساس ہے کہ ''پدرم سلطان بود'' طعن و طنز کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مگر قارئین کرام انصاف کریں۔ باوجود ان پڑھ ہونے کے اور باوجود اپنے اور پرائیوں کے ہاتھوں نشانہ ستم بننے کے اللہ کی دی ہوئی توفیق اور راہنمائی سے چٹان بن کر جوڈٹا رہا اس کا ایمان و ایقان کبھی متزلزل نہ ہوا اس عالی ظرف دیوانے کو میں ''سلطان'' کیوں نہ کہوں ہاں اس کا جانشین ہونا تبھی میرے کام آئے گا جب پوری استطاعت اور عزم کے ساتھ اس کے نقش قدم پر چلتا رہوں اللہ اس کی توفیق اپنے فضل سے بخشے۔

یہ دیوانہ قریہ بہ قریہ گھوڑے پر سوار ہو کر گھومتا پھرتا تھا اور دعوت الی اللہ کا جنون اس کے سر پر ایسا سوار تھا کہ اسے سر پیر کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ مگر اس نے اس مقدس ہاتھ میں اپنا ہاتھ کیا دیا کہ گویا علم وحکمت کے در اس کے لئے وا ہو گئے۔ پھر اس جنون کا ایک بہت بڑا تقاضا غیرت ایمانی بھی ہے جس سے وہ سرشار رہتا تھا۔ ایک بدنصیب رئیس نے اس کے راہنما اور پیشوا کے حق میں بغیر کسی قسم کے اشتعال کے سخت بدزبانی کی اس کا شیشہ دل ٹوٹ گیا جوں جوں منع کرتا وہ گندہ دھنی میں بڑھتا ہی گیا آخر اس کے ہاں سے زخمی دل لے کر نکل گئے اپنے غیر احمدی عزیزوں کے ہاں چلے گئے مگر اس غیرت مند دیوانے کے دل پر بہت گہرا اور کاری زخم آ چکا تھا ساری رات کچھ کھایا نہ پیا اور اسی ''اشعث و اغبر'' کے منہ سے بے اختیاری میں ایسی بات نکلی جو اسی کے کہنے کے عین مطابق اس بدتمیز انسان کی ساتویں ہی دن ایسی ہلاکت پر منتج ہوئی جو دردناک بھی تھی اور قہر الٰہی کا تابندہ نشان بن گئی اور اس نشان عبرت کے گواہ اسی قصبے کے غیر از جماعت لوگ ابھی موجود ہیں۔

آج ہم جو کچھ ہیں اس بزرگ رفیق کی دعاؤں اور تربیت اور روحانی ورثے کے صدقے ہیں اور ہمیں خود تو عقل و دانش کا دعویٰ ہی نہیں ہے۔

اپنے اسلاف کے کارناموں اور ان کے ایثار و جنون کا تصور کر کے بھی بحر ندامت میں ڈوب جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان دیوانوں اور ان کے پیشوا اور مقتداء کے طفیل (جن میں سے بعض کا ذکر اوپر بطور مشتے نمونہ از خروارے کیا ہے) ہمیں بھی اپنی رضوان کی راہوں پر چلنے کی سعادت بخشے۔ آمین۔

(روزنامہ الفضل 7 رجون 2001ء صفحہ 3 تا 4،6)

سفرنامہ یورپ وامریکہ

حضور انور ایدہ اللہ سے یادگار ملاقات اور یورپ اور امریکہ کی پرلطف سیر

اس سال اپریل مئی میں ہی یہ اعلان ہو گیا تھا کہ انٹرنیشنل جلسہ سالانہ لندن کی بجائے جرمنی میں ہوگا۔ جلسہ سالانہ کے مقام انعقاد کی یہ تبدیلی بعض ملکی مصالح پر تھی جسے جماعت جرمنی نے اپنی خوش نصیبی جانا اور فوراً اپنے ہاں جلسہ منعقد کرنے اور اس کے سارے انتظامات کرنے کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے حضرت صاحب کی خدمت میں مودبانہ پیشکش کر دی کہ جلسہ سالانہ جرمنی میں کیا جائے جو قبول ہوئی۔

ہر چند کہ مجھے بعض موانع درپیش تھے مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ویزا جات کے حصول اور جلسہ سالانہ میں شمولیت کا فیصلہ کرلیا۔ دل کے دلائل عقلی دلائل سے مضبوط تھے۔ کہ ہوش سنبھالا تو قادیان میں جلسہ سالانہ میں 1946ء تک اور پھر لاہور میں اور پھر ربوہ میں 1983ء تک ایک بھی ناغہ نہ ہوا اس کے بعد حاسدوں نے جب دیکھا کہ دسمبر 1891ء میں جو صرف 75 خوش نصیب افراد شریک جلسہ اوّل ہوئے وہ اب 2 لاکھ 75 ہزار ہو گئے ہیں تو حسد میں جل بھن گئے۔ یہ ترقیات وہ کب دیکھ سکتے تھے۔

اعلان کیا کہ ربوہ میں جلسہ نہیں ہونے دیں گے مگر دیوانے بھلا کب رکتے ہیں رستے میں کھڑی دیواروں سے۔ ہجرت کے بعد امام وقت نے جلسہ لندن میں کیا تو یہ نابکار اس میں بھی حاضر۔

گزشتہ برس بیسویں صدی کا آخری روحانی اجتماع تھا۔ اس میں خلاف توقعات محض اللہ کے فضل کے سہارے شمولیت نصیب ہوئی حالانکہ ویزہ دینے والے دفاتر نے بھی روایتی بخل سے کام لیا تھا۔ اب اکیسویں صدی کا یہ پہلا جلسہ تھا۔ اس میں شرکت بھی ایک سعادت عظمیٰ ہے۔

پھر خدا جانے کہ کب آویں یہ دن اور یہ بہار

صیاد اور پھر ساتھ حاسد بھی ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا۔ اس نے سمجھا کہ یہ شہد کی مکھیاں وہ مشروب تیار کر رہی ہیں۔ جو لوگوں کے لئے شفاء ہے اور اس سے مردے زندہ ہوتے جا رہے ہیں۔ شہد کے چھتے کو ہی ختم کر دینا چاہیئے۔ مگر یہ وہ ''نحل'' تھیں جنہیں وحی الٰہی کے ذریعہ مختلف پہاڑوں اور وادیوں میں پھولوں کا رس چوس کر شہد تیار کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔ انسانی ہاتھوں سے وہ اس روحانی کاروبار کو کیونکر ختم کر سکتے تھے۔ ایک جگہ سے انہیں حیات بخش مشروب بنانے سے روکو گے تو وہ دوسری جگہ اس کام میں مشغول ہو جائے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اب قریہ قریہ اور ملک بہ ملک جلسہ ہائے سالانہ منعقد ہو رہے ہیں اور ایک جگہ جلسہ رکوا کر بغلیں بجانے سے فائدہ؟ یہ دنیا بھر کی اقوام کے لئے مسلسل شہد بنانے اور شفاء للناس غذا تیار کرنے میں مصروف ہیں چنانچہ میں نے سوچا ساری بیماریوں کی شفاء جو کلام الٰہی میں مذکور ہے اسے ہی چکھوا اور یہی میری دل کی بیماری کے لئے بھی تریاق ہے اور آگے چل کر عرض کروں گا کہ شکر خدائے عزوجل میری یہ تدبیر کامیاب بھی ہوگی۔

چنانچہ 10 رجولائی کی شام لندن پہنچا۔ 12 رجولائی کو حضرت صاحب نے از راہ بندہ نوازی ملاقات کا وقت عطا فرمایا۔ میں جو مدتوں سے دل ہی دل میں ملاقات کے وقت گزارش کرنے کے لئے مضمون بنا تا رہا تھا غلام کو جب ستایا جائے اور اسے زخم لگیں تو وہ اپنے آقا کے پاس ہی تو فریاد کرتا ہے اور کہاں کرے سب سے ضروری التماس تو یہ کرنا چاہتا تھا کہ بیسویں صدی کے آغاز میں 1901ء سے 1925ء تک ربع صدی کے دوران پانچ بے گناہوں کا خون بہایا گیا تھا اور جب وہ صدی اختتام کو پہنچی اور اس کتاب صدی کا آخری ورق الٹایا

جانیوالا تھا تو 10 دنوں کے اندر 10 معصوموں کے خون سے وہ ورق بھی خون آلود کر دیا گیا۔ یہ تو صرف بیسویں صدی کے اوائل اور آخری 10 دنوں کی خونچکاں داستان ہے ورنہ تو مذہب کی تاریخ بے گناہ لوگوں کے لہو سے لالہ زار بنی ہوئی ہے۔ جس کی تفصیل حضرت صاحب کی کتاب ''مذہب کے نام پر خون'' میں پڑھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کہ صریح ظلم اور دہشت گردی اور قتل و غارت اور وہ بھی دین کے مقدس نام پر۔

میں ذکر کر رہا تھا کہ کئی باتیں جو عندالملاقات کرنے کی تیاریاں ذہن میں کی ہوئی تھیں مگر 12 / جولائی 8 بجے شام جب اس بارگاہ میں حاضر ہوا تو نور کی ایک جھلک دیکھتے ہی حالت غیر ہو گئی کہاں گئے گزارشات کے تیار شدہ وہ مضمون اور وہ وارداتیں اور وہ داستانیں، اپنا سینہ جو داغدار ہو چکا تھا اور جب اس پر کوئی اندرونی یا بیرونی چوٹ لگتی تو اللہ سمیع و مجیب کے حضور چلا تا تھا اور حضرت صاحب سے دعا کرنے کا ارادہ کرنے سے زخموں کے مندمل ہونے کی امیدیں باندھتا تھا۔

مگر حضور نے اپنے غلام پر کرم فرمایا جو پوچھا جواب دے دیا اور بس اس زبان میں کہاں طاقت تھی واپسی پر اپنی اس بے بسی اور ناکامی پر افسوس تو ہوا مگر شاعر کے اس قول صادق سے میری کچھ تشفی ہوئی۔

بے زبانی ترجمان شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیش یاد کام آتی ہیں تقریریں کہیں

میں نے اس مرتبہ دور دور کے بہت سفر کئے مثلاً امریکہ کی متعدد ریاستوں میں گیا۔ کینیڈا کا ویزہ پاکستان سے حاصل نہ کیا تھا۔ مگر ایک مہربان نے خود ہمراہ جا کر چند منٹوں میں کینیڈا کا چھ ماہ کا ویزا دلایا اور اس مقولے کی صداقت پر مہر کر دی کہ ''سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے'' اللہ انہیں بہترین جزا دے۔

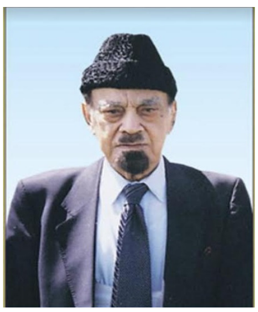
ویزا ملتے ہی میں ٹورانٹو کے لئے روانہ ہو گیا جو کہ اب وطن ثانی بن چکا ہے کہ میرے جگر کے ٹکڑوں نے اسی ملک کو اپنا نشیمن بنا لیا ہے۔ وہاں قیام کے دوران عزیزم خورشید غنی اور اسماء اور پیارے ارسلان کے ہمراہ نیاگرا فال دیکھنے گئے۔ اسے ایک عجوبہ روزگار کہتے ہیں۔ آبشاروں کا نظارہ کیا بونداباندی ہو رہی تھی اسی طرح یورپی ممالک میں بھی گیا مگر اپنا مستقل مستقر لندن ہی کو بنائے رکھا۔ جہاں گیا پھر پھرا کر لندن اپنے گھونسلے میں واپس پہنچ جاتا رہا کہ جس کو اللہ تعالیٰ کی تقدیر نے ایک مرکز کی حیثیت بخشی ہے۔ وہ ہی ہم سب کا مرکز ہے۔

کینیڈا میں 10 روز میرا قیام رہا۔ میری پوتی اسماء اور پوتا صفی وہاں رہتے ہیں۔ ایسے ہی محسوس ہوا جیسے گھر میں بیٹھے ہوں پھر وہاں عزیزم کرنل دلدار احمد صاحب اور کمانڈر چوہدری محمد اسلم صاحب کی محبت بھی حاصل رہی۔ ان کی کھلی بانہیں دور دراز ملک میں میرے

لئے ایک نعمت ثابت ہوئیں۔

برادرم سید ہدایت اللہ ہادی صاحب اور محترم بھائی حسن محمد عارف صاحب کی بے لوث محبتوں کو بھولنا تو ممکن ہی نہیں ہے کہ یہ میرے بس میں ہے ہی نہیں۔ یہ دو حضرات احمدیہ گزٹ کینیڈا کے اردو اور انگریزی کے ایڈیٹر ہیں۔ سید ہادی صاحب سے تو خط وکتابت جاری ہے۔اس میں بھی پہل انہوں نے ہی کی۔ اللہ انہیں اس کا اجر دے۔

افسوس کہ جناب نسیم مہدی صاحب کیلگری وغیرہ کے دورے پر جانے کی وجہ سے نہ مل سکے مگر فون پر اپنی حاضری میں نے جاتے ہی لگوادی تھی۔



صاحبزادہ مرزا مظفر احمد صاحب سے یادگار ملاقات

امریکہ جاؤں اور نبیرہ مسیح موعود صاحبزادہ مرزا مظفر احمد صاحب کی زیارت اور ملاقات سے مشرف نہ ہوں۔ یہ بہت بڑی محرومی ہوتی جو میری قوت برداشت سے باہر تھی۔ موصوف مجھ پر محض لِلّٰہ میری کسی خوبی یا استحقاق کے بغیر نصف صدی سے زائد عرصہ سے شفقت اور رأفت کا سلوک فرمارہے ہیں اس لئے یہ میری خطا سوء ادبی کی ذیل میں بھی آتی۔ وہ تو کریم ابن کریم ہیں کس باپ کے بیٹے ہیں، کس دادا کے پوتے ہیں۔ الطاف کریمانہ اور اوصاف حسنہ انہیں تو وراثت میں ودیعت ہوئے ہیں۔ میں بھلا کس شمار وقطار میں تھا۔ جو موردالتفات خسروانہ بنادیا گیا۔ یہ یکطرفہ عنایات کریمانہ کا تیز بہاؤ اس خانوادے کی روشن اور نورانی روایات ہی کا خاصہ ہیں۔ 29/ جولائی کو واشنگٹن ڈی سی پہنچ کر فون کیا تو معلوم ہوا کہ جماعتی طویل میٹنگ کی بطور امیر جماعت ہائے امریکہ صدارت فرمارہے ہیں۔ 5 گھنٹے کی مصروفیت کے بعد فارغ ہو پائے تو میں نے اپنے پوتے عزیز صفوان احمد کو گھر پر حاضری کے لئے جانے کو کہا۔ شام کو بارش ہورہی تھی۔ درِدولت پر حاضر ہوئے فوراً ڈرائنگ روم میں ہمیں بٹھایا گیا اور پھر اسی لمحے خود تشریف لائے۔ ملاقات سے سرفراز فرمایا اور کمال دلچسپی سے میری خیریت دریافت فرمانے کے علاوہ حضرت مرزا عبدالحق صاحب کی صحت وعافیت کی تفصیل سنی اور پھر فرمایا۔ کہ میں تمہارا کل سے انتظار کررہا ہوں مجھے کسی نے بتایا تھا۔ 28/ جولائی کو تم آرہے ہو اور کہ رات کا کھانا بھی میں نے تاخیر سے کھایا کہ شاید تم آرہے ہو۔ اکٹھے ڈنر کریں گے میں نے ادب سے وضاحت کی کہ میری 29/ جولائی کی ہی فلائیٹ تھی۔ 28 کو تو میں نے نہیں آنا تھا۔ پھر چونکہ آپ سارے دن کی مصروفیات کے باعث تھکے ہوئے تھے میں نے معذرت کی مگر بڑی دریا دلی سے مختلف موضوعات پر خوب کھل کر گفتگو فرماتے رہے۔ چائے اور انواع واقسام کے ماکولات سے ضیافت فرمائی مگر میں جو آپ کی شیریں بیانی میں محو تھا صرف ایک چائے کی پیالی وہ بھی تبرکاً نوش کی۔ نہ چاہا کہ کھانے پینے میں مصروف ہوکر اس گفتگو سے جو میرے لئے روح کی غذا تھی محروم ہوجاؤں۔ پھر کھانے کی دعوت پر بھی یہ کہہ کر

معذرت کر لی کہ لنچ بہت تاخیر سے ہوا تھا ابھی اشتہا نہیں ہے۔

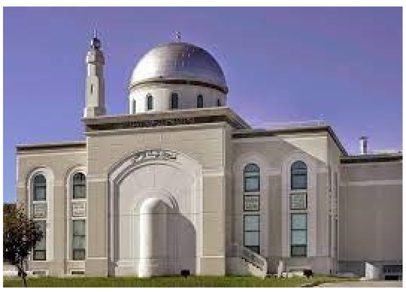
پھر از راہ کرم جماعت کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرانے کا عمدہ بندوبست کرنے کا ارشاد فرمایا اور امام صاحب واشنگٹن نے بتایا کہ تمہارا تعارف کراتے وقت مجھے فرمایا کہ ''میرے دوست اور صحافی ہیں'' میں صرف تین دن وہاں رہا۔ اس دوران ایم ٹی اے کے مینیجنگ ڈائریکٹر محترم بھائی منیر احمد صاحب اور مربی جناب سید شمشاد احمد صاحب نے جس قدر برادرانہ محبت کا سلوک روا رکھا اس کا بدلہ اتارنا تو میرے لئے ممکن نہیں لیکن چونکہ انہوں نے میرے ساتھ ٹوٹ کر محبت کی تھی اس لئے مجھے جب کبھی دعائے خاص کا موقعہ ملا ان کے لئے عاجزانہ دعائیں کرتا رہا کہ یہی کچھ میرے بس میں تھا۔ برگ سبز است تحفہ درویش، کچھ عرصہ قبل کسی ملکی میگزین میں صاحبزادہ میرزا مظفر احمد صاحب کے بارہ میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں آپ کی تصویر بھی تھی۔ وہ میں نے کاٹ کر رکھ لی جس کا اپنے کسی خط میں میں نے ذکر کیا تو صاحبزادہ موصوف نے مجھے اپنی ایک تصویر دستخطوں کے ساتھ بذریعہ ڈاک ارسال فرمائی جو میں نے فریم کرا کر اپنے کمرے میں رکھی ہوئی ہے۔

مدتوں بعد یہ ملاقات نصیب ہوئی تھی اور اتنی طویل گفتگو کا موقعہ عطا ہوا۔ میں نے انہیں انتہائی ملائم محبانہ اور محبوبانہ اوصاف وشمائل کا دلکش نمونہ دیکھا۔ میں تو خیر عرصہ دراز سے صاحبزادہ صاحب کو جانتا ہوں کہ کم آمیز طبیعت کے باوجود ہر قسم کے حالات میں شادابی اور دلربائی انہیں خاص طور پر ودیعت ہوئی ہے۔ مگر میرا پوتا عزیز صفوان احمد جو قریباً ڈیڑھ ماہ سے بالٹی مور میں آیا ہوا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ تھا وہ اس طویل عمر میں سارے دن کی محنت اور کلفت کے بعد اس قدر باغ و بہار شخصیت کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوا اور پھر بوقت رخصت مجھے بھی اور اسے بھی بہت پیار جو کیا تو دل بھر آیا۔ کہ یہ شخص جو دینی اور دنیاوی اعلیٰ مناصب پر فائز رہا اور پھر فرزند ماموز زمانہ ہے۔ ہم ہر لحاظ سے تہی دستوں اور بے نواؤں کے ساتھ اس قدر رحیمانہ سلوک! یقین ہے کہ اسی مے سے ساقی نے انہیں بھی سیراب کیا ہے۔ جس سے اس مقدس مورث فیضیاب ہوئے تھے اور یہ حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کا ان دعاؤں کی قبولیت کا نشان ہے۔

وہ سب دے ان کو جو مجھ کو دیا ہے

میں نے جناب صاحبزادہ صاحب سے بوقت الوداع مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر اس طرف لطف وکرم خاص اوج پر تھا۔ آپ نے بڑھ کر معانقہ سے سرفراز فرمایا۔ ہم واپس لوٹے تھے تو آپ کی یہ نوازش موضوع سخن بنی رہی۔ خصوصاً صفوان احمد کے لئے یہ ایک عجیب اور یادگار ملاقات تھی۔ جسے پہلے سے اس کا کچھ تجربہ نہ تھا۔ جس پیار سے ہمیں رخصت فرمایا گیا وہ نہ بھولنے والے لمحات تھے۔ میں نے گزارش کی کہ دوبارہ حاضر ہو کر چند سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس پر کمال خوش دلی سے فرمایا جس وقت اور جس روز چاہو آ جانا اپنے ایک انٹرویو پر مشتمل کتاب ''ایم ایم احمد کے انکشافات'' اور ایک عمدہ کتاب عطا فرمائی۔

میری کردار سازی میں اس نبیرہ مہدی معہود کا بھی بہت ہاتھ تھا۔ وہ ایک انقلاب آفرین شام تھی۔ 1952ء کی بات ہے جب اس وقت کے پرنسپل ٹی۔آئی کالج اور بعد ازاں سیدنا امام وقت نے میرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا تھا۔ اس کے بعد مجھ سے کوتاہیاں ہوئی ہوں گی مگر وہ ابر کرم بن کر ہی برستا رہا۔ میں نوازشات خسروانہ کا کیا صلہ دے سکتا ہوں اور میری کیا حیثیت ہے مگر دعا 50 سال سے کر رہا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ اس احساس کمتری کے باوجود کہ میں ایک بہت ہی خطا شعار انسان ہوں۔ مگر یہ یقین ہے کہ جس سے بھیک مانگتا ہوں وہ بڑا رحیم و کریم ہے اور اس سے مانگنے کے لئے کسی Qualification کی چنداں حاجت بھی نہیں ہے۔



بیت الرحمان واشنگٹن میں قیام وسجود کی سعادت

یہ تو مجھے صاحبزادہ مرزا مظفر احمد صاحب نے عندالملاقات بتایا تھا کہ وسیع وعریض ''بیت'' کے آس پاس قریباً 18 / ایکڑ اراضی جماعت نے خرید لی ہے۔ اسی میں سید شمشاد احمد صاحب کی جائے رہائش ہے اس میں ہی ریسٹ ہاؤس ہے اور پھر ساتھ ہی ایم ٹی اے امریکہ کے مرکزی دفاتر اور سر بفلک الیکٹرانک تنصیبات ایک احاطے کے اندر واقع ہیں جو سارے امریکہ اور کینیڈا کو ایم ٹی اے کی نشریات پہنچاتی ہیں۔ ہمیں بھی گدگدی ہوئی کہ اگر اجازت مل سکے تو اندر جا کر انہیں دیکھیں۔

مجھے بتایا گیا کہ سابق گورنمنٹ پاکستان کے ایک مرکزی وزیر نے بھی اس قسم کی خواہش ظاہر کی تھی انہیں بھی اجازت مل گئی تھی۔ میں نے امام صاحب سے اپنی اس تمنا کا اظہار کیا تو انہوں نے اس سارے سلسلہ کے انچارج محترم چوہدری منیر احمد صاحب سے فون پر اجازت طلب کی۔ میری خوش بختی کہ وہ مجھ سے بوجہ پہلے سے متعارف تھے۔ (غائبانہ) اس لئے بڑے تپاک سے ملے اور مجھے اور میرے پوتے کو ان قیمتی اور حساس تنصیبات کی ماہیت سے آگاہ فرمایا۔ انہوں نے بتایا کہ پاکستان کے فلاں وزیر صاحب آئے تھے اور یہاں آ کر ششدر اور حیران ہوئے کہ وہ کام آپ لوگ کر رہے ہیں جو بڑی بڑی حکومتوں سے نہیں ہو سکا۔ ہر چند کہ میں ایک Layman تھا بھلا سائنسی دور کے اس اعجاز کو کیا سمجھ سکتا۔ البتہ جس بات نے مجھے متاثر کیا وہ یہ تھی کہ کروڑوں ڈالر کی اس پیچیدہ اور گنجلک مشینری کے انچارج عزیزم چوہدری منیر احمد صاحب تھے۔ جو جامعہ احمدیہ ربوہ کے فارغ التحصیل شاہد ہی تھے اور بس۔ وہ بتاتے تھے کہ مجھے جب اس کا انچارج بنایا گیا تو ادب سے گزارش کی کہ کسی ایک انجینئر کو ساتھ رکھنے کی اجازت بخشی جاوے۔ مگر حضرت صاحب نے فرمایا تم خود ہی یہ کام کرو انشاء اللہ اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اور بنیادی طور پر ایک مربی جس کا سائنسی علوم کے ساتھ کبھی کوئی رشتہ نہیں رہا اب اس ساری مشینری کے رگ وریشہ سے اللہ کے فضل وکرم سے اس طرح واقف ہیں کہ کوئی ماہر سائنسدان بھی کیا ہوگا۔

ایک مردِ خدا نے بظاہر انہونی بات کہہ دی قادر کریم مالک نے اسی طرح پوری کر دی اور ایک بظاہر اناڑی شخص پر ہی نگاہ صدناز پڑ گئی تو وہی کندن ہو گیا۔

الغرض واشنگٹن کی فضاؤں کو فرزند مسیحا کے وجود باجود نے محبت والفت کے عطر سے ایسا معطر کر رکھا ہے کہ وہاں سے اس نفسا نفسی کے مادیت کے دور میں بھی ہم نے بیگانگی کا نام ونشان تک نہ دیکھا بلکہ اس کے برعکس سب یگانگت اور محبت کے ایسے رشتوں میں بندھے ہوئے تھے۔ کیوں نہ ہوتا ہم سبھی ایک ہی سرسبز و پھلدار درخت کی شاخیں ہی تو ہیں۔ دل حمد وشکر سے بھر جاتا ہے تو حضرت مہدی دوراں کے مبارک الفاظ میں شکر الٰہی بجالاتا کہ ان میں اتنی برکتیں ہیں جو ہمارے وہم وقیاس میں نہیں آسکتیں۔

کروں کیونکر ادا میں شکر باری
فدا ہو اس کی راہ میں عمر ساری
میرے سر پر ہے منت اس کی بھاری
چلی اس ہاتھ سے کشتی ہماری

اور حضرت صاحب کے ایک شعر میں تو عرفان اور معانی کا ایک جہاں آباد ہے۔ جو گویا وِردِ زبان ہی بن گیا ہے۔

بہار آئی ہے اس وقت خزاں میں
لگے ہیں پھول میرے بوستان میں

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ لِللہ محبت کرنے والے سارے بھائیوں کو اپنی جناب سے اجرِ عظیم عطاء فرمائے۔

شروع ماہ اگست لندن پہنچ کر 3، 4 دن ہی وہاں گزارے تو جرمنی روانہ ہو گئے۔ فرینکفرٹ اور پھر وہاں سے ہمبرگ یہ شہر بھی لازوال اور بے مثال محبتوں کا شہر ہے۔ مجھ ناہنجار اور بے ہنر کے لئے بھی اس بستی کی محبت کی بانہیں کھلی رہتی ہیں۔

ہمبرگ میں چند دن قیام کے بعد وہاں سے بذریعہ کار عزیزم بشارت احمد چوہدری کی محبت میں عازم ناروے ہوئے 4، 5 گھنٹے کے کار کے سفر کے بعد سمندری جہاز میں 8، 10 گھنٹے گزارے اوسلو پہنچے۔ تو وہاں عزیزوں اور رشتہ داروں نے بہت محبت کا سلوک کیا۔ اگلے دن روز جمعہ تھا نماز ''بیت اوسلو'' میں ادا کی۔ سب دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ وہاں کے امیر محترم جناب عون بن عقیل بن عبدالقادر صاحب ہیں۔ میرا قیام وہاں اپنی بھانجی عزیزہ نصرت ادریس کے ہاں تھا۔ جو شہر اوسلو سے 120 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور پھر وہاں سے آگے 30 کلومیٹر دور وہ مقام ہے جسے End of the world (زمین کا کنارا) کہتے ہیں۔ وہاں گئے تو ''میں تیری تبلیغ کو زمین کے کناروں تک پہنچاؤں گا'' کی ایک صدی پرانی بشارت یاد آئی۔ دل میں خیال آیا کہ یہاں دعوت

الی اللہ بھی تو کرنا ضروری ہے مگر وہاں جن نہ انس۔ میں وہاں درود شریف ہی پڑھتا رہا مگر اس کا عمدہ موقعہ جناب امیر صاحب ناروے نے فرما دیا۔ ارشاد ملا کہ اتوار 19 راگست 2001ء کو ناروے کے مقامی ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے لئے ایک انٹرویو نما تقریر سٹوڈیو میں ریکارڈ کرادو۔ تعمیل کے لئے بروقت سٹوڈیو پہنچے وہاں پونے تین گھنٹے کا طویل پروگرام تھا۔ جس نے گو مجھے نڈھال کر دیا مگر میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ زمین کے اس کنارے پر دعوت الی اللہ کی سعادت نصیب ہو رہی تھی۔ مجھے مقامی دوستوں نے بتایا کہ لکھوکھہا انسان جو سینکڑوں میل کے دائرے میں آباد ہیں یہ پروگرام سن رہے ہوں گے۔ یہاں اشارہ ہی کر سکتا ہوں۔ ساری باتوں کا دہرانا تو ممکن نہیں ہے۔

ایک واقعہ تو اس انٹرویو میں وہ بھی بیان کرنے میں میں آزاد تھا۔ جو سیدنا مرشدنا حضرت خلیفہ ثالث نے ایک نشست میں تین بار اس عاجز سے سنا تھا جو محترم ملک صاحب خان صاحب نون مرحوم کے احمدیت کے لئے جانفروشی اور ایمانی غیرت کے جوانمردانہ اظہار سے تعلق رکھتا تھا۔ کاش ہم سب پر بھی جب کڑا وقت آئے تو ایسی جرات اور بے باکی اور بے خوفی سے حبل اللہ کو مضبوطی سے پکڑ کر رکھنے کی توفیق پائیں۔

2001ء کا انٹرنیشنل جلسہ سالانہ من ہائیم جرمنی

امسال لندن کی بجائے جرمنی میں جلسہ سالانہ 24 تا 26 راگست 2001ء منعقد ہوا۔ اسلام آباد برطانیہ میں جلسہ سالانہ نہ ہونے پر مخالفین نے اسے اپنی کامیابی قرار دیا۔ انہیں کیا معلوم کہ جرمنی میں برطانیہ سے بھی زیادہ لوگ اس للٰہی اجتماع میں شریک ہوں گے۔ مخالف کو تو اس کو چہ کی خبر ہی نہیں مگر ہم جانتے ہیں کہ دعائیں کبھی پرانی نہیں ہوتیں۔

1891ء میں ایک مامور زمانہ نے ایسی مناجات کی تھیں جنہوں نے عرش الٰہی میں لرزہ پیدا کر دیا تھا۔ ان کی قبولیت ہر سال نئی نئی جہات سے ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ حاسدین کو مایوسی ہوئی ہوگی کہ جہاں برطانیہ میں 20، 25 ہزار لوگ جلسہ سالانہ پر جمع ہوتے تھے۔ مان ہائیم جرمنی میں 48، 49 ہزار ربانیوں کا اجتماع تھا۔ یہاں کوئی بڑا شہر بھی قریب نہیں تھا۔ فرینکفرٹ بھی اس جگہ سے 80 کلومیٹر دور تھا۔ ویزہ جات کے حصول میں بھی دشواریاں تھیں۔ جرمن سفارت خانوں نے بھی اکثر و بیشتر بخیلی سے ہی کام لیا۔ اس کے باوجود اتنی کثیر تعداد میں مخلصین کا جمع ہو جانا حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ مگر جہاں شمع ہوگی وہاں پروانے تو اپنی جان گنوانے کے لئے بصد شوق جمع ہو جاتے ہیں انہیں کسی کے بلانے کی حاجت بھی نہیں ہوتی۔ جنگل بیابان میں شمع روشن ہو تو نا معلوم یہ مخلوق کیسے اور کیونکر وہاں پہنچ جاتی ہے۔ مجھے اس کے کنہ معلوم نہیں ہیں۔

وہاں مئی مارکیٹ میں کیسے انتظامات ہوں گے۔ ہزار ہا انسان کا اجتماع عظیم جن میں خواتین اور بچے بھی شامل تھے۔ گرمی بھی سخت،

خورد ونوش کا کیا بندوبست ہوگا مگر یہ پروانے اس شمع نور کے قرب کو چاہتے تھے۔ وہ گو زندگی کی ساری سہولتوں کے عادی تھے مگر وہ اپنے محبوب کی ایک جھلک دیکھنے اور اپنی سماعتوں کو اس کی روح پرور گفتگو سے فیض یاب کرنے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے اور وہ سب نعماء زندگی سے یکسر بے نیاز ہو چکے تھے۔

حضرت صاحب سے ایک اور ملاقات جرمنی میں

ہر چند کہ میں 12 رجولائی کی شام کو لندن میں حضور سے ملاقات کر چکا تھا دوبارہ ملاقات کی اجازت نہیں ہوسکتی تھی مگر پاکستان سے ملک نادر حسین صاحب کھوکھر غربی متصل گجرات سے جلسہ سالانہ سے دو روز قبل جرمنی پہنچ گئے۔ ان کا فون پر مجھ سے رابطہ ہوا اور ساتھ ہی حضرت صاحب سے ملاقات کرنے کی ان کی شدید خواہش اور وہ بھی میرے ساتھ۔ میں نے معذرت کر دی کہ قریباً ڈیڑھ ماہ قبل ملاقات کر چکا ہوں۔ اس لئے میرا ہمراہ ہونا ممکن نہیں۔ اس نے حضرت صاحب کی خدمت میں درخواست لکھی۔ جس میں 50 لاکھ تاوان کی غرض سے دہشت گردوں کے ہاتھوں اس نے اپنے اغوا اور پھر زندگی اور موت کے درمیان ایک ہفتہ گزارنے اور اس دوران میری حتی المقدور امداد اور مشاورت کا ذکر کیا۔ نیز یہ بھی لکھا کہ عبدالسمیع نون نے بھی حضور کی خدمت اقدس میں بار بار فیکس کے ذریعہ دعاؤں کی التجا کی جو مستجاب ہوئیں۔ یہ اغواء اور برآمدگی کا واقعہ 15 رمئی 2000ء سے 21 رمئی 2000ء کے دوران ہوا اس لئے بصد ادب التماس ہے کہ ہم دونوں کو اکٹھے زیارت اور ملاقات کی اجازت بخشی جائے اس پر حضور نے از راہِ تلطف ہم دونوں کو 25 راگست کی صبح 11 بجے ملاقات کی اجازت جلسہ گاہ کے قریب اپنی قیام گاہ پر عطا فرمائی۔

چنانچہ ہم دونوں گیارہ بجے قبل دوپہر حاضر خدمت ہو گئے وہ ایک تاریخی اور دیدنی ملاقات تھی۔ ملک نادر حسین کو سوا سال قبل اپنے اغواء اور اس دوران ظلم وستم کی ساری داستانیں یاد آ گئیں اور پھر اس سراپا لطف وکرم کی توجہات کریمانہ اور دعا ہائے مستجاب جو اس کی جان بخشی کا موجب بنیں اور ان کے نتیجہ میں جو معجزے رونما ہوئے وہ سب یاد کر کے وہ تو حضور کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے زار وقطار رو رہے تھے۔ حتی کہ اس کی گھگھی بندھ گئی اور حضور نے مجھ سے اس واردات کی تفصیل سنی۔ حضور از راہِ بندہ نوازی سوالات کرتے رہے کیسے اغوا ہوئے کہاں سے پھر کہاں انہیں رکھا گیا اور اس دوران تشدد ہوا کہ نہیں؟ اور کس طرح آزاد ہوئے اور پھر میں نے عرض کیا کہ حضور کے دعا ہائے مستجاب کا یہ اعجاز کہ زر تاوان سارا واپس مل گیا اور مجرمان سو آدمی لے کر ملک نادر حسین صاحب مغوی کے ہاں معذرت طلبی کے لئے بھی آئے اور ملک صاحب نے بھی 1000، 1100 آدمیوں کو جن میں تین چار اضلاع کے دوست تھے امیر صاحب ضلع گجرات بھی تھے اکٹھا کیا ہوا تھا وہاں ایک بہت بڑا اجتماع تھا جس میں مجرمان کی طرف سے ایک شخص نے مختصر تقریر کی کہ ہمیں معاف کر دیا جائے غلطی ہوئی ہے اور جواب میں اس خاکسار راقم نے عرض کیا کہ یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے نہ کبھی ایسا ہوا ہے بلکہ

ہزار ہا میل دور بیٹھے ایک شخص کی دعاؤں کا ثمر ہے۔ جو اس وقت صفحہ دنیا پر اللہ تعالیٰ کا محبوب ترین بندہ ہے اور پھر حاضرین میں نعرے بلند ہوئے اور دوسرے روز گجرات کے مقامی اخبار نے شہ سرخیوں سے اس محفل کی خبریں شائع کیں اور کیا اپنے اور کیا غیر سبھی اس یقین سے معمور ہیں کہ یہ معجزہ ایک مرد خدا کی دعاہائے مستجاب کا نتیجہ ہے۔ تو میں جلد جلد یہ واقعات حضور کو یاد کرا رہا تھا۔ جنہیں حضور پہلے سے ہماری فیکس، درخواستوں کے ذریعہ جانتے تھے اور حضور نے جوابی فیکس کے ذریعہ اپنے خادم کے بارہ میں تفصیلات معلوم فرمائیں۔ یہاں یہ عرض کرتا جاؤں جب بارگاہ خلافت سے جوابی فیکس آنا شروع ہوئے تو میرا دل یقین سے لبریز ہو گیا کہ اب سب خیر ہے۔ برادرم جنرل عبدالعلی ملک صاحب مرحوم نے مجھے یہ نسخہ کیمیا عطا کیا تھا کہ جب خود قصر خلافت سے خیریت طلبی کا سلسلہ شروع ہو جائے تو یقین جانو کہ عقدہ کشائی ہو گئی۔ چنانچہ اس کا اس عاجز راقم کو ذاتی تجربہ بھی ہوا۔ جو ایک ایمان افروز داستان ہے مگر یہاں اس کا بیان موجب طوالت ہوگا۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ یہ نسخہ بیاض مسیحا سے ماخوذ ہے۔

تاہم معمول سے زیادہ وقت ہمیں عطا ہوا چونکہ حضور خود استفسار فرما رہے تھے پھر حضور نے خود فوٹو کا حکم صادر فرمایا اور پھر آخر میں اس عاجز نے نہایت مختصر الفاظ میں اپنی مرض قلب کا ذکر کیا اور بصد ادب یوں التجا کی کہ سیدنا اس بوڑھے سینے میں اب چیر پھاڑ کی کوئی طاقت نہیں ہے از راہ خادم نوازی مجھ پر آج ایک ایسی نگاہ کرم ڈالیں جس سے یہ مردہ زندہ ہو جائے۔

اور میں نے دیکھا کہ اس محبوب الٰہی نے اس پر تقصیر پر کمال توجہ سے نگاہ ڈالی گویا چند ثانیئے ہی کی نگاہ تھی مگر مجھے یقین سے لبریز کر گئی کہ شافی مطلق مجھے اس علالت سے نجات بخشے گا۔ وھوالقادر

ملاقات کے کمرہ سے باہر آئے تو میں چاہتا تھا کہ خوشی سے اچھلوں کہ آج سیدنا حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے خلیفہ چہارم جو حضور کا فرزند بھی ہے اور سیدنا حضرت مصلح موعود کے بیٹے کی نگاہوں کا مرکز بن گیا ہوں۔ جو میرے لئے شفاء بخش جام ثابت ہوگا۔ انشاء اللہ۔

بین الاقوامی جلسہ سالانہ ختم ہوا اور حاضرین نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اس روحانی مائدے سے حصہ لیا جو تین دن وہاں تقسیم ہوتا رہا تھا میں تو اس کی مثال بوجہ خود زمیندار ہونے کے ایک زمیندار سے ہی دیتا ہوں جو سال بھر کے لئے اپنے خاندان کے لئے غلہ جمع کر لیتا ہے اور پھر ہر سال اس کی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ آئندہ پھر تازہ اور عمدہ فصل ہو جس کو ذخیرہ کر لے سبھی شاداں و فرحاں لوٹے۔ اور ان میں وہ بھی کم تعداد میں نہیں تھے جو طویل روحانی فاقہ کشی کے بعد اس بار ہی سیراب ہو رہے تھے۔ جلسہ سالانہ کے چند دن جرمنی گذار کر ہم پھر لندن اپنے گھونسلے میں آ گئے۔ حضرت صاحب کی زیارت سے ایک ہفتہ تک فیض پاتے رہے۔ بالآخر وہ جمعۃ المبارک کا دن آن پہنچا جو لندن میں میرا آخری دن تھا اگلی صبح لندن کے مطار پر سے پاکستان کے لئے واپسی تھی۔ سارا دن بیت الفضل لندن اور اس کے نواح میں گزارا۔ شام کو مجلس عرفان تھی یہ بھی زیارت محبوب کا ذریعہ بن گیا۔ ساڑھے نو بجے کے قریب بعد نماز عشاء

گریسن ہال روڈ سے روانہ ہوا اور روحانی ماحول پر آخری نگاہ ڈالی دل بھر آیا۔ میرے ہمراہ برادر عزیز مبارک احمد چیمہ صاحب اور ان کی فیملی تھی۔ کوشش کی کہ دل کو قابو میں رکھوں مگر میں نے طویل زندگی میں کب اس کی بات مانی تھی جو وہ میری مانتا یہ بھی اچھا ہوا کہ اندھیرا چھا چکا تھا۔ میرے دل کی غمازی آنکھیں کر رہی تھیں۔ مقام شکر ہے کہ اس سے میرے عزیز ساتھی آگاہ نہ ہو سکے۔ گھر پہنچے تو میری بھانجی عزیزہ سلیم اختر اور اس کے دونوں بچے شاید میری حالت زار کو پا گئے تھے۔ مگر مصلحتاً خاموش رہے۔

میں عجیب تذبذب میں مبتلا تھا۔ تضادات کا شکار کبھی خیال آتا دو ماہ گزر گئے وطن جانا ہی چاہیئے کبھی دل یہ کہنے لگتا۔

اس پار تیرا کوئی بھی اب منتظر نہیں
کچے گھڑے پہ تیر کے جانا فضول ہے

نیز ایک کرشماتی شخصیت سے لمبی جدائی شدید صدمے کا موجب ہو رہی تھی۔ پلکوں پر مسلسل آنسو لرزتے رہے شدید کرب کے ذائقے سارے بدن میں پھیل چکے تھے۔ یہ ہجر و وصل کی کیفیات بھی عجیب ہیں ہم تو اس حال میں ہیں کہ نہ وصل راس آتا ہے نہ ہجر۔

وصل کی گھڑیوں میں ہجر کے اندیشے، ظلمات اور تفکرات گھر گھر کر آتے رہتے ہیں یوں بھی وصل کے لمحات پلک جھپکنے میں گزر جاتے ہیں اور جب دیدار نصیب ہوتا ہے تو اس میں بھی تشنگی ہی رہتی ہے بلکہ پیاس پہلے سے زیادہ بھڑک اٹھتی ہے۔

مگر دوستو ہم بڑے اونچے نصیبے والے ہیں جنہیں آسمان سے خوان یغما عطا ہوا ہے نہ معلوم اس سے محروم لوگ کیسے جی رہے ہیں۔ بجا طور پر ہر ملک میں منعقد ہونے والے اجلاسات میں اپنی شمولیت پر مجھے ناز ہے۔ مگر مجھے احساس گناہ نے بھی بہت کچوکے دیئے اور میں نے اپنے آپ کو مخاطب ہو کر کہا کہ تمہیں ایمان وایقان کی نعمتیں تو ورثے میں ملیں تھیں اور اپنے ابا کو جن کا دست حق پرست 1903ء میں ہزاروں سال سے مدفون خزانے پر جا پڑا تھا اور آسمان سے وقت پر نازل ہونے والے پانی سے اپنی روحانی پیاس بجھائی تھی۔ دعا دیتے ہو مگر قادیان اور لاہور اور ربوہ اور انگلستان اور آج جرمنی کے للٰہی اجتماعات میں شامل ہوتے ہوئے تین چوتھائی صدی گزار چکے ہو اپنا دامن تو دیکھو ہر سال عرش سے ہونے والے انعامات کو سنبھال کر رکھا بھی ہے؟ اور اگر تہی دامن ہو تو فکر کرو اتنے خزانوں میں سے تمہارے پاس کیوں کچھ بھی نہیں بچا۔ تمہارے اعمال کی بُغچی میں تو کئی چھید ہیں۔

ادھر مان ہائیم جرمنی کا جلسہ ختم ہوا ادھر احساس محرومی کا اتنا غلبہ ہوا کہ رات بے چینی میں ''گروس گراؤ'' میں گزاری۔ اگلی صبح اپنے کمرے کے دروازے بند کر لئے قلب حزیں آستانہ الوہیت پر گر کر غم والم سے چھلکنے لگا۔

عرض کیا اور تو میرے پلے کچھ نہیں تیرے حکم کی اطاعت میں اس دہلیز پر ہی مدتوں سے پڑا ہوں۔ نہ ملکی تقسیم میرے راہ میں حائل ہوئی نہ یہ طویل سفر اور غیر ممالک میں داخلے کی رکاوٹوں اور ویزوں کے حصول میں دشواریوں سے میں خائف ہوا۔ لیکن میرے آسمانی

آقا اس میں بھی میری کوئی خوبی نہیں یہ سب تیرے الطاف کریمانہ سے اور فضل عظیم سے ہی ہوا۔ ورنہ

میں تو مرکر خاک ہوتا گر نہ ہوتا تیرا لطف
پھر خدا جانے کہاں یہ پھینک دی جاتی غبار

اب یہ بھی فضل فرما کر اس پرانے اپنے در کے گداگر کو دھتکار نہ دے اور اے رحمن ورحیم میرے آسمانی آقا **ادخلی فی عبادی** کی نوید سنا۔ آمین یاارحم الراحمین۔

(روزنامہ الفضل ربوہ مورخہ 31/اکتوبر 2001ء صفحہ 3 تا4، یکم نومبر 2001ء صفحہ 3 تا4)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

قادرانہ تجلیات کے روح پرور مناظر



مضمون کے عنوان سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ کوئی خیالی پلاؤ پک رہے ہیں یا ''اضغاث احلام'' ہیں۔ بلکہ ایسے حقائق ہیں جن کی صادقوں کی ایک دنیا گواہ ہے۔ میں چند واقعات ہی بیان کر سکوں گا یوں تو احیائے موتی کے نشانات قریباً ہر ملک میں بلکہ ہر شہر میں ظاہر ہوئے اور اعجاز نمائی کی تو کوئی انتہا نہیں ہے مگر میں وہ واقعات بیان کروں گا جن کی صداقت ہر قسم کے شک وشبہ سے پاک ہے۔

عالم تصور میں 14، 15 صدی قبل سیدنا و امامنا کے دربار میں نے تو حضور ﷺ کو اپنے دو غلاموں کے لئے سلاموں کے خصوصی طور پر تحفے بھجواتے سنا ایک سلام یمن میں اویس قرنی کے لئے تھا جو اپنی والدہ کو اکیلا چھوڑ کر حضور کی غلامی قبول کرنے کے باوجود حضور ﷺ کی زیارت اور ملاقات کے لئے نہ جا سکا۔ آقا مکی و مدنی نے فرمایا مجھے یمن کی طرف سے خوشبو آ رہی ہے اور کہ میرا سلام اویس قرنی کو پہنچے۔

دوسرا سلام 1400 سال بعد آنے والے اپنے غلام مسیح موعود کے لئے۔ دنیا کی تاریخ میں 1400 سال کے طویل عرصہ کے بعد آنے والے کسی آقا نے اپنے کسی خادم کو نہ مخاطب کیا ہے۔ نہ کوئی تحفہ بھیجا نہ انعام و اکرام سے نوازا۔ **فتبارک من علم و تعلم**۔ پھر قریباً 120، 115 سال پہلے میں حضرت میرزا غلام مرتضیٰ صاحب کو ایک اعتماد والے سکھ دوست کو کہتے سنتا ہوں کہ ایک انگریز بڑا افسر میرا واقف ہے۔ تم غلام احمد کے پاس جاؤ اسے کہو کہ وہ چاہے تو میں اس کو کسی اچھی پوسٹ پر ملازم رکھوا دوں۔ سوچتا ہوں باپ اور بیٹے میں مودبانہ حجاب حائل تھے۔ اس لئے خود بات کرنا مناسب نہ سمجھی ہوگی۔ سکھ نے من وعن بات پہنچا دی۔ آپؑ کا جواب سنتا ہوں تو روح

میں ایک اور بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ خدائے قادر و توانا عزیز و حکیم کی قدرتوں کا قائل ہو جاتا ہوں۔ آپ بھی سنیں۔ ''ابّا جان کو کہہ دیں آپ کا شکریہ۔ مگر میں نے جس کا نوکر ہونا تھا ہو چکا میری فکر نہ کریں''۔ صرف کھدر کے دو جوڑے کپڑوں کے دے دیں اور روکھی سوکھی روٹی جو بھی ہوگی مجھے اعتراض نہ ہوگا۔ سکھ تو اس عارفانہ جواب سے مایوس ہوا مگر جب حضرت بڑے میرزا صاحب کو یہ جواب دیا تو وہ نہایت عمیق نگاہ رکھتے تھے اور معرفت کے نکات خوب سمجھتے تھے۔ فرمایا ''غلام احمد ٹھیک ہی کہتا ہے'' ''ہم نے تو یونہی دنیا کے دھندوں میں زندگی ضائع کر دی۔ اللہ تعالیٰ اسے ضائع نہیں کرے گا۔''

پھر میں اس بیت مبارک کو تصور کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں جس میں بمشکل 4، 5 نمازیوں کی گنجائش ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرے آقا کو عرش الٰہی سے سلطان القلم کا خطاب بخشا گیا۔ بیت کے ساتھ چھوٹا سا کمرہ ہے۔ اندر سے کنڈی لگا کر دونوں اطراف ایک ایک سیاہی کی دوات اونچی جگہ پر رکھی ہے۔ وہ ''سلطان'' ٹہل رہا ہے۔ قلم اور کاغذ ہاتھ میں ہے۔ اس پر چلتے چلتے حروف نہیں موتی اور جواہر بکھیر رہے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے چلتے چلتے کچھ لکھنے کی جسارت کی تو بری طرح ناکامی ہوئی تب سمجھ آئی کہ یہ ''سلطان القلم'' کا ہی اعجاز تھا۔ حالت یہ ہے کہ دشمن اور حاسد کوئی موقعہ ایذا رسانی کا ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ حتیٰ کہ انہیں میرے آقا کے چند حواریوں کا چھوٹی سی عبادت گاہ میں رکوع و سجود کرنے سے بھی دکھ ہوتا ہے اور حسد میں جل بھن کر زور بازو کا یوں مظاہرہ کرتے ہیں کہ اسی عبادت گاہ کے دروازے کے آگے دیوار کھڑی کر دیتے ہیں اور اس الٰہی ارشاد کا کچھ خوف نہیں کہ اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کے گھروں میں اس کا ذکر کرنے سے لوگوں کو روکتا ہے۔ مظلومیت کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ میرا آقا کوئی مزاحمت نہیں کرتا۔ ہاں اپنے خالق و مالک کی بارگاہ میں کس کس انداز میں پکار کی ہوگی۔ یہ تو وہ جانے اور اس کا مجیب رب۔ آخر عدالت نے دیوار کی مسماری کا حکم صادر کیا اور خرچہ مقدمہ بھی دیا گیا۔ خرچہ کی اجراء ہوئی تو وہی میرزا صاحبان جنہوں نے از راہ ظلم دیوار کھڑی کرا دی تھی ملتجی ہوئے کہ ہماری قرقی نہ کرائیں اور یہ تو مجسم عفو تھا۔ اس کا قدم اپنے آقائے عربی کے نقوش قدم پر ہی پڑتا تھا۔ ''اذھبوا'' کا حکم دیا اور اجراء رکوا دی۔ شاید ٹہلتے ٹہلتے ہی بند کوٹھڑی میں یہ شعر لکھا ہوگا:

ہم تو بستے ہیں فلک پر اس زمیں کو کیا کریں
آسماں کے رہنے والوں کو زمیں سے کیا نقار

یہ چلتے چلتے آپ کا قلم جو لعل بدخشاں کاغذ پر بکھیرتا تھا ہمیشہ خواہش ہوتی ہے کہ کاش میرے دل کے ٹکڑے ہوتے جن پر وہ پائے اقدس پڑتے یا اے کاش میں مولانا برہان الدین جہلمیؓ کی طرح اتنی جرأت ہی کر سکتا کہ ہوشیار پور جب آپ چلہ کشی کر رہے تھے۔ مولوی برہان الدین صاحبؓ نے باوجود خدام کے منع کرنے کے جھانک لیا اور نور کی ایک کرن اس کی جسم و جان میں سرایت کر گئی تھی

واپس جہلم پہنچے تو دوستوں نے پوچھا میرزا صاحب کو دیکھا کیا باتیں ہوئیں۔ کہا باتیں تو کوئی نہیں ہوئیں بس ایک جھلک دیکھی ہے۔ تیز تیز ٹہل رہے تھے اور کچھ لکھتے جا رہے تھے۔ میں سمجھا جو اتنا تیز قدم ہے اس کا سفر بہت بہت طویل ہے اور اس کی منزل دور بہت دور ہے۔ پھر آپ کو چشم تصور میں دیکھتا ہوں کہ لدھیانہ میں حضور ٹہل رہے ہیں۔ حضرت منشی ظفر احمد صاحبؓ کپورتھلوی پیچھے پیچھے چلتے ہیں کہ ایک صوفی آیا اور آتے ہی اپنی محدود عقل وفہم کے مطابق یہ سوال کیا کہ آپ زیارت کروا سکتے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا ''اس کے لئے مناسبت شرط ہے'' پھر حضرت منشی ظفر احمد صاحب کپورتھلوی کو پیچھے مُڑ کر دیکھا اور اس وقت دریائے کرم تموج میں تھا نگاہ فیض رساں بھر کر اپنے خادم کو دیکھا اور فرمایا ''جس پر خدا کا فضل ہو جائے'' اور اسی رات حضرت منشی صاحب کو زیارت نصیب ہوئی اور پھر یہ درِ رحمت ہمیشہ کھلا رہا۔ میں یہاں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ معرفت کی کمی کا یہ حال ہے کہ عام لوگ سب کچھ بغیر ایمانی جدوجہد اور خدا خوفی میں ترقی کرنے کے پکی پکائی پر انحصار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کوئی ایسا شخص ہو جو پھونک مار کر تمہیں اونچی فضاؤں میں اڑا دے۔ خود کچھ نہ کرنا پڑے اسی سے نام نہاد پیروں اور عاملوں نے مداریوں کی طرح ''ایسی دکانیں'' کھول رکھی ہیں جن سے وہ جھوٹے دعوے کرتے ہیں کہ سائل کے سارے مقصد حاصل ہو جائیں گے اور سادہ لوح لوگ لٹ رہے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو پانے کے لئے اپنے نفس پر ایک موت وارد کرنا پڑتی ہے تب وہ یار یگانہ اپنی چمک دکھلاتا ہے۔ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے کس خوبی اور لطافت کے ساتھ یہ نکتہ بیان فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

جو خاک میں ملے اسے ملتا ہے آشنا
اے آزمانے والے یہ نسخہ بھی آزما

اور اپنا تجربہ یوں بیان فرماتے ہیں:

مشت غبار اپنا تیرے لئے اڑایا
جب سے سنا کہ شرط مہرو وفا یہی ہے

میں اس سوچ میں گم تھا کہ ایک نظارہ دیکھا کہ حیدر آباد دکن کا ایک نوجوان عبدالکریمؓ دارالامان میں آیا اسے باؤلے کتے نے کاٹا۔ کسولی پہاڑ پر اسے علاج کے لئے بھجوایا گیا۔ بظاہر صحت یاب ہو کر واپس آیا مگر ہائیڈروفوبیا یعنی باؤلے پن کے آثار ظاہر ہو گئے جو لا علاج مرحلہ ہوتا ہے۔ کسولی کے ماہرین نے اپنے عجز کا اظہار کرتے ہوئے تار دے دیا۔ Sorry nothing can be done for Abdul Karim سیّدنا حضرت صاحب کی خدمت میں صورت حال بیان کر دی گئی۔ سب پریشان تھے کہ اب اس کی موت گویا نظر آ رہی ہے۔ ادھر خدائے قادر الکل ہونے پر کامل توکل کرنے والا قبولیت دعا کا نشان پانے والا اللہ کا فرستادہ موجود

ہے۔اس کا جواب سنیں ''ان کے پاس علاج نہیں مگر خدا کے پاس تو علاج ہے۔''

میرے بھائیو اور بزرگو! اس نعرہ مستانہ میں جس قدر اللہ کے ساتھ گہرا تعلق اور اس کی قدرتوں پر ایمان کامل اور اس کی طاقتوں پر مکمل یقین کی خوشبو کی لپٹیں آ رہی ہیں کون ہے جو ان پر دل و جان نچھاور نہ کرے اور پھر اسی طرح ہوتا ہے کہ وہ مردہ زندہ ہو جاتا ہے۔

قدرت سے اپنی ذات کا دیتا ہے حق ثبوت
اس بے نشاں کی چہرہ نمائی یہی تو ہے

پھر ایک شخص کو دیکھا نام اس کا ''حیات'' ہے۔طاعون زوروں پر ہے ملک میں جاروب کشی کی نوبت آ چکی ہے۔گھروں کے گھر اور شہروں کے شہر اجڑ رہے ہیں۔حیات کو بھی طاعون ہو گئی اس کے دوستوں نے امام الزمان سے گزارش کی آپ نے فرمایا حکیم مولانا نور الدین صاحبؓ سے کہیں ''حیات'' کا معائنہ کریں اور علاج کریں۔وہ باغ میں تھا۔آپ نے دیکھا تو اُسے سخت تیز بخار تھا۔طاعون کی گلٹیاں پھوڑے بن چکے تھے، بے تحاشا خون جاری تھا۔حضرت مولانا نور الدینؓ نے عرض کیا کہ اِس مرحلہ پر مرض پہنچ چُکا ہے کہ کوئی علاج ممکن نہیں۔وہ چند لمحوں کا مہمان ہے۔سیّدنا حضرت امام و مرشدؑ کی خدمت میں حیات کے دوستوں نے یہ احوال بیان کیا۔عرض کرنے والے خدام حضرت کے لاڈلے بھی بہت تھے۔عرض کیا کہ دُعا کا مرحلہ گزر چُکا ہے۔''سفارش'' کریں آقا مان گئے اتنا ہی فرمایا ''بہت اچھا'' اور گھر کے اندر چلے گئے۔یہ دونوں دوست ''بیت'' کی چھت پر ہی لیٹ گئے۔اندر جا کر اس بندۂ مالک الملک اور اس کے آسمانی آقا کے درمیان کیا کیا راز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔کن الفاظ میں مناجات ہوئیں بندہ بے دام کس کس طرح اپنے خالق و مالک کے پاؤں پڑا اور کس طرح اپنی بات منوائی یہ علیم و خبیر اس کا آقا ہی جانے۔آدھی رات کو عرش سے قبولیت کا پانی نازل ہوا۔جس سے وہ حقیقی موحد سیراب ہو گیا۔اسی وقت گھر کا دروازہ کھولا تو خدام جو وہاں سوئے ہوئے تھے اُنہیں جگایا کہ جاؤ حیات کا پتہ کرو۔اب ان کی حالت عجیب تھی۔ایک طرف اس کی وہ ڈراؤنی حالت جو مایوسی کی انتہا تک پہنچ چکی تھی جسے وہ دیکھ چکے تھے۔حکیم حاذق کا بیان ہے کہ مرض لاعلاج حدوں تک پہنچ چُکا ہے۔دوسری طرف اس محبوب خدا کا یقین سے لبریز بیان آدھی رات کا سماں وہ اسی حالت میں باغ میں گئے چشم فلک نے عجیب نظارہ دیکھا۔اس نے دیا جلایا ہوا تھا۔قرآن کریم پڑھ رہا تھا۔اس نے اپنے دوستوں کو آتے دیکھا تو للکارا کہ ''آجاؤ ڈرو نہیں میں بالکل اچھا ہو چُکا ہوں۔تپ کا نام و نشان باقی نہیں بغلوں کے پھوڑے درست ہو گئے ہیں۔خون آنا بند ہو گیا ہے۔''

خوش خوش واپس آئے۔اپنے آقا کو خبر دی کہ حضور وہ بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔آپ کے لئے تو یہ نئی خبر نہیں۔آپ کو تو خود علیم و خبیر نے عرش سے اطلاع دے دی تھی فرمایا جاؤ اس کے باپ کو اطلاع کرو اُسے تو حیات کے قریب المرگ ہونے کا تار دیا ہوا تھا۔پریشان ہو گا یہ خوشی سے اچھلتے اور بھاگتے نہر پر پہنچے۔رات کا پچھلا پہر تھا آگے سے حیات کا والد اپنے بیٹے کی خطرناک حالت سن کر ننگے پر آ رہا

تھا۔انہوں نے اسے اطلاع دی وہ تانگے سے اُتر کر وہیں پر سجدہ ریز ہوگیا۔اتنی خوشی اُسے ہوئی کہ بے ہوش ہوگیا۔اس نشان آسمانی کی ہیبت نے اس کا دل و دماغ اپنے قبضے میں ایسے جکڑ لئے کہ اس کو کچھ ہوش نہ رہا۔آخر وہ کچھ سنبھلا اور یہ قافلہ شاداں وفرحاں دارالامان کی طرف بڑھا۔

مگر اپنے خدام ہی کے لئے یہ کرم خاص نہیں تھا بلکہ دریائے کرم جب موج میں ہوتو وہ بنجر اور شور زمینوں کو بھی سیراب کرتا ہوا بڑھتا جاتا ہے۔لالہ شرمپت ایک آریہ تھا۔حضرت صاحب کا لڑکپن کا واقف سخت بیمار پڑ گیا۔پیٹ پر خطرناک قسم کا پھوڑا نکل آیا۔وہ سخت تکلیف میں تھا۔حضرت صاحب ہر روز اس آریہ کی عیادت کے لئے اس کے مکان پر تشریف لے جاتے وہ عرض کرتا ''حضرت جی میرے لئے دُعا کریں'' یہ بندہ باوفا جو دوستی اور وفا کی حقیقت کو جانتا تھا اور اس وقت صفحہ دُنیا پر وہ ایک ہی تھا۔دوست نوازی اور وفا شعاری میں اس کا کوئی ہم پلہ نہیں تھا۔دُعا کرتے رہے عیادت کے لئے ہر روز جاتے رہے۔یہاں تک کہ لالہ شرمپت صحت یاب ہوگیا۔ آقا حی و قیوم نے ان گنت ایسے نشان دکھائے مجھے یقین ہے کہ کوئی گھر ایسا نہیں ہوگا جس میں زندہ خدا کی قدرت کاملہ کا کوئی نشان ظاہر نہ ہوا ہو۔اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہمیشہ سے چلی آرہی ہے کہ اپنے پیارے بندوں سے اس کے کام سبھی معجزانہ ہوتے ہیں اور ان کے لئے ہمیشہ نشان دکھاتا ہے۔خصوصاً جب دشمن اس کے پیاروں پر حملہ آور ہوتا ہے اور انہیں نیست و نابود کرنے کے لئے شمشیر بکف ہوکر باہر نکل آتا ہے۔

تب وہ خدائے پاک نشاں کو دکھاتا ہے
غیروں پہ اپنا رعب نشاں سے جماتا ہے
کہتا ہے یہ تو بندہ عالی جناب ہے
مجھ سے لڑو اگر تمہیں لڑنے کی تاب ہے

پھر میں چلتے چلتے جہلم شہر کی ضلع کچہری کے ساتھ کھلے میدان میں پہنچا۔دیکھتا ہوں کہ میرا آقائے قادیانی اپنے چند حواریوں کے ہمراہ اپنے خلاف کسی مقدمہ کی پیشی بھگتنے کے لئے وہاں موجود ہے۔ہمراہیوں میں ایک سرفروش مجاہد ایک سربکف جوانمرد بھی ہے جس کا نام نامی حضرت شہزادہ عبداللطیف صاحب ؓ رئیس خوست ہے۔

یہ 17رجنوری 1903ء کا خنک دن ہے۔باہر دھوپ میں عدالت میں حاضری کے انتظار میں یہ انوکھا ملزم بیٹھا ہے کہ اس ضلع کے ''پیلاطوس'' کی طرف سے حاضری کے لئے بلایا جائے تو حاضر ہوں۔جوں جوں لوگوں نے سُنا جمع ہوتے گئے ایک خاص مجمع کی صورت پیدا ہوگئی یہ وہ زمانہ تھا جب فارسی زبان بہت لوگ سمجھتے اور جانتے تھے مگر شاید خاص طور پر اس لئے آپ نے فارسی زبان میں

گفتگو کرنا شروع کر دی کہ آپ کے پہلو میں شہزادہ خوست بیٹھے ہوئے تھے۔ فارسی زبان گویا ان کی تو مادری زبان تھی انہوں نے ادب سے عرض کیا کہ سیدنا میں اردو بھی سمجھ سکتا ہوں اور شاید مجمع میں موجود لوگوں میں بعض یا اکثر شاید فارسی زبان نہ سمجھ سکتے ہوں اگر اُردو میں بیان فرما دیں تو سب سمجھ سکیں گے۔ اس پر اُردو زبان میں بات شروع ہوئی۔ سوچتا ہوں لوگ اس دور کی نسبت بہت اچھے تھے۔ تعصّبات کے عفریت سے بچے ہوئے اور سعادت مند تھے اور پھر آپ کو اس سے بہت پہلے یہ مژدہ بھی ذوالعرش المجید نے سُنا دیا تھا کہ وہ عزیز و قادر خدا تمہیں لوگوں کے حملوں سے محفوظ رکھے گا۔ اس لئے کوئی خوف آپ کے پاس بھی نہیں پھٹکتا تھا۔ اس محفل میں مجھے بلند نصیبے والا ایک درزی نظر آ رہا ہے۔ اس نے عرض کیا کہ آپ کے دعویٰ سے لوگوں میں اختلاف بڑھ گیا ہے۔ باپ بیٹے سے بھائی بھائی سے اور میاں بیوی سے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے بعد گویا ''لیریں لیریں'' ہو گئے ہیں۔ اس پر ذرا روشنی ڈالیں۔ آپ بڑے تحمل سے فرماتے ہیں۔ میاں کبھی درزی کی دکان پر گئے ہو۔ اس نے کہا جی میں تو خود درزی ہوں۔ فرمایا پھر تمہیں یہ بات سمجھنے میں کچھ مشکل پیش نہیں آنا چاہئے تھی۔ تمہارے پاس کوئی شخص کپڑا لاتا ہے کہ مجھے قمیص بنا دو یا کوئی اور ملبوس تو تم کیا کرتے ہو؟ بغیر اسے کاٹنے کے کوئی لباس بنا سکتے ہو؟ اس نے کہا جی میں سمجھ گیا اسے حیرت ہوئی کہ یہ اتنا بڑا مذہبی لیڈر ہے مجھ غریب کے سوال پر برہم نہیں ہوا۔ جیسا کہ عام علماء کہلانے والے کرتے ہیں۔ انہوں نے کمال ملائمت سے میرے سوال کا جواب دے دیا ہے اس سے اسے ایک اور سوال کرنے کی جرأت ہوئی۔ اس نے کہا جی میں اَن پڑھ ہوں لمبی چوڑیں دلیلیں سمجھ نہیں سکتا مجھے کوئی سادی سی دلیل اپنی صداقت کی بتائیں۔

اس پر جو جواب سُنا تو اس نے میرے روح و بدن میں گویا بجلی دوڑا دی اور میں نے جب سے یہ بیان سُنا ہے شاذ ہی میرے دل و دماغ کو اس کافی وشافی جواب نے اپنی گرفت سے آزاد کیا ہو اور وہ بھی شاید نیند کی بے ہوشی کے وقت ہی۔ درزی نے سُنا آپ بھی جواب سُنیں۔ حضرت اقدس اپنا داہنا ہاتھ اپنے چہرہ کے قریب لے گئے فرمایا دیکھو یہ چہرہ جھوٹے کا ہوسکتا ہے؟ اور میری سماعتوں کو اس جواب باصواب سے ایسی روحانی لذت نصیب ہوئی کہ گویا خود میں 17رجنوری 1903ء کی دوپہر کو اس نورانی محفل میں موجود تھا۔

اس درزی نے کہا یہ چہرہ تو سچوں والا ہے۔ میں ایمان لاتا ہوں۔ اس مجلس کے حاضرین کی بُلند بختی پر رشک آتا ہے۔ میں نے جہلم جا کر اس مقام پر رشک اور حسرت کے ملے جلے چند آنسو بہائے اور آنکھیں بند کر کے اس روح پرور نظارہ سے لطف اندوز ہونے کی سعی کی مگر کہاں۔ یہ 17رجنوری 1903ء کا واقعہ تھا اور اسی سال جولائی میں یعنی اس واقعہ سے عین چھ ماہ بعد 14رجولائی 1903ء کو کابل کے چرخی پل جیل کے قریب میدان میں اس سید شہزادے نے اپنی جان کا نذرانہ اپنے مالک وخالق کے حضور کمال حوصلے کے ساتھ بلکہ بے مثال خوش دلی کے ساتھ پیش کر دیا اور اس کو اس پر نہ قلق ہوا نہ تعجب کہ اللہ خبیر وعلیم نے اسے پیشگی اطلاع دینا شروع کر دی تھی کہ ''سر بدہ سر بدہ''

اہل خرد سے ہو نہ سکا جو تمام عمر
وہ کام آج تیرے قدح خوار کر چلے

میں جب کابل گیا اور کئی بار وہاں گیا تو وہاں اس حرماں نصیب گروہ کو تصوراتی آنکھوں سے ڈھونڈھنے کی کوشش کی جنہوں نے یہ ظلم عظیم کیا تھا مگر ان کی تو دھول بھی باقی نہ رہی تھی گو یا ہر روز کئی کئی بار یہ آسمانی آواز سُنتا ہوں کہ

''ابھی ظالم کی پاداش باقی ہے، ابھی ظالم کی پاداش باقی ہے''

اے لوگو عبرت پکڑو ایک صدی گزر گئی ابھی بھی تمہیں معلوم نہیں ہوا کہ 1901ء میں حضرت مولوی عبدالرحمن صاحبؓ اور 14رجولائی 1903ء کو کابل کی سرزمین پر حضرت سیّد عبداللطیف صاحبؓ کا اور 31راگست 1924ء کو حضرت مولوی نعمت اللہ خان صاحب اور 5رفروری 1925ء کو حضرت قاری نور علی صاحب اور حضرت مولوی عبدالحلیم صاحب کا بہنے والا خون ذوالانتقام رب کو کتنا پیارا تھا۔ حضرت صاحب نے کئی بار فرمایا ہے کہ ایک صدی پوری ہونے کے بعد حکمت ربی سے مامور زمانہ کے منہ سے نکلی ہوئی بات پھر ایک روشن نشان ثابت ہوتی ہے دیکھو وہ 1901ء تھا اور دیکھو یہ 2002ء ہے دوستو غور کرو اور سمجھو کہ حضرت صاحب کا جائزہ کیسا پر معرفت اور ابدی صداقتوں کا حامل ہے۔

یہ مسیحائی اعجاز دس بیس نہیں سینکڑوں نہیں شمار سے باہر ہیں۔ میں اس موجیں مارتے ہوئے سمندر سے ایک چلو ہی بھر سکتا ہوں۔ موسلا دھار بارش برس رہی ہو تو باران رحمت کے قطروں کو کون گن سکتا ہے جو میں ایسی جسارت کروں مگر یہ بھی میری طاقت سے بیرون ہے کہ جب ذکر حبیب چھڑ جائے تو میں چند ایسے واقعات بھی نہ لکھوں جنہوں نے میرے راہوار تخیل کی باگیں موڑ دیں اور جو گویا میرے جسم و جان کا جزو بن چکے ہیں اور سچ یہ ہے کہ میں انہی کے سہارے جیتا ہوں کیونکہ انہی سے حی و قیوم کی صفات اور اس کی شان اور اس کی ہستی ایسی آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے جیسے سورج کو نصف النہار پر دیکھ رہا ہوں۔

حضرت میر ناصر نواب صاحبؓ گھبراہٹ کی حالت میں سیّدنا حضرت مسیح موعودؑ کے پاس بھاگے گئے اور غلبہ رقت سے بڑی مشکل سے عرض کیا ایس پی (سپرنٹنڈنٹ پولیس) ہتھکڑیوں والے آدمی ساتھ لے کر وارنٹ لے کر آ رہا ہے۔ قدرے تامل کے ساتھ فرمایا ''ایسا نہیں ہوگا خدا تعالیٰ کی حکومت اپنے خاص مصالح رکھتی ہے۔ وہ اپنے خلفائے مامورین کے لئے اس قسم کی رسوائی پسند نہیں کرتا''۔ خدا کی نصرت پر ایسا بھروسہ کہ کمال بے اعتنائی سے فرمایا کہ

''ایسا نہیں ہو گا میرا خدا مجھے اِس رسوائی سے بچائے گا''

یہ وہ مقام توکل ہے جو آپ کو اوائل میں ہی الہاماً تسلی دیتے ہوئے فرمایا گیا تھا کہ ''کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے کافی نہیں''۔

میں ایک طرف اس خطرے کو دیکھتا ہوں کہ گرفتاری کے لئے پولیس ہتھکڑیوں سمیت دروازے پر کھڑی ہے۔ ادھر اس بندہ خدا جو محبوب قادر کریم ہے اس کی اس لمحے کی حالت کا تصور کرتا ہوں تو حیرت میں ڈوب جاتا ہوں کہ کیا مقام توکل ہے اور اللہ کی نصرت اور حفاظت پر کتنا پختہ ایمان ہے۔ کیوں نہ ہو فرماتے ہیں رات سرہانے پر سر رکھتا ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے تسلی دینا شروع کرتا ہے۔ تجھے کیا خوف ہے میں تیرے ساتھ ہوں (مفہوم یہی ہے الفاظ نہیں)۔

اسی لئے بڑی تحدی کے ساتھ مدمقابل کو ایک زارونزار لومڑی سے تعبیر کرتے ہیں اور خود حضور ہی کی زبانی یہ ماجرا سُنیں کہ اس کلام میں وہ نور ہے جس میں دوسروں کو دخل نہیں فرماتے ہیں۔

جو خدا کا ہے اسے للکارنا اچھا نہیں
ہاتھ شیروں پر نہ ڈال اے روبۂ زار و نزار

اور گھات میں بیٹھنے والے دشمنوں سے کوئی معذرت خواہی نہیں کرتے بلکہ کامل یقین اور وثوق کے ساتھ یہ نعرہ بلند فرماتے ہیں۔

ہے سر راہ پر مرے وہ خود کھڑا مولیٰ کریم
پس نہ بیٹھو میری راہ میں اے شریران دیار

نادانو مولیٰ کریم کے مقابل پر تمہارے مکروں سے بھلا میرا کوئی بھی نقصان ہوسکتا ہے۔

آپ کے خلاف ایک مقدمہ فوجداری ایک ہندو مجسٹریٹ کی عدالت میں چل رہا ہے۔ وہ متعصب ہندو مجسٹریٹ چھوٹی چھوٹی تاریخیں ڈال کر آپ کو پریشان کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

بدزبان لیکھرام آریہ 6/مارچ 1897ء کو قتل ہوا تھا۔ اب ہندو مشتعل تھے کہ میرزا صاحب کی سازش سے ان کا لیڈر مارا گیا تھا۔ شاید یہ ہندو بھی لیکھرام کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ اسے کسی نے بتایا کہ انہیں الہام کا دعویٰ ہے اور یہ کہتے ہیں کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ میں اس شخص کو ذلیل کردوں گا جو تیری ذلت کا ارادہ بھی کرتا ہے۔ چنانچہ ہندو مجسٹریٹ نے بھری عدالت میں آپ سے سوال کیا کہ ایسا الہام آپ کو ہوا ہے۔ آپ نے بڑے وقار کے ساتھ فرمایا ہاں یہ میرا الہام ہے اور خدا کا کلام ہے اور خدا کا مجھ سے یہی وعدہ ہے کہ جو شخص مجھے ذلیل کرنے کا ارادہ کرے گا وہ خود ذلیل کیا جائے گا۔

اب مجسٹریٹ کو تو اپنی کرسی اور قلم پر ناز تھا۔ اس نے کہا کہ اگر میں آپ کی ہتک کروں تو پھر۔ آپ نے فرمایا خواہ کوئی کرے۔ وہ خود ذلیل کیا جائے گا۔ مجسٹریٹ نے دو تین بار یہ سوال دُہرایا مگر آپ نے ہر بار وہی جواب بڑی تمکنت اور بے خوفی کے ساتھ دیا۔ سچ فرمایا ہے آپ نے

دلبر کی راہ میں یہ دل ڈرتا نہیں کسی سے
ہشیار ساری دُنیا اک باولا یہی ہے

(روزنامہ الفضل 14 رجنوری 2002ء صفحہ 3 تا 4)

۞۞۞۞۞۞۞۞۞



پرواز کون کر گیا پر تولتا ہوا
خاموش ہو گیا چمن بولتا ہوا

ثاقب زیروی

دربارِ خلافت کا موسیقار، نڈر اور درویش صفت

جس محفل سے ''محمد صدیق'' المعروف حضرت ثاقب زیروی جیسے نابغہ روزگار اٹھ جائیں اس کی رونقیں ماند پڑ جانے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔

والدین نے نام ''محمد صدیق'' رکھا تھا اور اس مرد قلندر کی 84 سالہ طویل اور 60 سالہ صحافیانہ روش شاہد ہے کہ اسے ''سچی'' صفات سے وافر حصہ عطا ہوا تھا۔ کیا مجال جو اس اسم بامسمیٰ ''صدیق'' نے کبھی ان کی نمائش کی ہو۔ وہ پنہاں ہی رہیں۔ یوں آندھیوں کے مقابل پر اس کا دیا ہمیشہ روشن ہی رہا اور بڑی مخالفتوں کے طوفانوں میں اس کی استقامت نصیب کشتی کسی بھنور میں نہ پھنسی۔ وہ سخت صبر آزما زلازل میں بھی نہ صرف ثابت قدم رہا بلکہ یہ سب اس کے لئے جرس کارواں ثابت ہوئے۔ مجھے 1944ء میں مرحوم سے تعارف حاصل ہوا تھا اور پھر مجھے انہیں بہت قریب سے دیکھنے کی سعادت عطا ہوئی۔ میں نے ان میں محبت اور وفا اور استقامت اور استقلال کے وہ جوہر دیکھے جو نایاب نہیں تو اس دور میں کمیاب ضرور ہیں۔ اس پر یہ خالق ارض وسماء کا احسان عظیم کہ اسے وہ والدین عطا ہوئے جنہیں ''رفاقت'' کے تعلق نے گوہر آبدار بنا دیا تھا۔

یہ بچپن کی تربیت اور والدین کا عمدہ نمونہ ثاقب بھائی کا قبلہ راست کرنے اور پھر ساری عمر راست رکھنے میں بیحد ممد ثابت ہوا۔ ان کے والد محترم نے 1905ء میں ایک دست حق پرست پر ہاتھ رکھ کر اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں تج دینے کا عزم کیا تھا اور ان کی والدہ محترمہ جو اندازاً دس سال قبل اللہ کے حضور حاضر ہو چکی ہیں ان کی زندگی کے ایک واقعہ کا علم مجھے ثاقب بھائی سے ہوا تھا۔ وہ بیمار پڑ گئیں ان کے اور ہمارے آقا سات سمندر پار بیٹھے تھے۔ تار کے ذریعے درخواست دعا برائے صحت بھجوانے کی کوشش

کامیاب نہ ہوئی۔ادھر مرحومہ کا اصرار کہ اس کریم ابن کریم کو کسی طرح اطلاع کرو۔آج کی برقی ایجادات کی سہولتیں بھی دستیاب نہ تھیں۔یوں بھی میرا تجربہ ہے کہ بعض دفعہ الٰہی تصور ایسا ہوتا ہے کہ سارے ذرائع ناکام ہو جاتے ہیں بہر حال حضرت صاحب کو اطلاع بھجوانے میں کسی طرح کامیابی نہ ہوئی ادھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ الٰہی لاسلکی کے ذریعہ سے سیدنا طاہر و مطہر کو اماں جی کی علالت کی اطلاع ہو گئی اور ادھر سے ثاقب صاحب کو غالباً تار کے ذریعہ حضرت صاحب کا ارشاد موصول ہوا کہ آپ کی والدہ صاحبہ کی علالت کا علم ہوا ہے دعا کر رہا ہوں۔پھر قربان جاؤں اس شافی مطلق کے کہ ادھر یہ برقی پیغام جاں نثار اور وفا شعار بیٹے کو پہنچا ادھر ان کی اماں جان کو شفاء عطا ہو گئی۔

مہ و سال تو یاد نہیں اتنا یاد ہے کہ برادرم ڈاکٹر حافظ مسعود احمد صاحب زندہ تھے۔انہیں جب اس اعجاز مسیحائی کا علم ہوا تو میرے ہاتھ ایک بند لفافہ جس میں معقول نذرانہ کی رقم اور درخواست دعا تھی اور جو ثاقب صاحب کی والدہ صاحبہ کے نام تھا ارسال فرمایا اور پھر زندگی بھر یہ ان کا معمول رہا۔وہ بھی نہایت کم گو اور نہاں در نہاں شخصیت تھے۔میرے استفسار پر اتنا اظہار کیا کہ وہ بہت خدا رسیدہ خاتون تھیں۔جن کی بیماری کی خبر سیدنا امام وقت کو خود اللہ تعالیٰ نے کر دی۔میری یہ مجبوری کہ یہ جملہ معترضہ بیچ میں آ گیا مگر دو بلکہ تین برگزیدہ روحوں کی سچی کہانی تھی جو نوک قلم پر آ گئی۔

عرض یہ کر رہا تھا کہ ایسی خدا ترس بلکہ خدا رسیدہ ماں کی آغوش میں پلنے والے اور اس کی بانہوں میں جھولنے والے اور اس کے ہونٹوں سے لوریاں سننے والے اور ایسے ماں باپ کی دعاؤں سے پروان چڑھنے والے خاص مقصد کی تکمیل کے لئے قوم میں ابھارے جاتے ہیں۔یہ روز روز پیدا نہیں ہوتے ایسے دیدہ وروں کے لئے لاکھوں دعاؤں اور ہزاروں آہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔تب ایسے لوگ وجود میں آتے ہیں۔جن کی فکر سے دماغ جلا پاتے ہیں اور ان کے عمل سے معاشرے رنگین بنتے ہیں۔

یہ تو بچپن سے لڑکپن کا زمانہ تھا جس میں یہ پودا لگایا گیا۔وہ مٹی بہت زرخیز تھی اور اس میں ''نم'' بھی موجود تھا پھر نوجوانی آئی۔ابھی سن صرف 22،23 سال کا ہی تھا کہ ''شاہنامہ اسلام'' کی طرز پر ''دور خسروی'' کے نام سے ''منظوم تاریخ دور ثانی'' تحریر کی۔میں اس کے محاسن کو شمار کرنے کا یہاں ارادہ نہیں رکھتا صرف ''دور خسروی'' کے ''انتساب'' پر میری نگہ ہے جو کچھ یوں ہے۔''اس پر شکوہ واولوالعزم (حضرت مصلح موعودؓ) کے نام جس نے میرے تخیل کے راہوار کو دین کی طرف موڑا گر قبول افتد، زہے عز و شرف''۔

گویا اٹھتی جوانی میں اسے استاد بنایا جس کی مبارک پیدائش سے بھی تین سال قبل 52 صفات پر مشتمل خوشخبری اس کے والد معظم کو عطا ہوئی تھی اور ثاقب نے اپنی زندگی کے ہر سفر اور ہر جادہ اور ہر پروگرام کے لئے اپنے قلب و ذہن اور اپنی جان عزیز کی باگیں اس شہ سوار کے ہاتھوں میں دے دیں جس کی راہ حق کی طرف راہنمائی اور راہبری اور راست روی کی ضمانت خود خدائے علیم و خبیر نے دی تھی۔

ہاں وہی جس کے بارہ میں عرش سے آواز آئی تھی کہ ’’وہ سخت ذہین وفہیم ہوگا‘‘اور’’دل کا حلیم‘‘اور’’وہ اسیروں کی رستگاری کا موجب ہوگا‘‘ اور ایک ثاقب ہی نہیں ’’قومیں اس سے برکت پائیں گی‘‘۔

پس تاریخ شاہد ہے کہ اس بےنظیر شہسوار نے ساری عمر اس اپنے خادم کی باگوں کو مضبوطی سے تھامے رکھا اور صحیح خطوط پر ایسی راہنمائی کی جو’’سخت ذہین وفہیم‘‘کے ہاتھوں سے ہی ممکن تھی اور پھر یہ غلام ساری عمر اپنے آقا کے گن گاتا رہا کبھی وہ کہتا ہے۔

تجھ کو مولا نے کیا عطر رضا سے ممسوح
یہ مہک گلشن عالم میں بسا دے ساقی
اپنے ثاقب کو جو احساس کی دولت بخشی
تجھ کو اس لطف کی اللہ جزا دے ساقی

کبھی اپنے آپ کے لئے گدائے درِمحمود کا لقب طلب کرتے ہوئے یوں ملتجی ہے۔

میں خوش ہوں مجھ کو ملی ہے گدائی محمود
کچھ اور میرے لئے دوست!اہتمام نہ کر
مٹے بغیر درِ یار تک رسائی ہو
یہ بات جھوٹ ہے ثاقب خیال خام نہ کر

ثاقب صاحب سے پہلی شناسائی کالج کے گراؤنڈ میں ہوئی جہاں گویا ایک فرشی نشست قائم ہوگئی تھی۔ ہمارے پرنسپل صاحب میر محفل تھے اور ثاقب صاحب اپنے اشعار سنا رہے تھے۔ جون 1947ء تک کل تین سال تک میرا قیام قادیان میں رہا اور یہی تین سال کا عرصہ میرا حاصل حیات ہیں جو میں نے مسیح موعودؑ کی بستی میں گزارے۔ جہاں کی فضاؤں میں ایک عجیب سا روحانی کیف بسا ہوا تھا۔ عمر کے باقی مہ وسال تو بس کٹ گئے جن کا نہ حساب رکھنا ضروری ہے نہ احوال بتانا کچھ مفید۔ بچپن اور لڑکپن تو پہلے گزر چکا تھا۔ اس کے بعد (تقسیم ملک کے بعد) زائد از نصف صدی کا عرصہ ہم نے گنوا دیا۔ کچھ سال حصول رزق کا حصہ بنے کچھ کالے حروف پڑھنے میں کھپ گئے کچھ فضول باتوں کی نذر ہوگئے۔ کچھ عرصہ عمر سو کر گزار دیا۔ ہاں کچھ وقت صحبت یاراں میں بھی گزارا۔ خصوصاً ہر سال کے آخر میں تین دن ہم ایک للٰہی محفل میں گزارتے۔ اب قریباً 20 سال سے یہ دولت بھی چھن چکی ہے المختصر تین سال اوّل اور پھر چند دن ہر سال دسمبر کے آخری عشرے کے۔ متذکرہ بالا محفلوں کے یہی وہ مختصر حصہ عمر طویل ہے جس کی مہک روح میں رچی ہوئی ہے۔ جن کی یاد سے ٹوٹا ہوا دل بھی بہلاتا ہوں اور جن کے تصور سے لطف اٹھاتا ہوں۔ کاش کوئی ایسی ایجاد ہوتی جو اس روحانی کیف کو اس وجدان اور روح

پر ورمناظر کا صحیح صحیح عکس اتار لیتی اور پسر موعود اور دیگر اہل اللہ کے اقوال کو ریکارڈ کر لیتی یا کوئی ایسا ترجمان حقیقت بیان ہوتا جو حضرت بھائی عبدالرحمن صاحبؓ قادیانی کی طرح تصویر کشی کرتا جیسے انہوں نے جلسہ مذاہب عالم میں ''اسلامی اصول کی فلاسفی'' کے بیان کی تھی۔

''لاہور'' اپنی اشاعت کے پچاس برس پورے کر چکا ہے۔اس دوران اس موقر جریدے کو بند کر دینے کے لئے اہل اقتدار نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔اشتہارات کی بندش ''شاعر لاہور'' حضرت ثاقب صاحب جو مشاعروں کی روح رواں اور پسندیدہ اور محبوب شاعر تھےان کے لئے ریڈیو اور ٹی وی پر شعر کہنے کی مناہی کر دی۔ستم بالائے ستم یہ کہ ایک طویل عرصہ تک ''لاہور'' کے بنڈل گندے نالے میں پھینک دیئے جاتے رہے اور یہ سب بالائی حکام کے تحت ہوتا رہا۔میری رائے میں ایسی قبیح اور کمینہ حرکت حکومت کا صاحب اقتدار تو کیا اخلاقی سطح سے کوئی گرا ہوا شخص بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سب کچھ ہوا مگر مدیر لاہور کا ابتدائی استاد اور معلم اور شہسوار جس کے مقدس ہاتھوں میں اس نے نوجوانی میں اپنے عقل وفکر کی باگیں تھمادیں تھیں وہ تو ایسا اولوالعزم تھا کہ یہ سارا دور اس کی مثال پیش کرنے سے یکسر قاصر ہے اور پھر جمال ہمنشیں درمن اثر کرد کے قول صادق کے مطابق یہ شاگرد خاص بھی اسی کے مس سے کندن ہو گیا تھا۔سوچتا ہوں کہ اس کے والد ماجد حضرت مولوی حکیم اللہ بخش صاحب نے اپنے اس نوخیز اور ہونہار بیٹے کے کان میں پھونک دیا ہو گا کہ دیکھ میرے نور نظر اوکھلی میں سر دیا ہے تو پھر ڈرکا ہے کا۔اور سن میرے اور تیرے اس دور کے ہادی و مہدی کا یہ نعرہ مستانہ ہمارے لئے بھی راہِ ہدیٰ کا تعین کرتا ہے اسے نہ بھولنا اور یہ ہے۔

سخت جاں ہیں ہم کسی کے بغض کی پرواہ نہیں
دل قوی رکھتے ہیں ہم دردوں کی ہے ہم کو سہار

یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک جو عہد بیعت کرتا ہے اسے اپنی استطاعت کے مطابق اس پر عمل کرنا ہو گا کسی کو کم کسی کو زیادہ مگر یہ پھولوں کی سیج نہیں ہے اس کھٹالی میں پڑنے سے تکالیف آئیں گی۔مگر ثابت قدم رہنا ہو گا۔اللہ اس کی توفیق بخشے اور قدم نہ لڑکھڑائیں اور ہم ثابت قدمی دکھائیں جیسے میرے مرحوم بھائی ثاقب نے دکھائی۔تو اللہ کے حضور اجر عظیم کے مستحق ٹھہریں گے وہ کسی کی قربانی کو بغیر پھل کے نہیں رہنے دیتا۔

''لاہور'' اور ''مدیرِ لاہور'' کا ایک ہی ''جرم'' تھا اور وہ بہت بڑا ''جرم'' تھا وہ کیا تھا خود حضرت ثاقب صاحب کی زبان فیض ترجمان سے ہی سنیں۔

میں فدائے دین ھدیٰ بھی ہوں در مصطفی کا گدا بھی ہوں

میری فرد جرم میں درج ہو مرے سر پہ ہے یہ گناہ بھی

اوراس کی پاداش میں اخباروں کے کاغذات کے کوٹہ میں تکلیف دہ بندش، اشتہارات بند، ادیبوں اور شاعروں کی مجالس میں بلائے جانے پر پابندی، ریڈیو اور ٹی وی کے دروازے آپ کے لئے مکفل پھر اسی پر بس نہیں آئے دن جواب طلبیاں، تعزیری نوٹس پھر سنگین مقدمات کا قیام۔غرض کوئی بھی تیر حکومت کے ترکش میں نہ تھا جو اس مرد قلندر اور بندہ بے نوا پر نہ چلایا گیا۔مگر وہ مسلسل حق بات کہتا رہا اور کسی جابر سلطان کے آگے نہ جھکا بلکہ کھلم کھلا چیلنج دیا کہ

قدم شہادت گہ محبت میں ہم نے رکھا ہے مسکرا کر
ہمارے سینے کھلے ہوئے ہیں کہاں ہیں تیر آزمانے والے

پھر ایسے اللہ کے بندوں کو جنہیں اللہ ہی کی راہ میں جوروستم کا نشانہ بنایا جاتا ہو صبر اور طاقت اور سہارا اور قناعت بھی آسمان سے عطا ہوتی ہے۔کبھی ان کے منہ پر ایسا حرف شکایت نہ آیا جس سے دور کا اشارہ بھی ملے کہ لاہور کو مالی مشکلات کا سامنا ہے۔کبھی ایک بار بھی نہیں اللہ کی رزاقیت پر ہی انہیں یقین تھا اور بندوں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے گریز۔وہ خود بھی اسی پر عامل تھے اور اسی کی تلقین ہر کسی کو کرتے تھے کہ۔

تمہارے شیشہ غیرت کو جس سے ٹھیس لگے
ہزار تشنہ لبی ہو مگر وہ جام نہ لو

بہترین شاعراوراس کا بے مثل ترنم

ہم کہ ابتداء ہی سے راگ بھیریں وغیرہ اور قوالوں کی قوالی اور دیگر مترنم آوازوں سے الرجک تھے جب اس بے بدل شاعر کو سنا تو ہم تو مکمل طور پر بے اختیار ہو کر اس کی کمال نغمگی کے شیدا ہو گئے۔جس میں ایسا سوز تھا جس کی مثال دینے سے یا تشبیہہ بیان کرنے سے میں تو یکسر قاصر ہوں نہ میری قلم میں طاقت ہے نہ زبان میں۔ان کی نغمگی منفرد تھی سامعین کی نگاہوں کا مرکز بنے رہتے تھے۔ماہ دسمبر کے آخری عشرہ میں ہم ان کا کلام سننے کے لئے ساعتوں کو خوب تیار کیا کرتے تھے جونہی مطلع پڑھتے ہم مست اور بے خود ہو جاتے تھے۔

قرآن کریم کی سورۃ شعراء میں جہاں الا الذین سے استثناء شروع ہوتا ہے وہ صد فیصد اس پر پورے اترتے تھے۔دل سے جو آواز نکلتی ہے دل پہ ہی اترتی ہے یوں تو ان کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں مگر اکثر نظمیں ان کی ہی زبانی سنیں ہیں۔مرکزی خیال ان کی شاعری کا مدح رسول مکی و مدنی تھا۔کلام جہاں سے پڑھیں طائر کی نظر اپنے گھونسلے پر ہی ہوتی ہے۔پھر پھرا کر نعت رسول مقبول ﷺ ہی ان کے کلام کا معراج ہوتا ہے۔

پھر ایک اور خاص بات ان کے کلام میں ایسی ہے کہ شاید اس خصوصیت میں اور کوئی ان کا ہم پلہ نہ ہو۔ کہ ہر جلسہ سالانہ کے موقع پر جو نظم پڑھتے تھے وہ اس سال کی مکمل روئداد ہوتی تھی۔ میرے اس دعویٰ کی وضاحت اگر بیان کی جائے تو مثلاً 1974ء سے ہی شروع کریں تو ہر سال کا خلاصہ اور اس کے مطابق اشعار پیش کرنے پڑیں گے جو ظاہر ہے بموجب طوالت ہوگا۔ مرحوم ثاقب صاحب منظوم تاریخ لکھتے رہے گو کیفیت اور کمیت کا فرق ہونا لازم تھا اور ہے۔

ثاقب زیروی پر فوجداری مقدمہ اور وارنٹ گرفتاری کا اجراء

سال اور مہینہ تو یاد نہیں 1974ء کے واقعات کے متعلق مرحوم ''روزنامچہ'' شائع کرتے تھے۔ اس میں سرگودھا میں مظالم کا بھی ذکر کیا۔ ایک صاحب نے علاقہ مجسٹریٹ کی عدالت میں استغاثہ مدیر لاہور اور پبلشر پر دائر کر دیا اور پھر یوں ہوا کہ انہیں کوئی نوٹس وغیرہ نہ ملا اور وارنٹ گرفتاری جاری ہو گئے اور پھر بلا ضمانت ہمیں جب اس کا علم ہوا تو برادرم محترم حافظ مسعود احمد صاحب اور میں علاقہ مجسٹریٹ کے پاس گئے اور انہیں بتایا کہ عمداً ان کی اطلاع یابی نہیں کرائی گئی اور بلا ضمانت وارنٹ آپ کی عدالت سے جاری ہو گئے ہیں۔ ہم تاریخ مقررہ سے پہلے ہی ملزمان پیش کر دیتے ہیں آپ ان کی ضمانت لے لیں مگر وہ بھلا اتنی طاقت کہاں سے لاتے۔ آخر مقررہ تاریخ کا دن آ گیا۔ دونوں ملزمان ربوہ پہنچے۔ اوّل حضرت سیدنا ناصر الدین سے واقعات اور خطرات عرض کئے۔ فرمایا ''رات یہیں رہیں کل مجھے مل کر جانا''۔

رات اللہ کے چنیدہ بندے نے عزیز وقدیر کے حضور زاری کی اور بشارت مل گئی۔ صبح جب حسب ارشاد آپ سے ملنے گئے تو فرمایا جاؤ ''بے فکر رہنا کچھ بھی نہیں ہوگا''۔ آگے سرگودھا میں جو کچھ ہوا اسے فوق العقل اعجاز مسیحائی سے کمتر کوئی نام دیا ہی نہیں جا سکتا۔

مجسٹریٹ صاحب جو ایک ''راجہ'' صاحب تھے ہم ان کے رویے سے ڈرے ہوئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کا سرگودھا میں قیام جہاں ان کے سسرال کا گھر ہے مدعیان کی عنایات کا مرہون منت ہے۔ مستغیث فریق بھی جتھہ لے کر آئے ہوئے تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ راجہ صاحب ''نام کے راجہ'' ہیں یہ جرات نہیں کریں گے کہ ضمانت لے لیں۔ پھر بھی فردات لے کر میرے بیٹے اور میں علاوہ وکالت کی تصدیق کے اپنی نمبرداری کی سند بھی ہمراہ لائے تھے کیونکہ عدالت سے ہر قسم کی بے انصافی کا خطرہ تھا وہی ہے جیسا شاعر نے کہا ہے۔

تمہارا شہر تمہیں مدعی تمہی منصف
ہمیں خبر تھی ہمارا قصور نکلے گا

ادھر اس تصور سے ہی دل بیٹھے جا رہا تھا کہ م ش صاحب جیسا مسلم لیگی بزرگ اور ثاقب صاحب جیسے بزرگ عدیم المثال ادیب اور

شاعر کو جیل بھیج دیا جائے۔وہ دور بہت ہی ناتوانی اور نارسائی کا تھا۔لیکن

قادر کے کاروبار نمودار ہو گئے

اللہ درجات بلند کرے برادرم محمد اقبال صاحب سینئر ایڈوکیٹ اور مسلم لیگ کے گولڈ میڈلسٹ کے جنہوں نے جب ان دونوں ملزمان کو احاطہ عدالت میں دیکھا تو پوچھا کہ یہ کیوں آئے ہیں۔ان کی خدمت میں میں نے تفصیل بیان کی تو (وہ خود وکالت چھوڑ چکے تھے یونہی ہماری تربیت کے لئے بارروم میں آیا کرتے تھے)اسی وقت مستغیث کو بلا کر کہا تمہیں شرم نہیں آئی کہ دو پرانے مسلم لیگیوں اور اس بے نظیر نعت گو کے خلاف مقدمہ کر دیا ہے۔اگر احمدیوں پر مقدمہ کرنا زیادہ ضروری سمجھتے ہو تو جاؤ عبدالسمیع نون پر مقدمہ کرلو۔مگر میرا یہ حکم ہے کہ م ش صاحب اور ثاقب صاحب کے خلاف ابھی مقدمہ واپس لو اور پھر دفتر ڈسٹرکٹ کونسل میں مجسٹریٹ مذکور کی کچہری میں خود ساتھ گئے اور مقدمہ اسی وقت دم نقد خارج کروا کر پانچ منٹ میں واپس بارروم میں آئے وہیں چائے کا دور چلا اور پھر ثاقب بھائی سے وکلاء نے نعتیں سنیں اور یہ دونوں ملزمان پہلی پیشی پر ہی بصد ادب واحترام بری ہو کر روانہ ہوئے۔اس کے بعد میرا ٹاکرہ ایک مقام پر م ش صاحب سے ہوا تو کہنے لگے نون صاحب آپ کی احتیاط کی انتہا کہ نمبرداری کی سند بھی ساتھ اٹھالائے تھے نہ بھولی ہے نہ بھولے گی۔

اس ابتلاء کے موقع پر خادم نے دعا کی ہوگی اور مخدوم نے بھی مناجات کی۔کن الفاظ میں یہ تو اللہ علیم ومجیب ہی بہتر جانتا ہے مگر یہ شعر بھی اس کیفیت کا ہی بیان ہے۔

میری نیستی کا عالم تیرے ''کن'' کا منتظر ہے
میرے مہرباں دکھا دے ''فیکون'' کا نظارہ

میرے ساتھ محبت ووفا کا سلوک

اب کچھ اس لطف وعنایت کا ذکر بھی کر دوں جو میرے ساتھ 50 سال سے زائد عرصہ تک روا رکھا گیا۔اس سلسلہ میں کچھ تو میرے ذاتی معاملات کا دخل ہے جن کا بیان کرنا ضروری نہیں کچھ تو حجاب ونقاب میں بھی رہنا چاہئے۔میں انہیں ہمیشہ لکھا کرتا تھا کہ آپ ''مجاہد'' اور میں ''قاعد'' اور دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔دعا کے لئے اکثر لکھتا تھا بلا مبالغہ سینکڑوں خطوط لکھے ہوں گے اور ایک بھی ایسا نہیں جس کا جواب نہ آیا ہو۔انہیں مخاطب کرتے ہوئے روحانی لذت محسوس ہوتی تھی اس لئے بعض دفعہ میں خط لکھتا تھا اور یہی حال ہوتا کہ ۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

کچھ سال ہوئے ایک روز بغیر کسی خط میں اپنی آمد کا ذکر کرنے کے ایک جمعہ کے روز کوئی 11 بجے کے قریب میرے گھر پر تشریف لائے میرے لئے یہ بڑی خوشی کا دن تھا۔ چائے نوشی کے بعد کھانے کے لئے جب کھانے کے کمرے میں گئے تو میں نے ان کی شیروانی اٹھا کر کھانے کے کمرے میں اس لئے رکھ دی کہ اس مرد درویش کے ملبوس سے کوئی ملازم یا ملازمہ کوئی رقم ''تبرک'' سمجھ کر نہ اچک لے۔ واپس بیٹھنے کے لئے کمرے میں آئے تو میں شیروانی ساتھ اٹھالا یا اور پھر ہم سب نماز جمعہ کے لئے چلے گئے اور وہاں ہی ثاقب بھائی اور ان کا ایک صاحبزادہ اور ایک اور دوست جو ساتھ تھے عازم لاہور ہوئے۔ لاہور جا کر خط لکھا کہ میرے بیٹے کو حیرت ہوئی کہ چچا یعنی یہ خاکسار شیروانی اٹھائے پھرتا رہا اور پھر لکھا کہ میں نے اسے سمجھایا کہ وہ آپ کی تربیت خاموشی سے کر رہے تھے کہ مجھ ایسے ''غریب'' آدمی کی شیروانی اٹھانے میں انہیں کچھ باک نہیں حالانکہ اس میں کوئی خاص بات نہ تھی اور نہ میں نے ایسا کر کے ان پر کوئی احسان کیا تھا۔

اس کے بعد ہلال پور میرے گاؤں آنے کے عمر بھر خواہش مند رہے مگر افسوس کہ بیماری اور پھر موت نے انہیں مہلت نہ دی اور ہماری یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔

جب حکمران وقت پر زوال آیا مسند حکومت سے ہٹا دیئے گئے اور پھر مقدمہ قتل میں گرفتار ہو گئے تو اس عبرت ناک صورت حال پر ایک دائمی اثر رکھنے والی نظم ثاقب صاحب نے لکھی تھی اور پھر جلسہ سالانہ کے موقع پر پڑھی تھی جس کا ایک شعر تھا۔

آندھی کی طرح جو اٹھے تھے اب گرد کی صورت بیٹھے ہیں
ہے میری نگاہوں میں ثاقب انجام بلند ایوانوں کا

برادرم بزرگ ملک محمد اقبال صاحب سینئر ایڈوکیٹ کو مسلم لیگ کے اولین خدام میں شمولیت کا شرف حاصل ہونے پر گولڈ میڈل بھی دیا گیا تھا۔ ساری عمر انہوں نے مسلم لیگ کے ساتھ اپنا تعلق استوار رکھا اس نظم کا شہرہ سن کر مجھے ارشاد فرمایا ٹیپ ریکارڈ اور یہ ریکارڈ شدہ نظم بار روم میں لاؤ ہم سب سنیں گے۔ چنانچہ میں نے تعمیل کی وہ اور دیگر معزز سینئر وکلاء بے حد محظوظ ہوئے۔ ان دنوں مسلم لیگی حضرات کسی انتخابی مہم کے سلسلے میں جا بجا اجلاس منعقد کر رہے تھے۔ چونکہ ملک محمد اقبال صاحب بانی پاکستان کے معاون رہے تھے اس لئے انہیں بھی خطاب کرنے کے لئے مدعو کیا جاتا تھا۔ انہوں نے میری موجودگی میں اپنے ساتھیوں کو بار روم میں طلب فرما کر ایک نہایت عمدہ اور دلچسپ تجویز مسلم لیگ کے جلسوں کی کامیابی کے لئے بتائی۔ انہوں نے کہا کہ جلسوں کا اعلان کیا کرو کسی سے تلاوت کروانے کے بعد ثاقب صاحب کی اس نظم کی ٹیپ چلا کر حاضرین کو سنا کر جلسے کے اختتام کا اعلان کر دیا کرنا جو تم نے گھنٹوں میں بیان کرنا ہے وہ تمہاری تقریروں سے زیادہ عمدگی کے ساتھ چند منٹوں میں ثاقب صاحب کی زبان سے یہ نظم بیان کر دے گی۔

ثاقب بھائی دربار خلافت کا ایسا موسیقار تھا جس کی مثال ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ ثاقب صاحب جیسے انسان کا دستیاب ہونا سہل نہیں ہوتا۔اس کے لئے فلک کو برسوں گردش کرنی پڑتی ہے۔آسمان کہیں خاک چھان کرانہیں ڈھونڈتا ہے۔

سیدنا حضرت حکیم مولانا نورالدین خلیفۃ المسیح الاوّلؓ کی وفات کے چار سال بعد ثاقب صاحب کی ولادت ہوئی مگر وہ نورالدین اعظم بھی یگانہ روزگار تھا توحید پرست،متوکل الی اللہ اور عاشق قرآن اس کے حالات پڑھ کر یہ شاعر بھی اس پر فریفتہ ہوگیا اور یوں گویا ہوا۔

قابل صد ناز ہے ثاقب یہ بھیرے کی زمین
جس میں چمکا نور الدین سا بے بہا رنگین نگیں

اب سیدنا حضرت مصلح موعودؓ کے 1965ء میں اللہ کے حضور حاضر ہوجانے کے منظر کی دلفگار یاد دلانے والے کو آنکھیں تلاش کریں گی۔ساری دنیا سے نرالے اور انوکھے لحن میں اس کے لافانی شعر کو اس کی زبان سے سننے کو ہمارے کان ترسیں گے مگر پا نہ سکیں گے۔

دن ڈھل گیا تو درد نصیبوں کا قافلہ
کاندھے پر آفتاب اٹھائے ہوئے چلا

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی وفات کے بعد اکتوبر 1982ء میں جلسہ انصاراللہ کے اختتامی اجلاس میں جو زیرصدارت حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ منعقد ہوا فرشی نشست تھی۔حضرت صاحب کی شیریں آواز بھی محفوظ ہے۔جب فرمایا کہ ''اب مکرم ومحترم ثاقب زیروی صاحب اپنا تازہ کلام سنائیں گے ثاقب صاحب تشریف لائیں''۔حضرت صاحب کے پہلو میں یہ خادم آکر بیٹھا اور وہ ابدی کلام ترنم سے سنانا شروع کیا جس کا ایک شعر کچھ یوں ہے۔

افلاک پہ روح ناصر دیں جھوم اٹھی فرط مسرت سے
جب آئی نوید فتح و ظفر اسپین کے لالہ زاروں سے

یہ شعر پڑھتے ہوئے''روح ناصر دیں'' کے الفاظ پر آواز رندھ گئی اور ثانیہ بھر رک کر بمشکل یہ شعر ادا کیا پھر آخری شعر پر پہنچے اور اس شعر کا پہلا مصرعہ چار پانچ دفعہ پڑھا کہ۔

ثاقب یہ کرم بھی کیا کم ہے ناصر جو لیا طاہر بخشا
ورنہ دیوانے مر جاتے سر ٹکرا کر دیواروں سے

محترم ثاقب صاحب کی وفات کی خبر سن کر دارالضیافت ربوہ میں پہنچ گئے۔چہرے کی زیارت کی یوں لگا ابھی امام وقت آواز دے گا

اور یہ باوفا فدائی لبیک لبیک کہتا ہوا اپنے مخصوص لحن میں نغمہ سرائی شروع کر دے گا۔

دو تین بار میں اندر کمرے میں گیا جہاں مرحوم بھائی کا جسد خاکی رکھا گیا تھا۔ الوداعی بوسہ دیا جو اس یارِ غم گسار کو آخری سلامی تھی اور پھر چند قدم میت کو کندھا دے کر اور پھر قبر پر اجتماعی دعا میں شامل ہو کر ہم نے پچپن سالہ احسانات کا گویا بدلہ اتارنے کی کوشش کی۔

اے جانے والے اللہ کے فضل اور رحم اور کرم کے سایوں میں تیرا بسیرا ہو اور اپنے مرشد و محبوب کے قرب میں تجھے جگہ ملے کہ ساری عمر تو مہجوری کی آگ میں سلگتا رہا۔ تو نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ اپنے عشق کی داستانیں اپنے لہو سے رقم کی تھیں۔ کبھی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عشق کی مستی میں کہتا کہ۔

ہماری تو جان بھی وہی ہیں ہمارا ایمان بھی وہی ہیں
وہ اور ہوں گے درِ محمدؐ پہ جا کے پھر لوٹ آنے والے

کبھی ظالمانہ قوانین کے باعث اپنی بے بسی اور نارسائی کہ ہاتھوں پریشان ہو جاتا مگر رحمت ربی سے کبھی مایوس نہ ہوتا اور یقین سے کہتا۔

کبھی تو آئے گا وہ زمانہ کبھی تو ہوگا میرا بھی جانا
کہوں گا روضے پہ سر جھکا کر درود تم پر سلام تم پر

اور پھر ہجر کی تپش جب برداشت سے بڑھ جاتی تو دل کے سارے ارمان ایک آرزو اور ایک تمنا بن کر بے اختیاری کی حالت میں یہ دردمندانہ التجا بن جاتے کہ۔

بلا لو ثاقب کو اپنے در پر درود تم پر سلام تم پر

اب عاشق و معشوق اللہ کرے اکٹھے ہو جائیں وہیں تیری ملاقاتیں آقا اور ان کے جگر گوشوں سے بھی ہوں گی۔ زمانے نے تجھے ایذائیں دیں زخم لگائے یہاں تو نے کبھی اظہار نہ کیا اب اپنے خالق و مالک کو دل کے سارے زخم دکھا کر اس سے بہترین اجر وصول کر۔

(روزنامہ الفضل 19/مارچ 2002ء صفحہ 3 تا 4، 6)

تیرے بندے اے خدا سچ ہے کہ کچھ ایسے بھی ہیں

❁❁❁❁❁❁❁❁❁



محترم شیخ بشیر احمد صاحب سابق جج ہائی کورٹ کی چند یادیں

کب نکلتا ہے کوئی دل میں اتر جانے کے بعد
اس گلی میں دوسری جانب کوئی رستہ نہیں

روزنامہ الفضل کی 11 رمئی کی اشاعت میں واجب الاحترام بزرگ معروف قانون دان منکسر المزاج خادم دین شیخ بشیر احمد صاحب سابق جج عدالت عالیہ لاہور کے حالات زندگی پر مشتمل ان کی ایک صاحبزادی صاحبہ کا مضمون شامل ہے۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے انہوں نے حضرت ممدوح کے خانگی حالات پر عمدہ طریقے سے روشنی ڈالی ہے۔

اوّل تو سیدنا حضرت رسول عربی ﷺ کا یہ فرمان کہ اذکروا موتاکم بالخیر میرے پیش نظر ہے۔ نیز مجھے 1952ء سے جب میں نے لاء کالج میں داخلہ لیا تو جناب شیخ صاحب سے تعارف کی سعادت حاصل ہوئی۔ یونیورسٹی کے طلبہ شوقیہ بھی اور کبھی کبھی کالج کی انتظامیہ کی ہدایت پر بھی ہائی کورٹ میں معروف وکلاء کی بحث سننے جایا کرتے تھے۔ مجھے بھی شوق تھا اور جن معروف وکلاء نے بطور خاص مجھے اپنی قابلیت فصیح وبلیغ قوت بیانیہ اور اس کے ساتھ خوداعتمادی کے ساتھ اپنا موقف پیش کرنے سے متاثر کیا ان میں جناب ایم نور صاحب بار ایٹ لاء، جناب سردار محمد اقبال صاحب سابق چیف جسٹس، جناب شیخ بشیر احمد صاحب اور جناب مسٹر جسٹس منظور قادر صاحب بیرسٹر تھے اوّل الذکر دو صاحبان تو ہمارے گورنمنٹ لاء کالج کے لیکچرار تھے اور ہمیں ان سے فوجداری اور دیوانی قوانین پڑھنے کے مواقع بھی ملے اور موخر الذکر دونوں حضرات کو عدالت کے دوران بحث کرتے ہی سنا۔ میری یہ جچی تلی رائے ہے کہ گو یہ سب بہت بڑے قانون دان اور عالم فاضل تھے مگر جناب شیخ بشیر احمد صاحب وکلاء، علماء اور فضلاء کی مجلس کے صدر کہلانے کے مستحق تھے۔ ان سب حضرات کو انگریزی زبان پر کمال کا عبور حاصل تھا بحث کے دوان (اس زمانے میں انگریزی زبان میں ہی بحث ہوا کرتی تھی) انہیں کسی قسم کی دشورای کا سوال ہی نہیں ہوتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ انگریزی ان کی مادری زبان ہے اور اس زبان میں اظہار ان کے لئے پسندیدہ اور سہل تر ہے۔ اور بحث کرتے وقت یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا یہ حضرات تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہیں جو سیدھا دوڑ رہا ہے اور منزلوں پر منزلیں طے کرتا جا رہا ہے۔

ایک دفعہ مقدمہ قتل میں ضمانت کا معاملہ ہائی کورٹ لاہور میں پیش ہونے والا تھا ملزم فریق میرے ننھیال کے گاؤں کے لوگ تھے

انہوں نے مجھے جناب شیخ بشیر احمد صاحب کی شہرت سن کر مجبور کیا کہ انہیں وکیل کرادوں میں نے انہیں بتایا کہ موصوف تو دیوانی مقدمات میں مہارت رکھتے ہیں فوجداری مقدمات کی پیروی نہیں کیا کرتے مگر ان کا اصرار تھا کہ ضمانت کا سوال ہے شیخ صاحب جیسے معزز اور باوقار ایڈووکیٹ کے ذریعے ہی کامیابی کا امکان ہے چنانچہ میں نے شیخ صاحب ہی سے گزارش کر دی۔ انہوں نے وہی جواب دیا جس کی امید تھی البتہ میری دلجوئی کی خاطر ایم انور صاحب بار ایٹ لاء کو فون کر کے کہا کہ آپ اس مقدمہ کی پیروی کریں اور جناب شیخ صاحب کا طرز گفتگو نہایت بے تکلفانہ ہوا کرتا تھا۔ جب میں گیا تو فیس کا پوچھا بیرسٹر صاحب نے کہا شیخ صاحب میرے بڑے بھائی ہیں انہوں نے حکم دیا ہے کہ فیس وغیرہ کا ذکر مت کرو۔ میں نے بہت اصرار سے انہیں فیس تو ادا کر دی مگر میرے ساتھی خوش تھے کہ تھوڑی فیس دے کر اتنا بڑا وکیل کر لیا ہے۔

سرگودھا کے ٹوانوں اور نونوں کے درمیان نواب سر اللہ بخش ٹوانہ کی سینکڑوں ایکڑ اراضی اور کوٹھیوں کی تقسیم کا تنازعہ شروع ہوا۔ نواب صاحب خود بے اولاد تھے اور لواحقین میں سے ایک فریق نے اپنے موقف کی بنیاد ایک فتویٰ پر رکھی تھی۔ مگر شیخ صاحب کے زوردار دلائل کے سامنے وہ فتویٰ بے اثر ثابت ہوا۔ اور بریگیڈیئر گلشیر خان صاحب نون کو میں نے جناب شیخ صاحب کی قانون دانی قابلیت دیانت اور زبردست قوت بیانی کی بار بار تعریف کرتے سنا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ شیخ صاحب کے اصل جواہر تو تب کھلے جب 1953ء کے فسادات کی تحقیقاتی عدالت جو چیف جسٹس منیر صاحب اور مسٹر جسٹس کیانی صاحب پر مشتمل تھی۔ اس میں جماعت احمدیہ کے کیس کی پیروی جناب شیخ صاحب نے کی۔ ان کے مقابل پر بڑے معروف وکلاء مثلاً چوہدری یعقوب علی صاحب جو بعد میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس بنے اور بھی معروف قانون دان تھے۔ ہمیں یہ شرف حاصل ہے کہ ہم نے وہ کارروائی اپنے کانوں سے سنی اور آنکھوں سے دیکھی۔ اور اس کے دوران محترم جناب شیخ صاحب کی متعدد مدلل تقاریر سنیں۔ خصوصاً ایک دن تو جناب شیخ صاحب کو قتل مرتد اور احمدیوں کی دعوت الی اللہ پر پابندی کے موضوع پر جواب دینا پڑا تو اس طرح محسوس ہوا جیسے فصاحت و بلاغت کا سیلاب آ گیا ہے اور گویا کسی ڈیم کے بند ٹوٹ گئے ہیں کاش وہ تقریریں ریکارڈ ہو سکتیں اور اس نظارے کو کیمرے کی کوئی آنکھ یا آپ کی آواز کو کوئی برقی مشین محفوظ کر لیتی تو یہ بیان ازدیاد ایمان کا موجب ہوتا۔ یا مجھ میں اتنی طاقت ہوتی کہ میں اس ایمان افروز اور علم و آگہی کے تیزی سے بہتے دریا کا کچھ احوال بیان کر سکتا۔ شیخ صاحب جذبات ایمانی میں غوطے لگا لگا کر جواہر و موتی نکال نکال کر عدالت کے سامنے بکھیر رہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ دونوں فاضل جج بھی مسحور ہو چکے ہیں اور سامعین سے بھرے ہال کمرے پر مکمل سکوت چھایا ہوا تھا حتیٰ کہ کسی کے سانس تک کی آواز نہیں آ رہی تھی اور ہر فرد بشر کان لگا کر اس دلپذیر تقریر کو سن رہا تھا۔ گویا آپ کی پرشوکت آواز نے سامعین پر کیا موافق اور کیا مخالف سب پر جادو کر دیا تھا۔ آخری جملے اب بھی میری سماعتوں میں محفوظ ہیں مخالف وکیل نے دعوت الی اللہ کو روکنے کی بات کی تھی اس لئے آپ نے فرمایا ”We live for

it, we die for it ''چیف جسٹس منیر صاحب نے اردو میں کہا شیخ صاحب آپ نے بڑے قوی دلائل دیئے ہیں ''خدا گنجے کو ناخن نہ دے اگر ملاں کے ہاتھ حکومت آ گئی تو میرا سر بھی قلم کر دیا جائے گا اور میرے بھائی کیانی کی گردن بھی ناپی جائے گی''۔ یہ برملا اظہار شاید اردو میں ہی ہوسکتا تھا ورنہ عدالت کی کارروائی کے دوران جج صاحبان کا دستور تھا کہ اگر کوئی مقرر انگریزی میں تقریر کرے تو جواب یا آبزرویشن انگریزی میں اور اگر اردو میں تقریر ہو تو عدالت بھی اپنا اظہار اردو میں کرتی تھی۔ ضمناً عرض کرتا ہوں کہ خاتم النبیین کے موضوع پر خالد احمدیت جناب ملک عبدالرحمان صاحب خادم گجراتی جو سیاہ شیروانی میں ملبوس اور سر پر سفید طرے دار پگڑی باندھے ہوئے تھے کی تقریر کی شان بھی نرالی تھی اور ان کے گھن گرج ایک شیر ببر سے مشابہ تھی دلائل لاجواب اور زور بیان بے مثال تھا۔ یہ تقریر اردو زبان میں تھی۔

غرض ان جواں مردوں اور احمدیت کے سپوتوں نے میدان مار لیا۔ ان خوش بختوں کی دین حق کے لئے بے لوث اور سرفروشانہ خدمات جلیلہ نے انہیں دائمی اجر کا مستحق بنا دیا اور وہ تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی زندگی کے مقصد کو پا گئے۔

کسی کو گھر سے نکلتے ہی مل گئی منزل	کوئی ہماری طرح عمر بھر سفر میں رہا

جو عدالتی رپورٹ شائع ہوئی تھی وہ اس پر شاہد ہے۔

گذشتہ صدی کی ساتویں دہائی میں بیت الاحمد یہ سرگودھا کے لئے گورنمنٹ نے زمین فروخت کر دینے کے بعد بعض لوگوں کے بھرے میں آ کر فروخت شدہ زمین کی رجسٹری منسوخ کر دی تھی جس کے خلاف ناچار ہمیں رٹ پٹیشن دائر کرنا پڑی۔

رٹ پٹیشن خارج ہو گئی۔ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ کے مشورہ کے لئے حاضر ہوئے تو آں ممدوح نے ایک مفصل خط بنام شیخ بشیر احمد صاحب لکھ دیا اور اس میں لکھا کہ میں اس وحشت ناک خبر کے نتیجے میں ساری رات سو نہیں سکا آپ خود سپریم کورٹ میں پیروی کریں۔ چنانچہ شیخ صاحب نے اپیل دائر کر دی اور حکم امتناعی بھی حاصل کر لیا مگر سماعت سے قبل آپ کی وفات ہو گئی اور پھر ہم اچھے وکیل کی تلاش میں جناب ایس ایم ظفر ایڈووکیٹ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب انہیں بتایا کہ جناب شیخ صاحب وکیل تھے وہ تو اللہ کے حضور حاضر ہو گئے ہیں تو آفرین ہے ایس ایم ظفر صاحب کے اخلاص اور ایثار اور جذبہ وفا پر کہ انہوں نے کہا میں خود بحث کروں گا اور فیس کا تو سوال ہی نہیں ہے یہ میرے بڑے بھائی کا کام ہے ہم نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے اور بہت سے تعریفی کلمات شیخ صاحب کی شان میں کہے۔ کارنیلیس صاحب چیف جسٹس آف پاکستان تھے ان کے روبرو اپیل پیش ہوئی اور منظور ہوئی۔ الحمد للہ۔ کارنیلیس صاحب کی Observation بھی بھلائے نہیں بھولتی ایڈووکیٹ جنرل کو کہا کہ احمدیوں کو سجدہ گاہ سے محروم کرنے کا گورنمنٹ نے تہیہ کر رکھا ہے تو جائیں کوئی آرڈیننس کر کے احمدیوں کو ان کے حقوق سے محروم کر دیں میں تو یہ اپیل منظور کرتا ہوں۔

میں نے چند ایسے واقعات قلمبند کئے ہیں جن کا میں خود شاہد ہوں ورنہ وہ شخص بے پناہ علم بلیغ، طاقت اظہار و بیان اور دلپذیر طرز سخن

رکھتا تھا۔موثر اور مدلل تقریر کے علاوہ وہ ٹیبل ٹاک کے ایسے ماہر تھے کہ جس محفل میں موجود ہوتے اپنی شیریں بیانی اور پرلطف گفتگو سے مجلس میں چھائے رہتے تھے۔جناب شیخ صاحب جیسے وجود روز بروز پیدا نہیں ہوتے فلک کو برسوں گردش میں رہنا پڑتا ہے تب کہیں خاک کے پردے سے ایسے لالہ وگل نمایاں ہوتے ہیں۔انہیں آسمان خاک چھان کر ڈھونڈتا ہے گو یہ لوگ خاکی پیکر رکھتے ہیں مگر ان کی سوچ اور فکر افلاکی ہوتی ہے۔

ہوشیار پور کے اس مکان اور اس کے مکینوں کی خوش بختی پر رشک آتا ہے کہ 1886ء میں ایک برگزیدہ شخص نے اسے چلہ کشی کے لئے منتخب کیا پھر قادرالکل اور مالک الملک کی دہلیز پر سر جو رکھا تو تب اٹھایا جب جو کچھ مانگا تھا اس سے بڑھ کر عرش الٰہی سے ملنے کی نوید سنائی دی۔سچ کہا تھا جناب ثاقب زیروی صاحب مغفور نے کہ

کبھی یوں بھی کرتے ہیں وہ کرم طلب ایک شے کی ہزار دی کبھی یوں بھی لیتے ہیں امتحان کہ لٹاؤ دولت جسم وجاں

فتح وظفر کی کلید عطا ہوئی اور صاحب عظمت وشکوہ فرزند دلبند گرامی ارجمند مل گیا، وہ باون صفات کا حامل جس نے اسیروں کی رستگاری کا موجب ہونا تھا اور جس نے ساری دنیا میں شہرت دوام پانی تھی عطا ہوا۔

اور پھر 13 ٹمپل روڈ لاہور اور اس کا ساکن بھی اونچے نصیبے والا تھا کہ اس پیشگوئی کا مصداق گرامی ارجمند جب 55 سال کا ہوا تو اسے ہوشیار پور میں نازل ہونے والے کلام الٰہی کی صدائے بازگشت پھر سنائی دی اور اس طرح یہ ٹمپل روڈ لاہور جناب شیخ بشیر احمد صاحب کا مسکن سعادت اور بلند اقبال سارے لاہور پر غالب آ گیا۔جہاں نعماء آسمانی کا نزول ہو اور جس فرش پر عرش کی آواز سنائی دے وہی مبارک مقام ہو جاتا ہے مگر مکان کی ساری رونقیں اس کے مکین سے ہوتی ہیں۔جناب مرحوم اپنی ساری نیک نامیوں اور خوش بختیوں اور فتوحات علمی وادبی اور ان سب سے بڑھ کر موعود مصلح کا قرب حاصل ہونے اور مشیر خاص اور خادم کا مقام پا جانے پر مسرور ہوتے ہوں گے۔اور بزبان حال کہتے ہوں گے۔

صیاد میرے دم سے ہیں یہ سارے چہچہے جب میں نہیں تو رونق گلزار بھی نہیں

اپریل 1973ء کو متاع جان جان آفرین کے سپرد کر دی ان کی اولاد کو اللہ تعالیٰ سلامت رکھے اور اپنے بزرگ باپ کی صفات حسنہ کا وارث بنائے۔

جناب شیخ صاحب کی باتوں میں سوز عشق تھا اور سرور حسن بھی تھا کوئی تقریب ہو خصوصاً جلسہ سالانہ کی صدارت کے مواقع پر سیدنا بانی حضرت مسیح موعودؑ کا یہ شعر ہر بار جھوم جھوم کر اور ایسے سوز سے پڑھتے تھے کہ روح وجد میں آ جاتی۔

کہ پھر خالی گیا قسمت کا مارا تجھے دنیا میں ہے کس نے پکارا

یہ چھوٹا سا شعر علم وحکمت کا مخزن ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عطاؤں اور بخششوں کی کان ہے۔ شیخ صاحب کی یاد آتی ہے تو بیاض مسیحا کا یہ نسخہ کیمیا ساتھ ہی یاد آجاتا ہے۔

اے کاش ہم اس آسمانی صداقتوں اور برکتوں سے معمور قاعدہ کلیہ پر کامل یقین پیدا کریں اور پھر اس **ذو العرش المجید** کو محکم یقین اور مصفا توکل سے پکاریں اور پھر مالک الملک کی **عطاء غیر مجذوذ** اور موہبت کے اثمار کو چکھیں۔ دعا ہے ہم غریبوں بے سہاروں اور خطا شعاروں کو اس طرح پکارنے کی توفیق بھی وہ کریم ورحیم خود ہی دے کہ یہ بھی اس کے فضل ورحم سے ہی ہوگا۔

(روزنامہ الفضل 2رجولائی 2002ء صفحہ 7،6)



حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی دلنوازیوں کی پرکیف داستان

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو کئی بار یہ بشارت دی گئی کہ ’’ہم تجھے ایک لڑکے کی خوشخبری دیتے ہیں۔ وہ تیرے لئے نافلہ ہے وہ ہماری طرف سے نافلہ ہے‘‘۔

پھر مارچ 1906ء میں جب یہ نوید سنی تو حضور نے خود ہی اس کا مفہوم بھی بیان فرمایا تحریر فرمایا ’’ممکن ہے کہ اس کی یہ تعبیر ہو کہ محمود کے ہاں لڑکا ہو کیونکہ نافلہ پوتے کو بھی کہتے ہیں‘‘۔

16رنومبر 1909ء کو اس نافلہ کی ولادت ہوئی پھر یہ توارد بھی نہ معلوم کتنی حکمتوں کا حامل ہے کہ حضور کا وصال 26رمئی 1908ء کو 73 برس کی عمر میں ہوا اور 73 برس کی عمر گزار کے 9رجون 1982ء کو موعود نافلہ کی بھی وفات ہوئی۔ مگر ہم کیا اور ہماری قیاس آرائیاں کیا معنے۔ سچ وہی ہے جو حضرت مسیح موعود نے فرمایا کہ

تیری باتوں کے فرشتے بھی نہیں ہیں راز دار

میں کچھ عرصہ سے مغموم اور پریشان حال تھا اور ایسے میں وہ جو درد آشنا بھی تھا اور حق آشنا بھی تھا۔ غمگسار اور دل نواز اور دلدار بھی تھا۔ جس کی محبت کا چشمہ شیریں تیز بہاؤ میں ہمیشہ آب زلال تقسیم کرتا رہتا تھا۔ اس کا بار بار یاد آنا قدرتی امر تھا لوگ جتنے دکھوں اور دردوں کو حضور کے پاس لے کر جاتے اوّل تو کچھ عرض کرنے سے پہلے ہی سارے غم غلط ہو جاتے تھے۔ اور اگر کبھی بیان کرنے کی نوبت آتی تو پھر اس طرح محسوس ہوتا تھا کہ جیسے رنج والم کے سارے ناسور کاٹ کر سینے کو ہلکا اور صاف کر دیا گیا ہے۔ میں کئی دنوں سے اسی زمانے کی

یاد میں کھو جاتا رہا۔حضور کے احسانات قطار اندر قطار ایک متحرک فلم کی صورت چلنے لگے ایک طرف وہ توجہات کریمانہ کہ جنہوں نے غم حیات سے آزاد کر دیا تھا دوسری طرف آج کی کسمپرسی اور نارسائی اور بے بسی کا عالم ۔ لیٹے لیٹے یاد آتی تو تکیہ بھیگ جاتا اور میں تڑپ تڑپ کر کہہ اٹھتا۔

ان بہتے آنسوؤں کا ہی تحفہ قبول ہو
ہے میرے پاس کیا جو یہ تیرا غلام دے

وہ استاد تھے میں شاگرد وہ میرے آقا تھے اور میں غلام۔ ہر چند کہ یہ حضور کی سیرت نگاری کی کاوش نہیں ہے۔ نہ میری قلم میں اتنی تاب وتواں ہے کہ اس ''نافلہ'' کی تصویر کشی کر سکوں جس کی پیدائش سے بھی قبل آپ کے مقدس دادا کو خوشخبری سنا دی گئی تھی ہاں مجھ پر جو عنایات خسروانہ ہوئیں ان کا کچھ ذکر کروں گا۔تا حضور کے فکری اور وہبی کمالات کی تحسین سے حضور کے احسانات کریمانہ کا کسی قدر قرض تو اتار سکوں۔ گو یہ قرض بھاری ہے اور مجھ میں اس کی واپسی کی طاقت ہرگز نہیں ہے۔حضور کے بارہ میں کچھ لکھتے ہوئے میں اپنے قلب و جاں میں وارفتگی ، روح میں تازگی اور بالیدگی اپنی کوتاہ سوچ میں درخشندگی اور شگفتگی محسوس کرتا ہوں۔حضور کے ساتھ اپنی غلامی کی نسبت جوڑتے ہوئے میرا قلب مجروح فرحت محسوس کر رہا ہے۔اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کیا بعید کہ میرے دل کی شریانیں جو شاید کسی صدمے کے باعث ہی صحیح طریق پر کام کرنے سے معذرت خواہی کر رہی ہیں اس مرد خدا کے ذکر خیر کی برکت سے پھر رواں ہو جاویں۔ میری ذوقی بات ہے مگر ہمارا یقین کامل ہے کہ سیدنا حضرت امام الزماںؑ کے کلام میں بے انتہائی برکتیں ہیں۔ چنانچہ حضور کی مناجات میں سے جب یہ شعر میں پڑھتا ہوں اور اکثر یہ میرے ورد زباں رہتا ہے کہ

از بس لطیفی دلبرا در ہر رگ و تارم درآ
تاچوں بخود یابم ترا دل خوشتر از بستان کنم

جب قادر کریم حضرت مسیح موعود کے قدموں کے صدقے ہم نالائق اور بے ہنر غلاموں کے رگ و تار میں در آئے گا تو یہ خون کی بندش کیا حقیقت رکھتی ہے۔ انا عندظن عبدی بی حضور کی ان مناجات کے سارے اشعار یاد ہیں اور اپنے دوستوں کو مجلس میں ہمیشہ سناتا رہتا ہوں۔میرے ایک دوست جو اردو اور فارسی کے ایم اے اور ایل ایل بی ہیں۔انہوں نے حضور کی کئی مناجات نوٹ کر لی ہیں اور پڑھتے رہتے ہیں۔

حضور کا بے مثال جذبہ وفا

وفا ایک ایسا روحانی خلق ہے جو گویا سخاوت اور ایثار اور ترحم اور اس کے علاوہ کئی اخلاق حسنہ کا مرقع ہے۔ظاہر ہے کہ وفا وہی کرے گا

جو دوسرے کے لئے قربانی کرنے اور اس پر رحم کرنے اور اسی کے لئے اپنے اوقات اور مال اور کئی قسم کے جذبات کی قربانی دینے کے لئے ہر وقت تیار رہے گا۔ یہ جذبہ وفا حضور میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ بیت مبارک کی چھت پر مجلس عرفان کے بعد نماز عشاء کے اختتام پر مئی 1944ء کی ایک رات میرے کانوں سے یہ آواز ٹکرائی ''نون ادھر آؤ'' میں حاضر ہو گیا اور یہ شبھ گھڑی تھی کہ جب کوئی خریدر ہا تھا اور کوئی بک رہا تھا۔ جنس ارزاں بلکہ بے کار اور ناہنجار کا وہ مول اتنا بالا نرخ خریدار نے ڈال دیا کہ بیع وشراء کے سودوں میں ایسا کم کم ہی دیکھنے میں آیا ہوگا۔

دل دے کے ہم نے ان کی محبت کو پا لیا
بیکار چیز دے کے در بے بہا لیا

اور پھر حضرت بیگم صاحبہ اور دونوں صاحبزادیوں اور بڑے صاحبزادے کے ساتھ بیت الانوار میں حضرت امان جان کی کوٹھی پر مجھے ہمراہ لے گئے۔ وہ دن اور 9رجون 1982ء کی بے پناہ رات تک میری ساری نالائقیوں اور بے ہنریوں کے باوجود اسی محبوب خدا نے میرا ہاتھ ایسے حالات میں تھامے رکھا جب کوئی شخص میری دستگیری کرنے والا نہیں تھا۔ راہ نمائی بھی کی، دستگیری بھی فرمائی۔ حضور کی طرف سے دلداری اور دل نوازی اور بندہ پروری کے اوصاف کریمانہ سے میری زندگی عبارت ہے۔ میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں کہ نہ دین میں کوئی مقام نہ دنیا میں کوئی نام محض ایک گنوار اور ناتراشیدہ الہڑ سادیہاتی لڑکا جس کے تن پر ڈھب کے کپڑے بھی نہیں ہوتے تھے۔ نہ زبان میں وہ شائستگی جو اس مقدس بستی اور خصوصاً اس مقدس خانوادے کا طرہ امتیاز تھی۔ لیکن باران رحمت کا نزول جب گلستانوں پر ہوتا ہے تو روڑی پر بھی مینہ برس جاتا ہے شاید روڑی تو کوئی جواز بھی پیش کر سکے مگر میں اس قدر بے لوث وفاؤں کا کسی طرح بھی تو مستحق نہیں تھا۔ جب کرم کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا آقا احسان پر احسان کر رہا تھا میں تو خالی ہاتھ تھا کیا پیش کرتا۔ جی میں آیا کہ دل نکال کر پیش کروں مگر اسے ٹٹولا تو یہ بھی داغ داغ نکلا۔ حضور کے کام کی یہ بھی کوئی شئے تھی؟ وفا کا جذبہ روحانی اور سماوی خلق عظیم میں سے ہے میں سوچتا رہا کہ یہ جذبہ وہبی ہے مگر موروثی بھی نکلا۔ حضرت مسیح موعودؑ کے والد بزرگوار حضرت مرزا غلام مرتضیٰ صاحب کا ایک واقعہ تاریخ احمدیت میں موجود ہے۔ کہ مسٹر ایجرٹن جو فنانشل کمشنر تھے اور بعد میں گورنر پنجاب ہو گئے تھے۔ حضرت مرزا غلام مرتضیٰ صاحب انہیں ملنے لاہور گئے بٹالہ کے ایک حجام نے کہا میری معافی ضبط ہو گئی ہے سفارش کر دیں۔ حضرت مرزا صاحب لاہور گئے تو شالا مار باغ میں جلسہ ہو رہا تھا۔ جلسہ ختم ہوا تو مسٹر ایجرٹن سے کہا کہ آپ اس شخص کی ''بانہہ'' پکڑ لیں۔ اس نے کہا کیا مطلب ہے؟ اسے سمجھ نہ آئی ترجمان بیچ میں پڑا ہو گا۔ آپ نے اصرار کیا تو اس نے حجام کی ''بانہہ'' پکڑ لی۔

آپ نے فرمایا کہ ہمارے ملک میں دستور ہے کہ جس کی ''بانہہ'' پکڑ لیں اس کی لاج رکھتے ہیں۔ اس کی معافی ضبط ہو گئی ہے کیا

معافیاں دے کر ضبط کیا کرتے ہیں؟ چنانچہ اس نے معافی بحال کر دی۔ گو یہ چھوٹا سا واقعہ ہے مگر اس کی تہہ میں غریب پروری حاکم اعلیٰ کے اقتدار سے بے نیازی اور حضرت مرزا صاحب کے جذبہ ایثار و وفا کی جو موجیں تلاطم خیز ہیں ان کے متعلق کچھ وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ غرباء پروری اور بانہہ پکڑنے کی لاج رکھنے کا جذبہ حضرت مرزا ناصر احمد صاحبؒ کو اپنے جدامجد سے ورثہ میں بھی تو ملا تھا۔ (بینی بھی پکڑتے تھے تو کسی بڑے زور والے سے بھی چھوٹتی نہیں تھی)۔ حضرت مرزا غلام مرتضیٰ صاحب کے حالات پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت دلیر صاف گو اور بہادر مغل برلاس تھے۔ تبھی تو مسٹر رابرٹ کمشنر آپ کی ملاقات کے لئے جب قادیان آیا تو باتوں باتوں میں وہ پوچھ بیٹھا کہ قادیان سے سری گوبند پورہ کتنی دور ہے تو آپ نے غصے سے کہہ دیا کہ میں ہرکارہ نہیں ہوں۔ میں ضروری باتیں کرنے آیا تھا آپ ادھر ادھر کی باتوں میں لگ پڑے ہیں یہ وہ دور تھا جب انگریز کمشنر کی خوشامد اور چاپلوسی کرتے لوگ تھکتے نہیں تھے اور کتابیں اٹھائے پھرتے تھے۔ کہ کوئی خوشنودی کی تحریر لکھوالیں مگر یہ مغل شہزادہ جس کی رگوں میں پاک اور غیرت مند فارسی خون دوڑ رہا تھا کمشنر کو بھی جھڑکی دے گیا۔ میں نے ضلع سرگودھا کے رؤساء کے حالات سنے ہیں جو بہت بڑے جاگیردار تھے مگر انگریزوں سے حد درجہ خوشامدانہ رویہ رکھتے تھے۔

اور پھر جب یبدء منک کا دور آیا تو اسی خاندان کی روایات میں ایک روحانی انقلاب رونما ہو گیا۔ زمین بھی نئی بن گئی اور آسمان بھی نیا۔ پھر کہاں کے کمشنر اور کہاں کے گورنر۔ جس کا بسیرا زمین پر رہا ہی نہ ہو اس کو کسی زمینی صاحب اقتدار سے کیا کام۔ یوں خلق خدا کی بہبودی ہر دم پیش نظر تھی مگر نعرہ بلند کیا حضرت امام الزمان نے کہ

ہم تو بستے ہیں فلک پر اس زمین کو کیا کریں

وفا کا ذکر ہو رہا ہے تو سیدنا حضرت مسیح موعودؑ کی نگاہ تو ہر آن اپنے مالک و خالق اپنے آسمانی آقا کی طرف اٹھتی تھی فرماتے ہیں۔ اور یہی عین حق ہے کہ

نسل انسان میں نہیں دیکھی وفا جو تجھ میں ہے
تیرے بن دیکھا نہیں کوئی بھی یار غمگسار

حضرت مسیح موعودؑ سراپا رحمت و وفا اور ایثار تو تھے ہی غیروں پر بھی حتیٰ کہ معاندین پر ابر رحمت بن کر سایہ فگن رہے مگر اپنی ساری زندگی کا تجربہ اور صداقتوں کا نچوڑ یہ کہ نسل انسان میں وفا نہیں ہرگز نہیں جو اے میرے خدا تجھ میں ہے۔ قادیان سے ہمارا کالج اپنے نامور پرنسپل کی قیادت میں تقسیم ملک کے بعد ایک حویلی نما مکان میں لاہور کے کینال بنک میں منتقل ہوا۔ اساتذہ کرام کو اس کی حویلی کی چھت پر ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے دیکھ رہا ہوں اور ہم جو اس بیمثال درسگاہ کے تلامذہ تھے۔ ایک چٹائی پر بیٹھے ہوئے ہیں مگر کیا مجال جو ہمیں

اپنی کم مائیگی یا کمتری کا احساس کبھی ہوا ہو۔ جو اپنے قریب چاند کو ضوفگن دیکھ رہے ہوں۔ جس کے اردگرد روشن ستاروں نے ہالہ بنایا ہوا تھا۔ انہیں اپنی خاک نشینی کا تو کبھی خیال ہی نہیں آتا تھا۔ یہ عجیب گروہ عاشقاں تھا کیا استاد اور کیا شاگرد دنیا اور دنیا والوں کی چکا چوند سے یکسر بے نیاز۔ اللہ کی رضا پر راضی رہنے والے اور چٹانوں کو کاٹ کر راستہ بنانے والے یہ اس لئے کہ ان کی پشت پر ان کا آقا بیٹھا تھا۔ جس کو صاحب عزم وشکوہ ہونے کا خطاب عرش خداوند کریم سے عطا ہوا تھا۔

ہم نے 1948ء میں گریجوایشن تو کر لی اور پھر گاؤں کا رخ کیا۔ 2،3 سال زمیندارہ کرنے میں اپنے آبائی گاؤں اپنے ابا کے ہاتھ بٹاتے رہے۔ کہ ایک روز سیدنا حضرت مصلح موعودؓ اور حضرت مرزا ناصر احمد صاحبؒ کی زیارت اور دست بوسی کا شوق گاؤں سے رتن باغ لاہور کھینچ لایا۔ بعد نماز مغرب میرے اس وقت کے پرنسپل کی نگاہ کرم مجھ ناچیز پر پڑی اور پھر وہی محبت بھرا جملہ ''نون ادھر آؤ'' سناؤ گاؤں بیٹھے کیا کر رہے ہو میں نے کہا جی میں زمیندارہ کرتا ہوں۔ باغ لگوایا ہے فرمایا اچھا کیا ہے۔ مگر تمہارا وہاں باغ کے سر بیٹھنا کب ضروری ہے؟ قریب ہی حضرت صاحبزادہ ایم ایم احمد صاحب کھڑے تھے۔ ''مظفر نون کو پکڑ و اور یہ گاؤں نہ جائے'' انہوں نے اگلی صبح دفتر آنے کا حکم دیا۔ دفتر شاہ عالمی لاہور میں تھا۔ وہاں رپورٹ کر دی اسی دوران سال 1953ء میں میں نے ایل ایل بی کا امتحان دیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اونچے نمبروں میں کامیاب ہوا۔ میری زندگی کا یہ موڑ اپنے آقا کی اس دوررس نگاہ صدناز کا مرہون منت ہے۔ جس نے میری کایا پلٹ دی اور میں جو کچھ ہوں یہ حضور کے جذبہ احسان ووفا کے صدقے ہے اور جو کچھ میں نہیں بن سکا وہ میری شامت اعمال کے باعث ہے اگر اس شام یہ خدا رسیدہ بزرگ اپنے مقدس ہاتھوں میں میری ''بانہیں'' پکڑ کر اس راہ میں نہ ڈالتا۔ تو وہی گاؤں ہوتا اور اس کے جھمیلے کوئی قتل ہو رہا ہے تو کوئی چالان ہو رہا ہے اور میں بھی اسی دلدل میں پھنس کر رہ جاتا۔ میری داستان شیریں بھی ہے اور طویل بھی ہے۔ ہر کرم اور شفقت کا اظہار مجھے یاد ہے جو میرا دامن کھینچ رہا ہے مگر یہاں اتنی گنجائش کہاں ہے جستہ جستہ چند واقعات لکھ کر میں بھی انگلی پر خون لگا کر اپنا نام شہیدوں میں شامل کر رہا ہوں گو اس قابل ہرگز نہیں ہوں۔

ایک روز بحیثیت صدر انصار اللہ مرکزیہ کے سرگودھا تشریف آوری کا پروگرام تھا۔ یہ اکتوبر 1965ء کا کوئی مبارک دن تھا کہ ایک شام امیر صاحب سرگودھا نے اظہار فرمایا کہ حضرت میاں صاحب کل تشریف لا رہے ہیں۔ دوپہر کا کھانا تو سارے انصار کے ساتھ تناول فرماویں گے۔ سہ پہر کو اگر چائے کی کوئی دوست دعوت دینا چاہیں تو رابطہ کر کے گزارش کر لیں۔ ہم مجلس سے اٹھے برادرم محمد اقبال پراچہ نے بھی فون کیا۔ میں نے بھی گزارش کی مجھے ارشاد ہوا کہ امیر صاحب سے اجازت لے لیں میں نے ادب سے عرض کیا کہ اجازت لے چکا ہوں۔ فرمایا حضور یعنی حضرت مصلح موعودؓ شام کو یاد فرماتے ہیں۔ جلد واپس آنا ہوگا۔ اس لئے تقریر وغیرہ کرنے کا پروگرام نہ رکھیں میں نے عرض کیا کہ میرے گھر پر زیادہ دیر نہیں لگے گی چنانچہ میں نے دوسری شام میں چند معززین جن میں جج صاحبان، سینئر

وکلاء، ایم این اے اور روٴساء ضلع تھے کو مدعو کیا۔ آپ سے سب کا تعارف کرایا تو مجھے اشارے سے بلا کر کہا کہ اگر اتنے معزز لوگوں کا اجتماع تمہارے گھر ہوسکتا تھا تو مجھے تقریر کرنے کے لئے کیوں نہیں کہا میں نے عرض کیا کہ حضور نے خود منع فرما دیا تھا۔ حضور کی کشش کا یہ عالم تھا کہ ایک علاقے کے بہت بڑے رئیس میرے ہاں بن بلائے آ گئے۔ باہر گیٹ پر مجھے بلایا کہ تم نے مجھے دعوت تو نہیں دی مجھے چائے پینے کا شوق بھی نہیں جناب مرزا ناصر احمد صاحب سے ملنے کا اشتیاق ہے انہیں ملا دو اور میں واپس چلا جاؤں گا۔ میرے ساتھ ان کی بے تکلفی تھی میں نے انہیں کہا کہ وقت تھوڑا تھا اور آپ کے لئے میرے گھر آنے کے لئے کسی دعوت نامے کی یوں ضرورت بھی کب ہے۔ آئیں اندر اور میں نے یہ ساری بات حضور کو بتلا دی اور پھر وہ حضرت صاحب کے ساتھ بیٹھے رہے اور چائے نوش فرمانے کے بعد ہی گئے۔

محترم نواب مسعود احمد خان صاحب ضلع خوشاب میں واقع اپنی زمینوں پر آتے جاتے مجھے مل کر جاتے تھے یہ ان کا احسان بھلائے نہیں بھولتا انہوں نے کئی بار بیان کیا کہ حضور بہت خوش تھے کہ بہت چنیدہ اور معزز لوگ ''نون'' کے گھر جمع ہوئے تھے۔ اور کہ ایسا آج کل شاذ ہی ہوتا ہے۔ ''مجھے تقریر نہ کرنے کا افسوس ہے'' اس کے چند دن بعد سیدنا حضرت مصلح موعودؓ کا وصال ہو گیا۔ پھر یوں ہوا کہ ہماری دنیا اندھیر ہو گئی اور اس دور کا آفتاب ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ رات چاندنی تھی جس پر سیدہ صاحبزادی امۃ القدوس بیگم صاحبہ کا اظہار اس سانحہ عظیم کا مختصر الفاظ میں دردناک نقشہ پیش کرتا ہے۔

وہ جس سے اجالا تھا چاروں طرف
وہ گیا تو یہاں تیرگی چھا گئی
چاند روشن ہے اب بھی افق پر مگر
میرے سورج کو کس کی نظر کھا گئی

پھر وہ میرے استاد معظم وہ مایہ ناز درسگاہ کے پرنسپل مسند خلافت پر متمکن ہوئے اس عاجز کے ساتھ وہی وفاؤں اور شفقتوں کا سلسلہ قائم رہا۔ نہیں نہیں ان میں بہت اضافہ ہو گیا۔ جب انتخاب خلافت کے بعد پہلا مصافحہ بیعت مبارک میں ہو رہا تھا تو اس نابکار نے بھی سعادت حاصل کی۔ جب میرا ہاتھ اس مبارک ہاتھ سے ہم آغوش ہوا تو گو جلدی جلدی لوگ مصافحہ کر کے ہٹتے جاتے تھے۔ میرا کمزور اور ناتواں ہاتھ زیادہ دیر تک حضور نے تھامے رکھا اور دو باتیں کیں۔ گویا پہلے ہی روز یہ پیغام مل رہا تھا کہ گو اب زیادہ مصروف ہو گیا ہوں بڑی بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ میرے کندھوں پر آن پڑا ہے مگر تمہارے ساتھ بے پناہ شفقتوں اور مروتوں میں کمی نہیں آئے گی بلکہ اکیس برس پہلے کے عہد و وفا میں مزید پختگی اور وسعت آ گئی۔ میں جب یہ الفاظ لکھ رہا ہوں تو میرے قلم میں شگفتگی اور ناز کی روشنائی پہلے سے فزوں تر ہو رہی ہے۔ مگر یہ نکتہ مجھے کہیں نہیں بھولا کہ ایاز اپنی قسمت پر جتنا ناز کرے اس کی اپنی خوبی تو کوئی نہیں اس کا سارا

انحصار تو محمود کی ذرہ نوازی پر ہے۔ جب اونچی مسند پر اللہ نے بٹھا دیا تو ایثار اور جاں سپردگی اور اللہ کی راہ میں ہر شے نچھاور کر دینے کی فطری اور وھبی کمالات کے سمندر میں گویا تلاطم آ گیا۔ قرآن کریم کی سورۃ انعام میں اپنی ساری عبادات اور قربانیاں، زندگی اور موت اللہ رب العالمین کی خاطر وقف کر دینے کا ذکر ہے اور اب یہاں بھی یہی صورت ہو چکی تھی۔ چنانچہ آپ کو بھی قبولیت کا سرٹیفکیٹ ان الفاظ میں عطا ہوا کہ

جان و مال و آبرو حاضر ہیں تیری راہ میں

اور پھر محبان الٰہی ہمیشہ ارنی ارنی کی التجا کرتے نظر آتے ہیں۔ کسی کو لن ترانی کا جواب ملا کسی کو دیدار نصیب ہو گئے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح موعودؑ نے بھی اس روحانی اشتہاء کا برملا اظہار کیا اور درخواست کر ڈالی کہ

چہرہ دکھلا کر مجھے کر دیجئے غم سے رہا
کب تلک لمبے چلے جائیں گے ترسانے کے دن

اور پھر حضرت ناصر الدین کے ابا حضور نے تو نوعمری بلکہ لڑکپن میں ہی اس آرزو اور بے تاب تمنا کا اظہار کرتے ہوئے اپنے مولا سے عرض کر دیا کہ۔

موسیٰ سے تو نے طور پر جو کچھ کیا سلوک
مجھ سے بھی اب وہی مرے پروردگار ہو

اب آئیں دیکھتے ہیں کہ یہ آبائی ورثہ سیدی حضرت مرزا ناصر احمد صاحب کو کیسے عطاء ہوا۔ اب شعر تو حضور نہیں کہتے تھے مگر وہی تمنا وہی آرزو، وہی تڑپ اللہ تعالیٰ کے جلوے دیکھنے کی تھی۔ جو آپ کے مقدس باپ دادا کو تھی چنانچہ آپ کو مضطرب دیکھ کر خود اللہ تعالیٰ وہاب وکریم نے اپنے حضور سے بیان واظہار کے در وا کر دیئے اور حضور یہ مصرعہ الاپنے لگے۔

تیرے حسن کے جلوے بے پایاں

اک حسن کا جلوہ روز دکھا

آپ کا دور خلافت 17 سال چلا ہم تو پہلے سے زیادہ محتاط ہو گئے کہ اب وہ پہلی سی ہر وقت کی ملاقاتیں ممکن نہیں ہوں گی۔ حضور بے حد مصروف ہو گئے ہیں آنا جانا کم کر دینا چاہئے مگر قدرت خداوندی سے مقام ومرتبہ میں جتنے بڑھے اور جتنا دینی اور جماعتی مصروفیات میں اضافہ ہوا۔ اسی نسبت سے نہیں بلکہ کئی گنا زیادہ الفت اور محبت اور بندہ نوازی اور دلبری میں وہ پیش پیش ہی رہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو منصب روحانی پر سرفراز فرماتا ہے تو علاوہ کئی قسم کے کمالات روحانی اس کے جذب وکشش میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کی محبوبیت

کی شان کا تو اندازہ لگانا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم جنہوں نے پرنسپل کالج کے زمانہ میں بہت قریب سے دیکھا تھا اور پھر خلافت کے مسند پر بھی جلوہ افروز ہوئے تو جلوت اور خلوت میں بھی بہت ملاقاتیں ہوئیں جو گنتی سے بیرون ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضور کو اس بلند مقام و مرتبہ کے لئے تیار کر رہا تھا۔ آپ کا قدم تیز تیز بلندی کی طرف اٹھ رہا تھا ادھر ہماری چاہتوں کو بھی عروج نصیب ہوا۔ شاعر نے اس صورت حال کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

چپکے چپکے شباب ان پہ آ ہی گیا
رفتہ رفتہ زمین آسمان ہو گئی
اس طرف حسن میں اک اضافہ ہوا
اس طرف اک تمنا جوان ہو گئی

غلام نے جب دیکھا کہ آقا بہت مہربان ہو گئے ہیں تو اس نے بھی آقا کے راستہ میں گویا گھر بنا لیا۔ حضور کبھی احمد نگر کی زمینوں پر تشریف لے جاتے تو کبھی نصرت آباد کی اراضیات کی دیکھ بھال کے لئے۔ غلام کو ہر بار بلا ناغہ حکم مل جاتا کہ تم ساتھ چلو بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ غلام سونگھ لیتا کہ آج حضور کا زمینوں پر جانے کا پروگرام ہے اور وہ رقص کناں پہنچ جاتا۔ حضور دفتر کے دالان میں تشریف لاتے تو دست بوسی سے مشرف ہوتا حاضری لگ گئی۔ اگلا حکم یہ ہوتا کہ تم اپنی گاڑی یہیں چھوڑ دو اور میرے ساتھ بیٹھو اور ہم اپنی قسمت پر نازاں وفرحاں کفش برداری کی ڈیوٹی سنبھال لیتے۔ ایک دفعہ حضور اپنے باغ میں پھر رہے تھے کنو ابھی ترش تھے ایک کنو حضور نے توڑ کر اس عاجز کو دیا کہ دیکھو کیسا ہے وہ بہت ترش تھا میں نے سب میں تقسیم کر دیا حضور دیکھ کر مسکرائے کہ بہت ترش ہے جو سب میں بانٹ رہے ہو میں نے عرض کیا تبھی تو آپ کی خدمت میں کوئی قاش پیش نہیں کی۔

ایک بار حضور گھوڑے پر سواری کر رہے تھے کہ شاید گھوڑا ابدکا اور حضور گر پڑے۔ معمولی چوٹ آئی مگر ہم تو اس منہ کے بھوکے تھے۔ تیمارداری کے بہانے حضرت مرزا عبدالحق صاحب کی سرکردگی میں ربوہ دفتر پرائیویٹ سیکرٹری میں ملاقات کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

صوبیدار عبدالمنان صاحب افسر حفاظت خاص تھے انہوں نے ٹھیٹھ دہلوی زبان میں بیان کرنا شروع کیا کہ حضور اس طرح جا رہے تھے تو گھوڑا یوں بدکا۔ حضور یوں گرے میں نے جواباً کہا صوبیدار صاحب حضور پنجابی میں گھوڑے پر سوار ہوئے تھے اور پنجابی میں گرے تھے اور پنجابی زبان ہی اس کو صحیح بیان کر سکتی ہے یہ اردو زبان کے بس کی بات ہی نہیں ہے کہ ایسے بیان کر سکے یہ تو ایک لطیفہ تھا۔

ستمبر 1974ء کے پہلے عشرے میں برادرم ڈاکٹر حافظ مسعود احمد صاحب کی تحریک پر حضرت امیر صاحب کے ہمراہ گئے اس دورہ میں جناب محمد اقبال صاحب پراچہ برادرم قریشی محمود الحسن صاحب بھی ساتھ تھے۔ اس روز اس دور کے مخصوص حالات میں حضور سے یہ

استفسار کیا کہ آج کل کیا دعائیں کرنی چاہئیں ۔مختصر یہ کہ حضور نے فرمایا کہ ہم بددعا تو کسی کے لئے بھی نہیں کرتے ۔ مجھے اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانا چاہئے کہ مجھ پر خصوصی کرم بلا استحقاق ہوتا رہا۔

اگست 1976ء کی بات ہے حضور یورپ کے دورہ جرمنی وغیرہ پر تشریف لے گئے ہوئے تھے اور میں لندن پہنچ کر حضور کی آمد کا منتظر تھا۔حضور ہیتھرو ایئر پورٹ پر جرمنی سے واپسی پر اترے تو وہاں چند بزرگوں کو ہی جانے کی اجازت دی گئی تھی ۔ باقی سب لوگ 16 گریسن ہال روڈ پر استقبال کے لئے اکٹھے تھے ۔حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب ایئر پورٹ پر تشریف لے گئے ہوئے تھے ۔ حضرت چوہدری صاحب نے مجھے واپس آ کر بتلایا کے حضور نے مجھ سے ایئر پورٹ پر پوچھا کہ ''نون آیا ہوا ہے'' چوہدری صاحب نے جواب دیا کہ میں نے سنا ہے آیا ہوا ہے ابھی مجھے ملا نہیں ۔پھر مرزا لقمان احمد صاحب سے پوچھا انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ تو مزید پوچھا کہ وہ یہاں لندن میں کیا کر رہا ہے۔صاحبزادہ صاحب نے بتلایا کہ اس نے تین گاڑیاں خریدی ہیں یہ بات ایئر پورٹ پر ہوئی۔مشن ہاؤس پہنچے تو ہم قطاروں میں کھڑے تھے میرے دو غیر از جماعت دوست بھی ہمراہ تھے میں نے ان کا تعارف کروایا تو دلفریب مسکراہٹ سے جو ہمیشہ آپ کے چہرہ پر کھیلتی رہتی تھی مجھے فرمایا کہ دین میں تو چار کی اجازت ہے میں سمجھ گیا عرض کیا بہتر حضور چوتھی کا بندوبست بھی کرتا ہوں ۔ چنانچہ ایک شخص خود میری رہائش پر آ کر اپنی گاڑی مجھے دے گیا اور اس طرح چار پوری ہوگئیں ۔ پھر سال 1978ء میں عزیزم محمد اکرام پراچہ بھی میرے ہمراہ تھے وہ بھی کاروں کے گاہک اور میں بھی ۔ہم ٹرین پر سوار ہو کر ایک ڈیلر کے پاس روزانہ جاتے سودا طے نہیں ہو رہا تھا ایک دن دوپہر کو میں حضور سے ملا ۔ پرائیویٹ سیکرٹری صاحب نے معمول کے مطابق مجھے روکا کہ حضور دفتر میں بہت مصروف ہیں ہم بھی ٹلنے والے نہیں تھے منت سماجت کر کے 5 منٹ کی اجازت حاصل کر لی۔حضور تو گویا انتظار میں بیٹھے تھے میں نے عرض کیا کہ حضور فلاں ڈیلر سے کاروں کی خرید کی بات ہو رہی ہے مگر طے نہیں ہو پا رہی۔حضور نے فرمایا وہ کراچی کے ہیں مجھے بتایا گیا ہے کہ اچھی شہرت رکھتے ہیں جاؤ ان سے سودا کر لو۔ میں ٹرین پر سوار ہو کر فوراً آ گیا اور کہا کہ مجھے دو گاڑیاں منگوا دو۔اس نے کہا کہ نون صاحب آج بڑی تیزی میں ہو پہلے تو فیصلہ نہیں کر رہے تھے میں نے حضور کے ساتھ ملاقات کا بتلایا ان صاحب کا جماعت سے تعلق نہیں تھا۔ یوں وہ باخبر تھا کہ حضور تو جرمنی گئے ہوئے تھے میں نے بتلایا کہ آج ہی واپس تشریف لائے ہیں چنانچہ وہ معاہدہ طے ہو گیا اور جب میں نے مطلوبہ ادائیگی کر دی تو اس نے 100 پونڈ اٹھا کر مجھے واپس کر دیئے کہ اتنے برگزیدہ انسان نے میری تعریف کی ہے تو میں یہ 100 پونڈ کم لوں گا۔ یہ بتانا بھول رہا تھا کہ مجھے پانچ منٹ ملاقات کا موقع ملا تھا۔ میں نے سیکرٹری صاحب کے ساتھ 5 منٹ کے وعدہ کا ذکر کیا مگر حضور نے 25،30 منٹ بٹھائے رکھا۔ جتنا بیٹھتے اکتاہٹ کا کبھی احساس ہی نہ ہوتا تھا بلکہ جب اس نور افشاں محفل سے اٹھتے تو تشنگی اور بڑھ جاتی۔ حضور کی عنایات خسروانہ کا انتہا ہی نہیں میں مورد کرم بے حساب رہا۔حضور اسلام آباد میں

تشریف فرما تھے ہم بھی کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر پیچھے پیچھے رہتے ہمارا قیام راولپنڈی میں ہی تھا۔ ایک MES کے غیر از جماعت افسر میرے ہمراہ تھے سوچا کہ مغرب کی نماز حضور کے اقتداء میں ادا کی جائے۔ میرے ہمراہی دوست کو میں نے باہر لان میں کرسی بھجوا دی اور خود لاؤنج میں گیا۔ جہاں حضور بالائی منزل سے اتر کر نمازیں پڑھاتے تھے۔ پرائیویٹ سیکرٹری نے مجھے دیکھتے ہی حکم سنایا کہ ملاقات نہیں ہوگی۔ میں نے کہا کہ ہم نے کوئی درخواست دی ہے جو آپ نامنظور فرما رہے ہیں میں تو نماز پڑھنے آیا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد حضور نے نماز مغرب وعشاء پڑھائیں۔ اوپر جاتے ہوئے مرزا انس احمد صاحب کو فرما گئے نون نماز پڑھ لے تو اسے اوپر میرے پاس لے آنا۔ چنانچہ میں حسب الحکم اوپر گیا تو ایک کمرے میں حضور اکیلے بیٹھے تھے دوسری نشست پر مجھے بیٹھنے کا ارشاد فرمایا ان دنوں ایک نازک سا معاملہ سرگودھا میں چل رہا تھا اور حضور کو یہ رپورٹ ملی تھی کہ سرگودھا میں کوئی فوجداری مقدمہ ربوہ کے لوگوں پر بھی قائم کرنے کی کارروائی چل رہی ہے اور یہ بات درست تھی مگر میں نے حسب توفیق کوشش کی کہ مقدمہ درج نہ ہو۔ حضور نے اس کی تفصیل مجھ سے سنی اور آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار فرما کر مجھے ہدایات دیں۔ اگلے روز تعطیل تھی اور مجھے حکم دیا کہ پرسوں شام جو صورت حال ہو مجھے اوپر کے فون نمبر پر اطلاع دینا اور اگر کوئی اور فون اٹھائے تو کہنا کہ ''ناصر احمد'' سے ہی بات کرنی ہے۔ میں نے معذرت کی کہ میں حضور کو کیوں کر بلا سکتا ہوں فرمایا کہ میرے حکم سے۔ حضور نے میرے دوست کو بھی اور مجھے بھی اپنے ہمراہ کھانا کھانے کو کہا۔ مگر میں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ ہماری دعوت پنڈی میں ہے جہاں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں نے ہفتہ کی شام کو فون کیا تو میاں انس احمد صاحب نے اٹھایا تو میں نے انہیں تفصیلی رپورٹ دے کر کہ درخواست اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے خارج ہوگئی ہے اور یہ کہ حضور کو بتا دیں۔ چونکہ صاحبزادہ صاحب موصوف کا اپنا نام اس میں آتا تھا اس لئے ان سے چھپانے کا کوئی سوال ہی نہ تھا اور یہ مجھ میں ہمت ہی نہیں تھی کہ میں کہتا کہ حضرت صاحب کو فون پر بلایا جاوے۔ یہ تو چند ملاقاتوں کا ذکر نمونۃً کیا ہے ورنہ یہ کبھی شاذ ہی ہوا ہوگا کہ میں نے حضور کے پیچھے بیت مبارک میں نماز ادا کی ہو۔ اور پہریدار حکم لے کر نہ آیا ہو کہ حضور طلب فرما رہے ہیں۔

آپ کے سترہ سالہ دور خلافت میں سمندروں میں کس قدر ہلچل رہی۔ موجیں کس قدر شور انگیز رہیں گرداب کس کس طرح ناچے، سیاست کے بڑے بڑے برج کس طرح الٹ دیئے گئے۔ یہ ایک طولانی قصہ ہے۔ ایسے پُرآشوب دور میں بھی آپ مسلسل پژمردہ چہروں پر مسکراہٹیں بکھیرتے رہے۔ فیضان روحانی کے امین بھی تھے قسیم بھی تھے۔ آپ کی دینی اور روحانی توجہات اور باطنی فیوض نے لاکھوں افراد کے دل کی دنیا بدل ڈالی۔ آپ کی محبت آمیز اور شفقت آفرین گفتگو اور دل نواز تبسم سے ظلمت یاس آس سے بدل جاتی تھی۔ بحرانوں میں اس مرد بحران کے کمالات نکھر کر سامنے آتے تھے۔ جناب ثاقب کا اشارہ بڑا واضح تھا اور برحق کہ:۔

جب زخم لگیں تو چہرے پر پھولوں کا تبسم لہرائے

فرزانوں کا اتنا ظرف کہاں یہ حوصلہ ہے دیوانوں کا

آپ کا خلق عظیم سراپا تاثیر تھا ہر خادم یہی سمجھتا تھا کہ ان احسانات عظیم کا وہی اکیلا مورد ہے مگر وہ تو محبتوں اور شفقتوں کا بحر مواج تھا۔ اس نے جتنی دولتیں تقسیم کیں ان میں کمی نہ آئی اضافہ ہی ہوتا رہا۔

حضور کی طبیعت میں ٹھہراؤ سنجیدگی اور اس کے ساتھ زندہ دلی کا حسین امتزاج تھا حضور کے ساتھ گزرے ہوئے دن میری زندگی کی قیمتی متاع ہیں جنہیں میں نے اپنے دل کے خانوں اور ذہن کے لاکر میں محفوظ کیا ہوا ہے۔ جب کبھی افسردگی یا اداسی ستاتی ہے تو اسی خزانے کا اندوختہ میرے کام آتا ہے۔

سال 1974ء میں ہنگامہ خیزی اور اشتعال انگیزی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ حضور آدھی رات کے وقت سنگینوں کے سائے میں سفر کر سکتے تھے ورنہ گو حضور کسی کے دشمن نہیں تھے۔ مگر کم فہم اور نادان لوگ آگ اگلتے تھے۔ مگر کیا مجال جو آپ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور پیشانی کے نور میں کمی آئی ہو۔ شاعر نے جس خوبی سے حضور کی تصویر اتاری ہے ہم سے یہ کب ممکن ہے؟

آنکھیں کہ جیسے نور کی ندی چڑھی ہوئی
چہرہ کہ جیسے پھول کھلا ہو گلاب کا

اگست 1974ء میں میں نے عزیزم اکرام صاحب پراچہ اور کپتان ملک غلام احمد نون کی معیت میں اسلام آباد میں ایک دن زیارت کی ہمیں دیکھا تو ایک فاتح جرنیل کی طرح موٹر کی کھڑکی سے ہاتھ لمبا کر کے خوش آمدید کہا۔ اور ہم نے محسوس کیا کہ وہ ہاتھ ہمارے خلاف بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کر گیا ہے۔ وہاں سڑک پر سپیڈ بریکر تھا ہم عمداً وہیں کھڑے تھے۔

چہرے پر نور پہلے سے فزوں تر دیکھا تو میں نے کہا۔

تیرے چہرے کا نور اصلی ہے
چاند کی روشنی ادھاری ہے

پھر 9 رجون 1982ء کی بے پناہ رات مجھ غریب پر قیامت بن کر آئی میں سو رہا تھا کچھ پتہ نہیں کہاں سے آواز آئی کس نے پکارا کس نے صدا دی۔ کہ حضور فوت ہو گئے ہیں میں سناٹے میں آ گیا۔ چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ حضور کی صحت تو بہتر تھی۔ یہ ہوائی کسی دشمن کی اڑائی ہوئی ہو گی اور مجھے آج تک کچھ علم نہیں کہ وہ آواز کہاں سے آئی اور کیسے آئی۔ ذرا ہوش سنبھلے تو حضرت امیر صاحب سے تصدیق کروانے کے لئے فون کرنا چاہا مگر پھر رک گیا کہ اس وقت انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں ہے۔ اتنے میں میری مرحومہ بیوی بھی جاگ چکی تھی اور میری سراسیمگی کو دیکھ کر پوچھا کہ کیا بات ہے۔ اب بات میرے منہ پر آ نہیں سکتی تھی بالآخر میں نے حضور کی قیام گاہ پر اسلام آباد

فون کیا۔تو اناللہ جواب میں سنا۔

اس طرح 9؍جون 1982ء کو دو سورج ڈوبے ایک وہ جو روزانہ مشرق سے طلوع ہو کر مغرب میں ڈوب جاتا ہے دوسرا علم وعرفان اور شفقت ورافت کا یہ سورج جو مشرق سے طلوع ہوتا تھا اور خدا دادنور سے چار دانگ عالم میں روشنی پھیلا کر مشرق میں ہی غروب ہوا تھا۔ میں اسی دن ماں کی مامتا سے اور باپ کی شفقتوں سے یکسر محروم ہو گیا تھا اور وہ رات مجھے یتیم کر گئی تھی۔قانون قدرت کے ماتحت پھر خزاں کے بعد بہار آتی ہے مگر میری زندگی میں اس کے بعد پھر بہار لوٹ کر نہ آئی۔قربان جاؤں قادر کریم کے جس نے لٹے پٹے قافلے کو پھر ایک فتح نصیب جرنیل دے دیا۔درد وغم اور رنج والم کے طوفان میں گھرے نیم جانوں اور بسمل کی طرح تڑپنے والوں کو پھر زندگی عطا فرمائی۔پھر ایک رجل فارسی کا نزول ہوا اور پھر خوفناک طوفانوں کے بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی کے بادباں اس نے سنبھال لئے۔قادر کریم اس کی پشت پر تھا اس کے آتے ہی ہر قسم کے خطرات اور مصائب وآلام کے بادل چھٹ گئے۔ٹوٹے ہوئے دل پھر قرار پکڑ گئے۔وہ تو اپنے اولوالعزم باپ کا کامل عکس ہے۔فتوحات اس کو خوش آمدید کہتی ہیں۔کامیابیاں اور کامرانیاں اس کی بلائیں لیتی ہیں۔صد افسوس کہ موت نے ہم سے وہ نقاش اور مصور بھی چھین لیا جسے جماعت احمدیہ پر ''لیل'' کے اندھیرے چھا جانے کے بعد ''ضحیٰ'' کے روشنی بکھیرنے کو دو مصرعوں میں یوں بیان کر کے گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا تھا۔

ثاقب یہ کرم بھی کیا کم ہے ناصر جو لیا طاہر بخشا
ورنہ دیوانے مر جاتے سر ٹکرا کر دیواروں سے

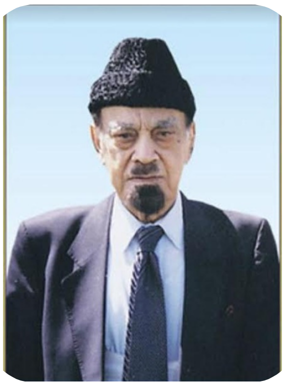
تین خلافتوں کے بابرکت زمانے دیکھے آسمانی نشانوں کا مشاہدہ کیا وہ زمانہ بھی دیکھا جب چند خوش قسمت صداقت کو تسلیم کرتے تھے تو ہم لہک لہک کر سورۃ نصر کی تلاوت کیا کرتے تھے اور اب وہ زمانہ بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے جب ایک ایک سال میں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں دین حق کو قبول کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔یادوں کے موتی سینے میں بہت محفوظ ہیں۔ان کو پرونے کا کام بھی اتنا آسان نہیں ہے۔چند منتشر اور بے ربط یادوں کو جمع کیا ہے۔

اور عشق کی باتوں میں ترتیب کی جستجو کرنا یوں بھی مناسب اور ممکن نہیں ہوتا۔

کتنی بے ربط تھی عشق کی گفتگو
جب مرتب ہوئی داستان بن گئی

(روزنامہ الفضل 31؍جولائی 2002ء صفحہ 3 تا 4۔یکم اگست 2002ء صفحہ 3 تا 4)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁



علم وعمل کے بلند مینار حضرت صاحبزادہ مرزا مظفر احمد صاحب

آپ کی شفقت وعنایات اور آپ کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات کی دلآویز

ہر تخلیق کا انجام فنا ہے اس لئے کسی فرد کے اپنے خالق و مالک کے حضور حاضر ہو جانے کا آخری سفر کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ بلکہ ایک قدرتی عمل ہے جو اسی طرح ازل سے جاری ہوا اور ابد الآباد تک چلتا رہے گا لیکن ہر فرد اپنے حسن اخلاق ملکی اور ملی اور دینی خدمات کی وجہ سے زندہ رہتا ہے اور اسے ہی بقائے دوام کہتے ہیں۔ ہر چند کہ یہ دور اخلاقی لحاظ سے بانجھ پن کا دور ہے اور ہمارا معاشرہ اخلاقی لحاظ سے قحط الرجال کا شکار ہے۔ ایسے میں اگر کوئی شخص اپنے حسن عمل کے اور اعلیٰ اخلاق کے جاوداں نقوش چھوڑ جاتا ہے تو اسے ابدی حیات حاصل ہو جاتی ہے میرا آج کا ممدوح۔ صاحبزادہ حضرت مرزا مظفر احمد بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو دنیا چھوڑ جانے کے بعد بھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ کتنی حق بات آپ کے تایا حضور نے کہی تھی کہ۔

تو چاہے تو وہی غیر فانی بن جائے
وہ زندگی جسے سب حباب کہتے ہیں

فروری 1913ء کو آپ کی پیدائش ہوئی۔ حضرت مسیح موعود کے بیٹوں کے تینوں بڑے صاحبزادگان کی اعلیٰ دینی ماحول میں تربیت ہوئی اور ان نوخیز پودوں نے خوش نما پھول کھلائے کہ ایک دنیا کو اپنی خوشبوؤں سے معطر کر دیا۔ یہ تینوں بھائی اکٹھے پلے اور جوان ہوئے اور ان میں یک رنگی اور وحدت واخوت کے ایسے گہرے تعلقات خود ہم نے دیکھے کہ گویا ایک مقدس مثلث کے تین زاویے تھے۔ تعلیم و تربیت پانے کے بعد ہر ایک نے اپنے اپنے رنگ میں خدمت دین اور ملکی وملی خدمات کے وہ جاوداں نقوش آہنی حیات مستعار کے دوران ثبت کئے اور نور اور روشنی کے ایسے ایسے مینار تعمیر کئے جو رہتی دنیا تک راہنمائی اور دستگیری کا کام دیتے رہیں گے۔ قوس قزح اپنے خوشنما رنگوں کی آمیزش کی وجہ سے خوبصورت اور معصوم مشہور ہے اور دلوں کو بہت بھاتی ہے۔ اسی طرح چاندنی کی ٹھنڈک اور شبنم کی پاکیزگی ملائمت اور خنکی بھی بہت دلپذیر مشہور ہے۔ مگر ان تینوں بھائیوں کے اخلاق اور ان کی دلنوازیوں اور دلربائیوں کے ساتھ ان قدرتی مناظر کا بھی کوئی مقابلہ نہیں۔ جو کیفیت اور معنویت اور رنگ ونور ان بھائیوں نے اپنی زندگی میں پیدا کیا ان کا جواب نہیں۔

آج جس بھائی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ نامور سکالر، انتھک کارکن، دیانت وامانت کے درخشاں مینار ملک وملت کی بے انتہا اور بے

لوث خدمت کرنے والے دینِ حق کی خدمت کے لئے ہر آن کمربستہ ایک وفا شعار اور پختہ دوست تھے غرض قلم میں طاقت نہیں جو اس کے اوصاف گنوا سکے نام نامی تھا حضرت مرزا مظفر احمد صاحب (ایم ایم احمد صاحب) یہ مخفف نام ایم ایم احمد بھی خوب مشہور ہوا اور اسی نام کے ساتھ بھی ایک تقدس ایسا اتصال پکڑ گیا کہ کسی اور کو اس میں شریک ہونے کی آج تک توفیق نہیں ملی۔ ہمارے میاں صاحب آج اس دنیا میں نہیں ہیں مگر میں محسوس کر رہا ہوں کہ اس کا وجود میرے قریب آ کر سرگوشی کر رہا ہے اس لہجہ میں جس لہجہ میں ازراہِ کرم و دلنوازی 29؍جولائی 2001ء کی شام کو اپنے مقام پر ڈیڑھ گھنٹہ کے قریب مختلف موضوعات پر باتیں کیں۔تعلق بنانا اور نبھانا تو اس خانوادے کی خاندانی خوبصورت روایات میں شامل ہے۔ میں پہلے کسی مضمون میں بیان کر چکا ہوں کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے 1952ء کی شام رتن باغ میں جب حضور ابھی کالج کے پرنسپل تھے بعد نماز مغرب میرا ہاتھ حضرت میاں صاحب کو جو پکڑایا اور اتنا کہا کہ سرگودھا کے اپنے گاؤں میں یہ واپس نہ جائے اگلی صبح میں حضرت میاں صاحب کے دفتر جو مال روڈ پر واقع تھا گیا تو مجھے انسپکٹر بحالیات شاہ عالمی دروازے کا حکم نامہ تھما دیا گیا اور یہیں سے میرے لاء گریجوئیٹ بننے کی بنیاد پڑی۔ اس تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں تعلق روز اوّل کی طرح پر کیف اور پر تپاک رہا۔ یہ تعلق اگرچہ ایک نیاز مند اور مخدوم ایک ذرہ ناچیز اور خاندانی غرور و وقار کے بلند و بالا مینار کے علاوہ دنیا کے بہت بڑے افسر اور بے کس اور بے نوا کے درمیان تھا۔ ادھر ایک بالکل بے کس اور بے ہنر مبتدی اور ادھر ایک منتہی ہر دور میں کسی قسم کا اشتراک منصب یا ہمسری کی نسبت تلاش کرنا کار بے کار ہی ہے لیکن یہ فخر میرا سرمایہ ہے کہ تعلقات میں جتنی بہتری ہو سکتی ہے اور جتنی بے تکلفی ممکن تھی آپ ہی کی طرف سے ہوتی تھی۔ سرگودھا میں میں نے وکالت شروع کی ہوئی تھی کہ کالج کے کسی فنکشن میں حضرت میاں ایم ایم احمد صاحب بھی لاہور سے آئے ہوئے تھے میں پہلے آپ کو لاہور ملا تھا اور راولپنڈی کا ایک کام کہا ہوا تھا۔ آپ نے پنڈی جانے پر وہ کام کرنے کا وعدہ فرمایا ہوا تھا دونوں بھائی آمنے سامنے تھے۔ جناب پرنسپل (بعدہ میرے سید و مرشد) اور حضرت مرزا مظفر احمد صاحب۔ حضرت صاحب نے پوچھا کہ مظفر آپ نے پنڈی کب جانا ہے میں ابھی آپ سے ملا نہیں تھا مگر انہوں نے مجھے دیکھ لیا ہوا تھا کہ پچھلی طرف کھڑا ہوا ہے فرمایا سمیع نون کے کام جانا ہے اور مڑ کر میری طرف نگاہ کی جب کہے گا چلا جاؤں گا۔ میں نے کہا میاں صاحب میرا کام تو گویا ہو گیا جو اتنا آپ نے میرا خیال رکھا ہوا ہے۔

29؍جولائی 2001ء کو میں واشنگٹن گیا تو مجھے گذشتہ ساٹھ ستر کے عرصہ کے سفر حیات میں بہت سے مسافر ملے جنہیں میں نے الوداع کہا اپنے بھی اور غیر بھی، عالم اور متقی اور راہنما اور رہبر بھی مگر یہ شخص وفا اور راستی کا مجسم تھا۔ اپنے مرشد سے تقویٰ کی ساری تفاصیل کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو رنگ لیا ہوا تھا۔ سب سے منفرد صاحب دل ستھری زندگی اور صاف ستھرا سفر۔ میں تو بیمار پڑا تھا اور دل کے بائی پاس کے لئے جانے کے لئے تیار بیٹھا تھا کہ ایک دن برادرم قریشی محمود الحسن صاحب کو فون کیا آگے سے انہوں نے بتلایا کہ

نامعلوم میاں صاحب کا جنازہ کب آتا ہے اوراس پر مجھے پتہ چلا کہ آپ فوت ہو چکے ہیں۔ آنسوایسے بہنے لگے جیسے کسی نے صراحیاں انڈیل دیں ہوں۔ آنکھوں کے سامنے ان کے الطاف کریمانہ، ان کے مقدس باپ دادا کے واقعات واحسانات اور ایک ایسی فلم چلی کہ میں بہت دیرتک اکیلا اپنے کمرے میں بیٹھا آنسو بہاتا رہا۔

حضرت صاحبزادہ صاحب کی طرف سے محبتوں اور شفقتوں کا ایسا پرکیف ریلا آیا جس سے میری محرومیوں اور بے کسی کے پر پوری طرح بھیگ گئے اوراس نے مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا اور میری اندرونی دیوارکوریت کی دیوار کی صورت مسمار کر دیا ان کی محبت کے مسلسل بڑھتے ہوئے گراف نے مجھے پریشان کر دیا اور میری پژمردگیاں اور پریشان حالی پر ان کی الفتوں کی چھاجوں اوس پڑ چکی تھی اور میں سوچتا تھا کہ یہ قرون اولیٰ کے دور کا شخص کس زمانے میں آ گیا ہے۔ تیس سال قبل جب قاتلانہ حملے میں آپ کو حی القیوم نے نئی زندگی عطا فرمائی تھی ہم کوتاہ فکر کیا اندازے لگا سکتے ہیں۔ مگر آسمانی آقا کی داد ودہش کا بھی کچھ ٹھکانہ نہیں کیا عجب آپ کا نام جانی قربانی دینے والوں میں شامل ہو چکا ہے۔

1978ء میں پہلی بار امریکہ گیا میرا قیام محترم ڈاکٹر شمیم احمد صاحب کے گھر تھا جب میاں صاحب کو پتہ چلا تو ایک صبح 9 بجے کے قریب میرے کمرے میں تشریف لائے اٹھ کر تعظیم بجالایا اور حضرت باجی کی خیریت دریافت کی فرمایا وہ ساتھ آئی ہوئی ہیں۔ وہ تمہیں سلام کہتی ہیں اور ساتھ ہی حکم سنایا کہ آج رات تم ہمارے ہاں کھانا کھاؤ گے میں نے عرض کیا کہ حضرت صاحب یہ بھی آپ کا ہی گھر ہے۔ مگر فرمایا کہ یہ لوگ ادھر ہی آ جائیں گے۔ چنانچہ ہم وہاں گئے تو لندن میں پاکستان کا سفیر بھی آیا ہوا تھا اور بھی کئی آدمی تھے۔ کھانے سے پہلے نماز مغرب وعشاء کا وقت ہوا تو نماز پڑھنے کے لئے ایک مخصوص کمرے میں گئے میں نے بہت اصرار کیا کہ جناب آج صاحب خانہ امامت کروائیں گے۔ مگر اس کے جواب میں دلفریب مسکراہٹ اور کہ میاں احمد (میاں عبدالرحیم احمد صاحب) نماز پڑھائیں گے اوراس کے بعد کھانا شروع ہوا سفیر صاحب سے تعارف کروایا بہت باتیں ہوتی رہیں مگر میاں صاحب کا ایک دستور تھا کہ ہمیشہ سنجیدہ اور بامقصد بات کرتے تھے۔

1978ء میں ہی جنرل یحییٰ خان صاحب فالج سے بیمار ہو کر امریکہ گئے اور واشنگٹن حضرت میاں صاحب کے گھر ہی سیدھے گئے ان کے ہمراہ ان کا بیٹا اور بیوی بھی تھی وہ تو مسلسل میاں صاحب کی کوٹھی پر ہی رہے اور جنرل صاحب کو حضرت میاں صاحب نے ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ مغربی ممالک کے طریق کے برعکس میاں صاحب کے پاس پاکستانی ڈرائیور پاکستانی باورچی اور خادم ہوتے تھے۔ وہاں شوفر والی کار تو ایک ایسی عیاشی ہے جو بڑے لارڈ ز ہی افورڈ کر سکتے ہیں۔ مگر میاں صاحب کے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ وہ لوگ دو ماہ میاں صاحب کے گھر رہے جس وقت واپس آئے تو صاحبزادی امۃ القیوم صاحبہ بھی ایئر پورٹ پر سابق صدر کی بیگم کو الوداع

کہنے گئیں۔

بوقت الوداع بیگم صدر یحییٰ خان صاحب نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور دعا کی کہ یا اللہ مظفر کافر ہے تو ساری دنیا کو اس جیسا کافر بنادے ہمارے ساتھ میاں صاحب کو اب کوئی غرض نہیں ہوسکتی مگر جس وفا شعاری اور بلند اخلاق کے تحت انہوں نے ہماری خبر گیری کی ہے دنیا کے پردے پر کوئی ایسا انسان نہیں جو اتنی خدمت کر سکے۔ وہ رو رہی تھی بے حد ممنونیت کا اظہار ان سب نے اس روز کیا۔ میں جب سال 2001ء میں حضرت میاں صاحب کے گھر گیا تو اس روز بھی سابق صدر کا فوٹو آپ کے کمرے میں پڑا تھا میں نے پوچھا تو بتایا کہ یحییٰ خان صاحب ہمارے گھر تھے تو ان کی خواہش پر فوٹو لئے پھر انہی کے کہنے پر میں نے وہ فوٹو انہیں پاکستان بھیج دیئے ایک فوٹو ایسا تھا کہ دیوار کے پیچھے حضرت مسیح موعود کا بڑا فوٹو تھا تو وہ میں نے نہ بھیجا کہ یحییٰ خان یہ نہ سمجھیں کہ میں انہیں خاموشی سے دعوت الی اللہ کر رہا ہوں۔ مگر یحییٰ خان تاڑ گئے اور انہوں نے اصرار سے کہا کہ جناب وہ فوٹو بھی بھیجیں جس کے عقب میں بڑا فوٹو بڑے مرزا صاحب کا ہے چنانچہ پھر میں نے وہ بھی انہیں بھجوا دیا۔

زندگی میں بڑے بڑے افسران سے واسطہ پڑا ہے۔ ایک بات جو انوکھی میاں صاحب میں، میں نے دیکھی اس کے وجوہ تلاش کرنا مشکل نہیں ہیں۔ حضرت میاں صاحب کا خاندانی وقار اور وجاہت ہی ایسی تھی اور پھر اخلاق ایسے بلند اور کریمانہ کہ آپ کے ماتحت تو آپ کے مداح تھے ہی آپ کے افسران بالا بھی آپ کی خواہشات سے سر مو انحراف نہیں کرتے تھے۔ ابتدائی سالوں 52،1951ء کی بات ہے کہ آپ ایڈیشنل کمشنر بحالیات تھے اور کمشنر بحالیات فدا حسین صاحب تھے مگر سید فدا حسین صاحب کا سارا انحصار حضرت میاں صاحب کے فیصلہ جات پر تھا۔ ممدوٹ وزارت میں آپ سیالکوٹ میں ڈپٹی کمشنر تھے کہ تین ایم پی اے وزیر اعلیٰ کو ملنے آئے انہوں نے اندر سے کہہ بھیجا کہ اگر میاں مظفر احمد صاحب کے خلاف کوئی بات ہے تو میں آپ کو ملنے کے لئے تیار نہیں ہوں ایسے تین ڈی سی اگر پنجاب کو مل جائیں تو سب معاملات طے ہو جائیں گے۔ یہ بڑی بے غیرتی ہے کہ ایسا صاف ستھرا افسر آپ کو پسند نہیں۔

آپ ڈی سی سیالکوٹ تھے جب لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے سیالکوٹ حکم بھیجا کہ وہاں جو قیمتی سامان پڑا تھا معذوروں کے لئے وہ ریل گاڑی میں لوڈ کرا کر ہندوستان بھیجا جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ماؤنٹ بیٹن ابھی اس لالچ میں تھا کہ اسے دونوں ممالک گورنر جنرل مقرر کر لیں۔ جب حضرت میاں صاحب کو اس سازش کا علم ہوا تو فوراً ریلوے حکام کو حکم بھیجا کہ یہ گاڑی جو تم بھیج رہے ہو روک لو انہوں نے عذر کیا کہ جناب لیڈی ماؤنٹ بیٹن کا یہ حکم ہے۔ میاں صاحب نے فرمایا خواہ کسی کا ہو تم میرے حکم کے پابند ہو۔ ہرگز گاڑی یہاں سے نہ چلے اور پھر سارا سامان اتار لیا گیا اور اس طرح پاکستان بڑے نقصان سے محفوظ رہا۔

مجھے ایک واقعہ آپ نے سنایا کہ نواب امیر محمد خان صاحب کالا باغ نے کہا میاں صاحب آپ کل سے چیف سیکرٹری پنجاب کا عہدہ

سنبھال لیں میں نے صدر ایوب خان صاحب سے بات کر لی ہے۔میاں صاحب نے کہا کہ میں چارج نہیں لوں گا ایک وجہ تو یہ ہے کہ سابقہ چیف سیکرٹری نے میرا نام ایڈیشنل چیف سیکرٹری کے لئے تجویز کیا تھا اس لئے یہ محسن کشی ہے کہ اسے ہٹا کر چارج خود سنبھال لوں دوسرے میں جونیئر ہوں میرا حق بھی نہیں بنتا۔نواب صاحب نے بااصرار کہا مگر انہوں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔نواب کالا باغ نے حیرت سے کہا کہ عجیب آدمی ہے۔ چیف سیکرٹری پنجاب کے عہدہ پر لات مار رہا ہے۔اصول پسندی اور ایسی بلند اخلاقی کی توقع آپ جیسے باکردار انسان سے ہی کی جا سکتی تھی۔ پھر جب آپ مرکز میں گئے تو پہلے فنانس سیکرٹری اور پھر ڈپٹی چیف پلاننگ کمیشن اور پھر مشیر صدر جو عہدہ کے لحاظ سے وفاقی وزیر کے برابر تھا، بنے۔

آپ مرکز میں تھے صدر پاکستان محمد ایوب خان صاحب تھے تو انہوں نے صدر صاحب سے کہا کہ نواب صاحب کالا باغ کے بیٹے مظفر خان کو وزیر لے لیں وہ تو انکار کر نہیں سکتا تھا۔جب اس بات کی خبر گورنر صاحب کو ہوئی تو انہوں نے میاں صاحب کو کھانے پر مدعو کیا اور پوچھا کہ ایسی کون سی تجویز آپ نے دی ہے آپ نے فرمایا تجویز منوالی ہے۔گورنر نے کہا میاں صاحب لوگ کہیں گے خود گورنر بنا اور بیٹے کو وزیر بنوالیا۔میاں صاحب نے کہا کیبنٹ میں آپ کی مخالفت ہوتی ہے۔جو کوئی بھی رنگ لا سکتی ہے آپ کا بیٹا وہاں بیٹھا ہوگا تو آپ کے مخالف لابی ختم ہو جائیگی۔اس پر گورنر بہت ممنون ہوا مگر کچھ دن سوچنے کے لئے مہلت مانگی۔

غرض ایسا باوقار عزت وعظمت والا یہ انسان تھا کہ جہاں رہا قطع نظر اس کے کہ اس کا عہدہ کیا ہے منصب کیا ہے وہ نمبر ایک ہی رہا مگر دنیا جانتی تھی کہ اس کی اپنی ذاتی غرض کوئی نہیں ہوتی تھی۔ ہر ایک کا بھلا سوچنا اور بھلا کرنا اس کی فطرت کا حصہ بن چکا تھا۔ان کی شخصیت علم وعمل کا دلآویز اور حسین مرقع تھی۔اقتصادیات ان کے ہاتھوں کی چھڑی تھی اور رموز حکومت گویا ان کی جیب میں تھے۔آدمی پڑھا لکھا ہو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہو اور ہر مشکل مرحلے میں اللہ سے راہنمائی بھی چاہے تو اس کے لئے کیا مشکل رہ جاتی ہے۔

''ایم ایم احمد کے انکشافات'' ایک صحافی نے آپ کا نہایت تفصیلی انٹرویو لیا تھا۔جو کتابی شکل میں شائع ہوا اور جس کی ایک کاپی مجھے عنایت کی گئی تھی۔نہایت مفید اور دلچسپ معلومات کا مجموعہ ہے۔اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا اپنی اونچی ملازمت کے دوران نیکوں سے بھی واسطہ پڑا اور دوسرے لوگوں سے بھی۔گویا جفت خوش حالاں وبدحالاں شدم۔ان پر پوری طرح صادق آتا ہے جو اچھے لوگ نہیں تھے۔ان کی برائیوں سے نفور رہے مگر ان کے ساتھ تعلقات کو نبایا کیونکہ دین حق بدی سے نفرت کرنے کا حکم دیتا ہے مگر بد کی دعا اور موعظہ حسنہ کے ذریعے اصلاح کی کوشش کرنے پر زور دیتا ہے۔

سیدنا حضرت مصلح موعودؓ کے زمانے میں بعض مخرجین کے رابطوں کی کنہ معلوم کرنے کے لئے ایک کمیشن حضور کے حکم سے بٹھایا گیا تھا۔جس کے ممبران حضرت شیخ محمد احمد صاحب مظہر اور حضرت صاحبزادہ مرزا مظفر احمد صاحب اور خاکسار راقم الحروف تھے۔اسی

دوران خاندان اقدس کے بعض افراد سے بھی بعض معلومات حاصل کرنا تھیں۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں مجھے راہنمائی کی ضرورت پڑی تو میں صاحبزادی امۃ الرشید صاحبہ کے در دولت پر حاضر ہوا۔ میری گفتگو میں میری کوئی بات انہیں پسند آئی۔ یوں میں نے مودب رہنا ہی تھا کہ سیدنا حضرت مصلح موعودؓ کی صاحبزادی اور سیدنا خلیفہ اوّلؓ کی نواسی ہیں۔ انہوں نے مجھے بھائی بنالیا جس پر مجھے آج تک بجا طور پر فخر ہے۔ حضرت میاں صاحب پاکستان آئے تو انہوں نے موصوفہ سے کہا کہ امتہ الرشید تم نے عقل کی بات کی ہے اور وہ یہ ہے کہ نون کو تم نے اپنا بھائی بنالیا ہے۔ باجی نے یہ واقعہ مجھے سنایا تو میرے لئے مسرت اور مزید اعزاز کا موجب بنا۔

چہرہ انسان کے اندرونے کا انڈیکس ہوتا ہے۔ ایک لطیف واقعہ سناتا ہوں بہت پرانی بات ہے حضرت میاں صاحب ولایت سے فارغ التحصیل ہوکر آئے تھے۔ مجھے محترم چوہدری عزیز احمد صاحب باجوہ سیشن جج مرحوم نے سنایا کہ میں لاہور G.P.O کے پاس فٹ پاتھ پر چل رہا تھا کہ اچانک حضرت میاں صاحب کسی کام سے وہاں آئے۔ کار میں تھے کار سے اتر کر ڈاکخانہ میں گئے تو میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ میں نے جوانی میں ہی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ نماز اور تہجد کا التزام بھی کرتا تھا۔ میاں صاحب کے چہرے پر نظر پڑی تو میں نے اپنے آپ کو مخاطب ہوکر کہا عزیز احمد! تو سو کوشش کرے اس نوجوان کے چہرے پر جو نور ہے اسے تو ساری عمر نہیں پہنچ سکتا۔

عشق الٰہی وسے منہ پر ولیاں ایہہ نشانی

کچھ عرصہ ہوا روزنامہ جنگ کے میگزین میں حضرت میاں صاحب کے بارے میں ایک مضمون چھپا اس میں مضمون نگار نے آپ کی تصویر بھی ساتھ شائع کردی۔ میں کافی دیر اسے دیکھتا رہا پھر اخبار سے تصویر پھاڑ کر ڈائری میں رکھ لی۔ میاں صاحب سے خط و کتابت اکثر رہتی تھی اس کے بعد جو خط لکھا تو تصویر والا واقعہ بھی لکھ ڈالا۔ آپ نے ایک بڑے لفافے میں اپنی ایک بہت بڑی خوبصورت تصویر بھیج دی کہ اخباری تصویر کو چھوڑ دو اتنا شوق ہے تو یہ رکھ لو۔ چنانچہ اب بھی وہ میرے کمرے کی زینت ہے۔ اب جو میں نے خط لکھا تو اس میں لکھا کہ میاں صاحب تصویروں سے کام نہیں بنتا آپ سے ملاقات ہو باتیں ہوں بہت سال ہوئے آپ آئے نہیں۔ غالباً 1991ء میں آخری بار آئے تھے۔ اسلام آباد سے 1991ء کا لکھا ہوا ایک خط میرے پاس پڑا ہے۔ تصویر کے بارہ میں لکھا کہ بہت شکریہ مل گئی ہے مگر یہ باتیں نہیں کرتی۔

آپ نے تصویر بھیجی ہم نے دیکھی غور سے
ہر ادا اچھی خموشی کی ادا اچھی نہیں

مگر لکھا کہ یہ بھی کچھ نہ کچھ کام آتی ہے۔ ہم نے کمرے میں رکھی ہوئی ہے۔

میرا ذہن یادوں کا بسیرا بن گیا ہے یہ یادیں کچھ عجیب چیز ہیں کچھ ایسی ہیں کہ ان سے دامن چھڑانا ناممکن، کچھ ہزار کوشش کے باوجود

گرفت میں نہیں آتیں۔آپ سے آخری ملاقات میری لینڈ امریکہ میں گذشتہ برس ہوئی میں نے محسوس کیا کہ قویٰ مضمحل ہو چکے تھے۔ عناصر میں اعتدال نہیں رہا تھا مگر وہی دلیری، دلنوازی اور خاندانی نور اور جاہ وحشم اس کی یاد چاہتا ہوں کسی طرح بھول جائے۔مگر اتنے پیارے شخص کی اتنی پیاری یاد کیونکر مجھے چھوڑے۔

23/جولائی کو آپ نے دنیا چھوڑی پھر 30/جولائی کو ربوہ کی بھری محفل سے جب وہ جوخوش لباس، خوش گفتار اٹھ گیا دلی دکھ ہوا کہ میں ان کے آخری سفر میں شامل نہ ہوسکا۔ کیونکہ عین 30/جولائی کو اس وقت جب ادھر آپ کی سواری آخرت کے لئے تیار ہورہی تھی لاہور کے ایک ہسپتال میں ڈاکٹر اپنے فن کا مظاہرہ اور سرجن اپنے ہنر کا کمال میرے ناتواں سینے کو مشق ستم بنا کر کر رہے تھے۔

دربار خلافت کے انمول رتن، اے وہ کہ جسے شاہانہ چہرہ عطا ہوا تھا تیری آنکھوں سے ہمیشہ نور اور محبت کی پھوار برستی تھی۔اے وہ جس کی کشادہ پیشانی وسیع قلب ونظر کی علامت تھی۔

اے نبیرہ مسیح پاک تو اپنے ''چاند'' باپ کی طرح غم زدہ دل کو بھانپ کر اس کے سارے ہم وغم اپنے سینے میں سمو لینے کی خواہش رکھتا تھا۔جا اپنی ساری خدمات قوم وملت اور خدماتِ دین متین کا صلہ اپنے رب کریم سے وصول کر۔ تیرے بزرگ باپ اور مقدس دادا تجھے خوش آمدید کہیں۔

اپنی سرکاری ملازمت کے دوران اعلیٰ معیار دیانت اور راست روی کا اجر تجھے تیرا خالق و مالک عطا کرے جس کی رضا ہر لمحہ تیرے پیش نظر رہی۔

تم روٹھ گئے دل بیٹھ گیا اب دل کی حقیقت کیا کہیئے

(روزنامہ الفضل 3/اکتوبر 2002ء صفحہ 3 تا 4)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁



حضرت علامہ شیخ محمد احمد صاحب مظہر کی عظیم شخصیت

آپ حضرت مسیح موعود کی دعاؤں کا عظیم ثمرہ اور جلیل القدر علمی وروحانی وجود کے مالک تھے۔حضرت شیخ محمد احمد مظہر صاحب کے متعلق جب گفتگو کرنا چاہیں یا کچھ لکھنا چاہیں تو آپ کی ولادت کے موقع پر سیدنا حضرت مسیح موعودؑ کا وہ مختصر مگر دعاؤں اور پیش خبریوں سے لبریز مکتوب آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جس کے الفاظ یہ تھے۔

''لڑکا نوزاد مبارک ہو اس کا نام محمد احمد رکھ دیں اللہ تعالیٰ باعمر کرے''۔

قریباً ایک صدی قبل آپ کی پیدائش کے موقع پر آپ کے عالی مرتبہ والد حضرت منشی ظفر احمد صاحبؓ کپورتھلوی کے نام یہ والا نامہ لکھا گیا اور اس میں تین پیش گوئیاں تھیں۔ نام محمد احمد رکھ دیں۔ جس میں اپنے آقا کی حتی المقدور اتباع کرنے کی دعا تھی پھر اس مکتوب میں اس کی پیشگوئی کو ''مبارک'' بھی لکھا گیا اور تیسری دعا جو وہ بھی بارگاہ الٰہی میں قبول ہو کر سچی پیشگوئی ثابت ہوئی وہ ''باعمر'' ہونے کی تھی۔

یوں تو آپ سے مجھے بہت عرصہ سے تعارف کا شرف حاصل تھا لیکن 1975ء میں جب آپ افتاء بورڈ کے صدر تھے اور میں بھی افتاء کمیٹی کا ممبر تھا تو ربوہ میں اجلاس میں شرکت کے بعد میں نے محسوس کیا کہ آپ علیل ہیں اور نقاہت محسوس فرما رہے ہیں۔ بس کے ذریعہ سفر کرتے تھے میں نے بھی فیصل آباد جانے کا کوئی بہانہ بنا کر اپنی کار میں لے جانے کی پیش کش کی۔ آپ نے سمجھا کہ یہ شاید میرے لئے فیصل آباد کا سفر اختیار کر رہا ہے مگر میں نے کسی کام کا ذکر کیا اور عرض کیا کہ آپ کی صحبت صالح بھی میسر آجائے گی اور جلد یہ بدیر اپنے کام کے لئے فیصل آباد تو مجھے جانا ہی ہے۔ آج ہی آپ کے ہمراہ چلا جاتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے تامل کے بعد رضامندی کا اظہار فرمایا۔ یہ میری پہلی جداگانہ ملاقات تھی۔ جو میرے لئے حضرت شیخ صاحب کی دعا ہائے مستجاب حاصل کرنے اور ذاتی مشوروں اور راہنمائی حاصل کرنے کا موجب ٹھہری۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس روز کے ایک گھنٹہ کے سفر کو اپنی تقدیر خاص سے طوالت بھی بخش دی۔ ہوا یوں کہ ہم ''شمس ٹیکسٹائل ملز'' جو چنیوٹ کے قریب ہے کے نزدیک سے گزر رہے تھے تو وہاں کے ایک احمدی افسر کو کسی طرح آپ کے وہاں سے گزرنے کا پیشگی علم ہو چکا تھا۔ انہوں نے بڑھ کر ہماری راہ روک لی اور مجبور کیا کہ حضرت موصوف ان کے گھر تشریف لے چلیں۔ جہاں پر ان کی والدہ صاحبہ کسی مشورے اور دعا کے لئے آپ کی منتظر بیٹھی تھیں۔ آپ نے میرے سے مشورہ کیا میں تو پہلے سے ہی چاہتا تھا کہ یہ مبارک لمحات اتنی جلدی ختم نہ ہوں۔ وہاں پر اس صاحب کی کوٹھی پر تو گویا ایک مجلس منعقد ہوگئی اور ہمیں حضرت شیخ صاحب کی پر معارف گفتگو سننے کا عمدہ موقعہ میسر آ گیا۔

یہ بیان علم و عرفان اور پاکیزہ فضا
آسمان سے جیسے کوئی نور برسانے لگے

جب قریباً تین گھنٹے بعد فیصل آباد پہنچے تو آپ نے مجھے وہاں ٹھہرانے پر اصرار کیا مگر میں نے معذرت کر لی اور واپس چلا آیا۔ جوں جوں مجھے قرب کا شرف ملتا رہا میں نے جانا کہ یہ نامور سکالر ادیب بے مثال فارسی کے بلند پایہ شاعر قانون میں بہت گہری نظر اور دقیق رائے رکھنے والے بزرگ ہیں۔ لیکن ساری صفات حسنہ اور تبحر علمی کے باوجود حد درجہ منکسر المزاج بے نفس اور تعریف و توصیف سے

یکسر بے نیاز تھے۔ ان سے مل کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گو یا انہیں اپنی وسعت علمی اور دینی اور روحانی مدارج کا ادراک بھی نہیں ہے۔

اس پہلی طویل ملاقات کے بعد تو پہلے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ پھر ملاقاتیں ہونی شروع ہوئیں خطوط میں اکثر تو میں اپنے مسائل کے حل کے لئے دعا کی گذارش کرتا تھا اور ہر معاملہ میں دعا کرنے کے بعد مفصل جواب ملتا اور آئندہ مسلسل دعا کرنے کا وعدہ ہوتا۔ دعائیہ خطوط کے جواب میں آپ کے اللہ تعالیٰ کے فضل و رحم پر یقین محکم پر قائم ہونے کی روشن دلیل ملتی اور ہمیں ہمیشہ بہت ڈھارس نصیب ہوتی۔

تبحر علمی

حضرت شیخ صاحب کے علم دینی و دنیاوی اور روحانی مقام و مرتبہ کو بلند و بالا پہاڑ سے تشبیہ دوں تو یہ تشبیہ بھی ناقص ہے اور آپ کے زہد و تعبد میں بلند مرتبت اور قبولیت دعا میں اللہ تعالیٰ کے احسانات اور فضل و کرم کی انتہا علیم و خبیر خدا کو ہی ہے ہم اس کو سمجھنے سے بھی قاصر ہیں۔ ان 17، 18 سالوں کے دوران میں نے سینکڑوں خطوط لکھے بعض میں ذاتی مشورہ طلب امور بھی ہوتے تھے اور ایک خط میں تو میں نے حضرت اقدس مسیح موعودؑ کے اس شعر کے معنی بھی دریافت کئے۔

اب تو خوشبو آ رہی ہے میرے یوسف کی مجھے
گو کہو دیوانہ میں کرتا ہوں اس کا انتظار

میں نے استفسار کیا تھا کہ ''یوسف'' سے مراد کون ہے مجھے 7/ دسمبر 85ء کو اپنے استفسار کا جواب ملا تحریر ہے۔ یوسف سے مراد قرآن کریم اور اسلام کی سربلندی اور فتح کی خوشبو تھی اور دلیل میں حضرت اقدس کا یہ شعر لکھا۔

یوسف شنیدہ بودم در چاہ ماند تنہا
دیں یوسفے کی تنہا از چاہ برکشیدہ

فرمایا اس شعر کے دوسری مصرع میں ''یوسفے'' سے مراد قرآن کریم ہے۔

طبیعت میں آورد بلا کی تھی۔ مضامین گویا آپ کے سامنے صف بستہ حاضر رہتے تھے۔ ہزار ہا اشعار زبانی یاد تھے۔ فارسی زبان میں آپ کے اشعار اس دور کے شعراء میں بے مثال ہیں۔ آپ کی ایک نادر کتاب جو فارسی ابیات پر مشتمل تھی ''دردودرماں'' مجھے اپنے دستخطوں سے عطا فرمائی۔

میں نے ''دردودرماں'' فارسی زبان سے دلچسپی رکھنے والے کئی دوستوں کو پڑھائی تھی۔ میں خود تو اس روحانی و علمی سمندر کی توصیف کرنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتا لیکن اہل علم لوگوں نے اس کلام کی بے حد تعریف کی اور یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ اس پائے کا فارسی زبان کا

شاعر پاکستان میں کوئی نہیں۔

پھر 1974ء کے پرآشوب دور کے بارہ میں آپ نے سات بند جن میں سے ہر ایک بند 15، 16/اشعار پر مشتمل تھا۔ فارسی زبان میں تحریر فرمائے چند ابیات پر مشتمل بند ہفتہ وار ''لاہور'' میں شائع ہوئے۔ تو میں نے ادب سے گزارش کر دی کہ اگر باقی بند عطا فرما دیں تو یہ عاجز شوق رکھتا ہے۔ چند یوم کے اندر اپنے دست مبارک سے ساتوں بند جو کم وبیش یکصد اشعار پر مشتمل ہیں تحریر کر کے ارسال فرما دیئے جو ایک نایاب علمی خزانہ ہے۔

اور یہ انمول علمی خزانہ محفوظ کر لینے اور زیادہ سے زیادہ اس کی اشاعت کرنے کے لائق ہے اے کاش ایسا ممکن ہو جائے۔

تعارف ہوا تو باہمی تعلق اگرچہ ایک نیازمند اور مخدوم ایک ذرہ ناچیز اور کوہ علم ووقار ایک مبتدی اور وہ بھی کندہ ناتراشیدہ اور ایک منتھیٰ اور خدا نما بزرگ کے درمیان تھا۔ مگر اس طرف سے حد درجہ پرتپاک اور پر کیف تعلق کا اظہار ہوتا رہا۔ میں حیران بھی ہوتا تھا اور اپنے بلند نصیبے پر اللہ کا شکر بھی بجالاتا تھا کہ ایسے فراخ دل شفیق مربی اور محسن اس تعصب اور جہالت کے دور میں علم وعرفان کے متوالے اور سفلی مفادات کے معاشرے میں بلند وعالی نظریات کو عزیز از جان سمجھنے والے بزرگ سے تعلق خاطر میرا سرمایہ تھا۔ ان سے وابستہ یادیں مدھم ہونے کو نہیں آتیں اور میں شاید ان روح پرور ملاقاتوں کو فراموش کرنا بھی نہیں چاہتا۔ بحر العلوم ہونے کے باوجود زندہ دل اور حوصلہ بڑھانے والے بزرگ تھے میں ان سے مل کر ولولہ تازہ اور عزم راسخ نصیب ہوتا تھا۔ میرا طریق تھا کہ جب طبیعت زیادہ پریشان ہوتی یا کوئی ناقابل حل مشکل پیش آتی تو میں حضرت شیخ مظہر صاحبؓ کا در فیض جا کھٹکھٹاتا اور ہمیشہ مجھے دعاؤں اور نیک تمناؤں اور نیک مشوروں سے نوازتے۔ مایوسی اور پژمردگی کی حالت چند منٹ کی ملاقات میں رفع ہو جاتی۔

قرب جتنا بڑھتا گیا میں نے محسوس کیا جیسے پھول کی بند کلی آہستہ آہستہ کھل کر فضا کو معطر کرتی ہے اسی طرح آپ کے پہلو دار شخصیت اور کردار کی عظمت جوں جوں ظاہر ہوتی گئی مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ ''تو چیزے دیگری''۔

11، 12 سال قبل میری اہلیہ عارضہ قلب سے بیمار ہوئیں تو میں نے ڈاکٹری مشورہ کے مطابق فیصل آباد کے ''ساحل ہسپتال'' میں انہیں داخل کرا دیا۔ ان دنوں حضرت شیخ صاحب بہت کمزور تھے۔ اوّل تو ہم نے انہیں اطلاع دینا مناسب نہ سمجھا کہ خود بیمار ہیں لیکن پھر یہ فیصلہ بدلنا پڑا کہ ان کی دعاؤں سے محرومی کا باعث ہوگا۔ عریضہ لکھ کر دستی ارسال کر دیا اور یہ تفصیل سے عرض کیا کہ ہمیں یہاں ہر قسم کی رہائش اور خوراک وغیرہ کی سہولت ہے مگر وہ جس کو بہت فیاضی اور وسیع دل عطا ہوا تھا فوراً پیغام بھیجنے شروع کئے۔ کھانا بھجوانے کی بے تکلف پیشکش۔ مریضہ کے لئے خون کی ضرورت کا علم ہوا تو فوری انتظام فرما دیا۔ ہسپتال میں آپ کے ارشاد کے ماتحت آنے والے دوستوں اور عزیزوں کا تانتا بندھا رہا۔ میں ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو بہت اصرار کے ساتھ ہر قسم کی امداد کرنے کا حکم دیا گیا مگر میں

نے حددرجہ ممنونیت اور لجاجت کے ساتھ عرض کیا کہ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو میں عرض کردوں گا۔ میں نے جانا کہ یہ درویش دل کا بادشاہ ہے اور وہ اپنے قول وفعل سے گویا دعوت دے رہا ہے۔

ہم فقیروں سے دوستی کر لو
گر سکھا دیں گے بادشاہی کا

قبولیت دعا

چندسال قبل کی بات ہے۔ برادرم حافظ ڈاکٹر مسعود احمد صاحب کا آپریشن لاہور میں ہوا۔ آپریشن کے بعد آپ کو بہت تکلیف ہورہی تھی۔ سرجن ڈاکٹر محترم بھائی صاحب کے عزیز تھے ہر ممکن علاج اور خدمت کرتے تھے مگر تکلیف میں کمی نہیں ہورہی تھی۔ میں آپ کے پاس بیٹھا تھا کہ محترم حافظ صاحب نے اپنے سرہانے سے ایک رومال نکالا اور مجھے کہا کہ آپ حضرت شیخ احمد صاحب مظہر کے پاس جائیں اس رومال پر دعا کرواکر مجھے کل تک پہنچادیں۔ میری تکلیف انشاءاللہ حضرت مظہر صاحب کی دعاؤں کی وجہ سے اللہ کے فضل سے رفع ہوجائے گی۔ میں اسی وقت عازم فیصل آباد ہوا اور رومال پیش کرکے محترم حافظ صاحب کی حالت کی تفصیل عرض کرکے دعا کی درخواست کی۔

حضرت شیخ صاحب نے ہمیں ساتھ شامل کرکے منہ پر رومال رکھ کر لمبی دعا کی اور آئندہ بھی دعا جاری رکھنے کا وعدہ فرمایا۔ میں نے اگلی صبح وہ رومال محترم حافظ صاحب کو پہنچادیا اور شافی مطلق نے اپنے پیارے بندے کی دعا قبول فرماکر شفاء عطا فرمادی۔

اس سے قبل مجھے ایک ایسی پریشانی لاحق ہوئی جس نے مجھے سخت روحانی اذیت میں مبتلا کردیا۔کوئی علاج نہ سوجھا جن پر اپنے زعم میں بڑی بھاری امیدیں وابستہ کررکھی تھیں سبھی نے بے رخی اور روگردانی اختیار کی۔تب شیر خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا صداقت سے لبریز پیغام یادآیا کہ:۔

تم بہت بھائیوں کا شمار کرتے رہتے ہومگر جب مصیبت آن پڑے تو ان کی تعداد بہت قلیل ہوجاتی ہے۔ ناشکری ہوگی اگر میں اس سلسلہ میں برادران کرام حضرت چوہدری عزیز احمد صاحب باجوہ اور جناب ثاقب زیروی صاحب کی امداد کی پیشکش کا ذکر نہ کروں گو وہ عملاً میری کوئی مدد نہیں کرسکتے تھے۔

اس دور میں ہاتھ کا سہارا دے کر تھامنے کا نہیں جھٹکا دے کر گرانے کا رواج بہت ہے لیکن جب میں نے اس درویش صفت خدانما انسان کے در پر دستک دی اور اپنی بپتا بیان کی تو انہیں حددرجہ شفیق روشن خیال اور دردمند پایا۔ آپ کے وفا دردمندی اور اخلاص سے بھرپور مشورے نے مجھے ایسی سیدھی راہ پر ڈال دیا جس پر چل کر تھوڑے ہی عرصہ میں میری ساری مشکلات حل ہوگئیں اور میں نے

بڑی کامیابی کے ساتھ اپنی منزل مقصود کو پالیا۔ میرے لئے عندالملاقات ہی عاجزانہ دعا شروع کر دی اور آئندہ بھی مسلسل دعاؤں سے مدد کرنے کا وعدہ فرمایا۔ مجھے اس مصیبت کے ایام میں جتنے بھی بہی خواہوں سے استمداد کرنی پڑی یا مشورہ لیا۔ سبھی نے ہاتھوں میں گویا آپریشن کرنے والے آلات تیار رکھے ہوئے تھے میرے جسم و دل پہلے ہی مجروح تھے۔ وہی حال ہوا کہ:۔

زخم دل ہو گئے ہرے میرے
ہر چمن سے میں اشک بار آیا

مخدوم حضرت شیخ صاحب مغفور کے علاوہ ایک اور روبخدا اور شفیق اور محسن کا ذکر بھی اس ضمن میں یہاں کرنے پر مجبور ہو رہا ہوں۔ ان کا نام نامی حضرت چوہدری عزیز احمد صاحب باجوہ ریٹائرڈ سیشن جج تھا۔ جو حال ہی میں نہایت کامیاب اور زاہدانہ زندگی گزار کر اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے ہیں۔ ان دونوں بزرگوں میں کئی اوصاف حسنہ مشترک تھے۔ مصیبت زدہ انسانیت کے لئے بلاتفریق وہ خلوص اور شفقت کی دولت بانٹتے پھرتے تھے۔ وہ مریض کی نبض پر محبت اور رأفت بھری انگلیاں رکھتے تھے اور شبانہ روز دعاؤں سے شافی علاج کرتے تھے اور کسی کو خالی نہیں لوٹاتے تھے۔ جب شدت غم سے انسان تنہا ہو جاتا ہے تو ایسے ہی عشق و وفا کے متوالے دل میں بسنے والے لوگ دل کی دھڑکن کے ساتھ رہتے ہیں اور ان کے وجود کی روشنی وجدان آفرین بن کر دردوالم سے نجات کا موجب بن جاتی ہے۔ پھر ان کی صحبت سے گزرا ہوا ایک ایک لمحہ آنکھوں کے آگے کھڑا ہو جاتا ہے اور مزید یہ احساس ساری کلفتوں کو دور کر دیتا ہے اگرچہ اس سے آتش فراق بھی بھڑکتی ہے مگر اس کا کوئی مداوا نہیں ہے اور ہر لحاظ سے انسان بے بس محض ہے۔

20رفروری 1993ء کو یوم مصلح موعود کی تقریب میں شمولیت کی غرض سے مجھے فیصل آباد سے ارشاد موصول ہوا تھا۔ اس سے پہلے برادرم چوہدری غلام دستگیر صاحب کا خط موصول ہوا تھا کہ حضرت شیخ صاحب کی طبیعت اب کمزور ہوگئی ہے۔ روز بروز نقاہت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان ساری پیشگی تنبیہات کے باوجود میں سرگودھا سے روانگی کے وقت یہ فیصلہ کر کے چلا تھا کہ صورت ملاقات یا زیارت جو بھی موقع ہوا کرنے کے بعد اجلاس میں شرکت کے لئے جاؤں گا۔ مغرب کی نماز سے قبل میں آپ کے مکان پر حاضر ہوا۔ تو آپ کے ایک پوتے نے بتایا دادا جان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ عزیز موصوف کا جواب بھی کمال ملائمت سے معمور تھا۔ میں نے اصرار کیا کہ میں انشاء اللہ پریشانی کا باعث نہیں بنوں گا۔ زیارت کر کے واپس لوٹ آؤں گا۔ مگر اللہ تعالیٰ جو میری خواہش اور پریشانی سے آگاہ تھا اور جو اپنے در کے بھکاریوں کی جھولی کبھی خالی نہیں دیکھنا چاہتا اس نے اپنے کرم سے میری دلجوئی کا اس طرح انتظام فرما دیا۔ جونہی میں نے آہستہ آواز میں سلام عرض کیا تو آپ نے آنکھیں کھولیں میں نے مصافحہ کیا اور اپنا نام بتایا تو

غالباً میری مرحومہ اہلیہ کا خیال آیا اور اناللہ پڑھا میں نے سمجھا تعزیت فرما رہے ہیں۔ پھر دریافت فرمایا ’’ہلال پور سے آئے ہو‘‘ میں نے عرض کیا نہیں سرگودھا سے آیا ہوں اور میری اہلیہ ہلال پور (جو میرا آبائی گاؤں ہے اور حضرت شیخ صاحب یہ جانتے تھے) میں نہیں بلکہ ربوہ میں دفن ہوئیں تھیں فرمایا ’’بہت اچھا‘‘ پھر دریافت فرمایا کیسے آئے ہو۔ میں نے بیت الفضل فیصل آباد میں اجلاس میں شرکت کا بتایا میں نے دعا کی درخواست کی فرمایا۔ ’’دعا کرونگا‘‘۔

میں نے برادرم حافظ صاحب کے لئے ان کی بیماری کی حالت عرض کر کے دعا کی درخواست کی تو قدرے تامل سے فرمایا ’’حافظ صاحب کا نام کیا ہے‘‘ میں نے عرض کیا ’’حافظ مسعود احمد‘‘ فرمایا ’’ہاں یاد آ گیا‘‘ ہے ان کے لئے دعا کروں گا۔ اس کے بعد بھی میرا کسی کام کے لئے فیصل آباد جانا ہوا تو ملنے کے لئے حاضر ہوا۔ باوجود حد درجہ کمزوری کے پہچان لیا اور وہاں پر موجود اپنے صاحبزادے کو کوئی مشروب لانے کے لئے کہا میں نے معذرت کر دی اور دعا کی درخواست کر کے واپس چلا آیا۔ اس کے بعد آخری بار 27 رمئی 1993ء کو فیصل آباد گیا مگر اس روز ملاقات نہیں ہوئی کہ غالباً محترم شیخ مظفر احمد صاحب کے گھر پر گئے ہوئے تھے اور طبیعت بہت زیادہ خراب ہو چکی تھی۔ زیارت کرنے کی خواہش بھی پوری نہ ہوئی۔ حالت کی تفصیل معلوم کر کے دل کو دھچکا لگا اور آنے والے سانحے کے اندیشوں نے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ یہ فیصل آباد کا وہ پھیرا تھا جب اپنے مخدوم اور ممدوح کی ملاقات سے محروم واپس آیا۔ میرا بجھا ہوا دل محبوب کی یہ آواز سن رہا تھا۔

ہم ہیں تو آپ کوچہء بازار میں بھی ہیں
ہم اٹھ گئے تو کوچہ و بازار دیکھنا

پھر دوسرے ہی روز یہ دل فگار خبر فون پر ملی کہ۔

وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی

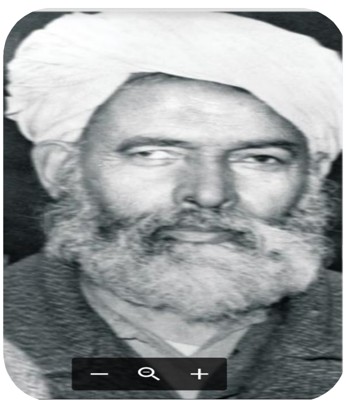
بیماری طویل تھی مگر ان کا صبر وتحمل اور برداشت قابل دید تھی۔ مرض میں ذرا سا فرق آیا تو بیت الفضل نماز پڑھنے کے لئے چل پڑے۔ بستر علالت پر ہونے کے باوجود چہرے کی شگفتگی اور فیض رسانی کی عادت میں ذرا بھر کمی نہیں آئی۔ میں نے استجابت دعا کے ان گنت نشانات دیکھے ہیں۔ خود میرے حق میں آپ کی دعاؤں کی قبولیت اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کا شمار ممکن نہیں۔ کتاب زندگی کا گویا آخری ورق الٹ رہے تھے۔ میری درخواست دعا پر بڑے پراعتماد لہجہ میں فرماتے ’’بہت اچھا‘‘۔ اور مجھے یقین ہو جاتا کہ دعا انشاء اللہ بارگاہ الٰہی میں قبول ہو گی۔ اہل اللہ نے عطا کرنے میں کبھی کمی نہیں کی۔ اس ساقی کی مے پاکیزہ اور بے درد تھی۔ مجھے ہمیشہ اپنی تنگ اور آلودہ دامنی کا احساس رہا۔ احسانات کا بہاؤ ہمیشہ یک طرفہ مگر بہت تیز رہا۔

ہم قدرتی طور پر آپ کی موت کے صدمے سے ملول تھے اور حد درجہ محرومی کا احساس دل پر گہرے گھاؤ لگا رہا تھا۔غم کے آنسو تھمتے نہیں تھے مگر اللہ کے پاک فرشتوں نے ایسی پاک اور پاکیزہ روح کے استقبال میں جشن عروسی منایا ہوگا۔

اے میرے محسن تجھ پر سلام تیرے احسانات اور تیرے علمی اور عملی کارنامے اور تیری نیکیاں رہتی دنیا تک یاد رہیں گی۔اللہ تجھے اپنے قرب کے اعلیٰ درجات عطا فرمائے۔

تمہاری قبر پر تاحشر باران کرم برسے
تمہاری روح کو حاصل ہو وصل و رحمت باری
خدا حافظ تمہارا ہو تمہیں جس نے بلایا ہے
ہمارا بھی خدا حافظ خداداری چہ غم داری

(روزنامہ الفضل ربوہ مورخہ 30؍دسمبر 2002ء)



حضرت مولوی شیر علیؓ صاحب

میری یادوں کے آئینہ میں۔فرشتہ سیرت وجود

حضرت مولانا ممدوح کو دنیا سے گزرے چھپن سال کا طویل عرصہ گزر گیا ہے مگر ان کی عظمت اب تک دھندلائی بھی نہیں ہے۔وہ عبادت گزاری عجز اور انکسار، وسعت علم، تقویٰ اللہ کے بلند بام پر فائز ہونے کے ایسے نقوش چھوڑ گئے ہیں جو کبھی مٹ نہیں سکتے اور جنہیں ہمیشگی کی ضمانت عطا ہوئی تھی۔

ان کے عقیدت منداور ارادت منداپنی محبتوں اور عقیدتوں اور آپ کی خداترسی اور غرباء پروری کے حالات دل پذیر الفاظ کی مالا میں پروتے رہیں گے مگر ان کے بلند و بالا مقام قرب الٰہی اور شان تقویٰ کو اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ہی جانتا ہے یہ ساری کاوشیں تو اپنی عقیدتوں کا اظہار ہے۔اور وہ بھی اپنے خام علم کے مطابق۔حال ہی میں ''نجم الھدیٰ'' کے نام سے ایک بہت عمدہ کوشش اور سعی بلیغ سامنے آئی ہے مگر ادب سے عرض کرتا ہوں کہ حسنات اور صفات حسنہ کے اس بحر بیکراں کی تہہ تک کسی کو رسائی حاصل نہیں ہوسکتی نہ کوئی اس کو کماحقہ بیان کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

میں نے چند سال قبل آں ممدوح کے کچھ آنکھوں دیکھے حالات سپرد قرطاس کئے تھے اب اوّل تو جناب ایڈیٹر صاحب الفضل نے

توجہ دلائی ہے اور پھر نجم الھدیٰ کے مطالعہ سے وہ یادیں جو کبھی زندگی بھر بھول نہیں سکتیں پھر تازہ ہو گئیں پھر ادرحمہ اور ہلال پور دونوں گاؤں کی ہمسائیگی کے باعث میں نے کچھ مزید لکھنا اپنا فرض سمجھا۔

پرانی محفلیں یاد آ رہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے

حضرت مولانا شیر علی صاحبؓ کا ایک خاص وصف فیض رسانی تھا۔ 1946ء میں ہمیں کالج میں تعطیلات ہونے والی تھیں کہ موضع نورانوالی تحصیل بھلوال (جہاں پر کہ حضرت مولانا صاحب کے بڑے بھائی حضرت حافظ عبدالعلی صاحب کی شادی ہوئی تھی) کا ایک شخص مسمی چودھری محمد مراد رانجھا حضرت مولانا شیر علی صاحبؓ کے ہاں پہنچا اور ایک مقدمہ میں جو اس کے خلاف سرگودھا کی عدالت میں دائر تھا۔ آپ سے مدد کی استدعا کی گو آپ کا ایسے کاموں سے دور کا تعلق نہیں تھا مگر بڑی ہمدردی سے اس کی بات سنی اور مجھے ہوسٹل سے طلب فرمایا اور خط جناب چودھری عزیز احمد صاحب باجوہ جو ان دنوں سرگودھا میں سول جج تعینات تھے کے نام لکھ کر مجھے دیا کہ چودھری مراد ان کے ہاں نہ جائے تم جانا اور اگر وہ اس کی جائز امداد کر سکیں تو کر دیں چنانچہ میں تعطیلات پر گھر پہنچا تو چودھری مراد نے خواہش کی کہ مجھے ساتھ لے کر سرگودھا جناب باجوہ صاحب کو خط پہنچایا جائے چنانچہ میں ان کے ہمراہ گیا مگر یہ احتیاط کر لی کہ اسے باجوہ صاحب کی کوٹھی میں نہ لے گیا مغرب کا وقت تھا حضرت باجوہ صاحب اپنے دو بڑے بیٹوں کے ہمراہ سیر کے لئے گئے ہوئے تھے مجھ سے انہوں نے کچھ نہ پوچھا اور فرمایا آؤ کھانا کھا لیں۔ کھانے کی میز پر بیٹھتے ہی حضرت مولوی صاحب کا خط دیا۔ آپ پڑھ کر مسکرائے وہ مقدمہ انہیں کی عدالت میں تھا اور اس کا فیصلہ بھی چودھری مراد کے خلاف ہوا کہ وہ حق پر نہیں تھا رات مجھے اپنے پاس رکھا اور حضرت مولوی صاحب کو سلام عرض کرنے کا ارشاد فرمایا۔ صبح میں روانہ ہو کر گھر پہنچا چودھری مراد کی مراد بر نہ آئی مگر مجھے حضرت چودھری صاحب سے تعارف حاصل ہوا۔ جو عمر بھر قائم رہا اور وہ تعلق میرا سرمایہ حیات بن گیا۔

حضرت مسیح موعودؑ کی پیشگوئی کے مطابق لیکھرام مورخہ 6 / مارچ 1897ء کو ہلاک ہوا اور عین اسی روز حضرت مولانا شیر علی صاحبؓ بیعت کر کے حضور کی غلامی میں داخل ہو گئے۔

پھر حضرت مولانا ممدوح نے جن کی عمر بروز بیعت 22 سال تھی۔ جلد جلد روحانی ترقی کی منازل طے کیں اور پچاس سالہ زمانہ بیعت میں اپنی صحت اور جان کی پرواہ کئے بغیر وہ سنہری کارہائے نمایاں سرانجام دیئے اور **سمعنا و اطعنا** کی وہ مثالیں قائم کیں جو رہتی دنیا تک تاریخ کے اوراق میں تابندہ و درخشندہ رہیں گی اور قومیں جو بعد میں آئیں گی انہیں پڑھ کر حیرت میں ڈوب جائیں گی کہ ایسے بے نفس، بے مثل قربانیاں کرنے والے بھی حضرت مسیح موعودؑ کے غلاموں میں گزرے ہیں۔

میری یہ خوش بختی کہ میرے والد میاں عبدالعزیز صاحب ؓ نون بھی حضرت مسیح موعودؑ کے رفیق تھے گو عمر میں حضرت مولوی صاحب سے چھوٹے تھے مگر دونوں بزرگوں کے ننھیال للیانی تحصیل بھلوال میں تھے۔ اس لئے حضرت مولوی صاحب میرے ابا جان کو ''بھائی جی'' کہہ کر پکارتے تھے اور بہت محبت کرتے تھے کہ دونوں کی مائیں للیانی کی تھیں۔ اس لئے گویا وہ بہنیں تھیں اور یہ ''خالہ زاد بھائی'' اس زمانے میں ایسی نسبت باہمی تعلقات کو بڑھانے کے لئے کافی سمجھی جاتی تھی پھر گاؤں ادرحمہ حضرت مولوی شیر علی صاحب ؓ کا مولد اور ہلال پور گاؤں کا فاصلہ دو میل ہے۔ یہ گاؤں متصل ہونے کی وجہ سے باہمی تعلقات کی گہرائی کا موجب بن گئے تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ حضرت گوہر بی بی صاحبہ حضرت مسیح موعود کی رفیقہ تھیں اور موصیہ ہونے کی وجہ سے 1907ء میں وفات ہوئی تو بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئیں۔ للیانی گاؤں میں بہت مرد وزن حافظِ قرآن کریم ہوئے تھے چنانچہ حضرت موصوفہ بھی قرآن کریم کی حافظہ تھیں۔

للیانی بہت بڑا قصبہ ہے۔ تحصیل بھلوال میں آبادی اور اراضیات کی وسعت کے لحاظ سے سب سے بڑا۔ باوجود کوشش کے مجھے حضرت گوہر بی بی صاحبہ کے ددھیال کا علم نہیں ہوسکا۔ جہاں تک بچپن کا میرا تاثر ہے وہ تلہ قوم سے تعلق رکھتی تھیں۔

حضرت مولوی صاحب کی شادی موضع ''بدررانجھہ''، متصل مڈھ رانجھا میں رانجھا قوم میں ہوئی تھی۔ آپ کی اہلیہ صاحبہ کے بھائی کا نام صالح محمد رانجھا تھا مگر خدا کی حکمت وہ بھی کہیں گوشہ گمنامی میں چلے گئے۔ اب ان کا کوئی رشتہ دار بدر میں موجود نہیں میں بدر اکثر جاتا رہتا ہوں یہ گاؤں ہمارے گاؤں سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔

پھر مجھے بجا طور پر ناز ہے کہ میرے ننھیال بھی اسی گاؤں للیانی میں ہیں جس میں حضرت مولانا شیر علی صاحب ؓ کے ننھیال تھے۔ میری والدہ کا نام فتح بی بی صاحبہ تھا جن کے بارے میں کچھ عرصہ قبل میں نے ایک مضمون الفضل میں لکھا تھا اور گو ہمارے ننھیال میں سے کوئی احمدی نہ ہوا نہ حضرت مولانا شیر علی صاحب ؓ کے ننھیال میں سے اور نہ میرے ننھیالی رشتے داروں میں احمدیت پھیلی مگر ہمیں نیک ماؤں کا دودھ نصیب ہوا میری والدہ بھی احمدی تھیں۔ الحمدللہ

ان ساری نسبتوں کے باوجود کجا حضرت مولانا شیر علی صاحب اور کجا میں عاجز۔ صدر محمد ایوب خان نے کامونکی منڈی سے باسمتی اعلیٰ قسم کے چاول ملکہ برطانیہ کو تحفہ بھیجے تھے تو ان دنوں یہ کہاوت ایجاد ہوئی تھی کہ ''کہاں کامونکی منڈی اور کہاں بکنگھم پیلس'' کوئی نسبت ہی نہیں تھی یہی حال اپنا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ ذرہ نواز کی قدرت اور رحمت سے کیا بعید کہ اس کے مقرب بندے کے ساتھ یہ تعلقات میری مغفرت کا موجب بن جائیں۔

1944ء میں جب ٹی آئی کالج میں داخل ہوا تو حضرت مولانا شیر علی صاحب میرے مربی سرپرست اور گویا گارڈین مقرر ہو چکے تھے۔ ہر ضرورت کا خیال، میری پڑھائی میں دلچسپی، میرے ابا کا حال پوچھنا اور ان کے لئے ہمیشہ دعائیں کرنا الغرض مجھے بیش بہا نعمت

میسر آ گئی تھی۔اوائل میں ہمارا ہوسٹل محلہ دارالانوار کی طرف سے جانے والی سڑک پر ایک کوٹھی میں تھا اور ہوسٹل کے سامنے سڑک کے پار حضرت مصلح موعودؓ کی کوٹھی ''دارالحمد'' میں حضرت مولوی صاحب کا ترجمہ قرآن کریم کا دفتر تھا۔

آپ ان دنوں علیل بہت رہے بخار اکثر ہو جاتا تھا اس لئے ''بیت الذکر' جا کر نماز باجماعت ادا کرنا ممکن نہ تھا چنانچہ ہوسٹل سے مجھے طلب فرمالیتے اور ہم اکٹھی نمازیں پڑھتے امامت حضرت عبدالرحیم صاحب شرما کراتے تھے اور حضرت مولوی صاحب کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا ایک بار شرما صاحب نماز پڑھ رہے تھے اور حالت قعدہ میں تھے حضرت مولوی صاحب نے سمجھا کہ بیٹھے ذکر الٰہی کر رہے ہیں شرما صاحب کے بھاری بھرکم کوٹ میں اتنی گرد وغبار ہوتی تھی کہ مسح بخوبی ہوسکتا تھا۔ چنانچہ حضرت مولوی صاحب نے شرما صاحب کی پیٹھ پر دونوں ہاتھوں سے گرد اڑا کر مسح کیا اور پھر محسوس کیا کہ شرما صاحب تو سنتیں پڑھ رہے تھے حضرت مولوی صاحب مسلسل استغفار کرتے رہے اور شرما صاحب سے بڑی لجاجت کے ساتھ معذرت کی وہ کہتے جارہے تھے کہ کیا ہوا مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی مگر حضرت مولوی صاحب ہیں کہ بار بار منتیں کر رہے ہیں کہ مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کی نماز میں عدم علم ہونے کی وجہ سے مداخلت کی۔

آپ کی نماز کی کیفیت بیان کرنے کی نہ مجھ میں طاقت نہ میرے قلم کو یارا۔فرض نماز تو امام صاحب کی اقتداء میں ختم کر لیتے مگر سنتوں میں ہم پیچھے بیٹھے رہتے اور آپ دنیا و مافیھا سے بے خبر اپنے مالک کے حضور حاضر ہو جاتے تو ایک تلاطم برپا ہو جاتا سینہ اس طرح کھولنے لگتا جیسے تیز آنچ پر ہنڈیا ابل رہی ہو۔

سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ غلام نماز میں کھڑا ہوتا تو راز و نیاز میں اس قدر محو ہو جاتا کہ سورۃ فاتحہ کی ایک ایک آیت بار بار دہراتے دل اور دماغ اور جسم کا ذرہ ذرہ کانپ رہا ہوتا زبان میں ارتعاش ہے گویا زندگی کی ساری تمنائیں پوری ہو رہی ہیں رکوع اور سجدے کی کیفیات کہیں اور نہ دیکھیں نہ سنیں سیدنا رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بیان فرمودہ ''احسان کا بہترین نمونہ'' ''کانک تراہ'' کے ایمان افروز نظارے تھے گویا ایک مچھلی مصفیٰ پانی میں تیر رہی ہے وہ نہ تھکتی ہے نہ ماندہ ہوتی ہے اب قعدہ میں بیٹھے تو جب **السلام علیک ایھاالنبی** کا مقام آیا تو آواز خفیۃً سے نکل کر جھرۃً کی حدود میں داخل ہو چکی ہے اور اس میں حضرت کا کوئی اختیار نہیں۔

گویا اپنا محبوب سامنے ہے اس پر سلام بڑے ادب سے عاجزی سے عشق و محبت میں ڈوب کر پیش کر رہے ہیں اور بڑے سوز سے وارفتگی اور فدائیت سے عقیدت کے پھول آقا کے حضور نچھاور کر رہے ہیں ان ساری دعاؤں اور سکنات و حرکات کے دوران سینہ میں اس قدر جوش اور سوز ہے کہ

اتنا تو ہم نے سوز نہ دیکھا کباب میں

آپ اس دوران کلیۃً بے خبر ہیں کہ آس پاس کون ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔

اب وہ گویا اس دنیا میں نہیں رہے کہیں اور چلے گئے ہیں شاید اپنے مرشد کے پاس جن کا قول صادق ہے۔

ہم تو بستے ہیں فلک پر اس زمین کو کیا کریں
آسماں کے رہنے والوں کو زمیں سے کیا نقار

آپ کے بڑے بھائی حضرت حافظ عبدالعلی صاحب تھے وہ بھی بڑے بزرگ اور متقی انسان تھے۔ چونکہ دونوں قدبت میں بھی برابر اور شاید عمروں میں بھی تھوڑا فرق ہو۔ حضرت حافظ صاحب سے کسی نے پوچھا کہ آپ دونوں میں سے بڑا کون ہے۔

حضرت حافظ صاحب نے فرمایا ''دنیا میں تو پہلے میں ہی آیا تھا مگر بڑا شیر علی ہے''۔

اس مختصر جواب میں حضرت حافظ صاحب کی کسر نفسی عاجزی اور چھوٹے بھائی کی بلند و بالا مقام روحانی کا جس خوبصورتی سے اعتراف کیا گیا ہے وہ خود حضرت حافظ عبدالعلی صاحب کے عارف باللہ ہونے کا واضح ثبوت ہے حضرت حافظ صاحب خود بڑے متقی بے نفس اور زاہد و عابد بزرگ تھے مگر آپ کا جواب جب بھی کوئی نکتہ شناس مومن پڑھے گا تو اس سے روحانی لذت اٹھائے گا۔

میں اکثر حضرت مولانا شیر علی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا کبھی کسی خانگی مشورے کی غرض سے کبھی دعا کی درخواست کرنے۔ ایک روز میں آپ کے در دولت پر حاضر ہوا تو پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے اور مصافحہ کیا تو تیز بخار تھا جو میں نے محسوس کیا پوچھا تو فرمایا ہاں بخار ہے۔ میں نے ایک جاہلانہ سوال کیا کہ حضرت میں نے ایف، اے تو کر لیا ہے گھر پر ابا اکیلے ہیں میں نے زمینداراہ ہی کرنا ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں پڑھائی چھوڑ کر گھر چلا جاؤں۔ آپ مشکل سے اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا ہرگز نہیں بی، اے ضرور کریں اور ایک وقت آئے گا کہ بی، اے کی ڈگری کی ضرورت پڑے گی اور اس وقت پھر بی، اے کرنا تمہارے لئے بہت مشکل ہوگا میں تو فوراً سپر انداز ہو گیا عرض کیا کہ حضرت ٹھیک ہے آپ جس طرح حکم دے رہے ہیں اسی طرح کرونگا۔ چنانچہ میں نے تقسیم ملک کے بعد لاہور آ کر بی اے کر لیا۔

سچ یہ ہے کہ یہ نسخہ میرا بار بار کا آزمودہ ہے کہ

گفتہ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(ترجمہ) ایک عارف باللہ کا کہنا اللہ تعالیٰ کا کہنا ہوتا ہے اگرچہ اللہ کے بندے کے حلق سے ہی وہ بات نکلتی تو ہے۔

چنانچہ چار سال بعد 1952ء میں ایل ایل بی کرنے کا ارادہ کیا تو حضرت مولانا کا فرمان یاد آیا کہ اب نہ بی اے ہو سکتا تھا اور نہ بی

اے کے بغیر ایل ایل بی۔ وہ بلند حوصلگی کے ایک آسمان تھے اس لئے زندہ خدائے علیم وقدیر کے ساتھ آپ کا زندہ اور جاودانی تعلق تھا جب بھی آپ سے ملتے تو ہمیں بھی زندہ رہنے کا بلند حوصلہ آپ کی صحبت سے مل جاتا۔

وہ خدا نما انسان ماہ نومبر 1947ء میں اپنے محبوب آسمانی آقا کے حضور حاضر ہو گیا اور میں اپنے والد صاحب کی زندگی میں ہی گویا یتیم ہو گیا جس شخص کو خود اٹھا کر اپنے ہاتھوں سے سپرد خاک کیا بظاہر وہ عزیز واقرباء اور ارادتمندوں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا مگر حق یہ ہے کہ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود ہمارے دلوں سے رخصت نہیں ہوا اس کا اعلیٰ کردار اس کی محبت وشفقت اس کی غرباء پروری اس کی علمی اور ایمانی حلاوت اس کا ذوق عبادت آقائے قادیانی کی اطاعت جس میں عشق کی ملونی تھی ایسی اعلیٰ صفات وحسنات آپ کے جسم کے ساتھ مٹی میں دفن ہو ہی نہیں سکتی تھیں یہ ہمارے آس پاس ہی رہتی ہیں اور ان کی خوشبو ہمارے قلب وجان کو اب بھی سکون اور راحت بخشتی ہے اور معطر رکھتی ہے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے نجم الھدیٰ کی مؤلفہ کو جوں جوں اس کی ورق گردانی کرتے رہے وہ اللہ کا ولی بے حساب یاد آیا اس کے بیمار دنوں کی محنت اور رتجگے اس کی پل پل کی محنت شاقہ اس کی مستجاب دعائیں جس سے ہم نے پیدائش سے پہلے بھی حصہ پایا اور پیدائش کے بعد بھی۔ اپنے آقا ومرشد سے عشق ومحبت کے زنجارے جو آج بھی عشاق کے لئے پیمانہ عشق ووفا ثابت ہو رہے ہیں ایک ایک واقعہ سے ایمانوں میں تازگی اور دلوں میں رشک پیدا ہوتا ہے۔

حضرت مولانا صاحب نے بھی تو عید کے موقع پر حضرت مسیح موعود کے جوتے تلاش کر کے پگڑی کے سفید شملے سے صاف کرنے کا اعزاز حاصل کر ہی لیا تھا۔ اے مسیح موعود کے عاشق صادق تیری فدائیت اور فریفتگی کے اس اظہار نے تیری شان دوبالا کر دی ہے۔

ہاں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ایک روز نور پور تھل کے ریگستان میں شکار کھیلنے تشریف لے گئے میں بھی آپ کے ہمراہ تھا آپ کے بوٹ ریت سے بھر گئے جب واپس آنے لگے اور حضور موٹر کی عقبی سیٹ پر بیٹھے تو میں نے آگے بڑھ کر حضور کے بوٹ کھول کر ریت نکالی اپنی چادر سے صاف کئے اور پھر حضور کے پیر صاف کئے اور بوٹ پہنائے جب اتنا کچھ میں کر چکا تو حضور نے روانگی کا حکم دیا اور میں پیچھے کھڑی اپنی کار میں سوار ہو گیا۔

اتنی معمولی سی سعادت جو میرے حصے میں آئی یہ بھی میرے منّان مالک کا احسان ہے۔

(روزنامہ الفضل 6/مارچ 2003ء صفحہ 3 تا 4)

۞۞۞۞۞۞۞۞۞



میرا معتبر حوالہ کوئی ہے تو بس یہی ہے
تیری اک نظر کا صدقہ میری ساری زندگی ہے

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کی روح پرور یادیں اور نوازشات کریمانہ

آپ نے وفا و ایثار اور محبت کے لافانی مینار تعمیر کئے

سیدنا حضرت مرزا طاہر احمدؒ وہ دین حق کا فتح نصیب جرنیل امن اور محبت اور وفا اور دینی اقدار و شعار کے لافانی درس دینے والا محبوب وہ کروڑوں دلوں کی دھڑکن۔ ہاں وہ شخص جو تھا ’’دعا ہی دعا ہمارے لئے‘‘ اپنے لاتعداد عشاق کو بلکتے ہوئے چھوڑ کر ’’رفیق اعلیٰ‘‘ کی طرف پرواز کر گیا۔

اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں مگر ہر آن یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ بچوں یا خواتین جبکہ حضور کی اپنی کوئی صاحبزادی بھی ساتھ ہوگی یا بوڑھوں یا جوانوں میں ایسے بیٹھے ہوئے ہوں گے جیسے تاروں کے ہالے میں چاند ضوفگن ہو۔ MTA آن کریں گے تو وہ من موہنی صورت نظر آئے گی۔ مگر اب دیکھ کر درد کی کسک ضرور ساتھ لائے گی۔ کہ میرا آقا نہیں کروڑوں کا محبوب اب ان نظروں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو چکا ہے۔ اب اس کی روح پرور باتیں سنائی دیں گی مگر اس کے پاکیزہ لمس سے ہم ہمیشہ کے لئے محروم ہو چکے ہیں۔ اب ہماری ’’ہم آغوش‘‘ ہونے کی تمنائیں حسرت بن چکی ہیں۔

اب کس کو بھیج بلائیں گے
کیسے سینے سے لگائیں گے
مر کر بھی کوئی لوٹا ہے
سائے بھی کبھی ہاتھ آئیں گے

21/اپریل کو محمود ہال میں چہرہ مبارک دیکھا کہ اگر مجھے وفات کا علم نہ ہوتا تو میں حضور کو عارضی نیند میں ہی سمجھتا۔ وہی پُر رونق چہرہ وہی طمانیت اور سکینت جو نفسِ مطمئنہ کی علامت ہوتی ہے ’’راضیۃ مرضیۃ‘‘ اور اللہ کے عباد اور اس کی جنتوں میں داخل ہونے کی نوید حضور کو عطا ہو چکی تھی۔ وہ پیدائشی دلیر اور بہادر اور جری انسان تھا۔ اللہ کی طرف سے جس کام کے لئے جب بھی بلاوا آتا کبھی بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ **لبیک اللھم لبیک** کہتے ہوئے حاضر ہوا کرتے تھے۔ اب جب دنیا سے منہ موڑنے کے لئے

ناقوس بجا الٰہی تقدیر نے طلب فرمایا تو کمال خوش دلی سے حاضر ہوئے۔اے کاش (ایسی) پر سکینت، اطمینان بخش اور خوشی خوشی موت کی آغوش میں جانے کی ہر ایک کو توفیق ملے۔انجام اچھا ہوگا تو اسی طرح ہوگا۔مگر انسان آخر انسان ہے اس جدائی کے عارضی ہونے کا یقین ہونے کے باوجود سینے میں تیر لگا۔میں حضور کے چہرہ مبارک کو بٹ بٹ دیکھ رہا تھا مگر یہ عجیب لگا کہ وہ ہاتھ اب نہ اٹھے۔جنہیں چوم لینے کی حسرت رہتی۔اور وہ باہیں جن میں دنیا کے دکھوں سے پناہ حاصل کرتے اب حکم الٰہی کے تحت حرکت نہ کر سکیں گے۔دل جو پہلے ہی تارتار تھا رفو کر کے کام چلا رہے تھے اس کی مزید نہ معلوم کتنی کرچیاں ہوئیں۔مگر یہ حال دل اب کس کو سناتا سب لوگوں کا یہی حال تھا۔ایک دوسرے سے تعزیت کر رہے تھے۔میں نے اپنے جیسا تہی دامن اور خستہ حال کسی کو نہ دیکھا تو اپنے آپ سے ہی تعزیت کر لی۔آنسو نہ جانے اتنے کہاں سے آئے یوں محسوس ہوا۔کہ آنکھوں کے پیچھے کسی نے صراحیاں انڈیل دی ہیں۔مگر یہ آنسو بھی غنیمت ہیں کہ اگر یہ بھی نہ ہوتے تو کیا ہوتا دل پر لگی آگ ٹھنڈی تو نہ ہوئی بلکہ اور زیادہ بھڑکی۔اگر یہ آنسو بھی میسر نہ آتے تو دم گھٹ جاتا۔یہ حق بات ہے کہ:

بڑے کام کا ہے یہ آنکھوں کا پانی

میں نہ حضور کی سوانح لکھ سکتا ہوں نہ فتوحات کی تفصیل۔مجھ حقیر کے ساتھ جو الطافِ کریمانہ ہوئے اس کا بھی سارا ذکر کیسے ممکن ہے۔مگر للہ اسے مدح خود نہ سمجھا جائے۔بلکہ کریم ابن کریم ابن مسیح موعودؑ کا ہی کرم تھا میرا کوئی بھی استحقاق نہیں تھا۔گوبر کے ڈھیر پر مینہ برسے تو اس میں اس گند کے ڈھیر کی کیا خوبی۔وہ میرا تاجِ سر اور میں حضور کی خاک در۔وہ آقا اور میں نوکر۔حضور کے ساتھ غلامانہ حیثیت پر بھی بجا طور پر مجھے ناز ہے۔اور یہ الفاظ لکھتے ہوئے میرے قلم میں شگفتگی اور سوچ میں پاکیزگی اور جسم و جان میں ایک وارفتگی اور روح میں تازگی محسوس ہو رہی ہے۔حضور کے ساتھ اپنی نسبت جوڑتے ہوئے فرحت محسوس کر رہا ہوں۔کجا ''ابنائے فارس'' اور کجا یہ ننگ انسانیت۔خاک کو عالم پاک سے بھی کچھ نسبت ہوگی۔مگر یہاں تو اتنی بھی نہیں۔مگر پھر بھی اس پاک انسان نے جس کے مطہر جسم و جان میں حضرت مصلح موعودؓ اور حضرت مسیح موعودؑ کا خون دوڑ رہا تھا وفا و ایثار اور محبت کے وہ مینار تعمیر کئے جو رہتی دنیا تک نور بکھیرتے رہیں گے۔

وہ سیدنا مصلح موعودؓ کا لخت جگر ہاں وہی ابنِ مریم۔کروڑوں کا دلدار 21 اور 22/اپریل 2003ء کو محمود ہال لندن میں محو استراحت تھا۔میرا خامہ جو پہلے ہی ٹوٹا پھوٹا تھا خام تھا۔آج وہ خونچکاں بھی ہے اور یہ حروف لکھتے ہوئے گویا چیخ رہا ہے۔

ذہن ہے تو پراگندہ۔دل جو کئی سال سے زخم خوردہ اور دریدہ ہو چکا ہے۔آج تو زخموں سے چور چور ہے۔غم والم کی گھنگھور گھٹائیں میرے تخیل پر چھائی ہوئی ہیں۔ایسے میں دل کی واردات کیا لکھی جا سکتی ہے اور نہ لکھوں تو بھی چین نہیں۔اللہ کا نام لے کر اپنا ٹوٹا ہوا قلم

اٹھایا اور پہلے اسی کو مخاطب کیا کہ:

کِلکِ اَلَم طراز ذرا دیکھ بھال کر
کس سانحے کا ذکر ہے اتنا خیال کر
سن تو بھی ہم نشیں ذرا دل سنبھال کر
کاغذ پر رکھ رہا ہوں کلیجا نکال کر
پرواز کون کر گیا پَر تولتا ہوا
خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

میں گذشتہ صدی کی آخری دو دہائیوں سے لے کر آج تک مسلسل ایک گردش میں ہوں۔ 1982ء میں میرے محبوب آقا حضرت ناصر الدینؒ کی وفات نے میری زندگی کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اور آج 21 سال بعد رہی سہی کسر سیدنا حضرت طاہر ومطہر کی اچانک وفات نے نکال دی۔ اب میری محرومیاں اور مسائل عروج پر ہیں میرے اہم راز اور غمگساروں کا بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے جانا اس پر مستزاد اگر زندہ جاوید قادر مطلق کا سہارا نہ ہوتا تو۔

میں تو مر کر خاک ہوتا گر نہ ہوتا تیرا لطف
پھر خدا جانے کہاں یہ پھینک دی جاتی غبار

یہ حضرت اقدس کا شعر میرے مر مر کر زندہ رہنے کی سچی تفسیر بیان کر رہا ہے اور یہ عین حقیقت ہے۔ اب اس سے آگے میری معمر اور بوڑھی سوچوں نے جانا چھوڑ دیا ہے۔ مولا بس باقی ہوس۔

تاریکیوں نے باغ کو گھیرا ہے کیا کریں
سورج ہے سر پہ اور اندھیرا ہے کیا کریں

میں ذہن کی پراگندگی کے باوجود اپنے دل کا درد اور غم قرطاس پر بکھیرنا چاہتا ہوں۔ شاید اس سے کچھ سینے کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ حضور کی پاک زندگی کا احوال نیز جو میدان آپ نے مارے نہ ان کا بیان مجھ سے ممکن ہے نہ حضور کی فتوحات قلوب واذہان کی طویل فہرست کو شمار کرنے کی توفیق یہ کام تو مورخین کریں گے میں نے تو جیسا اوپر اظہار کیا ہے اپنے ساتھ حضور کی نوازشاتِ کریمانہ کی ایک جھلک ہی پیش کر سکتا ہوں ڈرتا ہوں یہ میری خودستائی نہ سمجھی جائے۔

اوّل تو احسانات اور نوازشات تو حضور ہی کی تھیں اور ہمیشہ رہیں۔ میرا اس میں کیا کمال ہے اور میری طرح ہر ایک سے محبت والفت کا

وہی سلوک مسلسل ہوتا رہا ہے۔اس لئے یہ میری کوئی اجارہ داری نہیں تھی بلکہ کسی کی بھی نہیں تھی۔محبتوں کا ایک سمندر تھا اس نے جتنی محبتیں بانٹیں ان کا شمار نہیں۔ بچے بوڑھے مرد وخواتین اپنے پرائے حتیٰ کہ غیر اور دشمن بھی حضور کی محبتوں کے مورد رہے۔

حضور کا اپنا ہی شعر ہے حضور کا دل بریاں جو اوروں کے لئے دردمندی اور دکھوں سے چور رہتا تھا۔

وہ یاد آئے جن کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا
سوجے نین دکھائے اپنے اور رلایا ساری رات

میرے اس طرز تحریر کی ایک سند بھی میرے پاس ہے اور وہ حضرت چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان صاحب ؓ کی ہے۔ان کی جلسہ سالانہ ربوہ کی سٹیج سے ایک تقریر ہوئی تھی جس کا عنوان تھا ''سیدنا حضرت مصلح موعود کی یادیں''۔

حضرت چوہدری سر ظفر اللہ خان صاحب کی وہ تقریر ریکارڈ شدہ میں نے کئی بار سنی ہے۔آپ نے فرمایا کہ میں کیا کیا یادیں اس مختصر وقت میں بیان کرسکتا ہوں میرے ساتھ جو حضور کا محبانہ سلوک رہا اس کی ہی چند جھلکیاں پیش کرسکتا ہوں۔وہی حال اپنا ہے۔دنیا میں کروڑوں انسانوں کا دلدار وہ براعظم افریقہ کا بھی محبوب تھا اور ایشیا کا بھی۔وہ یورپ اور امریکہ اور جزائر غرض یہ کہ تمام دنیا کا معشوق تھا۔اپنے اپنے احوال لوگ لکھیں گے میں اپنی داستان کا ایک حصہ رقم کرنے پر ہی اکتفاء کرتا ہوں۔لڑکپن میں قادیان میں ملاقات تو ہوتی تھی یوں گہرا تعارف نہیں تھا۔ربوہ میں آکر وہ غنچہ کھلا اور پھول بنا۔پھر تو اس کی خوشبو نے جہان کو اپنی طرف کھینچا۔انہی میں یہ عاصی بھی تھا۔بھولتا ہوں غالباً 1980ء کی گرمیوں کا موسم تھا۔کہ پیغام ملا کہ آپ کے گھر کچھ لوگ جمع ہوسکیں گے سوال و جواب کی محفل ہو جائے۔میری تو مراد پوری ہورہی تھی فوراً آمادگی ظاہر کردی۔فرمایا شام کا وقت ہوگا چائے کی پیالی اور بسکٹ حاضرین کو پیش کرنے کا انتظام کرنا ہوگا میں نے عرض کیا کہ یہ دیہاتی شہر ہے شام کے بعد محفل ہوگی وہ وقت یہاں کے لوگوں کے لئے چائے کا نہیں کھانے کا ہے۔اور پھر میرے مدعووین جن میں جج صاحبان، وکلاء، ممبران اسمبلی اور روٴسا ہوں گے وہ میرے ساتھ بے تکلفی کا اظہار کرتے ہوئے کھانے کا خود بھی مطالبہ کردیں گے۔اس لئے کھانے کا انتظام کروں گا۔آپ نے فرمایا اور میرے محبوب کے یہ الفاظ 23 سال کا لمبا عرصہ گذرنے کے باوجود حرف بحرف میری میٹھی یادوں کے لاکر میں محفوظ ہیں کہ ''یہ تو بیچارے میزبان پر ظلم ہوگا'' میں نے عرض کیا جناب نہ میں ''بے چارہ ہوں نہ مجھ پر کوئی ظلم ہے''۔

صاحبزادہ میرزا لقمان احمد صاحب بھی آپ کے ساتھ آئے تھے اور لوگوں کا تو یاد نہیں۔بہت روح پرور مجلس تھی جس کا اظہار غیر از جماعت شرکاء نے برملا کیا۔کھانے کے بعد ٹھنڈے آموں کی طشتریوں کی باری آئی تو مجھے بلایا اور فرمایا میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں ''نہ تم بے چارے ہو نہ تم پر کوئی ظلم ہے'' مگر یہ بتاؤ میں نے تو ہر جگہ سوال و جواب کی مجالس کرنا ہوتی ہیں ہر جگہ یہ کھانے کا انتظام تو مشکل

ہوگا۔ میں نے عرض کیا یہاں تو آپ جب بھی تشریف لاویں یہی کچھ ہوگا۔ اوروں کا علم نہیں وہ جانیں۔

اس کے بعد میں ایک روز ربوہ میں تھا کہ عزیزم ڈاکٹر ظہیر الدین منصور احمد صاحب نے کہا کہ ماموں جان کا نواسہ ہوا ہے مبارکباد نہیں دینے جانا۔ میں نے کہا ضرور جانا ہے وہ بھی میرے ساتھ گئے۔ معانقہ کیا اور اسی دوران مبارکباد عرض کی۔ فرمایا مٹھائی کھا کر جانا ہوگا بھاگ جاتے ہو۔ پھر ٹرالی مٹھائیوں سے لدی ہوئی آئی میں نے ایک آدھ دانا چکھا کہ حکم تھا اور پھر عجیب واقعہ ہوا کہ حضور کا ایک نواسہ مجھے حضور کی وفات کے بعد بیت فضل لندن میں ملا۔ میں نے پیار سے معانقہ کیا۔ جس کی ابتداء عزیز موصوف کی طرف سے ہوتی تھی میں متعجب ہوا کہ یہ کون صاحبزادہ ہے۔ میاں کس کے بیٹے ہو تو جواب میں کہا۔ میاں سفیر احمد صاحب کا میں نے کہا جانتے ہو کہ تمہارے دادا کا نام میرزا منیر احمد تھا۔ وہ ماشاء اللہ بہت ہی ذہین تھے۔ اس نے جواب میں کہا تبھی تو آپ سے ملنے آیا ہوں۔ میں نے کہا میاں آپ کے دادا جان سے مجھے بہت پیار تھا اور انہیں بھی مجھ سے محبت تھی۔ اس نوعمر صاحبزادے نے کہا میں یہ جانتا ہوں مجھے وہ بہت ہی پیارا لگا یہ پہلے نواسے سے چھوٹا ہوگا اللہ تعالیٰ اسے اپنے دادا اور نانا کی صفات حسنہ کا حقیقی وارث بنائے۔ میرے زخمی دل کو اس سے ملنے سے تقویت حاصل ہوئی۔ اس معصوم صاحبزادے نے اپنے نانا اور دادا کی یادیں تازہ کر کے مجھ پر احسان کیا۔ اللہ اسے جزا دے۔

حضور لندن تشریف لائے۔ تو اب خطوط اور فیکس ہی رہ گئے تھے یا کبھی کبھار لندن جانا تو ملاقات کا شرف حاصل کرنا۔

19 سال کا عرصہ ہجر و فراق میں سلگتے گزرا۔ میں شاعر نہیں ہوں مگر اچھے شعر میں جو حکمت ہوتی ہے اس سے کسی حد تک واقفیت کا زعم ضرور ہے۔ چنانچہ حضور کے نام نامہ و پیام میں شعر اکثر لکھتا اور حضور بہت داد دیتے۔ ایک بار فرمایا کہ تمہارے قلم سے تمہاری صحیح پہچان مجھے ہوئی ہے ورنہ جانتا تو تجھے لڑکپن سے تھا تم چھپے رہتے ہو وغیرہ۔ ایک بار میں نے لکھا کہ حضور ''عام'' کی جمع مجھے معلوم نہیں ہوسکی۔ یہاں سے پوچھا تو مجھے بتایا گیا ''عام'' جمع بھی استعمال ہوتا ہے (جس کے معنی سال کے ہوتے ہیں) سیدنا و امامنا حضرت رسول عربی ﷺ نے اس سال کو ''عام الحزن'' قرار دیا تھا۔ جس سال حضور کی حرم حضرت خدیجہؓ اور چچا ابوطالبؓ اور کئی قریبی صحابہ فوت ہو گئے تھے۔ میرے لئے یہ مسلسل تیسرا سال گذر رہا ہے ہر سال ''عام الحزن'' ہے۔

میں نے اقبال عظیم صاحب کا ایک شعر لکھا کہ ایک سال کا حزن بھی انسان کو ہلکان کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے مجھ پر تو تین سال سے حزن و ملال کے سائے چھائے ہوئے ہیں۔ نہ معلوم اقبال عظیم پر کیا افتاد پڑی تھی۔ کہ بے چارہ بلبلا اٹھا تھا۔ اور یوں اظہار کیا کہ۔

پچھلا برس عظیم بہت ہی طویل تھا
میں بوڑھا ہو گیا ہوں اسی ایک سال میں

حضور نے جواب میں لکھا کہ اقبال عظیم نے اپنی حالت نہایت عمدہ طریق سے بیان کی ہے۔حضور نے اس شعر کو بہت پسند کیا اور پھر میرے لئے دعائیں لکھیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ہم وغم سے نجات دے۔میری یہی غرض تھی جو پوری ہوگئی۔پھر ایک خط میں میں نے لکھا کہ حضور آپ کا یہ فرمانا دو گھڑی صبر سے کام لو ساتھیو۔حضور یہ دو گھڑیاں کب ختم ہوں گی۔راہ تکتے تکتے میری آنکھوں کا اجالا اندھیرے میں بدلتا جارہا ہے۔اور پنجابی کے یہ شعر لکھ دیئے۔

اج وی داغ دلاں دے جلدے
دیوے تیرے پیار دے بلدے
عمر مری توں ملے وسدے
وعدے تیرے پل دو پل دے
ھن تے سجناں مل جا آکے
مدتاں ھوئیاں دکھڑے جھلدے
فیر توں آئیوں تے کی آئیوں
آ گے جد پیغام اجل دے

حضور نے جوابی خط میں ان شعروں کو خود لکھ کر ان کی تعریف کی فرمایا ان سے فطرت کی صحیح عکاسی ہوتی ہے اور پھر یوں ہوا کہ حضور بن باسی ہی کے دوران اپنے رفیق اعلیٰ کے حضور حاضر ہوگئے۔یہ تیر نیم کش میرے سینے میں رڑک رہا ہے جونہی یہ خبر میں نے سنی میں تو بے خود ہوگیا۔پلنگ پر لیٹ کر آنسو بہاتا رہا مجھے امید نہیں تھی کہ میری آنکھوں کے پیچھے اتنا پانی ہے مگر یہ تو نہ ختم ہونے والا خزانہ نکلا۔

ذرا سنبھلا تو پاسپورٹ نکالا ویزا تو UK کا تھا ہی قطر ایئر ویز میں سیٹ بھی مل گئی اور اس طرح قدرت الٰہی نے اٹھا کر 21/اپریل کی دوپہر کو 16 گریسن ہال روڈ لندن پہنچا دیا۔میں فٹ پاتھ پر کھڑا دونوں طرف بہت طویل قطاریں زائرین کی دیکھ کر گھبرا گیا کہ مجھ میں اس وقت ہرگز اتنی طاقت نہیں تھی کہ چند منٹ بھی کھڑا ہوسکتا اس جانکاہ صدمے اور دوراتوں کے جگراتے نے میری ساری توانائیاں چاٹ لی تھیں میں اس ادھیڑ بن میں ہی تھا کہ ایک اللہ کے بندے نے مجھے بازو سے پکڑا اور دیدار حبیب رحمہ اللہ کے لئے محمود ہال میں لے گیا۔میں نے زیارت کی مگر نیم بے ہوشی کا عالم تھا۔باہر نکلا تو میرا پوتا عزیزم صباحت اور نواسہ عزیز اسد مجھے ملے وہیں پر منصور احمد پسر برادرم ڈاکٹر حافظ مسعود احمد صاحب سے مدتوں بعد ملاقات ہوئی مگر کس حال میں۔

میرا بھانجا عزیزم بشارت احمد صاحب گاڑی لے کر آئے اور مجھے ٹوٹنگ میں میری بھانجی کے گھر لے گئے۔ صدمہ عروج پر تھا۔ آج اس شہر میں تھا جس کی ساری رونقیں ختم ہو چکی تھیں۔ وہ جس کی ہم آغوشی سے سارے صدمات اور دکھ اور درد اور ہم وغم دور ہو جاتے تھے وہ نعمت اب چھن چکی تھی۔ 16 گریسن ہال روڈ میں ہی میرے درد والم کا مداوا ہوتا تھا آج وہیں میرے زخموں پر نمک چھڑکا گیا۔

''دلدار فوت ہو گیا''

ذرا سنبھلا تو 18ر اور 19ر اپریل کی درمیانی رات کا خواب یاد آیا خواب میں میں نے یہ آواز سنی کہ ''دلدار فوت ہو گیا ہے''۔ اس صبح میرا ذہن کرنل دلدار احمد صاحب آف ادرحماں حال ٹورانٹو کینیڈا کی طرف ہی گیا۔ کیونکہ کسی دلدار نامی اور کسی آدمی کو میں جانتا نہیں تھا میں نے سوچا کہ خواب تعبیر طلب ہوتے ہیں بعض دفعہ خواب کی موت حیات کا پیغام لاتی ہے۔ واللہ اعلم۔ مگر اس خواب کی تعبیر کی ضرورت ہی نہ تھی وہ میرا دلدار نہیں لاکھوں کا نہیں کروڑوں کا دلدار اسی رات فوت ہوا۔ جس شب میں نے یہ خواب دیکھا تھا۔ خواب حرف بحرف سچا نکلا مگر دکھوں اور دردوں اور محرومیوں کے پہاڑ ساتھ لایا۔ یاالٰہی رحم میں نے نامعلوم کس ان دیکھے اور غیر محسوس خوف کی وجہ سے جلد جلد فیکس دینے شروع کئے تھے۔ قریباً ہر ہفتے حضور انور کو ایک پیغام فیکس پر کبھی مجھے کسی کا یہ مصرع کچھ کے دیتا کہ۔

صبا ہو بس میں تو ایک جھونکے میں لاکھ بھیجوں پیام ان کو

اور کبھی یہ شعر شاید حضور کو لکھ بھی دیتا تھا۔ کہ

دیارِ مغرب کے رہنے والو تمہیں مبارک ہو پاس رہنا
حضور محبوب عرض کر دو کسی کا یاں پہ اداس رہنا

مگر میں بھولا رہا کبھی نامہ و پیام سے بھی دل کی لگی بجھتی ہے بلکہ میں نے دیکھا اس کی لو اور تیز ہوتی ہے مگر بے چارگی کا عالم تھا اور وسیلہ بھی کوئی نہ تھا۔

ہاں من ہائیم جرمنی میں 2001ء کی ایک صبح نہیں بھولتی جب میں عزیزم ملک نادر حسین کھوکھر کے ہمراہ ملاقات کے لئے حاضر ہوا۔ ملک نادر حسین کو غنڈوں نے پچاس لاکھ روپے تاوان کے لئے جبراً اغوا کیا تھا۔ سات رات اور دن آنکھیں باندھ کر نامعلوم مقام پر انہیں رکھا گیا مجھے اسی رات فون پر اطلاع مل گئی تو اپنی آہ وزاری کے ساتھ سیدنا حضور کا در کھٹکھٹایا جو قیامت کھوکھر غربی پر گزر گئی اس کا احوال بتا بتا کر حضور سے دعائے مضطربانہ کی بار بار درخواست کی۔ حتیٰ کہ ایک دن میں دو دو بار فیکس بھی دیئے حضور نے بہت کرم فرمایا بہت دعا کی کہ بہت الجھا ہوا مسئلہ آناً فاناً حل ہو گیا۔ یہ حضور کی موروثی صفت تھی وہ کس باپ کا بیٹا تھا اور کس دادے کا پوتا تھا۔ آج یہی ابنائے فارس ہی تو ہیں جو وفا اور محبت اور رحم کے بے پناہ جذبات رکھتے ہیں۔ اور غیروں کے دکھوں اور دردوں کو بھی محسوس کرتے ہیں۔ یہ تو پھر

بھی اپنا ایک غلام تھا۔آخر حضور کی دعائیں مستجاب ہوئیں اور خلافِ توقع نہ صرف ساتویں دن عزیز موصوف کی رہائی ہوئی اور وہ لوگ 100 ''معززین'' کا وفد لے کر معذرت خواہی کے لئے آئے اور پچاس لاکھ روپیہ وصول شدہ تاوان بھی واپس کر گئے۔

غیر ممکن کو ممکن میں بدل دیتی ہے
اے مرے فلسفیو! زور دعا دیکھو تو

میں بھی وہاں تھا میں نے اس روز 1200 کے بھرے مجمع میں اپنی جوابی تقریر میں یہ سچ اظہار کیا تھا کہ یہ انوکھا واقعہ سیدنا حضرت آقائے قادیانی کی دعائے مستجاب کا چمکتا ہوا نشان ہے اور ایک کونہ سے ''حضرت مرزا طاہر احمد صاحب زندہ باد'' کے فلک شگاف نعرے لگے اور اگلی صبح گجرات کے لوکل اخبار میں یہ ساری خبر من وعن شائع ہوئی کہ عبدالسمیع نون آف سرگودھا نے اس سارے خونی ڈرامے کا مداوا مرزا طاہر احمد صاحب کی دعا کو قرار دیا۔

خدا شاہد ہے کہ اس میں ذرا مبالغہ نہ تھا کہ حضور کی دعا سے یہ معجزہ رونما ہوا ورنہ وارداتی اور اجرتی قاتل لوگوں سے ہضم شدہ رقم کب کسی کو ملتی ہے۔اس دوران حضور سے خاکسار کا سوال وجواب ایک ایمان افروز واقعہ ہے۔جو مجھے عمر کے باقی دنوں میں مضطرب رکھے گا۔کیونکہ اس غلام ابن غلام کی بازیابی کا واقعہ حضور نے کمال محبت شیفتگی اور حد درجہ دلجمعی اور دلچسپی سے سماعت فرمایا اور متعدد سوالات کئے جن کے جواب میں نے اپنے محدود فہم کے مطابق دیئے بالآخر حضور نے 50 لاکھ روپے کی رقم تاوان ادا کر کے جان چھڑانے کے بعد پھر مجرمان کے رجوع اور واپسی رقم پر حیرت کا اظہار فرمایا۔حضور کی یہ داستان سنانے کے لئے ہم دونوں یعنی ملک نادر حسین اور یہ خاکسار 25/اگست 2001ء کو حضور کے دربار میں حاضر ہوئے پہلے تو یہ حالت ہوتی کہ حضور کے پرنور چہرے کو دیکھتے ہی اپنی حالت غیر ہو جاتی تھی اور بقول پیر فضل شاہ گجراتی۔

حضور نال ہو گئی ملاقات میری
ملاقات ایہہ پر کامیاب نہ رہئی
میں آ گیا حسن دے رعب تھلے
مونہوں عرض کچھ کرن دی تاب نہ رہئی

ہر بار متوقع ملاقات سے قبل تیاری کرنا اپنا احوال بیان کرنے کے لئے مضمون بنانا اور اپنی معروضات کو معین شکل دینے کے لئے دل ہی دل میں ہوم ورک کرنا مگر جب ملاقات ہوتی تو پھر وہی حال کہ

دل وچ آکھدا رھناں واں اس واری

رکھ دیاں گا کھول کے حال دل دا
آ سامنے جاندا او جدوں مرے
کردا صرف حضور حضور رھناں

مگر 25؍اگست 2001ء کو 11 بجے اللہ تعالیٰ نے ہمت دی کہ سارا احوال اغوا اور بازیابی کا تنگ وقت میں حضور کو سنایا حضور بے حد دلچسپی سے سنتے رہے اور بعض سوالات بھی کئے۔ اور اس پر حیران بھی ہوئے کہ رقم ہضم ہوجانے کے بہت بعد کیونکر واپس ہوئی میں نے عرض کیا سیدنا حضور کی دعاؤں سے۔ اللہ تعالیٰ نے فضل کیا اور کوئی وسیلہ اور ذریعہ ہرگز نہیں تھا۔ اس دوران حضور کے احسانات کو یاد کر کے عزیز نادر حسین تو مسلسل روتے رہے بلکہ ان کی ہچکی بندھی رہی۔ بالآخر حضور نے ہمارے ساتھ فوٹو بنوایا تو میں نے جرات کر کے عرض کی میرے آقا حضور کے مقدس باپ دادا نے بھی کئی مردے زندہ کئے۔ حضور میں بھی ایک مردہ ہوں دل ریزہ ریزہ ہو چکا ہے۔ حضور مجھ پر از راہ بندہ نوازی نظرِ کرم فرما دیں تو انشاء اللہ میں زندہ ہو جاؤں گا۔

ملک نادر حسین اور خود میں نے بھی دیکھا کہ محبوب آقا کی نظر رحم و کرم میرے سارے جسم پر پھر گئی۔ سر کی چوٹی سے لے کر پاؤں تک اور یہی موجب بنی میری صحت یابی کی۔ ورنہ ڈاکٹر تو میرے دل کی رفو گیری سے کترا رہے تھے مگر میں یقین سے لبریز تھا کہ اب سب خیر ہے۔ نشتر جیسے بھی چلے گا خیر ہی ہوگی۔ یہ پرانا قصہ نہیں ابھی کل کی بات ہے۔ برادرم رشید قیصرانی نے سچ کہا ہے۔

میرا معتبر حوالہ کوئی ہے تو بس یہی ہے
تیری اک نظر کا صدقہ میری ساری زندگی ہے

عجیب کیفیت ہے اس وقت میرے دل کی غموں اور دکھوں سے گویا چھلک رہا ہے اور اس محبوب کے احسانوں کو گن گن کر ایک تصوراتی دنیا میں مورد احسانات ہونے کی وجہ سے بہل بھی رہا ہے فی الحال اتنی ہی جان تھی۔ اس زہر سے زیادہ تلخ اور شہد سے بڑھ کر شیریں ذکر کو یہیں ختم کرتا ہوں اور اس محبوب خدا کا ذکر تو چلتا ہی رہے گا۔ ایک حسرت ضرور ہے کہ کاش میں بھی شاعر ہوتا تو ثاقب بھائی کی طرح میں بھی اپنے بزرگوں کا اچھے رنگ میں ذکر تو کرتا۔ حضرت مولانا نور الدین خلیفۃ المسیح الاول ؓ کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی جائے پیدائش کی بھی بجا طور پر تعریف کرتے ہیں۔

قابل صد ناز ہے ثاقب یہ بھیرے کی سر زمین

حضرت مصلح موعود کی وفات 1965ء میں ہوئی تو لافانی شعر لکھے۔ مثلاً

دن ڈھل گیا تو درد نصیبوں کا قافلہ

کاندھے پہ آفتاب اٹھائے ہوئے چلا

اور 1982ء میں اس محبت کے سفیر حضرت حافظ میرزا ناصر احمد رحمہ اللہ کی وفات ہوئی تو ثاقب بیچارہ ایک طرف درد سے چیخ اٹھا تو دوسری طرف سیدنا حضرت صاحبزادہ میرزا طاہر احمد صاحب کی صورت میں موھبت الٰہی پر شکر بھی بجالایا اور یوں گویا ہوا۔

ثاقب یہ کرم بھی کیا کم ہے ناصر جو لیا طاہر بخشا

ورنہ دیوانے مر جاتے سر ٹکرا کر دیواروں سے

اب ثاقب بھائی بھی مرحوم ہو چکے ہیں اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اب کے بھی ہم نے کچھ اشعار پڑھے ہیں۔ 8/ جون کے پرچہ میں ''تعزیت'' اور ''تہنیت'' بھی پڑھے ہیں۔ بہت ہی اچھا اظہار ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ نئے قلموں کا انتظار ہے۔

الوداع

اے جانے والے تجھے الوداع کہتے ہوئے دل پر سخت چوٹ لگتی ہے مگر یہ ایک واقعہ ہے ایک حقیقت ہے۔ جب تک تو جیا تو نے اپنی طاقت سے بڑھ کر ہماری تعلیم و تربیت اصلاح اور بہبودی کا خیال رکھا۔ بیحد ایثار سے کام لیا کیا چھوٹے اور کیا بڑے کیا مرد اور کیا خواتین سبھی تیرے جان نثار عشاق تھے۔ تیری اوصاف حمیدہ اور حسنات اور فیض اور صفات عاداتِ حسنہ ایسی من موہنی تھیں کہ وہ ہر ایک دل کو منٹوں میں فتح کر لیتی تھیں۔ تیری قید محبت سے آزاد ہونے میں موت پنہاں تھی۔ ہم تیری محبتوں اور شفقتوں کا کب بدلہ اتار سکتے ہیں جا اور اپنے رب کریم سے بہترین صلہ لے اور اس کی جنتوں میں بسیرا کر۔ ہاں ہمارے آقا وہاں تجھے اپنے بزرگ ابا اور مقدس دادا کی معیت نصیب ہوگی اور تیری روح کو حقیقی خوشی نصیب ہوگی۔ تو نے اس دنیا میں جلاوطنی کے مصائب جھیلے اور بن باسی کی سوختہ زندگی بسر کی مگر ہم نے دیکھا کہ جب سیدنا حضرت رسول عربی ﷺ کا ذکر تیری زبان پر آتا تو تیری آواز عشق اور محبت سے روندھ جاتی تھی اور تیرے جسم میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا تھا اسی طرح تو اپنے وطن سرزمینِ پاکستان آنے کے لئے بھی مضطرب رہا۔ جولیس سیزر کو روم سے جلاوطن کر دیا گیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ جہاں میں ہوں گا وہیں روم ہوگا۔ اب تو اپنے ربِ کریم کے پاس پہنچ چکا ہے اب اس کو یہ سینے کے زخم دکھا اور اسی سے ایسا اجر جزیل انشاء اللہ تجھے عطا ہوگا۔ جس کا ادراک بھی ہماری عقل وفہم سے بالا ہے۔

استقبال

اور اے آنے والے تیرا آنا بھی صد مبارک ہے ہم نے زخمی دلوں کو تیرے آنے کی نوید سے بہلا لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر فعل پر دل و جان سے ہم راضی ہیں۔ جانے والے نے اللہ کی منشاء اور حکم کے مطابق تجھے اپنی کرسی پر بٹھا دیا اور خود رخصت ہو گیا اے آقائے

خامس اللہ تیرے ساتھ ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ ساتھ رہے گا۔ اس کے انتخاب ہمیشہ مبارک ثابت ہوئے ہیں ہم غریبوں کی غلامی قبول فرما اور ہاں ہمارا خیال بھی رکھنا کہ دیکھ ہمارے پیارے آقا ہمارے دلوں کے کتنے ٹکڑے کاٹے گئے۔ 1965ء میں پھر 1982ء پھر 2003ء میں اور کیا کس طرح دل حزیں کے پُرزے اڑُائے گئے اب ایک ٹکڑا باقی ہے وہ ہم تیری نظر کرتے ہیں تو بھی اسے قبول فرما اللہ تعالیٰ بھی قبول فرمائے اور ہمارا انجام بخیر ہو۔ ہم تیرے آنے سے ''مسرور'' ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی تائیدات اور نصرتوں سے ہمیشہ نوازتا رہے اور فتوحات کا جو سلسلہ چل رہا تھا وہ آپ کے مقدس دور میں قائم رہے بلکہ تیز تر ہو جائے۔ اے قادر خدا تو ایسا ہی کر۔ ہماری دعا ہے کہ

ہر گام پر فرشتوں کا لشکر ہو ساتھ ساتھ
ہر ملک میں تمہاری حفاظت خدا کرے

(روزنامہ الفضل 29 رمئی 2003ء صفحہ 3 تا 5)

19 راپریل 2003 کا ایک عدیم المثال راہی

لیتا ہی نہیں کہیں پڑاؤ
یادوں کا عجیب کارواں ہے

وقت کو اس سے کچھ غرض نہیں کہ کون کس موڑ پر جدا ہو گیا وہ بڑا ہی پتھر دل ہے جب کسی سے بچھڑنے کا وقت آتا ہے تو لگتا ہے کہ وقت یہیں ٹھہر جائے گا مگر جب ماہ و سال گزرنے لگتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ جدائی کے کئی مہینے اور پھر کئی سال دبے پاؤں گزر گئے ہیں مگر انسان کے چلے جانے سے اس کی عظمت اور محبت تو نہیں مرتی۔ ہم بسیار کوشش کے باوجود کیا لکھ سکیں گے اپنی عقیدتوں اور محبتوں کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کو مالا میں پرولیں گے مگر وہ عظیم شخص تھا وہ نہ بھولنے والا شخص بہت بڑا انسان تھا۔ وہ تاریخ دان بھی تھے تاریخ ساز بھی تھے اور تاریخ کا مان بھی تھے۔

جب انسانیت کی تاریخ لکھی جائے گی جب اسلام کے لئے ایثار اور ان تھک کوششوں پر کوئی غیر متعصب تاریخ دان قلم اٹھائے گا تو حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کے تذکرے بھی ان میں خوش نما رنگ بھریں گے۔ اور دین حق کے حقیقی خادموں اور اس کی اشاعت اور ترقی کے لئے سردھڑ کی بازی لگانے والوں میں میرے آقا کا نام اونچا بہت اونچا ہوگا۔ وہ شخص اتنی پہلو دار شخصیت رکھتا تھا کہ اس کی سوانح لکھنے والوں کو اس کی کُنہ معلوم نہیں ہو سکے گی اور یونہی قلمیں توڑتے رہیں گے۔ وہ حوصلوں کا ایک آسمان تھے جو کوئی اپنا یا غیر ملنے آتا تو

بھرپور جینے کا حوصلہ لے کر اٹھتا۔

16 گریسن ہال روڈ جہاں اس کی زندگی کے 19 سال گزرے 21/اپریل کو اسے دیکھا تو وہاں ایک عارفانہ سوز بکھرا ہوا تھا۔ ہزار ہا آنکھوں سے رم جھم ہو رہی تھی۔ چہروں پر افسردگی اور پژمردگی کی دھول ہر ایک کی زندگی کا سہارا الٹ جانے کا غم، خاموشی کا سناٹا جس میں محرومی کا شدید احساس بھی تھا جب حضور کے چہرہ پر نگاہ ڈالی تو آنسوؤں نے وہاں پر بھی گویا پردہ لٹکا دیا کچھ صاف دکھائی نہیں دیتا تھا آنسوؤں کی جھلی کو بمشکل صاف کیا تو میرے دل میں بے ساختہ یہ کسی کا شعر آیا کہ

جی کے مرنا تو سب کو آتا ہے
مر کے جینا سکھا دیا تو نے

تو زندہ ہے تو کبھی نہیں مرے گا جسم اطہر تو بے شک مٹی اوڑھ لے گا۔ مگر تیری عظمت کردار تیرا وسیع علم تیرا گہرا الٰہی عرفان تیری دل نواز مسکراہٹ یہ تو دفن ہونے والی چیزیں نہیں ہیں۔ یہ تیرا سب کچھ ہمارے ساتھ رہے گا۔ اور اب یہی ہمارا اثاثہ ہے اس کی خوشبو سے ہی دلوں کو سکون نصیب ہوگا۔ مگر کیا پتا کہ دل اس سے بہل جائے گا یا تپش ہجر سے سلگنا شروع ہو جائے گا۔ غالب امکان یہی ہے کہ آخر والی صورت حال ہی ہوگی۔

آج تو میرے آقا بے حساب ہی یاد آ رہے ہیں ہماری خاطر انتھک کوشش، رتجگے، تیری پل پل کی محنت تو نے اپنے بیمار جسم وجان کی کچھ بھی پروانہ کی۔ 18/اپریل بروز جمعہ بیت الفضل میں نماز جمعہ کے لئے آتے دیکھا تو آپ کی کمزور چال دیکھ کر سینے میں چوٹ لگی اور میں نے پاس بیٹھے ہوئے اپنے بچوں کو کہا کہ حضور کس طرح چل رہے ہیں اور آنکھیں بھر گئیں آپ جان تو گئے ہوں گے کہ اپنے خالق و مالک کے حضور حاضر ہونے والے ہیں تبھی تو اپنی صاحبزادیوں کو مہجوری کے اچانک صدمے سے بچانے کے لئے تیاری کرواتے رہے۔ پھر 18/اپریل کو پون گھنٹے کا خطبہ جمعہ عصر سے مغرب تک اسی شام طویل نشست میں محفل علم وعرفان بھی سجائی۔ یہ سب جماعت کی بہتری اور تربیت اور محبت کی خاطر تجھے آگے قدم بڑھا کر پیچھے ہٹنا نہ آیا۔ نہ تیرا تدبر ہارا نہ تیرا تفکر تیری اس چٹانی جبلت کو ہم مہجور غلام سلام پیش کرتے ہیں للہ قبول فرمالیں کہ ہم تہی دستوں کے پاس سوائے محبت اور عقیدت کے پھولوں کے اور ہے کیا مجھے ایک اور صدمہ بھی ہے کہ قلم سے خون ٹپکانے کے سوا اور کچھ بھی میرے پاس نہیں ہے اور پھر غم ایسے حالات میں بہت بڑھا جب غمگسار بھی کوئی نہیں ہے۔ اس دکھ میں میں اپنے آپ سے خود بھی روٹھ گیا ہوں حتیٰ کہ اپنے زخمی سینہ سے سانسیں کھینچنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ رنج ومصائب کی لگاتار یورشیں اچھے بھلے باہمت انسان کو اندر سے ریزہ ریزہ کر دیتی ہیں۔ میں تو صبر وہمت کی ساری طاقتیں کھو بیٹھا ہوں کچھ عمر کی کہنگی اور کچھ پے بہ پے پیاروں کے روٹھ جانے سے اور اب حالت یہ ہے کہ اپنی کچلی ہوئی شخصیت کو خود بھی اجنبی سمجھتا ہوں ادھر میرے محترم

بزرگ استاد کی نصیحت بلکہ ارشاد مدنظر ہے۔

تم اپنے آپ سے ملتے اگر اکیلے تھے
کڑا تھا وقت تو ہنس کر گزار دینا تھا

بصد معذرت ان سے التماس ہے کہ آپ کا ارشاد سرآنکھوں پر مگر آپ نے جس کڑے وقت کو ہنس کر گزار دینے کی نصیحت کی تھی وہ یہ نہیں تھا کوئی اور ہوگا۔ یہ تو میری طاقت سے بیرون ہے بلکہ خود حضرت ناصح کو بھی میں نے اپنے سے زیادہ اس کڑے وقت میں غم زدہ بیت الفضل لندن میں دیکھا۔

''سرصلیب میں نے ہرگز کوئی اشتہار نہیں دیا تھا''۔

اگر میرے چاک گریبان اور دریدہ دامن اور آنکھوں کی برسات سے کسی نے میرے اندر کا راز پالیا ہو تو یہ بے بسی اور مجبوری کا عالم تھا اور راقم نے تو سیدنا مصلح موعود کا سبق سیکھا ہوا تھا کہ۔

عشق و وفا کا کام نہیں نالہ و فغاں
بھر آیا دل تو چپکے سے آنسو بہا لیا

اہل اللہ کی دو خصوصیات انہیں عام لوگوں سے بلکہ ''علماء'' کہلانے والوں سے بھی ممتاز کرتی ہیں یعنی ''حق'' اور ''جذب'' یہ دونوں صفات میرے آقا کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے ارزانی فرمائی تھیں۔ حق بات سوچتے کہتے اور اس پر ہمیشہ کاربند رہتے اور ہمیں عمر بھر تلقین فرماتے رہے آپ کو قرآن مجید کی حقانیت پر یقین کامل تھا اس کے احکام کی پابندی کی نصیحت فرماتے اور ''جذب'' ایک وھبی علامت عارف باللہ کی ہوتی ہے۔ اس میں بھی حضرت صاحب اپنے مقدس باپ اور دادا کے حقیقی جانشین تھے۔ مسند خلافت پر فائز ہونے سے قبل بھی ہر کوئی کھنچا چلا آتا تھا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے مسند خلافت پر فائز فرمایا تو جذب کی طاقت میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ سات سمندر پار ہی خلافت کا پیشتر بلکہ عملاً سارا ہی زمانہ بن باسی میں گزارا۔ حضور خود فرماتے کہ جماعت کے وہ لوگ بھی لندن کھنچے چلے آتے جن کو میں جانتا ہوں کہ ان کے پاس زادراہ کے بھی نا معلوم اللہ تعالیٰ نے کیسے سامان کر دیئے۔ بظاہر ان کے پاس اتنے وسائل نہیں ہوتے تھے پنجابی کے شاعر نے اس کیفیت کا کیا خوب بیان کیا کہ

آپے دور دراز تھیں لے آون
کھچاں ٹور کے حُسن عُریاں دیاں
شمع بلے تے آپ ہو جان کٹھے

سدا گھلدا اے کون پروانیاں نوں

مئی کے اواخر میں میرا ایک مضمون چھپ چکا ہے مگر ایسے ودود اور رؤف اور محسن آقا کی شیریں یادیں مسلسل تڑپا رہی ہیں۔

لیتا ہی نہیں کہیں پڑاؤ

یادوں کا عجیب کارواں ہے

چند دن جو ایسی آڑی ترچھی تحریر کو ترتیب دینے میں گزرتے ہیں ان میں دل کو کچھ بہلا لیتا ہوں پھر وہی ناسمجھی دل کی مگر سوچتا ہوں کہ حضور کے فکری اور علمی کمالات کی شایان شان تحسین ابھی میرے ذمے قرضہ ہے اگرچہ مجھ میں اس روشنی اور نور کے مینار کی تصویر کشی کی ہرگز طاقت نہیں ہے۔

راحت کے لئے کون سا اسلوب تراشوں

جو لفظ مکمل ہو میسر نہیں آتا

پھر اللہ قادر کے حضور التجا کرتا ہوں کہ

ایک درویش تیرے در پہ چلا آیا ہے

اس کے کشکول میں لفظوں کی فروانی دے

سیدنا حضرت مصلح موعود نے 1944ء کے جلسہ ہوشیار پور میں ایک پیش خبری بیان فرمائی تھی حضرت مصلح موعود نے فرمایا۔ سنئے

''خدا نے مجھے بتایا ہے کہ وہ ایک زمانے میں مجھ کو دوبارہ دنیا میں بھیجے گا اور میں پھر کسی شرک والے زمانے میں دنیا کی اصلاح کے لئے آؤں گا جس کے معنی یہ ہیں کہ میری روح ایک زمانے میں کسی اور شخص پر جو میری جیسی طاقتیں رکھتا ہوگا نازل ہوگی اور وہ میرے نقش قدم پر چل کر دنیا کی اصلاح کرے گا''۔

(الفضل مطبوعہ 19رفروری 1956)

علامات انگلی سے اشارے کر رہی ہیں کہ وہ شخص جس پر حضرت مصلح موعود کی روح نازل ہوئی وہ سیّدنا حضرت طاہر و مطہر ہی تھے۔ زبان و بیان کی ساری طاقتیں بھی باپ بیٹے میں مشترک تھیں اور دنیا کی اصلاح بھی اس نے خوب خوب کی اور جماعت کی گاڑی پٹڑی پر ایسے چڑھا کر کہ اب وہ منزلیں مارتی جائے گی اور کبھی نہیں رکے گی۔ مجھے اس پیش خبری کا مصداق حضرت صاحبزادہ میرزا طاہر احمد صاحب ہی نظر آتے ہیں۔ واللہ اعلم

علم و معرفت ہو، خطابات میں بیان ہو، لیکچر ہو، کوئی تصنیف کا کام ہو، حضور کی شخصیت علم و عمل کا دلآویز اور حسین مرقع تھی بہترین

ادیب نثر میں یکساں ید طولی رکھتے۔تقریر کے دوران سامعین کی نگاہوں کا مرکز اور سامعین کو مسحور کر کے سارے اجتماع کو پوری گرفت میں لے لیتے۔خطاب کی جاذبیت اور علمی وسعت کو ہمیشہ تسلیم کیا جاتا تھا۔

اور یہ ساری صفات بدرجہ اولیٰ وکمال سیدنا حضرت مصلح موعود میں پائی جاتی تھیں۔میں نے تو حضرت صاحب کو کئی دفعہ دوران تقریر نیم وا نگاہوں۔مختلف زاویوں سے دیکھا کہ مجھے تو شکل وصورت میں حضرت مصلح موعود ہی نظر آئے اور سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے جو شرک کے زمانے میں اپنے دوبارہ آنے کی نوید سنائی تھی تو یہ زمانہ شرک کا ہی تو ہے۔نہ معلوم وہ کون خوش نصیب تھا جسے حضرت سیدنا محموداحمد خواب میں آئے۔میری بھی یہ خواہش رہی کہ کبھی اس پرانے ویران کوچے میں بھی سیدنا حضرت مصلح موعود اور سیدنا حضرت طاہر کی روح پاک کا گزر ہو۔

ہر شب اسی امید میں سوتا ہوں دوستو
شاید ہو وصل یار میسر مگر کہاں

حضرت چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان صاحب سے کسی شخص نے کہا کہ آپ کے بارہ میں ایک شخص نے منذر خواب دیکھی ہے کچھ صدقہ دے دیں۔چوہدری صاحب نے فرمایا کہ صدقہ دے دوں گا۔لیکن اگر خواب بتانے میں کوئی مذائقہ نہ ہو تو بتا ہی دیں۔خواب تھی کہ سیدنا حضرت مصلح موعود تشریف لائے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں ظفر اللہ خان کو لینے آیا ہوں اس پر چوہدری صاحب نے بڑی خوشی سے کہا کہ یہ منذر تو نہیں یہ تو بڑی مبشر خواب ہے اگر حضور مجھے ساتھ لے کر جائیں تو اس سے بڑی مبشر خواب کیا ہوگی۔دعا کریں کہ جب میرا وقت واپسی کا آئے تو اسی طرح حضور کی معیت مجھے نصیب ہو۔

اس جگہ میں اپنے آنکھوں دیکھے تینوں خلفاء احمدیت کی پاک روحوں سے بصد ادب ومنت التماس کرتا ہوں کہ ہمارے سردار آپ کو نہ ہم بھول سکے ہیں نہ زندگی بھر بھول سکتے ہیں اور یہ بھی مودبانہ گزارش ہے کہ آپ نے وہ معرکے سر کئے اور وہ جاودانی نقوش چھوڑے ہیں اور ایسے روشنی کے مینار تعمیر کئے ہیں کہ آپ تینوں خلفاء کرام کا کوئی غلام آپ کو فراموش نہیں کرسکتا۔ہر گل را رنگ بوئے دیگر است۔ جب ہمارا وقت واپسیں آئے تو ہمیں بھی اپنی جوتیوں میں بٹھا لینا۔

حضرت سیدنا خلیفۃ المسیح الرابع کے بارہ میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت لکھا جائے گا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ سب کچھ ناکافی ہوگا۔کبھی سمندر بھی کوزے میں بند ہوئے ہیں ہم جب محبوب الٰہی کا احوال لکھتے ہیں تو غرض یہ ہوتی ہے کہ اس سے دل کے درد کا کچھ مداوا ہو جائے گا کچھ آنسو بہاتے ہیں کہ یہ بھی درد دل کا ایک آزمودہ نسخہ ہے۔

مہجوری کے رنج والم اور وحشتوں میں بھی ایک لطف غم ہوتا ہے وہ اگر نہ رہے تو یہ تہی دستی اور بے نوائی بھی خود ایک درد بن جاتی ہے بے

قراری میں دعا کرتا ہوں۔

میری ہم رکاب ہیں وحشتیں میری وحشتوں کو قرار دے
مجھے مہر و ماہ سے کیا غرض مجھے بھیک میں میرا یار دے

حضور میں شگفتگی اخلاق عظمت اور فراست اور وسعت قلب اور دیگر کئی حسنات اور اعلیٰ صفات کی فروانی تھی۔ ہمارے محبوب کی نیم باز آنکھوں میں عشقِ الٰہی کی مستی اور پھر ساتھ لطیف حسِ مزاح اور انسانیت کی محبت آج بھی حضور کے نیازمندوں کے لئے نظر افروز ہیں۔ سینکڑوں ہزاروں نوجوانوں کو جن کی کوئی حیثیت نہیں تھی محض ایک مشت خاک تھے اور بس انہیں ہمدوش ثریا بنادیا۔

حضور کی محبتوں کا انداز تو زمانے بھر سے نرالا تھا۔ حضور کی محبتوں کی خوشبو نے میرے دل و دماغ اور جسم و جان کو ایسا مہکا دیا تھا کہ تصوراتی عالم میں آج بھی وہی خوشبو مجھے معطر کر رہی ہے۔

ہر چند کہ ہم اس منہ کے عاشق تھے مگر فروری 2003 سے میں نے جلد جلد حضور انور کی خدمت اقدس میں فیکس بھیجنا شروع کیں ڈھلتی عمر کے نتیجہ میں عناصر میں اعتدال نہ رہے تو چھوٹی سی بات سے بھی دل پر چوٹ پڑتی ہے اور پھر اس ناتواں بچے کی طرح جسے جب کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے تو ماں کی آغوش میں پناہ ڈھونڈتا ہے مجھے ذرا گھبراہٹ محسوس ہوئی تو میں نے فوراً فیکس دے دی اور دعا کی درخواست حضور کی خدمت میں پیش کر دی اور جب میں فیکس آفس سے نکل رہا ہوتا تھا تو سب گھبراہٹ کافور ہو چکی ہوتی اہل اللہ کو ارض و سماء کا مالک قبولیت کا وہ بلند مقام عطا فرماتا ہے جس کے نشانات ساری دنیا میں رہنے والوں نے مشاہدہ کئے یہ الگ ایک مضمون ہے۔

یہاں میں یہ ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ مورخہ 31/مارچ 2003ء کو میں نے حضور کو ایک فیکس دی جو میرے سامنے اس وقت موجود ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ انہی دنوں میری بہن کے بیٹے عزیزم بشارت احمد نے حضور انور سے جرمنی سے لندن آ کر ملاقات کرنی چاہی تو دفتر والوں نے کوئی شناخت کا حوالہ طلب کیا تو اس نے میرا نام لیا کہ اس کا بھانجا ہوں جب حضور سے ملا تو حضور نے ازراہ بندہ نوازی اس عاجز کی خیریت دریافت فرمائی اور خود ہی فرمایا کہ اس کے ابا کا نام ''عبدالعزیز'' تھا۔ وہ حضرت مسیح موعود کے رفیق تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے یعنی اس عاجز کے لئے بہت دعائیں کیں پھر عزیز موصوف سے اس کا احوال ہمدردی سے دریافت فرمایا اور اسے بتایا کہ میں تمہارے ماموں کا حضرت مولانا شیر علی صاحب والا مضمون پڑھ رہا تھا ملاقات ختم ہوئی تو بشارت صاحب نے مجھے اسی وقت فون کیا۔

قربان جاؤں اس الفت اور لطف و کرم اور بندہ پروری پر کہ ساری عمر احسان فرماتے رہے جاتے جاتے بھی اپنے اس حقیر مگر دیرینہ غلام کا مول بڑھا گئے۔

ان بہتے آنسوؤں کا ہی تحفہ قبول ہو
ہے اس کے پاس کیا جو یہ تیرا غلام دے

حضور نے جو دل اور جو بستیاں جو ملک اور جو براعظم دین حق کے لئے فتح کئے ان کا طول وعرض اتنا ہے کہ میرا ناتواں قلم ان کے کسی ایک حصہ کو بھی قابو میں لانے سے قاصر رہے گا۔

میں یہ نوٹ لکھ چکا تو حضرت خلیفہ صباح الدین صاحب کا ایک روح پرور مضمون نظر سے گزرا جس میں حضور نے انہیں کسی ضرورت کے موقع پر اپنی گاڑی ایک سفر کے لئے عطا فرمادی تھی۔تو مجھے حضور کے ایثار،غنا اور وفا اور محبت کا واقعہ یاد آیا۔

5/اکتوبر 1974ء کو سرگودھا میں بیشتر احمدیوں کی املاک لوٹ لی گئی تھیں یا نذر آتش کر دی گئی تھیں۔حضرت میرزا عبدالحق صاحب کا اثاثۃ البیت بھی لوٹ لیا گیا اور توڑ پھوڑ بھی کی حتیٰ کہ ایک درندے نے حضرت موصوف کی جیب سے جبراً قیمتی پین بھی چھین لیا۔ برادرم ڈاکٹر حافظ مسعود احمد کا گھر اور کلینک اور ان میں موجود سارے سامان کو جلا کر راکھ کر دیا گیا جس میں موٹر سائیکل اور موٹر کار بھی تھی اور بصد مشکل حافظ صاحب محترم اپنے چند افراد خانہ کے ہمراہ بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔اور سٹیلائیٹ ٹاؤن میں پروفیسر رحمت علی صاحب مسلم کے گھر کا ایک کمرہ جس کا فرش ناہموار اینٹوں کا تھا اس پر عام سی دری بچھا کر بہت وقت گزارا اور اس دوران چارپائیوں بستروں اور رقوم کی بہت پیشکش ہوئی مگر موصوف نے ہمیشہ معذرت ہی کی۔حتی کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے ہزار ہا روپے ان دوستوں کی بحالی کے لئے بھجوائے جن کی دوکانیں خاکستر ہو چکی تھیں یا گھر کا سامان جلا دیا گیا یا لوٹ لیا گیا۔حضور کی یہ امداد اس غرض سے تھی تا لٹے پٹے دوست اپنا کام معمولی سے سرمائے سے شروع کر سکیں یا مثلاً خورد و نوش کا کچھ سامان یا برتن یا بستر چارپائی وغیرہ خرید لیں۔حضرت میرزا صاحب اور ڈاکٹر حافظ مسعود احمد صاحب نے کوئی ایسی امداد لینے سے بھی معذرت ہی کی۔ جب اس کی رپورٹ حضور کی خدمت میں ارسال کی گئی کہ ان دو حضرات نے کوئی امداد نہیں لی تو آپ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے انہوں نے کوئی رقم لینی ہی نہیں تھی مجھے معلوم تھا میں ان کے لئے الگ دعا کر رہا ہوں۔سچ ہے کہ ولی را ولی می شناسد کاش ہمیں بھی وہ مقام غنا اور توکل نصیب ہو جو سرگودھا کے ان دو بزرگوں کو عطا ہوا تھا۔

اسی دوران حضرت صاحبزادہ میرزا طاہر احمد صاحب نے اپنی کار حافظ صاحب کو بھیج دی اور ڈرائیور کے ہاتھ ایک خط ارسال کیا کہ آپ ضرور یہ موٹر کار رکھ لیں۔آپ کو سانس کی بھی تکلیف ہے پیدل آپ چل نہیں سکتے اور بہت تاکید کی کہ یہ واپس نہ بھجیں مجھے اب اس کی ضرورت نہیں ہم یعنی محمد اقبال صاحب پراچہ قریشی محمود الحسن صاحب اور عاجز راقم جناب حافظ صاحب کے پاس صبح شام جایا کرتے تھے۔اس روز میں اکیلا گیا تو اسی کمرے میں بیٹھے حضرت صاحبزادہ صاحب کے خط کا جواب لکھ رہے تھے جواب لکھ چکے تو حضرت

صاحبزادہ صاحب کا خط اور اس کا جواب مجھے دے کر فرمایا کہ آج کل میری حالت بھی ایسی ہی ہے صاحبزادہ صاحب گو میرے بھائی ہیں مگر حضرت مصلح موعود کے بیٹے اور موجودہ حضرت صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں دونوں خطوط دیکھ لیں کوئی بے ادبی یا گستاخی کا جملہ دیکھیں تو کاٹ دیں۔

حضرت صاحب کا خط بڑا جذباتی اور محبت سے معمور تھا اور جواب اس کا حافظ بھائی نے جو دیا اس کے چند جملے ایسے میرے ذہن پر نقش ہو چکے ہیں کہ وہ میری زندگی کے بقیہ ایام میں میرے قلب و ذہن کو منور کرتے رہیں گے۔ حافظ صاحب محترم نے لکھا۔ آپ میرے بھائی ہیں آپ نے موٹر کار بھجوا کر مجھ پر بہت احسان کیا ہے مگر میری ساری کائنات 12 9x فٹ کا کمرہ ہے نہ میرا کوئی کلینک رہا نہ میں نے کہیں جانا ہوتا ہے اور پھر لوگوں کا میرے خلاف ابھی اتنا تعصب ہے کہ جو شے میری طرف منسوب ہوگی اسے لوگ آج بھی آگ لگا دیں گے اور پھر لکھا کہ عرش پر سے اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے اور گویا مجھے فرما رہا ہے کہ (اگر میں کسی سے کوئی چیز لوں) کہ ''او بے غیرت مسعود ساری عمر میں نے تمہیں موجیں کرائیں اور ذرا سا جھٹکا دیا ہے تو تجھے بدظنی ہوگئی ہے کہ تمہارے لئے اب میرے خزانے میں کچھ باقی نہیں ہے اور تو لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلا رہا ہے''۔

یہ خیال کر کے خدا جانتا ہے میں کانپ جاتا ہوں اس لئے خدا کے لئے ناراض نہ ہوں آپ کی موٹر کار میں واپس بھیج رہا ہوں۔ ملاحظہ فرماویں کہ اس زندگی کے بہت بڑے ابتلاء کو ذرا سا جھٹکا قرار دیا اللہ والوں کے حوصلے بھی کتنے زیادہ قادر کریم نے عطا فرمائے ہوتے ہیں۔

اور اس وقت نیشنل بنک میں صرف 90 روپے آپ کے موجود تھے وہ بھی آپ نے نکلوا لئے کہ ادویات وغیرہ منگوانے کے لئے اکاؤنٹ کھلوایا تھا مگر اب دوائیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ کوئی پاس تھا نہ بنک میں کوئی کوڑی نہ کوئی سامان مگر اللہ تعالیٰ کی قدرتوں پر کامل توکل تھا۔ اور ہم نے دیکھا کہ نہ معلوم کہاں سے اللہ نے اتنا رزق عطا فرمایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے مارکیٹ بھی بن گئی اور غالباً 23 دکانیں ہیں اور عالی شان مکان پہلی منزل پر۔

اللہ رازق ذو القوۃ المتین پر جو توکل کرے وہ اسی طرح ہی رزق دیتا ہے۔ ایک مخالف جماعت وکیل نے حیرت سے بار روم میں کہا ہے کہ امریکہ سے ڈاکٹر مسعود کو Aid مل رہی ہے میں نے یہ واقعہ حضرت خلیفہ ثالث کی خدمت میں عرض کیا حضور نے جلسہ سالانہ کی تقریر میں ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ رزق عطا فرماتا ہے نادان لوگ کہتے ہیں کہ اس کو امداد مل رہی ہے ادھر سے مل رہی ہے۔ آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہا جہاں سے ملتی ہے اس کا تو نادانوں کو علم ہی نہیں اور اس جگہ یہ لطیفہ بھی برمحل ہے کہ حضرت مرزا صاحب کے پاس ان کے عقیدت مند دوست ملک محمد اقبال صاحب مشہور وکیل اپنے وکیل بیٹے کے ساتھ افسوس کرنے ان کے گھر گئے یاد رہے کہ اس سانحہ

عظیمہ کے روز 18 ویں رمضان کی تاریخ تھی۔ملک صاحب کا بیان ہے کہ میرزا صاحب نے فرمایا آپ شوگر کے مریض ہیں روزہ نہیں ہے تو میں چائے پیش کروں مگر ہماری ساری کراکری حملہ آواروں نے توڑ دی ہے یا لوٹ لی ہے مٹی کے برتنوں میں ہی میں پیش کرسکتا ہوں۔اسے محسوس نہ کریں غالبا انہوں نے معذرت کرلی۔ملک محمد اقبال صاحب بہت زیرک انسان تھے اور باوقار دوست فرماتے تھے کہ میرے وکیل بیٹے نے واپسی پر حیرت کا اظہار کیا کہ ابا یہ 75 سالہ بوڑھا جس کا سارا سامان لوٹ لیا گیا اس کے پاس اب مٹی کے بھدے سے برتن ہی ہیں جن میں ہمیں چائے پلانے کی ہمت رکھتا ہے۔ابا اس ظلم اور درندگی کے خلاف واویلا بھی نہیں کرتا جس کا شکار ہوا ہے بلکہ وہ مطمئن ہے خود روزے سے ہے۔اور ہم دونوں نے روزہ نہیں رکھا ہوا۔ ’’مگر وہ کافر اور ہم مومن‘‘ اور حیرت سے وکیل بیٹے نے کہا ’’ابا یہ کیسا کافر ہے اور ہم کیسے مومن ہیں‘‘۔

پھر 26/اپریل 1984ء کی رات حضرت میرزا عبدالحق صاحب نے مجھے حکم دیا کہ موٹر لے کر آؤ ربوہ جانا ہے میں حاضر ہو گیا اتنا فرمایا کہ رات دس بجے حضور نے یاد فرمایا ہے میں نے راستے میں پوچھا (میں اور میرا منجھلا بیٹا اعجاز احمد ساتھ تھے) ہم نے آپ کو چھوڑ کر آجانا ہے یا رات وہیں رہ کر آپ کو ساتھ لانا ہے۔جیسے حکم ہو آپ نے فرمایا حضور نے تمہیں بھی میٹنگ میں بلایا ہے۔خیر رات دس بجے سے لے کر ایک بجے تک مشاورت ہوئی۔ بہت باتیں ہوئیں جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں ہے۔اگلی صبح حضور نے فرمایا کہ یہی دوست کل دس بجے پھر آجائیں۔وہ جمعہ کا دن تھا اس دن پھر 10 بجے ہم پہنچ گئے اور قریباً ایک بجے تک میٹنگ رہی اور پھر جمعہ کے لئے بیت اقصیٰ میں گئے نماز جمعہ حضور کی بجائے ایک اور صاحب نے پڑھائی۔اس کے بعد حضور عازم لندن ہو گئے۔پھر 19 سال بعد 19/اپریل کو سفر آخرت کے لئے لندن ہی سے رخصت ہو گئے۔

آفرین صد آفرین۔تیری پیدائش بھی مبارک اور تیری زندگی کے شب و روز اور مہ و سال بھی مبارک کہ تو نے ہمیں حیات مستعار کے دوران معاشرت اور روحانیت کے نہ بھولنے والے سبق پڑھائے اور میرے پیارے آقا تیری وفات بھی مبارک کہ تو نے ہمیں مر کر بھی جینا سکھا دیا۔

سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ کا یہ جملہ بہت مشہور ہے ’’جو چاہو سو پوچھو‘‘ کی یاد دلاتی رہیں گی۔اردو زبان میں بھی اور انگریزی زبان میں حضور نے علم اور روحانیت کے وہ سبق سوال و جواب کی مجالس میں دیئے کہ جنہوں نے ہزاروں بلکہ لاکھوں دلوں کو رام کرلیا۔

کچھ عرصہ ہوا میں اپنے گھر میں حضور کی سوال و جواب کی محفل سے MTA پر محظوظ ہو رہا تھا کہ میرے ایک عزیز دوست جو فوجداری قانون کے ماہر مانے جاتے ہیں اور قتل و غارت کے مقدمات کی پیروی میں سارے پنجاب میں پھرتے رہتے ہیں اس روز جہلم سے کوئی مقدمہ لے کے جو لوٹے تو میرے گھر آ گئے کہ نون صاحب ٹھنڈا پانی بھی پلاؤ اور پھر چائے بھی۔MTA پر پروگرام چل رہا تھا میں نے

کہا کہ شاہ صاحب یہ پروگرام چلتا رہے؟ انہوں نے کہا ضرور میں یہ سنوں گا۔ چنانچہ سارا پروگرام جو قریباً ایک گھنٹے کا تھا انہوں نے بڑے انہماک سے سنا اور اس وقت ''خوب ہے خوب ہے'' کہتے رہے۔

اگلے روز ہمارے بار روم میں کسی نے جماعت کے خلاف کوئی اعتراض کیا تو شاہ صاحب نے کہا کہ کل میں نے میرزا صاحب پر اعتراضات بھی سنے ہیں اور بات بھی۔ مختصراً تو جواب اس کا میں دوں گا تفصیلی جواب سننا چاہو تو نون صاحب چائے بھی پلائیں گے۔ میرزا صاحب کی باتیں بھی سنائیں گے غرض بے تعریف کرتے رہے۔

سر والڈر یلے نے شیکسپئر کے بارہ میں کہا تھا ''وہ ایک کمیاب چیز تھا'' اس میں کچھ شک نہیں کہ شیکسپئر علم کی دنیا میں نام پیدا کر گیا مگر میں سمجھتا ہوں سر والڈر یلے نے ایک لحاظ سے مبالغہ آرائی سے ہی کام لیا ہے ''کمیاب بلکہ نایاب'' انسان دیکھنا ہو تو میرے حضور کو دیکھئے۔ علم و فضل دنیاوی بھی اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا علم دینی اور روحانی بھی اس دور میں اور کوئی ان کے ہم پلہ نہیں تھا۔

مجھے یہ فخر بھی حاصل ہے کہ میں نے حضور کو بہت قریب سے دیکھا۔ منصبِ خلافت پر فائز ہونے سے پہلے بہت ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ سرگودھا سے محترم قریشی محمود الحسن صاحب عزیزم محمد اکرام پراچہ صاحب اور یہ خاکسار راقم حضور کے ہمرکاب تھے۔ سفر راولپنڈی سے واپسی کا تھا آج کل کی پھرتیاں بھی نہیں تھیں رات ادھر ہی بسر ہوئی دوسرے دن ہم براستہ گجرات گوجرانوالہ شیخو پورہ ربوہ آئے یہ سفر آنے جانے کا دس بارہ گھنٹے کا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ واپسی پر میں نے ادب سے عرض کیا کہ جناب میاں صاحب اب بھی کوئی نظم لکھی ہے فرمایا نہیں میں نے کہا پہلے تو آپ نظمیں کہا کرتے تھے۔ فرمایا تمہیں کیسے معلوم ہے میں نے کہا کہ ایک نظم میں نے آپ کی زبانی سنی ہوئی ہے۔ کونسی؟ میں نے اس نظم کے جتنے شعر یاد تھے پڑھ دیئے۔ جوانی میں حافظہ بھی ساتھ دیتا تھا پس نظم سنی پسند آئی اور بیشتر حصہ یاد ہو گیا۔

کچھ لوگ وہ جو چاہتے ہیں دولت جہاں ملے
زمین ملے مکان ملے سکون قلب و جاں ملے
پر احمدی وہ ہیں کہ جن کے جب دعا کو ہاتھ اٹھیں
تڑپ تڑپ کے یوں کہے کہ ہم کو قادیاں ملے

اس سے اگلے شعر بھی میں نے سنائے فرمایا اب یاد آ رہا ہے ورنہ میں تو بھول چکا تھا۔ اور میری یادداشت پر خوشی کا اظہار فرمایا تم نے یاد رکھے ہیں ''کلام طاہر'' طبع ہوئی تو اس میں یہ شعر موجود پائے گجرات میں اترے عزیزم سعید قریشی کے ہاں چائے پی۔ گوجرانوالہ کے تکے مشہور ہیں ہم نے عرض کیا کہ شام تو ہو گئی ہے یہ بھی چکھ لیں اور پھر رات کو ربوہ آپ کو چھوڑ کر ہم سرگودھا پہنچے۔

جوں جوں تعارف بڑھتا گیا ہم نے دیکھا کہ بند کلی آہستہ آہستہ کھل کر فضا کو معطر کرتی جاتی اور وہ شخص سراپا محبت اور وفا اور سادگی اور ایثار اور روحانیت اور للّٰھیت تھا۔

جب حضور خلیفہ بنے تو ہم قدرتی طور پر زیادہ محتاط اور مودب ہو گئے مگر اس طرف سے محبتوں کا وہ ریلا آیا جس سے ہماری محرومیوں اور پژمردگیوں اور کم مائیگی کے پر بھیگ گئے۔ وہ بقول عبیداللہ علیم صاحب ''چھاؤں چھاؤں'' شخص تھا۔ اور ہم ہی کیا دنیا نے اعتراف کیا کہ بسیار خوباں دیدہ ایم لیکن تو چیزے دیگری۔

ایسے گردش چرخ نے چرخ چاھڑے
سب کیتیاں بیتیاں بھل گیاں
ویلا مردیاں تیک اوہ یاد رہنائیں
جیہڑا گزریا تیری دیوار تھلے

بحرالعلوم ہونے کے ساتھ ساتھ زندہ دلی اور لطیف مزاح کی ملونی ایسی کہ بڑوں اور چھوٹوں اور عورتوں اور بچوں سب کے دلوں کو اپنی گرفت میں لے لیتے اور تسخیر کر لیتے تھے۔

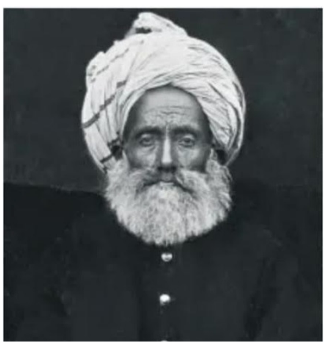
حضور کے حوالے سے یادوں کا ایک جنگل آباد ہے مگر یہاں بیان کی گنجائش نہیں۔ آپ کی جبین پر آنے والے دنوں کی بشارتیں رقم تھیں۔ ظاہر و باطن دونوں خوبصورت اور خوشبودار تھے۔ قومیں آپ کی روحانی زندگی سے زندگی پائیں گی اور آپ کے اقوال زریں ہر شخص کا قبلہ درست کرنے میں مدد و معاون بنتے رہیں گے اب اڑھائی ماہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا حضور کو رحلت فرمائے۔ مگر اس سانحہ کی چوٹ اتنی شدید ہے کہ کوئی فلسفہ کوئی منطق کوئی تشریح دل کو ڈھارس دینے کا موجب نہیں بن سکی آپ کی پر شوکت آواز کی بازگشت احمدیت کے بلند و بالا گنبدوں سے گونجتی رہے گی۔

مگر یاد رہے کہ دکھ اور مہجوری اور محرومی کا شدید احساس اپنی جگہ برحق مگر ہم ماتمی قوم نہیں ہیں اور نہ ہی سینہ کوبی ہمارا شعار ہے دل غموں سے بھرا ہے تو بھرا رہے کہ یہ بھی وفا کا ایک ضروری اور فطری تقاضا ہے۔ اپنے محسنوں کو یاد رکھنا زندہ قوموں کی ایک بڑی علامت ہے حضور کے فرمودات محفوظ ہیں ہمیں ان کی روشنی میں اپنی اولادوں کی اصلاح کرتے رہنا چاہئے مگر ہمارا آقا بڑا ہی باوفا آقا ہے اس نے ہمیں مغموم دیکھا تو دیر نہیں کی جلدی ہمیں مسرور کر دیا۔ ایک ہاتھ سے ایک نعمتِ عظمیٰ ہم سے واپس لی تو خالی ہاتھ نہیں رہنے دیا۔ دوسرے ہاتھ سے اسی کا بدل ہمیں سیدنا حضرت صاحبزادہ میرزا مسرور احمد صاحب خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ کی شکل میں عطا فرما دیا ہمارا فرض ہے کہ ہم سب کمال محبت اور عقیدت اور جذبہ اطاعت کے ساتھ حضور انور کے ساتھ چمٹ جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا اپنا انتخاب ہے جو

مبارک ہے یقیناً مبارک ہے اللہ تعالیٰ حضور کو تادیر سلامت رکھے اور غلبہ دین اور جماعت کی ترقی اور بہبودی کے پروگراموں میں سماوی تائیدات انہیں حاصل ہوں۔ سوچیں تو ایک ہی ثمر دار درخت کی دو شاخیں ہیں بقول برادر قدسی صاحب۔

ایک ہی مشعل کی کرنیں ذی وقار
وہ بھی تھا اک نور یہ بھی نور ہے
وہ غنی تھا یہ سخی ابن سخی
وہ مظفر تھا تو یہ منصور ہے

(روزنامہ الفضل 21رجولائی 2003ء صفحہ 3 تا 5)



خوست کے عالی نسب شہزادے کا قابل صد رشک انجام

اس مقدس انسان کی حق شناسی، حق پرستی اور حق گوئی قابل تقلید ہے

ہم اب سال 2003ء سے گزر رہے ہیں۔ سو سال قبل 1903ء بھی گزرا۔ ہر چند کہ وہ سال ہم نے دیکھا نہیں مگر اس سال کے سانحہ عظیم نے اسے تاریخ احمدیت میں بھی اور تاریخ افغانیہ میں بھی ایک یادگار سال بنا دیا ہے۔

علاقہ خوست کے شہزادے کی فطری سعادت، تقویٰ شعاری، عبادت گزاری اور حق شناسی پھر جاں سپاری کے تذکرے بہت ہوئے اور تا ابد ہوتے رہیں گے۔ جب سے 2003ء کا پہلا دن طلوع ہوا میں اس مسلسل تصور کے خمار میں رہا کہ یہ سال تو اس معصوم افغان شہزادے کے نام نامی سے معنون ہے۔ دنیاداروں نے اپنے اپنے خیال کے مطابق اس سال کو کسی نہ کسی سیاسی شخصیت سے جوڑا تو کسی اور نے کسی اپنے خیالی محبوب کے ساتھ اس کے ڈانڈے ملائے۔ مگر مجھے یہ سب نسبتیں بے حقیقت لگیں۔ یہ سال حضرت سید عبداللطیف رئیس خوست کے نام سے ہی سجتا ہے۔ اور انہیں کے نام نامی سے اس میں برکتیں تلاش کرنے والوں کو بہت برکتیں بھی ملیں گی۔

اس سال کے شروع ہوتے ہی مجھے کابل کے وہ بزرگ سید بہت ہی یاد آئے اور نا معلوم مجھے اس معصوم مظلوم کی یادوں نے کیا کیا کیفیتیں عطا کیں مگر اب مشکل مرحلہ یہ ہے کہ اس عالی منصب اور بلند مرتبہ شہید مرحوم کے ذکر کے لئے اظہاری طاقت اور کیفیت کہاں سے لاؤں۔ ہاں وہ روحانیت کا بلند و بالا مینار جس کے بارے میں اس کے اور ہم سب کے مرشد و پیشوا نے فرمایا تھا ”کہ اس کی ایمانی

قوت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ اگر میں اس کو ایک بڑے سے بڑے پہاڑ سے تشبیہ دوں تو میں ڈرتا ہوں کہ میری تشبیہہ ناقص نہ ہو''۔ وہ شخص جس کو سبحانیت سے اللہ تعالیٰ نے وافر حصہ بخشا تھا اس کے بیان کے لئے تو دلکش ابلاغ اور دلنشیں کنایوں کی ضرورت ہے۔ میں کچھ عرصہ ہم وغم کی گھٹا ٹوپ آندھی اور حزن وملال کی گہری دھند میں زندگی گزار رہا ہوں مگر جونہی حضرت شہزادہ صاحب کا خیال آتا سارے رنج ومحن کافور ہو جاتے اور میں اس مقدس انسان کی حق شناسی، حق پرستی اور حق گوئی کے تصور میں گم ہو جاتا اور اس کی جان سپردگی کے لمحات نے مجھے وہ شبھ گھڑی عطا کر دی جو سراسر مالک الملک کی دین ہے۔ اپنی علمی کم مائیگی کے باوجود جب اپنا ناتواں قلم اس محبوب کی یاد میں اٹھایا تو کسی قدر اس میں پختگی اور فکری پاکیزگی کا احساس ہوا۔ کیوں نہ ہوتا اور اس میں میری ہرگز کوئی بقراطی نہیں ہے۔ بلکہ اس معصوم اخوان زادے کی روحانی تقدیس ہے جو سو سال گزرنے پر بھی ختم نہیں ہو سکتی۔ بلکہ نہیں وہ قیامت تک ختم نہیں ہو سکتی۔

ہم نے چھڑکا ہے صلیبوں پہ لہو
کون کہتا ہے کہ ہم صاحبِ کردار نہیں

میاں احمد نور صاحب، حضرت صاحبزادہ صاحب کے خاص شاگرد تھے پھر حضرت شہزادہ کی شہادت کا واقعہ ہائلہ 14ر جولائی 1903ء کو ہوا تھا اور میاں احمد نور صاحب موصوف 8ر نومبر 1903ء کو قادیان پہنچے۔ ان کا بیان ہے 40 روز تک صاحبزادہ صاحب کا جسد خاکی پتھروں کے ڈھیر تلے دبا رہا جہاں حضرت ممدوح کو سنگسار کیا گیا تھا۔ آپ کے کچھ شاگرد وہاں موجود تھے مگر افغانی پولیس کا پہرہ ہوتا تھا۔ آخر احمد نور صاحب کابلی نے چند دوستوں کو ساتھ لے کر رات کے وقت چھپ چھپا کر آپ کی لاش نکالی قبرستان لے گئے اور جنازہ پڑھ کر راتوں رات وہاں دفن کر دیا۔ وہ شہید مرحوم بزبان حال پکار رہا تھا۔

اوہدی گلی دے وچ دفناونے دی
اینویں خوشی اے میرے دوستاں نوں
اوس جدوں لنگھنائیں ٹھوکر مار لنگھنائیں
رہسی قبر دا کویں نشان باقی

وہی بات ہوئی جب امیر کو پتہ چلا کہ فلاں جگہ پر قبر بنا دی گئی ہے تو راتوں رات وہاں سے آپ کی لاش نکال کر کہیں غائب کر دی۔ میاں احمد نور صاحب کا بیان ہے کہ چالیس دن گزر جانے کے بعد جب پتھروں کے تلے سے نکالے گئے تو آپ کے بدن سے کستوری کی خوشبو آرہی تھی۔ عقل وقیاس سے یہ ماجرا بیرون ہے کوئی حسابی آدمی یا دنیا کا کوئی سائنسدان اس کی توضیح کرنے سے قاصر ہے کہ یہ چالیس دن کے بعد پتھروں کے نیچے سے لاش نکالنے سے خوشبو کہاں سے آسکتی ہے مگر ہمیں یقین ہے اور پختہ ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا

اور خوشنودی اور قبولیت کی یہ خوشبو تھی اور یہ کیفیت خارق عادت معجزات کی ذیل میں آتی ہے۔

بوئے او آید زبام و کوئے او

کاش مجھے الفاظ میسر آتے جو خود بولتے اور ایسے حروف عطا ہوتے جو اپنا آپ خود کھولتے اے کاش مجھے اسلوب عطا ہوتا جو رواں ہوتا تو اس پاک نفس کا کچھ شایان شان ذکر کرسکتا۔ اور اے میرے خدا مجھے وہ لہجہ ارزاں فرما جو ایسا مؤثر ہو کہ جیسے میرے دل و دماغ میں لہریں اٹھ رہی ہیں۔ میں اپنے قارئین کے دلوں میں بھی جوار بھاٹا پیدا کرسکوں اور دنیائے دل میں حشر اٹھادوں۔ جتنی میں کوشش کروں اس پاک نفس کی بیمثال قربانیوں اور قابل رشک جانفروشی کا بیان مجھ سے ممکن نہیں ہے۔ یہ بہت مشکل کام ہے مگر میں اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں حصول برکت کی خاطر اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ ذکر تو ضرور کروں گا۔ اس اخوان زادے کی جان قربان کرنے کی مکمل داستان تو بہت طویل ہے اور پھر بار بار بیان بھی ہو چکی ہے۔ میں اس میں کیا اضافہ کرسکتا ہوں یوں بھی تکرار کسی قدر تکدر پیدا کر دیتا ہے یونہی چند اشارے کرتا جاؤں گا۔

آپ اکتوبر 1902ء کو قادیان تشریف لائے اور پھر تین چار ماہ اپنے آقا کے حضور حاضر رہ کر قلب و روح کو خوب صیقل کیا فرماتے کہ بار بار حکم ہوتا ہے ''سر بدہ سر بدہ'' جنوری 1903ء کے وسط میں سیدنا حضرت مسیح موعودؑ نے ایک مبارک سفر اختیار کیا جس کے بارہ میں عالم الغیب نے پہلے سے نوید سنادی تھی کہ بہت برکتوں کا حامل ہوگا۔ حضرت سید عبداللطیف صاحب بھی حضور انور کے ہم رکاب تھے۔ حضور کی جہلم میں پیشی تھی۔ 17رجنوری کو احاطہ عدالت میں آپ رونق افروز ہوئے حضرت صاحبزادہ صاحب بھی پاس تھے۔ روایت ہے کہ حضور نے فارسی میں گفتگو کرنا شروع فرمائی اس زمانہ میں بہت لوگ فارسی جانتے تھے اور شاید حضور نے حضرت شاہزادہ صاحب کی خاطر ہی خاص طور پر اس روز فارسی میں تقریر شروع فرمائی۔ تو صاحبزادہ صاحب نے ادب سے عرض کیا کہ حضور بہت لوگ ہیں شاید کچھ لوگ فارسی نہ سمجھتے ہوں اور میں تو اردو بھی سمجھتا ہوں چنانچہ پھر حضور نے اردو میں بات کرنا شروع کر دی۔

وہ مجلس کس قدر روح پرور تھی اس مجلس میں ایک درزی نے سوال کیا تھا کہ آپ نے باپ کو بیٹے سے اور بھائی کو بھائی سے الگ الگ کر دیا گویا خاندان کو لیراں لیراں کر دیا ہے تو حضور نے فرمایا کہ میاں کبھی درزی کی دکان پر گئے ہو اس نے عرض کیا کہ حضور میں تو خود درزی ہوں حضور نے فرمایا تو پھر تمہارے لئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ تم لباس بنانے کے لئے کپڑے کو کاٹو اور مالک شور مچانا شروع کردے کہ میرا کپڑا کیوں کاٹ کر خراب کر رہے ہو اس نے بے ساختہ کہا کہ اسے پاگل ہی کہیں گے۔ حضور نے فرمایا کہ میں بھی ایک جماعت بنا رہا ہوں اس لئے تراش خراش کا عمل ضروری ہے۔ (حضور کے الفاظ تو یہ نہیں تھے مفہوم تقریباً یہی تھا) اور پھر اس اونچے نصیبے والے درزی نے سوال کیا کہ میں ان پڑھ محض ہوں علم کی باتیں مجھے سمجھ نہیں آتی۔ اپنی سچائی کی کوئی سادہ سی دلیل دے کر سمجھا

دیں۔تو حضور نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے چہرہ کے قریب لے جا کر فرمایا کہ یہ دیکھو یہ چہرہ جھوٹے آدمی کا ہوسکتا ہے اس نے برملا کہا نہیں جی یہ چہرہ تو بہت پرنور اور مبارک ہے اور اس نے اسی وقت بیعت کر لی۔ میں نے جب یہ روایت پڑھی اس وقت آتش جوان تھا جہلم گیا اور اس جگہ کی نشاندہی کرائی جہاں حضور سر محفل جلوہ افروز ہوئے تھے اور اس درزی پر بھی دل فریفتہ ہو گیا جس نے یہ دونوں سوال کئے تھے اور حضور انور سے حاضرین محفل نے اور اب ہم نے بھی وہ روح پرور جواب سنے۔

اس مبارک اور یادگار سفر کا ہی واقعہ ہے کہ حضرت شہید مرحوم نے احاطہ کچہری جہلم میں 17رجنوری 1903ء کو حضور سے عرض کیا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ مولوی محمد حسین (بٹالوی) کے پاس جاؤں اسے کہوں کہ مجھے جو نور کابل سے نظر آ گیا تمہیں جو سب سے نزدیک ہو کچھ دکھائی نہ دیا۔

الغرض اس سفر سے یہ مبارک قافلہ بامراد واپس لوٹا تو حضرت سید عبداللطیف صاحب اپنے وطن جانے کے لئے تیار ہو گئے اور روانگی کے روز حضور خود اور کچھ رفقاء قادیان سے ڈیڑھ میل دور تک انہیں الوداع کہنے کے لئے ساتھ گئے اور جب الوداع ہونے لگے تو فرط جذبات سے مغلوب ہو کر اور اس بات کا بھی انہیں شاید پختہ علم ہو چکا تھا کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہے وہ حضور کے پاؤں پڑ گئے اور زاروقطار رونے لگے۔عرض کرتے کہ حضور میرے لئے دعا کریں حضور نے فرمایا اٹھیں مگر وہ دیوانگی میں اپنے آپ سے باہر ہو چکے تھے انہیں کچھ ہوش نہ تھا۔آخر حضور نے فرمایا: الامر فوق الادب تو آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور بہتے آنسوؤں کے ساتھ اور بوجھل دل کے ساتھ رخصت ہوئے۔

آقا بھی جانتا تھا کہ میرا یہ سرفروش عقیدت مند اپنی متاع جان و مال اور اولاد غرض یہ کہ ہر شے کو تج کر اپنے ظالم اور جاہل ملک جا رہا ہے۔ جہاں اس کی کسی شئے کی حتی کہ جان کی حفاظت کی بھی کوئی ضمانت نہیں اور اس باوفا اور مخلص اور ایثار وقربانی کے پتلے مرید کو تو ''سربدہ سربدہ'' کے پے در پے الہام ہوتے رہے تھے۔اسے خوب اندازہ تھا کہ میں وطن پہنچتے ہی جان سے اور بیوی بچوں سے اور وسیع جائیدادوں سے محروم کر دیا جاؤں گا۔

دوستو سوچو کہ آقا اس زمانے کا عارف باللہ ماموراور امور خداوندی اور تقدیر الٰہی کو سمجھنے اور جاننے والا مرید بھی معرفت الٰہی اور اللہ اور اس کے رسول اور زمانے کے امام کی محبت میں سرشار دونوں الگ ہو رہے ہیں اور اس یقین کے ساتھ کہ اس دنیا میں پھر دونوں کی ملاقات ممکن نہیں ہوگی۔ میں اس آقا اور غلام کے بچھڑنے کے نازک وقت کو جب بھی چشم تصور سے دیکھتا ہوں تو سینے میں دل ڈوبنے لگتا ہے اور پھر بہت وقت تک تنہائی میں بیٹھ کر ٹپ ٹپ آنسو بہانے کے بغیر چین نہیں آتا۔آقا ہو تو ایسا ہو اور غلام بھی ہو تو ایسا ہو۔ایک صدی گزر گئی یہ نظارہ چشم فلک نے پھر نہ دیکھا۔

دنیا بھی اک سرا ہے بچھڑے گا جو ملا ہے
گر سو برس رہا ہے آخر کو پھر جدا ہے
شکوہ کی کچھ نہیں جا یہ گھر ہی بے بقا ہے
یہ روز کر مبارک سبحان من یرانی

ملک افغانیاں میں اوّل حضرت مولوی عبدالرحمن صاحب سے 20/جون 1901ء کو جان چھین لی گئی۔ وہ حضرت صاحبزادہ مرحوم کے شاگرد تھے۔ پھر دو سال بعد 14/جولائی 1903ء کو کمال وفا اور دلیری اور محبت اور ایثار کی طشتری میں سجا کر حضرت اخوان زادہ صاحب نے اپنی متاع جان اپنے خالق و مالک کے حضور پیش کر دی۔ جانتے تھے کہ اس میں اولاد کی خواری اور بربادی ہوگی وسیع جائیداد ضبط ہو جائے گی کچھ بھی باقی نہیں رہے گا مگر بزبان حال کہہ رہے تھے کہ ''جان و مال و آبرو حاضر ہیں تری راہ میں'' اور اس نازک وقت قرآنی دعائیں آپ پڑھتے رہے۔ حضرت یوسفؑ کی دعا کہ اے میرے زمین و آسمان کے خالق آقا صرف اور صرف تو ہی میرا اولی ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ مجھے دین پر موت دینا اور اپنے صالح اور چنیدہ بندوں کے ساتھ مجھے ملا دینا۔ موت آنکھوں کے سامنے نظر آ رہی تھی اور یہ برگزیدہ انسان نہ بیوی بچوں کا ذکر کرتا ہے نہ وسیع جائیداد کا نہ اپنی جان فدا کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس کرتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ربانی شہ سوار نے اپنے گھوڑے پر زین کس لی ہوئی تھی اور وہ سفر آخرت پر روانگی کے لئے بے چینی اور کمال خوشدلی سے روانگی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ موت کو اندھی وادی اور گہری غار جان کر پیچھے نہیں ہٹتا بلکہ اسے وصال یار کا وسیلہ سمجھ کر گلے لگانے کے لئے بے تاب ہے۔ اے کاش اس منظر کو کسی کیمرے کی آنکھ اچک کر محفوظ کر لیتی۔

گریبان چاک دامن تار تار اور طوق گردن میں
سوئے مقتل ترا کس شان سے دیوانہ آتا ہے

اس سید شاہزادے کی قربانی کے لئے خوش دلی اور بے خوفی اور دلیری کی قرونِ اولیٰ میں مثالیں ملتی ہیں۔ آج کل تو یہ رسم جاں فروشی عنقا ہے۔ حضرت شہید مرحوم ہاں اس سخی شاہزادے کا شجرہ نسب حضرت داتا گنج بخشؒ کے ساتھ ملتا تھا۔ جو حضرت علیؓ کی نسل میں سے تھے۔ حضرت سید ہجویری داتا گنج بخشؒ نے اپنے آسمانی آقا کے ساتھ کسی خاص ساعت میں یوں راز و نیاز کیا تھا اور شہادت کا رتبہ پانے کی تمنا ظاہر کی تھی۔

جاں نجواھم داد اندر کوئے تو
گر مرا آزار آید یا بلا

اور آسمانی علوم و معرفت کو سمجھنے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ کبھی باپ دادا کے حق میں کی گئی دعا یا نوید آسمانی اس کے بیٹے یا پوتے کے حق میں پوری ہوتی ہے۔ اگلے روز ''تذکرہ'' میں حضرت اقدس کا ایک رویا پڑھا۔ حضور فرماتے ہیں۔ ''میں ایک ڈولی میں بیٹھا ہوا ہوں پھر کسی نے میاں شریف احمد کو اس میں بٹھا دیا'' مجھے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے اور نہ مجھے اس کا یارا ہے۔

حضرت سید ہجویری کی یہ دعا مقبول ہوئی اور آپ کے حقیقی وارث حضرت سید عبداللطیف شاہ کی شہادت کے رنگ میں پوری ہوگئی۔ خود حضرت گنج بخشؒ کو طبعی موت بستر پر ہی نصیب ہوئی تھی مگر وہ بھی شہید راہ حق تھے اس میں کیا شک ہے۔

اوہدے ہور ٹھکانے وی ملن دے نیں
لگی ہوئی کوئی طور دی قید ناہیں
کدھرے دار اتے ملاقات بخشے
کدے بخشدائے دید دیوار تھلے

اس معصوم شاہزادے کی بے مثل قربانی کا اجمالی ذکر کر کے کچھ تو اس بد بخت زمین کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس نے اس شاہزادے کا ناحق خون پیا اور کچھ حضرت اقدس کی ایک مقدس تمنا کا تذکرہ کرنا بھی مقصود ہے۔ جو حضور نے شہید مرحوم کے سانحہ عظیمہ کے وقت ظاہر فرمائی تھی۔ حضور نے فرمایا تھا:

''اے عبداللطیف تیرے پر ہزاروں رحمتیں کہ تو نے میری زندگی میں ہی اپنے صدق کا نمونہ دکھایا اور جو لوگ میری جماعت میں سے میری موت کے بعد رہیں گے میں نہیں جانتا کہ وہ کیا کریں گے''۔

یہاں یہ ذکر کر دوں کہ شہداء کرام کے اس سرخیل اور شہداء کے ماتھے کے اس جھومر سے پہلے 20رجون 1901ء کو حضرت مولوی عبد الرحمن صاحب اور پھر 31راگست 1924ء کو حضرت مولوی نعمت اللہ خان صاحب اور پھر حضرت قاری نور علی صاحب اور حضرت مولوی عبدالحلیم صاحب 5رفروری 1925ء کو راہ حق میں اپنی جانیں قربان کر کے حضرت اقدس کی آرزو پوری کر گئے۔

حضرت اقدس کی پاک روح سے بصد ادب اور کمال انکسار کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اے میرے آقا و مرشد جو بیج حضرت سید عبد اللطیف صاحب شہید نے کابل کی سرزمین میں بویا تھا اور پھر اپنے پاک خون سے جس طرح اس کی آبیاری کی تھی وہ بیج نہ صرف افغانستان میں پھلا پھولا بلکہ سرزمین ہندو پاک میں بھی اسی شاہزادے کی ڈگر پر چلتے ہوئے سندھ کے شہروں اور دیہات میں اور پنجاب کے کوہ و دامن میں اور سرحد اور بلوچستان کے کوہستانی اور میدانی علاقوں میں بھی دین کو دنیا پر مقدم رکھتے ہوئے درجنوں بلکہ شاید سینکڑوں جاں نثاروں نے اپنی جانوں کے نذرانے اس راہ میں پیش کر دیئے۔ حضور نے فرمایا تھا کہ

''اے کابل تو گواہ رہ کہ تیرے پر سخت جرم کا ارتکاب کیا گیا اے بدقسمت زمین تو خدا کی نظر سے گر گئی کہ تو اس ظلم عظیم کی جگہ ہے''۔

ہاں حضور انور کی پاک اور مقدس روح کو اپنے عقیدت مندوں کی جانیں قربان کرنے سے ایک گونہ مسرت بھی ہوگی کہ جماعت حضور کے وصال کے بعد بھی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے میں ہرگز بخل سے کام نہیں لے رہی اللہ کے محبوب اور چنیدہ بندے کی زبان سے اور قلم سے جو لفظ بھی نکلا وہ پورا ہو رہا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہوتا وہ تو ماموز زمانہ تھا۔ آج دنیا دیکھ رہی ہے کہ کابل کی زمین کس طرح خدائے قادر کی نظروں سے گر گئی ہے اور آج کابل بلکہ سارا افغانستان اس ماموز ربانی کی صداقت بیان پر شاہد ہے اور ایک صدی گزر جانے کے باوجود ان معصوموں کے خون ناحق سے جس قدر ذوالانتقام رب کو ملک افغانیاں نے ناراض کیا تھا اس کا بدلہ کن کن عذابوں میں مبتلا کر کے اللہ قدیر نے لیا ہے۔ اے کاش کسی کو تو سمجھ آئے کہ اس ملک پر کس گناہ کی شامت آئی ہے کہ ٹلنے کا نام نہیں لیتی اور نحوستوں کے سائے اور اندھیرے اتنے گہرے ہو گئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کبھی سحر نہیں پھوٹے گی۔ اے کاش اس ملک کے باسی یہ سمجھ سکیں کہ ان کا مداوا نہ کسی ''کرزئی کے پاس ہے نہ کوئی بین الاقوامی چارٹر ان کی مدد کر سکے گا''۔ ''ظالم کی پاداش باقی ہے ظالم کی پاداش باقی ہے'' کا نقارہ ایک صدی سے بج رہا ہے اور یہ ناقوس چپ نہیں ہوگا جب تک ظالم قوم کی آنکھیں نہ کھلیں اور خالق و مالک سے صلح نہ کر لیں حضرت ماموز زمانہ کا یہ قول ہر روز سچا ثابت ہو رہا ہے۔ کہ

شکر اللہ میری بھی آہیں خالی نہیں گئیں
کچھ بنی طاعون کی صورت کچھ زلازل کے بخار

اللہ تعالیٰ کی عنایات کریمانہ اور الطاف خسروانہ کا شمار ممکن نہیں جو مجھ عاصی اور پر تقصیر پر ہوئے ایک قابل ذکر کرم مجھ پر کریم و مہربان رب نے یہ کیا کہ ایک روز سید حضرت صاحبزادہ محمد طیب صاحب لطیف ابن حضرت شہید مرحوم اور عبدالرب صاحب بھتیجا شہید مرحوم کسی احمدی وکیل کا پتہ پوچھتے پوچھتے میرے غریب خانہ پر آ نکلے مجھے شناسائی نہیں تھی مگر خصوصاً صاحبزادہ محمد طیب صاحب لطیف کے روحانی خدوخال سے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی بہت بزرگ شخص ہے انہوں نے تعارف کرایا تو میں نے یقین جانا کہ ان کا میرے ہاں تشریف لانا میرے لئے موجب ہزار سعادت و برکات ہے اور میں بے حد مسرور ہوا۔ کبھی میں اپنے گھر کو دیکھتا اور کبھی ان کو اور پھر بے اختیار کہہ اٹھا۔

ان کو بٹھاؤں کہاں دل میں صفائی تک نہیں

عبدالرب صاحب پیغامی تھے ان کے نوکر نے سرگودھا شہر میں اپنے سسرال میں سے کسی کو خنجر گھونپ دیا تھا اور وہ پس زندان چلا گیا تھا۔ یہ بزرگ اس کی ضمانت کروانے کے لئے آئے میں نے کوشش کی دوسرے ہی روز کہہ کہلا کر اس کی ضمانت منظور کروائی۔ اور پھر آپ

ہی ضامن بھی مہیا کیا اور رہا کروا کر ربوہ بھیجا۔ اس سے حضرت صاحبزادہ محمد طیب صاحب لطیف بہت خوش ہوئے۔ ان کی خدمت کرنا ہی میرا مقصود تھا۔ پھر اس حقیر سی خدمت کے نتیجے میں حضرت صاحبزادہ صاحب موصوف مائل بہ کرم ہوئے اور میرے ہاں اکثر تشریف لایا کرتے تھے۔ وہ 1903ء میں اپنے ابا کی شہادت کے موقعہ پر غالباً 8/9 سال کی عمر کے تھے۔ اور خود بھی باقی افراد خاندان کے ساتھ بہت سخت اذیتوں اور جاں گسل حالات سے گزرے تھے اور وہاں کی جیل ایک سخت گندا عقوبت خانہ ہے۔ میں نے باہر سے اسے دیکھا تھا اندر کی حالت اللہ تعالیٰ کسی کو نہ دکھائے۔ حضرت صاحبزادہ صاحب سے اس کی حالت سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ حضرت سید عبداللطیف صاحب تو کچھ عرصہ جیل میں بند رہ کر پا بجولاں رہ کر (اور یہ ہمارے ملک کی بیڑی نہ سمجھی جائے وہ تو دو من وزنی گردن سے پاؤں تک سارے جسم کو جکڑ لیتی ہے) سنگسار کر دیئے گئے۔ مگر لواحقین پر مصائب اور تکالیف کی انتہا کر دی گئی بتاتے تھے کہ ہم کو جب کبھی جیل سے باہر لایا جاتا تو ہمارے سفید کپڑے سرخ نظر آتے تھے۔ اس مچھر کے خون سے جو ہمیں کاٹتا تھا اور ملیریا نے ہم سب کو نیم جان کر دیا تھا۔ آخر حضرت شہید مرحوم کے کسی شاگرد گورنر کو ترس آیا اور اس نے رہائی دلائی۔ شاعر نے نہ معلوم کن حالات میں کہا تھا کہ

یہ کہہ دو کوہکن سے کہ مرنا نہیں کمال
مر مر کر ہجر یار میں جینا کمال ہے

مگر یہ شعر کسی طرح نہ مرنے والے پر صادق آتا ہے نہ جینے والوں پر، صرف اتنا حصہ متعلقہ ہے کہ مر مر کر جینا ایک روز کے مرنے سے بہر حال صبر آزما اور کٹھن منزل ہوتی ہے۔ حضرت صاحبزادہ محمد طیب صاحب لطیف کو میں ''زندہ شہید'' کہتا تھا حضرت شہید مرحوم کے وطن راقم کو کوئی بار جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک دفعہ برادرم شیخ محمد اقبال صاحب پراچہ بھی ہمراہ تھے۔ ہمارا قیام ہوٹل میں تھا مگر شاہزادہ مرحوم کے ایک پوتے نے ہمیں اپنے گھر پر بلایا۔ وہ ہمیں اپنی کار میں لے جا رہے تھے کہ ایک بازار میں سے گزرتے ہوئے فرمایا کہ آپ اپنی قراقلی کی ٹوپیاں اتار لیں کیونکہ یہ بڑا ہی متعصب علاقہ ہے۔ پاکستانیوں سے انہیں اللہ واسطے کا بیر ہے آپ ٹوپیوں سے پہچانے نہ جاویں۔

ایک دفعہ مجھے حبیب اللہ خان صاحب جو مولوی عبدالحلیم صاحب شہید کے پوتے تھے ان کا فون آیا کہ سنا ہے کہ آپ پاکستان سے آئے ہوئے ہیں اور احمدی ہیں۔ میں مولوی عبدالحلیم صاحب کا پوتا ہوں اور وہ کابل میں ''پشتنی تجارتی بانک'' (کابل کا سٹیٹ بنک) کے بڑے عہدے پر تھے انہوں نے بتایا کہ میں کراچی پاکستان میں سرکاری دورے پر گیا تو لاہور بھی گیا اور وہاں سے ربوہ بھی حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کو ملنے گیا تھا۔ مگر وہ کہیں اس وقت بیرون ملک دورے پر روانہ ہونے والے تھے ملاقات نہ ہو سکی۔ افسوس کہ

حضرت صاحبزادہ محمد طیب صاحب لطیف کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادگان سے تعارف نہ ہوا اور میں اس طرح اس بزرگ اور تاریخی خاندان کی رفاقت سے محروم ہو گیا۔ اس میں میری غفلت اور نالائقی کا بھی دخل ہے اور میری حرماں نصیبی بھی تو ظاہر ہے۔ اے کاش کسی دن ان ذی عزو وقار خانوادے کے کسی فرد کے ساتھ کسی طرح پھر ملاقات اور تعارف ہو جائے تو وہ یوم سعید مجھے پھر ان بزرگوں کی حسین یادیں تازہ کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ شہدائے کرام کی یاد میں میں نے بہت آنسو بہائے خصوصاً شہادت سید عبد اللطیف صاحب شہید اور حضرت مولوی عبدالرحمن صاحب اور حضرت مولوی نعمت اللہ خان صاحب کے واقعات کی تفصیل پڑھ کر چھپ چھپا کر اللہ تعالیٰ کی دہلیز پر سر رکھ کر آنکھیں بہہ نکلیں تو شاید میرا ذرہ نواز آقا انہیں ہی قبول فرمالے۔ اور کیا عجب اور قادر کریم کی رحمت سے کیا بعید کہ میری چشم نم آلود سے بہنے والا پانی میرے معاصی کی جہنم کو ٹھنڈا کر دے۔

میرے یار جس جام نو منہ لایا
او گھٹ نئیں جام جمشید کولوں
اثر آب حیات دا رکھدائے
جیہڑا گھٹ باقی اوھدے جام وچ اے

حضرت شہید مرحوم کو جب سنگسار کیا گیا اس واقعہ کو چشم تصور سے اکثر دیکھنے کی کوشش کی اور استقامت کے اس شہزادے کے آخری اوقات کا ایمان افروز نظارہ بھی کیا اور ایمان وایقان میں بلند و بالا چٹان کو دیکھا جو میرے وہم وگمان سے بھی بالا نکلی۔ اس راستبازوں کے سردار اور تقویٰ اور اطاعت الٰہی کو انتہا تک پہنچا دینے والے بزرگ کی عالم تصورات میں زیارت کی اور کچھ پھر 1958،59ء میں آپ کے بزرگ صاحبزادے حضرت سید محمد طیب صاحب لطیف کو جب ان جاگتی آنکھوں سے دیکھا تو اس بزرگ کے روحانی مقام سے اس کے والد معظم کے نور کا اندازہ کیا اگر میں یہ کہوں کہ وہ میرے قیاس سے بھی بیرون تھا تو یہ عین صداقت ہے۔

میں کیا اور میرا علم کیا اور روحانیت کو جانچنے کی میری استطاعت کیا یہ بھی ناقص ہیں۔ ان کے مقام و مرتبہ کا اصل علم تو علیم وخبیر خدا کو ہے۔ اس کے رجسٹر میں کسی کا کتنا مقام بلند و بالا درج ہے وہ اصل حقیقت ہے۔

سیدنا حضرت رسول عربیؐ نے خدا کی راہ میں جان قربان کرنے والوں کی کئی مثالیں دے دے کر سمجھایا ہے۔ اسی طرح اس زمانے کے مامور نے ہمیں تحریرات اور ملفوظات میں اس کی تشریح ہمارے علم وفہم کے مطابق سمجھائی ہے۔ ان سب کے مطالعہ سے مجھے یہ سمجھ آتی ہے کہ ایک تو وہ گروہ عاشقان تھا جو بعض فوری جنگوں میں جانیں قربان کر گئے اور کچھ وہ بھی جو مہینوں پابند سلاسل رہے اور پھر سنگسار کر دیئے گئے یا گلا گھونٹ کر مار دیئے گئے۔ ان کے مقام بلند اور منصب اعلیٰ میں تو شک کی کوئی گنجائش نہیں مگر میرے

ناقص ادراک کے مطابق وہ بھی بے شمار ہیں خصوصاً اس دور میں جن کو کافر دجال مرتد اور واجب القتل قرار دیا گیا اور جنہیں ایسی ماوراء طاقت دکھ اور ایذائیں دی گئیں۔ بالخصوص ان کے مرشد ومقتدا کے خلاف وہ سب وشتم اور بہتانوں کی وہ بوچھاڑ کی گئی جن سے ان کے سینے چھلنی کر دیئے گئے اور قلب وذہن کو مجروح کیا گیا۔ گو انہیں یکدم سنگسار نہ کیا گیا مگر ہر روز انہیں جان سے مار دینے کے منصوبے اور کوششیں کی گئیں کہ گویا وہ ہر روز موت کے منہ سے بمشکل نکلے اس گروہ مظلومین ومقتولین کا شمار نا معلوم الٰہی ریکارڈ میں کہاں پر ہے۔

قارئین کرام میں نے یہ نوٹ سال کے آخر میں اس نیت سے لکھا ہے کہ اس بزرگ شاہزادے کی قربانی اور اس کی اولاد کی جانفشانی اور اس کی وسیع جائیداد کی ضبطی کی خون آشام داستان پھر تازہ کر دوں ہر چند کہ ہم کوئی برسی نہیں منایا کرتے نہ ہم عزاداری کو جائز سمجھتے ہیں۔ مگر اپنے میں سے خدارسیدہ بزرگوں اور چنیدہ اور خدانما عشاق الٰہی کا ذکر کرنا اور پھر خود اپنے آپ کو سمجھانا کہ ہمارے اسلاف کس شان بلند کے حامل تھے اور ہم ان کی طرف منسوب ہونے کا کیونکر حق رکھتے ہیں اور پھر آنیوالی نسلوں کے لئے ایسے پاک نمونوں کا ذکر ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور احسانات پر یقین قائم ہونے اور اس کے لئے ہر شے قربان کرنے کے جذبے کو مہمیز لگانے کے لئے ضروری خیال کیا۔

میرا خدا مجھ سے بہتر جانتا ہے کہ مجھے عشاق کے اس گروہ سے اور ماموزمانہ اور اس کے خلفاء اور رفقاء سے گہرا قلبی تعلق بچپن سے رہا ہے اور اب بھی اس کے سہارے جی رہا ہوں اور پیر فضل شاہ گجراتی کا شعر میرے حسب حال ہے۔

میں شروع تھیں لے کے اج توڑی
جھدے عشق میں ذلتاں جھاگیاں نے
دم اوہدے ہی قدماں دے وچ نکلے
عزت آبرو رہندی اے تاں میری

(روزنامہ الفضل 24 ر دسمبر 2003ء صفحہ 4 تا 6)



ایک بے نفس اور درویش صفت پروفیسر مکرم محمد الدین صاحب انور کا ذکر خیر

ایک دفعہ میں لندن میں حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب کی ملاقات کے لئے ان کے فلیٹ پر حاضر ہوا۔ آپ ان دنوں حدیث شریف کا ترجمہ انگریزی زبان میں کر رہے تھے مختلف کتب میز پر کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کی صحت اور عمر میں برکت دے آپ اس عمر میں بھی اتنے مفید کام کر رہے ہیں۔ فرمایا کہ اب انجام بخیر کی دعا کریں میرے بہت پیارے اب اس پار چلے گئے ہیں وہی حال ہمارا ہے کہ ہمارے بھی بہت ہی محبوب اور پیارے وجود دنیا چھوڑ چکے ہیں۔ چوہدری محمد الدین صاحب انور بہت عرصہ سے بیمار تھے مگر باوجود علالت کے ہمارا ہمیشہ خیال رکھا اور ہمیں کبھی نہ بھلایا۔ بڑے التزام کے ساتھ خیریت دریافت کرتے اور دعائیں بھی کرتے۔ کچھ دنوں کا وقفہ ڈال کر میں بھی فون کرتا ہر بار ان کی بیگم آپا بشریٰ بیگم صاحبہ بتاتیں کہ اکثر پوچھتے ہیں کہ اس کا کیا حال ہے۔ طویل بیماری کے دوران ان کی بیگم صاحبہ نے جو رفیق حضرت مسیح موعود کی دختر ہیں کمال وفا اور محنت اور محبت سے ان کی خبر گیری کی حالانکہ موصوفہ خود ایک موذی مرض میں مبتلا ہیں۔ مکرم انور صاحب کی بیماری نے انہیں اپنی تکلیف بھلا رکھی تھی۔

پروفیسر انور صاحب مرحوم کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ میرے بھی دوست اور میری اولاد کے بھی دوست اور غم خوار اور اولاد کی اولاد کے بھی دوست اور بہی خواہ تھے۔ اسی قسم کا سلوک یہ عاجز راقم بھی اپنے دوستوں کی اولاد سے روا رکھتا ہے جس پر محترم جناب شیخ محمد اقبال صاحب پراچہ نے بے تکلفی میں ایک بار یہ نکتہ اٹھایا تو میں نے کہا کہ یہ درست ہے کہ دوستی تو ہم جولیوں اور عموماً ہم عمروں سے ہوتی ہے مگر سچا دوست وہی ہوتا ہے اور یہ حقیقی دوستی کی بڑی علامت ہے کہ دوست کی اولاد بلکہ اولاد در اولاد کے ساتھ بھی محبت کا سلوک رکھے۔

پروفیسر صاحب کی یہ تین پشتوں سے محبت بہت کام کی ثابت ہوئی آپ عمر بھر سیکرٹری تحریک جدید رہے۔ میرے اور میرے خاندان کے سارے چندہ جات کی وصولی آپ ہی کرتے تھے اور جس پیارے انداز سے چندوں کا بجٹ بناتے اور پھر خصوصاً نوعمروں کو اتنی شفقت اور محبت سے گویا ان کی انگلی پکڑ کر پٹری پر ڈال دیتے کہ قسمت اچھی ہو تو پھر یہ گاڑی تیز سے تیز ہوتی جاتی۔ اور وصولی کا طریق ایسا دلربا تھا کہ مثلاً ''میں'' رسید کاٹ دوں گا آپ جب چاہیں ادائیگی کر دیں''۔ اس قدر محبت اور ایثار کا اظہار کرتے کہ فوری ادائیگی کرنے پر ہر کہ ومہ آمادہ ہو جاتا۔

حکماء کہتے ہیں کہ محبت کرنے والے دل خاص ہوتے ہیں تو ٹھیک ہی ہو گا مگر جناب چوہدری صاحب کا تو خمیر ہی انکساری، دلنوازی اور

ایثاراور محبت کا مرکب تھا۔قریباً ہر روز اپنے ''اسلحہ'' سے مسلح ہو کر اور بکتر بند ہو کر اپنی ''ناقہ'' پر سوار ہو کر چندہ جات کی وصولی کی ڈیوٹی پر نکلتے اور ہنستے مسکراتے اپنے معین پروگرام کے مطابق گھروں میں جاتے اور ان کا آنا ہمیشہ خوشی اور مسرت کا موجب ہوتا۔ ''اسلحہ'' ان کا رجسٹر وعدہ جات اور رسید بک ہوتی تھی اور ان کا بائیسکل ان کی ''ناقہ'' تھی۔جس نے ان کی کارگزاری کو بھی گویا پہیے لگا دیئے تھے۔ چندوں کا بجٹ بنانے اور ان کی وصولی کا ہنر کوئی ان سے سیکھے۔بعض وہ لوگ جو اس فرض کی ادائیگی میں کمزور ہوتے اور نادہندگان میں شمار ہوتے تھے ان سے وصولی کا ایک ہی طریق ہوتا تھا کہ محترم انور صاحب کو بھجوایا جائے اور کسی ایک کا بھی مجھے علم نہیں جس نے ان کے مطالبے پر کبھی ''نہ'' کی ہو۔اور میں اللہ کے فضل اور رحمت سے یقین رکھتا ہوں کہ جو لوگ پروفیسر انور صاحب کی دستگیری سے چندہ ادا کرنے کی نیکی میں شامل ہو چکے ہیں اللہ تعالیٰ تا ابد اس کا بہتر صلہ پروفیسر صاحب مرحوم کو بھی دیتا رہے گا۔کہ اس کے ہاں کس چیز کی کمی ہے۔ چندہ وصول کرنے والے حضرات کا طریق محبانہ اور آبرومندانہ ہو نہ کہ آمرانہ۔تو دینے والا اللہ کی راہ میں بخوشی اپنے اموال کا حصہ پیش کر دیتا ہے۔ مجھے جناب ملک صاحب خان صاحب نون کا پرانا واقعہ یاد آیا کہ کسی مقامی عہدہ دار نے ان کو کہلا بھیجا کہ فلاں ضرورت کے لئے 200 روپیہ آپ بھجوا دیں۔ملک صاحب کو یہ انداز پسند نہ آیا اور مجھے ملے اس کا ذکر کیا فلاں شخص اس طرح چندہ مانگتا ہے جیسے لگان کی وصولی کسی بقایا دار سے کی جارہی ہے۔ میں نے اس پر محتاط رویہ اختیار کرتے ہوئے انہیں سمجھایا کہ بہتر تو یہی ہے کہ اس منصوبے پر جتنی رقم خرچ ہونی ہے وہ ساری آپ ہی ادا کریں۔کل خرچ 900 روپے کا تھا چنانچہ وہ فوراً آمادہ ہو گئے اور فوری طور پر رقم ادا بھی کر دی۔ہم نے بھی یہ سبق پرفیسر انور صاحب سے سیکھا ہوا تھا ورنہ ہمیں اتنی عقل و دانش کا دعویٰ ہرگز نہیں ہے۔

آخر میں محترم ڈاکٹر شمیم اے شیخ کے لئے دعا کی غرض سے یہ ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انہوں نے پروفیسر صاحب کی بیماری میں ہر آن ان کی خبر گیری اور علاج کا حق ادا کر دیا۔ حیرت ہوتی تھی کہ باوجود اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کے وہ کس طرح اتنے التزام کے ساتھ انہیں دیکھنے چلے جاتے تھے۔ یہ ان کا محبانہ سلوک ہم سے بھی بہت پرانا چلا آرہا ہے۔ جب اپنے محسنوں کے لئے دعا کی توفیق ملتی ہے تو جناب ڈاکٹر صاحب بھی یاد آتے ہیں۔

محترم پروفیسر صاحب کے علاج میں آخری سال ڈاکٹر محمود احمد صاحب شیخ بھی شامل ہو گئے اور بڑی ہمدردی کے ساتھ پیش آتے رہے۔اور وفات سے تین چار روز قبل تو صادق ہسپتال میں ہی انہیں داخل فرما کر علاج کرتے رہے گو موت کا تو کوئی علاج نہیں۔مگر آفرین ہے ان دو ماہر طبیبوں کی بے لوث خدمت پر۔ اللہ تعالیٰ پروفیسر مرحوم کو اپنے قرب کے اعلیٰ مقام میں جگہ دے اور ان کی بیگم صاحبہ محترمہ کو کامل شفا عطا فرمائے۔اور ڈاکٹر صاحبان کو اپنی جناب پاک سے بہترین اجر دے۔آمین یا ارحم الراحمین۔

(روزنامہ الفضل 4/جولائی 2003ء)

میرے ابا حضرت میاں عبدالعزیز صاحب نون
رفیق حضرت مسیح موعود

ماہ مئی میں میرے ابا کی وفات ہوئی میرے لئے یہ توارد دل خوش کن ہے کہ اس سے 45 سال قبل اسی ماہ میں قارئین الفضل کے اور خود میرے والد کے مرشد و پیشوا اللہ کے حضور حاضر ہوئے تھے۔ میرے والد کی وفات 9 رمئی 1953ء کو ہوئی۔ انہوں نے 1915ء میں وصیت کی تھی۔

مجھے والد صاحب نے جیسے تعلیم دلائی اور میری تربیت کی کوشش کی یہ ایک ایسی داستان ہے کہ گو شیریں ہے مگر اس کو بیان کرنے کے لئے کم از کم میرے آجکل کے حالات خصوصاً نامکمی دل کی اس قابل نہیں کہ اس بظاہر دلنواز مگر بباطن دل فگار کہانی کو قرطاس پر لاسکوں۔ نصف صدی کا عرصہ گزر چکا ہے اور اتنی طویل مدت زخم دل بھرنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ مگر گھاؤ اتنا گہرا ہے کہ چند دن اس پر کھرنڈ بن جانے کے بعد کسی معمولی سے واقعہ سے زخم دل پھر ہرا ہو جاتا ہے۔ میں بزرگوں اور دوستوں کا ذکر اذکروا موتا کم بالخیر کے نبوی ارشاد کے تحت کرتا رہا ہوں۔ گو ان میں سے بھی ہر ایک کا ذکر میرے قلب مہجور کے لئے کئی لحاظ سے مشکل بلکہ بعض دفعہ ناممکن بن جاتا ہے مگر میرے والد کے قرب جسمانی کے باعث ان کے ہجر کی چوٹ سب سے زیادہ محسوس ہوتی رہی اور یہی باعث بنتا رہا والد صاحب کے بارہ میں کچھ لکھنے میں التواء کا۔

میں اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا میری دو بہنیں تھیں جو اپنے اپنے سسرال سدھار چکی تھیں کیونکہ بہنوں کی عمریں مجھ سے بہت زیادہ تھیں وہ جوان تھیں جب میری ولادت سیدنا حضرت مصلح موعودؓ اور حضرت مولانا شیر علیؓ صاحب کی دعاؤں کے طفیل ہوئی تھی اس لئے گھر میں 1948ء تک میری والدہ مہربان اور والد صاحب دونوں موجود تھے۔ پھر 1948ء میں والدہ صاحبہ کی وفات کے بعد 1953ء تک کا عرصہ میرے ابا نے اکیلے تنہائیوں اور اداسیوں میں سلگتے ہی گزارا۔ جب میں ایل ایل بی فائنل کے امتحان کے لئے 4 دن بعد لاہور جانے والا تھا کہ ابا کی حادثاتی موت نے تو گویا مجھے ہلا کر رکھ دیا۔

اسی سے چاہیے ہے لو لگانی
کہ سب فانی ہیں پر وہ غیر فانی

آج کی یہ چند سطور میری طرف سے اپنے ابا کی روح کے حضور عقیدت کے پھول پیش کرنے کی حقیر جسارت ہے۔ شاید میرے ابا کی

روح کو اس سے سکون مل جائے۔ کہ جس بیٹے کی تعلیم وتربیت کی خاطر جدائی کی اذیتیں برداشت کیں۔ اب وہ ٹیڑھے میڑھے اور آڑے ترچھے چند لفظ لکھنے کے قابل تو ہو گیا ہے۔ میرے والد میرے لئے اولین یونیورسٹی ثابت ہوئے جن کے سایہ عاطفت میں میں نے اخلاق کریمانہ وعادات حسنہ کے وہ سبق سیکھے جوانہوں نے حضرت اقدس کے پاک اور مبارک اور نایاب لمس سے سیکھے تھے اور اس میں کیا شک ہے کہ ''وہ علوم'' ہی اصل علوم تھے۔

ہم باپ بیٹا تو تھے ہی ہمدم، ہمراز اور یک جان دوست بھی تھے۔ نہیں نہیں میں اپنے ''رفیق'' باپ کا عاشق تھا۔ اور ہر آن ان کی قربانیوں اور شفقتوں اور دعا کو یاد کر کے ان کی اطاعت میں اور خوشنودی کے حصول کے لئے کئی کئی جتن کرتا رہتا تھا۔ اللہ قادر کے فضل سے مجھ میں ہمت پڑ جاتی تھی کہ جان پر کھیل کر بازی جیت لیتا۔ اس اجمال کی تفصیل بیان کرنے میں خودستائی کا عنصر آ جائے گا۔ اس لئے اسے یہیں تک رہنے دینا مناسب ہے مگر اس تصریح کے ساتھ کہ اس میں میری کچھ بھی بقراطی نہیں تھی۔ میرے ابا کی مقبول دعائیں میری راہنمائی اور دستگیری کرتی تھیں اور فضل قادر ہمیشہ میرے ابا کی دعاؤں کے طفیل مجھ پر رحمت کا بادل بن کر سایہ فگن رہا اور اب تک آپ کی دعائیں میری طرف بڑھنے والی ہر بلا کو روک لیتی ہیں۔ اور یقین ہے کہ جب تک جیئوں گا اسی طرح فضل ربی میرا دفاع کرتا رہے گا۔ اور میرے والد اپنی دعاؤں پر ہی کب حصر کرتے تھے مسلسل سیدنا حضرت مصلح موعودؓ کی خدمت اقدس میں دعاؤں کے خطوط محترم جناب ماسٹر چوہدری محمد حیات صاحب پڑھیار (والد عزیزم چوہدری وسیم احمد صاحب S.E اور کرنل دلدار احمد صاحب) سے جو گویا ہمارے گھر کے معزز فرد ہی تھے لکھواتے تھے۔ جس کو کسی مصیبت میں گرفتار یا بیماری میں مبتلا دیکھتے اسے حضرت صاحب کی دعا کے لئے لکھنے کی تلقین کرتے اور یہ بار ہا ہوا کہ مستعدی کو اس کا مقصود مل گیا۔

مجھے ایک واقعہ اچھی طرح یاد ہے 1938/39ء میں ہمارے گاؤں کے چند زمینداروں کے خلاف مقدمہ قتل قائم ہوا اور انہیں سزائے موت اور عمر قید کی سزائیں سیشن کورٹ سرگودھا سے ہوئیں۔ ابا جان ملزمان کے ایک بھائی کو ملے اور اسے کہا کہ ایک روپیہ خرچ کرو تمہارے بھائیوں کی رہائی اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہو جائے گی۔ بات اس پر اعتمادی اور یقین راسخ سے کرتے تھے کہ سیدھی دل میں اتر جاتی تھی۔ مثلاً ایک روپیہ کا خرچ؟ اور اتنے سنگین مقدمہ سے سزایابی کے بعد رہائی؟ وہ حیران ہوا تو دوسرے ہی لمحے اسے کہا تین تین پیسے کے کارڈ لے لو سیدنا حضرت مصلح موعودؓ کو ہر تیسرے دن ایک ایک خط دعا کے لئے لکھو۔ اللہ نے چاہا تو دو ماہ میں تمہارا مقصد حاصل ہو جائے گا۔

شرط یہ ہے کہ اگر تمہارا مسئلہ تمہاری خواہش کے مطابق حل ہو گیا تو قادیان جانا دیکھنا۔ ماننا نہ ماننا تمہاری قسمت۔ ان کے گھر میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ ابا جان کو وہ راست باز اور صادق العہد تو یقین کرتے ہی تھے، اس سہل طریق کو اختیار کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

چنانچہ محترم چوہدری محمد حیات صاحب پڑھیار مذکور سے اس نے خط لکھوانے شروع کئے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے بھائیوں کو رہائی دے دی۔مگر وہ شخص معاہدے پر قائم نہ رہا اور ٹال مٹول کرتا رہا اور پھر وہ خاندان اللہ تعالیٰ کی گرفت میں ایسا آیا کہ الامان والحفیظ۔

نشاں کو دیکھ کر انکار کب تک پیش جائے گا

میں بات مرحوم والد صاحب کی بیعت کرنے سے شروع کرنا چاہتا تھا کہ تمہید ہی میں میرا قلم بہتا چلا گیا۔1903ء میں ابا جان نے بیعت کی تھی۔

بیعت کا واقعہ

میرے پڑ دادا جان حافظ غلام مصطفی صاحب حدیث کے عالم تھے۔ابا جان بتاتے تھے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل انہیں جانتے تھے اور فرماتے تھے کہ وہ حدیث کے ''متبحر'' عالم تھے۔جب چاند سورج کو گرہن رمضان شریف کے مہینے میں 1894ء میں لگا تو انہوں نے بتایا کہ یہ امام مہدی کے ظاہر ہونے کی علامت ہے۔اب امام مہدی ظاہر ہوگا مگر وہ جلد ہی فوت ہو گئے۔ہمارا گاؤں ہلال پور کور دیہہ تھا۔وہاں ڈاکخانہ نہ سڑک نہ ریل نہ اور کوئی رابطے کا سلسلہ وہاں دیر سے خبر پہنچی۔میرے دادا جان کا نام حافظ غلام محمد تھا۔جو بہت سخت گیر اور رعب والے تھے۔ابا کہتے تھے کہ اگر والد صاحب کبھی کہتے کہ عبدالعزیز میرے ساتھ آ کر کھانا کھاؤ تو مصیبت پڑ جاتی تھی۔بہر حال ابا جان نے اپنے والد صاحب سے سفر کی اجازت مانگی کہ میں کسی بزرگ کو ملنے جانا چاہتا ہوں۔دادا جان نے کہا کہ گولڑہ شریف چلے جاؤ۔انہوں نے سفر خرچ لیا اور عازم قادیان ہو گئے۔اپنے والد سے بول کر اختلافات کرنے کی تو توفیق نہیں تھی۔

پوچھتے پوچھتے قادیان پہنچ گئے اور حضور کی زیارت سے فیض یاب ہوئے۔حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل سے بھی ملے۔جو ہمارے خاندان سے بھیرہ کے ہونے کی وجہ سے پہلے سے واقف تھے۔والد صاحب کی نوعمری کا زمانہ تھا فرماتے تھے میں نماز بھی شاذ ہی پڑھتا تھا اور وہ بھی اپنے والد صاحب کے ڈر کے مارے۔میں نے اپنی اس کمزوری کا حضور سے ذکر کیا۔حضور نے دعا کرنے کا وعدہ فرمایا اور پھر مجھے نماز میں لذت آنا شروع ہوئی اور یہ تبدیلی حضرت مسیح موعودؑ کی دعائے مقبول کے صدقے واقعہ ہوئی۔

جب واپس آئے تو دادا جان نے پوچھا گولڑہ شریف سے ہو آئے ہو کہتے تھے اب ہمت اللہ تعالیٰ کے فضل سے اور حضرت مسیح موعودؑ کی قوت قدسی سے پیدا ہو چکی تھی۔انہوں نے صاف صاف بتا دیا کہ میں تو قادیان گیا تھا اور امام مہدی وہاں ظاہر ہوئے ہیں۔میرے دادا جان نے اپنی وفات سے پہلے انہی کی خبر دی تھی کہ ظاہر ہو چکے ہیں اور سورج چاند کو گرہن بھی لگ چکا ہے۔جو امام مہدی کی آمد کی علامت ہے۔اس پر ان کے والد صاحب کچھ برہم ہوئے اور جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی بھی دی مگر ابا اس کو خاطر میں نہ لائے کیونکہ انہوں نے تو اس نورانی چہرہ کو دیکھا تھا اور اس مبارک ہاتھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ان کے اندر اس پاکیزہ لمس سے ایسی

جرات ایمانی پیدا ہو چکی تھی کہ وہ اپنے آپ کو اس طرح مخاطب کرتے تھے۔

خوشی دے نال جھاگیں ہر غمی نوں
دلا وٹا نہ لاویں عاشقی نوں

میں نے بہت رفقاء کے حالات کا مطالعہ بھی کیا ہے اور 1944ء میں ٹی آئی کالج میں داخلے کے زمانے میں قادیان میں رفقاء کی تعداد بہت تھی۔ یہ جنس ہی کوئی مختلف تھی۔ بجلی کے پاور ہاؤس سے ان کا کنکشن ہوتے ہی بجلی کی روانی کے رگ وریشہ میں سرایت کر جاتی تھی جس سے اندر کی ساری میل کچیل صاف ہو کر ان کا سینہ آئینہ کی مانند شفاف ہو جاتا تھا اور اس میں عکس یار منعکس ہونا شروع ہو جاتا تھا اور جس پاور ہاؤس کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ کسی پیر فقیر یا سجادہ نشین کا نہیں بلکہ ماموز زمانہ کا تھا۔ اس کے ہاتھ نے جس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا وہ یکسر کوئی نیا انسان بن گیا۔ اس کی کایا پلٹ ہو گئی۔ عقل حیلہ تراش اور منطق گردن فراز کے سارے اسلوب عنقاء ہو گئے اور اس کی جگہ جذب وجنون اور وارفتگی نے لے لی۔ عقل کی پاسبانی سے چھٹکارا مل گیا اور عشق خدا بین کو اپنا راہنما بنالیا۔ اس موعود امام کو پا لینے کے بعد اب اصل یہ ٹھہرالیا کہ

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

الغرض سارے رفقاء اسی رنگ میں رنگین ہو جاتے رہے اور ایک عجیب مخلوق ہم نے دیکھی جو بظاہر زمین پر چلتے پھرتے تھے مگر وہ تو گویا کہیں آسمان پر بستے تھے۔ نہ انہیں دنیا والوں کے حملوں کا خوف نہ گھر بار سے بے دخل کر دینے کی دھمکیوں کا کوئی ڈر۔ وہ اگر اس راہ میں ستائے بھی جاتے تھے تو حمد اور شکر ادا کرتے تھے اور ان کے دل خوشیوں اور مسرتوں سے لبریز ہو جاتے تھے۔

حضرت مولوی برھان الدین صاحب جہلمی ؓ پر جب کسی نادان مائی نے ان کے سر پر کوڑا کرکٹ چھت سے پھینکا تھا تو وہ کہتے جاتے تھے ''مائی ہور پا'' ''مائی ہور پا'' جب ظالموں نے انہیں گرا کر ان کے منہ میں گوبر ٹھونسنا شروع کیا تو پھر بھی مست الست پڑے رہے اور کہتے جاتے تھے ''او برھانیا ایہہ نعمتاں فیر کتھوں'' نہ کوئی مخالفانہ ردِعمل نہ منت سماجت نہ چیخ نہ پکار بلکہ امام مہدی کو ماننے کے ''جرم'' میں اس گند اور غلاظت کو ''نعمتاں'' قرار دیتے تھے۔ ''مائی ہور پا'' اور ''او برھانیا ایہہ نعمتاں پھر کتھوں'' کے واقعات کوئی سنے تو کہے یہ پاگل پن ہے دیوانگی ہے۔ مگر دوستو اصل فرزانگی یہی ہے۔ یہ وہی آخرین ہیں جن کے اولین میں سے ایک کو جب غریب الوطنی میں دشمن نے نیزہ مار کر گرا دیا تو اس نے نعرہ مستانہ بلند کیا تھا۔ فزت برب الکعبة۔ اسے بھی دیکھنے والا حیران ہو گیا تھا کہ یہ عجیب انسان ہے کہ مر رہا ہے گھر سے دور نہ کوئی رشتہ دار پاس ہے نہ کوئی اس کا قصور اور کہتا ہے فزت برب الکعبة یہ خالصتاً آسمانی مخلوق تھی اور یہ ربانی گروہ تھا

اور یہ تبدیلی اہل اللہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بغیر پیدا ہی نہیں ہوسکتی۔ہم کہاں ان عاشقان ربی کے دل میں خودفراموشی اور عشق ووارفتگی کی کنہہ معلوم کرسکتے ہیں۔بیان کرنا تو بعد کی بات ہے خود عارف باللہ ہی کے زبان مبارک سے ان کا احوال سنیں فرماتے ہیں:

کچھ ایسے مست ہیں وہ رخ خوب یار سے
ڈرتے کبھی نہیں ہیں وہ دشمن کے وار سے
ان سے خدا کے کام سبھی معجزانہ ہیں
یہ اس لئے کہ عاشق یار یگانہ ہیں
جب دشمنوں کے ہاتھ سے وہ تنگ آتے ہیں
جب بد شعار لوگ انہیں کچھ ستاتے ہیں
تب وہ خدائے پاک نشان کو دکھاتا ہے
غیروں پہ اپنا رعب نشاں جماتا ہے
کہتا ہے یہ تو بندۂ عالی جناب ہے
مجھ سے لڑو اگر تمہیں لڑنے کی تاب ہے

ان اللہ والوں کا ذکر کرتے کرتے میں نہ قلم پر کنٹرول رکھ سکا اور نہ قلب وذہن پر میرا قابو رہا۔بات بڑھتی گئی لیکن اس دوران مسلسل طائر کی نگاہ اپنے نشیمن پر ہی رہی۔میں اب پھر اپنے والد صاحب کے بیعت کے ابتدائی ایام اور حالات کا کچھ ذکر کرتا ہوں ابّا بتاتے تھے۔

سارے گاؤں والوں کی ''کانفرنس'' ہوئی کہ ''مرزائیوں'' کا بائیکاٹ ایسا کیا جائے کہ یہ تنگ آکر ''مرزائیت'' کو ترک کردیں۔ایک ابّا احمدی تھے اور ایک کوئی سرکاری اہلکار غریب آدمی یہ دو آدمی بھرے گاؤں میں احمدی تھے۔

سب نے اس سرکاری اہلکار جو غالباً مدرّس تھے ان کا بائیکاٹ کرنے کے لئے اپنے اپنے سینوں پر ہاتھ مارے اور اس طرح بہادری کی فہرست میں اپنا نام درج کرانے اور تمغہ جیتنے کے اور ہر طرح تنگ کرنے کے دعوے کئے۔ابا کا ذکر آتا تو سب کہتے وہ ہمارے بس میں نہیں۔زمین اس کی اپنی مزارعین اس پر جان چھڑکتے ہیں۔معینان اس کے فدائی۔اسے ہماری کیا پرواہ ہے۔ساری رات منصوبے بنا بنا کر توڑتے رہے کچھ فیصلہ نہ کر پائے۔

مولانا محمد اسماعیل صاحبؓ ہلال پوری کا واقعہ بیعت

میرے والد صاحب بیعت کرکے آئے تو مولانا محمد اسماعیل صاحبؓ ہلال پوری جو میرے ابا کے دوست تھے۔وہ ابا سے پوچھتے کہ تم

نے قادیان میں کیا دیکھا اور کیا باتیں سنیں اور یہ انہیں بتاتے تھے کہ کس طرح حضرت صاحب سے ملے اور حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل سے ملاقات کی اور چونکہ حضرت مولوی صاحب اپنے والد مولانا محمد بخش صاحب سے بہت ڈرتے تھے۔اس لئے ان کی ملاقاتیں رات کو باہر جنگل میں ہوتی تھیں۔آخر ایک دن میاں حسن محمد صاحبؓ حضور کی تصنیف لطیف آئینہ کمالات اسلام لے کر اس بیت میں نماز عصر پڑھنے گئے جس میں حضرت مولوی محمد اسماعیل صاحب بھی نماز پڑھ رہے تھے۔انہوں نے آئینہ کمالات اسلام اپنے سامنے صف پر رکھ دی اور حضرت میاں حسن محمد صاحب کے نماز ختم کرنے سے پہلے ہی دو صفحات پر نظر ڈال کر کتاب وہیں رکھ دی۔چونکہ بہت تیز ذہن کے مالک اور زیرک انسان تھے اور ساتھ خوش نصیب بھی۔ان چند منٹوں میں ہی انہوں نے حق کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے والد صاحب کی خشمگی اور درشتی کا کچھ خیال نہ کیا اور اعلان کر دیا کہ میں بیعت کروں گا۔ان کے والد صاحب مولانا محمد بخش صاحب سخت ناراض ہو گئے کہتے تھے کہ ''عزیزو نے اسمٰعیلو نوں پٹ سٹیا'' چنانچہ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحبؓ نے اواخر اپریل 1908ء میں بیعت کی اور حضور کی وفات قریباً ایک ماہ بعد ہوئی۔بہر حال حضرت مولوی صاحب رفقاء کی صف میں شامل ہو گئے اور پھر حضرت مولانا نے بہت تیز رفتاری سے سلوک کی راہیں طے کر لیں اور بہتوں سے آگے نکل گئے اور اساتذہ کے بھی استاد بن گئے۔مگر وفا ایسی کہ آخری دم تک ہلال پور کی محبت کو بھی نہ بھولے اور میرے ابا کے ساتھ دوستی اور یک رنگی تو حضرت مولانا کی بے مثال تھی۔

واقعہ اشعث اغبر کا

میرے والد صاحب باوجود اس کے کہ معمولی پڑھے لکھے تھے۔حضور کی کتب اور الفضل باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔دعوت الی اللہ کا بڑا شوق تھا۔اس جذبہ وافر کو جنون کا ہی نام دیا جا سکتا ہے۔گھوڑے پر سواری کرتے تھے اور کتابیں زین پر رکھ کر دور و نزدیک لے جاتے اور لوگوں کو پڑھاتے تھے۔ساری کتابوں پر نشان زین کے پڑے ہوئے ہوتے تھے۔

ایک دن للیانی ضلع سرگودھا کے ایک نمبردار رئیس کے ہاں گئے پہلے بھی اس سے باتیں ہوتی رہتی تھیں۔کچھ تعلق بھی تھا۔چونکہ میرے ابا کے ننھیال کا گھران کے بالکل قریب تھا،اس لئے بہت آنا جانا تھا۔شادی غمی پر آتے جاتے تھے۔اب جو گئے تو اس کی شامت اعمال پورے ''جوبن'' پر تھی۔اس نے بلاوجہ حضرت اقدس کو گالیاں دینا شروع کیں۔ابا نے اسے سمجھایا کہ یہ بے ہودگی اچھی نہیں مجھے گالیاں دے لو۔اگر تمہیں دشنام طرازی کا دورہ پڑا ہوا ہے تو مگر اس پاک شخص کو گالیاں نہ دو۔اس پر وہ اور بھی بھڑکا۔تو ابا سخت غمزدہ ہو کر **لاتقعدوا معھم** کے ارشاد کی تعمیل میں وہاں سے اٹھ کر اپنے ننھیال کے گھر چلے گئے۔شام کا وقت تھا نماز پڑھی اور دیکھنے والے بتاتے تھے (اب تو آخری گواہ اس واقعہ کا برادرم چوہدری گل محمد بھی فوت ہو گیا ہے) رات کو باوجود اصرار کے کھانا نہ کھایا۔دودھ پیش کیا تو انکار کر دیا۔عشاء کی نماز کے بعد رنج وغم اور غصے سے پیلے ہو کر فرمانے لگے۔کہ فلاں شخص نے حضرت صاحب کی شان میں آج بہت بکواس

کی ہے جس سے مجھے سخت دکھ ہوا ہے۔ آٹھ دن کے اندر یہ شخص ہلاک ہوگا۔ گل محمد کہتا تھا کہ ہم حیران تھے کہ آج چچا جان کو اتنا دکھ پہنچا ہے کہ نہ کچھ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں یہ کیا ماجرا ہے۔ اتنا کہ کر رات گزار کر صبح اپنے گاؤں واپس آ گئے اور بھائی گل محمد غیر احمدی قسم کھا کر بتاتا تھا کہ عین اس کے ساتویں دن وہ رئیس حجامت کروا رہا تھا اس کے دارہ پر کچھ اور آدمی بھی بیٹھے تھے۔ اسے کسی شادی کی تقریب میں شرکت کے لئے کہیں جانا تھا۔ تانگہ تیار تھا کہ ایک شخص آیا اس کے ہاتھ میں ٹوکہ تھا اس نے بھری مجلس میں اس کی گردن پر دو وار کئے اور وہاں سے بھاگ گیا اور یہ رئیس تڑپ تڑپ کر وہیں مر گیا اور قاتل کا آج تک کوئی پتہ نہ چلا ایک ''اشعث اغبر'' نے جب اللہ کی قسم کھا کر اس کی ہلاکت کی خبر دی تو اللہ تعالیٰ نے وہ پوری کر دی۔ یہی اس کی مبارک سنت ہے۔ کاش لوگ عبرت حاصل کریں۔ حضرت مسیح موعودؑ فرما گئے تھے کہ

موت کی راہ سے ملے گی اب تو دیں کو کچھ مدد

اور حق یہ ہے کہ

دنیا میں گرچہ ہو گی سو قسم کی برائی
پاکوں کی ہتک کرنا سب سے برا یہی ہے

ایک فوجداری مقدمہ کا قیام

دیوی رتہ مل کپور ہمارا ایک مزارع ہوتا تھا۔ والد صاحب مزارعین اور ملازمین اور معینان کے ساتھ بڑی شفقت کا سلوک فرماتے تھے۔ اور وہ بھی سبھی والد صاحب کا بے حد ادب کرتے تھے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ آپکو یہ مقام تقویٰ اللہ کے باعث حاصل ہوا تھا۔ جو مسیح الزماں کی برکت سے آپ کو خاص محبت الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ ورنہ مالک زمین اور مزارعین کے اختلافات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ جو بعض دفعہ سنگین صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں مگر یہاں معاملہ ہی اور تھا۔ میں نے وہ مزارعین بھی دیکھے جو تین پشتوں سے ہماری اراضی کاشت کرتے چلے آ رہے تھے۔ چونکہ ابا مسلم اور غیر مسلم سب پر شفقت اور احسان کا سلوک روا رکھتے تھے۔ اس لئے وہ ہندو مزارعین دیوی رتہ مل بھی آپ کا بہت ادب کرتا تھا۔ اس کی بیٹی نوجوان تھی جو میری بہنوں کی ہم عمر تھی۔ ان کے ساتھ اس کا دوستانہ ہو گیا۔ میری بہنیں قرآن کریم گھر میں پڑھتی تھیں۔ وہ ہندو لڑکی بھی آ بیٹھتی تھی وہ بہت ذہین تھی اس نے بھی قرآن مجید ساتھ ہی پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے ماں باپ اور ایک بھائی سندر داس نامی تھا۔ وہ جانتے تھے مگر وہ ہمارے گھر آنے میں کبھی معترض نہیں ہوئے۔ چنانچہ اس نے کچھ عرصہ میں قرآن کریم ختم کر لیا۔ اس کی شادی کا فیصلہ چنیوٹ کے ایک بڑے سیٹھ کے بیٹے سے ہو چکا تھا۔ جب انہیں پتا چلا کہ یہ قرآن کریم پڑھ چکی ہے اور ہمارے گھر میں چونکہ احمدیت کا ماحول تھا اخبارات اور رسالے بھی آتے تھے۔ وہ بھی میری بہنوں کے

ساتھ پڑھتی رہی۔آخرایک دن اس نے میرے ابا سے کہا کہ میں تو احمدی ہونا چاہتی ہوں۔ یہ ہندومت اوراس کے ویداورانکی عبادات مجھے پسندنہیں۔اس پراس کے سسرال کوطیش آیااورانہوں نے ابا کے خلاف چنیوٹ میں پرچہ دے دیا۔وہ لڑکی تو ایمان پر بڑی مستقیم نکلی۔اس مقدمہ میں الزامات کی تفصیل کا تو مجھے علم نہیں مگرابا بتاتے تھے کہ وکیل ڈراتا تھا کہ مقدمہ بہت سنگین ہےاورلڑکی بھی موجود ہے۔جو ہندومذہب چھوڑ کراحمدیت میں داخل ہوئی ہےاور چنیوٹ کے سیٹھ بھی بڑی طاقت رکھتے تھےاورمجسٹریٹ بھی کٹر ہندو تھا۔مگرابا کوکبھی فکرنہ ہوا۔ہلال پور سے چنیوٹ 25 کوس کا فاصلہ ہمیشہ گھوڑے پر یہ سفر طے کرتے تھےاورآدھے فاصلے پرموضع لنگرمخدوم پڑتا تھا۔وہاں کے مخدوم شیرمحمد صاحب کے ہاں کبھی ٹھہر جاتے۔ان کے ساتھ دوستی ہوگئی تھی۔بعد میں مخدوم صاحب نے مستقل سکونت سرگودھامیں میری ہمسائیگی میں اختیارکرلی تھی اور پھرمیرے بھی بڑے محبت کرنے والے دوست بن گئے تھے۔

مجھےتو ابا کے میزبان رہنے کی وجہ سےان سے عقیدت تھی۔بہرحال وہ طویل مقدمہ چلا۔نہ باربار کے لمبے سفر نے کبھی والدصاحب کو پریشان کیانہ متوقع فیصلے سے کبھی گھبرائے۔ہاں سیدنا مصلح موعودؓ کوبرابردعا کی درخواست بھجواتے رہے۔آخرمقدمہ کے فیصلہ کادن آ گیا۔

ہفتہ کے روز تاریخ فیصلہ تھی اورقید سخت کی سزا کا خطرہ تھا۔اس سے پہلے جمعہ کے روز چنیوٹ پہنچےتو بیعت احمدیہ میں نماز جمعہ ادا کی۔چنداحمدی ہی اس زمانے میں چنیوٹ میں تھے۔اجنبی کودیکھ کرانہوں نے پوچھاتو بتایا کہ میں ہلال پورتھانہ مڈھ رانجھا کا رہنے والا ہوں۔کل میرے مقدمہ کا فیصلہ ہےدعا کریں۔حاضرین نماز جمعہ میں سے ایک غریب حجام تھااس نے تفصیل ابا سے الگ ہوکر پوچھی اوروعدہ کیا کہ کل احاطہ عدالت میں پھرتمہیں ملوں گا۔عرش الٰہی سے فیصلہ ہو چکا تھا۔اس معمولی سے ''تنکے'' کے ذریعے اللہ قادر کی تجلی ظاہر ہوئی اوراس نے ڈوبتی کشتی کو بچالیا۔وہ حجام ہفتہ کے روز صبح احاطہ کچہری میں پھرابا سے ملااور بتایا کہ انشاءاللہ تم بری ہوجاؤ گےاور پھرتفصیل سنائی کہ آج رات میں ہندومجسٹریٹ کے گھر گیااس کی حجامت بنایا کرتا ہوں۔رات کے وقت آنے پروہ حیران ہوا کہ تم اس وقت کیسے آئے ہو۔تواس نے کہاجی ضروری کام ہے کیا کام ہے۔وعدہ فرمائیں کہ کام کردیں گےتوعرض کروں گااورساتھ اس نے دلیل یہ دی کہ سیٹھ صاحب میں آپ کا جدی پشتی کمین تونہیں ہوں۔میں تو چارآنے لےکرآپ کی حجامت بناجاتا ہوں اس لئے میرادعویٰ یامان توآپ پراس طرح نہیں جس طرح جدی کمیوں کا ہوتا ہے۔مگرمیرایہ کام کردیں جب تک زندہ رہوں گا آپ کے لئے اورآپ کے اہل وعیال کے لئے اللہ کے حضوردعائیں کرتارہوں گااورساتھ وضاحت کی کہ یہ کوئی رسمی پیشکش اوررسمی رواجی دعانہیں ہوگی اورنہ ہی ہم اس قسم کی دعاکے قائل ہیں۔مجسٹریٹ نے کہا کہ اچھااگرمیں کرسکتاہواتوکردوں گا۔تواس حجام نے کہا کہ جناب قلم آپ کے ہاتھ میں ہے اگرمیرا کام کردیں توآپ کا کوئی کیابگاڑسکتا ہے۔بولوکیا کام ہےاس نے کہا کہ جناب میرے بھائی کا مقدمہ آپ کے پاس ہےاورکل فیصلہ ہے اسے بری کرانا ہےآپ کا کون سا بھائی؟ پہلےتو کبھی آپ نے ذکرنہیں کیا۔اس نے کہا کہ جناب مجھے آج ہی پتہ چلا ہے وہ ملزم ہیں

عبدالعزیز نون۔اس نے کہا تو نائی اور وہ نون؟ تھانہ مڈھ رانجھا کا؟ آپ کا بھائی کہاں سے ہے؟اس نے کہا جناب وہ بھی احمدی ہیں اور میں بھی احمدی ہوں۔ہم بھائی بھائی ہی ہوتے ہیں۔اس نے آگے سے مقدمہ کے مدعیوں کے اثر ورسوخ اور مقدمہ کی سنگینی کا ذکر کیا۔ اس نے کہا۔جناب آپ ماشاءاللہ خود بھی بڑے خاندانی آدمی ہیں۔یہ لالے آپ کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔بالآخر اس نے کہا کہ بہت اچھا میں اسے تمہاری خاطر بری کر دوں گا۔ابا نے یہ بات سنی سردی کا موسم تھا۔ہندو سیٹھ بڑی بڑی پگڑیوں والے مقدمہ کا فیصلہ سننے کے لئے بڑی تعداد میں کچہری آئے ہوئے تھے۔بہت دیر ہوگئی۔تو اکثر گھروں کو چلے گئے انہیں یقین تھا کہ مقدمہ کا فیصلہ ہمارے حق میں ہی ہو گا۔ایک آدمی کو مقرر کیا کہ تم ہمیں بتا دینا کہ کتنی سزائے قید ہوئی ہے۔آخر 4 بجے کے قریب سورج کی روشنی جب پیلی پڑ چکی تھی کہ ابا کو پکار ہوئی اور مجسٹریٹ نے کہا تمہیں بری کرتا ہوں۔سچ ہے

قدرت سے اپنی ذات کا دیتا ہے حق ثبوت
اس بے نشاں کی چہرہ نمائی یہی تو ہے

ابا کے مرشد کو مدتوں پہلے سے مژدہ سنا دیا گیا تھا کہ ’’آگ تیری غلام بلکہ تیرے غلاموں کی غلام ہے‘‘۔حضرت مسیح موعودؑ نے اپنے جان نثاروں کو جو سبق پڑھائے تھے۔ان میں اوّل نمبر خدائے قادر و یکتا پر یقین کامل اور اس کے سوا کسی سے نہ ڈرنے اور نہ جھکنے کا درس نمبر ایک کی حیثیت رکھتا ہے۔حضور کا اپنا احوال تو خالصتاً للٰہی رنگ رکھتا تھا اور حسب مراتب آپ کے متبعین خصوصاً رفقاء کرام نے بھی اپنے آقا و مطاع کی اتباع میں وہی روش اختیار کر لی تھی۔حضور فرماتے ہیں اور کس دلیری اور ایمان و ایقان سے لبریز ہو کر فرماتے ہیں۔

دلبر کی راہ میں یہ دل ڈرتا نہیں کسی سے
ہشیار ساری دنیا اک باولا یہی ہے

میرے والد صاحب کے تعلقات بلا تمیز مذہب و ملت دوستانہ اور مشفقانہ سب کے ساتھ تھے۔ہمارا منشی بھی ہندو تھا۔ہندو مزارع کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ہندو دوکانداروں کو مفت جگہیں دکانوں اور مکانوں کے لئے دی ہوئی تھیں۔وہ بھی مخلصانہ اور مودبانہ سلوک والد صاحب سے کرتے تھے۔اوپر چنیوٹ میں جس مقدمہ کا ذکر کیا ہے اس میں اوّل فریق تو دیوی رتہ مل تھا۔جس کی بیٹی احمدی ہوگئی تھی مگر اس نے اس پر بھی کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ پہلے جیسے تعلقات ہی رکھے۔

1942ء میں میری شادی ہوئی۔اپنی برادری میں دعوت طعام جس طرح عام لوگ دیا کرتے ہیں۔وہ تو ابا نے بھی اسی طرح کیا مگر اس میں گاؤں بلکہ شاید یہ علاقے کی تاریخ میں پہلی اور آخری بار یہ اضافہ والد صاحب نے کیا کہ سارے گاؤں میں جتنے ہندو تھے ان سب کی بھی ضیافت کی۔ملارام بڑا معتمد ابا جان کا ہوتا تھا۔اس سے مشورہ کیا کہ لوگ بلا استثناء گائے وغیرہ کا گوشت پکا کر تقسیم کرتے ہیں

ہم یہ ہرگز نہیں کریں گے۔ اور مڈھ رانجھا سے قصائیوں کو بکرے سپلائی کرنے کا ٹھیکہ دیا ہے۔ آپ چاہیں تو کچا راشن لے کر اپنے انتظام کے تحت ہندوؤں کے لئے کھانا پکوالیں اور ہندوؤں میں تقسیم کر دیں۔ ملا رام نے کہا جناب بکرے کا گوشت اور چینی کا حلوہ (عام طور پر لوگ شادیوں پر گڑ کا حلوہ پکاتے تھے) آپ نے بھی پکانا ہے اور اس میں ہمیں کیا اعتراض ہے۔ آپ کے گھر کا کھانا ہی کھائیں گے۔ چنانچہ اس نے ساری ہندو برادری سے مشورہ کر کے یہی فیصلہ کیا۔ ہر چند کہ وہ ایک انوکھا انتظام تھا کہ ہندوؤں کے گھروں میں یہ افراط کھانا بھجوایا گیا اور برادری کو بھی گویا اس نسخہ از بیاض مسیحا نوشتہ ایم ہی کی ایک ادنیٰ سی جھلک تھی۔ یہ بھی حضرت مسیح پاک کی تعلیم شفقت علی خلق اللہ اور رواداری کا ہی ایک محدود مظاہرہ تھا۔ حضور نے ایسی روشن مثالیں اس سلسلے میں قائم کی ہوئی تھیں کہ کیا لالہ ملاوامل اور کیا لالہ شرمپت بلکہ سبھی متعصب آریوں کی طرف سے مخالفانہ اور معاندانہ سلوک بار بار تجربہ کرنے کے باوجود حضور نے ان کے ساتھ وہ فیاضانہ سلوک روا رکھا کہ کوئی اور کب اس بارہ میں حضور کی گرد کو بھی پہنچ سکتا ہے۔

حضور کا یہ فرمان کہ ”دنیا میں میرا کوئی دشمن نہیں ہے میں بنی نوع انسان سے ایسی محبت کرتا ہوں کہ جیسے والدہ مہربان اپنے بچوں سے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر“ آب زر سے لکھنے کے لائق ہے اور حضور کا عمل حضور کے قول سے بھی بڑھ کر ارفع اخلاق کا نمونہ اور ایمان پرور رہا۔

میں نے جن رفقاء کرام کو دیکھا ان میں حضرت اقدس کی نورانی صفات کی جھلک علیٰ قدر مراتب کسی میں کم اور کسی میں زیادہ نظر آتی تھی اور انہیں دیکھ کر انسان یہ محسوس کرتا تھا کہ یہ بھی اسی گلستان کا پھول ہے اور اس سے زیادہ پڑھے لکھے ہونے کی شرط بھی نہیں تھی۔ کیونکہ یہاں ڈگری اصل چیز نہیں بلکہ پاکیزہ فکری اور تقویٰ اللہ کی دولت کا حصول اصل مقیاس ہے۔

بجا کہ میں اپنے ابا کا اکلوتا بیٹا تھا مگر پیار ایسی دولت ہے جو زیادہ بھی ہو تو تقسیم ہو کر کم نہیں ہو جاتی سخت ناشکری ہوگی اگر میں کسی قدر ذکر اس پیار اور محبت کا نہ کروں جو میرے والد صاحب کو مجھ سے تھا۔ سبھی باپ بچوں سے پیار کرتے ہیں۔ اس میں ہمارا باپ بیٹے کا تعلق کوئی استثنا نہیں مگر جس قدر میں نے ابا سے دعائیں لیں اور جس قدر ان دعاؤں کی کیفیت مجھ پر ظاہر ہو جاتی تھی۔ اس کا تذکرہ نہ کروں اور نقاب اوڑھے رکھوں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عنایات کریمانہ کی ناسپاسی ہوگی۔ میں اس خالق و مالک کا کس طرح شکر بجا لاؤں جس نے میرے باپ کے سینے میں رحمت اور حد درجہ شفقت اور ان کے رویہ میں ربوبیت بھر دی تھی۔ یہ تو ممکن ہے کہ کوئی کسی سمندر کے پاتال تک پہنچ جائے مگر کسی میں دم نہیں کہ میرے والد صاحب کے پیار کا پاتال پا سکے اگر میں یہ کہوں کہ میرا نیم خواندہ باپ میرے لئے آداب اور تربیت اور اخلاق حسنہ اور تعلیم کی یونیورسٹی تھے تو اس میں ہرگز کچھ مبالغہ نہیں۔ اس بے مثال درسگاہ کے اسباق اب تک نہیں بھولے اور وہی میرے علم کی بنیاد ہیں یہ تو ممکن ہے کہ انسان کسی کی خاطر دنیا کو فراموش کر سکے مگر میں نے تو اپنے والد صاحب کا مشاہدہ کیا کہ وہ مجھے پا کر اپنے آپ کو بھی فراموش کر بیٹھے تھے اور کم و بیش یہی حال میرا بھی تھا کہ ”رفیق“ اور شفیق باپ کو میں

نعمتِ عظمیٰ یقین کرتا تھا۔ ہمارے گاؤں کے باہر ایک میل تک ریت کے ٹیلے ہوتے تھے کوئی درخت نہ اوٹ۔ میں بھلوال سکول میں پڑھتا تھا۔ گھر سے روانہ ہوتا تو ابا ساتھ گاؤں سے باہر تشریف لاتے وہاں کھڑے ہو کر جب تک میں گھوڑے پر سوار ہو کر آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو جاتا تھا ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے رہتے تھے۔ لوگوں کو اس طرح دعاؤں کی لذت سے یکسر ناآشنائی تھی وہ حیران ہوتے تھے کہ میاں جی اتنی دیر تک منہ چھپا کر کیا پڑھ رہے ہیں اور جب دعا ختم کرتے تھے تو آپ کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگی ہوتی تھی اور یہ ہر ایک میرے سفر پر روانہ ہونے کے وقت لمبی اور پرسوز دعا سے رخصت کرنا آپ کا معمول تھا۔ نمازوں میں خصوصاً تہجد کی نماز میں کس قدر دعائیں کرتے ہوں گے وہ تو علیم وخبیر مالک الملک ہی جانے۔ اللہ تعالیٰ کو وہ آنسو بہت محبوب ہیں جو اللہ کے حضور کسی آنکھ سے بہہ پڑیں اور وہ ہاتھ جو اپنے رب کریم کے حضور پھیلائے جائیں وہی تکریم کے لائق ہے اور جتنا کوئی سمیع ومجیب کے حضور گڑ گڑائے قادر خدا اس کی حاجات کا خود کفیل ہو جاتا ہے اور بعض دفعہ جتنا بندہ مانگتا ہے اس سے بڑھ کر اسے ملتا ہے جتنی کوئی اللہ کے حضور جھولی پسارتا ہے اتنا وہ کریم ورحیم مولا بندہ سے پیار کرتا ہے مجھے یقین ہے کہ میں جو اب تک گزر اوقات کر رہا ہوں اور اتنی عمر میں بھی اللہ نے صحت وعافیت سے رکھا ہے اور ہمیشہ سرخروئی اور تائید سماوی اور نصرت عزیزہ سے نوازتا رہا ہے یہ وہی مناجات ہیں جو میرے ''رفیق'' والد صاحب نے میرے لئے خود کی تھیں اور سیدنا حضرت مصلح موعودؓ کی خدمت میں بھی بار بار درخواستیں کیں۔ ابا جان کی ان دعاؤں کا نظارہ آج بھی چشم تصور سے کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ بلا مبالغہ پندرہ بیس منٹ تک کھڑے ہو کر اللہ کے حضور میرے لئے زاری کر رہے ہیں تو اللہ کے فضلوں اور رحمتوں پر یقین بھی پیدا ہوتا ہے اور شدید احساس محرومی بھی کچوکے دیتا ہے اور بھر بلبلا کر پکار اٹھتا ہوں۔

کون میرے واسطے زاری کرے

در گہ ربی میں میرا جائے کون

تین خلفاء کرام کا مبارک دور میں نے دیکھا اور تینوں سے دعائیں لیں اور رفقاء کرام سے بھی۔

اب حضرت صاحبزادہ مرزا مسرور احمد صاحب ایدہ اللہ بنصرالعزیز کا عہد مبارک ہے۔ حضور کو قریباً ہر ہفتے فیکس کرتا ہوں اور دعا کی درخواست کرتا ہوں اور بھی بزرگ خصوصاً میرے ٹی آئی کالج کے اساتذہ بھی از راہ کرم میرے لئے دعائیں کرتے ہیں اور خاندان اقدس کی خواتین مبارکہ بھی اور یہی میرا اثاثہ ہے۔ اور انہیں بزرگوں کی دعاؤں کے طفیل میری زندگی کی گاڑی رینگ رہی ہے۔ **فجزا هم الله خيرا۔**

کاش ہم جو رفیق باپ کی اولاد ہیں۔ اسی طرح ہم بھی اللہ کے حضور گڑ گڑانا اور اسی در سے مانگنا اپنی عادت بنا لیں۔ کیونکہ وہ ودود رب کریم اس بندہ محتاج کو ضرور نوازتا ہے۔ جو غیروں سے منہ یکسر پھیر لے اور اسی کے در کا فقیر اور بھکاری بن جائے۔ مگر حالت یہ ہے

کہ ادھر رفقاء کرام کی عبادت گزاری، انکساری اور اضطراری کیفیات کو یاد کرتے ہیں۔ ادھر اپنی حالت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو بے اختیار پکار اٹھتے ہیں۔

خوش قسمتی پہ آپ کی کرتے ہیں رشک ہم
کہتے ہیں دل ہی دل میں یہ آنسو بہا بہا
یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالہء جرس کارواں رہے

1947ء میں تقسیم ملک کا اعلان ہوا۔ تو ہندوستان میں شر پسندوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا اور اس میں نہ بوڑھوں کو نہ عورتوں کو اور نہ بچوں کو بخشا گیا۔ اور درندگی کے وہ مظاہرے دیکھنے میں آئے کہ جس سے انسانیت شرم کے مارے منہ چھپاتی پھرتی تھی۔

میں تو ٹی آئی کالج میں پڑھتا تھا جو قادیان سے ہجرت کر کے لاہور آ چکا تھا۔ گھر میں میرے والد صاحب اکیلے تھے مگر اس علاقے میں بشمول نواحی ضلع گجرات کے بعض دیہات کے ہندوؤں کو جائے پناہ کی تلاش ہوئی۔ تو 150 کے قریب مرد و زن ہماری حویلی میں پناہ گزین ہوئے۔ کیونکہ انہیں ''رفیق'' حضرت اقدس کے علاوہ نہ کسی کی امان پر یقین تھا اور نہ انہیں کسی نے حملہ آوروں سے بچانے کی حامی بھری۔ بلکہ لوگ تو انہیں لوٹنے کے لئے موقعہ کی تلاش میں تھے۔ ہمارے گاؤں کے لوگوں کے دین میں بھی جوش پیدا ہوا یوں تو وہ کوئی مسلمان نہیں کر سکتے تھے اب موقعہ جانا کہ ان مجبوروں کو ڈرا دھمکا کر اپنے حلقہ میں شامل کر لیں اور مفت میں جنت کے وارث بن جائیں۔ کبھی چوہدری مانک بوسال کا اور کبھی کسی اور کا ہوّا کھڑا کر دیتے۔ کہ وہ ''لشکر'' لے کر آ رہا ہے اور سب کو تہ تیغ کر دے گا۔ عورتوں کو ساتھ لے جائے گا اور مردوں کو یہیں قتل کر دے گا۔ جب ان مجبوروں اور محصوروں نے ذلت اور موت آنکھوں کے سامنے دیکھ لی تو انہوں نے کہا۔ بہت اچھا ہم تمہارے دین پر آئے پھر ان کی روٹیاں پکانے کے لیے چندہ بصورت غلہ اکٹھا کرنے لگے (پہلے تو ہمارے ہاں سے کھانا کھا رہے تھے) مگر شرط یہ لگائی کہ بڑا گوشت کھلائیں گے تا کہ ان کے مسلمان ہونے کا ثبوت مل سکے۔

جب اس سازش کا والد صاحب کو پتہ چلا تو انہوں نے کہا بالکل نہیں اگر کھانا نہیں کھلاتے تو نہ کھلائیں بڑے گوشت والی شرط ناجائز ہے۔ بہر حال وہ لوگ تین چار ہفتے تک ہمارے ہاں رہے اور ابا نے مجھے سرگودھا بھیجا کہ افسران اعلیٰ کو کہہ کر انہیں ضلعی کیمپ میں منتقل کرا دیا جائے۔ کیونکہ گاؤں میں وہ لوگ خوف زدہ تھے یہاں شہر سرگودھا میں محترم چوہدری عزیز احمد صاحب باجوہ جج امیر جماعت تھے وہ میرے ہمراہ ڈی سی ہاؤس گئے اور ڈپٹی کمشنر کو کہا کہ یہ ایک نوجوان اور اس کا باپ اتنی تعداد میں لوگوں کو تین چار ہفتے سے پناہ دیئے ہوئے ہیں اور لوگ سخت جوش میں ہیں ان کا انخلا کرائیں۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد ان کے گھروں کو seal کر کے انہیں سرگودھا

کیمپوں میں پہنچا دیا گیا وہاں سے ان کی رخصتی کا نظارہ بھی بہت دل فگار تھا وہ ابا کو گلے مل مل کر زار و قطار روتے ہوئے رخصت ہوئے۔ یہاں شہر کیمپ میں بھی ان کا قیام کم و بیش ایک ماہ رہا۔ ابا انہیں ملنے سرگودھا آئے تو ایک ہندو نے کہا کہ میاں صاحب اگر نوازش کریں تو میرا سونا میرے ہندو رشتہ دار کے پاس موضع مٹیلہ میں پڑا ہے اگر وہ آپ لا سکے تو ہمارے لئے کچھ عرصہ کے لئے ان مصیبت کے دنوں میں اخراجات میں کفایت کر سکے گا۔

ابا جان کو مٹیلہ والے جانتے نہیں تھے مگر کیمپ والوں نے پیغام وغیرہ دیئے ابا جان مٹیلہ گئے اتفاق سے انہوں نے بھی اپنے رشتے داروں سے ابا جان کا نام سنا ہوا تھا اور ان کی دیانتداری کے قصے بھی ان کے ہندو رشتے داروں نے سنائے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک گٹھری میں سونے کے زیورات جو وزن میں کئی سیر تھے باندھ دیئے۔ ابا جان نے رات للیانی گزاری وہاں کے عزیزوں نے بہت اعتراض کیا کہ لاکھوں روپے کا مال آپ ہندوؤں کو دینے جا رہے ہیں۔ ابا نے کہا انہیں کی امانت ہیں انہیں واپس دوں گا خدا کرے کیمپ کے باہر فوج یا پولیس والے نہ روکیں نیت صاف ہو تو اللہ تعالیٰ مدد کرتا ہے سارے کا سارا سونا مالک کو دے دیا۔ ایک اور نے کہا کہ میاں جی آپ کو تکلیف تو ہو گی مگر مٹیلہ میں میرا سونا بھی پڑا ہے وہ بھی مٹیلہ سے لے کر سرگودھا کیمپ میں پہنچا دینا۔ ایک تو فطرتاً نیک نیت واقع ہوئے تھے اور دوسرے حضرت مصلح موعودؓ کا یہ فرمان بھی جاری ہو چکا تھا کہ یہاں سے جانے والوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور ہر قسم کی چھینا جھپٹی کو گناہ قرار دیا گیا تھا۔ یہ پچپن چھپن سال پرانا واقعہ ہے اور وہ بھی حضرت مسیح موعودؑ کے ایک غلام کا۔ آج تو یہ حالت ہے کہ۔

محتسب اب نہ وہ مے نہ وہ پینے والے
بند خود ہی درمیخانہ ہوا جاتا ہے

اور اگر ''حضرت شیخ'' کو اس واردات یعنی امانت کی ان کے مالکان کو پہنچانے کی بھنک پڑ جاتی تو نہ معلوم میرے والد صاحب پر کیا کیا فتویٰ داغے جاتے کیونکہ

فقیہ شہر سے اس کا جواز کیا پوچھیں
کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

بہر حال خیر گزری کسی کو انگشت نمائی کی توفیق ہی نہ ملی ویسے حق بات یہ ہے کہ ابا جان کو کسی کی مخالفت کی پرواہ بھی کم ہی ہوتی تھی۔

المختصر میں نے نہ صرف اپنے والد کو بلکہ جن بھی رفقاء کرام سے میرا واسطہ پڑا انہیں امانت و دیانت کا بہترین نمونہ اور اللہ تعالیٰ پر کامل توکل کرنے میں یکتا اور ہر کہ و مہ بر شفقت اور حسن و سلوک میں عدیم المثال قومی نسلی اور مذہبی ہر قسم کے تعصّبات سے یکسر پاک پایا۔

تقویٰ اللہ کی راہ میں قدم مارنے والے سب کے لئے محبت ہی محبت نفرت سے وہ ہمیشہ نفور رہتے ۔قادیان میں کالج کے زمانے میں حضرت مولانا شیر علی صاحبؓ تو میرے گویا گارڈین تھے۔انہیں بہت قریب سے دیکھا ان کی بے نفسی انکساری اور عبادت میں بے مثل ذوق وشوق اوراضطرار خلافت حقہ کی اطاعت اور چاکری......کیا کروں ان کی صفات حسنہ کا گنوانا میرے بس کی بات نہیں۔

پھر ربوہ میں حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ اور حضرت سید مختار احمد صاحبؓ شاہ جہان پوری سے بہت سے ملاقاتیں نصیب ہوئیں۔خط وکتابت بھی رہی ہر پھول کی دل موہ لینے والی خوشبو سونگھی اوردل وجان کو معطر کیا اوراس شیریں بیانی میں جب میں نے اپنے آپ کو بے بس پایا تو سیدنا حضرت مصلح موعودؓ کے پر معارف کلام میں پناہ لی۔حضور نے ان عشاق کا اس طرح نقشہ کھینچا تھا۔

بادۂ عرفاں سے تیری ان کے سر مخمور ہیں
جذبہ الفت سے تیرے ان کے دل معمور ہیں
ان کے سینوں سے اٹھا کرتے ہیں طوفان رات دن
وہ زمانہ بھر میں دیوانے تیرے مشہور ہیں
تیرے بندے اے خدا دنیا میں کچھ ایسے بھی ہیں

حکایت لذیز بود دراز تر گفتم والا معاملہ میرے ساتھ ہوا۔والد صاحب کے بارہ میں کچھ لکھتے ہوئے جذبات کی رو میں بہہ جانا میری مجبوری تھی جسے کچھ اہل دل ہی جانتے ہیں۔ چند منتشر واقعات ہی لکھے ہیں اور وہ بھی بے ترتیبی کے ساتھ کوئی مبسوط تحریر لکھنا تو میرے بس میں ہی نہیں تھا مگر

کتنی بے ربط تھی عشق کی گفتگو
جب مرتب ہوئی داستاں ہو گئی

قارئین کرام دعا کریں کہ میرے والد صاحب کو بھی جنت الفردوس میں رفقاء کرام کی معیت اپنے آقا حضرت مسیح پاک اوراپنے اور اپنے مرشد کے بھی امام ومطاع کے قرب میں جگہ عطا فرمائے اور مجھے اور میرے ابا کی اولاد اور اولاد در اولاد کو تا قیامت احمدیت کے ساتھ ان معنوں میں منسلک رکھے جن معنوں میں حضرت اقدس کا منشاء مبارک تھا۔ورنہ صرف نام احمدی رکھا لینے سے تو کام نہیں بنتا۔

ایں است کام دل اگر آید میسرم

(روزنامہ الفضل 15 رمئی 2004ء صفحہ 3 تا 4۔17 رمئی 2004ء صفحہ 3 تا 4)

۞۞۞۞۞۞۞۞۞



اے ناصرِ دیں تیری یادیں ہیں قلب ونظر کا سرمایہ

19 ویں صدی کے نصف آخر میں جب دین حق کا صرف نام ہی باقی رہ گیا اور اخلاقی زوال اور فکری انحطاط اپنے آخری نقطہ کو پہنچ گئے تو وعدوں کے مطابق مصلح ربانی کا ظہور ہوا۔ جس نے گویا ایک نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کر دیا۔ حضرت مہدی دوراں نے قریباً 30 سال تک اصلاح احوال کی ہر ممکن کوشش کی۔ حضور کے زبان مبارک سے وہ گہر ہائے گراں مایہ نکلے اور قلم الحدید نے وہ جوہر دکھائے کہ حضور نے عرش سے ''سلطان القلم'' کا اعزاز پایا اور اس نے ایک ایسا انقلاب پیدا کر دیا جس کی مثال از منہ سابقہ میں ماموران الٰہی کی جماعتوں میں ہی مل سکتی ہے۔ ایک جماعت پیدا کی جس نے اپنا سب کچھ دین حق کی راہ میں تج دیا اور اخلاق واعمال کی وہ نورانی مشعلیں روشن کیں کہ جن سے ایک عالم منور ہو گیا۔

انسانی زندگی کو دوام تو حاصل نہیں۔ ایک شخص کی طبعی زندگی میں ساری دنیا کو دین حق کی خوبیوں سے روشناس کرانے کا کام ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ حضور نے فرمایا کہ میرے جانے کے بعد دوسری قدرت ظاہر ہوگی جو دائمی ہوگی۔

چنانچہ خلفائے کرام کا سلسلہ 1908ء سے شروع ہوا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کا دور تو ہم نے 21، 22 سال تک شعور کی بلوغت کے زمانے میں دیکھا مگر حضور کے خداداد جمال وجلال کے سبب حضور کی پُرنور بارعب شخصیت اور ادب واحترام اور عقیدت کے باعث ایک فاصلہ رہا۔ حضور کے خداداد نور کے انتشار اور جذب وکشش کا یہ حال تھا کہ ؎

میں رعب حسن سے ساکت ہوں وہ فرط حیا سے مہر بلب
دونوں کو جھجک سی ہوتی ہے ، اظہار تمنا کون کرے

یوں دست بوسی کا شرف کئی بار حاصل کیا اور کچھ عرصہ تک بیت المبارک کی چھت پر مجلس عرفان کے دوران جسم اطہر کو دبانے کی سعادت بھی حاصل کی حضور کی مجلس سوال وجواب میں سوال پوچھنے کی جسارت بھی کی۔ مگر پھر بھی حسن بے مثال کے زیادہ قریب ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ سرگودھا میں ہمارے درمیان ایک ایسا بلند بخت وجود اب بھی موجود ہے۔ یعنی حضرت مرزا عبدالحق صاحب جنہوں نے قرب حضور کے جو مزے لوٹے اور جس جس طرح بہت نزدیک سے حضرت مصلح موعود کے حسن واحسان کے جلوے دیکھے اس کا ذکر ہم بھی گزشتہ نصف صدی سے سنتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ ایمان افروز بھی ہیں اور حضور کی شان ووفا کے شاہد بھی۔ مگر ایک خدا لگتی بات کہ حضرت مرزا عبدالحق صاحب نے بھی اپنے آقا کے رنگ میں رنگین ہونے کے لئے عمر بھر سعی کی۔ تفصیل کی گنجائش نہیں المختصر آقا بھی

عاشق قرآن اور یہ خادم بھی عشق ومحبت سے سرشار ہوکر 104 سال کی عمر میں بھی قرآن پڑھانے میں مصروف مگر یہ بھی ایک قلیل حصہ ہی اس راز و نیاز کا ہوسکتا ہے۔ ورنہ قلب ونظر پر ایسے ربانی اور چنیدہ شخص کے قریب رہنے سے جو کیفیت روحانی پیدا ہوتی ہے زبان کب اس کو بیان کرسکتی ہے اور قلم کو کب یارا ہے کہ وہ سب کچھ قرطاس پر بکھیر سکے۔ ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

اور بھی بہت سے سعید شخص گزرے ہیں جنہیں حضرت اقدس کی ہم نشینی کے خصوصی شرف حاصل ہوئے۔ میں نے صرف سرگودھا شہر کے ایک بلند نصیبے والے شخص کا ذکر بطور مشتے نمونہ از خروارے کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر وصحت میں برکت دے۔

حضور کی وفات 1965ء میں ہوئی تو سیّدنا حضرت مرزا ناصر احمد صاحب مسند خلافت پر فائز ہوئے۔ مجھے آج کی نشست میں حضور ہی کے ساتھ گزرے ہوئے شیریں حالات اور واقعات کا کچھ ذکر کرنا ہے۔ حضور کا زمانہ خلافت تو سترہ سال رہا مگر مجھے حضور کی ذات میں انسانیت اور روحانیت کی وہ بلند شان دیکھنا نصیب ہوئی جو نکھر کر جب 1965ء میں سامنے آئی تو پھر تو ایک عالم اس کا شاہد ہے۔ بلکہ مجھ سے بھی پہلے میرے ابّا نے جو حضرت مسیح موعود کے رفیق تھے، انہوں نے حضور کے تقدس کی خوشبو سونگھ لی اور تبھی تو مجھے 1944ء میں جب ٹی آئی کالج کا افتتاح ہوا تو مجھے مشورہ نہیں بلکہ حکم دیا کہ تم قادیان کالج میں داخلہ لو اور وہاں راست تربیت میں تعلیم حاصل کرو ورنہ گورنمنٹ کالج شاہ پور اور زمیندارہ کالج گجرات کی اچھی شہرت اس زمانے میں تھی اور یہ قریب بھی تھے۔ مگر ان درسگاہوں کا تو دل سے خیال ہی نکل گیا۔ بیت نور کے عقب میں ہمارا ہوسٹل تھا جس کی بلڈنگ پختہ بھی نہیں تھی مگر ہمیں جو قلبی اطمینان اور سکون وہاں نصیب ہوا اور جو علمی اور روحانی اسباق ہم نے اس ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ استاذی المحترم جناب پروفیسر چوہدری محمد علی صاحب سے پڑھے وہ وقتی نہیں تھے۔ نہ صرف کالج کی تعلیم کے دوران وہ کام آئے بلکہ اب تک شعوری اور غیر شعوری طور پر وہ ہمیں فائدہ پہنچا رہے ہیں۔

قادر کریم ہمارے اس خیر خواہ حقیقی عالم بے بدل اور مربی استاد کی عمر اور صحت میں برکت بخشے اور سارے طلباء کی طرف سے ان کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ میں ابھی ہوسٹل کی بات کر رہا ہوں ورنہ جملہ اساتذہ کرام اعلیٰ صفات کے حامل تھے اور بہت بلند علمی اور ادبی مراتب رکھتے تھے۔ میری دانست میں اب جناب ڈاکٹر پروفیسر سلطان محمود صاحب شاہد ہی زندہ ہیں۔ اگرچہ میں براہ راست ان کا طالبعلم نہیں تھا مگر ان کی بزرگی اور خاموش تربیت سے اکتساب فیض ضرور کیا اور اب تک ان دونوں بزرگ اساتذہ کی دعاؤں سے مستفیض ہو رہا ہوں۔ میرا یہ شذرہ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب کی سیرت نگاری کی کاوش نہیں ہے۔ ابھی حال ہی میں عزیزم محمود مجیب اصغر صاحب انجینئر نے ''حیات ناصر'' کی ایک جلد مرتب کی ہے۔ دوسری جلد بھی چھپے تو کچھ سیری ہو۔ مگر وہ شخص اتنا عظیم تھا اور ایسا محسن کہ ان کے خصائل اور حسنات کے متعلق بہت کچھ لکھا جاتا رہے گا۔ اپنی تو یہ حالت ہے کہ حضور کی وفات کو 22 سال گزر جانے کے باوجود نہ

اُنہیں کبھی صبح بھول سکا نہ شام کو۔ ایسے نابغہ روزگار دس بیس کے نہیں سینکڑوں کے بھی نہیں لاکھوں کے محبوب اور محب ہوتے ہیں۔ اس میں میری یا کسی اور کی کوئی اجارہ داری ہرگز نہیں لیکن تحدیث نعمت کے طور پر یہ لکھنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں کہ میں بھی حضور کی توجہات کریمانہ اور الطاف خسروانہ کا مورد رہا۔ نہ کسی میری خوبی کی وجہ سے بلکہ محض حضور کی کمترنوازی کے باعث۔ میں تو حضور کے گھر کا گویا ایک ادنیٰ چاکر تھا اور یہی میرا فخر ہے۔ قادیان میں ہوتے تھے تو میں نے یہ محسوس کیا کہ تین ہم عمر بھائی یعنی حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب، حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب اور حضرت صاحبزادہ مرزا مظفر احمد صاحب ایک مثلث کے تین زاویے تھے اور جن کا باہمی پیوند بہت مضبوط تھا۔

مؤخرالذکر صاحبزادہ صاحب تو ICS کر کے سرکاری اعلیٰ ملازمت میں چلے گئے۔ باقی دونوں بھائی یک جان وقالب بن کر قادیان میں ہی رہے۔ بھائی بھائی تو تھے ہی ہم عمری بھی اٹوٹ جوڑ کا باعث بن گئی تھی۔ راقم کا تعارف حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب کے ذریعے حضرت مرزا منصور احمد صاحب سے ہوا اور طویل ہم نشینی کا انمول موقع حضرت چوہدری فتح محمد صاحب سیال کے الیکشن نے مہیا کر دیا۔ وہ اس طرح کہ یہ دونوں بھائی اس مہم کے انچارج تھے اور ایک سیاہ رنگ کی چھوٹی سی کاران کے پاس ہوتی تھی۔ فرنٹ سیٹوں پر یہ دونوں برادران کرام اور عقبی سیٹ پر یہ خادم، حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب کا بھاری بھرکم اوورکوٹ سنبھالے جس کی وسیع وعریض جیبیں ڈرائی فروٹ سے لبالب بھری ہوتی تھیں۔ جب وہ ڈرائی فروٹ سپلائی کرنے کا ارشاد ہوتا تو میں مٹھی بھر کر پیش کرتا اور پھر مجھے بھی اس خوان یغما میں شمولیت کا حکم ہوتا جس کی تعمیل لازم ہوتی۔ یہ دورہ جات قادیان کے نواح میں قریباً 4، 5 ہفتے چلتے رہے اور ہم کو **نوامع الصادقین** کے اعزاز سے مشرف ہوتے رہے۔ ان دو بھائیوں کی وفات سے محسوس ہوا کہ مہجوری کا زمانہ کتنا صبر آزما اور کٹھن ہوتا ہے۔ آزاد صاحب کے ان اشعار میں معلوم ہوتا ہے انہی دو بھائیوں کی مقدس جوڑی ہی کا ذکر ہے۔ ؎

اک دور میں چمکے تھے دو پیکر نورانی
اور تو نے بجھا ڈالے اے موج ہوا دونوں
اک رنگ گلستان تھا اک بوئے گلستان تھا
ہر بات میں رکھتے تھے پھولوں کی ادا دونوں
تزئین گلستان تھے سامان بہاراں تھے
جو پھول چنے تو نے اے دستِ قضا دونوں

ہم لاہور مہاجر بن کر آئے یعنی ہمارا کالج اور ہوسٹل لاہور میں نہر کے کنارے مویشیوں کی ایک حویلی نما کوٹھی میں تھا۔ صفوں پر ہم بیٹھ

جاتے تھے اور اساتذہ کرام وہاں جو ٹوٹی پھوٹی چار پائیاں تھیں ان پر بیٹھ کر لیکچر دے دیتے۔ وہی صفیں نماز پڑھنے کے لئے اور انہی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ مگر ایسی بے بسی اور بے بضاعتی میں بھی جب حضرت صاحبزادہ صاحب (پرنسپل صاحب) تشریف لاتے تو ہمیں اس خاک نشینی میں بھی ہمدوش ثریا ہو جانے کا قرار واقعی احساس ہوتا تھا۔ کبھی نگاہ اپنی محرومیوں اور نارسائیوں کی طرف نہ گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے گھپ اندھیرے میں رنگ و نور کی مشعلیں روشن ہو گئی ہوں۔ پھر کچھ عرصے بعد ہمارے کالج کو D.A.V کالج کی نیم شکستہ بلڈنگ ملی۔ مگر یہ راز اسی زمانے میں منکشف ہوا کہ رونقیں بلند و بالا عمارات سے وابستہ نہیں۔ یہ ربانی لوگوں کے انتشار نور کی محتاج ہوتی ہیں۔

انہی دنوں ایک دن حضرت صاحبزادہ صاحب نے فرمایا آج سہ پہر شکار پر جانا ہے تو میرے ساتھ جاؤ گے مجھے جب ہمرکابی کا حکم ملتا تو میں اپنے نصیبے پر نازاں اور شاداں ہوتا تھا۔ چنانچہ میں حضور کی شاٹ گن کارتوس سنبھالے کار کی عقبی سیٹ پر تھا اور حضور دریائے راوی کے جانب چل رہے تھے۔ راوی کے پل پر ایک نوجوان منتظر کھڑا تھا۔ اسے ساتھ بٹھایا کہ وہ شکاری تھا اور شکارگاہ کی نشاندہی کرنے ساتھ چلا۔ 10 میل 20 میل گزر گئے اور اس نے 8، 10 میل دریائے راوی سے دور شکارگاہ بتائی تھی۔ مگر کوئی نام و نشان شکارگاہ کا نہ ملا۔ وہ بھی کھویا کھویا سا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ حضور مرید کے پہنچنے والے ہیں اور اس کی حیرانی و پریشانی سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے کچھ پتہ نہیں۔ آخر حضور نے کار روکی اور اس نے ادھر اُدھر گھورنا شروع کیا اور حضرت صاحب جان گئے کہ یہ غالباً بھول گیا ہے۔ واپسی کا سفر اختیار کیا اور پل راوی پر اسے اتار کر مجھے اس زمانے کے لحاظ سے اچھی بھلی رقم دی کہ اسے دو اور وہ خوشی سے چھلانگیں لگاتا ہوا اپنی ڈھاری کی طرف چلا گیا۔

پھر جب 1953ء کی تحریک زوروں پر تھی تو حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد صاحب اور حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب کی گرفتاری میری ناقص رائے میں غیروں کی گرفتاریوں کے ساتھ عدل و انصاف کا توازن ظاہر کرنے کے لئے عمل میں آئی۔ اس سے جماعت احمدیہ کی پریشانی کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ جیل خانہ لاہور کی معروف سڑک جیل روڈ پر ہوتا تھا اور سپرنٹنڈنٹ جیل مہر محمد حیات صاحب ضلع سرگودھا کے رہنے والے تھے۔ میں انہیں ملا اور اپنے ان دونوں سرداروں کے پسِ زنداں ہونے کا واقعہ بتا کر اس سے ان کی ہر قسم کی خدمت اور سہولت کا وعدہ لیا۔ وہ اس وقت تو مجھے ضلع سرگودھا کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ہی جانتے تھے۔ بعد میں کچھ رشتہ داری بھی قائم ہو گئی۔ اس کا ردعمل یہ تھا کہ وہاں ''دو شہزادے'' آئے ہوئے ہیں اور کہ میں ہر لحاظ سے خیال رکھتا ہوں۔

سیّدہ حضرت نواب مبارکہ بیگم صاحبہ نے اس سانحہ کے موقع پر چند شعر کہے تھے جن میں سے ایک کچھ یوں تھا ؂

چلاؤ کوئی جا کے مزار مسیح پر

نصرت جہاں کے گود کے پالوں کو لے گئے

یعنی حضرت مرزا شریف احمد صاحب تو سیّدہ حضرت اماں جان کے بیٹے تھے اور حضرت نافلہ موعود بھی چونکہ حضرت اماں جان کے ہاں ہی بچپن سے پلے تھے اور بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ اس لئے دونوں کو حضرت سیّدہ نصرت جہاں کے گود کے پالوں کو لے گئے۔

گرمی کا موسم تھا حضرت مصلح موعود ربوہ میں تھے۔ سخت گرمی کے موسم میں عشاء کے وقت حضرت سیّدہ مہر آپا صاحبہ نے سخت گرمی کا ذکر چھیڑا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ ہمارے محبوسین کا جیل میں کیا حال ہوگا۔ نا معلوم انہیں پنکھے وغیرہ کی سہولت بھی ملی ہوئی ہے یا نہیں۔ حضرت مصلح موعود سے زیادہ کس کو فکر تھا۔ اس پر آپ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے۔ وہ صرف اس جرم میں ماخوذ ہیں کہ ان کا کوئی جرم نہیں۔ اس لئے مجھے اپنے خدا پر کامل یقین و ایمان ہے کہ وہ جلد ہی ان پر فضل کرے گا۔''

سیّدہ حضرت مہر آپا کا بیان ہے کہ

''اس پر آپ کے چہرہ کا رنگ بدل گیا اور آپ نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ گریہ وزاری کا وہ منظر میں نہیں بھول سکتی۔ میں اس کیفیت کو قلم بند نہیں کر سکتی۔ جو اس وقت میری آنکھوں نے دیکھا۔ اس گریہ میں تڑپ اور بے قراری تھی۔''

''یہی منظر پھر میں نے تہجد کے وقت دیکھا۔ اس وقت حضرت مصلح موعود بلند آواز سے نہایت عجز و رقت کے ساتھ کچھ مانگ رہے تھے۔ اس نالہ وشیون نے مجھ میں ایک ایسا ایمان و یقین پیدا کر دیا کہ میں برملا کہنے لگی کہ یہ دعا رائیگاں انشاءاللہ نہیں جائے گی۔ اس نے تو عرش کے پائے ہلا دیئے ہوں گے ضرور دن چڑھتے چڑھتے اللہ تعالیٰ نوید سنائے گا۔ چنانچہ جب دن چڑھا اور ڈاک کا وقت آیا تو پہلا تار جو ملا وہ یہ خوشخبری لئے ہوئے تھا کہ حضرت میاں صاحب اور عزیز محترم میاں ناصر احمد صاحب رہا ہو چکے ہیں۔''

اسی دوران ہمیں مسلسل یہ خبریں ملتی تھیں کہ یہ دونوں بزرگ اندر جیل میں نہایت اطمینان سے رہ رہے ہیں اور دیگر گرفتاران بلا کے لئے بھی حوصلے اور ڈھارس کا موجب بنے ہوئے ہیں جیل میں جا کر ان کی صفات حسنہ اور اعلیٰ خصائل و اخلاق اور بلند حوصلگی کے وہ مظاہرے ان کے اصحاب السجن نے دیکھے کہ وہ حیران ہوتے۔ ان کے خداداد حوصلے اور توکل علی اللہ پر۔ آلام و مصائب تو زندگی کا لازمہ ہیں عام آدمی ایسے میں بے خود ہو جاتا ہے اور گھبراہٹ میں پل پل دل گھٹتا ہے لیکن ایک سچا مومن اللہ پر توکل کے زور پر ہر غم کو زندگی کا محرم بنا لیتا ہے اور اس الٰہی حکم کا آرزومند رہتا ہے کہ ہر دکھ کے بعد سکھ آئے گا۔

جہاں ان دونوں بزرگوں کے ایمان و ایقان اور حوصلہ اور شجاعت اور صبر کے اوصاف ظاہر ہوئے وہاں حضرت مصلح موعود کی دعائے مستجاب کے نظارے بھی دیکھے۔ انہی دنوں حضرت مصلح موعود کی ایک نظم شائع ہوئی تھی جس میں ایک طرف مظالم کا نقشہ بھی تھا۔ پھر اپنے

قادر وتوانا مالک الملک پر ناز اور ناز برداری کی کیفیات بھی تھیں۔فرمایا:

طوفان کے بعد اٹھتے چلے آئے طوفان
لگنے کو نہیں آتی مری کشتی کنارے
گر زندگی دینی ہے تو دے ہاتھ سے اپنے
کیا جینا ہے یہ جیتے ہیں غیروں کے سہارے

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی دریا کا طوفان فراعین کے لئے موجب غرقابی اور مثیل موسیٰ کے لئے سفینۂ نوح بن گیا۔ پہلے تو آپ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب تھے کالج کے پرنسپل تھے۔سیّدنا حضرت مصلح موعود کے فرزند تھے۔موعود نافلہ تھے اور اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ۔مگر پھر اچانک آپ کی زندگی میں الٰہی نوشتوں کے مطابق ایک زریں انقلاب آ گیا اور آپ مسند خلافت ثالثہ پر متمکن ہو گئے۔نہ معلوم شاعر نے کس موقعہ پر یہ شعر کہے تھے مگر میں نے تو اپنے آقا کی نسبت انہیں حق جانا ؎

چپکے چپکے شباب ان پہ آ ہی گیا
رفتہ رفتہ زمیں آسمان ہو گئی
اس طرف حسن میں اک اضافہ ہوا
اس طرف اک تمنا جواں ہو گئی

ابھی آپ پرنسپل کالج ہی تھے کہ آپ انصاراللہ کے اجلاس میں صدارت کے لئے سرگودھا تشریف لائے۔حضرت امیر صاحب نے ایک شام ہمیں بتایا کہ سہ پہر کی چائے کے وقت اگر کوئی آپ میں سے حضرت صاحبزادہ صاحب کو دعوت دے کر منالے تو میری طرف سے اجازت ہے چنانچہ میں نے فون پر اسی شام درخواست کر دی اور جب حضرت امیر صاحب کی رضامندی بھی عرض کر دی تو فرمایا مجھے تمہارے گھر آنے میں کیا اعتراض ہے چنانچہ 50/ 55 معززین (غیر از جماعت) میں نے مدعو کئے ہوئے تھے جنہوں نے آپ کا میرے گھر استقبال کیا حضرت امیر صاحب اور احمدی حضرات تو میزبان ہی تھے۔پھر میری قسمت کہ سیّدنا حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب بھی خلافت سے تھوڑا عرصہ قبل سوال و جواب کی محفل برپا کرنے میرے ہاں تشریف لائے۔صاحبزادہ مرزا لقمان احمد صاحب بھی ہمراہ تھے۔

بیماری بھی بعض دفعہ اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کا نشان بن جاتی ہے۔میں عارضہ قلب میں مبتلا ہوا تو اس وقت کے ناظر اعلیٰ اور آج کے میرے پیرومرشد حضرت صاحبزادہ مرزا مسرور احمد صاحب خلیفۃ المسیح الخامس مع حضرت سیّدہ بیگم صاحبہ بغیر پیشگی اطلاع دیئے میرا

حال پوچھنے تشریف لائے۔حق یہ ہے کہ مندرجہ بالا تینوں مواقع میرے لئے خوشیوں اور مسرتوں کے ابدی پیغام لائے تھے اور اگر میں یہ کہوں کہ ان تینوں خلفائے کرام کے میرے گھر قدم رنجہ فرمانے سے عید کی خوشیوں سے فزوں تر مجھے خوشی ہوئی تھی تو ہرگز یہ مبالغہ نہیں ہے۔

حضرت مہدی کے راج دلارے جو تینوں بعد میں مسیح پاک کے نائبین اور خلفاء مقرر ہوئے اور مجھ ناچیز کا گھر۔ مجھے تو کوئی بھی نسبت تلاش کرنے کے باوجود نہیں ملی۔اللہ انہیں اس بندہ نوازی کا اجر دے۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اور یہ میں واضح کردوں کہ اس شرف کا (تین خلفائے کرام کا میرے گھر آنے کا) میں کسی طرح مستحق نہ تھا۔ یہ مقدس خاندان بڑا ہی باوفا اور ذرہ نواز ہے جس کا ہاتھ تھامتے ہیں۔خواہ وہ کتنا ہی کمتر ہو اسے چھوڑتے نہیں ہیں۔ پھر خلفاء کا مقام تو ادراک سے بھی بالا ہے۔ یہ مسند خلافت پر متمکن ہونے سے پہلے بھی اللہ علیم وخبیر کی نگہ میں ہوتے ہیں اور منتخب ہوکر تو گویا اللہ کی مٹھی میں آجاتے ہیں۔

حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب احمد نگر اور نصرت آباد کی زمینوں پر تشریف لے جایا کرتے تو حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب اکثر و بیشتر ہمراہ ہوتے۔اگر صاحبزادہ مرزا منیر احمد صاحب جہلم سے آئے ہوئے ہوتے تو انہیں بھی ساتھ جانے کا ارشاد ہوتا۔اس عاجز کو بھی زمینوں کے ہر دورے پر ہمراہ رکھا۔ یہ طویل ہم نشینی اور ہمرکابی اس پاک نفس کے ساتھ کیا عجب کہ میری مغفرت کا موجب بن جائے۔قول صادق المرء مع من احب بھی میرا دل بڑھاتا ہے۔ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ نصرت آباد کی زمینوں پر 25، 30 آدمی ایک وٹ پر قطار میں چل رہے تھے سب سے آگے حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر عرض کیا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ حارث حراث و علی مقدمة رجل یقال له المنصور۔اس حدیث نبوی کی ایک معنوی تصویر یہاں بھی نظر آرہی ہے۔

ایک دفعہ حضرت صاحب یورپ کے دورہ پر تیار تھے۔ پروگرام تفصیلی طے ہو چکے تھے کہ ربوہ میں ایک قضائی تنازعہ پیدا ہوا۔جس نے حضور کی توجہ اپنی طرف کھینچی۔حضور اسے بغیر تصفیہ کے چھوڑ کر بھی نہیں جاسکتے تھے۔مشورہ کے لئے حضرت مرزا عبدالحق صاحب اور حضرت ملک سیف الرحمان صاحب کو حضور نے طلب فرمایا اور ساتھ مجھے بھی حاضری کا حکم ملا۔میری تو کوئی حیثیت نہیں تھی۔ بہرحال تعمیل ارشاد میں مَیں بھی شامل ہوگیا۔حضور نے پیش آمدہ قضائی تنازعہ کے بارہ میں دونوں بزرگوں سے استفسار فرمایا۔دونوں کی رائے یہ تھی کہ کم از کم مدعا علیہ کی اطلاع یابی لازمی ہے۔اس کے بغیر قضاء کچھ نہیں کرسکتی۔

حضور نے فرمایا اسے نوٹس بھجوائے گئے ہیں۔مگر وہ تعمیل کرنے سے مسلسل انکار کرتا رہا ہے۔جس روز ہماری میٹنگ ہوئی اس روز میں نے حضور سے عرض کیا کہ مجھے مدعا علیہ کی اطلاع یابی پر مامور فرمایا جاوے۔اوّل تو حضور نے فرمایا تم کہاں سے ڈھونڈو گے۔میں نے ادب سے بلکہ لجاجت سے عرض کیا کہ حضور میں تلاش کرلوں گا اور امید ہے انہیں مل پاؤں گا۔

چنانچہ حضور نے مجھے اس کے نوٹس دستی دفتر سے دلوائے۔دو دن بعد قضاء میں تاریخ تھی۔میں شام کو سرگودھا پہنچا۔رات بھر بارش ہوتی رہی۔مدعا علیہ کے بارہ میں پتہ چلا کہ وہ چک 35 شمالی میں کسی شادی کی تقریب میں شامل ہے۔یہ چک سرگودھا سے 5/6 میل جانب شمال مشرق کچے راستے پر تھا۔جہاں موٹر تو جا نہیں سکتی تھی۔میں گھوڑے پر سوار ہوکر چک 35 شمالی پہنچا۔وہاں سے پتہ چلا کہ ضلع خوشاب کے موضع بجار میں کسی ڈیرہ پر گئے ہوئے ہیں اور دو روز بعد واپس آئیں گے۔ ؎

چل پڑا ہوں شوق بے پرواہ کو مرشد مان کر
راستہ پُر پیچ ہے یا پُرخطر جیسا بھی ہے

میں تلاش کرتا کرتا بجار کے نواح میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ قریباً ایک کلومیٹر پیچھے ایک کچے راستے پر کچا کوٹھا ہے اس میں ممکن ہے موجود ہوں بہر حال میں وہاں پہنچا۔شدید گرمی کا دن تھا اور مجھے سخت سر درد تھا۔وہ کوٹھہ نظر آیا تو شکر کیا کہ منزل تو آ گئی ہے۔اب اگر مطلوبہ شخص بھی مل جائے تو بات بنے۔اندر دیکھا تو مدعا علیہ بیٹھے تھے میرے پہلے سے واقف تھے۔بیٹھتے ہی ملک صاحب خان صاحب نون مرحوم کی یہ نصیحت یاد آئی کہ جس آدمی کے پاس جاؤ فوراً اپنا آنے کا مقصد بیان کرو۔میں نے کہا کہ یہ آپ کے قضاء کے نوٹس ہیں۔ان کی وصولی کے دستخط کردیں۔انہوں نے اوّل تو انکار کیا مگر میں نے انہیں پنجابی زبان میں سمجھایا کہ یہ دستخط تو کرنا پڑیں گے۔میں دفتر کا کوئی چپڑاسی تو نہیں ہوں کہ آپ انکار کرکے بھگا دیں گے۔پنجابی زبان کی اپنی کچھ خصوصیات ہیں جو بعض دفعہ بہت کام آتی ہیں۔وہاں بھی کامیابی ہوئی۔انہوں نے دستخط کردیئے۔میں نے اپنی حلفیہ تصدیق کردی کہ 3:15 بجے سہ پہر فلاں مقام پر مدعا علیہ نے میرے روبرو دستخط کردیئے ہیں اور اسی لمحے واپس سرگودھا اور شام کو ربوہ پہنچ کر حضور انور کو رپورٹ پیش کردی۔حضور متعجب ہوئے کہ کیسے اور کہاں تم نے اسے تلاش کیا۔اور میری دن بھر کی داستان سن کر مسرور ہوئے اور دعا دی کہ اب کام آسان ہو جائے گا اور میرا پروگرام یورپ وغیرہ کا بھی متاثر نہیں ہوگا۔مجھے اگرچہ اس دن بیماری میں بہت مشکل سفر کرنا پڑا مگر حضور کی خوشنودی کا اعزاز ضرور ہوا اور یہ سودا بہر حال میرے لئے بہت سستا تھا اور سخت گرمی کا وہ دن اور میں بیمار تھا مگر میں زبان حال سے کہتا رہا شدید سر درد میں کہ ؎

سب گوارا ہے تھکن ساری دکھن ساری چبھن
ایک خوشبو کے لئے ہے یہ سفر جیسا بھی ہے

ایک دفعہ یوں ہوا کہ حضور کے ایک صاحبزادے نے کچھ زمین Long Lease پر لی ہوئی تھی۔سرگودھا کے افسر آبادی کو رپورٹ ملی کہ وہاں سے کچھ درخت پٹہ دار نے کاٹ لئے ہیں۔افسر آبادی نے فوری رپورٹ ڈی سی سرگودھا کو بھجوادی کہ پولیس کو حکم دیں پرچہ درج کریں اور درختان برآمد کریں۔ مجھے اس واقعہ کی بھنک دفتر ڈی سی سرگودھا سے پڑی اور میں نے اپنی عاجزانہ کوشش اپنے ایک فوجی افسر دوست کے ساتھ مل کر شروع کر دی اور افسر آبادی سے بھی احتجاج کیا کہ Lessee نے خود درختان اُگائے ہوئے تھے جو کاٹے ہیں اور کہ انہیں اس کا حق تھا وغیرہ۔ادھر وہ فوجی افسر ڈی سی صاحب سے ملے وہی دلیل انہوں نے وہاں دی اور ڈی سی نے مسل واپس بھیج دی۔ یہاں تک معاملہ پہنچ چکا تھا اور ہم مطمئن ہو گئے۔حضور کے صاحبزادے صاحب کو بھی کسی نے بتایا کہ اس طرح رپورٹ ہوئی ہے وہ گھبرا کر حضرت صاحب کے پاس اسلام آباد چلے گئے حضور اسلام آباد میں قیام پذیر تھے۔

میں اپنے کسی کام کے سلسلہ میں راولپنڈی اپنے ایک ایکسین غیر احمدی دوست ابراہیم صاحب کے ساتھ گیا۔شام کو میں انہیں ساتھ لے کر اسلام آباد حضرت صاحب کی اقتداء میں نماز پڑھنے کی غرض سے چلا گیا۔ پرائیویٹ سیکرٹری صاحب نے سمجھا ہوگا کہ یہ ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔انہوں نے فی البدیہہ ہی ہمیں ملاقات کرانے سے انکار کر دیا۔ میں نے انہیں کہا کہ آپ نے تو ہماری وہ درخواست رد کر دی ہے جو ہم نے پیش ہی نہیں کی۔ ہم تو نماز پڑھ کر واپس چلے جائیں گے۔حضور اوپر کی منزل سے نیچے نماز پڑھانے تشریف لائے ۔20/25 آدمی تھے۔فرض پڑھا کر حضور اوپر جانے لگے تو میاں انس احمد صاحب کو فرمائے گئے ''نون'' وتر پڑھ لے تو اسے اوپر لے آؤ'' چنانچہ میں اوپر گیا تو شمال مشرق کی طرف ایک کمرے میں دو سنگل صوفے پڑے تھے۔وہاں ہی حضور تشریف لائے وہاں ہم آقا اور غلام دونوں ہی تھے۔حضور نے زبانی سرکاری دفتری رپورٹوں کا ذکر کیا تو میں نے جتنی کوشش کی تھی وہ عرض کر دی اور چونکہ وہ فوجی افسر دوست بہت اثر رکھتے تھے۔اس لئے میں نے حضور کو اطمینان کرا دیا کہ انشاء اللہ کارروائی جمعہ کی تعطیل کے اگلے دن ختم ہو جائے گی۔

حضور نے فرمایا جب یہ ہو جائے تو اوپر والے فون پر مجھے اطلاع دینا۔ جو فون اٹھائے اسے کہنا کہ ''ناصر احمد'' سے ہی بات کرنی ہے۔ میں نے عرض کیا حضور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں حضور کو بلاؤں تو حضور نے فرمایا ''میرے حکم سے''۔غرض میں نے تعطیل کے اگلے روز کارروائی مکمل ہو جانے پر شام کو حضور انور کے نمبر پر فون کیا تو صاحبزادہ مرزا انس احمد صاحب ہی بولے میں نے انہیں تفصیلی رپورٹ دے دی۔الحمدللہ کامیابی ہوئی۔

حضور کے قریب رہنے کا طویل عرصہ اور میری چاکری کا زمانہ میرے لئے سرمایہ حیات ہے۔ بہت واقعات ہیں۔سب کا بیان کرنا ممکن بھی نہیں ہے اور الفضل کی تنگ دامنی سے بھی ہمیشہ خائف رہتا ہوں اور یہ قصے خواہ چھوٹے چھوٹے ہیں مگر ان کے ذکر سے میری

زندگی کی تلخیاں چونکہ ختم ہو جاتی ہیں تاہم چند ایک پر ہی اکتفا کروں گا۔

ہم لندن میں تھے۔حضور نے ’’بیت‘‘ کے افتتاح کے لئے گوٹن برگ (سویڈن) جانے کا پروگرام بنایا۔ایک قافلہ تیار تھا۔جن کے لئے ایک جہاز میں بہت سی نشستیں ریزرو کرائی گئی تھیں۔لاہور کے ایک دوست اس کے انچارج تھے۔وہ ٹریول ایجنٹ تھے۔میں نے انہیں بیت الفضل کے باہر مل کر کہا کہ میں بھی جانا چاہتا ہوں۔50 پونڈ واپسی (رعایتی کرایہ) مقرر تھا۔ان کے ساتھ میرا کاروں کی شپنگ کا بھی سلسلہ چل رہا تھا۔اس لئے کافی رقم تو میری ان کے پاس تھی ہی انہوں نے کہا کہ اب جہاز میں سیٹ کوئی نہیں مل سکتی میں نے کہا اچھا جانا تو انشاءاللہ میں نے بھی ہے۔کسی اور جہاز میں کچھ زیادہ خرچ کر کے پہنچ جاؤں گا۔سرِ شام یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ حضور وہاں تشریف لائے اور مجھے فرمایا ’’نون تم بھی گوٹن برگ کل جا رہے ہوناں‘‘ میں نے عرض کیا حضور یہ صاحب کہتے ہیں جہاز میں کوئی سیٹ نہیں ہے اس نے کہا حضور سیٹ کا بندوبست کر دوں گا۔چنانچہ ہم بھی گوٹن برگ گئے۔وہاں بھی عجیب نظارہ تھا۔

جس ہوسٹل میں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔اس کے کاؤنٹر پر افتتاح کی اگلی صبح ہی حضور کا خوبصورت فوٹو تھا اور عبارت تو پڑھی نہیں جا سکتی تھی ہوسٹل کے ایک آدمی نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ہمیں بتایا کہ یہ کہہ رہے ہیں کہ سویڈن میں خدا کو ایک گھر مل گیا ہے۔حضور اس وقت بہت خوش تھے۔پریس کانفرنس ہوئی، ہم بھی شامل تھے۔اس کے بعد حضور باہر جو خالی زمین تھی وہاں تشریف فرما ہوئے اور مجھ سے دریافت کیا کہ پتہ ہے اس جگہ ہماری کل زمین ’’بیت‘‘ کے آس پاس کتنی ہے۔میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو ایک وہاں کے دوست کو میرے ساتھ بھیجا کہ ’’نون‘‘ کو اپنی اراضی کی سرحدیں دکھلاؤ۔وہ زمین تو بہت وسیع تھی، ایکڑوں میں تھی۔میں نے آ کر عرض کیا حضور! ماشاءاللہ بہت وسیع زمین ہے۔پھر حضور نے خدام سے پوچھا کہ آج ہمارے لئے عید کا دن ہے۔کیا کھانا پسند کرو گے۔کسی نے آہستگی سے کہہ دیا کہ ’’مرغ روسٹ‘‘ حضور نے فرمایا ٹھیک ہے، یہی چلے گا۔

ایک سال میں لندن میں تھا اور تین کاریں خرید چکا تھا۔حضور یورپ تشریف لے گئے ہوئے تھے۔جس روز حضور کی واپسی تھی پروگرام کا پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ ایئرپورٹ پر تو چند دوست جن میں حضور کے صاحبزادہ مرزا لقمان احمد صاحب، چوہدری ظفراللہ خان صاحب وغیرہ تھے ہی جائیں گے باقی سب بیت الفضل کے احاطے میں انتظار کریں یہاں ملاقات ہو جائے گی۔میرے ساتھ غیر احمدی دو دوست بھی تھے۔

چنانچہ ہم نے بیت الفضل لندن میں ہی انتظار کیا۔دیکھتے ہی دیکھتے حضور کی سواری آ گئی اور ہم قطار بنا کر ملاقات کے لئے کھڑے تھے کہ میں نے حضور سے غیر احمدی دوستوں کا تعارف کروایا۔جب میں دست بوسی کر رہا تھا تو حضور نے فرمایا ’’دین میں تو چار کی اجازت ہے‘‘ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ صاحبزادہ مرزا لقمان احمد سے حضور نے ہیتھرو ایئرپورٹ ہی سے پوچھ لیا تھا کہ نون آیا ہوا ہے اور وہ

یہاں کیا کر رہا ہے؟ میاں صاحب نے بتایا کہ اس نے تین کاریں خریدی ہیں۔ ہم بھی حضور کے مزاج میں برکت تلاش کرنے والے تھے۔ اسی روز ایک غیر واقف غیر احمدی دوست آیا اور میرے ساتھ تعارف ہونے پر اپنی کار مجھے دینے کی پیشکش کی اور قیمت بھی واجبی تھی چنانچہ چار پوری ہوگئیں اور وہی کار پاکستان آنے پر سب سے بہتر نکلی۔

ایک دفعہ لندن میں تھے۔ ہم کاریں کون سی خریدیں کوئی فیصلہ نہ کر سکتے تھے۔ عزیزم محمد اکرام پراچہ بھی میرے ساتھ تھے کہ میں نے حضور سے ذکر کیا۔ حضور نے تفصیل پوچھ کر فیصلہ فرما دیا۔ چنانچہ میں بھاگم بھاگ اسی وقت ٹرین میں ڈیلر کے پاس پہنچا اور اسے رقم دی میرے لئے فلاں کاریں بک کریں اس نے تعجب سے پوچھا کہ آپ تو کوئی فیصلہ نہیں کر رہے تھے۔ آج کیا ہوا میں نے بتایا کہ حضور سے میری بات ہوئی ہے حضور نے یہ فیصلہ فرمایا ہے وہ غیر احمدی تھا۔ اس نے پوچھا کہ حضور کو یہ بھی بتایا ہے کہ کس ڈیلر سے سودا کر رہے ہو۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے سو پونڈ مجھے طے شدہ قیمت سے واپس کر دیئے۔ حضور کا نام نامی بیچ میں آیا ہے۔ یہ خصوصی رعایت حضور کے احترام میں ہے اور جب وہ کاریں یہاں پہنچیں تو وہی انگریزی مقولے والی بات کو Hot Cakes کی طرح گاہکوں کی قطاریں لگ گئیں۔ یہ حضور کے بابرکت فیصلہ کا نتیجہ تھا۔

سیّدنا حضرت حافظ مرزا ناصر احمد صاحب کی وفات کا سانحہ ماجعہ

کئی دنوں سے حضور کو دل کی تکلیف کا سن رہے تھے۔ سبھی احمدی دعائیں بھی کر رہے تھے۔ صدقات بھی دے رہے تھے ڈاکٹر صاحبان سرتوڑ کوششیں کر رہے تھے۔ ایک انگریز ماہر امراض قلب بھی ان میں شامل ہوا۔ حضور کی صحت بہتر ہونا شروع ہوئی اور امیدیں اور آرزوئیں پختگی کی طرف بڑھنے لگیں کہ یہ نعمت ابھی ہمارے پاس ہی رہے گی مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا ہم بھلا کیا جانیں علیم و حکیم کی حکمتوں کو۔ بہرحال 8 رجون کی شام کی خبر امید افزاء تھی دعائیں برابر جاری تھیں۔ 8/9 جون کی رات کو سو گئے۔ آدھی رات کا وقت ہوگا نہ معلوم کہاں سے آواز آئی کہ ''حضور فوت ہو گئے ہیں۔'' یہ میرے لئے آج تک معمہ ہے میں سناٹے میں آ گیا کئی خیال آئے یہ خواب تھا تو نہ معلوم اس کی تعبیر کیا ہو۔ اندھیرے میں اُٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ ذہن ماؤف، سوچیں معطل، دل کی دھڑکن حد سے زیادہ تیز ہو رہی تھی۔ چند منٹ بعد میں نے اس کمرے کی لائٹ جلائی سوچا کہ حضرت امیر صاحب سے استفسار کروں پھر خیال آیا ایسے واہمہ کے نتیجے میں انہیں ایسے وقت کیوں پریشان کروں آخر سوچا کہ اسلام آباد حضور کے جائے قیام پر ہی فون کر کے پتہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ اسلام آباد فون کیا تو انا اللہ کی آواز نے مجھے رنج والم میں مبتلا کر دیا۔ وقت وفات پوچھا اور پھر کچھ بولنے کی سکت نہ رہی۔ اچانک صدمے کی گرفت ایسی سخت تھی کہ وقتی طور پر میری آنکھوں کا پانی بھی خشک ہو گیا۔ پھر میں نے اپنی بیوی اور بچوں کو اٹھایا سبھی خبر سن کر غم زدہ ہو گئے پھر تو اشکوں کا سیلاب تھا اور میں تھا۔ جب مجھ سے کوئی تعزیت کرتا یا حضور کے مجھ پر احسانات کا ذکر کرتا تو آگے سے کہہ دیتا

ے

اشکوں سے کیونکر سمجھاؤں اپنے دل کا حال تجھے
پانی پر تصویر بنانا اپنے بس کی بات نہیں

کچھ دنوں بعد حضرت خلیفۃ المسیح الرابع سے تعزیت کے لئے ربوہ حاضر ہوئے اور حضور کی اچانک دل کی حالت بگڑ جانے کا سبب پوچھا تو حضور نے فرمایا کہ میں نے انگریز ڈاکٹر سے حضور کے بارہ میں پوچھا تھا تو اس نے جواب دیا کہ My Patient is very intelligent. He knows what has happened to him and he also knows what may happen. الغرض دل کو سمجھایا کہ ؎

دل نادان راضی ہو رضا پر
ترا چاہا نہیں چاہا خدا نے

اگلے روز چہرہ مبارک دیکھا تو کسی کا کہا ہوا شعر یاد آ گیا جو حضور ہی کے بارہ میں حضور کی زندگی میں اس نے کہا تھا (اور وفات کے بعد تو حضور کا چہرہ نوروں سے اور بھی منور ہو رہا تھا)۔ ؎

آنکھیں کہ جیسے نور کی ندی چڑھی ہوئی
چہرہ کہ جیسے پھول کھلا ہو گلاب کا

اس شعر کے خالق نے تو نہایت عمدگی کے ساتھ حضور کی تصویر کشی کی تھی میرے قلم میں کہاں اتنی تاب و توانائی کہ اس سراپا نور کا قلمی خاکہ تیار کر سکے۔

مجھے بھی حضور سے محبت کا دعویٰ تھا اور حضور بھی محض للہ مجھ سے پیار کرتے تھے ورنہ میرے جیسے تہی دامن بلکہ آلودہ دامن کم علم اور کم فہم سے کون پیار کرتا ہے۔ ادھر میں ہر لحاظ سے حقیر اور ادھر حسن ظاہری اور باطنی کا اپنے دور کا بہترین نمونہ۔ مگر شکر خدائے ذوالجلال کا کہ ناز و نیاز میں عمر گزر گئی انہیں چاہنے والے اور حضور کے عشاق تو سینکڑوں نہیں ہزاروں بلکہ لاکھوں تھے۔ میں اپنے آپ کو سمجھتا ہوں اور شکر ہے کہ کبھی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوا اور میر کے الفاظ میں ہی اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ ؎

تو میرے کس شمار میں ہے کس قطار میں

حضور فوت ہو چکے اور آنکھوں سے اوجھل ہیں مگر محبت تو غیر فانی ہوتی ہے۔ اس پر تو کبھی موت نہیں آتی کیونکہ محبت تو ایک بے غرض انہماک اور خود فراموش محویت کا نام ہے۔ گزرے ہوئے بھلے وقتوں کو یاد کرتا ہوں تو محرومی اور جدائی کے احساس سے دل پر سخت چوٹ

لگتی ہے۔مگر ؎

یادِ یار میں بھی اک مزا ہے

یہ تو ٹھیک ہے کہ ہم برسیاں نہیں مناتے اور نہ ہی سالگرہ کی رسوم کے قائل ہیں اور ان طوقوں سے ہماری گردنیں حضرت مسیح موعودؑ کی برکت سے آزاد ہو چکی ہیں لیکن اپنے محسنوں کو یاد کرنا اور ہمیشہ یاد رکھنا زندہ قوموں کی علامت ہے اور جو قومیں ایسے محسنوں کو بھلا دیتی ہیں وہ مٹ جایا کرتی ہیں اپنی تو یہ حالت ہے کہ اس مسیحا نفس کو بھلانا چاہوں بھی تو ناکام رہوں گا۔ ؎

ہم اہلِ وفا ترکِ وفا کر نہیں سکتے
ہاں حضرت ناصح ہمیں جو چاہے سزا دے

جب دل گھبراتا ہے تو سیّدنا حضرت مصلح موعود کے پاکیزہ کلام سے اسے قرار ملتا ہے اور حضور کی روح کو یوں مخاطب ہوتا ہوں کہ ؎

تو تو واں جنت میں خوش اور شاد ہے
''ہم'' غریبوں کی خبر کو آئے کون
جانتا ہوں صبر کرنا ہے ثواب
اس دل نادان کو سمجھائے کون

اے ناصر دین تجھ پر سلام کہ تو نے مہر و محبت اور عشق و وفا کی بہت دلفریب منازل طے کیں اور ہمیں بھی عمر بھر ان منازل کی نشاندہی کر کے ان پر قدم مارنے کی ترغیب دلاتے رہے اور اپنوں اور غیروں پر اتنے احسان تو نے کئے کہ ان کا جمع کرنا مشکل۔کون ساری دنیا میں بکھرے ہوئے پھولوں کو چن سکتا ہے تو تو اس چشمہ شیریں کی مانند تھا جو اونچی پہاڑی سے ڈھلوان کی طرف پورے زور سے بہتا رہتا ہے اور بلا امتیاز مذہب وملت سب کو سیراب کرتا رہتا ہے۔

انسانی زندگی کیا ہے ایک چیستان ہے ایک بجھارت یا ایک پہیلی ہے اور موت نہ سمجھ آنے والا معمہ۔آنکھیں بند ہوئیں اور آدمی ایک افسانہ بن گیا لیکن بعض شخصیات اپنے خداداد وہبی نور اور حسن عمل سے قبر کی شب دراز کے اندھیروں کو بھی روشنی میں بدل دیتے ہیں اور گویا وہ موت کو بھی شکست دے دیتے ہیں۔میرا آقا تو انہی خوش بختوں میں ایک تھا۔حضرت صاحب ہمیشہ مجھے ''نون'' کہہ کر پکارا کرتے تھے اور حضور کی آواز قلب وجاں میں ایک عجیب طلسمی کیفیت پیدا کر دیتی تھی اب مدت مدید سے میرے کان ''نون'' کا لفظ سننے کو ترس رہے ہیں اور اب یہ آرزو ایک دل فگار حسرت کی صورت اختیار کر چکی ہے کاش حضور کی دل لبھانے والی شیریں آواز ''نون'' پھر سے میری

سماعتوں میں رس گھولے اور میں قربانت شوم، قربانت شوم (میں آپ پر قربان جاؤں، میں آپ پر قربان جاؤں) کہتا ہوا حضور کے جسم اطہر سے لپٹ جاؤں۔ یقین ہے کہ آپ اپنے بزرگ اور موعود باپ اور مقدس دادا کے قرب میں شاداں اور فرحاں ہوں گے۔

اے ہمارے آسمانی آقا تو عفو بھی غفور بھی اور بندہ نواز بھی اور ذرہ نواز بھی جب ہمارا وقت واپسیں آوے تو تیری عفو اور مغفرت اور وسیع رحمت سے امید رکھتے ہیں۔ جس طرح اس دنیا میں اپنے آقاؤں کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت تو نے اپنے فضل سے عطا فرمائی آخرت میں بھی انہی قدموں میں ہمارا بسیرا ہو۔ ؎

ترا دامانِ رحمت اور تو ہے
مری ننھی سی جاں ہے اور میں ہوں

یا اللہ رحم۔

(روزنامہ الفضل مورخہ 17 رجولائی 2004ء صفحہ 3 تا 4۔ مورخہ 19 رجولائی 2004ء صفحہ 3 تا 4، 7)

۞۞۞۞۞۞۞۞۞

خلفائے سلسلہ کی یادوں کے انمٹ نقوش

سیّدنا حضرت مصلح موعودؓ



حضرت مصلح موعود کے بارے میں کچھ لکھنا ہو تو کم از کم سیّدی حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب (خلیفۃ المسیح الرابعؒ) کی عمیق نگاہ اور زوردار قلم کی ضرورت ہے۔ حضور کے سوانح حضرت صاحبزادہ صاحب نے شروع کئے تھے۔ ایک تو حضرت صاحبزادہ صاحب کا ادب میں بہت بلند مقام تھا۔ زبان و قلم کے دھنی اور شاہ سوار پھر اس کے ساتھ خانگی حالات اور واقعات کے عینی شاہد۔ یہ ایسی خصوصیات تھیں جن میں آپ کا کوئی ہم پلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سیّدنا حضرت مصلح موعود کی سیرت کی جلد اوّل و دوم جو حضرت ممدوح نے تالیف فرمائیں ان کا رنگ جداگانہ بلکہ عاشقانہ ہے۔

میں نے نو عمری میں حضور کو دیکھا تھا۔ کالج کے زمانے میں عموماً ایک مہینے بعد قادیان سے اپنے گاؤں آتا ہوتا تھا۔ جہاں میرے والدین میری آمد کی بیتابی سے منتظر ہوتے تھے۔ اگر حضور کا قادیان میں ہی قیام کا پروگرام ہوتا تو ہفتوں اور مہینوں کے گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا تھا یہ ناممکن تھا کہ حضور نے خطبہ جمعہ دینا ہو اور ہم اس سے غیر حاضر رہیں۔ پھر رات کی مجلس عرفان کی اپنی ہی کشش

تھی۔طالب پور بھنگواں کے ایک رئیس ہمارے ایک ہم مکتب چودھری مسعود احمد صاحب ہوتے تھے۔انہیں نماز باجماعت کے لئے تو کہنا پڑتا تھا مگر کیا مجال جو مجلس عرفان میں حاضری کے لئے کسی تحریک کی ضرورت پڑتی۔حضور انور دینی اور دنیاوی معاملات پر نہایت پُر مغز اور دلچسپ گفتگو فرماتے اور بڑی بڑی اُلجھی ہوئی گتھیاں چٹکیوں میں سلجھا دیتے اور ادق مسائل دینیہ ایسی عمدگی سے حل فرماتے کہ ہم جیسے کم فہم بھی پوری طرح سمجھ جاتے۔پھر ساتھ ہی لطائف بھی بیان فرماتے اور پاکیزہ زبان میں۔مجلس کو مکمل طور پر گویا گرفت میں رکھتے اور ہر مزاج اور ہر علمی سطح کا شخص آپ کے حسن بیان سے محظوظ ہوتا اور فیض حاصل کرتا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ خواہش رہتی کہ ابھی حضور عشاء کی ندا کا حکم نہ دیں۔ابھی کچھ اور دیر تک روحانی لذت قلب و ذہن پر مستولی رہے۔لوگ دور دراز کے محلوں سے کھنچے چلے آتے تھے اور کچھ بیرون جات سے بھی۔ایک سامع کو کبھی غیر حاضر نہ پایا جو ریتی چھلہ کے دوسری جانب سے بہرصورت اس محفل روحانیاں میں پہنچ جاتا تھا۔مگر اس نے کبھی آگے بڑھ کر بیٹھنے کی نہ کوشش کی بلکہ آخر میں ہمہ تن گوش بیٹھا رہتا۔وہ تھے میرے محسن اور مربی حضرت مولانا شیر علی صاحب۔یہ روحانی جذب و کشش اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کو بطور خاص عطا ہوتا ہے۔سیّدنا حضرت مسیح موعودؑ کے زمانے میں جب رسل و رسائل کے ذرائع ناقص اور بہت کم تھے۔ہندوستان کے دور دراز کے علاقوں سے نیز دنیا کے دوسرے ملکوں سے عشاق پروانہ وار اس شمع پر اپنی متاع جان قربان کرنے کے لئے کھنچے چلے آتے تھے اور حضور کے وصال کے بعد خلفاء کو یہی مقناطیسی قوت عطا ہوئی۔سچ کہا تھا پنجابی کے شاعر پیر فضل شاہ گجراتی نے کہ ؎

آپے دور دراز تھیں لے آون
کھچّاں ٹور کے حسن عُریاں دیاں
شمع بلے تے آپ ہو جاون کٹھے
سدا گھلدا اے کون پروانیاں نوں

آج مجھے پھر اپنے پیارے وہی جو لاکھوں نہیں کروڑوں کے پیارے اور خدائے لم یزل کے محبوب ہیں بہت یاد آئے۔اگرچہ موسم خزاں کا ہے مگر ان کی یادوں سے میری خزاں بھی بہار میں بدل جاتی ہے اور جب کبھی اداسی اور پریشان حالی اور دل گرفتگی مجھے گھیر لیتی ہے تو ان اپنے پیاروں کے ساتھ بیتے ہوئے مہ وسال اور ان کے قدموں میں اپنی وہ نشستیں یاد آتی ہیں۔جب میں وہاں بیٹھا دنیا و مافیھا کو یکسر بھول جاتا تھا۔ایک ایک واقعہ اور ایک ایک شیریں لمحہ یاد آ کر میری ساری پژمردگی اور زبوں حالی اس سے کافور ہو جاتی ہے اور میں یہ نعرہ لگاتا ہوں۔ ؎

آج پھر موسم بہار آیا

دل میں میرے خیال یار آیا

حیرت ہے کہ عمر ڈھلنے کے ساتھ ساتھ یادداشت کمزور ہوتی جاتی ہے مگر ان مہ پاروں کی ساری یادیں نہ بھولی ہیں نہ بھول سکیں گی۔ کیونکہ ان کا ٹھکانہ قلب وذہن کے ایسے نہاں خانوں میں ہے جہاں بھول اور ذھول کا کوئی گزر نہیں۔لقمان حکیم کا قول ہے کہ دو باتوں کی سمجھ نہیں آتی۔ایک یہ کہ انسان پانی استعمال کرتا ہے پھر مرتا کیوں ہے۔دوسرے یہ کہ جب مردے کو پانی سے غسل دیا جاتا ہے تو وہ زندہ کیوں نہیں ہوجاتا وہ تو معروف حکیم تھا، دانا تھا۔گو کہ میں کم فہم اور کوتاہ علم ہوں مگر شاہد ہوں اور قوی دلائل کے ساتھ یہ دعویٰ مسیح پاک پیش کرتا ہوں کہ لاریب آسمانی پانی سے مردے زندہ ہوجاتے ہیں اور میرے مرشد کا دعویٰ کئی بار سچا ثابت ہوا بلکہ ہر احمدی کی زندگی اس روحانی پانی سے قائم ہے۔ ؎

میں وہ پانی ہوں جو اُترا آسمان سے وقت پر
میں ہون وہ نور خدا جس سے ہوا دن آشکار

اور جب آسمانی پانی کا چھینٹا اس تن مردہ پر پڑتا ہے تو یہ پھر سے زندہ ہوجاتا ہے اور بلامبالغہ میں کئی بار عملاً مرچکا ہوں اور پھر سے ان مسیحا نفسوں کے دم مسیحائی سے زندہ ہوا ہوں۔جب میری تیرہ بختی حد سے بڑھ جاتی ہے تو مسیحائے زماں جو ''نور خدا'' تھا اور جو خود تو **الرحیل ثم الرحیل** کی پیش خبریوں کے مطابق ہمارے آنکھوں سے اوجھل ہوگیا مگر وہ اپنے پیچھے ایک ''دائمی قدرت'' چھوڑ گیا جس نے تاقیامت ہمارا ساتھ دینا ہے۔چنانچہ اسی کے جانشینوں کے ذریعہ اسی نور کی کسی ایک کرن نے میری رات کے گھپ اندھیروں کو نور سحر میں تبدیل کردیا حق یہ ہے کہ اگر اس آسمانی پانی کے چھینٹے مجھ پر نہ پڑتے اور اس ''چشمہ رواں'' سے دو گھونٹ نصیب نہ ہوتے جو میرے لئے ''آب حیواں'' بن گیا تو میں تو مر کر خاک ہوچکا تھا۔اوروں کی زندگی کے ذرائع اور موجبات کا تو وہ جانیں میرے جیسے پر تقصیر کے لئے جس کے اعمال کی بغچی میں کچھ بھی نہیں بالکل خالی ہے۔سیّدنا حضرت مسیح دوراں کے ذریعہ اُترنے والی آسمانی پانی اور ''نور خدا'' کے بغیر فنا ہی فنا تھی۔اسی لئے تو میں بار بار اپنے ایک بزرگ کا ہمنوا بن کر یہ آرزو کرتا ہوں۔ ؎

کہاں چھپا ہے تو اے ابر نو بہار برس
بر برس کہ زمانہ ہے بیقرار برس
خدا کرے کہ ملے عمر نوح ساقی کو
یہ پاکباز سلامت رہے ہزار برس

یہ تو اس بزرگ نے سیّدنا حضرت مسیح زماں کی زندگی میں تمنا کی تھی لیکن ہم اس دور قدرت ثانیہ میں بھی یہ آرزو کرنے میں حق بجانب

ہیں کہ یہ اسی دور کا تسلسل ہے جو سورۃ نور میں بیان نوید کے مطابق جب تک ہم ایمان پر قائم رہیں گے۔ وہی ’’آسمانی پانی‘‘ اور ’’وہی نور خدا‘‘، ہم پر بھی برستا رہے گا۔

سیّدنا حضرت مصلح موعود کے ساتھ گزرے دنوں کے واقعات تو بہت ہیں لکھنے کا کسے یارا۔ جوں جوں یاد کرتا ہوں آنکھوں سے آنسوؤں کا دھارا۔ کچھ ان شیریں لمحوں کی میٹھی یادیں اور کچھ پھر اپنی آج کی محرومیاں۔ یہ عجیب ملغوبہ سا بن جاتا ہے اور میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ ؎

اشکوں سے کیونکر سمجھاؤں اپنے دل کا حال تجھے
پانی پر تصویر بنانا میرے بس کی بات نہیں

اور اپنے تصوراتی ناصح سے یہ کہہ کر اس سے جان چھڑاتا ہوں کہ ؎

ناصح کچھ تو سوچ مجھے یہ عشق کہاں لے آیا ہے
اتنی دور سے واپس جانا میرے بس کی بات نہیں

حضور کی ایک نگاہ کرم

22راگست 1956ء کے دن حضور انور مری سے ربوہ جا رہے تھے کہ برادران فضل الرحمان صاحب پراچہ اور محمد اقبال صاحب پراچہ نے حضور کی ناقہ کی باگیں تھام لیں اور بصد منت دوپہر کا کھانا ان کے ہاں کھانے کی درخواست کی۔ حضور بھی بوجوہ ان پر بے حد مہربان تھے۔ وہ خوش نصیب مری پہنچ کر منظوری حاصل کر چکے ہوں گے۔ بہرحال کینال ریسٹ ہاؤس سرگودھا میں حضور اور حضور کے قافلے کی دعوت کا انتظام تھا۔ مجھے بھی پراچہ برادران نے شمولیت کا شرف بخشا۔ حضرت مرزا عبدالحق صاحب، حضرت صاحب کے ساتھ صوفے پر حضور کے بائیں جانب تشریف فرما تھے۔ قریباً نصف صدی گزر چکی ہے لیکن حضور جہاں تشریف رکھتے تھے اور جس طرف حضور کا رُخ مبارک تھا یہ سارا نقشہ اس وقت ان آنکھوں کے سامنے ہے اور اس بوڑھے ذہن میں اس طور مستحضر ہے۔ گویا کل کا واقعہ ہے۔ حضرت مرزا صاحب نے میرا تعارف کرایا۔ حضور اس عاجز سے مخاطب ہوئے۔ میں حضور کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ حضور نے جو بات پوچھی میں نے عرض کر دی۔ حضور نے پوچھا کہ یہ تمہاری شہادت شائع کر دی جائے۔ میں نے بصد ادب عرض کیا کہ حضور ضرور شائع فرماویں۔ حضور نے قانونی نکتہ بیان فرمایا ہم وکیل کہلاتے تھے مگر اتنی عقل کہاں کہ موکل اور وکیل کے درمیان جو گفتگو یا مشورہ ہوتا ہے وہ نہ موکل نہ وکیل شائع کرانے کا حق رکھتا ہے کیونکہ وہ Privileged Talk ہوتی ہے اور جو فریق اسے نشر کرے اس پر مقدمہ ہو سکتا ہے اور دوسری طرف میرا وہ نام نہاد موکل بڑا موذی ثابت ہو رہا تھا۔

میں نے بظاہر دلیری سے شاید گستاخی ہو اللہ معاف فرمائے عرض کیا کہ حضور کے خلاف وہ بک بک کر رہا ہے۔ میری جان یا عزت کی تو قیمت ہی کوئی نہیں۔ واقعہ سچ ہے اگر مقدمہ کرے گا تو میں بھگت لوں گا اور میں نے کہا کہ وہ یوں بھی میرے قریبی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اگر مقدمہ کرے گا تو میں اس سے دوسری طرح نپٹ لوں گا۔ حضور کو میری ''دلیری'' بھا گئی۔ دوسرے ہی روز الفضل کے پہلے ہی صفحہ پر میرا بیان حضور کے حکم اور اجازت سے شائع ہوا جس میں میرا ذکر سرگودھا کے ''معتبر آدمی'' اور ''کامیاب وکیل'' کے الفاظ سے کیا۔ محبوبان الٰہی کے ساتھ اللہ کا یہ سلوک رہا ہے۔ ؎

گفتہ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

میں نہ ''معتبر'' شخص تھا نہ ''کامیاب وکیل'' بس وہ نگاہ پڑی تو میرے لئے کامیابی کے وہ در کھلے کہ میں ان کا سوچ کر بھی حیران ہو جاتا ہوں۔ بہر حال جو کچھ ہوں اسی نگاہ کرم کے صدقے اور جو میں نہیں بن سکا وہ میری شامت اعمال۔ آخر نومبر 1965ء آ گیا۔ حضور اپنے خالق و مالک کے پاس پہنچ گئے۔ ایک فدائی صحابی حضرت سعد بن معاذؓ رئیس انصار فوت ہوئے تو رحمت عالمؐ نے فرمایا: سعد کی وفات سے الٰہی عرش جھومنے لگا ہم بھی اللہ کے فضل و احسان سے یہی امید رکھتے ہیں۔ حضرت مصلح موعود نے پیش خبریاں بیان فرمائی تھی۔ ؎

اک وقت آئے گا کہ کہیں گے تمام لوگ
ملت کے اس فدائی پہ رحمت خدا کرے

اے میرے آقا و مرشد کی پاک روح تجھ پر سلام۔ آپ کا فرمایا ہوا قول سچا ثابت ہوا۔ آج 40 سال کے قریب عرصہ آپ کی وفات کو ہو چکا ہے۔ وہ قول 1965ء میں بھی سچا تھا اور آج بھی زمین اور آسمان اور فضائیں گواہ رہیں کہ سارے کروڑوں نیک بندے یہی دُعائیں کر رہے ہیں کہ ؎

ملت کے اس فدائی پہ رحمت خدا کرے

حضرت حافظ مرزا ناصر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثالث

اب ابتلائے عظیم 1965ء کے خونچکاں واقعات کو ادھورا چھوڑ کر کہ مجھے نومبر 1965ء کے دلدوز واقعات یاد کر کے اور ان کی قدرے تفصیل بیان کرنے سے خطرہ ہے کہ میرا زخمی دل ساتھ نہ چھوڑ دے۔ المختصر یہ کہ گو حضور کی یادیں پرانی ہو چکی ہیں پھر بھی انہی کی یاد میں میری زندگی کا سہارا بنی ہوئی ہیں۔ ہماری زندگی میں تو یہ پہلا بڑا سانحہ تھا کہ حضرت مصلح موعود جیسا امام ہمیں چھوڑ گیا تھا۔ جس نے

52 سال تک الٰہی تائیدات اور نصرتوں سے جماعت کا نہایت درخشاں ناک نقشہ قائم کیا تھا۔اس سے جماعت پر ایک زلزلہ سا آ گیا تھا۔اسی قسم کا جیسا 26رمئی 1908ء کو جماعت کو جھٹکا لگا تھا۔قدم ڈگمگا رہے تھے۔دماغ پریشان مگر آنکھیں مسلسل آسمان پر جمی ہوئی تھیں۔غیروں کے گھروں میں شادیانے کہ اتنا بڑا جماعت کا لیڈر گزر گیا ہے تو پیچھے کچھ بھی نہیں بچا مگر جسے اللہ نے قائم و دائم رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہو اس کو کیا غم۔پھر حبل اللہ آسمان سے نازل ہوئی اور پھر غمزدوں اور درد کے ماروں نے بھاگ کر اسے پکڑ لیا گو جانیوالے کا غم بہت تھا تاہم اسی کے لخت جگر کو اللہ نے پھر اسی مقام پر لا کھڑا کر دیا اور اس نے بلبلاتی قوم کے دھڑکتے دلوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر انہیں قرار عطا کیا اور ہم نے ایسا محسوس کیا کہ جس طرح دریا کی طغیانی میں بہتے جا رہے تھے اور یہ سیلاب ایسا قیامت کا نمونہ تھا کہ جو ہمیں بہائے لے جا رہا تھا کہ یکدم قم باذنی کی آسمانی ندا نے گرتے ہوؤں کو تھام لیا۔ڈوبتے ہوؤں کو بچا لیا اور وہ جو دریا کی طغیانی کی لہروں کی نذر ہو چکے تھے اور دشمن ان کی غرقابی کا نظارہ کرنے میں خوش تھا اور بغلیں بجا رہا تھا۔انہیں **مالک الملک** نے پھر بحفاظت ساحل پر اُتار دیا۔وہ بڑا رحیم و کریم ہے۔اپنے غریب بندوں کو بھلا کب غم والم میں اکیلا چھوڑ دیتا۔اس نے صدمات سے چور بندوں کی فریادوں کو سنا انہیں بپایہ قبولیت جگہ دی اور حضرت سیّدنا حافظ ناصر الدین کو اپنے ہاتھوں منتخب کرا کر ہماری باگ ڈور اس کو سونپ دی۔ایک رات حضرت مصلح موعود کو اللہ قدیر نے بلایا اور دوسری رات پھر برستی آنکھوں نے مژدہ سنا کہ سیّدنا حضرت مرزا ناصر احمد صاحب خلیفہ چنے گئے ہیں۔

خنک چاندنی رات بیت مبارک کے مین گیٹ کے آگے انتظار کی وہ گھڑیاں کس قدر کربناک تھیں وہ دلفگار خاموش سسکیاں اب تک یاد ہیں۔آخر ایک صاحب سب سے پہلے باہر آئے اور اعلان کر دیا کہ حضرت مرزا ناصر احمد صاحب منتخب ہو گئے۔آنسو بھی عجیب اللہ کی نعمت ہیں۔پہلے قریباً 18/ 20 گھنٹے اس حال میں آنسو بہائے کہ ہمارے سروں پر سائبان نہیں رہا تھا اور جب نیا آسمانی تحفہ ملا تو وہی آنکھیں اور وہی ان کا پانی شکران نعمت میں بھی جاری رہا۔سوچتا ہوں کہ غم والم کے آنسو اور شکرانے کے آنسو ایک ہی مادے سے کشید کئے جاتے ہیں۔فرق ہے تو صرف یہ کہ وہ ارمانوں کے جنازے پر اور یہ تمناؤں اور آرزوؤں کے پودوں پر شگفتگی اور بہار آنے پر۔

حضرت مصلح موعود کی تدفین کے بعد سیدی حضرت مرزا ناصر احمد صاحب نے بیت مبارک میں جو لوگ اس وقت حاضر تھے اور ان کی تعداد بسیار تھی انہیں شرف مصافحہ عطا فرمایا۔اس عاجز کو 20/ 21 سال سے حضور کی چاکری کا شرف حاصل رہا تھا۔جب میری باری آئی تو حضرت ممدوح نے ازراہ بندہ نوازی ایک منٹ کے قریب میرے ساتھ مختصر دو باتیں کیں اور شاید یہ انوکھا اعزاز اس خادم کے حصہ میں ہی آیا۔حضور کی من موہنی عادات اور صفات کا شمار ممکن نہیں۔چند ماہ قبل ہائی کورٹ لاہور کے فاضل جج نے ان دونوں بھائیوں

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث اور سیّدنا حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الرابع کا ذکر نہایت ادب احترام اور عقیدت کے ساتھ کیا اور ہر دو کی صفات حسنہ کا الگ الگ حسین پیرائے میں تذکرہ کیا۔ کیونکہ جج صاحب موصوف دونوں حضرات کو مختلف مواقع پر مل چکے تھے۔ ایک بظاہر پرائے سے خوبصورت باتیں سن کر مجھے دلی فرحت نصیب ہوئی۔

حضور کے انتخاب کے روز ہی میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ حضور اب بہت عالی منصب پر فائز ہو چکے ہیں۔ اب وہ پہلے سی بے تکلفی اور صبح شام کی ملاقاتیں نہیں رہیں گی کچھ فاصلہ رکھنا پڑے گا مگر اللہ والوں کے حوصلے بھی بڑے ہوتے ہیں گو حالات بھی بدل چکے تھے اور حضور کی حالت ذاتی میں بھی ایک انقلاب آفریں تبدیلی آ چکی تھی اور مصروفیات دینیہ بھی بہت بڑھ چکی تھیں اور گویا عالم یہ تھا کہ ؎

چپکے چپکے شباب ان پہ آ ہی گیا
رفتہ رفتہ زمیں آسماں ہو گئی
اس طرف حسن میں اک اضافہ ہوا
اس طرف اک تمنا جواں ہو گئی

مگر وہ جو بیس سال سے باران رحمت کی شکل میں رم جھم برستا رہا تھا۔ اب وہ ساون کی جھڑی کی صورت فضل واحسان، مروت وشفقت میں موسلا دھار مینہ کی طرح برسنا شروع ہوا اور یہ سلسلہ حضور کی وفات تک چلتا رہا۔ غلام پر آقا اگر مہربان ہو تو وہ بھی آگے سے نخرے کرنا شروع کر دیتا ہے۔ مگر اس شاہی خاندان خصوصاً منتخب افراد کے غلام پروری کے اسلوب بھی دنیا جہان سے الگ اور نرالے تھے۔ بڑے وقار اور وفاداری کے ساتھ ہماری اطاعت اور ممنونیت اور عقیدت میں لپٹی ہوئی دیوانگی کو بھی پسند فرماتے رہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے میرے محترم بھائی ڈاکٹر حافظ مسعود احمد صاحب نے جو بہت ذکی الحس تھے کسی طرح بھانپ لیا اور مجھے اعتماد میں لے کر قدرے مفہوم اور متفکر ہو کر ذکر کیا کہ حضرت صاحب اسلام آباد اور جہلم وغیرہ سے آتے جاتے ہمیں کوئی اطلاع نہیں دیتے اور نہ ہمیں لب سڑک ملاقات اور زیارت کا شرف عطا ہوتا ہے۔ پہلے یہ حال تھا کہ حضور جہلم میں صاحبزادہ مرزا منیر احمد صاحب کے ہاں مقیم تھے۔ روانگی سے پہلے محترم حافظ صاحب کو فون کیا کہ فاتح الدین بول رہا ہوں۔ آج فلاں وقت کے قریب سرگودھا سے گزروں گا۔ حافظ صاحب کہتے تھے مجھے حیرت ہوئی اور پہلے تو میں سمجھ ہی نہ سکا پھر فوراً سنبھل کر عرض کیا حضور بہت اچھا۔ چنانچہ سرگودھا ریمونٹ ڈپو کے سامنے ہم حضرت مرزا عبدالحق صاحب کی قیادت میں موجود تھے۔ وہیں سڑک کے ایک طرف کھڑے ہو کر حضور نے ملاقات کا شرف عطا کیا اور کار کے بونٹ پر چائے کی پیالی رکھ کر نوش فرمائی۔ فرمایا کہ یہاں چائے ٹھنڈی نہیں ہوگی یہ میز بہتر ہے۔

حافظ صاحب نے اپنی فکرمندی سے مجھے بھی پریشان کر دیا تو میں نے حضور کو خط لکھا کہ حضور کے ارادتمند تو سرگودھا میں ہزاروں ہیں مگر حضور کا نوکر ہونے کا اعزاز شاید صرف مجھے ہی حاصل ہے اور آقا اگر غلام کے گھر آ جائے تو گو آقا کے مقام و مرتبت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ مگر غلام کی خوشی اور خوش بختی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ حضور مجھے اگر پتہ چل جائے کہ حضور سرگودھا سے گزر رہے ہیں تو میں حضور کی سواری کی باگ تھام کر اپنے گھر لے آؤں گا۔ چند منٹوں سے حضور کچھ فرق نہیں پڑتا۔ حضور نے جواب میں لکھوایا کہ ربوہ سے چلیں تو سرگودھا سے آگے طویل سفر باقی ہوتا ہے اور ربوہ کی طرف آ رہے ہوں تو سرگودھا آنے سے پہلے ہی گویا ربوہ نظروں میں آ جاتا ہے اس لئے سرگودھا میں رکنا دونوں صورتوں میں ممکن نہیں ہو گا ورنہ مجھے تمہارے گھر آنے میں باک نہیں اور پہلے آ بھی چکا ہوں۔ وہ جواب میں نے بھائی حافظ مسعود احمد صاحب کو پڑھا دیا۔ جس سے ہمارے دلوں میں قدرے شگفتگی آ گئی۔

میں پہلے کسی مضمون میں لکھ چکا ہوں کہ حضور احمد نگر اور نصرت آباد کی زمینوں پر جاتے تھے۔ میں کیسے سونگھ لیتا تھا کہ حضور کا پروگرام ہے زمینوں پر جانے کا۔ شاید کوئی دن مقرر ہوتے تھے۔ بہرحال یہ کبھی نہ ہوا کہ میں پہلے دفتر میں حاضر نہ ہوا ہوں۔ حضور نیچے تشریف لاتے سلام کرتا تو مجھے ارشاد فرماتے اپنی موٹر یہیں کھڑی کر دو اور میرے ساتھ بیٹھو۔ میں حضور کے ساتھ ویگن میں بیٹھ جاتا۔ حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب اکثر ساتھ جاتے۔

ایک دن احمد نگر میں کنو کے باغ میں حضور پھر رہے تھے کہ فرمایا چھوٹی سی مشین ہے جو درختوں کو کاٹتی ہے۔ میں نے امپورٹ کرنا چاہی تو پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ بڑا لمبا پروسیجر ہے۔ میں نے عرض کیا حضور مجھے حکم دیتے میں حال ہی میں یورپ سے آیا ہوں ساتھ لے آتا۔ مجھ سے چھوٹی سی مشین کا کس نے پوچھنا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ حضور A.C پنڈی میرا عزیز ہے۔ ہوائی جہاز کے پاس پہنچا ہوا تھا اور نہ میرے پاس کوئی چیز تھی نہ A.C صاحب کی معیت کے باعث کسی نے تعرض کیا۔ حضور نے فرمایا "تم کام تو نکال لیتے ہو"۔

میں نے عرض کیا کہ حضور میں اس دفعہ کوکا کولا بنانے والی مشین یورپ سے لایا حالانکہ وہ کافی بڑی تھی۔ اسلام آباد ایئرپورٹ پر کسٹم والوں نے پوچھا کیا ہے۔ میں نے کہا کہ کوکا کولا بنانے والی فیکٹری۔ وہ افسر حیران ہوا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں نے کہا ہمارے بڑے نون نور حیات صاحب نون ایم۔ این۔ اے نے لاہور میں بڑی فیکٹری لگائی ہوئی ہے۔ میں چھوٹا سا نون ہوں۔ "چھوٹی سی فیکٹری" میں بھی لے آیا ہوں۔ وہ مسکرایا تو پھر لے جاؤ ہمارے پاس اس پر ٹیکس لگانے کا کوئی شیڈول نہیں ہے۔

مجھے گھر والوں نے ایک دن ربوہ بھیجا کہ حضور سے عبدالبصیر بیٹے کے نکاح پڑھانے کی منظوری اگر لے سکو۔ میں شام کے وقت حاضر ہوا۔ میں نے کہا حضور جس دن جس وقت جس ماہ جس سال حضور کو فرصت ہو۔ اس عاجز کے بیٹے کا نکاح پڑھا دیں تو عنایت ہوگی۔ حضور نے وعدہ فرما لیا اور پھر گھوڑ دوڑ ہو رہی تھی حضور خود تشریف فرما تھے۔ میں بھی حضور کے قدموں میں بیٹھا ہوا تھا۔ حضور نے لاؤڈ سپیکر پر

اعلان کروادیا کہ جب عبدالبصیر نون گھوڑا دوڑانے کے لئے میدان میں آئے تو اعلان کردینا کہ اگر عبدالبصیر کلّہ اُٹھالے گیا تو میں آج ہی اس کا نکاح پڑھادوں گا چنانچہ بصیر کلّہ اُٹھا کرلہراتا ہوا لے گیا اور حضور نے اسی شام نکاح پڑھادیا بلکہ اس سے پہلے اس کے لئے رشتہ کی تجویز میں نے حضور کی خدمت میں کاکول میں پیش کی تو حضور نے فرمایا تم نہ بات کرنا میں ربوہ آیا تو مجھے یاد کرادینا۔ چنانچہ خود حضور کے ہاتھوں ہی یہ فیصلہ بھی ہوا تھا اور پھر حضور اس کی برات میں بھی سیّدہ حضرت بیگم صاحب کے ساتھ شامل ہوئے۔

پھر میں نے عرض کیا کہ حضور تین بیٹیاں ہیں ان کے لئے دعا کریں کوئی مناسب رشتے ہوجائیں تو فرمایا جو تجویز تمہارے پاس آئے تم مجھے بتادینا فیصلہ میں خود کروں گا۔ دلربائی اور دلداری اور بندہ نوازی کے عجیب انداز تھے۔ مختصر سی بات کر کے دل جیت لینا یہ حضور کا ایک نہایت حسین طریق تھا۔ ؎

شکر خدا گزر گئی راز و نیاز میں ہی عمر
مجھ کو بھی ان سے عشق تھا ان کو بھی مجھ سے پیار تھا

20/21 سال کا ساتھ یادوں کی برات ہے۔ یادیں ایک کے بعد دوسری قطاریں باندھے کھڑی ہیں ساری تو نہیں لکھی جاسکتیں۔

واحسرتاؔ وہ بھی چل بسے۔ بجا کہ موت اٹل حقیقت ہے لیکن یہ ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ جانے والا سینہ ودل پر ایک سلگتا ہوا انگارہ دے جاتا ہے۔

میری عقیدتوں کے ایک ''قمر'' حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب نے حضرت منشی ظفر احمد صاحب کپورتھلوی کی وفات پر ایک نوٹ لکھا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ روحوں کی بالیدگی کا موجب بننے والا ہے۔ لاریب یہ ایک سرمدی ابدی صداقت ہے جو دنیا اور مابعد کے حالات کی صحیح تصویر پیش کرتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ موت ایک عجیب وغریب پردہ ہے۔ جس کے ایک طرف جدا ہونے والے دوست اور اعزا اور خدا کے مقدس فرشتے بلکہ خود خدائے قدوس آنے والے روح کی خوشی میں ایک عروسی جشن کا نظارہ دیکھتے ہیں۔ اللہ اللہ یہ کیسا عجیب منظر ہے کہ ایک طرف صف ماتم ہے اور دوسری طرف جشن شادی اور درمیان میں اڑتی ہوئی انسانی سانس کا پھڑ پھڑاتا ہوا پردہ گویا مرنے والے کے ایک کان میں رونے کی آواز پہنچ رہی ہوتی ہے تو دوسرے کان میں خوشی کے ترانے اور وہ عجیب وغریب مرکب ماحول میں گھرا ہوا اگلے جہان میں قدم رکھتا ہے۔ آگے آپ دُعا کرتے ہیں۔ ''اے اللہ تیرے وہ سارے بندے جو احمدیت کی پاک لڑی میں محبت اور اخلاص کے ساتھ پروئے ہوئے ہیں...... اس وقت تک ان سے موت کو روکے رکھ جب تک کہ تیری قدرت کا طلسمی ہاتھ انہیں گناہوں سے پاک وصاف کر کے تیرے قدموں میں حاضر ہونے کے قابل بنادے۔ تاکہ ان کی موت عروسی جشن والی موت ہو...... تیری اس عظیم الشان رحمت کی قسم ہے جو تیرے پاک مسیح کی بعثت کی محرک ہوئی کہ تو ایسا ہی کر آمین یا رب

العالمین۔‘‘

اس محسن اور مشفق ’’چاند‘‘ بلکہ ’’چاندوں کے چاند‘‘ کے بارہ میں بھی انشاء اللہ ایک شذرہ لکھوں گا تاکہ کچھ تو احسانوں کا بوجھ ہلکا ہو اور کچھ تو قرض اُترے جس کے نیچے میں دبا ہوا ہوں۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی وفات جس رات کو ہوئی نہ معلوم مجھے کہاں سے آواز آئی ’’حضور فوت ہو گئے ہیں‘‘ یہ آج تک معمہ ہی ہے۔ میں ہڑبڑا کر اندھیرے میں پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس اندوہناک آواز کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ اگرچہ میرا ذہن کسی سوچ و بچار کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ میرے گھر والے قریب ہی سوئے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ آنسو بھی نہ نکلے کہ دل پر سلگنے والی آگ کو بجھا سکتے اور میں گم صم بیٹھا تھا۔ گردوپیش سے بالکل بے خبر وحشتوں میں گھرا ہوا یہ آواز کہاں سے آئی۔ جھوٹی بھی ہو سکتی ہے۔ اگر یہ سچ نکلی تو کیا حال ہوگا۔ آخر کچھ دیر میں اپنے آپ کو سنبھالا دیا۔ پتہ تو کرنا چاہئے۔ پہلے خیال کیا حضرت مرزا عبدالحق صاحب سے پتہ کیا جائے فون کر کے۔ پھر خیال آیا انہیں آدھی رات کے وقت کیوں پریشان کیا جائے۔ آخر میں نے اپنے کمرے کی بتی جلائی اور حضور کے جائے قیام اسلام آباد فون کرنے کا فیصلہ کیا۔ کسی صاحب نے فون اُٹھایا اور ’’انا للہ‘‘ پڑھا۔ آگے کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہ پڑی۔ شُکر ہے کہ آنسوؤں کی برسات شروع ہوئی۔ ورنہ ایسے میں دم گھٹ کر بھسم ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے اور سب گھر والے اُٹھ بیٹھے اور میرے غم والم میں شریک ہو گئے اور میں نے یہ شعر پڑھے۔ ؎

لو آیا میرے دل پر اک نئی افتاد کا موسم
مجھے لگتا ہے ہر موسم ستم ایجاد کا موسم

بالآخر 1982ء میں سیّدنا حضرت حافظ مرزا ناصر احمد خلیفۃ المسیح الثالث بھی ہم سے چھن گئے۔ وہی جری جوان رعنا جو طارق بن زیاد کی طرح ساحل اندلس پر اُترا تھا۔ نہیں نہیں اس کا جذبہ طارق سے کہیں فزوں تر اور مبارک تر تھا۔ جس میں کسی قسم کی دنیاوی ملک گیری اور حکومتی جاہ وحشم کی کوئی بھی تمنا نہ تھی۔ وہ تو دین حق کے ہاتھ سے اس ملک کے نکل جانے کا غم لے کر اور پھر کئی شب و روز اسی رنج والم میں سلگتا رہا سو نہیں سکا تھا۔ دعاؤں میں سارا وقت گزارا۔ اس کے مولیٰ نے اس کی زاری سن لی، قبول فرمالی اور ’’بشارت‘‘ کی صورت میں بشارت عطا کی۔ تب میرے محترم اور محسن بزرگ بھائی ثاقب زیروی کے دکھی دل سے یہ صدا ایک ہوک کی صورت اُٹھی اور حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کی زیر صدارت اکتوبر 1982ء میں جب خود حضور ایک فرشی نشست پر تشریف فرما تھے۔ انصاراللہ کا اجتماع ختم ہونے کے دن آخری اجلاس میں اپنے مخصوص انداز میں ایک نظم پڑھی تھی جس سے سامعین کی آنکھیں بے اختیار بہہ نکلی تھیں اور سنیں وہ یہ آواز تھی ؎

صدیوں کے پرانے خوابوں کو ہم نے زندہ تعبیریں دیں
خوابیدہ فضائیں جاگ اُٹھیں اُبھری جو ''ندا'' میناروں سے
افلاک پہ روح ناصر دیں جھوم اُٹھی فرط مسرت سے
جب آئی نوید فتح و ظفر اسپین کے لالہ زاروں سے

اور جب آخری شعر پڑھا تو نہ صرف پڑھنے والے کا بلکہ سبھی حاضرین کا حال بسمل نیم جاں کا سا تھا اور حالت سب کی نا قابل بیان۔ وہ شعر یہ تھا۔ ؎

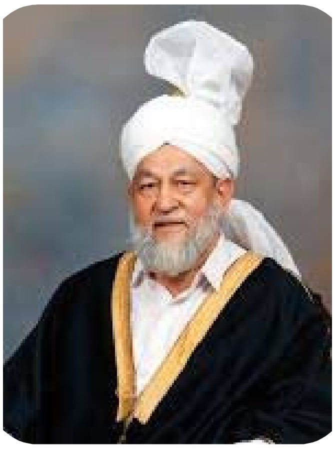
ثاقب یہ کرم بھی کیا کم ہے ناصر جو لیا طاہر بخشا
ورنہ دیوانے مر جاتے سر ٹکرا کر دیواروں سے

جب کارروائی اجلاس ختم ہوئی۔ دعا ہوئی تو میں اپنے عزیزوں کو لے کر جلدی جلدی اپنی موٹر کی طرف بڑھا کہ ہم نے اس روز شیخوپورہ جانا تھا اور پھر واپس بھی آنا تھا کہ بھائی ثاقب نے پیچھے سے آواز دی میاں صاحب میاں صاحب! مجھے یہ سمجھ نہیں آئی کہ کوئی مجھے بلا رہا ہے۔ میں نے کہا یہاں سارے ہی میاں صاحب ہیں۔ آخر مُڑ کر دیکھا ثاقب بھائی تھے۔ میں نے بے ساختگی سے کہا کہ بھائی آج تو آپ نے ذبح کر دیا ہے یہ شعر سنا کر۔ بھائی بولے نہ معلوم میرے دل کے کس قدر ٹکڑے یہ شعر لکھتے ہوئے ہو گئے تھے۔

الوادع۔ اے محبتوں کے سفیر اے نفرتوں کو جڑوں سے اکھیڑنے والے اور محبوں کے داعی۔ اے وہ جس نے محبت سب کے لئے نفرت کسی سے نہیں کا وہ زریں اصول عطا فرمایا۔ جو مشارق اور مغارب میں مقبول ہوا اور جو اپنوں اور غیروں نے دنیا کی اقوام و ملل کی ساری بیماریوں اور سارے تنازعات اور جنگوں کے لئے ایک نسخہ کیمیا تسلیم کیا۔ اے ہمارے محبوب! تجھے یہ سنہری کلام کہاں سے موہبت ہوا یقیناً عرش الٰہی سے۔ ''جان و مال و آبرو حاضر ہیں تیری رہ میں'' یہ ایک مصرع طرح تو نے قوم کو دیا اور پھر اس پر اپنے اپنے رنگ میں طبع آزمائی کی اس لئے کہ یہی حیات مستعار کا ماٹو تھا۔

اے محبوب الٰہی تو نے ہمیشہ ہمیں یہی مختصر مگر جامع نصیحت کی کہ ''اللہ تعالیٰ سے صلح کر لو'' یہ تیری ادائیں نہ بھولی ہیں نہ بھولیں گی۔ ہم تیرے لئے بلند مراتب کی عاجزانہ دُعا کرتے ہیں۔ تیرے احسانوں کا بدلہ کیسے اُتار سکتے ہیں۔ جا اور اپنے رب کریم سے بہترین صلہ وصول کر۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁



حضرت سیّدنا مرزا طاہر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الرابع

ہر گلے راہ رنگ و بوئے دیگر است

ہر چند کہ گزشتہ برس حضور کے بارہ میں دو مضامین سپرد قرطاس کر چکا ہوں مگر حضور کی شش جہات شخصیت پر جتنا لکھا جائے کم ہے۔ کوشش یہی ہوگی کہ کوئی واقعہ دہراؤں نہیں لیکن اگر یاد داشت کہیں ساتھ نہ دے تو معذرت۔ حضور نے قریباً پونے دو سال ہی خلافت کے پاکستان میں گزارے تھے کہ حالات نے وطن چھوڑنے پر حضور کو مجبور کر دیا۔

1944ء میں سیّدنا حضرت مصلح موعود نے پیشگوئی فرمائی تھی کہ شرک کے زمانے میں میں دوبارہ دنیا میں آؤں گا جس کے معنی یہ ہیں کہ میرے جیسی طاقتوں والا ایک انسان ظاہر ہوگا اور جو میرے طریق پر چلے گا۔ یہ الفاظ تو میرے ہیں مگر مفہوم یہی ہے۔ وہ زمانہ جس میں اللہ کے نام لینے پر قدغن تھی، جس میں کلمہ توحید پڑھنے پر تعزیریں تھیں ہم نے دیکھا کہ سیّدنا حضرت مرزا طاہر احمد صاحب اپنے والد ماجد سے اس لحاظ سے بھی مثیل تھے۔ بیان طویل ہو جائے گا اگر ساری مشابہتیں گنوانی شروع کر دوں۔ ایک کا ذکر کر دیتا ہوں کہ سیّدنا حضرت محمود بھی ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے اور آپ بھی ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے نیز یہ کہ سیّدنا مصلح موعود نے 18 سال کا زمانہ مہجوری میں گزارا جبکہ سیّدنا حضرت مرزا طاہر احمد صاحب کا 18 / 19 سال کا زمانہ وطن سے دور گزرا۔ پھر سیّدنا حضرت مصلح موعود بھی دارالہجرت میں ہی فوت ہوئے اور یہیں دفن ہوئے۔ اسی طرح حضرت خلیفۃ المسیح الرابع بھی جلا وطنی کے دوران اللہ کے حضور حاضر ہوئے اور وہیں ''اسلام آباد'' میں مدفون ہوئے۔ یہ مشابہتوں کا بیان بہت شیریں ہے مگر الفضل کی تنگ دامانی کا احساس یہیں پر رُک جانے پر مجبور کر رہا ہے۔ دیارِ غیر میں جو حضور نے کام کئے اور جو کامیابیاں نصیب ہوئیں ان کا شمار ممکن نہیں۔ ہر ہر قدم پر الٰہی نصرتوں اور سماوی تائیدات کے نظارے ہر چشم بینا نے دیکھے اور ایک زمانہ اس کا شاہد ہے۔ ایم ٹی اے کے ذریعہ اشاعت دین حق غیروں میں اور تربیت و تعلیم کے کارنامے اپنوں میں عدیم المثال ہیں اور اگر حساب کرنے پر بیٹھیں اور ایک طرف اپنی جماعت کی محدود استطاعت کو رکھیں اور دوسری طرف ایم ٹی اے کے اجراء اور اس کے پھیلاؤ پر نگاہ دوڑائیں تو عقل اس کے جمع خرچ اور حساب کتاب تو سب فیل ہو جاتے ہیں اور اسے جو نشان آسمانی یقین نہیں کرتا وہ ناقابل علاج مریض ہے۔ اللہ اس کی عقل و خرد اور بصیرت کو بحال کرے۔

مامورین کا ابتدائی دور ہمیشہ ابتلاؤں مخالفتوں اور دکھوں کا ہوتا ہے۔ ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے ہر دور میں جماعت عداوتوں

اور نفرتوں کا نشانہ ستم بنی رہی ہے۔صداقتوں کے دشمنوں کے ترکش میں کوئی تیر نہیں تھا جو ہماری طرف نہیں پھینکا گیا۔ پھر حضور کا احساس دل اور جماعت کے ہر فرد کے درد و کرب کو ایسی شدت سے محسوس کرنے والا دل اور پھر اسیران اور سزا ہونے والوں کے احوال پر اور بیوت سے اللہ اور اس کے رسول کے ناموں کے کھرچنے کے دردناک واقعات نے قلب مطہر پر سخت چوٹیں لگائیں اور پھر سنگ وخشت یا فولاد سے تو بنا ہوا نہیں تھا۔اس میں تریڑیں آ گئیں اور پھر آخر ٹوٹ ہی گیا۔

اللہ والوں نے تو اس درد و کرب وبلا کی جزائیں کریم ورحیم رب سے وصول کیں۔حیرت ہے کہ کسی کو دماغ نہیں کہ فرعونوں اور ہامانوں کے عبرتناک انجام پر بھی غور کرے اور عبرت پکڑے۔سبھی یہ کہہ کر چلے جاتے ہیں کہ یہ حادثات اور سانحات ہوتے ہی رہتے ہیں۔

میں سیّدنا حضرت مرزا طاہر احمد صاحب کا مختصر احوال بیان کر کے اس بیان کو ختم کروں گا۔یہ عرض کر دینا کہ حضور سے رسمی تعارف تو لڑکپن سے ہی تھا۔جب میں نے ہائی سکول بھلوال اور حضور نے ٹی آئی ہائی سکول قادیان سے ایک ساتھ امتحان پاس کیا۔مگر حضور کے ساتھ گہرے تعلقات کی بنیاد ربوہ میں ہی پڑی۔خلیفہ وقت کی خدمت میں خطوط لکھنا تو میں نے 1939ء سے شروع کیا جب میں ہائی سکول میں داخل ہوا۔میری عمر اس وقت 13 سال کی تھی اور پھر حضور کے جواب کا منتظر رہتا۔اب 65 سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔آج تک یہ معمول میں نے چھوڑا نہیں اور خواہش بھی یہی ہے کہ میں عمر بھر خلیفہ وقت کی خدمت میں دعا اور توجہ کریمانہ کی غرض سے ہمیشہ رابطہ رکھوں اور میری اولاد بھی قیامت تک۔آج کل فیکس کیا کرتا ہوں۔قریباً ہر ہفتے ایک فیکس تو میں نے لازم قرار دیا ہوا ہے۔کبھی کبھی اس سے زیادہ بھی لکھتا ہوں۔

خلافت سے قبل ایک بار ادرحمہ سے باہر ایک جلسہ گاہ بنائی گئی۔ہم ہلال پور سے شامل ہونے کے لئے 4/5 آدمی آئے۔بہت روح پرور وہ خطاب تھا جس کی تفاصیل بھی ذہن میں مستحضر ہیں۔اس کے بعد یا شاید پہلے کھانے کے لئے ایک مکان کی بیٹھک میں حضور اور حضور کے ساتھ آنے والے دوستوں کو لایا گیا۔ہم ادھر اُدھر ہو گئے کہ نواحی گاؤں سے آئے ہوئے تھے اور غالباً کھانا بھی کھایا ہوا تھا۔مہمان خصوصی کے ساتھ شریک طعام ہونا ادب اور تہذیب کے خلاف تھا۔ادھر سے آدمی آیا کہ میاں صاحب آدھ گھنٹے سے تمہارا انتظار فرما رہے ہیں۔اسے بلاؤ تو کھانا کھائیں گے۔پھر تو مجھے شرم آئی کہ آپ کی کوفت کا موجب بنا ہوں۔غرض اس خاندان کی وفاؤں اور اعلیٰ تہذیبی روایات کا ادراک بھی ہم ایسے کم فہموں کے بس میں نہیں ہے۔کجا یہ کہ کوئی ان کی ہمسری کا دعویدار ہو۔یہ ''رجال فارسی'' اس دور کے ہر لحاظ سے بلند مرتبت اور اونچی جدا شان کے مالک ہیں۔حضرت مضطر ہی کچھ ان کا ذکر کر سکتے ہیں جو قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ علم وفضل میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں۔مثلاً فرماتے ہیں۔ ؎

اس حسن مجسم نے مسحور کیا سب کو

اپنے بھی غلام اس کے بیگانے بھی گرویدہ

یا پھر رشید قیصرانی جنہوں نے اپنے استاد سے عشق ومحبت کے سبق سیکھے۔ استاد اور شاگرد کے الفاظ جدا جدا ہیں۔مضمون واحد ہے۔

ے

میرا معتبر حوالہ کوئی ہے تو بس یہی ہے
تیری اک نظر کا صدقہ میری ساری زندگی ہے
میرے نقد جاں کے یوسف کوئی بھیج اب نشانی
تری راہ تکتے تکتے میری آنکھ بجھ گئی ہے

بھائیو اور بہنو اصل بات یہی ہے کہ ہم کہاں اور وہ کہاں، پر رحم آڑے آ گیا۔ہم بے حقیقت لوگ اور وہ دین ودنیا کے علوم کے شناسا اور ہر لحاظ سے اونچے درجے والے۔کوئی بھی تو نسبت نہیں۔محض کرم اور عنایت ہے جو پوچھتے تھے یا خیال رکھتے تھے۔

اسی طرح موجودہ حضرت صاحب ہیں۔حضرت فضل عمر کے نواسے اور وہ جو ''بادشاہ آیا'' جس نے فقیری میں بھی بادشاہی کی۔اس کے پوتے حد درجہ مہربان، وفا ومحبت مجسم۔شیخ ابوبکر خالص عمل کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں۔

''خالص عمل وہ ہے جس کا فرشتے تک کو علم نہ ہو کہ لکھ سکے۔شیطان کو بھی خبر نہ ہو کہ خراب کر سکے اور نہ ہی نفس کو پتہ چلے کہ اس پر فخر کر سکے۔''

حضرت صاحب فطرتاً ہی ''خالص عمل'' کرنے کے عادی ہیں۔**اللّٰھم زد و بارک**

میں متذکرہ بالا تینوں بزرگ اور قابل تقلید ہستیوں کا ذکر کیوں بار بار کرتا ہوں کوئی اور موضوع نہیں ملتا۔نہیں یہ بات نہیں۔میری تنہائی، اداسی، دل کی افسردگی اور ویرانی جب مجھے گھیر لیتی ہے اور دم گھٹنے لگتا ہے۔کبھی حضرت فضل عمر کی شیریں اور روح پرور داستانوں کو یاد کر کر کے تصور میں حضور کی محفل میں جا کر بیٹھتا ہوں۔کبھی سیّدنا حضرت حافظ مرزا ناصر احمد صاحب کی خدمت میں اکیلے بیٹھنے کے مزے یاد کر کے انہیں ایک واقعہ سناتا ہوں تو حضور فرماتے ہیں ایک دفعہ پھر سناؤ۔پھر عالم تصور ہی میں باہر سے آواز سنائی دیتی ہے کہ حضور مغرب کی نداہو گئی ہے۔میں اجازت طلب کرتا ہوں۔حضور کے پیار ومحبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے فرماتے ہیں۔اچھا اجازت دیتا ہوں۔ایک دفعہ پھر وہی واقعہ سناؤ۔اس ایک واقعہ کو حضور نے تین بار سُنا۔کبھی قادیان میں سیّدہ حضرت امّاں جان کی کوٹھی کی طرف حضور کی صاحبزادی کو اٹھا کر ساتھ ساتھ چل رہا ہوں اور پھر وہیں پر آسمانی مائدہ سے لطف اندوز ہونے کا حکم اور وہیں رات بھر ٹھہرنے کے لئے ایک الگ کمرے کا بندوبست۔پھر کبھی حضرت سیّدنا طاہر مطہر کا میرے غریب خانہ پرواردہونا۔میرے دو بیٹوں کے

دعوت ولیمہ پر حضور دورہ پر ہونے کی وجہ سے نہ پہنچ پائے تھے۔ دوسرے یا شاید تیسرے دن تشریف لائے۔ فرمایا ''ولیمی کھانے آیا ہوں'' ان دنوں میں کیسا زندہ آدمی تھا اب تو اک شخص نے مجھے مار دیا ہے۔ ''ولیمی'' تناول فرما رہے تھے اور یہ امر موجب اطمینان و فرحت ہے کہ اسی کمرے میں اسی جگہ پر میں نے اپنا پلنگ بچھایا ہوا ہے۔ فرمایا ''ولیمی یہ ہے تو ولیمہ کیا ہوگا''۔ کمترنوازی کے اسلوب کوئی اس مقدس خاندان سے سیکھے۔

پھر میں دل کے ہاتھوں بیمار پڑا تو موجودہ حضرت صاحب مع حضرت بیگم صاحبہ کے بغیر اطلاع تشریف لائے۔ اس طرح میری بیماری بھی میرے لئے موجب صد برکت ورحمت بن گئی۔

الغرض ان مقدس وجودوں کے ذکر سے میرے جسم وجان میں تازگی اور شگفتگی اور روح میں بالیدگی آ جاتی ہے اور یہ بزرگ ہستیاں دنیا میں نہیں رہیں مگر ان کے فیوض وبرکات اور ان کی دعائیں مسلسل میرے ساتھ ہیں۔ ورنہ تو ویرانی ہی ویرانی تھی۔

ان تینوں خلفائے عظام کی یادوں کے نقوش اور ان کی اخلاقیات کے آثار آج بھی ان کے عقیدتمندوں اور نیازمندوں کے لئے نظر افروز ہیں۔ ان کو دیکھا دل نے انہیں مانا اور پہچانا مگر قلم ان کا خاکہ کھینچنے سے قاصر ہے۔ ان کی اخلاقی اور روحانی زندگی کے بہت سے پرتو تھے مثلاً استغناء، وسعت قلب، متانت، اخلاقی عظمت، فراست، غیرت دینی، رواداری اور شگفتہ مزاجی کیا کیا بیان کروں۔ اپنے مصمم ارادوں کی زنجیر میں زمانے کے گرد وپیش کو جکڑ لیتے تھے۔ ان کی تعریف یہیں پر توختم نہیں ہوجاتی۔ میری دون ہمتی کے باعث یہی کچھ لکھ سکا ہوں۔ مصلح الدین راجیکی نے سچ لکھا ہے۔ ؎

درد والے ہی جان سکتے ہیں
درد مندوں کی ناشکیبائی
یہ بھی شاید تیری عنایت ہے
بیٹھے بیٹھے جو آنکھ بھر آئی
میں جو بھولا تو غم زمانے کے
یاد آئی تو تیری یاد آئی

(روزنامہ الفضل ربوہ 24/دسمبر 2004ء صفحہ 3 تا 4 و 27/دسمبر 2004ء صفحہ 3 تا 4)



حضرت صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب بھی ہاتھ چھڑا گئے

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

حضرت صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب میرے محترم استاد اور پھر میرے آقا و مرشدؒ کے چھوٹے بھائی تھے۔ بہت عزلت پسند، کم آمیز اور نفیس طبیعت پائی تھی۔ سیّدنا حضرت مسیح موعودؑ کی وفات کے بعد قدرتی طور پر سیّدہ حضرت اماں جان پر اُداسی اور تنہائی کا احساس غالب رہتا تھا تو اس کا علاج سیّدنا حضرت مصلح موعود نے یہ کیا کہ حضرت خلیفہ اوّل کے زمانہ میں اپنے فرزند اکبر صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب جبکہ ان کی عمر 6/7 سال تھی، کی انگلی پکڑے حضرت اماں جان کے پاس لے گئے اور حضرت اماں جان کے ہاتھ میں صاحبزادہ صاحب موصوف کا ہاتھ دے کر عرض کیا کہ اماں جان ناصر احمد آپ کا بیٹا ہے یہ آپ کے پاس ہی رہے گا۔ چنانچہ صاحبزادہ صاحب موصوف تو حضرت اماں جان کے گھر رہے۔ حضرت سیّدہ ناصرہ بیگم صاحبہ مدظلھا کے بعد بیٹوں میں سب سے بڑے صاحبزادہ مرزا مبارک احمد ہی تھے جو سیّدنا حضرت مرزا محمود احمد صاحب کی توجہ خاص کا مرکز بنے۔ صاحبزادہ صاحب نے ایک کتاب موسومہ ''یادوں کے دریچے'' تحریر فرمائی تھی۔ غالباً طبع نہیں ہوئی۔ اس کا مسودہ میری درخواست پر حضرت ممدوح نے مجھے اپنے دستخطوں سے ارسال فرمایا تھا۔ اس میں حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب کے سیّدہ حضرت اماں جان کے سپرد کرنے کا واقعہ درج ہے۔

پھر اس میں صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب لکھتے ہیں کہ ''1924ء کے بعد شاید ہی کوئی ایسا سفر ہو جس میں حضور مجھے ساتھ نہ لے گئے ہوں۔''

میری خوش بختی کہ مجھے حضرت مسیح موعود کی ساری مبشر اولاد سے فیض پانے کے مواقع ملے۔ یہاں میں خاص طور پر سیّدہ حضرت نواب مبارکہ بیگم صاحبہ کا ذکر کروں گا کہ ایک دفعہ آپ کے صاحبزادے نوابزادہ محمد احمد خان صاحب کا ایک الجھا ہوا زمین کا مقدمہ کمشنری سرگودھا میں تھا جس کی پیروی اس عاجز کے سپرد تھی۔ نوابزادہ کا یہ دستور قابل صد رشک رہا کہ ضلع خوشاب میں اپنی کوٹھی جو زمینوں پر تعمیر کی ہوئی تھی وہاں رہائش رکھتے تھے یا کراچی میں جایا کرتے تھے۔ جہاں کہیں بھی ہوں تو روزانہ ایک پوسٹ کارڈ حضرت خلیفہ وقت کی خدمت میں دُعا کے لئے اور ایک خط اپنی اماں جان کی خدمت میں لکھتے۔ مجھے بھی ان کے ساتھ (خان محمد احمد خان صاحب

کے ساتھ) بہت قریبی تعلق رہا۔ وہ بہت مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ ان کی سیرت کے کئی حسین پہلو مجھ پر ظاہر ہوئے جن کا ذکر اس جگہ موجب طوالت ہوگا۔ جو مقدمہ سرگودھا میں تھا اس سلسلے میں بھی کامیابی دعاؤں سے ہی ہوئی۔

جب مقدمہ کا فیصلہ ہوا تو موصوف کراچی میں قیام پذیر تھے اور اپنی امی جان (حضرت سیّدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ) کو مسلسل اپنی پریشانی کے عالم میں روزانہ خط لکھتے۔ میری بھی حضرت ممدوحہ سے خط و کتابت تھی۔ آپ نے مجھے لکھا کہ ''محمد احمد بہت پریشان ہے کوشش کریں کہ اسے کامیابی ہو''۔ چنانچہ حضرت صاحب کی دعاؤں سے اور سیّدہ حضرت نواب مبارکہ بیگم صاحبہ کی مقبول دعاؤں سے فیصلہ تو نوابزادہ صاحب کے حق میں ہوا میں نے فیصلہ ہوتے ہی بذریعہ تار حضرت سیّدہ ممدوحہ کو کامیابی کی فوری اطلاع دی۔ انہوں نے نوابزادہ صاحب کو کراچی مطلع کر دیا۔ چونکہ بیٹے کی پریشانی سے شفیق والدہ بھی متفکر تھیں۔ اس لئے میرا تار ملنے پر آپ بہت خوش ہوئیں اور مجھے لکھا کہ تم آج سے میرے بیٹے ہو اور مجھے اپنے ہاں طلب فرمایا اور دعائیں دیں۔ اس کے بعد میں فخر سے حضرت ممدوحہ کو حضرت امی جان لکھ کر ہی مخاطب کرتا تھا۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے بھی دعا کی درخواست کرتا اور مجھے آپ جواب سے سرفراز فرماتیں۔ آپ کے کچھ خطوط میرے پاس ابھی محفوظ ہیں۔ جب ایک ایک کر کے یہ مبارک نسل اللہ کو پیاری ہوئی حضرت مسیح موعود کی آخری نشانی حضرت سیّدہ امۃ الحفیظ بیگم صاحبہ تھیں وہ بھی مجھ پر محض للہ بے حد مہربان تھیں۔ جب وہ فوت ہوئیں تو برادرم عبدالمنان ناہید صاحب نے نوحہ لکھا تھا۔ ایک شعر اس طرح تھا۔ ؎

صبا قادیاں کو بھی جا کر بتا
کہ آج اس کا الدار خالی ہوا

کیونکہ آپ حضرت مسیح پاک کی صاحبزادی تھیں جو پانچوں میں سے آخر میں فوت ہوئیں تو تیسری نسل نے میری دستگیری فرمائی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث تو عرصے سے میرے مشفق مربی اور گویا میرے باپ ہی تھے۔ حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب نے مکمل طور پر بغیر میری کسی خوبی کے مجھے اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا۔ لطف و وفا کی صفات تو انہیں مقدس باپ دادا سے وراثت میں ملی تھیں۔ جیتے جی انہوں نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مگر ابھی تک صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب سے رسمی تعارف کے باوجود بے تکلفانہ ملاقاتوں سے مشرف نہیں ہوا تھا کہ ایک دن میرا نصیبہ جاگا۔ ہلال پور میں ہماری نئی تعمیر شدہ عبادت گاہ اور ساتھ ہمارے گھر اور دارا اور بارہ دری وغیرہ کی وڈیو فلم تیار کرنے کے لئے غالباً جرمنی سے تشریف لائے ہوئے دوستوں کی ایک پارٹی ہلال پور آئی۔ انہوں نے میرا انٹرویو ریکارڈ کیا اور پھر یہ کہہ کر کہ ابھی آدھ گھنٹے کی فلم (Casette) میں گنجائش ہے۔ کسی دن ربوہ آ کر تم کچھ اور حالات ریکارڈ کروا جانا۔ چنانچہ تعمیل ارشاد میں میں ربوہ گیا۔ جب فارغ ہوا تو نہ جانے کیسے مجھے ہمت ہوئی۔ پہلے کچھ خیال بھی نہیں تھا۔ وہیں

محترم ماسٹر احمد علی صاحب کے گھر سے جہاں میرا پیغام ریکارڈ ہوا۔ میں نے فون اُٹھایا۔ محترم جناب صاحبزادہ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت میں نے اپنے گاؤں میں ایک عبادت گاہ چھوٹی سی بنائی ہے کسی روز آپ وہاں تشریف لاویں تو کرم ہوگا۔ آپ نے فوری طور پر فرمایا ہاں تو میں آجاؤں گا۔ میں چونکہ ایسے جواب کی ہرگز توقع نہیں رکھتا تھا۔ یہ جواب سن کر میرے خوشی کی انتہا نہ رہی۔ معلوم ہوتا ہے اس روز آپ کے وجود کا دریا کرم خاص تموج میں تھا۔ میں نے کہا کہ جناب میں پھر نعرہ ماردوں فرمایا ''بیشک'' مگر ایک شرط ہے۔ وہاں میں چند منٹ ٹھہر سکوں گا۔ میں نے عرض کیا سیّدنا حضرت مسیح موعودؑ کے پوتے کا ایک منٹ کے لئے آنا بھی ہمارے لئے ہزار برکتوں کا موجب ہوگا۔ مگر چند منٹوں میں آپ کھانا کیسے کھاسکیں گے۔ فرمایا کھانا تو میں نہیں کھاؤں گا، بیمار ہوں، پرہیزی کھاتا ہوں۔ میں نے عرض کیا (اور اب میں آپ کی غیر متوقع مہربانی سے ''شیر'' ہو چکا تھا) کہ پرہیزی جو آپ کھاتے ہیں وہی پک جائے گی۔ بہرحال مان گئے مگر ان کے ذہن میں بعض وجوہات کی بنا پر تحفظات تھے جس لئے جلد واپسی کا فرماتے تھے۔ دیسی مرغ اور مچھلی وغیرہ کا بندوبست کیا ہوا تھا اسی طرح اور بھی ہلکی پھلکی بعض ڈشیں ایک بیمار کے لئے جو مناسب سمجھا۔ آپ کی آمد کے لئے جمعہ کا دن مقرر ہوا تھا۔

ہم چشم براہ تھے اور رحمہ اور تخت ہزارہ سے آپ کی آمد کا سن کر لوگ ہمارے ہاں جمع تھے۔ ہم دو کاروں میں گاؤں سے باہر آدھا میل جاکر انتظار کرنے لگے۔ آخر وقت مقررہ پر آپ کی سواری آگئی۔ آپ کے ہمرکاب صاحبزادہ مرزا مجیب احمد صاحب اور آپ کے پرانے ساتھی مرزا امتیاز احمد صاحب بھی تھے۔ میں نے موٹر میں بیٹھے بیٹھے ہی مصافحہ کیا اور رہنمائی کے لئے ایک کار آگے اور ایک پیچھے کر دی۔ اس دوران کئی غیر احمدی بھی وہاں ہمارے دارا پر جمع ہو گئے تھے۔ جب آپ کی کار گیٹ کے اندر داخل ہوئی تو ایک غیر احمدی محمد نامی نے آپ پر نظر پڑتے ہی پُرزور نعرہ لگایا۔ آپ کو بٹھایا اور جلد ہی عرض کیا کہ واش روم ساتھ ہے آپ جانا چاہیں تو۔ آپ گئے تو جب واپس آئے تو بہت خوش ہوئے کہ ایسا صاف ستھرا واش روم کا انتظام ہے۔ تو مجھے کوئی جلدی واپسی کی نہیں ہے۔ دراصل میں گھبراتا تھا کہ گاؤں میں مجھے پیشاب کرنے کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے تکلیف ہوگی۔ میں نے دوائیاں کھائی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے پیشاب زیادہ آتا ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ مجھے آں ممدوح کی طبع نازک اور نظافت کے اعلیٰ معیار کا علم تھا۔ میں نے نئے تو لئے کو اچھی طرح دھلا کر اور واش روم کی صفائی اور رگڑائی کی بڑی سختی سے تاکید کی ہوئی تھی جو آپ کے لئے سہولت کا موجب ضرور بنی۔ پھر تھوڑی دیر بعد کھانے کی میز پر تشریف لائے تو چھوٹا سا پیس مچھلی کا۔ اور دیں۔ انہوں نے کمال ادب سے عرض کیا ابا مچھلی بہت اچھی ہے تھوڑی سی اور لے لیں۔ غرض پرہیزی والی شرط بھی ہم نے اپنی دانش اور استطاعت کے مطابق پوری کر دی۔ مگر انہوں نے کم گفتن، کم خوردن، کم خفتن جو صفات و خصائل حسنہ اولیا اللہ کے ہیں ان سے وافر حصہ پایا تھا، بہت کم ہی کھایا۔ وہ شخص جس نے نعرہ لگایا تھا۔ آپ کھانا کھا کر صوفے پر بیٹھے تھے تو اس نے اجازت چاہی کہ آپ کے قدموں میں بیٹھ جاؤں۔ جب اسے اجازت ملی وہ ایک

پنجابی شاعر تھا تو میں نے اسے کہا کہ وہ واقعہ سنائے جو نواحی گاؤں نصیر پور کلاں میں اس کے ساتھ گزرا تھا۔ اس نے بتایا کہ سردیوں کا موسم تھا۔ مجھے نصیر پور کلاں کے رانجھہ قوم کی فرمائش پر ڈھولے سنانے کے لئے وہ لوگ اپنے گاؤں لے گئے۔ جب وہاں کے زمیندار غیر احمدی مولوی صاحب کو علم ہوا تو انہوں نے بڑی سختی سے حکم دیا کہ خبردار یہاں کسی نے ''بک بک کی'' وہاں کے لوگ ان کی برادری کے تھے اور وہ مولوی صاحب خود زمیندار تھے اور بڑے رُعب والے تھے، سردی کا موسم تھا، آدھی رات کو لوگوں نے کہا کہ مولوی صاحب سو گئے ہیں اب تم اپنا کام شروع کرو۔ اس کی خوش قسمتی کہ مولوی صاحب کسی کام کے لئے پھر گلی سے گزرے تو یہ ڈھولے سنا رہا تھا۔ مولوی صاحب وہاں رُکے، پھر دارے کے اندر آئے اور فرمائش کی کہ وہی ڈھولہ پھر سناؤ، مجلس پر سناٹا سا چھا گیا کہ مولوی صاحب کے حکم کی خلاف ورزی پر نہ معلوم کس قدر ناراض ہوں گے۔ شاعر محمد مذکورہ نے معافی مانگی۔

مولوی صاحب نے کہا میں کچھ نہیں کہتا وہی ڈھولہ پھر سناؤ۔ اس میں جو واقعہ تم نے بیان کیا ہے وہ سچا ہے۔ گو میں مرزا صاحب کو نہیں مانتا۔ تو اسے ہمت ہوئی اور اس نے اپنی طرز میں پھر وہی ڈھولہ سنایا۔ مولوی صاحب کو بہت پسند آیا۔ چنانچہ مولوی صاحب نے کہا دوبارہ سناؤ۔ پھر تو شاعر خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا۔

وہ ڈھولہ کچھ اس طرح تھا۔

علم دین اپڑے دی ایہہ نشانی ہے
جیوں مرزا غلام احمد اپڑیا ھا لیکھرام تے
تے سنیا ھا کل خدائیاں

یعنی علم دین راجپال پر اسی طرح حملہ آور ہوا جس طرح حضرت مرزا غلام احمد صاحب نے لیکھرام کا کام تمام کیا تھا۔ دنیا نے سنا تھا لیکھرام کی ہلاکت کا واقعہ اور یہ شاعر کی کم علمی تھی۔ دونوں ہلاکتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مگر اس واقعہ کی برکت سے شاعر کو ساری رات ڈھولے سنانے کی اجازت مل گئی۔ یہ واقعہ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ حضرت صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب کو سنایا اور وہ ڈھولہ بھی پورے کا پورا جس میں اور بھی حملہ آوروں کی مثالیں دی گئی تھیں اور ہلاک ہونے والوں کا ذکر بھی تھا۔ شکر ہے کہ یہ ترکیب حضرت موصوف کی دلچسپی کا موجب ضرور ہوئی۔

جمعہ کا دن تھا کافی احباب جمع تھے۔ میں نے عرض کیا کہ جمعہ پڑھائیں تو آپ نے فرمایا میں تو نماز کرسی پر بیٹھ کر پڑھتا ہوں۔ جہاں جاتا ہوں ''کوئی آدمی'' جمعہ پڑھانے کے لئے ساتھ لے جاتا ہوں۔ آج تو میں کوئی آدمی بھی نہیں لایا اور مجھے ارشاد ہوا کہ خطبہ دوں۔ میں نے کہا مجھے ''اپنا آدمی'' بنالیں تا حشر میں بھی میری اسی نسبت سے شناخت تو ہو کہ حضرت امام الزمان کے لخت جگر کا آدمی ہوں۔

چنانچہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا ٹھیک ہے تم میری نمائندگی کرو۔

میں نے خطبہ جمعہ دیا اور نماز پڑھائی۔ اس روز حضرت مصلح موعود کے صاحبزادے اور نبیرہ مسیح موعود کو اپنے گاؤں میں اور اپنے گھر دیکھ کر میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اور میں نے خطبہ میں عرض کیا کہ حضرت صاحبزادہ صاحب دُعا کریں۔ یہاں سے ساری نحوستیں بھاگ جائیں اور ساری برکتیں آجائیں۔ یہ بڑی سنگلاخ زمین ہے احمدیت کے لحاظ سے اور میں تو اس مبارک تقریب پر بے حد خوش تھا اور قادر کریم کا شکر بجالا رہا تھا جس نے اس مبارک وجود کو اپنی عمر کی کہنگی اور علالت طبع کے باوجود اتنا سفر کر کے ہمارے ہاں بھیجنے کا انتظام فرمادیا تھا اور میں نے خطبے میں اپنی خوشی اور خوش بختی کا کھل کر ذکر کیا اور کسی کے یہ شعر بھی پڑھے۔

اگر کیڑی کے گھر نارائن آئے
تو سمجھو اس پہ رحمت کے ہیں سائے
خدا کی ذات کا ہے یہ بھی جلوہ
دکھائے وہ جسے چاہے دکھائے

نماز جمعہ کے بعد میں نے حضرت صاحبزادہ صاحب سے عرض کیا کہ آپ پسند فرماویں تو ان لوگوں سے جو قریبی جماعتوں سے تشریف لائے ہیں خطاب فرماویں۔ آپ نے فرمایا اندر جا کر باتیں کریں گے۔ اس روز حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کے ہم زلف میجر شیر احمد صاحب کے چھوٹے بھائی غیر از جماعت ملک لیاقت حیات صاحب اعوان بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ حضرت میاں سے انہوں نے بعض امور کے لئے دُعا کی درخواست کی۔ اس سارے دن کی ویڈیو بھی ہمارے ایک عزیز نے تیار کی تھی۔ آپ نے ملک صاحب کی بہت دلداری فرمائی جو اس سے بے حد متاثر ہوئے اور آج تک اس دن کو یاد کرتے ہیں۔

یہ تیسری نسل مبارکہ اپنے باپ دادا کی خُوبُو لئے ہوئے تھی۔ ان کے چہرے پر نور کے ہالے بھی دیکھے جاسکتے تھے۔ چشم بینا چاہئے۔ حضرت میاں صاحب بعارضہ قلب بیمار ہوئے تو راولپنڈی ڈاکٹر بریگیڈیئر ذوالفقار صاحب سے مشورہ کرنے گئے۔ فرماتے تھے کہ میرے واقف نہیں تھے۔ بہت سے مریض ڈاکٹر صاحب کے منتظر بیٹھے تھے۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر صاحب آئے اسی کمرے سے گزرے مجھے دیکھا تو عملے سے پوچھا یہ صاحب کون ہیں جو فلاں جگہ بیٹھے ہیں۔ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو بغیر باری کا خیال کئے فوراً آدمی بھیجا کہ انہیں بلا لائیں۔ فرماتے تھے کہ میں حیران تھا کہ مجھے سب سے پہلے کیوں بُلایا گیا ہے۔ پہلے کبھی تعارف بھی نہیں ہوا تھا اور ڈاکٹر بریگیڈیئر صاحب کہنے لگے آپ پر نظر پڑتے ہی میرے لئے یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ آپ کو منتظر رکھا جائے الغرض ان کے دادا جان کو عرش سے جو پیغام ملا تھا اس میں انہوں نے بھی تو حصہ پایا تھا۔

عشق الٰہی وسے منہ تے ولیاں ایہہ نشانی

اور یہی آبائی چہرے پر نور کی برکت ہی ڈاکٹر صاحب کو متاثر کر گئی۔

26/اپریل 1984ء کو رات دس بجے سیّدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے ہنگامی صورتحال کے پیش نظر ایک میٹنگ بلائی۔ ربوہ سے وکلاء صاحبان تحریک جدید، ناظر صاحبان، حضرت ملک سیف الرحمان صاحب اور سرگودھا سے حضرت مرزا عبدالحق صاحب اور اس عاجز کو رات دس بجے طلب فرمایا۔ اندازاً 20/ 22 کے قریب یہ سب دوست تھے۔ کرسیوں پر حضرت صاحب کے کمرے میں بیٹھے تھے اور سامنے حضرت صاحب ایک تین سیٹوں والے صوفے پر تشریف فرما تھے۔ اس روز کی خبروں کو حضور نے ریکارڈ کروالیا تھا جو ٹیپ ہمیں سنائی گئی اس کے چند منٹ بعد حضرت صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب تشریف لائے تو حضرت صاحب نے اُٹھ کر بڑے بھائی کا استقبال کیا اور فرمایا بھائی آپ میرے پاس آ جائیں اور اپنے پاس صوفے پر بٹھالیا۔ پھر ایک بجے رات تک مختلف موضوعات پر بحث ہوتی رہی اور حضور نے فرمایا کل صبح دن کے دس بجے یہ صاحبان پھر یہاں جمع ہو جائیں۔ اس روز جمعہ تھا۔ چنانچہ پھر سبھی احباب حسب الحکم وہیں پر حاضر ہو گئے۔ اس روز میں نے دیکھا کہ حضرت میاں صاحب نے رات بھی اور اگلے دن بھی بہت مفید مشورے دیئے۔ حالانکہ وہ دن بہت پریشان کن اور ابتلا کے دن تھے مگر کیا مجال جو اس مغل شہزادے کو ذرا بھی گھبراہٹ ہوئی ہو۔ سچ ہے یہ تو وہ لوگ تھے جن کے حوصلے ہیں زیاد۔ سچ فرما گئے تھے مسیح دوراں بیاض مسیحائی میں ؎

سخت جاں ہیں ہم کسی کے بغض کی پرواہ نہیں
دل قوی رکھتے ہیں ہم دردوں کی ہے ہم کو سہار

حضرت صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب کا اس ناقابل فراموش احسان کا ذکر کر آیا ہوں کہ عمر کے آخری سالوں میں کمزور صحت کے باوجود میری درخواست پر ہمارے گاؤں تشریف لائے۔ پہلے یہاں آ کر کچھ وقت ٹھہرنے میں متردد تھے۔ پھر خوش ہوئے اور خواہش کی کہ میری بیگم بھی یہاں آنا پسند کریں گی۔ ہمیں اور کیا چاہئے تھا۔ وہ حضرت مسیح موعودؑ کی نواسی اور یہ حضرت مہدی دوران کے پوتے، ہم نے باصرار تاکیدی گزارش کی کہ ضرور تشریف لاویں اور میری بہو بیٹیاں انہیں خوش آمدید کہیں گی مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ آپ کی بیگم صاحبہ کا انتقال ہو گیا اور یہ ہماری حسرت دل ہی دل میں رہ گئی۔ مگر یہ مغل شہزادہ باوجود اس صدمے کی زد میں آ جانے کے اپنے وعدہ کے مطابق 13/اپریل 1997ء کو دوبارہ تشریف لائے اور ہمارے لئے عید سعید کی خوشیوں کا سامان پیدا فرما گئے۔ اس بار واپس روانگی سے قبل آپ نے بہت رقت آمیز الوداعی دعا کرائی جس دوران ہمارے بھی اتنے آنسو بہہ نکلے کہ ہمیں اس روز کی دعا کی قبولیت کے گویا واضح اشارے مل گئے۔

اور پھر چند دن بعد اللہ تعالیٰ نے ہمارے حالات میں ایسی انقلاب آفریں تبدیلی فرمادی کہ جو یوں ایک واہمہ کی حیثیت رکھتی تھی اور ہر کوئی اس کی امید رکھنے کو ایک پاگل کی بڑ قرار دیتا تھا۔مگر ان اللہ والوں کی مناجات نے ہمیشہ ناممکن کو ممکن بنایا اور ڈوبتی ڈولتی کشتی بحفاظت کنارے لگ گئی۔ ؎

استجابت کے مزے عرش بریں سے پوچھئے
سجدہ کی کیفیتیں میری جبیں سے پوچھئے

اور بقول سیّدنا حضرت مصلح موعودؓ ؎

غیر ممکن کو بھی ممکن میں بدل دیتی ہے
اے میرے فلسفیو زور دُعا دیکھو تو

حضرت صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب نے بحیثیت وکیل التبشیر اور بحیثیت وکیل الاعلیٰ بہت غیر ملکی سفر کئے۔کئی عبادت گاہوں کے سنگ بنیاد رکھے اور کئی ایک کا افتتاح کیا۔بیرونی مربیان کی کارکردگی کا جائزہ لیا اور کئی ممالک میں پریس کانفرنسیں کیں۔

یہ لوگ ایک نشان آسمانی تھے۔موت نے تو ایک نہ ایک وقت آنا ہی ہے۔اس سے نہ صادقین محفوظ رہے نہ اولیاء کرام نہ انبیاءعظام مگر بحیثیت ایک زندہ قوم کا ادنیٰ فرد ہونے کے یہ خواہش ہوتی ہے اور اب تو یہ خواہش ایک دلی تڑپ کی صورت اختیار کر چکی ہے کہ ان کی جگہ لینے والوں کے لئے بہت ضروری ہے کہ اپنے پیشرووں کے نقوش قدوم کی تلاش کر کے اپنے آپ کو اسی رنگ میں ڈھالیں اور وہی خوبیاں اور حسنات اپنے اندر پیدا کریں جو گزر جانے والوں میں تھیں۔تا یہ الٰہی جماعت کہہ سکے کہ ’’جب ہمارا ایک سردار فوت ہو جاتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ لینے کے لئے قریباً اسی خوبو کے ساتھ آگے آجاتا ہے۔‘‘

اب یہ ہماری جماعت پر خاص احسان ہے کہ جماعت کو اللہ تعالیٰ نے مالی فراخی عطا فرمائی ہے۔اس کو بھی ایک امتحان سمجھنا چاہئے اور اس وقت کو نہیں فراموش کرنا چاہئے۔جب 48/ 1947ء میں تقسیم ملک کے بعد جب سیّدنا حضرت مصلح موعود رتن باغ لاہور میں سکونت پذیر تھے تو اپنے سارے خاندان کے حضور خود ہی کفیل تھے۔اسی میں آپ کے بھائیوں اور بہنوں کے بھی خاندان تھے۔مالی تنگی کا زمانہ تھا۔حضور نے حکم دیا کہ ایک وقت ایک چپاتی ہر ایک کو ملا کرے گی اور وہ پنجابی زبان کی روٹی نہیں تھی بلکہ وہ ’’پھلکا‘‘ تھا جو بالکل ’’ہلکا پھلکا‘‘ ہوا کرتا ہے اور ایک روز صاحبزادہ مرزا انس احمد صاحب جو ابھی ان دنوں چھوٹے لڑکے تھے ان کے رونے کی آواز سن کر حضرت ممدوح نے دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے؟ انس کیوں رو رہا ہے تو عرض کیا گیا وہ کہتا ہے اس چپاتی سے میری بھوک نہیں مٹتی۔بھوک لگی ہے۔حضور نے فرمایا اور تو گنجائش نہیں میں آدھ چپاتی کھایا کروں گا۔انس احمد کو ڈیڑھ چپاتی دیا کریں۔

(یادوں کے دریچے، مصنفہ حضرت مرزا مبارک احمد صاحب صفحہ 55 غیر مطبوعہ)

انہی دنوں رتن باغ کے عقبی حصے میں لنگر خانہ مسیح موعودؑ جاری تھا اور ہر کوئی وہاں سے کھانا کھاتا تھا بلکہ یہ ایک لطیفہ ہی ہے کہ ''اسلام'' نامی ایک شخص موضع للیانی ضلع سرگودھا کا رہنے والا کسی مقدمہ کے سلسلہ میں لاہور گیا۔ اسے 2/3 دن وہاں رہنا پڑا تو کھانا مسیح پاک کے لنگر سے کھا آتا تھا۔ یوں سخت متعصب اور دشمن احمدیت کو مفت کھانا ملتا تھا اس لئے اپنے تعصب اور عداوت کو پس پشت ڈال کر وہیں سے کھا آتا تھا مگر مصلح موعود کے اپنے خاندان کی حالت اوپر بیان کر آیا ہوں۔

یہ لوگ ہوتے ہیں جو حقیقی معنوں میں رہنما کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں اور افراد جماعت کی کردار سازی کے کرشمے دکھاتے ہیں۔

آپ کو سیّد و مرشد حضرت مصلح موعود کی زبان مبارک سے ہی عشاق الٰہی اور فدائیان ملت کا تذکرہ سناتا ہوں۔ حضور فرماتے ہیں:

''جس طرح آسمان سے ساری دنیا پر بارشیں نازل ہوتی ہیں۔ پیاسی زمین سیراب ہوتی ہے اسی طرح یہ لوگ علم وعرفان کی ایک بارش ہیں جس طرح بارش سے پھل اور پھول اور میوے اور غذائیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح ان کا دامن فیض بھی وسیع ہے۔ ہر مشرقی اور عربی اور عجمی کے لئے ان کی محبت کی گود کھلی ہے۔ یہ خدائے رحمان کی صفت رحمانیت کا ایک زندہ ثبوت ہیں۔ یہ پانی کی طرح خدائے تعالیٰ کی طرف بہتے اور ہواؤں کی طرح اس کی طرف اُڑتے اور مشکلات اور حوادث میں زمین کی طرح ثابت قدم رہتے اور آگ کی طرح ہر قسم کی شیطنت کو جلاتے اور پہاڑوں کی طرح دنیا کی حفاظت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔'' (الفضل 29 رجولائی 1997ء)

حضرت مصلح موعودؓ نے فرمایا تھا اور سچ فرمایا تھا کہ ؎

اک وقت آئے گا کہیں گے تمام لوگ
ملت کے اس فدائی پہ رحمت خدا کرے

وہ وقت بھی آچکا ہے اور چار دانگ عالم سے یہی صدائیں اُٹھ رہی ہیں اور قیامت تک لوگ تڑپ تڑپ کر یہ دعا کرتے رہیں گے کہ ؎

ملت کے اس فدائی پہ رحمت خدا کرے

صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب نے ہلال پور گاؤں میں یہ واقعہ سنایا کہ میرا ایک اپریشن تھا جو حضرت ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب نے کیا مگر وہ کامیاب نہ ہوا۔ اس پر حضرت ابّا جان کو تشویش ہوئی تو حضرت میر محمد اسماعیل صاحب نے یہ کہہ کر حضور کی پریشانی میں کمی کرنے کی کوشش کی کہ حضور دیکھیں مبارک احمد کو اللہ نے یہ خاص صفت ودیعت فرمائی ہے کہ بیماری میں ان کا چہرہ شگفتہ گلاب کے پھول کی طرح کھلا رہتا ہے۔ اس پر ذرا بھی بیماری کا اثر نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہم نے بارہا دیکھا۔ آپ کی شدید علالت میں بھی چہرے کے حسن و

تابانی میں ذرا فرق نہ آیا۔

دوسرا روا قعہ آپ نے ہمارے گاؤں میں چند گھنٹوں کے قیام کے دوران یہ سنایا کہ پہلے میری ایک بیٹی تھی اب میری دو بیٹیاں ہیں اور پھر خود ہی اس راز کو کھولا۔فرمایا کہ حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب کی ایک بیٹی میرے ساتھ بے حد محبت کرتی ہے۔یوں ساری میری بھتیجیاں پیاری ہیں مگر ایک بیٹی کا یہ حال ہے اسے میرا کہیں سے پتہ چلے کہ میں لندن میں فلاں جگہ اُترا ہوں تو فوراً میرے پاس پہنچ جائے گی اور ’’بڑے ابّا جان میرے ساتھ چلیں‘‘ اور پھر اپنے گھر لے آتی ہے۔اس کی محبت اور فدائیت کو دیکھ کر میں نے اسے اپنی دوسری بیٹی بنالیا ہے۔پھر یہی اعزاز وشرف میری ایک پوتی کو از راہ کرم بخشا اور فرمایا کہ اسماءنون کے اضافے سے اب میری تین بیٹیاں ہوگئی ہیں۔

بہر حال میں آپ کے اپنے گھر ہلال پور تشریف لانے کو ایک انعام الٰہی تصور کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ آپ کی ہمارے گاؤں میں رقت آمیز دعائیں کبھی ضرور پھل پھول لاویں گی اور انشاءاللہ ایسی ہوائیں چلیں گی جو اپنے ساتھ باران رحمت لاویں گی اور پھر یہ سنگلاخ اور روحانی لحاظ سے بنجر زمین بھی ایک گلستان بن جاوے گی۔کاش یہ نظارہ ہم بھی دیکھیں ورنہ ہماری نسلیں تو انشاءاللہ دیکھیں گی۔

سیّدنا حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب کے قدموں کے بھی قبل از زمانہ خلافت اس گاؤں کی مٹی نے بوسے لئے تھے اور بھی صاحبزادگان بلکہ خواتین مبارکہ بھی یہاں تشریف فرما ہوئیں۔ان سب کی برکات ایک دن ضرور رنگ لائیں گی۔برکات اور دعائیں کبھی پُرانی اور بوڑھی تو نہیں ہوتیں میں نے یہ چند منتشر واقعات محض حضرت صاحبزادہ صاحب کی خدمت میں عقیدت کے پھول کے طور پر پیش کئے ہیں۔یہ ہرگز سوانح نگاری کی کاوش نہیں اور ابھی تو اپنے ایک محبوب درویش اور مستجاب الدعوات شاہزادے کا ذکر بھی میرے ذمہ ہے جنہوں نے مع دیگر افراد وخواتین مبارکہ کے میری درخواست پر میرے گاؤں تشریف لا کر ہمیں اعزاز بخشا اور دعاؤں سے نوازا۔توفیق اللہ دے اور میں ان کرم فرماؤں کا تذکرہ کرتا رہوں کہ یہ میرے دل وجان کی شگفتگی کا باعث بنتا ہے۔

گوان بزرگوں کے آنے سے تو غنچہ دل کھلتا ہے مگر میری مجبوری کی پھر بھی تشنگی قائم رہتی ہے مگر ؎

پیاس میری نہ بجھی گر تو مجھے کیا اس سے
چشمۂ فیض و عنایات اگر جاری ہے

(روزنامہ الفضل یکم اکتوبر 2004ء صفحہ 3 تا 5)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

محترم صاحبزادہ سیّد محمد طیب لطیف صاحب

ہمیں بھی یاد کر لینا چمن میں جب بہار آئے

1958ء کے موسم گرما کا ایک چلچلاتی دھوپ والا سخت گرم دن تھا کہ اپنے آقا ومطاع کے صدقے میرے گھر 15/c سیٹلا ئٹ ٹاؤن سرگودھا جہاں پر کہ میں ان دنوں کرایہ کی کوٹھی میں رہتا تھا گویا ابر رحمت کا ٹکڑا سایہ فگن ہوا اور سخت جھلسانے والی لو کی بجاہے بادنسیم کے جھونکے آ کر میرے قلب وروح کو ٹھنڈک پہنچانے کا موجب بنے۔

قارئین کرام! میں سخت بھوکا تھا، خوان یغما خود چل کر میرے پاس آیا۔ میں بلا کا پیاسا تھا، میٹھے پانی کا کنواں کہوں یا آب شیریں کا ٹھنڈا چشمہ خود چل کر میرے گھر آ گیا اور میری شادابی کا موجب ہوا۔ میں بیمار تھا، مسیحا خود چل کر مجھ بیمار کو دارو دینے آ گیا۔ یہ سب کچھ میری خوش نصیبی کا موجب تھا یا یہ ایک خواب تھا مگر یہ شیریں لمحات آنکھ جھپکنے میں گزر گئے۔ آج جبکہ نصف صدی گزر چکی ہے۔ اس دن کو یاد کر کے ان گزرے ہوئے لمحات کو پھر سے پا لینے کی حسرت تڑپاتی ہے مگر یہ برکتیں اور نعماء آسمانی روز روز کہاں۔ ہوا یوں کہ میں جون، جولائی کی سہ پہر کو گھر میں بیٹھا تھا کہ گیٹ پر نصب گھنٹی بجی، دیکھا تو دو بزرگ شخص میرے سامنے تھے نہ جان نہ پہچان۔ مگر گو خود شناسی میرے نصیب میں کبھی نہ آئی۔ تاہم مردم شناسی کا کچھ نہ کچھ ملکہ ورثے میں پایا تھا۔ یا الٰہی یہ کون دو شخص ہیں۔ یہ کوئی فرشتے لگتے ہیں۔ بڑھ کر استقبال کیا اور اندر انہیں بٹھایا اور جو مشروب گھر میں موجود تھا انہیں پیش کیا۔

آشنائی تو نہیں تھی تاہم ان میں سے ایک کی نورانی شکل کی شعاع نور آنکھوں کے راستے سیدھی دل میں اُتر گئی۔ میں ایک بالکل بے علم اور انجان تھا۔ روحانیت کے رعب تلے دب چکا تھا۔ تاہم ہمت کر کے پوچھا کہ حضرت میں نے آپ کو پہچانا نہیں معافی چاہتا ہوں تو وہ بزرگ گویا ہوئے کہ میرا نام محمد طیب لطیف ہے اور یہ میرا چچازاد بھائی صاحبزادہ عبدالرب ہیں (اور ساتھ ہی وضاحت فرما دی کہ ان کا تعلق لاہوری جماعت سے ہے) تو آپ حضرت سیّد عبداللطیف کے خاندان میں سے ہیں۔ ہاں ابھی انہیں اپنے آپ کو حضرت موصوف کا بیٹا کہنے میں جھجک سی تھی۔ مزید کریدنے پر فرمایا ہاں وہ میرے باپ تھے۔ آج آپ سے ایک کام کے سلسلہ میں مدد لینے آئے ہیں۔ فرمایا یہ میرے کزن بھائی ہیں۔ ان کے نجی ملازم کا کوئی جھگڑا یہاں سرگودھا میں اپنے رشتہ داروں کے ساتھ ہوا یہ سبھی پٹھان لوگ ہیں۔ اس نے خنجر کا ایک وار کر کے اپنے مخالف کو شدید زخمی کر دیا اور اب وہ جیل میں ہے۔ کیا کوئی صورت اس کی ضمانت کی ہو سکتی ہے۔ گویا برائے نام سا ریفرنس مقدمہ کا ان کے پاس تھا۔ میں نے حامی بھر لی اور حقیقت یہ ہے کہ اس پٹھان نے تو جو کچھ کیا مگر اس

سارے واقعہ کو میں نے اپنے لئے موجب سعادت جانا۔ دفعہ 30 کے مجسٹریٹ کے پاس وہ مقدمہ تھا اس زمانے میں 2/3 مجسٹریٹ ہی یہاں ہوتے تھے۔ صاحبزادہ محمد طیب صاحب نے بٹوا نکالا اور میں نے بہت لجاجت کے ساتھ اور بہت کوشش کے بعد کوئی فیس روپے ٹکے میں وصول کرنے سے انکار کر دیا اور میں نے کہا کہ حضرت آپ دریائے شمل کے کنارے سید گاہ خوست کے بہت بڑے بزرگ ولی اللہ اور واصل الی اللہ کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کا میرے گھر آنا میرے لئے بہت بڑی برکت کا موجب ہے۔ جس کی کوئی قیمت کسی ملکی یا غیر ملکی کرنسی میں لگائی نہیں جاسکتی۔ شائد وہ وکلاء کے طمعی اذہان سے خائف تھے، بمشکل ہی راضی ہوئے۔

میں نے ربوہ کا ان کا ایڈریس لے لیا اور عرض کیا جتنا جلدی ممکن ہوا کوشش کر کے اپنی کارگزاری سے آپ کی خدمت میں اطلاع کر دوں گا۔ پھر میں نے بہت منت سماجت کی کہ آپ آج یہیں شب باش ہو جائیں۔ مگر وہ حضرات اس پر تو راضی نہ ہوئے کہ صاحبزادہ عبدالرب صاحب نے شائد لاہور پہنچنا تھا۔ میں نے روانہ کیا اور سوچ میں پڑ گیا اور تنہائی میں اپنے نصیبے پر فخر کرنے لگا کہ کجا یہ ولی ابن ولی حضرت سیّد عبداللطیف کا وہ بیٹا جو فی الاصل تو اپنے مقدس باپ کے ساتھ ہی گویا اپنی جان بھی راہ حق میں قربان کر چکا تھا اور کجا میں عاصی اور ناہنجار یہ کیسے میرے گھر آ گئے۔ وہی بات ہوئی ؎

آنے کو وہ تیار تھے میں خود ہی کچھ شرما گیا
ان کو بٹھاؤں میں کہاں دل میں صفائی تک نہیں

اب میں اس فکر میں غلطاں کہ کام مشکل ہے کسی طرح اس میں کامیابی ہو تو اس بزرگ شخص کے پاک دل میں ایک گوشہ مل جائے۔ شائد یہی میرے لئے توشہ آخرت بن جائے۔ خیر وہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص کرم سے دوسرے ہی روز مجھے کامیابی عطا فرمائی اور ضمانت کا حکم ہو گیا جو بظاہر بہت مشکل تھا۔ پھر میں نے اپنا ہی کوئی آدمی ضامن دے کر ان کے ملازم کو جیل سے رہا کروا کر ربوہ بھیج دیا۔ اس میری حقیر سی خدمت اور کوشش کی اس کریم ابن کریم نے بہت قدر دانی فرمائی اور پھر ہمارے تعلقات میں روز افزوں ترقی ہونا شروع ہوگئی۔ میں اپنی قسمت پر نازاں تھا کہ بقول جناب عبیداللہ علیم صاحب ؎

یہ محبت تو نصیبوں سے ملا کرتی ہے
چل کے خود آئے مسیحا کسی بیمار کے پاس

محترم صاحبزادہ محمد طیب لطیف صاحب پھر تو کئی بار میری درخواست پر میرے ظلمت کدے پر تشریف لائے اور سچ مانیں کہ ایسا ارتعاش نور ہوتا کہ وہی میرا تاریک و تار گھر خوست کی مشعل نور سے روشن ہوتا نظر آتا۔ ہاں وہی مشعل جو پنجاب کی ایک گمنام بستی قادیان میں برسنے والے نور سے اپنے فتیلہ کو لَو دے کر شعلہ بار بن چکی تھی۔ تعارف جو بڑھا تو معلوم ہوا کہ صاحبزادہ صاحب نے ان

مصائب کو جھیلنے کے بعد پچھلی عمر میں قرآن حفظ کیا ہوا تھا۔ یادر ہے کہ یہ سارا مقدس اور مظلوم خاندان حضرت شاہزادہ صاحب کی جاں سپردگی کے بعد شدید اور ہولناک مصائب افغان گورنمنٹ کے ہاتھوں جھیل کر 1920ء میں سرائے نورنگ (انڈیا) میں پہنچ پایا۔

صاحبزادہ صاحب سرگودھا قیام کے دوران ہمیں نمازوں کی امامت کراتے اور ٹھہر ٹھہر کر گویا قرآنی مطالب میں غوطہ زن ہو جاتے اور ایسی لحن اور لے میں تلاوت کرتے جو پھر کبھی سننا نصیب نہ ہوئی۔ میں تو کم نظر جو تھا یہ خیال نہ آیا کہ اسے ریکارڈ کر لیتا۔ ایک بار سیّدنا حضرت خلیفۃ ثالث کی ہمارے رشتہ داروں کے ہاں موجودگی کے دوران آپ نے تلاوت کی۔ حضور نے آپ کے اس افغانی لہجے اور نغمگی کو بہت پسند فرمایا۔ میں نے صاحبزادہ محمد طیب لطیف صاحب سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ مجھے اپنے حضرت ابا جان کے حالات زندگی اور پھر وفا شعاری استقامت اور بلند حوصلگی سے مکمل رضا مندی اور کامل وفا سے اپنی جان راہ خدا میں قربان کرنے کے واقعات املا کروائیں نیز حضرت موصوف کی وفات کے بعد جو طویل عرصہ تک آپ کے سارے خاندان کو غم و درد اور رنج و محن کی چکی میں پیسا گیا وہ روح فرسا اور روح پرور واقعات بھی لکھوادیں۔ کیونکہ آپ کی عمر مورخہ 14 رجولائی 1903ء کو قریباً آٹھ، نو سال تھی اور آپ گویا ان سارے بیتے ہوئے واقعات کے بہترین شاہد تھے۔ اوّل تو میں اسے اپنی نالائقی ہی سمجھتا ہوں جو شائد میری سیاہ بختی کی دلیل بھی ہے اور دوسرے صاحبزادہ صاحب کو بھی بے حد حجاب تھا اور بار بار فرماتے تھے کہ اس میں خود ستائی اور خود نمائی کا اندیشہ ہو سکتا ہے جس سے میں سخت ڈرتا ہوں کہ یہ میری کاوش کسی پہلو سے سلب ایمان کا موجب نہ ہو۔ اس پر ہماری باہمی بہت دلچسپ گفتگو ہوئی۔ میں اپنی طرف سے بڑھ چڑھ کے دلائل پیش کرتا کہ تاریخ کو محفوظ کر لینا بھی ایک فرض ہے۔ مگر وہ بلند کردار اور عالی نسب شاہزادہ تو انکساری عاجزی اور تبتل الی اللہ کی وجہ سے اس سے طبعاً نفور ہی رہا مگر زیادہ اصرار نہ کرنے کا میں بھی تو مجرم ہوں۔ گو زبانی واقعات کی کرید میں کرتا رہتا تھا کہ کیسے آپ کا سارا خاندان 14 رجولائی 1903ء کے سانحہ کے بعد بلخ ترکستان کی طرف جلاوطن کر دیا گیا اور پھر واپس کابل میں منگوا کر چرخی پل جیل میں ڈال دیا گیا اور کیونکر ساری جائیدادیں اور اموال اور اثاثہ البیت تک لوٹ لیا گیا اور باقی ماندہ خاندان کو محض قلاش اور بے بس بنا کر رکھ دیا گیا۔ وہ ناز و نعم میں پلے ہوئے جو وسیع جائیدادوں کے مالک تھے جن کے دستر خواں پر روزانہ کم از کم 50 مہمان کھانا کھایا کرتے تھے ان کی یہ حالت ہوگئی کہ نہ کھانے کو کوئی چیز نہ پہننے کو اور نہ سر چھپانے کی کوئی جاء گویا ان سے ایسے جرائم سرزد ہوئے تھے جن کی سزا میں ان کے بزرگ مورث کو ہلاک کر دینے اور افراد خاندان کا سب کچھ چھین لینے کے بعد کلیۃً بے یار و مددگار قیدی بنا دیا گیا۔ پرانا گھسا پٹا شعر کسی کا ہے۔ ؎

یہ کہہ دو کوہکن سے کہ مرنا نہیں کمال

مر مر کے ہجر یار میں جینا کمال ہے

گو اپنے خیال کے مطابق شاعر نے اس میں ایک صداقت بیان کی ہے مگر یہاں یہ مثال ناقص تر اور کم تر نظر آتی ہے۔ کجا کوہکن کا مرنا اور کجا 14 رجولائی 1903ء کے روز اس مقدس شاہزادے کا اپنے خالق و مالک کو اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا۔ آپ کے قید میں رہنے کے بارہ میں دو روایات ملتی ہیں۔ ایک کے مطابق آپ ڈیڑھ ماہ تک اور دوسری کے مطابق آپ چار ماہ قید میں رہے اور جو بھی عرصہ قید تھا اس سے نفس مضمون پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اللہ کی راہ میں کمال خوشدلی کے ساتھ بار بار بادشاہ وقت کے سمجھانے کے باوجود کہ اب بھی باز آ جاؤ۔ سارے اعزازات اور جاگیروں سمیت پہلے والا بلند مقام اور منصب عالی تمہیں عطا ہوگا۔ اس سانحہ عظیم کے روز پھر آخری وقت بھی یہ فہمائش کہ میرے کان میں ہی کہہ دو تو میں تمہیں ابھی چھوڑ دیتا ہوں۔

وہ کوہ استقامت اور جبل راستی و وفا علی الاعلان کہتا رہا۔ جو چاہو کر گزرو، میں جس حق کو پہچان کر سچ مان چکا ہوں اس سے کیونکر انکار کر سکتا ہوں اور یاد رہے کہ اس شخص کو توحق الیقین کا رتبہ عطا ہو چکا تھا اور قادیان میں ہی اس کو اس قسم کے نظارے دکھائے جا چکے تھے۔ کبھی کہتے کہ مجھے عرش سے حکم ملتا ہے کہ ''سر بدہ سر بدہ'' کبھی کشفی نظارے میں افغانیوں کی ہلاکت کے منظر دکھائے جاتے تو کہتے میں نے تو انہیں قتل نہیں کیا۔ ملائکہ نے انہیں قتل کیا ہے۔ مگر افسردہ ہو جاتے۔

یہاں مجھے اس بزرگ سیّد شاہزادے کے آپ کے عشق و وفا اور استقامت کی داستان جو خونچکاں بھی ہے اور روح افزا بھی، کا دہرانا مقصود نہیں ہے بلکہ آپ کے خاندان اور خصوصاً صاحبزادہ محمد طیب صاحب پر جو گزری اور اس کے چند چشم دید اور گوش شنید واقعات پر ہی حصر کرتا ہے۔ حضرت شاہزادہ صاحب نے تو ڈیڑھ ماہ کی قید یا دوسری روایت کے مطابق 4 ماہ کی قید کے بعد بھی اپنی جان راہ خدا میں قربان کرنے کے فیصلے کو کسی لالچ طمع یا امیدیں دلانے پر بھی نہ بدلا وہ استقامت کا پہاڑ بزبان حال یہی کہتا رہا۔ ؎

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

اور 14 رجولائی 1903ء کے روز اپنے مالک کے قدموں میں سر رکھ دیا اور اس دنیا سے اوجھل ہو گئے مگر باقی خاندان کے افراد تو 17 سال کی جلاوطنی اور قید و بند کی سزائیں بھگت بھگت کر گویا ہر روز ان کے لئے 14 رجولائی ہی ثابت ہوتا رہا۔ یہ سترہ سال کا طویل عرصہ خاندان کے بقیہ افراد کے لئے ہر روز موت کا پیغام لے کر طلوع ہوتا اور ہر رات شب عاشورہ ثابت ہوتی اور آفرین اور صد تحسین اس مقدس خانوادہ کے جملہ افراد پر جن کی رگوں میں اس عظیم شہزادے کا پاک اور غیرت مند اور اللہ کی رضا کے سامنے اپنی ہر شے تج دینے کا پاک خون گردش کر رہا تھا۔ وہ کیا مرد اور کیا خواتین ایسی فولادی دیواریں ثابت ہوئیں کہ انہیں طولانی سزائیں اور آزار دینے کے سارے حربے کیا مجال جو اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہٹا سکے۔ احمد فراز نے اس دور میں جو بظاہر روشنی اور انسانی اقدار کی حفاظت کا دور شمار ہوتا ہے

حقیقت حال کو یوں بیان کیا ہے۔ ؎

جام و سبو کی آبرو اہل ہوس کے ہاتھ ہے
جب سے خطیب و محتسب شہر میں معتبر ہوئے

ایک صدی پیچھے کا سفر کریں اور چشم تصور سے افغانی صفت بدخونخواری بلکہ مردم خوری کا نظارہ کریں جس میں اس پاک باطن اولیاء اللہ عشاق الٰہی کو موت کی وادی میں دھکیلا گیا۔ گویا یہ خاندان اقدس کے افراد ہر روز نئی موت مرتے تھے۔ پہلے بیان کردہ شعر کا آخری مصرع آں ممدوح کی کسی حد تک ان باقیات الصالحات پر صادق آتا ہے کہ ؎

مرمر کے ہجر یار میں جینا کمال ہے

محترم صاحبزادہ سے جوں جوں تعارف بڑھتا گیا۔ ان کی حسنات اور صفات حسنہ اور عادات وشمائل خصوصاً عبادات میں حد درجہ شغف میں ان کے حضرت والد محترم کی تصویر کسی حد تک نظر آنے لگی۔ گوان کا والد تو ایسا عالی مقام شاہزادہ تھا کہ جس کی مثال صدیوں کی تاریخ کھنگالنے سے بھی نہیں ملتی۔ تاہم میں زیادہ سے زیادہ وقت صاحبزادہ سیّد طیب لطیف صاحب کی صحبت میں گزارنے کی کوشش کرتا رہا۔

ایک دن میرا پروگرام لاہور جانے کا تھا تو موصوف سے ربوہ میں رابطہ کر کے پیشکش کی کہ اپنے صاحبزادہ کو ملنے (جو لاہور میں رہتے تھے) جانا چاہیں تو میں آپ کو ربوہ سے ہمراہ لے جاؤں گا۔ یاد ہوگا ان دنوں سفر کی وہ سہولتیں لاہور جانے کے لئے نہیں تھیں جو آجکل ہیں۔ آپ نے فرمایا اس شرط پر آپ کے ساتھ جاؤں گا کہ رات آپ ہمارے ساتھ ہی میرے بیٹے کے گھر رہیں۔ مجھے ان کے لئے موجب زحمت بننا گوارہ نہیں تھا تاہم ان کی ہم نشینی کو موجب سعادت یقین کرتے ہوئے حامی بھر لی اور ربوہ سے ہم اکٹھے لاہور پہنچے۔ رات سردتھی اور دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ انہوں نے تو چند دن وہاں رہنا تھا۔ میں نے صبح اجازت چاہی۔ یوں اس رات بھی ایک لطیفہ ہوگیا کہ سڑک نما گلی میں آپ کے بیٹے کا مکان تھا۔ اندر موٹر جانے کی گنجائش نہیں تھی۔ سڑک پر اپنے گھر کی دیوار کے ساتھ موٹر پارک کر دی اور محلہ کے چوکیدار کو ان کے بیٹے نے تاکید بھی کر دی کہ زیادہ خیال رکھے۔ مگر مجھے خیال آیا کہ یہ کاریں تو اپنی چور آپ ہی ہوتی ہیں۔ اگر خدانخواستہ یہ حادثہ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ اب میں تجویزیں کرنے لگا۔ پہلے تو تجویز کیا کہ کمرے سے نکل کر کمرے کے دروازے کے ساتھ ہی کار تھی۔ اس میں جا کر سیٹ لمبی کر کے سوجاتا ہوں۔ پھر خیال آتا کہ کمرہ کا دروازہ کھلا رہے گا تو میزبان کے گھر چور داخل ہو جائے گا۔ رات کافی گزر گئی اسی فکر میں کروٹیں لیتا رہا۔ آخر تجویز سوجھی کہ ایک پہیہ موٹر کا اُتار کر اور موٹر کو جیک پر کھڑا کر کے فالتو پہیہ بھی اور اس کے نٹ وغیرہ یہ دونوں پہیے نکال کر اندر کمرے میں رکھ دیئے اور سوچا کہ اب اگر چور آئے گا تو پہیہ بھی لائے گا اور نٹ بولٹ بھی

اور شائد یہ ممکن نہیں ہوگا۔غرض رات گزاری اور پھر میزبان کے جاگنے سے پہلے موٹر کو پہیوں پر کھڑا بھی کر دیا۔میزبان کو نہ بتایا کہ تا میزبان اور خصوصاً ان کے والد محترم میری اس حرکت سے پریشان خاطر نہ ہوں۔

چوہدری قائم دین صاحب قائمقام ڈپٹی کمشنر سرگودھا کی صاحبزادہ صاحب سے ملاقات

چوہدری قائم دین صاحب جو افسر مال اور پھر S.D.M اور قائم مقام ڈپٹی کمشنر سرگودھا بھی رہے نے ایک دن مجھے بلایا اور پوچھا کہ مجھے کسی نے بتایا ہے کہ وہ جو اس صدی کے ابتدا میں افغانیوں نے ایک بہت بزرگ آدمی کو سنگسار کر کے ہلاک کر دیا تھا۔ان کا بیٹا تمہارے ہاں آیا کرتا ہے۔میں نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے کہا کہ اب وہ سرگودھا آویں تو آپ انہیں میرے گھر چھوڑ جائیں میں کچھ باتیں پوچھنا چاہتا ہوں اور چائے ان کے ساتھ پئیں گے مگر بہتر یہ ہے کہ تم پاس نہ ہو۔میں نے کہا جب صاحبزادہ صاحب آئیں میں آپ کے گھر انہیں بھیج دوں گا۔آپ جو پوچھنا چاہیں پوچھ لینا۔

چنانچہ ان کی ملاقات کوئی ڈیڑھ گھنٹے کی تھی۔صاحبزادہ صاحب نے واپس ہمارے گھر آ کر بتایا کہ اس نے واقعات مجھ سے پوچھے اور مجھے جن کا علم تھا وہ میں نے بتا دیئے ہیں۔2/3 دن گزرے تو چوہدری قائم دین صاحب مجھے ملے۔میرے دیرینہ واقف تھے ان کی شادی میرے ایک بہت ہی مخلص دوست کی بہن سے ہوئی تھی اور حضرت صاحبزادہ صاحب سے ملاقات کی تفصیل انہوں نے بتائی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ شخص خود ''زندہ شہید'' ہے۔جلاوطنی قید و بند اور آزاردہی کے سارے واقعات اس کے اپنے ساتھ گزرے۔جائیدادوں کا چھن جانا اور مفلسی اور ناداری کا دور بھی ان پر آیا۔غلیظ اور گندی جیل میں بھی بہت وقت ڈال دیئے گئے۔سارے حالات انہوں نے بتائے۔میں نے کہا کہ بادشاہ بڑا ظالم تھا تو فوراً بولے نہیں نہیں۔بادشاہ خود ظالم ہرگز نہیں تھا وہ علماء سوء کے ہاتھوں مجبور ہو چکا تھا۔وہ خود اچھا انسان تھا۔علماء زمانہ اسے مجبور نہ کرتے تو وہ یہ ظلم نہ کرتا۔ چوہدری قائم دین صاحب حیرت زدہ ہو کر بے حد تعریف صاحبزادہ صاحب کی کیا کرتے تھے کہ دیکھیں اتنی تکالیف اُٹھا کر بھی یہ اس بادشاہ کا شکوہ نہیں کرتا تعریف ہی کرتا ہے۔یہ بلند و بالا حوصلہ اور عدل وانصاف کی یہ میزان صداقت کی بہت بڑی دلیل ہے اور کہتے تھے میں نے اپنے ملنے والے لوگوں سے یہ ذکر کیا ہے کہ مجھے امید تھی کہ یہ شخص کہتا کہ بادشاہ بڑا ظالم اور بدکن تھا وغیرہ مگر یہ تو عجیب انسان ہے جس کے ہاتھوں باپ قتل ہوا۔خود سال ہا سال تک ناگفتنی مصائب جھیلے یہ شخص پھر بھی اس کی تعریف کرتا ہے۔یہ ہے صحیح مومن کی علامت اور پہچان۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ والے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔وہ آلام و مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں تو ان کی نگاہ اپنے مالک قادر و توانا پر ہوتی ہے۔وہ کسی کا شکوہ گلہ نہیں کرتے۔قرآن کریم میں بارہا ''صبر'' کی تلقین فرمائی گئی ہے۔اس کے یہی تقاضے ہوتے ہیں کہ ؎

جو کوئی ٹھوکر بھی مارے گا تو اس کو سہ لیں گے ہم خوشی سے

کہیں گے اپنی سزا یہی تھی زباں پہ شکوہ نہ لائیں گے ہم

اور وہ تو ہر دم اپنے یار حقیقی سے ملنے کی تڑپ رکھتے ہیں اور اس کی راہ میں جتنے دکھ جھیلنے پڑے وہ خوشی سے جھیلتے بلکہ مسکراتے ہیں اور کہا کرتے ہیں۔ ؎

دشمن کو ظلم کی برچھی سے تم سینہ و دل برمانے دو
یہ درد رہے گا بن کے دوا تم صبر کرو وقت آنے دو

یہ سب عاشق صادق تھے۔ان کا مورث حضرت سیّد عبداللطیف صاحب اور ان کے بعد رہنے والی تینوں بیوگان اور چھ بچے بلکہ ان سے بھی پہلے فنافی اللہ لوگ حضرت مولوی عبدالرحمن صاحب جو 20/جون 1901ء کو اور خود حضرت شاہزادہ صاحب آف خوست 14/جولائی 1903ء کو اور حضرت مولوی نعمت اللہ خان صاحب عین جوانی میں 31/اگست 1924ء کو اور پھر حضرت مولوی عبدالحلیم صاحب اور حضرت قاری نور علی صاحب 5/فروری 1925ء کو ایک صادق مامور من اللہ کی شناخت اور تصدیق کرنے کی پاداش میں از راہ ظلم موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے اور اس گروہ عاشقان الٰہی کے علاوہ 1918ء میں صاحبزادگان محمد سعید جان صاحب اور محمد عمر جان صاحب اور حضرت سیّد سلطان احمد صاحب اور حضرت سیّد حکیم احمد صاحب اور حضرت فضل کریم صاحب کو بدنام زمانہ جیل میں ڈال کر خشک روٹی اور نمک کی خوراک کھانے کو دی جاتی جس سے ان کی انتریاں گل گئیں اور گویا زہر خورانی سے انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ یہ بھی 1917ء اور 1918ء کے قیامت خیز سانحات ہیں۔

پیر فضل شاہ گجراتی نے کیا خوب اللہ کی راہ میں جان قربان کرنے والوں کو شکور رب کی طرف سے صلہ ملنے کا احوال اس شعر میں بیان کیا ہے۔

مقتل وچ سرمد نوں دیکھ کے تے
کسے جھوم کے ایہہ آواز دتی
سروں ادھراں بدنامیاں کون جھلے
سروں پراں ہو جایئے تے یار مل دے

اور قارئین کرام یہ فہرست بھی کابل کے راہ خدا میں جان فدا کرنے والوں کی حتمی کب ہے۔ مجھے نہیں معلوم کس کس کو اور کس کس ظالمانہ طریقے سے افغانی جاہل فتویٰ فروشوں کی تسکین کے لئے عاشقان الٰہی کو یک مشت اور اقساط میں ہلاک کیا گیا مگر ان کی گنتی تو زیادہ سے زیادہ درجنوں میں ہوگی۔ادھر حضرت مسیح پاک کا یہ انذار کہ

”اے کابل کی زمین تو گواہ رہ کہ تیرے پر سخت جرم کا ارتکاب کیا گیا۔ اے بدقسمت زمین تو خدا کی نظر سے گر گئی تو اس ظلم عظیم کی جگہ ہے۔“

اور نیز فرمایا کہ ”ظالم کی پاداش باقی ہے“ ہر دن جو چڑھتا ہے تو یہ دائمی سماوی انذار ”ظالم کی پاداش باقی ہے“ کی تکمیل کے لئے اور ہر رات اس ماموِر زمانہ کے اس ضمن میں اقوال زریں کی صداقت کے لئے شاہد بن کر آتے ہیں۔

(روزنامہ الفضل ربوہ مورخہ 15/جولائی 2005ء صفحہ 5،6)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁



عزم واخلاص کا پیکر
خان بہادر ملک صاحب خان صاحب نون ڈپٹی کمشنر (ر)

قندیل کیا بجھی کہ نگر بے چراغ ہے

اپریل 1954ء کا کوئی ایک دن تھا کہ مجھے سب ڈویژن بھلوال میں قانون کی پریکٹس شروع کرنے کی ترغیب دلائی گئی اور مجھے معلوم ہوا کہ ملک عطامحمد خان صاحب نون کا مکان عدالت بھلوال سے بالکل متصل ہے اور اس کے کئی حصے ہیں جو وہ کرایہ پر دیتے ہیں۔ چنانچہ میں دن ڈھلے بھلوال پہنچا۔ اس مکان کے مردانہ حصے میں ملک صاحب مذکور بیٹھے تھے۔ میں نے سلام کہا اور اپنا مقصد بیان کیا۔ انہوں نے کہا آپ نون ہیں، تو آپ کا اپنا مکان ہے۔ کل میرے بیٹے گاؤں سے شہر بھلوال آئیں گے تم بھی آ جانا تو میں انہیں تاکید سے کہوں گا کہ انہیں مکان دے دو۔ میں اس سے مطمئن ہو گیا مگر یہ اطمینان گھڑی دو گھڑی کا ہی تھا جب میں گیٹ سے باہر نکل ہی رہا تھا تو ملک صاحب نے بلایا اور کہا کہ بڑھاپے کی وجہ سے بات یاد نہیں رہتی نام تو تمہارا پوچھا ہی نہیں۔ میں نے اپنا نام بتایا تو ملک صاحب نے کہا یہاں کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ حیرانگی کے عالم میں پوچھا ”عبدالسمیع“ نام ہلال پور سے فالتو ہے۔ ہلال پور میں یہ نام کہاں سے آ گیا۔ میں نے کہا کہ ہم احمدی ہیں۔ میری پیدائش سے پہلے میرے ابّا حضرت صاحب خلیفۃ المسیح الثانی سے دعائیں کرواتے رہے پھر جب میری ولادت ہوئی (اور میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا) تو ابا نے حضور کی خدمت میں تبرکاً میرا نام تجویز کرنے کی درخواست کی تو میرے والد کا نام عبدالعزیز تھا۔ حضور نے میرا نام عبدالسمیع رکھ دیا۔ ملک صاحب نے بلا تامل کہا کہ پھر کل آنے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہیں مکان نہیں دیں گے۔ میں نے کہا یہ تو اچھا ہوا آج ہی بات کھل گئی اور میرا ایک چکر بچا۔ ملک صاحب بڑی عمر کے تھے (غالباً ملک صاحب

خان صاحب نون سے عمر میں بڑے بھائی دوسری والدہ کے بطن سے) پھر میری دلجوئی کی کوشش کرنے لگے یہ نہیں کہ مجھے احمدیت سے کوئی مخالفت ہے۔ احمدی تو بڑے اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ ابھی ابھی ایم ایم احمد صاحب (حضرت صاحبزادہ مرزا مظفر احمد صاحب) سرگودھا میں رہ کر تبدیل ہوئے ہیں اور چوہدری عزیز احمد باجوہ صاحب جج تھے۔ ان دونوں کے ساتھ میرا گہرا تعلق تھا اور ان کی انصاف پسندی اور راست روی کا میں کیا ایک زمانہ شاہد ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ملک صاحب خان نون میرے سوتیلے بھائی ہیں۔ ہمارے باہم جائیدادوں کی تقسیم وغیرہ کے تنازعات چلتے رہتے ہیں۔ وہ احمدی ہیں تم ہمارے مکان میں رہو گے مگر وکالت ''ملک صاحب خان'' کی کرو گے۔ میں نے کہا بہر حال یہ اچھا ہوا کہ ابتدا ہی میں بات واضح ہوگئی۔ البتہ میں نے انہیں کہا کہ میں ملک صاحب خان صاحب سے متعارف بھی نہیں ہوں۔ تاہم میں آپ کے مفروضے کی تردید بھی نہیں کرتا اور میں واپس سر شام للیانی پہنچ گیا اور گو میں مایوس بھی ہوا مگر خوش بھی تھا کہ ؎

ٹھوکر بھی کھائی ہے تو اسی ہی کی راہ میں

پھر اللہ کریم ورحیم کے فضل سے مجھے ایک مکان ہری پورہ سرگودھا شہر میں مفت مل گیا اور میں جون 1954ء میں سرگودھا منتقل ہو گیا۔

سرگودھا آ جانے کے بعد ایک سال تک میری کوئی شناسائی جناب ملک صاحب خان نون صاحب سے نہیں ہوئی۔ ایک تو میں طبعاً کم آمیز تھا اور دوسرے ذہن میں یہ احساس تھا کہ وہ بڑے لوگ ہیں۔ شاید ان سے ملنا مناسب بھی نہ ہو۔ یہ تو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ مخدومی حضرت مرزا عبدالحق صاحب کو کہ انہوں نے مجھے کہا آپ ملک صاحب سے کبھی نہیں ملے میں نے عرض کیا کہ کوئی واقفیت ہی نہیں ہے تو آں ممدوح نے جھٹ باہمی تعارف کی تقریب پیدا فرمادی اور میری ملک صاحب سے پہلی ملاقات حضرت مرزا صاحب کی کوٹھی پر ہی ہوئی۔ پھر تو تعارف بڑھتا گیا اور ہم نے کہا ؎

یوں تو کہنے کے لئے چارہ گر مجھے بے شمار ملے مگر
جو مزاجِ درد سمجھ سکے اسی چارہ گر کی تلاش تھی

اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی حالت ان کی بھی تھی۔ چنانچہ ایک بار فرمایا کہ میرے سوتیلے بھائی بہت ہیں مگر سگے بھائی تم ہی ہو یہ ان کا احسان۔ اب وہ شخص اتنی خوبیوں کا مالک تھا کہ میں نہیں جانتا کہ ان کی زندگی کے کون سے پہلو سے پردہ سرکاؤں اور کیا کیا خوبی بیان کروں۔ میں عرض کردوں کہ نون خاندان جو بھیرہ کے قریب 12 دیہات کے مالکان ہیں ان میں صرف ملک صاحب خان نون ہی واحد احمدی ہوئے۔ گو دوسرے نون صاحبان مثلاً میجر سردار خان وغیرہ اور سر ملک محمد فیروز خان نون صاحب جو وزیر اعلیٰ پنجاب اور پھر وزیر اعظم پاکستان بھی رہے، کے سیّدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے ساتھ گہرے دوستی کے تعلقات تھے اور عقیدت بھی رکھتے تھے اور میں

سمجھتا ہوں کہ یہ میرے سید و مرشد کی شخصیت کا کمال تھا اور آسمانی صحیفے میں جس کا نزول بہت مبارک اور جلال الٰہی کے ظہور کا موجب بیان ہوا تھا اور جو بھی حضور سے کسی سلسلے میں ملتا وہ حضور کا گرویدہ ہو جاتا۔ ایک حسین مثال سر ملک محمد فیروز خان صاحب کی بیان کر دیتا ہوں۔

جب ملک صاحب ریٹائرڈ زندگی الوقار نون ایونیو (Noon Avenue) لاہور میں گزار رہے تھے تو تقریباً ہر ہفتے مجھے فون کرتے اور قریباً یہی الفاظ ہر بار ہوتے ''سمیع تمہارا کیا حال ہے'' میں کہتا بابا جی اللہ کا فضل ہے۔ پھر پوچھتے ''حضرت صاحب کی طبیعت کیسی ہے''۔ میں عرض کرتا کہ حضور علیل ہیں (واضح ہو کہ یہ 1962ء تا 1964ء کے دوران کی باتیں ہیں) تو مجھے ملک صاحب کہتے اچھا تم جب حضور کی خدمت میں حاضر ہو تو ''میرے آداب عرض کرنا نہ بھولنا'' پھر پوچھتے سر ظفر اللہ خان کب پاکستان آ رہے ہیں۔ میں عرض کرتا عموماً نومبر کے آخر میں تشریف لاتے ہیں تو اس پر تاکید کہ جب آ ویں تو مجھے بتا دینا میں انہیں ''حاضری'' پر بلا کر ملوں گا۔ (خود ملک صاحب بعارضہ فالج بیمار تھے) ''حاضری'' نون صاحب کے ہاں لنچ یا ڈنر کے متبادل لفظ کے طور پر رائج ہے اور پھر تیسرا سوال کہ بھائی صاحب خان کا کیا حال ہے۔ میں کہتا وہ اللہ کے فضل سے ٹھیک ہے تو سر محمد فیروز خان صاحب کہتے وہ ورزش بہت کرتے ہیں۔ 82 سال ان کی عمر تھی۔ میں نے حیران ہو کر کہا کہ نہیں ورزش تو اب کوئی نہیں کر سکتے ''سمیع تم سمجھتے نہیں ہو، وہ چھ نمازیں باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ اس عمر میں یہ ورزش ہی بہت ہے''۔ میں بیان کرنے لگا ہوں۔ ملک صاحب خان صاحب نون کے کچھ حالات، بیچ میں جب سیّدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کا نام نامی آ گیا تو میری مجبوری کہ میں اس بلند مرتبت شخص کے سحر میں مسحور ہو کر نہ معلوم کہاں سے کہاں چلا گیا مگر پھر اپنی یادوں، سوچوں کی باگوں کو زور سے پکڑا اور راہوارِ تخیل کو جو کہیں اور شیریں یادوں میں سرپٹ دوڑ رہا تھا بمشکل روکا۔

جہاں تک میرا علم ہے کہ جناب ملک صاحب خان نون کی بیعت سیّدنا حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے زمانے کی ہے اور میری تصدیق تاریخ احمدیت حصہ چہارم کے صفحہ 642 سے بھی ہوتی ہے جس میں مولانا دوست محمد صاحب شاہد نے حضور کے دور کے مبائعین کے اسماء درج کئے ہیں جس میں ملک صاحب خان نون سیریل نمبر 11 پر درج ہیں۔ مجھے جناب ملک صاحب نے بتایا کہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کو ملنے قادیان گیا۔ عقیدت تو ان سے پہلے سے تھی۔ حضور نے فرمایا ملک صاحب آپ ہمارے اور قریب آ جائیں تو میں نے عرض کیا کہ میں تو حاضر ہوں لیکن بیعت کی تقریب اس زمانے میں ہوئی جب آپ بطور سٹی مجسٹریٹ امرتسر میں تعینات تھے۔

بتاتے تھے کہ 1905ء میں چیفس کالج لاہور سے فارغ التحصیل ہوئے تھے اور تعلیم میں عمدہ کارکردگی کی قدردانی کے طور پر آپ کو کالج کی انتظامیہ نے سونے کا تمغہ عطا کیا تھا۔ پھر 1905ء ہی میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر تقرری ہوگئی اور حضرت خلیفۃ

المسیح الاوّل کے عہد (1908ء تا1914ء) کے دوران امرتسر میں تعینات تھے۔فرماتے تھے کہ ڈپٹی کمشنر امرتسر ایک سکھ تھا۔ یہ چونکہ رئیس ابن رئیس تھے جہاں رہتے سواری کے لئے گھوڑا، دودھ کے لئے بھینس اور شکار کے شوقین تھے۔شکاری کتے بھی رکھتے تھے۔ پھر اس زمانے میں موٹر کار کی لگژری (Luxury) تو شاذ ہی کسی ڈپٹی کمشنر کو بھی نصیب ہوتی تھی۔ ملک صاحب عمدہ کار بھی رکھتے تھے۔اس سے سکھ ڈی سی کو چڑ ہوگئی تھی۔اس نے کہا کہ یہ میرا ماتحت افسر ہے یا کوئی ''لارڈ'' ہے۔ملک صاحب فرماتے تھے کہ اس نے منصوبہ بنایا کہ مجھے بہت Heavy Work بہت زیادہ تعداد میں اور الجھے ہوئے مقدمات دیئے کہ یہ اس کام میں فیل ہوجائے گا اور اس سے جان چھوٹے گی۔ملک صاحب بڑی ہمت والے تھے، خاندانی انا کے ساتھ ایمانی غیرت بھی مل گئی تھی۔

خاندان حضرت چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان صاحب کے ساتھ تعلقات

ملک صاحب کا برادرانہ گہرا تعلق حضرت چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان صاحب کے خاندان کے ساتھ تھا۔حضرت چوہدری صاحب کی ایک تقریر میں ملک صاحب کا ذکر میں نے کیسٹ میں سنا ہے کہ ایک میرے گہرے دوست ہیں جن کے ساتھ میرا تعلق بھائیوں سے بڑھ کر ہے آگے اور ذکر ہے۔اگرچہ نام ملک صاحب کا حضرت چوہدری صاحب نے نہیں لیا مگر سارے کوائف ملک صاحب کے ہی بیان ہوئے ہیں۔ادھر ملک صاحب بھی کہتے تھے کہ میں ''بے بے جی'' (والدہ حضرت چوہدری صاحب) کو کہتا تھا کہ بے بے جی میرے لئے اتنی دعا کرتی ہو جتنی چوہدری ظفر اللہ خان صاحب کے لئے تو بے بے جی فرماتی تھیں کہ اپنے پانچوں بیٹوں کے لئے برابر دعا کرتی ہوں۔یعنی حضرت چوہدری صاحب اور ان کے تینوں بھائی اور پانچویں ملک صاحب خان صاحب نون۔

حضرت چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان صاحب کا سرگودھا میں ورود

انہی دنوں سرگودھا میں کمشنری بنی تھی اور چوہدری محمد اسلم صاحب باجوہ کمشنر سرگودھا ڈویژن کے تھے وہ بھی مدعو بلکہ وہ تو حضرت چوہدری صاحب کے سیالکوٹ کے باجوہ ہونے کے لحاظ سے یوں بھی رشتہ دار یا کم از کم برادری کے تھے۔اسی طرح ساری جوڈیشنری اور انتظامیہ کو دعوت دی گئی اور ملک صاحب خان صاحب نون کی کوٹھی کے وسیع احاطہ میں تین صد مہمانوں کے لئے چائے کا انتظام اور حضرت چوہدری صاحب کے لیکچر کا پروگرام تھا۔

اس میں ایک لطیفہ ہوا کہ کل اخراجات کا تخمینہ 3 روپے فی کس کے حساب سے 900 روپے کا تھا۔مجلس عاملہ میں سے کسی نے 50 روپے اور کسی نے 100 روپے چائے کے اخراجات کے لئے دیئے۔پھر بھی یہ 700 روپے بنے۔200 روپے ملک صاحب کو کہا گیا کہ وہ ادا کریں۔میرے ساتھ ملک صاحب کی ان دنوں گاڑھی چھنتی تھی۔کچہری میں میرے پاس تشریف لائے، مجھے فرمانے لگے تم لوگوں کو پتہ ہے کہ میری جیب میں کتنے روپے ہیں۔پھر ایک اعتراض یہ بھی کیا کہ 200 روپے کے مطالبہ کے بغیر اگر مجھے یونہی کہہ دیا

جا تا تم بھی حصہ ڈالوتو مجھے ثواب بھی ہوتا۔ میں ان کی بزرگی کے باعث ان کی کسی بات سے اختلاف رکھنے کے باوجود اعتراض نہیں کرتا تھا۔اس پر میں نے جو کچھ میری سمجھ میں آیا میں نے جواب دے دیا مگر میں نے کہا ملک صاحب یہ تو بتائیں کہ چوہدری محمد ظفراللہ خان صاحب سے آپ ہمیشہ حقیقی بھائیوں کا سا تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ہاں بالکل ہیں ہی وہ میرے بھائی۔تو میں نے کہا آپ کے بھائی ہالینڈ سے سرگودھا آ رہے ہیں۔آپ کے گھر چائے نوش فرمائیں گے تو یہ آپ کے لئے کس طرح مناسب ہے کہ جماعت سے چندہ لے کر چوہدری صاحب کے اعزاز میں عصرانہ دیں بالکل صحیح ہے۔ابھی احمد خان کی اماں سے بات کرتا ہوں۔فوراً موٹر میں بیٹھ کر کوٹھی پہنچ کر مجھے طلب فرمایا اور بتایا کہ احمد خان کی اماں کہتی ہے یہ تمہارا حقیقی خیر خواہ ہے۔ہماری تو ناک کٹ جاتی اگر ہم چندہ لے کر چوہدری صاحب کی ضیافت کرتے۔سارا خرچ ہم خود کریں گے۔ چنانچہ میں نے یہ مژدہ حضرت امیر صاحب کو سنا دیا۔ ہماری چندہ کی رقم واپس اور ملک صاحب کے ذمہ سارے اخراجات۔آگے ایک اور الجھن پھر پیدا ہوگئی۔ملک صاحب نے کہا چوہدری صاحب میرے بھائی ہیں اور سیالکوٹ کے جاٹ ہیں۔ہم اپنے نائی سے دیسی گھی کی مٹھائی بنوا کر ہی پیش کریں گے۔

حضرت امیر صاحب نے فرمایا کہ یہ مٹھائی کوئی پسند نہیں کرے گا۔انہیں کہیں پھر رہنے دیں۔ میں نے حضرت امیر صاحب سے ادب سے عرض کیا کہ جناب میرے لئے یہ کہنا تو مشکل ہے۔کوئی اور طریقہ اختیار کروں گا۔ چنانچہ اسی روز میری ملاقات ملک صاحب سے ہوئی جو اکثر ویسے بھی روزانہ ہوتی تھی۔ میں نے کہا کہ آپ کا یہ ٹی سیٹ آپ نے امرتسر میں مجسٹریٹی کے دوران خرید کیا تھا۔ملک صاحب نے اس کی ذرا وضاحت کی کہ ہاں شاہ ایران آیا تھا تو لندن سے خصوصی طور پر برتن منگوائے گئے تھے۔وہیں سے یہ ٹی سیٹ میں نے خریدا تھا۔ میں نے کہا اس کی کوئی پیالی یا شوگر پاٹ یا ملک پاٹ اگر ٹوٹ جائے تو Replace ہوسکتا ہے تو بہ یہ ممکن ہی نہیں۔ملک صاحب نے فرمایا۔میں نے کہا اس کی تو کوئی گارنٹی نہیں کہ اس قیمتی سیٹ کا کچھ بھی باقی بچے گا۔ملک صاحب حیران ہوئے تو پھر کہا کیا کیا جائے۔ میں نے کہا یہ ساتھ ہی ''کلکتہ ہاؤس'' والے ہیں۔اسی رقم میں یہ سارا انتظام خود کر دیں گے اور انہیں کے برتن ہوں گے اور ہم ان میں سے جو ٹوٹ گئے ان کے بھی ذمہ دار نہیں ہوں گے تو پھر چلو ان سے بات کریں۔ میں نے چائے کے سارے لوازمات لکھوا دیئے اور 900 روپے ملک صاحب نے دے دیئے اور چائے کا انتظام بھی ہوگیا اور حضرت چوہدری صاحب کی بہت عمدہ تقریر بھی ہوگئی۔یہ تقریر اردو زبان میں تھی۔

شام کے کھانے کے لئے محترم فیض احمد صاحب ایڈووکیٹ سابق ایم ایل اے نے کھانے کی دعوت کی وہ حضرت چوہدری صاحب کے پرانے واقف اور ممنون تھے۔شاید جونیئر وکیل کے طور پر حضرت چوہدری صاحب کے ساتھ کام کرتے رہے تھے۔وہاں پر وکلاء برادری نے حضرت چوہدری صاحب سے خواہش کی کہ آج انگریزی زبان میں بین الاقوامی عدالت کی کارکردگی پر تقریر فرمادیں۔

چوہدری صاحب نے مسکرا کرفرمایا بہت اچھا۔آج شام کے میزبان مجھے انگریزی زبان میں تقریر کرنے کے لئے انگریزی زبان میں کہہ دیں تو میں تقریر انگریزی زبان میں کروں گا۔ چوہدری فیض احمد صاحب نے کہا انگریزی مجھے نہیں آتی ہے۔آپ وکلاء کی خاطر انگریزی میں ہی تقریر فرمائیں۔وہ بھی ایک یادگار شام اور یادگار لیکچر تھا۔

ملک صاحب کی مالی قربانی

حضرت حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کا ایک فرمان اکثر بیان کیا جاتا ہے جو حضور نے چندہ وقف جدید کی کمی کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا۔ اگر مجھے کپڑے بھی بیچنے پڑے یا مکان بھی فروخت کرنا پڑا تو میں تحریک وقف جدید کو کامیاب کرنے کے لئے دریغ نہیں کروں گا (مفہوم) اس پر ملک صاحب نے میری موجودگی میں حضور انور کو عریضہ لکھا کہ حضور آپ نے پہلے ہی اپنی ہر شے راہ خدا میں جھونک دی ہوئی ہے۔اب ہمارے کپڑے اور ہمارے مکان اور ہماری زمینیں باقی ہیں جو حاضر ہیں۔پہلے یہ بکیں گی تو پھر آپ کی باری آئے گی۔ چنانچہ چندہ میں کافی اضافہ کر کے رقم ارسال کر دی۔

پھر فرمانے لگے اس دفعہ جلسہ سالانہ میں حضور نے جو تفصیل تحریک جدید کے ثمرات کی بیان فرمائی ہے وہ بڑی ایمان افروز بھی ہے اور شاندار بھی۔حضور کی اس تحریک کو تو اللہ کے فضل سے خصوصاً بیرون ملک میں بہت کامیابی عطا ہوئی ہے مگر پھر کہنے لگے سوال یہ ہے کہ ہم چندے کتنے دیتے ہیں۔یہ تو انگلی پر لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے کی کوشش ہے۔حالانکہ میرے اندازے کے مطابق ملک صاحب کا چندہ ضلع میں شاید سب سے زیادہ ہوتا تھا۔فرمایا میرے پاس نقد رقم تو اتنی نہیں ہے میں دو مربع زمین نہری جو برلب سڑک رونده بھلوال تا سردار پور نون واقع ہے، وہ تحریک جدید میں دیتا ہوں تم لکھو کہ یہ زمین تحریک جدید اپنے نام انتقال کرالے۔ چنانچہ محترم چوہدری مشتاق احمد صاحب باجوہ جوان دنوں وکیل الزراعت تھے تشریف لائے تھے اور غالباً زمین وہ فروخت کر گئے تھے۔زمیندار ہی جانتے ہیں کہ مالک اراضی کے لئے اراضی اور وہ بھی بہترین موزوں مقام پر اسے کتنی عزیز ہوتی ہے۔

زیاں ہے عشق میں یہ جانتے ہیں ہم بھی مگر
معاملہ ہی کیا ہو اگر زیاں کے لئے

دیانتداری اور غیرت ایمانی

آپ مجسٹریٹ تو بہت مقامات پر رہے۔جب ڈپٹی کمشنر ہوئے تو گوجرانوالہ، ڈیرہ غازی خان، مظفر گڑھ، ملتان، جھنگ اور شیخوپورہ میں تعینات رہے۔ بہت خداداد رعب والے افسر تھے جہاں رہے غریب و امیر سبھی رطب اللسان رہے۔ایک دفعہ ہم دونوں لاہور جا رہے تھے۔پنڈی بھٹیاں میں حضرت بابا خیر محمد صاحب نون کا مزار ہے۔وہ ہمارے جدامجد تھے۔ملک صاحب نے فرمایا یہاں چند

منٹ رک کر ان کے مزار پر بھی دعا کر لیں۔ چنانچہ ہم جہاں تک کار جا سکتی تھی گئے۔ آگے کار کھڑی کر کے پیدل گئے رؤسا شہر بھٹی صاحبان کو ملک صاحب کی آمد کا کسی نے بتا دیا۔ پھر کیا تھا سارے بھٹی سردار صف بستہ حاضر ہوئے اور وہیں شب باش ہونے پر اصرار کیا۔ وہ ملک صاحب کے گوجرانوالہ کی تعیناتی کے دوران احسانات کو یاد کر کے گویا نثار ہو رہے تھے۔ حالانکہ اس دن ان کا کوئی فرد خاندان فوت ہو گیا تھا۔ وہ جنازہ چھوڑ کے آئے تھے مگر ملک صاحب نے معذرت کی اور کہا آپ جائیں افسوس ہے کہ آپ کے خاندان میں فوتیدگی ہوگئی ہے۔

آپ کی خاندانی وجاہت اس کے ساتھ دیانتداری، راست روی پھر اس پر تقویٰ کا رنگ جو چوکھا چڑھا تو یہ سارے عوامل مل کر آپ کو ایک نا قابل تسخیر شخصیت قادر کریم نے بنا دیا تھا۔ چنانچہ فرماتے تھے انگریز چیف سیکرٹری نے کمشنرز اور ڈپٹی کمشنرز کی ایک میٹنگ بلائی تھی اور میٹنگ کے بعد کھانے کے دوران چیف سیکرٹری نے جماعت کے بارہ میں درشتگی اور کسی قدر نفرت کا اظہار کیا۔ میں سلام کرتا ہوں اس باغیرت نون کو کہ جس نے وہیں کھانا چھوڑ دیا اور چیف سیکرٹری کو سخت جواب دے کر کھانے کے کمرے سے باہر آ کر اپنی موٹر میں بیٹھ کر واپس چلے آئے۔ ملازمت پیشہ دوست ہی اس معاملہ کی سنگینی کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک ڈپٹی کمشنر کمشنروں اور خصوصاً چیف سیکرٹری کو بیٹھے چھوڑ کر اس کی دعوت پر تین حرف بھیج کر کیسے اُٹھ کر آ سکتا ہے۔ ؎

دلبر کی راہ میں یہ دل ڈرتا نہیں کسی سے
ہوشیار ساری دنیا اک باولا یہی ہے

میں سوچتا ہوں کہ یہ آپ کا سخت رویہ کسی خاندانی زور کی وجہ سے ممکن نہیں تھا بلکہ صرف اور صرف ایمانی غیرت، تقویٰ کے اعلیٰ مقام اور توکل علی اللہ کے جو اسباق آپ نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی کلاس میں پڑھے تھے انہیں کے باعث اتنی دلیری اس وقت آپ میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے لئے کسی ثبوت یا دلیل تلاش کرنے کی کیا حاجت ہے کہ اپنے آقا کے روحانی جلال کا سایہ ہی اس ارادتمند پر پڑا اور یہ تاریخ کا انوکھا اور نادر اور بے مثال ایمانی مظاہرہ اس شجاع نون نے کیا۔

پھر اسی ضلع گوجرانوالہ کی تعیناتی کے دوران کولوتارڑ دورہ پر تشریف لائے۔ چوہدری عطاء اللہ ذیلدار کے دارہ پر وارد ہوئے۔ آتے ہی حکم صادر کیا کہ یہاں کے سارے احمدیوں کو بلاؤ۔ وہ سبھی غریب کمی کمین ہی تھے۔ (ان میں سے میاں محمد بخش ہنوز زندہ ہیں۔ بہت عمر رسیدہ ہیں)۔ سب ڈرتے کانپتے حاضر ہوئے کہ نہ معلوم ''صاحب بہادر'' ہمارے لئے کیا حکم لائے ہیں۔ جب آئے تو وہ بیچارے زمین پر بیٹھ گئے مگر ملک صاحب اٹھے اور حکم دیا۔ چارپائیاں لاؤ انہیں پاس بٹھایا اور پوچھا تمہیں چوہدری کوئی تکلیف تو نہیں دیتے۔ مگر وہ بیچارے جھینپ رہے تھے کیسے اتنے بڑے چودھریوں کا شکوہ کرتے۔ بھانپ گئے اور پھر چودھریوں کو کہا کہ یہ میرے بھائی ہیں۔

خبردار جوان سے کسی نے براسلوک کیا یا کوئی بیگار لی۔ پھر کیا تھا ان غریبوں سے عزت اور آبرو سے سبھی پیش آنے لگے۔ اس چھوٹے سے واقعہ میں معاشرے میں اونچے مقام کے احمدیوں کے لئے کیسے زریں اسباق موجود ہیں۔ کاش کہ سبھی احمدی اپنے غریب احمدی بھائیوں کی اسی طرح عزت اور وقار کا خیال رکھیں اور یاد رکھیں کہ ہمارے آقا و مرشد نے تو فرمایا کہ وہ احمدی (بڑے چھوٹے کی کوئی تمیز نہیں) ایسے ہوں جیسے ایک پیٹ سے نکلے ہوئے دو بھائی (مفہوم)۔ ایک دفعہ حافظ آباد گوجرانوالہ روڈ پر نہر کا ایک بنگلہ ہے۔ آپ کا وہاں پر دورہ مقرر تھا۔ آپ آئے اور معلوم ہوا کہ وہاں کوئی غریب آدمی ''رفیق حضرت مسیح موعودؑ'' رہتا ہے۔ انہیں بلا بھیجا اور اس کے لئے اور اپنے لئے ایک الگ جگہ کرسیاں لگوا کر اس کے ساتھ کافی دیر تک راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہیں اور ساری چودھراہٹ سرنگوں منتظر بیٹھی رہی کہ کب ہمیں سلام کا موقعہ ملتا ہے۔ ؎

طریق عشق میں اے دل سیادت کیا غلامی کیا
محبت خادم و آقا کو اک حلقہ میں لاتی ہے

غرض جہاں جاتے احمدیوں کے ساتھ گھل مل جاتے۔ ان کا احوال معلوم فرماتے اور انہیں کوئی مسئلہ درپیش ہوتا اسی وقت دم نقد حل کر دیتے۔

چوہدری بشیر احمد صاحب تارڑ سرگودھا میں ڈپٹی کمشنر رہے ہیں۔ اسی دوران ان کے بڑے بھائی چوہدری نذیر احمد صاحب تارڑ موضع ونیکے تارڑ ضلع حافظ آباد سے ملک صاحب کے پاس آئے۔ میں بھی پاس بیٹھا تھا۔ چوہدری صاحب نے کہا ''چاچا جی بشیر احمد روزانہ سلام کرنے آتا ہے کہ نہیں'' ملک صاحب نے فرمایا مجھے اکثر ملتا رہتا ہے۔ چوہدری نذیر احمد صاحب نے کہا اس کا فرض ہے اور میں یہی معلوم کرنے آیا ہوں کہ وہ آپ کے گھر روزانہ حاضر ہو کر آداب بجالاتا ہے کہ نہیں ملک صاحب نے انہیں ٹھنڈا کیا کہ وہ بہت مصروف ہے مگر یوں تابعدار ہے کہ فکر نہ کریں وہ مجھے احترام سے ملتا ہے۔

سرگودھا میں ایک مشہور سیشن جج سید عبداللطیف شاہ صاحب تھے وہ کافی سال یہاں مجسٹریٹ دفعہ 30 اور پھر سیشن جج رہے اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ جب ریٹائر ہوئے تو ملک صاحب نے شام کی چائے پر انہیں بلایا۔ چند لوگ ہی مدعو تھے جن میں راقم تو تھا ہی وضاحت فرمائی کہ میں رات کے کھانے کا تکلف برداشت نہیں کر سکتا جلدی سو جاتا ہوں۔ دعوت رات کو ہو تو دیر تک جاگنا پڑتا ہے جو میرے لئے مشکل ہے۔

ملک صاحب اندر گئے تو سیّد عبداللطیف شاہ نے ایک واقعہ سنایا کہ میں ایل ایل بی کر کے گاؤں آیا تو میرے والد صاحب جو ذیلدار تھے فوت ہو گئے اور گاؤں سے آٹھ درخواستیں ذیلداری کی دائر ہوئیں۔ ملک صاحب نے مجھے عدالت کے برآمدے سے گزرتے

ہوئے پہچان لیا اور چپڑاسی کو بھیجا کہ اس آدمی کو جلد بلا لاؤ۔ اوّل افسوس کیا کہ بھائی نادر علی شاہ صاحب فوت ہو گئے ہیں۔ میں انشاءاللہ حاضر ہوں گا۔ مجھے ان کی وفات کا بہت افسوس ہے۔ (سیّد نادر علی شاہ صاحب احمدی تھے) اور پھر پوچھا تم کیسے آئے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ میں ذیلداری کی درخواست دینے آیا ہوں۔ فرمایا درخواست کی ضرورت نہیں۔ اپنا HVC بلایا اور حکم دیا کہ دیکھو میں لطیف شاہ کو جانتا ہوں یہ مرحوم ذیلدار کا بیٹا ہے۔ لاء گریجوایٹ ہے۔ اچھے چال چلن والا شریف آدمی ہے۔ اسے میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ میں اسے ذیلدار مقرر کرتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ جناب کئی درخواستیں ہیں جن کی تاریخیں ابھی ایک ہفتہ بعد ہیں HVC کو حکم دیا کہ وہ بھی سب نکال لاؤ۔ وہ ساری درخواستیں لایا۔ ایک ایک کر کے ان سب کو خارج کر دیا اور مجھے ذیلدار مقرر کر دیا۔ جب مقررہ تاریخ آئی تو سبھی امیدواران حاضر آئے۔ HVC نے بتایا تمہاری درخواستیں خارج ہو چکی ہیں اور لطیف شاہ پسر ذیلدار کو ذیلدار مقرر کر دیا گیا ہے۔ سب نے اپیلیں کمشنر راولپنڈی کے پاس دائر کر دیں کہ ہمیں سنا بھی نہیں گیا اور مقررہ تاریخ سے پہلے ہی ہماری درخواست DC نے خارج کر دی ہے وغیرہ۔ کمشنر جو انگریز تھا اس نے کہا جب میرا ڈی سی ذاتی طور پر پسر ذیلدار کو جانتا ہے اور اس کی نگاہ میں وہی فٹ امیدوار ہے تو میں اس کی Discretion میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھتا۔ سب اپیلیں خارج کر دیں اور کئی میرے سامنے واقعات ملک صاحب کی سینہ زوری کے ہیں لیکن سبھی حق پر مبنی۔ مگر الفضل کی تنگ دامانی کا خیال ہے۔ اس لئے اس شیریں داستان کو فی الحال یہیں ختم کرتا ہوں۔

نون ٹوانہ برادری میں ملک صاحب کی تعظیم

ملک محمد فیروز خان صاحب وزیر اعظم پاکستان تھے کراچی سے نور پور نون اپنے گاؤں آئے ساری برادری وہاں اکٹھی تھی۔ مجھے بھی ساتھ لے کر نور پور وزیر اعظم کو ملنے چلے گئے میں نے دیکھا ڈی آئی جی ملک عطا محمد صاحب نون جو حاضر سروس تھے۔ بریگیڈیئر گل شیر خان صاحب نون اور دیگر افراد خاندان حتیٰ کہ خود سر فیروز خان صاحب اُٹھ کر دونوں ہاتھ ناف کے نیچے باندھ کر صف بستہ ہو گئے اور سبھی اس درویش نون کو سلام کر رہے تھے اور آداب بجا لا رہے تھے۔

کمزوروں کی مدد کرنے والا

ایسے کئی واقعات ہیں جو دوران ملازمت تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ حکومتی زور اور اختیارات کی وجہ سے مگر ریٹائرمنٹ کے بعد بھی بہت خود اعتمادی کے ساتھ جس میں خدا ترسی اور الٰہی مدد پر بھروسہ ہونے کی وجہ سے ایک خاص زوردار رعب پیدا ہو گیا تھا۔ کام لیتے تھے جب جھنگ میں ڈی سی تعینات تھے تو انہیں پتہ چلا کہ موضع سنبلا نوالہ تھانہ میانی کے ایک زمیندار شیر خان کے دو قیمتی گھوڑے چوری ہو گئے ہیں۔ جو لالیاں کے ایک مشہور رسہ گیر رئیس کے پاس ہیں اور ملک صاحب کے بھائی میجر سردار خان صاحب نون نے بھی اسے گھوڑے

واپس کرنے کو کہا تھا مگر اس نے گھوڑوں کے اس کی تحویل میں ہونے سے انکار کر دیا تھا ملک صاحب کو یقین دلایا گیا کہ واقعی گھوڑے اس کے پاس ہیں۔ چنانچہ ملک صاحب گھر آئے ہوئے تھے سیدھے لالیاں گئے ریسٹ ہاؤس کھل گیا۔ چونکہ دورے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ پولیس کی دوڑیں لگ گئیں۔ ''صاحب بہادر آ گئے ہیں''۔ ملک صاحب نے تھانیدار کو کہا کہ کوئی آدمی بھیج کر فلاں رئیس کا نویں والا کو بلوا کر میرے پاس بھیجو۔ اس رئیس نے اپنی عزت افزائی سمجھی فوراً ملک صاحب کے پاس پہنچا پرانی خاندانی واقفیت تھی۔ ملک صاحب نے چھوٹتے ہی کہا کہ شیر خان بیچارے کے گھوڑے واپس کر دو۔ اس نے آگے سے حیل وحجت کی۔ نہیں جناب میں تو کبھی ایسا کام نہیں کرتا اور نہ مجھے شیر خان کے گھوڑوں کا علم ہے۔ ملک صاحب نے 2/3 بار اسے فہمائش کی کہ یہ تو مجھے یقین ہو چکا ہے کہ گھوڑے تمہارے پاس ہی ہیں۔ واپس کرنا پڑیں گے۔ جب پھر بھی اس نے انکار کیا تو ملک صاحب نے تھانیدار کو بلایا اور حکم دیا کہ اسے ہتھکڑی لگا دو۔ وہ رئیس ملک صاحب کے پاؤں پکڑ گیا کہ ملک صاحب خدا کے لئے ایک دن کی مہلت دے دیں۔ زمین اور آسمان کے درمیان جہاں کہیں بھی گھوڑے ہوں گے پیش کر دوں گا۔ ملک صاحب مان گئے اور کہا چھوڑ دو فی الحال اس کو۔ آج رات میں یہاں ہوں کل میرا دورہ چنیوٹ ہوگا۔ وقت پر وہاں گھوڑے لے کر آ جانا۔ چنانچہ اگلی سہ پہر وہی گھوڑے لے کر حاضر ہو گیا۔ جناب آپ ناراض ہو گئے تھے میں نے بڑی مشکل سے اور بڑی دور سے برآمد کئے ہیں۔

یہ تو ڈپٹی کمشنر کے دوران کا واقعہ تھا۔ پھر ریٹائرمنٹ کے بعد بلکہ وفات سے چند سال قبل جب آپ بہت کمزور ہو چکے تھے۔ فتح آباد اپنے واحد ملکیتی گاؤں میں کوٹھی سے باہر نکل کر دارہ پر آئے وہاں بہت لوگ جمع تھے۔ سب نے اپنی اپنی گزارش کی۔ ایک آدمی نے اپنی بپتا سنائی کہ میں ایک مزارع قریبی گاؤں کا ہوں۔ فلاں آدمی (جو علاقے کا بدمعاش اور خود چور اور رسہ گیر تھا) نے میرے دونوں بیل چرا لئے ہیں اور نون صاحبان کے کہنے پر بھی انکاری ہو گیا ہے۔ ملک صاحب نے تفصیل دریافت فرمائی اور کہ کس طرح اسے یقین تھا کہ اسی نے چرائے ہیں۔ اس نے بتایا وہ کوٹ حاکم خان نواحی گاؤں کا مزارع تھا۔ (واضح ہو کہ کوٹ حاکم خان ملک صاحب کے والد صاحب کے نام پر ہی یہ گاؤں موسوم ہوا تھا۔ ملک صاحب کے والد صاحب کا نام ملک حاکم خان صاحب تھا) جب یقین ہو گیا کہ وہی نامی چور ہے تو اپنے منشی کو کہا کہ پرسوں اسے بلوا لو اور اس غریب آدمی کو حاضر ہونے کا کہا۔ چنانچہ وہ آ گیا اور کیا مجال جو وہ پیروں پر پانی پڑنے دے۔ اسی طرح ٹال مٹول کرنا شروع کی جس طرح باقی نون صاحبان کو کہہ کر ٹال دیتا تھا۔ مگر اسے کیا معلوم یہ نون ٹرخایا نہیں جا سکتا تھا۔ اب اس کے پاس وہ لالیاں والی ہتھکڑی تو نہیں تھی مگر تقویٰ اللہ اور توکل علی اللہ کے ہتھیاروں سے آج بھی پوری طرح لیس تھے۔ چنانچہ حکم صادر ہوا کہ تم چلے جاؤ سات دن کی مہلت ہے۔ اگر بیل واپس نہ کئے تو مزارع کو کہا کہ میرے اعلیٰ نسل کے کئی بیل یہاں کھڑے ہیں جو تمہیں پسند آئے وہ لے جانا میں جانوں اور یہ چور، اب میرے بیل اس کے پاس ہوں گے اور میں دیکھوں گا یہ کس طرح

واپس نہیں کرتا۔ وہ غریب آدمی واپس گھر چلا گیا اور اس چور کو بھی اٹھا دیا۔ چار دن گزرے تھے کہ اصل بیل لے کر وہی حاضر ہو گیا کہ جناب نہ معلوم کہاں کہاں میں ان بیلوں کے پیچھے خوار ہوا ہوں۔ آپ ناراض نہ ہوں۔ یہ رہے بیل اور اس مزارع کو بلا کر اس کے حوالے کئے اور وہ دعائیں دیتا ہوا اپنے بیل ہانک کر خوشی خوشی گھر پہنچا۔ اسے وہ بیل مل گئے تھے جن کے ملنے کا کوئی بھی امکان نہیں تھا۔ خود میرے ساتھ کئی معاملات میں ننگی تلوار کی طرح ایسے ایسے معاملات میں مدد فرمائی کہ کوئی اور نہ کر سکتا۔

ملک صاحب نے حتی الوسع اپنے اکلوتے بیٹے کی تربیت اور تعلیم پر بہت توجہ دی تھی۔ حتیٰ کہ سرگودھا چھوڑ کر ربوہ میں سکونت اختیار کر لی۔ ایک صبح ملک صاحب اپنے اکلوتے بیٹے کو لے کر اپنے گاؤں سے سیدھے ہمارے گھر آئے چونکہ بہت سویرے تشریف لائے تھے میں نے ناشتے کا پوچھا۔ فرمایا ناشتہ کرنا ہے۔ میں نے سوچا آپ سے ضروری بات بھی کرنا ہے اور ناشتہ بھی آپ کو علم ہے جو میں کرتا ہوں۔ ہمارے ہاں گائیں بھینس تھیں، مکھن اور لسی وغیرہ ملک صاحب کو مرغوب تھے پھر چائے بہر حال یہ ان کی فراخدلی تھی کہ خوش رہتے تھے ہمارے ہاں تشریف لا کر۔ اور مشورہ یہ تھا کہ سوال کیا کہ حضرت صاحب نے فلمی گانے وغیرہ سننے کی اجازت دی ہوئی ہے؟ میں نے اس سادہ سے سوال کا جواب نفی میں دیا۔ فرمایا بیٹا کہتا ہے مجھے ریڈیو لے دو۔ اس پر گندے اور فحش گانے ہوتے ہیں جس کی اجازت حضرت صاحب نے نہیں دی۔ میں تو ریڈیو لے کر نہیں دوں گا۔ بچہ 9، 10 سال کا تھا، رونے لگ گیا۔ میں نے ایک درمیانی راستہ تجویز کیا کہ اسے ٹیپ ریکارڈر خرید دیں اور بانی سلسلہ اور ائمہ کی نظموں کی کیسٹیں وہ سنتا رہے گا۔ اس کا دل بھی بہل جائے گا اور یہ سودمند بھی ثابت ہوگا۔ فرمایا ہاں یہ ٹھیک ہے اور تم خود اس کے ساتھ جاؤ اور ٹیپ ریکارڈر اسے خرید دو میں نے اسی روز تعمیل کر دی۔

موضع گورالی ضلع گجرات میں نون خاندان کی رشتہ داری چلی آ رہی ہے۔ ملک مولا بخش صاحب ان کے بزرگ احمدی تھے۔ آگے ان کی اولاد میں احمدیت نہ چلی۔ انہیں کا ایک بیٹا اے۔ کے ملک صاحب کمشنر راولپنڈی اور ممبر بورڈ آف ریونیو بھی رہے۔ ہماری کمشنری راولپنڈی ہی تھی۔ میں عدالتی کام سے فارغ ہو کر انہیں راولپنڈی گھر ملنے کے لئے گیا تو انہوں نے مجھے کہا کہ دیکھو خفیہ رپورٹیں آ رہی ہیں کہ سلانوالی کے علاقے میں احمدی بہت اشتعال پھیلا رہے ہیں۔ ان دنوں چک منگلا وغیرہ میں احمدی ہو رہے تھے۔ میں نے انہیں جواب دیا کہ اگر کوئی احمدیت قبول کر لے تو اشتعال کیسے پھیل جاتا ہے۔ ہم کسی کو مجبور تو کر نہیں رہے۔ اپنی مرضی سے لوگ احمدیت قبول کر رہے ہیں۔

انہیں اے۔ کے ملک صاحب کی بھتیجی کے رشتہ کے لئے ملک صاحب نے اپنے بیٹے کے لئے پیغام بھیجا۔ جب میرے ساتھ اس کا ذکر کیا تو میں نے کہا ملک صاحب حضرت صاحب سے آپ نے اجازت لے لی ہے۔ وہ حیران ہوئے کہ کس بات کی۔ جماعت سے باہر رشتہ کرنے کی نہیں تو۔ میں نے عرض کیا کہ یہ ضروری ہے تو ملک صاحب نے اسی وقت اس تجویز کو منسوخ کر دیا کہ اجازت کیسی۔

جب جماعت سے باہر رشتہ کرنے کی اجازت نہیں ہے تو میں کیوں اس اصول کو توڑ دوں۔

الغرض وہ غریبوں اور بے نواؤں کا ہمدرد اور دکھ درد کا ساتھی وہ احمدیت کے لئے از حد غیرت رکھنے والا خلیفہ وقت کا حقیقی غلام اپنی ملازمت کے دنوں میں سب سے زیادہ خوش پوش سوا چھ فٹ کا جوان اور ساتھ سادگی کا بہترین نمونہ خدا کی راہ میں بے حد قربانی کرنے والا۔ وہی جس نے اکیلے بیت محمود متصل دارالضیافت تعمیر کروادی۔ وہی جس نے محلہ دارالیمن میں ایک بیت تعمیر کرائی۔ ہاں وہی جسے سارا نون خاندان پرہیز گار نواہی سے بچنے والا اور متقی انسان جانتا اور یقین کرتا تھا۔ وہ ملتان ملازمت کے دوران گیا تو وہاں کے لوگوں کے دل جیت لایا۔ جھنگ میں بھی اور گوجرانوالہ میں بھی ڈیرہ غازی خان اور مظفر گڑھ میں بھی اس نے بیشمار دل فتح کئے۔ اسے کبھی نہ دل میں خوف پیدا ہوا نہ وہ اس معاملے میں کسی سے ڈرتا تھا کہ احمدیوں کے ساتھ بطور خاص ملنا خواہ کتنا ہی غریب ہو اور اس کے کام کرنا اور رؤسا زمانہ کی بیگار سے انہیں بچانا اور پھر ہر ضلع میں اس نے اپنی دیانتداری پرہیزگاری اور دین حق کے لئے غیرت کے جھنڈے گاڑے مثلاً ملتان کے بڑے زمیندار بوسن تو انہیں دیوتا جانتے تھے۔ اس طرح گوجرانوالہ ضلع کے بھٹی اور تارڑ اس کی تعریف میں رطب اللسان پائے گے۔ میرا یہ مشاہدہ آپ کی ریٹائرمنٹ کے بعد کا ہے غرض ؎

جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

جب آپ کی وفات ہوئی تو فتح آباد میں نماز جنازہ میں حضرت سیّدنا مرزا طاہر احمد صاحب، حضرت مرزا عبدالحق صاحب، حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب کے علاوہ سرگودھا اور ربوہ کے بہت بزرگ شامل ہوئے۔

چونکہ گاؤں کے تنہا مالک تھے۔ سارے گاؤں کی آبادی آپ کی رعیت تھی۔ حتیٰ کہ گاؤں کا ''مولوی'' بھی۔ ہمارے جنازے پڑھنے کے بعد ان لوگوں نے بھی جنازہ پڑھا جس میں نون برادری بھی شامل ہوئی۔

وہ تو اس قدر اللہ کے غضب سے ڈرتا تھا کہ ایک دفعہ اپنے منشی محمد صدیق کو گودام سے غلہ چوری کر کے فروخت کرنے پر نوکری سے برخاست کر دیا۔ فرماتے تھے یہ حکم دے کر گھر گیا تو آپ کا اکلوتا بیٹا جو اس وقت چھ سات سال کا تھا اسے تیز بخار ہو چکا تھا جسے چند منٹ پہلے چنگا بھلا تندرست چھوڑ کر باہر گئے تھے۔ اسی وقت خیال آیا کہ مولا کریم کو میری یہ ادا پسند نہیں آئی۔ اسی وقت سائیکل پر آدمی منشی کے پیچھے دوڑایا اور اسے کہا جاؤ تمہیں معاف کیا۔ آئندہ ایسا فعل نہ کرنا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے جب فوت شدہ بزرگوں کے نام زندہ رکھنے کے لئے ان کے ورثاء کو چندہ فوت شدگان کی طرف سے دیتے رہنے کی سماوی تحریک فرمائی تو میں نے بھی اس ارشاد حضور کا اپنے آپ کو مخاطب سمجھا۔ ہر گاہ کہ میں مرحوم والدین اور اپنی اہلیہ مرحومہ کی طرف سے تو پہلے ہی چندہ دیتا تھا ملک صاحب خان صاحب نون کا نام نامی زندہ رکھنے کے لئے چندہ دینا شروع کیا مگر میں کیا

اور میری بساط کیا۔

1949ء میں جب سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کمپنی باغ سرگودھا میں لیکچر دینے کے لئے سرگودھا تشریف لائے تو حضور کے اعزاز میں ملک صاحب موصوف نے دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا جس میں کچھ رؤسا اور انتظامیہ کے افسران علاوہ جماعت کے اکابرین کے مدعو تھے۔

لطیفہ یہ ہوا کہ مسٹر نصیر احمد صاحب ICS جو DC سرگودھا تھے اور انگریز مسٹر ٹیری (Terry)SP تھے۔ SP سرگودھا نے DC سے پوچھا کہ نون صاحب کے ہاں لنچ پر جانا ہے؟ DC صاحب نے پوچھا کون سے نون صاحب مسٹر Terry گورے SP نے بے ساختہ جواب دیا "Sahib Khan is only Noon all other Noons are after Noon." انگریز SP کے ریمارکس میں ملک صاحب کی جو عمر کی آخری منازل طے کر رہے تھے۔ جو اس ہمتی بلند حوصلگی اور اعلیٰ کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ دیگر وجوہ کا خدا جانے مگر اس میں کیا شک ہے کہ مامور زمانہ کو پہچاننے میں یہی Only Noon تھا اور کوئی اس کا ہمسر نہیں تھا۔ ملک صاحب سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے عاشق صادق تو تھے ہی حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب اور صاحبزادہ مرزا شریف احمد صاحب کے ساتھ بھی ملک صاحب کے عقیدت، احترام اور محبت کے گہرے روابط تھے۔

پیر فضل شاہ گجراتی کی زبان میں ؎

چن آسمانی سورج کولوں لیندائے نور ادھارا
سر پیراں تک نور مجسم میرے دلبر ماہی

1966ء موسم گرما میں بڑھاپے نے ساری توانائیاں چوس لی تھیں مگر آواز میں وہی خداداد رعب اور جہاں دینی غیرت کا سوال آتا تو نیم جاں جسم میں نامعلوم کہاں سے ساری طاقتیں عود کر آتیں۔ آخر 17 / جولائی 1966ء کا دن آ گیا اور وہ چراغ جو حضرت خلیفۃ المسیح الاول کے مبارک دور میں امرتسر پچھلی رات روشن ہو کر ضوفشانی کرنے لگا تھا پھر مسلسل 55 / 56 سال تک نور بکھیرتا رہا بجھ گیا۔ ؎

اے اجل مانا کہ تیری فطرت ہے گل چینی
پھول وہ توڑا کہ گلشن میں ویرانی ہو گئی

(روزنامہ الفضل ربوہ 17 / جولائی 2004ء صفحہ 3 تا 4، 19 / جولائی 2004ء صفحہ 3 تا 4 و 7)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁



ندائے نماز اور اس کا عاشق
میرا ممدوح ومطاع حضرت مصلح موعود

مجھے قلبی دکھ کے ساتھ یہ کہنا اور لکھنا پڑتا ہے کہ اصل لفظ جو نماز کے لئے بلانے کے واسطے مستعمل ہے وہ نہ میں لکھ سکتا ہوں اور نہ یہ کالم انہیں چھاپنے کی طاقت رکھتے ہیں اور اس جائز کام کے لئے بھی مجھے متبادل الفاظ تلاش کرنا پڑیں گے اور ایسے کرتے ہوئے ہر دم میرے دل پر ایک چوٹ لگے گی۔ آزادی ضمیر اور آزادی اظہار کے دعوؤں کے باوجود میں ایک صحیح اور برمحل لفظ تک نہیں لکھ سکتا مگر یہ آجکل کی بات نہیں ربع صدی ہونے کو آئی کہ ہمارے ہونٹوں پر ٹیپ لگا دی گئی اور اب تو ہم خوگر ظلم وستم ہو چکے ہیں۔ ؎

جو کچھ خدا دکھائے وہ ناچار دیکھنا

حضرت رابعہ بصریؒ سے کسی نے پوچھا تھا کہ آپ کو غم کب ہوتا ہے؟ فرمایا جب کوئی غم نہ ہو۔ اسی طرح ہم بھی دکھوں اور غموں کو مسلسل سہنے کے عادی ہو چکے ہیں اور اب تو یہاں تک کہنا شروع کر دیا ہے کہ ؎

موسم گل ہی کیا ہے ضروری فصل خزاں میں جی لوں گا
اہل چمن کے ناز اُٹھانا میرے بس کی بات نہیں

برصغیر کی تقسیم سے قبل کا واقعہ ہے کہ قادیان میں ''بیت'' مبارک کی چھت پر مجلس عرفان منعقد ہوا کرتی تھی۔ سیدنا حضرت مصلح موعود لکڑی کے بنے ہوئے شہ نشین پر تشریف فرما ہوتے تھے مگر حضور کے حکم پر حضور کے دائیں بائیں بھی اسی قسم کے شہ نشین رکھے جاتے تھے جس پر حضور کے ساتھ اور بزرگ بھی تشریف رکھتے تھے کیونکہ حضور اکیلے دوسروں سے اونچا بیٹھنے کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ وہ ''مجلس عرفان'' کیا تھی۔ اس میں علم وحکمت، تعلیم وتربیت پند ونصائح اور دین حق کی اشاعت کے ذرائع اور وسائل کا بیان بھی ہوتا اور دین حق کی صداقتوں اور کتاب اللہ کے فضائل بمقابلہ دیگر ادیان کی کتب کا ذکر بھی۔

غرض وہ ربانیوں اور قدوسیوں کی ایسی محفل سجتی تھی کہ نہ میرے قلم میں طاقت ہے کہ اس کے محاسن کو بیان کر سکے نہ زبان میں وہ طاقت ہے کہ اس کی خوبیوں کا شمار کر سکے بلکہ حق یہ ہے کہ میرے تصور میں بھی اتنی گنجائش نہیں کہ فکر وذکر دینی کی ان محافل کے حسن و جمال کو کسی طرح سمیٹ سکے۔ وہ بس سننے اور اس کی خوشبو سونگھنے اور مہک میں مست ہو جانے والے ہی کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ

گلستان کیا تھا اور اس کے پھل پھول کیا تھے۔ المختصر ؎

ہر روز روز عید تھا اور ہر شب شب برات

وہ مقدس شامیں ہمیں اپنا مقدر سنوارنے کا موقع عطا کر گئیں۔ ؎

اُنج تے دیکھنے نوں لاتعداد واری ساڈی زندگی وچ بہار آئی

اپر اوہ نہ کدی بہار آئی اسیں منتظر جیہڑی بہار دے رہے

حضرت مصلح موعود گرمیوں میں ڈلہوزی اور سردیوں میں بعض سندھ کی اراضیات کی دیکھ بھال کے لئے تشریف لے جایا کرتے تھے تو ہمیں بھی حضور کی قادیان سے غیر حاضری میں اپنے والدین کو ملنے کا ہوش آتا تھا۔ کبھی مہینہ میں ایک بار کبھی دو ماہ کے بعد ایک دو دن کے لئے۔ پھر جیسے پرندہ اپنے گھونسلے کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے۔ ہم بھی بھاگم بھاگ دارالامان کا رخ کرتے تھے اور والدین کرام کو جب ہماری حضور انور کی اس ہم نشینی کی روش کا پتہ چلا تو وہ بھی خوش ہوتے تھے ''شادیم کہ کارے کردی''۔

برادرم چوہدری مسعود احمد صاحب مرحوم طالب پور بھنگواں والے جو 8/اکتوبر کے زلزلہ میں حرماں نصیب مرگلہ پلازہ اسلام آباد میں شب باش ہوئے تھے اور وہیں راہی ملک عدم ہو گئے۔ اللہ ان کو اپنی مغفرت کی چادر میں لپیٹ لے۔ وہ ہمارے ہم سبق اور ساتھی ہوتے تھے اور مجھے ان کا مجلس عرفان میں بلا ناغہ حاضری کا اہتمام کرنا یاد ہے۔ جونہی سورج اپنی آخری منزل کی طرف سفر کرتا نظر آتا ہم بھی اسی آسمانی مائدہ کی انتظار میں بیت مبارک کی چھت پر ہمہ تن منتظر ہوتے۔ اس آسمانی شخص کے دینی فکر و ذکر کے ہر شام نئے سے نئے اسلوب اور دلائل بیان کرنے کے حسین پیرائے ہوتے تھے اور ایسے دلنشین کہ ہر شب سامعین یہی کہتے کہ یہ جو آج نعماء روحانی عطا ہوئی ہیں پہلے کبھی نہ دیکھیں نہ سنیں۔ کیا گلاب اور موتیا اور چنبیلی کے پھول ایک دن یا ایک ہی موسم میں کھلتے اور خوشبوؤں کی لپٹیں بکھیرتے ہیں۔ ان کی زندگی تو شاید انسان کی زندگی سے بھی زیادہ ہو۔ مگر جب بھی کوئی پھول کھلتا ہے تو وہ اپنی شگفتگی اور تر و تازگی اور اپنی مہک سے ذہن و قلب کی شادابی اور بالیدگی کا موجب بنتا ہے اور کبھی بھی نہ پھولوں کی خوشبو میں باسی پن اور بوسیدگی در آئی اور نہ ان سے طبیعت کبھی اکتائی اور نہ کبھی جی بھرا۔ بہرحال میں اپنی ساری توانائیوں کو صرف کرنے اور میرا قلم اپنی ساری سیاہی نچوڑنے کے باوجود ان کیفیات کو بیان کرنے سے قاصر ہے جو ان چند سالوں میں نصیب ہوئیں۔

یوں تو وہاں اس گلستان میں رنگ برنگے خوشبودار پھول موجود ہوتے تھے مگر میں نے دیکھا اور مشاہدہ اور تجربہ کیا کہ میرے آقا و مرشد کے لئے جب آپ کے گھر کی طرف سے ''بیت'' والا دروازہ کھلتا تو انوکھی خوشبو دور سے ہی دل و دماغ کو معطر کر دیتی اور کیسے بتاؤں کہ اس خوشبو میں کیا ہوتا تھا۔ میں نے کئی بار تجربہ کیا کہ دائیں بائیں دیکھنا نہیں اور نہ پتہ کرنا ہے کہ حضرت صاحب آ رہے ہیں۔ خوشبو کی

لپٹیں خود ہی قوت شامہ میں پہنچ کر پتہ دے دیتی تھیں کہ وہ شخص آ رہا ہے۔ ؎

اس کی خوشبوئے پیرہن توبہ
بوئے گل ناگوار اب تک ہے

میں پہلے کسی مقالے میں لکھ چکا ہوں اور تکرار کا الزام لینے کے لئے بھی تیار ہوں مگر یہ اپنا فخر سعادت بتانے سے رُک نہیں سکتا کہ نہ مجھے کوئی مشق نہ تجربہ مگر ایک شام مجھ سے رہا نہ گیا اور نہ معلوم کیسے مجھے یہ ہمت پڑی کہ اچھل کر حضور کے قدموں میں جا بیٹھا اور دبانا شروع کیا۔ عشاء کے بعد جب فارغ ہوئے تو اپنے مشفق اور محسن ابن آقائی حضرت صاحبزادہ حافظ میرزا ناصر احمد کی ''عدالت'' میں پیشی ہوگئی میں اندر ہی اندر ڈر رہا تھا کہ آپ نہ معلوم کیا سزا سنائیں گے۔ کیونکہ آپ کی اجازت کے بغیر یہ ''جسارت'' کرنے کی کسی کو اجازت ہی نہ تھی۔ مجھ سے سیّدی حضرت حافظ صاحب نے پوچھا تمہیں کچھ مشق بھی ہے؟ میرا جواب نفی میں تھا اور ڈر رہا تھا کہ کیا حکم میرے خلاف صادر ہوتا ہے۔ مگر وہ میری حالت زار کو بھانپ گئے تھے اور وہ بڑے مردم شناس تھے اور حد سے زیادہ مہربان۔ انہوں نے جانا کہ اگر اسے منع کیا تو شاید یہ برداشت نہ کر سکے گا باعزت ''رہائی'' ہوئی۔ اس سے مجھے جو خوشی ہوئی وہ کچھ تو میں بھی جانتا ہوں مگر صحیح تو میرا خدا ہی جانتا ہے کیونکہ یہ نرمی اس شام کی جسارت کرنے کی معافی ہی نہیں تھی بلکہ آئندہ حضور کے قدموں میں بیٹھنے کا سرٹیفکیٹ بھی تھا۔ میں ایک دیہاتی لڑکا نہ شباہت نہ لباس مگر قربان جاؤں اس خانوادے کی وفاؤں اور بندہ نوازیوں پر کہ سیدی حضرت حافظ میرزا ناصر احمد صاحب نے جب مجھ بے نوا اور بے ہنر کا ہاتھ 1944ء کی ایک شام تھاما تو پھر باوجود میری نالائقیوں اور کج فہمیوں کے یوم وصال تک شفقت پہ شفقت اور کرم پہ کرم ہی فرماتے گئے اور حضور کی عنایات کریمانہ کی داستانیں میری زندگی میں اس قدر بکھری پڑی ہیں جو قرطاس پر تو اس کی وسعتوں اور طول وعرض کے باوجود سما نہیں سکتیں اس عالی نسب خاندان کی وفاؤں کا معیار تو دنیا جہان سے بلند و بالا ہے۔ مامور زمانہ کے تو کیا ہی کہنے۔ خود حضرت مصلح موعود فرماتے ہیں کہ ؎

خاک کر دے ملا دے مٹی میں
پر میرے دل کو بے وفا نہ بنا

اور یہی دستور عالی مقام باپ کے مایہ ناز حافظ قرآن فرزند کا تھا اور اس نابکار پر تو ایسے مہربان کہ ؎

مجھ سے خطا سرشت کو سب کچھ عطا کیا
ایسا تو خوش نصیب کوئی خال خال ہے

انہی شاموں میں سے ایک شام جب محفل کے خاتمے کا وقت آیا اور ہر جان یہ چاہتی تھی کہ ابھی اور کچھ حضور فرمالیں تو عشاء کی ندا کا حکم

ہوا۔ایک شخص نے ندا نماز دی۔حضور نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا کہ اس منادی کی ندا تو میرے ساتھ کے گھر میں بھی نہیں پہنچی۔کوئی اور جہیر الصوت ندا دے۔اس پر اور ایک شخص نے کوشش کی مگر حضور کو وہ بھی پسند نہ آئی۔فرمایا ندا میں نرمی بلند آواز ہی کافی نہیں نغمگی بھی ہونا چاہئے۔جہاں تک مجھے یاد ہے۔چار لوگوں نے اپنی اپنی طرز پر ندا دی۔آپ خوش نہ ہوئے اور فرمایا کہ محلہ جات میں صحیح تلفظ بلند آواز اور نغمگی اور سوز اور طرز ادائیگی کے مقابلہ جات کرائے جائیں۔تب جا کر ایک ندا کی طرز آپ کو بھائی اور جو پھر لاہور اور حضرت مصلح موعود کے ساتھ ربوہ بھی آئی پھر حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کے ساتھ لندن بھی گئی اور پرانے خطبات کی کیسٹوں میں سنتے ہیں تو آنسو بہاتے ہیں۔یہ آنسو محرومی اور دکھ کے بھی ہوتے ہیں اور آواز کی دلنشینی کی وجہ سے خوشی کے بھی۔

ہم بھولے لوگ قادیان میں ہی جان گئے تھے کہ یہ شخص بہت بلند مرتبہ شخص جس کی پیدائش سے بھی تین سال قبل اس کے خالق اور مالک اور مصور حقیقی نے اس کے خدوخال تفصیل سے بیان فرمادیئے تھے یہ تو حقیقی عاشق ندا ہے اور پھر ہم نے ساری عمر حضور کے اس عشق کے مظاہر دیکھے۔غالباً حضور نے یہ سعدی کی حکایت بھی سنائی تھی کہ ایک پادری کی بیٹی دین حق کی طرف مائل ہوئی اور اس کا یہ رویہ پادری کے لئے زہر قاتل ثابت ہو رہا تھا۔جب کسی قسم کی فہمائش نے کام نہ دیا نہ جبر وتشدد سے اسے دین حق سے برگشتہ کرنے کا کوئی سوال باقی رہا تو پادری بہت پریشان۔آخر اس شہر میں جہاں پادری رہتا تھا وہاں ایک ندا دینے والا منادی آ گیا۔اس کی آواز ایسی کرخت کھردری اور انکر الاصوات تھی کہ پادری کی بیٹی اس سے اور پھر اسی کے ذریعے دین حق سے نفور ہوگئی کہ اس میں کوئی شرینی ہی نہیں ہے اور شاید دین حق میں بھی یہی کچھ ہے۔پادری کو بھی اس کا علم ہوا تو اس کی جان میں جان آئی۔

مگر اس اندیشے سے خائف ہو کر کہ شاید اس ''مؤذن'' کی آواز کی دلنشینی اور دلربائی سے اور لوگ بھی نالاں ہوں تو یہ شہر چھوڑ کر چلا نہ جائے۔پادری اس مؤذن کے پاس گیا کہ آپ یہاں مستقل رہیں۔کھانا اور ناشتہ میں خاموشی سے تمہیں پہنچایا کروں گا۔منادی نے شکر کیا کہ پیٹ کا دھندا ہی اسے اس شہر میں لایا تھا۔اس کا تو مداوا ہو گیا۔بہرحال پادری کا کام بھی ہو گیا اور منادی کا بھی۔

قادیان کے زمانے کی ہی بات ہے کہ ضلع لاہور کے کسی گاؤں میں جہاں سکھ اور مومن رہتے تھے سکھوں نے ندا نماز دینے سے جبر سے مومنوں کو روک دیا۔غالباً مومنوں کی آبادی کم تھی یا وہ کمزور اور سکھ طاقتور تھے۔حضرت صاحب کو جب علم ہوا تو حضور بے حد مضطرب ہوئے کہ اللہ کا نام اس گاؤں میں سکھوں نے بند کرا دیا ہے۔

چنانچہ محترم جناب گیانی واحد حسین صاحب کو بھیجا کہ کسی طرح ندا کو جاری کراؤ اور انہیں فرمایا کہ میں سخت پریشان ہوں کہ وہاں سے اللہ کا نام بلند نہیں ہو رہا۔گیانی صاحب بھی بڑے بزرگ مربی اور اور یجنل تھنکر Original Thinker تھے۔گاؤں میں گئے کسی مومن سے نہ ملے اور سیدھے اس گاؤں کی بیت الذکر کے چھت پر چڑھ کر گورمکھی زبان میں ترجمہ کر کے ندا دینی شروع کی۔سکھوں نے

جب وہ خوبصورت اور دل نشین آواز سنی تو جوق در جوق اس بیت الذکر کی طرف آئے اور محترم گیانی صاحب کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کی بے حد قدردانی عزت افزائی کی اور کہا کہ آپ ہمارے مہمان ہیں۔ آپ نے آج نہایت عمدہ پیغام بلند آواز میں دیا ہے۔ گیانی صاحب نے کہا کہ یہ وہی ندا ہے جو مومن دیتے تھے آخر اس میں آپ کو کیا اعتراض ہے۔ انہوں نے کہا یہ توحید ہی کا تو سبق ہے۔ اس میں ہمیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ پھر گیانی صاحب نے انہیں بابا گورو نانک جی کے شبد بھی سنائے کہ وہ تو مکہ شریف بھی تشریف لے گئے تھے اور ندا اور نماز کے متعلق ان کی یہ تعلیم تھی وغیرہ۔ ان کا انداز ایسا دلربا ہوتا تھا کہ سارے شکوک رفع ہو گئے اور انہوں نے کہا اگر یہ ندا ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ انہیں سمجھا کر ندا مومن سے دلا کر حضور کی خدمت میں رپورٹ پیش کی۔ حضور بے حد خوش ہوئے۔

1947ء میں برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی۔ اوّل رتن باغ لاہور اور پھر حضرت صاحب ربوہ میں آئے ابتدائی سالوں کی بات ہے جلسہ سالانہ کے موقع پر کوئی عمارتیں تو بنی ہی نہیں تھیں۔ سردی کا موسم تھا تو حضور کے حکم پر چھوٹے چھوٹے سائز کی گھاس پھونس کی جھونپڑیاں بنائی گئی تھیں۔ انہیں میں سبھی حاضرین کا قیام وطعام کا انتظام ہوتا تھا۔ وہ جھونپڑیاں شمار سے بیرون تھیں۔ حضور کا ارشاد ہوا کہ ہر نماز کے وقت ہر ایک جھونپڑی میں ہر آدمی ندا دے اور ہزار ہا آدمیوں کی اذانیں اور توحید و رسالت کے اعلان سے فضا گونج اُٹھے۔ چنانچہ وہ نظارہ بھی نہیں بھولتا کہ وہ سارا عارضی شہر کا شہر پانچ وقت اذانوں سے گونج رہا ہوتا تھا۔ یہ کیا تھا یہ اس عاشق رسول کے عشق ندا کے مظاہرے ہی تو تھے۔ اب تو میں سوچتا ہوں کہ شاید حضور کو ہاتف غیبی نے یہ خبر دی ہو کہ ایک وقت آنے والا ہے کہ اس مظلوم جماعت پر قدغن لگا دی جائے گی اور اذان کی برکات سے محروم ہو جائے گی۔ یہ میرا قیاس تقویت پاتا ہے جب یاد کرتا ہوں کہ سیّدی حضرت حافظ میرزا ناصر احمد صاحب نے زندگی کے آخری سالوں میں ہر نماز کے بعد لا الہ الا اللہ نہایت سوز بھری آواز کے ساتھ پڑھنا شروع کیا تھا اور ہم بھی ساتھ دہرایا کرتے تھے۔

دوستو اس مالک سے ڈرتے ڈرتے دن بھی بسر کرو اور راتیں بھی کہ وہ راضی تو سب خیر ہے ورنہ انسان تو بے حقیقت ہے۔ مامور زمان فرما گیا ہے کہ ہیچوں خاکم بلکہ زاں ہم کمترے۔ اور ہاں دیکھنا کہ ایسے اللہ کے کسی بندے کو نہ چھیڑ بیٹھنا اور نہ تنگ کرنا جس کے متعلق وہ قادر خدا خود فرماتا ہے۔ کہتا ہے ؎

یہ تو بندہ عالی جناب ہے
مجھ سے لڑو اگر تمہیں لڑنے کی تاب ہے

پھر حضرت مصلح موعود بیمار پڑ گئے۔ 1953ء کا سال آیا دسمبر کے آخری دنوں میں حسب معمول جلسہ سالانہ تھا کہ حضور نے وہ معرکۃ الآراء تقریر فرمائی جس کا مزہ 28ر دسمبر 1953ء کی شام جن خوش بختوں نے چکھا وہ کب بھول سکتے ہیں۔ سیر روحانی کے تسلسل میں

حضور کا علمی مضمون تھا۔ جس کی ریکارڈنگ تو میرے پاس محفوظ ہے۔ بے شمار دفعہ سن چکا ہوں جب کبھی دل کی لگی کو آنسوؤں کی برسات سے بجھانے کی ضرورت پڑتی ہے تو پھر سنتا ہوں اور آنسوؤں کی جھڑی بھی ایسی کہ گویا ساون آنکھوں میں آ کر ٹھہر گیا ہے۔

روحانی اور آسمانی مضمون کی شیرینی دلآویزی اور اس مہ رخ کے اب نظر نہ آنے کی محرومی اور حسرت کہ جس کے ہم عاشق تھے اور نہ معلوم ان اشکوں کا موجب کیا کیا ہوتا ہے میں اس کی وضاحت کرنے سے قاصر ہوں۔ بقول پیر فضل شاہ گجراتی ؎

ہویا کہ جے تیرے نے نین کھیوے
اکھاں میریاں دی گٹ رھندیاں نے
میرے کول سوھے سوھے اتھروں نے
جے تو رکھنا ایں سرخ شراب ساقی

وہ مضمون جس کو حضور نے بہت طویل بیان فرمایا۔ البتہ گزشتہ بادشاہوں کے نوبت خانوں کا ذکر فرماتے ہوئے حضور نے یہ بھی بیان کیا کہ نوبت خانوں سے بادشاہ ایک کام یہ بھی لیا کرتے تھے کہ بعض تقریبات جن میں بادشاہ سلامت خود دیدار کراتے تو نوبت بجتی تھی مگر یہ نوبت کبھی سال بعد کبھی اس سے بھی زیادہ مدت یا کم مدت کے بعد۔ مگر ضروری نہیں ہوتا تھا کہ بادشاہ کا سارے لوگ دیدار کر بھی سکیں۔ کچھ لوگ حاضر ہوتے، کچھ بے چارے دور سے ہی بادشاہ کی سواری دیکھ کر یا سواریوں کا دھول دھپا کھا کر واپس لوٹ آتے اور پھر ان بادشاہوں کا کوئی مقابلہ زمین و آسمان کے خالق اور مالک سے کیا تھا وہ تو کوئی 100 گاؤں کا کوئی 200 گاؤں کا یا کوئی ایک ملک کا مالک ہوتا کوئی اس ایک سے زیادہ ملکوں کا مالک ہوتا مگر یہ تو ''اکبر'' ہے سب سے بڑا۔ قرون اولیٰ میں قیصر و کسریٰ بڑے حکمران تھے اور اب امریکہ ''سپر پاور'' مگر کیا مجال جو اس اعلیٰ و اکبر کے سامنے آنکھ اُٹھا کر دیکھ بھی سکیں اور وہاں نوبت بجتی تھی کہ ٹم ٹم ٹوں ٹوں کہ مطلب ہے بادشاہ کے دیدار کے لئے آ جاؤ۔ حضور فرماتے ہیں کہ بھلا ٹم ٹم ٹوں ٹوں سے بادشاہ کے دیدار کا کیا تعلق؟

لیکن ہمارا بادشاہ وہ بادشاہ ہے جس کے سامنے بڑے سے بڑے بادشاہ کو آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی بھی سکت نہیں اور وہ سال میں یا دو سال میں ایک بار نہیں اور یہ بھی نہیں کہ اس بادشاہ کا دیدار کرنے کے لئے سینکڑوں یا ہزاروں میلوں کا سفر کر کے جانا پڑے۔ بلکہ ہر شہر کے ہر محلہ میں ہر گاؤں میں دن میں پانچ مرتبہ آ جاتا ہے اور ٹم ٹم ٹوں ٹوں سے نہیں بلاتا بلکہ بلانے والا مؤذن بادشاہ کی شان بھی بیان کرتا ہے اور بادشاہ کے پاس آنے سے جو فیوض روحانی اور جسمانی حاصل ہوں گے وہ بھی بیان کرتا ہے اور پھر حضور نے نہایت نغمگی کے ساتھ اور سوز کے ساتھ اذان کے الفاظ سارے دہرائے اور مطالب بیان کئے۔ میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ جس اچھوتے اور دلنواز اور ایمان افروز انداز میں حضرت مصلح موعود نے اذان کے الفاظ کی فلاسفی اور مطالب بیان کئے صفحہ دنیا پر اس

وقت کوئی شخص نہیں جو حضور کے بیان فرمودہ معارف کی گرد کو بھی پہنچ سکے۔ یہ نوبت خانوں کا روحانی پیرائے میں ذکر بھی اذان نماز کے ساتھ حضرت مصلح موعود کے عشق کی ایک قوی اور معتبر شہادت ہے۔ پھر حضور نے نہایت ہی فکر انگیز ایمان افروز اور دلکش انداز میں آسمانی نوبت کا ذکر بھی کیا۔ اس میں یہ بھی مذکور تھا کہ کس طرح 1400 سال قبل مشرق میں حکمران کسریٰ اور مغرب میں قیصر کی زبردست حکومتیں اس بظاہر نا قابل اعتنا نہایت غریبانہ نوبت خانوں میں اللہ اکبر اللہ اکبر پکارنے والوں کی زد میں آئیں اور وہ نوبتی خود بھی بہت غریب اور بے نوا تھے۔ نہ تن ڈھانکنے کو انہیں کپڑے میسر تھے اور نہ ہی اور دنیا کی کوئی سہولت میسر اور نوبت خانہ جس میں وہ اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ وہ بھی ایسا کہ نہ چھت نہ فرش کھجور کی ٹہنیوں سے اس کا سرا ڈھانکا ہوا تھا۔ بارش ہوتی تھی تو اس میں عبادت کرنے والوں کے کیچڑ میں پاؤں دھنس جاتے تھے اور ماتھے مٹی آلود ہو جاتے تھے۔ عبادت کے بعد کوئی خشک گوشہ اگر نظر آتا تو بہتر ورنہ اس بارش میں ٹپکتی چھت کے نیچے بیٹھ کر کامل یقین اور پختہ ایمان سے سرگوشیاں کرتے تھے کہ جیسا ہمارا محبوب اور مطاع ﷺ نے اللہ سے خبر پا کر ہمیں بتایا ہوا ہے۔ انشاء اللہ ہم مشرق پر بھی قابض ہو جائیں گے اور مغرب پر بھی اور شمال میں بھی ہمارے خدائے واحد کی سلطنت ہو گی اور جنوب میں بھی اور پھر سیّدنا حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں وہی بظاہر غرباء اور یہ باطنی بادشاہ کہ انہیں خدائے قادر پر کامل یقین تھا۔ فتح یاب بھی ہو جاتے ہیں اور حضور کی وفات کے نو سال کے اندر ہی ساری معلومہ دنیا پر حکمران ہو جاتے ہیں۔

پھر حضور نے اپنی جماعت کو مخاطب کر کے بڑے زوردار اور بارعب پاٹ دار آواز میں ان کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے انہیں اس نوبت خانے کی تولیت کی ذمہ داری سپرد فرماتے ہوئے انہیں آسمانی بادشاہت کے موسیقارو کے موقر اور معزز خطاب سے نوازا۔ کاش کہ میں اس تقریر کا آخری حصہ یہاں من وعن درج کرنے کی توفیق پاتا مگر میری کمزوری اور بے بسی کا بُرا ہو۔ میں قارئین کرام کو اس خط میں شامل کرنے سے بوجوہ قاصر ہوں۔ جو ابھی میں سن کر محظوظ ہوا ہوں۔

آخر میں 28 دسمبر 1953ء کی عشاء کے وقت کا حوالہ پھر دیتا ہوں۔ جنہوں نے وہ سعید ساعتیں میرے سید و مرشد کے جلو میں گزاریں وہ ہی کچھ ان کی کیفیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں مجھ میں بلکہ کسی اور میں بھی یہ طاقت نہیں کہ اس روحانی کیفیت اور رفع کا احوال بیان کر سکے۔ جو اس شام ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمارا مطاع بھی زمین پر نہیں ہے کہیں آسمان کی بلندیوں میں محو پرواز ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ میرا خدا شاہد ہے کہ میں اس وقت حضور کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ ایسا معرفت کا پُر کیف ریلا آیا کہ جس نے ہماری خطاؤں اور معاصی کے ساتھ ہی ہمیں بھی کسی اور عالم میں پہنچا دیا۔ عالم تصور میں میں یہ سطور لکھتے ہوئے اس غیر معمولی جذب اور کیف کی حالت کو دیکھ رہا ہوں اور اپنی حالت کا اندازہ لگا رہا ہوں کہ اس وقت میں کہاں اور کس حالت میں تھا۔ بزبان حال ہم یہ عاجزانہ صدا لگا رہے

تھے۔ ؎

ہم فقیروں پہ لطف شاہانہ
بخت آور لگی ہے فال ہمیں
ہم ثریا سے ہو کر آجائیں
جب بھی تھوڑا سا دیں اچھال ہمیں

آخر 1965ء میں وہ دین حق کا فدائی اذان کا عاشق صادق اس لئے کہ اس میں اس کے خالق و مالک کی کبریائی کا ذکر بھی تھا اور اس کے محبوب عربی کے بلند و بالا درجات کا بھی نشان ملتا تھا جس کے بارہ میں آپ فرماتے تھے کہ ؎

مجھے اس بات پر ہے فخر محمودؔ
میرا معشوقؐ محبوب خدا ہے

ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور اپنے رب کریم کے قدموں میں جا بیٹھا اور ہم مجبور ہاتھ ملتے ہی رہ گئے۔ بے ادبی یا گستاخی نہ ہو تو میں آپ کی پاک روح کو یوں مخاطب ہونے کی جرأت کرتا ہوں۔ ؎

مرے آقا مری اک عرض سن لو
نہیں رکتی ہے منہ پر بات آئی
یہ بدلہ تھا کیا مہر و وفا کا
کہ اتنی ہو گئی بے اعتنائی
وہ صورت دیکھتے تھے جس کو ہر روز
کچھ ایسی آپ نے ہم سے چھپائی
کہ آنا خواب تک میں بھی قسم ہے
نہ تھی گویا کبھی بھی آشنائی
کہیں ہم کس سے یہ درد نہانی
بجز ترے مسیح قادیانی

(روزنامہ الفضل ربوہ مورخہ 6رمئی 2006ء صفحہ 7تا8)



آہ! الحاج حضرت مرزا عبدالحق صاحب نے بھی مٹی اوڑھ لی

گر سو برس رہا ہے
آخر کو پھر جدا ہے

لاریب یہ حقیقت ہے کہ موت زندگی سے بھی زیادہ یقینی ہے مگر یہ حقیقت اتنی تلخ ہے کہ اس کو تسلیم کرنا کوئی آسان بات نہیں بلکہ جب دنیا سے کوئی پیارا وجود اُٹھ جاتا ہے تو وہ پیچھے رہ جانے والوں کی زندگی کا ایک حصہ بھی ساتھ لے جاتا ہے اور یوں ایک طرف قبروں کے گڑھے بھرے جارہے ہیں تو دوسری طرف پسماندگان کے دلوں میں بھی ایسے گڑھے پڑ جاتے ہیں جس کا علاج نہ کسی ماہر ڈاکٹر کے پاس ہے نہ حالیہ دور کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ان کا کوئی مداوا کر پاتی ہے۔

عنوان میں حضرت اقدس مسیح موعود کے دو مصرعے جو تحریر کئے ہیں اگر غور سے اور سوچ اور سمجھ کے ساتھ انہیں پڑھیں تو ایک طور تسلی عطا ہوتا ہے۔ حضرت صاحب نے سو برس کی عمر کو طویل عمر کی علامت کے طور پر بیان فرمایا ہے اور اس میں کیا شک ہے کہ یہ کافی بڑی عمر ہے۔ حضور اقدس کے خاندان میں سے میرے علم کے مطابق حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب اور حضرت صاحبزادہ مرزا مظفر احمد صاحب اور حضرت مرزا مبارک احمد صاحب نے 90 برس کے لگ بھگ عمریں پائیں۔ یہ تینوں صاحبزادگان اس عاجز راقم پر بطور خاص نگہ لطف وکرم رکھتے تھے اور میں بڑے لمبے عرصے تک ان میں سے ہر ایک کے فیضان محبت کا مورد رہا اور ان کی رحلت سے یہی جانا کہ اتنی جلدی یہ کرم فرما ہاتھ چھڑا گئے ہیں اور ان کی وفات کے صدمات کی چوٹ ایسی میرے قلب وروح پر پڑی کہ کئی سال گزر جانے کے باوجود اس کی کسک کم ہونے میں نہیں آتی کیونکہ یہ سبھی حضرات ایسے سایہ دار اور پھلدار درخت کی مانند تھے جو ٹھنڈی چھاؤں بھی دیتے تھے اور میٹھے پھل بھی۔ پھر گزشتہ قریباً 40 سالوں میں تین تو خلفائے کرام دنیا سے رخصت ہوئے جن میں سے ہر ایک لاکھوں بلکہ کروڑوں کی محبت اور عشق ووفا کے مرکز اور مصدر تھے۔ اس عاجز راقم نے تینوں کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت پائی اور ان ہر سہ مقربان الٰہی کی طرف سے بغیر میری کسی خوبی کے ہمیشہ مورد الطاف خسروانہ رہا دیگر احباء اور عزیزوں اور باوفا دوستوں کا شمار نہیں جو واصل الی اللہ ہوئے۔

اب اس کہنگئی عمر میں حضرت مرزا عبدالحق صاحب کی وفات کے صدمے نے ایک کاری ضرب دل وجان پر لگائی ہے زندگی اتنا کڑا

امتحان بھی لے گی کبھی سوچا نہ تھا۔ ؎

کچھ تو نازک مزاج ہیں ہم بھی
اور یہ چوٹ بھی نئی ہے ابھی

میں کئی دنوں سے حضرت مرزا صاحب موصوف کے بارہ میں کچھ لکھنا چاہ رہا تھا مگر جب بھی میں نے ایسے بزرگوں کے بارہ میں لکھنے کی جسارت کی جن میں بعض کا ذکر اوپر کر آیا ہوں تو میں نے اسے بے حد مشکل بلکہ دل فگار فرض جانا کہ کبھی صدمے کی چوٹ کے نتیجے میں دماغ و ذہن کی قوتیں جنہیں بصد مشکل اکٹھا کرتا ہوں اسے جیسے کوئی اچک کر لے جاتا ہے کبھی ان وجودوں کی عظمت اور قرب الٰہی کسی اور دنیا میں لے جاتی اور میں قلم اور قرطاس کو بھول ہی جاتا۔ کبھی محرومیاں اور اداسیاں دل و دماغ کو بہکا کر ایک اور عالم میں بھگا لے جاتیں اور میرا قلم جو پہلے ہی لولا لنگڑا سا تھا گویا ٹوٹ ہی جاتا۔ اس بیخ و بن میں کئی دن سخت ذہنی اذیت میں رہتا اور پھر سنبھل کر کچھ ٹیڑھے میڑھے الفاظ سپرد قرطاس کرتا لیکن میری یہ کربناک کیفیت بھی فضل الٰہی کو جذب کرنے کا ذریعہ ٹھہری۔ میں نے برادر معظم چوہدری عزیز احمد صاحب باجوہ سیشن جج کے بارہ میں الفضل کی نوازش سے ایک نوٹ شائع کیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کا دور تھا مجھے قادیان کے جلسہ کے موقع پر برادر مکرم مولانا نصیر احمد صاحب قمر ایڈیٹر انٹرنیشنل الفضل نے بتایا کہ حضرت صاحب نے مجھے ارشاد فرمایا کہ وہ ''نون'' والا مضمون لاؤ جو باجوہ صاحب کے بارہ میں چھپا ہے۔ پھر چند روز بعد دوبارہ اور پھر سہ بارہ یہی ارشاد ہوا اس پر جناب مولانا قمر صاحب نے مجھے مبارک باد دی جزاھم اللہ خیرا۔

پھر کچھ دنوں بعد عزیزی چودھری کنور ادریس صاحب نے کراچی سے مجھے لکھا کہ حضور انور نے میرے ابّا جان کے بارہ میں تمہارا مضمون بہت پسند کیا ہے اور پھر حضرت صاحب نے از راہ بندہ نوازی ایک طویل خط کے ذریعہ میری کاوش کو سراہا۔ اس خط کی فوٹو کاپی محترمی جناب ایڈیٹر صاحب الفضل برادرم عزیزم مولانا عبدالسمیع خان صاحب کے اصرار پر ان کو دی تھی۔ شکر خدائے لم یزل کہ اس حوصلہ افزائی سے راقم کو کوئی غلط فہمی نہ ہوئی یہاں اس کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ اگر تعزیتی مضمون لکھنے سے قلبی اذیت پاتا ہوں تو حضرت باجوہ صاحب کے متعلق لکھے گئے مضمون نے دربار خلافت میں رسائی بھی تو حاصل کر لی۔ الحمد للہ ولا فخری۔ بہر حال یہ میرے لئے دربار خلافت کا ایوارڈ بہت ہے۔ ؎

چلو اچھا ہوا کام آ گئی دیوانگی اپنی
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

بڑی شبھ گھڑی تھی جب سرگودھا میں مستقل طور پر آ کر پیشہ وکالت اختیار کرنے سے قریباً 4 سال قبل مجھے حضرت مرزا عبدالحق

صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ باوجود اپنی کم علمی اور کوتاہ فکری کے اسی پہلی ملاقات میں ہی میں بھانپ گیا تھا کہ یہ شخص مقربان الٰہی میں سے ہے اور صالحین کی جماعت میں سے ہے اور صاحب کشش وجذب بزرگ ہے اور میں نے دیکھا کہ ؎

بس ایک ہی دھن ہے کہ کریں خود کو تصدق
راضی ہو کسی طرح سے محبوب ہمارا

پھر تو ملاقاتیں کسی نہ کسی بہانے زیادہ ہونے لگیں۔ بالآخر 1954ء میں جب میں نے وکالت شروع کی تو حضرت ممدوح کو قانون کے محاذ پر ڈٹ کر پُراثر بحث کرتے دیکھ کر انہیں ہی اپنا استاد بنانا چاہا جسے موصوف نے خوشی سے قبول فرمایا اس طرح مجھے آپ کے تلمیذ ہونے کا اعزاز خصوصی بھی عطا ہوا۔ پیر فضل شاہ گجراتی کے الفاظ میں دُعا مانگی۔ ؎

ربا لنگ رکھیں میرا در نیواں
اٹھاں والیاں نال پیار لائے
میں چیری ہوئی چادر اپنی نوں
بناں ویکھیاں پیر پسار دتا

جناب استاذی المحترم مرزا صاحب کی صحبت صالح کے پہلے 40 سال تو زریں انمول اور بیشمار مواقع ملے آپ کی قیادت میں ہر دوسرے ہفتے ضلعی جماعتوں کے دورہ پر خاکسار کے علاوہ برادرم مکرم حافظ ڈاکٹر مسعود احمد صاحب اور برادرم قریشی محمود الحسن صاحب (اللہ ان کی صحت وعمر میں بہت برکت دے) اور برادرم مکرم شیخ محمد اقبال صاحب پراچہ بھی ہمرکاب ہوتے تھے اور ہم سب کو یہ بھی فخر کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ہم چاروں کو مرزا صاحب کی فیملی کہا کرتے تھے۔ اوّل تو موٹر کار نہیں ہوتی تھی تو بھائی اقبال پراچہ صاحب جو ایثار وفا کے پتلے تھے اپنی کوئی نئی بس ہی نکلواتے اور ہم پانچ کس اس بس میں سوار ہو کر کچے راستوں پر دھول دھپے کی پرواہ کئے بغیر عشق احمدیت اور اطاعت امیر میں مست وسرشار رہتے پھر میں نے ایک کار خریدی تو اسی نے چند سال ناقہ کا کام دیا اور پھر پیارے بھائی حافظ ڈاکٹر مسعود احمد صاحب کے استعمال کے لئے ان کے عزیز بھائی ودود احمد صاحب نئی بریڈ فورڈ کار لندن سے لائے تو مستقل طور پر نئی سواری میسر آئی اور اس میں سفر بے حد آرام دہ ہو گیا۔

ہم لوگ جس جماعت میں جاتے وہاں اگر کوئی اجتماعی مسئلہ ہوتا یا تربیت کے لحاظ سے کسی دیہی جماعت کی کوئی چول ڈھیلی نظر آتی تو حضرت امیر صاحب ہمیشہ خطاب فرمایا کرتے تھے اور وہ شخص خود قول سے بڑھ کر عمل کا نہ صرف قائل تھا بلکہ عملی زندگی میں اعمال صالحہ کا بہترین نمونہ تھا۔ ایسے شخص کی بات دل سے نکلتی اور سیدھی دل پر اُترتی جاتی تھی۔ برخلاف دنیاوی واعظین مقامی جماعت کے

دوستوں کی بہترین تربیت کے مواقع تو ہوتے ہی تھے ہم لوگوں کو بھی اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکنے اور اپنی اپنی اصلاح کرنے کے لئے نہایت عمدہ موعظت نصیب ہوتی اور جب حضرت امیر صاحب حضرت مصلح موعودؓ کا ذکر کرتے اور اکثر اپنی تقاریر بلکہ گفتگو میں بھی حضور کے اقوال زریں کا حوالہ دیا کرتے تھے تو اس وقت آپ کی حالت دیدنی ہوتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخص اپنے آقا کی مجلس خاص میں حاضر ہے اور آقا کی نگاہیں انہی پر جمی ہوئی ہیں اور یہ اس کیف کے مزے لے رہا ہے اور طرہ یہ کہ ہم کو بھی اس حظ روحانی میں شریک کرنے کی سعی فرمارہے ہیں۔ میں اس حصہ بیان کی کیفیت اور ماہیت بیان کرنے سے یکسر قاصر ہوں۔ اب میرے محترم بھائی قریشی محمود الحسن صاحب گو بیماری کی وجہ سے ان کی یادداشت بھی کمزور ہوگئی ہے مگر وہ ایسے مناظر کیونکر بھول سکتے ہیں میری کچھ تائید اور مدد کر سکتے ہیں۔

وہ روح پرور لمحے میرا وجدان گواہی دیتا ہے کہ وہ میرے حافظے کے گلدان میں آج بھی تازہ ہیں اور تفاصیل یاد نہ بھی ہوں تو تحت الشعور میں ان خوشگوار یادوں کی مہک محسوس کرتا ہوں۔ ہم سب کے لئے یہ نہایت عمدہ درسگاہ ہوتی تھی جس میں قرآن کریم کی آیات کی تلاوت بھی ہوتی تھی۔ حدیث شریف کے حوالے بھی اور حضرت مسیح پاک کی نثر کے مفہوم اور اشعار اردو میں بھی، فارسی میں بھی بڑے دلنشین انداز میں سناتے تھے۔ آپ گو حافظ قرآن نہیں تھے مگر قرآن کریم کے ساتھ عشق و محبت کے نتیجے میں آپ کو بہت سے حصے قرآن مجید کے یاد تھے اور تقریر کرتے ہوئے تو فرفر قرآن کریم کے حوالے ایسے انداز میں دیتے تھے کہ سننے والا جانتا کہ یہ حافظ قرآن مجید ہیں۔

قرآن مجید سے عشق:

اوپر میں نے آپ کے عشق قرآن کا ذکر کیا ہے یہ کوئی میری خالی خوش عقیدتی نہیں ہے نہ مبالغہ کا بیان بلکہ یہ اس شخص کا ذکر کر رہا ہوں جس نے عین عالم شباب میں روزانہ 4 گھنٹے مسلسل دس سال تک قرآن کریم کے معانی ومفہوم کے سمجھنے میں صرف کئے اور فرمایا کرتے تھے اس میں کوئی ناغہ نہیں ہوا اور ایک اوپری لے میں حضرت مسیح موعود اپنے آقا کا فارسی کا یہ شعر پڑھتے کہ ؎

من ندارم مایہ کردار ہا
عشق جوشید و ازو شد کارہا

(ترجمہ) حضور فرماتے ہیں کہ میں کردار کی پونجی نہیں رکھتا بس اندرونی عشق نے جوش مارا اور اس سے سارے کام ہوگئے۔

آپ کا فارسی کا شعر پڑھنے سے یاد آیا ایک اپنے آقا و مرشد کا یہ شعر بھی آپ کو بے حد عزیز تھا۔ ؎

دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی

دیوانہ تو ہر دو جہاں را چہ کند

(ترجمہ) تو دیوانہ بنا کر ہر دو جہاں بخش دیتا ہے مگر مولا تیرا دیوانہ دو جہانوں کو کیا کرے گا اسے تو تو مطلوب ہے۔

قرآن کریم کا ساری عمر درس جاری رہا کہ تدریس قرآن میں ان کی صحت کا بھی راز پوشیدہ تھا۔قرآن کریم کے نوٹس حضرت مسیح پاک کی تفاسیر سے اور حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے درس اور پھر خود حاضر ہو کر کمال مداومت کے ساتھ حضرت مصلح موعود کے درس قرآن اور تفسیر سے پوری طرح استفادہ کیا اور پھر اس نعمت کو تقسیم کرنے اور ان خزائن کو بانٹنے میں ساری متاع جان صرف کر دی کمال یہ تھا کہ سامعین کے فہم وادراک کی سطح پر اُتر کر سمجھاتے تھے۔ مجھے چار خلفاء عظام کی اقتداء میں نمازیں پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ان کی تو بات ہی الگ ہے وہ تو خدا تعالیٰ کی چنیدہ اور منتخب ہستیاں ہوتی ہیں۔ میں اپنے جان و دل کو گواہ رکھ کر یہ عرض کرتا ہوں خلفائے کرام کے بعد جو لذت اور سرور حضرت مرزا عبدالحق صاحب کی اقتدا میں نماز ادا کرنے میں نصیب ہوتا تھا وہ کہیں اور نہ ملا۔تلاوت کرنے کا آپ کا انداز منفرد تھا اس میں جذب بھی تھا کشش بھی۔ترتیل بھی تھی مگر اس میں ہرگز تصنع یا بناوٹ کا شائبہ نہیں ہوتا تھا۔مقتدی اور سامعین بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق لطف اندوز ہوتے تھے یہاں اپنے موضوع سے بھٹک جانے کا الزام لینے کو تیار ہوں مگر برادرم حافظ ڈاکٹر مسعود احمد صاحب کی تلاوت کے انوکھے طریق اور دلربا انداز کا ذکر نہ کروں تو ناشکرے پن کا مجرم ہوں گا۔وہ شیرینی وہ حلاوت اور وہ مستی خود حافظ صاحب میں اور پھر سامعین اور مقتدیوں میں بھی منتقل ہوتی دیکھی کہ کہیں اور باید وشاید۔اے کاش پھر ربوہ میں جلسہ سالانہ کا سٹیج ہو اور پھر حضرت خلیفہ وقت کے پاس کھڑے ہو کر میرے پیارے بھائی حافظ ڈاکٹر صاحب تلاوت کر رہے ہوں اور یہ عاجز وہیں قدموں میں بیٹھا سُن رہا ہو اور لاکھوں سامعین مسحور ہو جائیں۔ ؎

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

کاش سورہ مومن کے پہلے رکوع کی حافظ صاحب کی تلاوت جو انہوں نے 1983ء کے جلسہ پر کی تھی ایک بار پھر میری سماعتوں کو نصیب ہو۔اے کاش!

ایک اور واقعہ قرأت قرآن کریم کا شاید اسے بھی برمحل نہ سمجھا جائے مگر دیوانے کا کیا ہوتا ہے اس نے تو ہر حال میں اپنی قلبی واردات کا ذکر کرنا ہوتا ہے۔ 1983ء کی ایک شام میرے غیر از جماعت دوست دوائی لینے کے لئے مجھے ربوہ ہمراہ لے گئے۔ نام ان کا سردار جاوید اختر خان بلوچ ایڈووکیٹ۔ جب واپس آنے لگے تو مغرب کی نماز حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کی اقتداء میں پڑھنے کے لئے میں بیت مبارک میں چلا گیا جن لوگوں نے حضور کی اقتدا میں نمازیں پڑھی ہیں وہ جانتے ہیں کہ نمازوں میں گویا اپنے خالق و مالک کے حضور حاضر ہو کر اس کا کلام پڑھ رہے ہوتے اور ایک نرالا لحن اور سوز تلاوت آیات قرآنی کا ہوتا تھا۔میرا یقین میرے مشاہدے پر مبنی تھا کہ

میرے دوست جاوید اختر خان نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی کہیں بھی۔ میں نے نماز ختم ہونے پر سلام پھیرا تو کیا دیکھتا ہوں جاوید اختر صاحب میری پچھلی صف میں بیٹھے ہیں جب فارغ ہو کر بیت کے گیٹ پر آئے جہاں موٹر کھڑی تھی تو میں نے پوچھا کہ خان صاحب آپ کب اور کیونکر نماز میں شامل ہوئے تو انہوں نے کہا کہ نہ میرا وضو تھا نہ نماز میں شامل ہونے کا کوئی ارادہ۔ جب مرزا صاحب کی قرأت میں نے سنی تو کسی غیبی طاقت نے مجھے اُٹھا کر بیت میں کھڑا کر دیا اور میں قرأت سن کر مست ہو گیا اور پھر وہ دہراتے رہے کہ ایسی دل میں گھر کر جانے والی قرأت پہلے کبھی نہیں سُنی۔ اصل میں پڑھنے والے کا قرآن کے ساتھ تعلق خاطر اس کے لحن کو سنوارتا اور نغمگی اور جذب و کیف کو اُبھارتا ہے اور یہ صفات حضرت مرزا صاحب کی قرأت میں بھی موجود تھیں۔

کتب حضرت مسیح موعود کا بالاستیعاب مطالعہ

فرمایا کرتے تھے کہ اُردو فارسی یا عربی کا کوئی لفظ حضور انور کے قلم سے نہیں نکلا جسے میں نے پڑھا نہ ہو اور عربی کے حضور کے کلام نثر اور نظم کو لغات عربی سے حل کیا بلکہ ترجمہ کیا جو خود خلفائے کرام نے پسند فرمایا۔ آپ کی متعدد تصانیف مطالعہ کیں۔ ایک کتاب غالباً صداقت حضرت مسیح موعود 1956ء یا 1958ء میں مجھے دی جب میں لندن جا رہا تھا (دونوں سال گیا تھا اس لئے صحیح سال یاد نہیں) کہ محترم ڈاکٹر پروفیسر عبدالسلام صاحب کی خدمت میں پیش کروں۔ جو انہوں نے بڑی عقیدت، کمال ادب اور ساتھ ہی میرے شکریے سے وصول فرمائی۔ میں نے تو فضائی سفر کے دوران ہی ساری پڑھ لی تھی اور آپ کی تالیف ''روح العرفان'' ایک ایسا روحانی مائدہ ہے کہ کئی بار پڑھ چکا ہوں چونکہ حضرت مسیح موعود کی تصانیف کے اقتباسات ہیں عجیب لطف دیتے ہیں عربی عبارات کے ترجمے بھی ساتھ ہیں۔ سوچتا ہوں کہ اس شخص کو اللہ تعالیٰ نے کتنے اوقات عطا فرمائے تھے اور ان اوقات کا کس قدر بابرکت اور صحیح استعمال کیا کہ قرآن کریم اور حدیث شریف اور کتب حضرت مسیح موعود کا رو بخدا شخص ''عاشق صادق'' اور ''حافظ'' بھی ہو گیا اور جو محنت کر گئے ہیں وہ احمدیت کی کئی نسلوں کو کام دے گی۔

وقت کی پابندی

انسان حیران ہو جاتا ہے جب آپ کے وسعت مطالعہ قرآن کریم حل لغات عربی اور مطالعہ ساری کتب و اشتہارات حضرت مسیح موعود کا خیال کرتا ہے مگر یہ وہ شخص تھا جو وقت کی قدر و قیمت کو جانتا اور پہچانتا تھا تبھی تو اس کے اوقات میں برکت پڑی ورنہ یہاں تو وقت کا ضیاع ایک فیشن کی صورت اختیار کر چکا ہے جتنا بڑا دنیا کے لحاظ سے شخص ہوتا ہے اتنے ہی گھنٹے دیر سے وقت مقررہ سے پہنچ کر اپنی اہمیت جتلاتا ہے۔

مثلاً وقت مقررہ سے ایک گھنٹے کی تاخیر کو تو اب ہماری قوم تاخیر کہنا بھی بھول چکی ہے لیکن ایسے لوگ کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے۔

حقیقت میں بڑے لوگ وہی ہیں جو وقت کی قدر کرتے ہیں اور حضرت مرزا صاحب اس میدان میں بھی ایک منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کی زندگی کا سارا نظام گھڑی کی سوئیوں کی پابندی کرتا تھا۔ جہاں جانا ہو تقریب کوئی ہو حتٰی کہ ٹینس کھیلنے جایا کرتے تھے تو عین مقررہ وقت پر کلب میں پہنچ جاتے۔ راستے میں چودھری قائم الدین صاحب قائم مقام ڈی سی کی کوٹھی پڑتی تھی۔ ان کے بیٹے کہتے تھے ہم اپنی گھڑیاں آپ کے مقررہ وقت سے ملا لیا کرتے تھے۔ ہم جب دوروں پر جاتے تو کیا مجال جو کوئی بھی حتیٰ کہ پراچہ صاحب محترم بھی ایک منٹ کی بھی تاخیر کریں۔ ایک دفعہ مغرب کی نماز کے وقت کوٹ مومن جانا تھا میری اور میری کار کی ڈیوٹی تھی۔ ہمارے ساتھیوں نے ایک ''سازش'' کی سبھی چائے کے عادی تھے (سوائے جناب محترم حافظ صاحب کے کہ وہ مخالفین چائے میں سے تھے) کہ جانے سے پہلے میرے گھر پر پئیں گے اور وہاں سے اکٹھے کوٹ مومن کے لئے روانہ ہوں گے۔

ہم جب اکٹھے ہو چکے اور چائے تیار ہو رہی تھی تو میں نے اپنے بیٹے عبدالبصیر کو بھیجا کہ وہ حضرت مرزا صاحب کو یہاں ہمارے گھر لائے۔ بصیر گیا تو حضرت موصوف نے گھڑی دیکھی اور فرمایا کہ ''بیٹا ڈیڑھ منٹ لیٹ ہو''۔ اس نے ادب سے معذرت کر لی۔ گھر آئے تو پوچھا یہ کیا میں نے عرض کیا کہ چائے یہاں نوش فرما لیں ہم پی لیتے ہیں کوٹ مومن والوں کو کیا تنگ کرنا ہے فرمایا ''دیر ہو جائے گی'' میں نے کہا کہ آرام سے آپ چائے پی لیں انشاء اللہ وقت پر پہنچ جائیں گے۔ کچھ گاڑی بھی اچھی تھی کچھ اپنا بھی جوانی کا گرم خون۔ بہت تیز گاڑی دوڑائی اور کوٹمومن سے باہر تھانے کے پاس پہنچے تو میں نے عرض کیا کہ وہ دیکھ لیں سورج سرخ گولے کی صورت نیچے اُفق میں اُترنے کی تیاریوں میں ہے اور کسی کے بیت احمدیہ میں پہنچنے کا منتظر ساکت و جامد کھڑا ہے۔ بہرحال ہم بخیریت وقت سے پہلے بیت احمدیہ کوٹمومن میں پہنچ گئے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے زمانے میں حضور نے یہ طریق اختیار فرمایا تھا کہ کسی مرکزی مربی سے کسی دیئے گئے موضوع پر علمی تقریر کرواتے اور پھر پاکستان کی جماعتوں میں اسی موضوع پر تقریر کرنے کا ہر جماعت کو ارشاد فرمایا کرتے مرکز میں مجھے یاد ہے حضرت مولوی ابوالعطاء صاحب کی تقریر تھی مجھے معلوم تھا کہ مجھے سرگودھا میں اسی موضوع پر تقریر کرنے کا حکم ملنا ہے۔ میں بیت مبارک ربوہ میں حاضر ہوا مضمون مشکل تھا حضرت خالد احمدیت کی تقریر سن کر ان سے نوٹس بھی لے لئے اور تقریر تیار کر لی جب میں تقریر کر رہا تھا تو حضرت امیر صاحب نے فرمایا ''ایک منٹ باقی ہے''۔ میں نے عرض کیا جناب آپ جلسہ سالانہ پر تقریر کر رہے ہوتے ہیں۔ جب آپ کو وقت کا الٹی میٹم ملتا ہے تو آپ فرماتے ہیں اچھا وقت پر ختم کر دوں گا۔ ''باقی چھپ جائے گی''۔ میری تو باقی چھپنی بھی کہیں نہیں۔ اس پر آپ نے قہقہہ لگایا اور اجازت دی کہ اچھا تم اپنا مضمون مکمل کر لو۔ 1974ء میں غازیوں کی ایک

یلغار آپ کے گھر پر بھی پڑی کچھ سامان لوٹ لے گئے کچھ توڑ پھوڑ کی حتیٰ کہ کسی نادان بدنصیب نے آپ کی جیب سے پارکر کا پن بھی چھین لیا۔

ملک محمد اقبال صاحب ایک معروف اور نامور فوجداری کے ماہر وکیل تھے۔آپ کے دوست تھے رمضان کا مہینہ تھا دوسرے روز سہ پہر کو اپنے وکیل نوجوان بیٹے کے ساتھ احوال پرسی کے لئے آپ کے گھر گئے تو آپ نے فرمایا ملک صاحب آپ ذیابیطس کے مریض ہیں شاید روزہ نہ ہوگا۔اگر ایسا ہی ہے تو میں چائے پیش کروں مگر اس معذرت کے ساتھ کہ ہمارے گھر میں کراکری نام کی کوئی چیز باقی نہیں بچی۔ہم نے مٹی کے پیالے گھر میں رکھ لئے ہیں۔اگر محسوس نہ کریں تو چائے انہی مٹی کے پیالوں میں پیش کرسکتا ہوں۔ملک صاحب نے شکریہ ادا کیا۔ملک صاحب نے دوسرے روز مجھے بتایا کہ میرے بیٹے نے واپسی پر مجھے کہا کہ ابّا یہ کیا بات ہے کہ یہ 75 سالہ بوڑھا ہے گھر میں سامان حتیٰ کہ پرچ پیالی تک بھی نہیں بچی ہے۔وہ خود روزے سے ہیں آپ جوان اور میں نوعمر ہمارا دونوں کا روزہ نہیں ہے اور وہ کافر اور ہم مسلمان۔

حضرت خلیفہ ثالث نے کچھ رقم بھیجی۔اس دن 68 دکانوں مکانوں کو نقصان پہنچا تھا۔حافظ بھائی کا مکان کلینک کار وغیرہ سب کچھ نذر آتش، کچھ بھی نہ بچا۔حضرت مرزا صاحب کا بھی نقصان کافی تھا۔مگر ان دونوں بزرگوں نے اس رقم میں سے کچھ بھی نہ لیا باوجود ہمارے اصرار کے کہ یہ تبرک ہے۔ہم نے حضرت صاحب کی خدمت میں رپورٹ کردی تو حضور نے فرمایا میں ان کے لئے الگ سے خاص طور دعا کر رہا ہوں انہیں مجبور نہ کریں وہ نہیں لیں گے دوسروں میں تقسیم کردیں۔

سیّدنا حضرت مصلح موعود کے ساتھ خصوصی تعلق

اس آقا و مطاع اور اس جاں نثار غلام کے تعلقات کی گہرائی کو تو اللہ ہی جانتا ہے۔حضرت مصلح موعود کے ساتھ یکرنگی اور ہم آہنگی اور اطاعت شعاری حضرت مرزا صاحب کی اپنے کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ہر ہفتے اپنے آقا کی خدمت میں پہنچنے کی دلی تمنا کو مالک الملک خوب پوری کرنے کے اسباب بھی مہیا فرما دیتا تھا۔

آقا وہ جس کی پیدائش سے بھی تین سال قبل مصور حقیقی نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس کے خدوخال اور ناک نقشہ بیان فرما دیا تھا جس میں اس کو حاصل ہونے والے کمالات روحانی اور دینی کا ذکر بھی تھا اس کی فتوحات کا تذکرہ بھی تھا اس کے حسن و جمال اور اولوالعزم ہونے کی پیش خبری بھی تھی۔سماوی تائیدات اور نصرتوں کے وعدے بھی نمایاں تھے۔پھر بندہ نوازی اور چاکر پروری اور عشق و وفا کے مظاہرے کرنے میں تو یہ سارا مقدس خاندان ہی ایک بلند مینار کی مانند کھڑا نظر آتا ہے اور سب کے ماتھے کے جھومر خود حضرت مسیح و مہدی اور حضرت مصلح موعود سبھی نے اس حضرت مہدی کے راج دلارے کو پہچانا لیکن شناخت شناخت میں بھی فرق ہوتا ہے پھر حضور انور

کے ساتھ حضرت مرزا صاحب نے اطاعت، فرمانبرداری اور محبت بھی ایسے رنگ میں کی کہ ہزاروں رشک کرتے تھے۔ آج ہم اس بے مثال آقا اور اس کے ساتھ بے مثل اطاعت کرنے والے غلام کا ذکر تمام کیسے کر سکتے ہیں۔ حضرت مصلح موعود کے ہی مبارک الفاظ بزبان حضرت مرزا صاحب کچھ یوں بیان کر سکتے ہیں اور شاید یہ ہی مختصر مگر جامع بیان عاشق و معشوق کے درمیانی احوال کا ہو۔ ؎

شکر خدا گزر گئی ناز و نیاز میں ہی عمر
مجھ کو بھی ان سے عشق تھا ان کو بھی مجھ سے پیار تھا

حضرت مرزا صاحب فرماتے تھے کہ ایک حضور کا (ذاتی یا جماعتی) ضروری مقدمہ درپیش تھا۔ حضور نے مجھے فرمایا یہ میری قمیص کل پہن کر عدالت جانا ہے انشاءاللہ کامیابی ہوگی اور مرزا صاحب وہ اپنے قد سے لمبی قمیص پہن کر گئے اور قادر کریم نے کامیابی بخشی۔ **و هو علیٰ کل شیءٍ قدیر۔**

اب اس عاجز کے پاس قمیص تو حضور انور کی کوئی نہیں تھی البتہ حضرت سیّدہ آپا جان مہر آپا صاحبہ نے جواز راہ غلام نوازی مجھے ''بھائی'' کہتی تھیں حضرت مصلح موعود کا ایک گرم پاجامہ عطا فرمایا اس پر سرٹیفکیٹ اپنے دست مبارک سے لکھا کہ حضور کا مستعملہ گرم پاجامہ ہے۔ اپنے بھائی کو تحفہ دیتی ہوں۔ نیچے تاریخ درج فرمادی میرا بھی ایک ذاتی مقدمہ تھا جو میرے لئے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ اب کس طرح پہنوں شلوار کے نیچے پہننا تو تبرک کے ادب کے خلاف ہے مجھے یہ ترکیب سوجھی کہ اپنی قمیص کے نیچے اور بنیان کے اوپر گلے میں ڈال لیا۔ مجھے بھی حضور کی برکتوں سے وافر حصہ ملا اور میں بھی مقدمہ جیت گیا۔ **الحمد للہ۔**

بات کہاں سے کہاں چلی گئی معذرت خواہ ہوں حضرت مصلح موعود کا ذکر چھڑ جائے تو میرے دل کی دھڑکنیں باگیں تڑا کر میرے قابو میں نہیں رہتیں اور باغی ہو جاتی ہیں اور میں اس حالت کو پسند بھی بہت کرتا ہوں چاہتا ہوں کہ آج کے زمانے سے 50،45 برس پہلے کے فرحت بخش اور روح پرور زمانے میں کہیں کھو جاؤں شاید کہیں خواب میں ہی وہ من موہنی شکل وہ اللہ کا محبوب اور میرا مطلوب نظر آجائے۔ اے کاش! ؎

ہر شب اسی امید میں سوتا ہوں دوستو
شاید ہو وصل یار میسر مگر کہاں

ان دنوں میں ایک ''زندہ آدمی'' تھا اور میرا دل ایک پھول کی مانند اپنی شگفتگی اور تر و تازگی کی وجہ سے کچھ کام کا بھی تھا۔ مگر اب دل صد چاک کا جو حال ہے وہی جو سیّدنا حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب نے ان اشعار میں بیان فرمایا ہے۔ ؎

دل کا کنول جو روز و شب

رہتا شگفتہ تھا سو اب
اس کا یہ ابتر حال ہے
اک سبزۂ پامال ہے
اک پھول کملایا ہوا
سوکھا ہوا بکھرا ہوا
روندا پڑا ہے خاک پر

سیّدنا حضرت مرزا طاہر احمد صاحب کے ذکر سے یاد آیا کہ آپ کے وصال کی خبر 19؍اپریل 2003ء کو مجھ پر بجلی کی طرح گری اور جو حال ہوا اس کا ذکر کیا۔ ایک رات پہلے مجھے آواز آئی تھی کہ ''دلدار فوت ہو گیا ہے'' دوسری صبح زیارت چہرہ اور جنازے میں شرکت کے لئے تیار ہو گیا۔ ویزا تو پہلے ہی پنج سالہ میرے پلے تھا۔ ہوائی جہاز کی نشست کے لئے گزارش کی تو تھانیدارانہ رویے نے رہی سہی کسر نکال دی صدمے سے پہلے رفو شدہ دل کا بُرا حال تھا خطرہ تھا کہ وہ اس نازش صدقمر کی زیارت کے لئے ساتھ جانے سے انکار ہی نہ کر دے۔ خیر اللہ اللہ کر کے نصف شب کو لاہور کے فضائی مستقر پر پہنچے وہاں پر جماعت لاہور نے ریفریشمنٹ کا انتظام کیا ہوا تھا حضرت مرزا صاحب کو سلام عرض کیا۔ آپ بہت ہی غمزدہ تھے حیران ہوئے کہ تم نے بھی ہمت کر لی۔ آپ درست ہی فرما رہے تھے۔ کیونکہ چند ماہ قبل میں نے دل کی اوپن سرجری کروائی تھی۔ ہنوز نقاہت باقی تھی ہم اکٹھے لاؤنج میں جا کر بیٹھے میں نے عرض کیا یہاں غسل خانے وغیرہ بہت صاف ہیں نہ معلوم جہاز میں کیا حال ہو اگر مناسب سمجھیں تو یہاں ایک دفعہ فراغت ہو جائے فرمایا ہاں یہ ٹھیک ہے اور پھر میں دروازے پر کھڑا تھا مجھے آپ کی طبیعت کا بہت عرصہ سے پتہ تھا کہ آپ کسی کا استعمال شدہ تولیہ خواہ بظاہر کتنا صاف ہی ہو استعمال نہیں فرماتے تھے۔ چنانچہ میں نے انہیں اپنی چادر اس ان لکھے سرٹیفکیٹ کے ساتھ پیش کی کہ یہ بالکل صاف ہے۔ اسے استعمال فرماویں مسکرا کر پوچھا کہ آپ نے یہ چادر کس لئے رکھی ہوئی ہے میں نے کہا حضرت مامور زمانہ کے تتبع میں۔ حضور نے فرمایا تھا ؎

دوش پر میرے وہ چادر ہے کہ دی اس یار نے
پھر اگر طاقت ہے اے منکر تو یہ چادر اُتار

چنانچہ یہ عاجز گرمیوں میں لون کی اور سردیوں میں گرم چادر سفر میں ہمراہ ضرور رکھتا ہے۔ جہاز میں بیٹھے طویل سفر تھا ''تھانیدار'' صاحب نے تو مجھے ایسا ڈرایا ہوا تھا کہ شاید میں کبھی بھی لندن نہ پہنچ پاؤں گا مگر جہاز تھا کہ خالی پڑا ہوا تھا 4/4 سیٹوں والی ساری قطاروں

پر ایک ایک دو دو آدمی بیٹھے تھے میں نے درمیانی ڈنڈے اُٹھا کر بستر بنالیا اور سرہانے 3/4 اکٹھے رکھ کر آرام کرلیا لیکن جونہی مجھے تکان سے آرام محسوس ہوا۔ حضرت مرزا صاحب کا خیال آیا آپ کے ساتھ ایک آدمی مسلسل باتیں کرتا آرہا تھا میں نے اسے پچھلی نشست لینے کو کہا اور حضرت امیر صاحب کو اپنی طرح بستر تیار کر دیا اور پگڑی میں نے سنبھال کر وہیں رکھ دی جہاں اپنی سلیمانی ٹوپی رکھی تھی لیکن مرزا صاحب سوئے نہیں کوئی اور عقیدت مند آ گیا اور اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کمر سیدھی کر کے میں بھی حضرت مرزا صاحب کے پاس جا بیٹھا۔

فرمایا اس سانحہ عظیمہ پر کچھ شعر سناؤ۔ چنانچہ میں نے یہ شعر سنائے آپ نے پسند فرمائے۔ ؎

کلک الم طراز ذرا دیکھ بھال کر
کس سانحے کا ذکر ہے اتنا خیال کر
سن تو بھی ہم نشین ذرا دل سنبھال کر
کاغذ پہ رکھ رہا ہوں کلیجہ نکال کر
پرواز کون کر گیا پر تولتا ہوا
خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

فرمایا یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ حضور کے بارے میں ہی کسی نے کہے ہیں۔

حضرت امیر صاحب سے آخری ملاقات

23/اگست کی شام میں بمع اپنے بیٹے اعجاز احمد صاحب حضرت مرزا صاحب کی ملاقات کو گیا تو میں آپ کی حالت دیکھ کر ڈر گیا بہت نحیف سی آواز جو سمجھی نہیں جاتی تھی۔ مجھ سے پوچھا کیسے آئے ہو میں نے مختصراً گزارش کر دی فرمایا ''دیکھوں گا'' رات 10 بجے مجھے فون کرایا کہ صبح دس بجے آجاؤ۔ 24/اگست کو حاضر ہوئے تو فرمایا کام ہو گیا ہے مطمئن رہو۔ 26/تاریخ کو لبیک اللھم لبیک پکارتے ہوئے اپنے خالق حقیقی کے پاس خوشدلی سے پہنچ گئے۔

بجا کہ حضرت مرزا صاحب نے 106 سال کی طویل عمر پائی مگر سچ جانیئے ابھی تشنگی باقی تھی آپ کی قرار واقعی ضرورت تھی جواب مسلسل محسوس ہو رہی ہے۔ سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ مجھے چھوڑ جانے والے میرے بزرگ میرے محسن اور میرے محبوب کرم فرما اور میرے عزیز اور پیارے جنہیں بستر سے گھر سے اٹھا کر سپرد خاک کر آئے ہیں۔ وہ میرے دل سے رخصت کیوں نہیں ہوتے۔ دل میں موجود ایک کاری زخم کی صورت میں رہتے ہیں میں نے اس پر غور کیا آخر میں سمجھ آئی کہ ان کا علم و عمل اور ان کی محبت و شفقت ان کا فیض

عام ان کا اعلیٰ کردار اور اس پر مستزاد ان کی دل نواز مسکراہٹ یہ صفات کوئی مٹی میں دفن ہونے والی ہیں؟

حضرت مرزا صاحب کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھ دیا ہے مگر حق ادا نہیں ہوا۔ وہ شخص دیانت اور امانت کا اعلیٰ نمونہ تقویٰ کی باریک راہوں کی تلاش کرنے کے بعد انہیں راہوں کا راہی۔ عاشق قرآن حقیقی معنوں میں عشق رسول ﷺ میں مگن رہنے والا مسیح ومہدی کے ساتھ گہری وابستگی اور محبت اور وفا کا پتلا۔

خلفاء کرام کا اطاعت شعار اور مودب ساتھی۔ ایسے شخص کو میرے جاگتے سوتے الفاظ یا کھدری عبارتیں کب اور کیونکر بیان کرسکتی ہیں۔ بیماری کے دوران جب بھی ملنے گئے تو ہر بار یہی محسوس ہوا کہ جنت کے مسافر سے ملاقات ہوئی ہے۔ اللہ جزائے خیر دے ڈاکٹر نوری صاحب کو جنہوں نے حضرت مرزا صاحب کا علاج حد درجہ ہمدردی سے کیا اور ان کے راولپنڈی میں قیام پذیر ہونے کے باعث ایک فرشتہ سیرت طبیب حاذق قادر کریم نے سرگودھا کو عطا کیا ہوا ہے۔ اس نے ہمہ وقت حضرت امیر صاحب کی طبیعت کے مطابق اور پھر جرنیل صاحب موصوف سے مسلسل مشورے کر کے علاج کیا جب بھی ہم گئے وہ حضرت مرزا صاحب کے پاس موجود ہوتے ان کا نام نامی ڈاکٹر محمد محمود صاحب شیخ نامور ماہر طبیب اور مرد خلیق۔ ان دونوں ڈاکٹر صاحبان کے سارے سرگودھا کی جماعت پر یہ احسان ہمیشہ یادگار رہے گا اور چاہئے کہ ہم سب دل سے ان کے لئے دعائیں کرتے رہیں کہ انہوں نے تیمارداری کا حق ادا کر دیا ہے ہم ان کے احسانوں کا بدلہ تو نہیں دے سکتے لیکن دعائیں مسلسل ان کے لئے کرتے رہنا ہمارا فرض ہے۔ حضرت مرزا صاحب کو میں نے کئی بار ان کی زندگی میں لکھا کہ میرا یقین ہے کہ آپ کا وجود ہم سرگودھا والوں کے لئے ایک تعویذ کی حیثیت رکھتا ہے نامعلوم کتنی بلائیں آپ جیسے بزرگ اور خدانما وجود کے صدقے ہمارے سروں سے ٹل جاتی ہیں۔

آپ کی شفقت کے کئی روپ تھے ہر پہلو بے کنار ہر گوشہ بے لوث اور یہ سب رحمت ایزدی کا ہلکا سا عکس تھا۔ اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوتا ہے وہ شخص جس نے انسانی فکر وشعور کو نئی جہتیں دیں قرآنی علوم کو فروغ دیا۔ اسے خوب پڑھا اور بہت خوب پڑھایا۔ حضرت مرزا صاحب کے بارے میں لکھتے ہوئے دل کی بیقراری محرومیوں کے احساس سے بڑھ جاتی ہے اور قلم لرزنے لگتا ہے۔ اس شخص دعا گو ایثار پیشہ خلافت حقہ کے جاں نثار عاشق کے زیر زمین چلے جانے سے سرگودھا کی یہ نگری خالی ہو رہی تھی۔ اندر کا شیشہ تڑخ گیا ہے مستقبل کے خطرات کی آگہی نے شدید اضطراب پیدا کر دیا ہے۔ روح جیسے مجروح ہوگئی۔ من مصروف ماتم ہوگیا ادھر دنیا والے شکم پرست عناصر کی باچھیں کھل رہی تھیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ سرگودھا کی جماعت کی بہت بڑی شخصیت جس سے ان لوگوں کو ارادتمندانہ اور والہانہ لگاؤ تھا وہ ہمیشہ کے لئے انہیں چھوڑ گیا ہے۔ اس کرب کے تلخ ذائقے احمدیوں کے جسم وجان میں کڑواہٹ انڈیل رہے تھے۔ گرمیوں میں دھکتی دھوپ اور تپتی راتیں کیسے گزریں گی پھر آگے سردیوں کی طویل راتیں ظالم صبحیں اور بے کیف شاموں میں کس کی دعائیں ہوں گی جو

سرگودھا والوں کے لئے خیر طلب کریں گی اور شر سے بچے رہنے کی آرزومند ہوں گی شاعر نے نہ معلوم کس پس منظر میں یہ شعر کہا تھا اپنا حال بھی کچھ ملتا جلتا ہی ہے ؎

اب ذوق میکشی کی بھی عظمت نہیں رہی
اہل ریا کے ہاتھ میں پیمانہ دیکھ کر

مگر پھر ذرا ہوش آیا تو خیال آیا کہ ہمارے لئے مایوسی کی تو کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔ ہمارا شفیق اور مہربان خلیفہ برحق جو موجود ہے۔ اللہ اسے ہمیشہ سلامت رکھے۔ اس کی دعائیں بھی ہمیں پہنچتی رہیں گی کیا ہوا جو وہ سات سمندر پار ہے تو دعاؤں اور برکتوں کے لئے یہ دور دراز کے فاصلے تو کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ سر سلامت تو سب سلامت۔ حضرت مصلح موعود نے ایسے خدشات اور خطرات کے موقعہ پر جو قندیل روشن فرمائی تھی وہ آج بھی روشن ہے اور تا قیامت روشن رہے گی۔ ؎

دولہا ہمارا زندۂ جاوید ہے جناب
کیا بے وقوف ہیں جو بنیں سوگوار ہم

حرف آخر

حضرت مرزا صاحب کی وفات کی خبر سن کر اپنے تو بیشمار حاضر آئے ہی تھے اور انہیں آنا ہی تھا غیر از جماعت دوستوں میں سے 5/6 تو فوری طور پر جن میں عزیزم چوہدری سہیل چیمہ صاحب بھی تھے پہنچ گئے اور بعض بعد میں جن میں ایک ممبر پارلیمنٹ بھی تھے اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ ان کے ووٹروں اور حمایتیوں میں متعصب لوگ کیا کچھ نہ کہیں گے جمع ہوئے اور پسماندگان کے ساتھ تعزیت کی خود عاجز راقم کے پاس بہت لوگوں نے جن میں اکثریت وکلاء کی تھی اظہار ہمدردی کیا یہ صورت حال دیکھ کر آزاد کا یہ شعر میرے لبوں پر بے اختیار آتا رہا۔ ؎

کیا خبر کیا بات اس کے کفر میں پوشیدہ تھی
ایک کافر کیوں حرم والوں کو یاد آیا بہت

اے ہمیں چھوڑ کے جانے والے اللہ تعالیٰ تیرے درجات بلند سے بلند کرتا رہے تو نے بہت دینی خدمات صدی بھر سرانجام دی مگر نمود و نمائش تو ہمیشہ نفور رہا۔ لوگ بن پھب کر کیمرے کی آنکھ کے سامنے ہوتے ہیں تا دنیا دیکھے مگر تجھے ایسی سستی شہرت سے کچھ غرض نہ تھی کیونکہ حقیقی بڑائی تو اس میں ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے بے ریا اعمال کو قبول فرمائے اور پھر کیمرے پیچھے پیچھے بھاگے نہ یہ کہ کوئی انسان کیمرہ کے سامنے آنے کا آرزومند ہو۔

اے ہمارے بزرگ مرزا صاحب۔ تیرے پسماندگان صرف تیری اولاد ہی نہیں بلکہ ہم سبھی تیرے پسماندگان میں شامل ہیں اور تیری وفات سے ہم سبھی غمزدہ اور زخم خوردہ ہیں۔ مگر موت سے کسے مفر ہے۔ سارے انبیاء اور اولیاء نے یہ جام نوش کیا اس دور کے مامور ہمارے اور تیرے مرشد کی وفات 26 رمئی کو دس بجے ہوئی تو حضرت سیّدہ نواب مبارکہ بیگم نے سچ ہی کہا تھا کہ ہمارا سورج وقت صبح ہی غروب ہو گیا (آپ کی وفات بھی اسی تاریخ کے اسی ساعت ہوئی) جا اور اپنی جاں نثاری اور اپنی بے لوث خدمات دینیہ اور کلام الٰہی کے ساتھ عاشقانہ محبت کا صلہ اپنے آسمانی آقا سے وصول کر۔ جماعت احمدیہ سرگودھا کو تو نے اس طرح ہر قسم کے حملے سے محفوظ رکھا جیسے مرغی اپنے پروں تلے اپنے چوزوں کو چیل وغیرہ سے چھپا کر بچائے رکھتی ہے۔ قادر کریم حضرت صاحب کی دعاؤں کو قبول فرما کر ہمیں نعم البدل عطا فرمائے کہ اس کے خزانوں میں ہرگز کمی نہیں اور اللہ تیرے جانشین کو تیری ساری صفات کا وارث بنائے۔ ایں است کام دل اگر آید میسرم۔ اپنا حال پریشان خیال پراگندہ قلب و ذہن میں سوائے غم واندوہ کے اور کسی شئے کی گنجائش ہی نہیں رہی سوئی جاگی کچھ عبارتیں اور بغیر کسی ترتیب کے کچھ حالات اکٹھے کئے گو ان میں بے ربطی اور انتشار نمایاں ہے مگر یہ تو سوچیں کہ کتنے عظیم انسان کے بارہ میں لکھنے کی میں نے جسارت کی ہے میرے جیسے خام علم اور کوتاہ فکر کا شخص کیونکر قارئین کی توقعات پر پورا اُتر سکتا ہے۔ یہ تو حضرت مرزا صاحب کے احسانات کی طویل فہرست کے بوجھ ہلکا کرنے کی سعی ناتمام ہے یہ بھی میں نے اپنی معمر اور بوڑھی سوچوں کو بڑی مشکل سے یکجا کر کے ایک مضمون لکھا ہے ذرہ نواز آسمانی آقا کے فضل و رحم سے کیا بعید جو میری اس تحریر کو قبول فرما کر حضرت مرحوم و مغفور کی مزید بلندی درجات کا موجب بنا دے اور راقم عاصی کی مغفرت کا کچھ ذریعہ وسیلہ بن جائے۔ **و ذلک ارجو من اللہ تعالیٰ**

کتنی بے ربط تھی عشق کی گفتگو
جب مرتب ہوئی داستان ہو گئی

(روزنامہ الفضل ربوہ 3رنومبر 2006ء صفحہ 3 تا 6)



اخلاص وایثار کا پیکر۔ یاروں کا یار

قریشی محمود الحسن بھی ہم سے روٹھ گیا

جب میں جذباتی ہوجاتا ہوں اور یونہی نہیں مثلاً گزرے دنوں کی شیریں داستانیں یاد کر کے یا

''بیتے ہوئے دن عیش کے بنتے ہیں شمع زندگی
اور ڈالتے ہیں روشنی میرے دل صد چاک پر''

اور اب ''اکثر شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے'' ان سدا بہار محفلوں اور خوشیوں اور مسرتوں سے اب یکسر محرومی کے باعث جذبات غالب آجاتے ہیں ایسے میں جو ٹوٹے پھوٹے لفظ لکھتا ہوں تو گویا ان پر بھی رقت طاری ہوجاتی ہے اور کلک الم طراز بھی ٹوٹنے لگتی ہے اور اگر کچھ چلتی بھی ہے تو اپاہج کی طرح دل سے چاہتا ہوں کہ قلم اور قرطاس کے ذریعے دل کا بوجھ ہلکا کروں مگر اداسی اور محرومی ایسے گھیر لیتی ہے کہ آنکھیں بھیگ جاتی ہیں یہ میں نے پہلے بھی کسی مضمون میں لکھا تھا کہ کسی فوت شدہ بھائی کے بارے میں لکھنا میرے لئے بڑا ہی اذیت ناک بلکہ روح فرسا مرحلہ ہوتا ہے۔ اور کچھ بھی نہ لکھنا تو جانے والی روح کے ساتھ بے وفائی اور عمر بھر کی محبتوں اور مسرتوں کے باعث شاید غداری بھی ہو۔ آج پھر ایسی ہی کیفیت سے میرا زخمی دل اور جان حزین دو چار ہے جب بہت ہی پیارے نیک اور پارسا بڑے بھائی قریشی محمود الحسن صاحب کی وفات حسرت آیات پر قلم اٹھانے کا ارادہ کیا آنکھیں آنسوؤں سے تر بتر اور کچھ سوجھتا نہیں کہ کیا لکھوں وہ بھائی تو بڑی صفات رکھتا تھا اور اس کی شخصیت پہلو دار تھی کون سا گوشہ ان کی طویل زندگی کا ٹٹولوں اور اس میں سے کیا کیا قارئین کرام کی خدمت میں پیش کروں ان کی ذہانت اور فراست کی وجہ سے وہ تو ہر فن مولا بن چکے تھے۔ احمدیت کے نور نے ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو خوب روشن اور صیقل کر دیا تھا اور ہمارے لئے قابل صد رشک وجود بن گئے تھے۔ جماعتی مختلف عہدوں پر عمر بھر بڑی عرق ریزی اور کمال محبت اور شوق کے ساتھ خدمات سرانجام دیں۔

مالی معاملات میں ان کی مہارت ایک طرف اور ان کی دیانتداری اور جماعتی روپے کی حفاظت کمال درجے پر پہنچی ہوئی تھی۔

پیارے بھائی ڈاکٹر حافظ مسعود احمد صاحب اور محترم بھائی جناب محمد اقبال صاحب پراچہ برادرم قریشی صاحب اور یہ عاجز ہماری چار یاری مشہور و معروف تھی نہ صرف جماعت میں بلکہ غیر از جماعت دوست بھی جانتے تھے کہ ان چاروں کی یک رنگی اور باہم دلی وابستگی قابل رشک ہے۔ تقریباً روزانہ کا معمول کہ پیارے بھائی پراچہ صاحب اور میں سیٹلائیٹ ٹاؤن سے 12 بلاک حضرت حافظ صاحب

کے ہاں پہنچ جاتے اور وہ بھی اپنی مصروفیات سے کنی کترا کر قریشی صاحب مرحوم مغفور کا ڈرائیور موجود ہوتا تو کار میں ورنہ پیدل آدمی بھیج دیتے تب ہمارا کورم پورا ہوتا اور وہ محفلیں ان بزرگ بھائیوں کے باعث ایسی روح پرور ثابت ہوتیں کہ ہر مجلس کے اختتام پر ایمان و ایقان صیقل ہو جاتے۔ حتیٰ کہ سیدنا مرشدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کو بھی ہماری چار یاری بھا گئی اور حضور انور نے ہم چاروں کو حضرت مرزا عبدالحق صاحب کی ''فیملی'' کا نام دیا اگر ہم چاروں میں سے کوئی ایک دربارِ خلافت میں حاضر نہ ہوسکتا تو حضور فوراً بھانپ جاتے اور دریافت فرماتے کہ آج مرزا صاحب کی فیملی نہیں آئی اور ہم حضور کے اس شفقت بھرے اظہار پر پھولے نہ سماتے۔

ایک سال موسم گرما سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کا کول میں مقیم تھے کافی دن گزر گئے زیارت ملاقات کے لئے ہم بے تاب ہو گئے۔ آخر ہم چاروں بھائی جان حافظ صاحب کی کار میں روانہ ہوئے۔ جاتے ہی حضور انور نے از راہِ غلام نوازی ملاقات کا اعزاز عطا فرمایا بہت دیر تک مختلف باتیں ہوتی رہیں رات بھیگ چکی تھی کہ بھائی جان ڈاکٹر حافظ صاحب نے واپسی کا عزم کیا ہم تو ایسے مصروف بھی نہیں تھے کہ الٹے پاؤں راتوں رات واپس پہنچیں۔ حافظ صاحب کا طریق تھا کہ خواہ ساری رات سفر میں گزر جائے کلینک میں بروقت حاضر ہونا ضروری سمجھتے تھے۔ آجکل کے زمانہ کی ماردھاڑ کا بھی کوئی اندیشہ نہیں تھا اور نہ رہزنی کا کوئی خوف۔ یوں حافظ صاحب کو ہم کہتے تھے کہ آپ کی کار کسی مہارت کی وجہ سے نہیں بلکہ آپ کے تقویٰ کی برکت سے چلتی ہے اور یہ بات عین درست تھی کہ لاہور سے ایک بار آتے ہوئے حافظ صاحب سو گئے گاڑی چلتی رہی آخر جب لڑکھڑانے لگی تو میں نے جو عقبی نشست پر بیٹھا تھا حافظ صاحب کو جھنجھوڑا کہ حافظ صاحب سو تو نہیں گئے۔ آپ جاگے اور لالیاں اڈے پر آ کر منہ پر پانی کے چھٹے مارے اور اپنے تینوں مصاحبین کو بعد میں بتایا اس وقت حضرت مرزا صاحب کے روبرو شرم کے مارے خاموش رہے کہ میں نے ساری رات لاہور کے خیابان ہوٹل میں جاگ کر گزاری تھی سردیوں کی طویل رات۔ اس لئے مجھے نیند آ گئی تھی اور فلاں خواب بھی میں دیکھ رہا تھا جب تم نے مجھے ہوشیار کیا۔

ساری رات جاگ کر گزارنے کی بھی ایمان افروز کہانی سن لیں کہ میں دائیں پہلو ہی سو سکتا ہوں، نہ بائیں کروٹ نہ پشت چارپائی پر لگا کر، آپ نے جو پلنگ مجھے دیا اس پر اگر دائیں طرف کروٹ لیتا تو میری پشت کے پیچھے مرزا صاحب کا پلنگ تھا یہ تو صریح بے ادبی ہوتی اس لئے میں نے ساری رات جاگتے گزاری اور آنکھ جھپک نہیں سکا۔ اور ہمیں وہ ادب واحترام کا سبق دے گئے جو ہم نے اس سے پہلے نہ دیکھا نہ سنا۔

بات ایبٹ آباد کا کول کی ہو رہی تھی بیچ میں لاہور کا سفر اور حافظ بھائی کا ایمان افروز اور روح پرور واقعہ آ گیا تو میرا قلم میرے قابو سے نکل گیا اور کچھ ہوش نہ رہا کہ قارئین اس بے ربط عبارت کو پڑھ کر راقم کو دیوانہ ہی کہیں گے اور مجھے خود تسلیم ہے کہ میں دیوانہ ہوں ذرہ نواز اور بندہ پرور کے لطف وکرم سے کیا بعید جو مجھے وہ دیوانہ بنا دے جس کے حصول کی تمنا سیدنا حضرت مصلح موعود نے فرمائی ہے۔

اے کاش! ہم چاروں حضرت مرزا صاحب کی قیادت میں سرگودھا (اور اس وقت خوشاب بھی سرگودھا کا ہی حصہ ہوتا تھا بعد میں الگ ضلع بنا) کے دور دراز دیہات میں جماعتی دوروں پر جایا کرتے تھے بہت سفر کئے جو بعض تو اپنی منفرد خصوصیات کے باعث اب تک نہیں بھولے پھر یوں ہوا کہ ہماری نیوسول لائن کی بیت کے لئے چار کنال زمین گورنمنٹ سے خریدی اور دین حق کے درد میں بدحال لوگ اکٹھے ہو کر ملک امیر محمد کالا باغ گورنر پنجاب کے پاس گئے انہوں نے بہ یک قلم بیع نامہ منسوخ کر دیا تو پھر بیت کی جگہ کی بحالی کے لئے مشورے کرنے اور پھر رٹ پٹیشن دائر کرنے کے لئے بے شمار سفر لاہور کرنا پڑے۔ ہائی کورٹ سے ہماری پٹیشن خارج ہوئی تو سپریم کورٹ سے رجوع کیا جہاں قادر کریم نے کامیابی عطا فرمائی اس طرح ہم پانچوں نے لاہور اور راولپنڈی کے سفر بھی کئے۔

مقام شکر ہے کہ کبھی ہمارا باہمی رائے کا اختلاف بھی نہ ہوا۔ یہ عرض کر دوں کہ......ڈیوٹی پر......کچھ عرصہ میری کار رہوا کرتی تھی پھر اکثر و بیشتر حضرت حافظ ڈاکٹر صاحب کی کار نے بیڑا اٹھالیا مگر کیا مجال خواہ دور دراز کا سفر ہو جو کبھی یہ خیال دل میں گزرا ہو کہ پٹرول تو جماعت کے فنڈ سے ڈلوالیں حضرت امیر صاحب نے مجھے یاد ہے یہاں تک بھی فرمایا کہ اس کا مطلب ہے کہ آئندہ آپ کی کار کہیں نہ لے جائی جائے مگر مرزا صاحب کی ان گنت حسنات اور خوبیوں میں ایک یہ بھی تھی کہ غصہ فوراً تھوک دیتے تھے۔ آجکل فکری افلاس کا دور ہے نمود و نمائش نے حقیقی اخلاص اور ایثار کی جگہ لے لی ہے شکر خدا کہ ہماری جماعت بہت حد تک اس سے بچی ہوئی ہے اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت مسیح موعود اور خلفاء کرام کے احکام اور مواعظ کے مطابق خدمت کرنے کی توفیق عطا فرماتا رہے اور خود بینی اور نمائش سے بچائے رکھے آمین۔

محترم بھائی قریشی محمود الحسن صاحب سے میرا ایک اضافی اور گہرا اور پوتر رشتہ بھی تھا وہ اس طرح کہ میرے والد صاحب میاں عبد العزیز صاحب نمبردار ہلال پور کو 1903ء میں حضرت مہدی معہود کے دست مبارک پر بیعت کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب فاضل ہلال پوری جنہیں اکثر لوگ ''مولوی فاضل منشی فاضل'' بھی کہتے تھے۔ میرے ابا کے بہت گہرے دوست تھے حقیقی بھائیوں سے بھی بڑھ کر ان دونوں بزرگوں کے باہم تعلقات تھے۔ ابا جان جب بیعت کر کے گاؤں گئے تو حضرت مولوی صاحب باہر رات کو جنگل میں جا کر قادیان اور والئی قادیان کے حالات دلچسپی سے سنتے کیونکہ حضرت مولانا صاحب اپنے والد محترم مولوی محمد بخش صاحب سے بہت ڈرتے تھے بالآخر 1908ء میں حضرت مولانا صاحب کو انشراح صدر ہوا اور احمدی ہونے کا برملا اعلان کر دیا جب ان کے والد صاحب کو علم ہوا تو سخت ناراض ہوئے اور فرماتے عزیزو (یعنی میرے والد عبدالعزیز) نے اسماعیلو (یعنی حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب) کو پٹ سٹیا یعنی بہکا لیا۔

بہرحال یہ لمبی داستان ہے بالآخر حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب قادیان تشریف لے گئے خود مجھے بھی ان کی شاگردی کا شرف

حاصل ہوا مگر کہاں میں اور کہاں میرا علم حضرت مولانا صاحب تو استاذ الاساتذہ بنے بہرحال جو تھوڑا وقت میں نے آں ممدوح سے اکتساب علم کیا وہ اب تک ذہن میں تازہ ہے جزاھم اللہ۔

انہی دنوں میرے چچا جان یعنی حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب ہلال پوری کی دختر نیک اختر آپا جان حفصہ بیگم صاحبہ برادرم قریشی صاحب کے عقد میں آئیں ہمارا تو خانہ واحدی والا معاملہ تھا۔ میری دو بڑی بہنیں اور تھیں اور آپا حفصہ بیگم صاحبہ سلمہا کو ہمیشہ اپنی بہن ہی جانا اور انہوں نے بھی نہ صرف میرے ساتھ بلکہ میرے سارے کنبہ کے ساتھ خواہرانہ شفقت مروت اور احسان کا سلوک کیا۔ فجز اھا اللہ۔ اس طرح محترم قریشی صاحب مرحوم گویا میرے بہنوئی بھی تھے۔

یہاں حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کا ذکر آیا ہے تو میں موضوع سے بھٹک جانے کا اعتراض بھی قبول کرنے کو تیار ہوں مگر یہ واقعہ بیان کرنے سے رک نہیں سکتا۔ حضرت مولوی صاحب ہلال پور آئے ہوئے تھے اور وہاں سے سرگودھا جانے کا ایک ہی ذریعہ تھا کہ ایک بس علی الصبح مڈھ رانجھا سے چلتی تھی ابا جان نے مجھے حکم دیا کہ میں حضرت مولانا صاحب کو گھوڑے پر سوار کر کے مڈھ رانجھا سے سرگودھا جانے والی بس پر پہنچاؤں تو میں حضرت مولوی صاحب کے پیچھے سوار ہو گیا رات ڈھلے 7/8 میل کا سفر تھا شروع ہوا اس سفر میں حضرت مولانا صاحب نے ہلال پور سے قرآن کریم کی تلاوت نہایت سوز کے ساتھ اور لحن داودی میں کرنا شروع کی اور مڈھ رانجھا جو غالباً ڈیڑھ گھنٹے کا فاصلہ تھا۔ مسلسل پڑھتے آئے مجھے چھوٹی عمر کی وجہ سے پوری سمجھ اور ادراک تو نہیں تھا مگر اس درد بھری کیفیت نے مجھے بھی گویا مسحور کر لیا اور ایک کیفیت سرمدی مجھے بھی عطا ہوئی سوچتا ہوں کہ آپ حافظ قرآن نہیں تھے مگر ڈیڑھ گھنٹے تک مسلسل قرآن کریم پڑھتے رہنا کلام الٰہی سے عشق کی بہت بڑی علامت ہے اور حضرت رسول اکرم ﷺ پر درود بھیجنے کی اہمیت پر تو آپ کی ایک کتاب محامد خاتم النبیین ایک پر اثر اور جامع کتاب ہے۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب ہلال پوری کے بارہ میں سیدنا حضرت مصلح موعود نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ حضرت حافظ روشن علی صاحب سفر پر ساتھ ہوں تو کسی لیکچر کے لئے قرآنی آیات مطابق موقعہ فوراً بتا دیتے ہیں۔ اور اگر مولانا محمد اسماعیل صاحب ہلال پوری ساتھ ہوں تو حضرت مسیح موعود کی کسی کتب کے حوالے کی ضرورت ہو تو ایسا لگتا ہے کہ انہیں سارا مسیح پاک کا کتب خانہ ازبر یاد ہے حوالے پر حوالے زبانی بتا دیتے ہیں (مفہوم) قارئین کرام حضرت مولانا صاحب موصوف کے ساتھ ''ہلال پوری'' کا لفظ ہمیشہ ہمارے لٹریچر میں بھی آتا ہے اور میں نے بھی ہلال پوری کا لفظ بار بار استعمال کیا ہے اور مجھے خود ہلال پور کا جم پل ہونے پر ناز ہے کہ مجھے بھی اس عالم بے بدل اور تصنع اور تکلفات سے مبرا بزرگ سے یہ نسبت تو ہے اللہ ذرہ نواز کی رحمت بے پایاں سے امیدوار ہوں کہ وہ مجھے اس بزرگ اور بےنفس عالم سے اس نسبت کے صدقے معاف فرما دے۔ **ذلک**

ارجو من اللہ

پھر ایک اور حضرت مسیح پاک کے رفیق خاص جنہوں نے 6/مارچ 1897ء کو اس روز بیعت کی تھی جس روز لیکھرام اپنے بدانجام کو پہنچا تھا۔ نام نامی حضرت مولانا شیر علی صاحب رانجھہ تھا آں ممدوح سے بھی ایک نسبت اس عاجز کو ہے کہ حضرت مولانا شیر علی صاحب اور حضرت مولانا حافظ عبدالعلی صاحب کے ننھیال للیانی متصل بھلوال میں تھے۔ میرے ان بزرگوں اور محسنوں کی والدہ ماجدہ تلہ قوم سے تعلق رکھتی تھیں ان کا نام گوہر بی بی اور قرآن کریم کی حافظہ تھیں یہ عاجز بھی اس قصبہ للیانی کے معزز پنجوتھہ خاندان کا نواسہ ہے اور میری والدہ ماجدہ کا نام فتح بی بی تھا گویا ان دونوں بزرگوں نے للیانی کا دودھ پیا تھا اور وہیں کا دودھ اس عاصی کو بھی نصیب ہوا میرے آسمانی آقا یہ نسبت تیرے فضل ورحم اور ذرہ نوازی سے میرے نصیبے میں لکھ دے تا جب وقت رخصت آئے تو مجھے اپنے ان متذکرہ بالا بزرگوں کے قرب میں جگہ عطا فرما دینا۔ گو طائر کی نظر مسلسل اپنے نشیمن پر ہے مگر ایسے بزرگوں کا ذکر بیچ میں آ گیا جو میری طاقت میں نہیں تھا کہ صرف نظر کر کے گزر جاتا جو پڑھنے والے موضوع سے بھٹک جانے کا الزام دھرنا چاہیں ان سے معذرت اس عمر میں نہ دل قابو میں رہتا ہے نہ قلم۔

میرے محترم بھائی قریشی محمود الحسن صاحب ایک چنچل خوش باش انسان بلکہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے کوئی الجھن یا دقت یا پریشانی پیش آئے تو ان کے پاس اس کا علاج موجود۔ ہم چاروں اکٹھے ہو جاتے کیسے فوراً یکجا ہو جاتے یہ معمہ نہ سمجھانے کا۔ جب چار دیواری کے اندر چاروں یار اکٹھے ہو جاتے تو پھر کہاں کا کوئی غم اور فکر اور کہاں کی پریشانی قریشی صاحب کو میں محبت اور بے تکلفی میں ''امرت دھارا'' کہتا تھا یعنی ہر مرض کا علاج۔ شروع وہ حضرت خلیفہ وقت کی دعاؤں کی تحریک سے کرتے اور پھر تدابیر کا پشتارہ کھول دیتے۔

کوئی صاحب شاید یہ جاننا چاہیں کہ ان چاروں میں صدر محفل کون ہوتا تھا تو بھائی تقویٰ بلندی کردار اور دست سخا وجود اور ایثار و اخلاص غرض یہ کہ ساری صفات حسنہ کے لحاظ سے بھائی جان حافظ جی اس کے مستحق تھے مگر صدر مجلس ہمیشہ بھائی جان قریشی صاحب ہی ہوا کرتے تھے۔ اور خود حافظ صاحب کی خوشی بھی اسی میں ہوتی تھی۔ یوں بھی یہ ایک غیر رسمی محفل ہوتی کوئی باقاعدہ صدارت وغیرہ کا تقرر کب ہوتا تھا۔

قریشی صاحب کا نام نامی بھی محمود تھا اور ان کے کام بھی نام کے مطابق محمود ہی تھے۔ بڑے مونس و غمخوار خاندان مسیح موعود کے شیدائی اور فدائی۔ خلفاء کرام وعظام کے غلام و وفادار جیسا کہ اوپر میں نے لکھا ہے کہ ہر فن مولا۔ ہر فن اور ہنر کے ماہر تھے یہ ایک طویل داستان ہے اور میرے حافظے کے گلدان میں بہت سے گلدستے سجے ہوئے موجود ہیں مگر ان کا ذکر طوالت کا موجب ہوگا جو شاید الفضل کے

کالموں کی برداشت سے بھی باہر ہو۔

ارادہ تھا کہ تینوں بھائی یکے بعد دیگر رخصت ہو چکے ہیں یکجائی طور پر ان کا بیان کرسکوں تو ایک کتابچہ بن جائے گا جوان کے لئے بھی دعاؤں کی تحریک کا موجب ہوگا اور میرے لئے بھی۔ مگر ایک تو نامحکم دل مانع ہے دوسرے ایک اندیشہ جان کو لاحق ہے کہ ان شیریں داستانوں اور اس پیار محبت کی محفلوں کا ذکر کرتے کرتے اب ان سے یکسر محرومی اداسی اور تنہائی کہیں مجھے بھی نہ لے بیٹھے۔ بیتے عیش کے دنوں کی یاد کیونکر لکھوں گا ایسے میں میرا قلم لولا اور میری ساری قلبی اور ذہنی طاقتیں بھی جواب دے جاتی ہیں پھر میرے دوست ایک سے بڑھ کر حسنات اور صفات کے مالک تھے۔ پیارے بھائی قریشی صاحب تو عبقری حیثیت کے مالک انسان تھے میرے سوئے جاگے الفاظ کب ان کی تصویر کشی کر سکتے ہیں۔

موت سے مجھے گلا بھی ہے جو میں سمجھتا ہوں کہ شاید بجا بھی ہو کہ یہ آتی ہے تو آتی چلی جاتی ہے اتنا وقفہ بھی نہیں ڈالتی کہ پہلی موت کا زخم کچھ تو بھر جائے یا اس پر کھرنڈ ہی بن جائے۔ کچھ شک نہیں کہ علیم وخبیر رب کریم کی حکمت بالغہ سے سب کام موت وحیات کا چل رہا ہے۔

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آسان ہو گئیں

ایک دفعہ حضرت سیدنا خلیفۃ المسیح الرابع کو میں نے خط میں لکھا کہ حضور عام الحزن تو ایک تھا ''عام'' کی جمع مجھے کسی عالم سے معلوم نہیں ہوسکی میرے لئے تو تین سال مسلسل حزن کے گذرے ہیں اور پھر میں نے اقبال عظیم کا یہ شعر بھی لکھ دیا کہ

پچھلا برس عظیم بہت ہی طویل تھا
میں بوڑھا ہو گیا ہوں اسی ایک سال میں

میں نے لکھا کہ حضور اقبال عظیم پر نا معلوم کیا افتاد پڑی جو اسے ایک سال میں بوڑھا کر گئی حضور نے جواب میں لکھا کہ اقبال عظیم کے شعر نے مجھ پر وجد کی سی حالت طاری کر دی۔ میں نے لکھا کہ میرے لئے دعا کریں کہ میں ان مسلسل تین سالوں کے حزن سے کامیابی کے ساتھ نکل جاؤں، خلفاء احمدیت کی دعاؤں کے صدقے جی رہا ہوں اللہ خلافت حقہ کی نعمت میں ہمیشگی عطا فرمائے۔ پھر یوں ہوا کہ میں ذرا سنبھلا ہی تھا کہ 19/اپریل 2003ء کو حضرت خلیفۃ المسیح الرابع وفات پا گئے اس غم نے رہی سہی کسر نکال دی۔ اب 9/اپریل کو بھائی محمود الحسن قریشی صاحب انتقال فرما گئے۔

ذرہ نواز کے احسانات اور انعامات اور مغفرت کے کارناموں کے کچھ نہ کچھ ہم واقف ہیں امید ہے کہ وہ آقا اور غلام کو اکٹھا مقام

قرب عطا فرمائے گا۔ انا عند ظن عبدی بی کی سند میرے پاس ہے۔

الفضل نے محترم قریشی صاحب کی وفات پر جو خبر شائع کی اس میں انہیں حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد صاحب کے ساتھ ان کے کارخانے میں کام کرنے کی وجہ سے خاص تعلق کا ذکر کیا جہاں تک مجھے یاد ہے قریشی صاحب کے خسر حضرت مولانا اسماعیل صاحب ہلال پوری کا مکان حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد صاحب کی قادیان میں کوٹھی کے قریب تھا اور شاید یہ ہمسائیگی بھی وجہ الفت حضرت صاحبزادہ صاحب موصوف کی بنی ہوگی۔

حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب کا محترم قریشی صاحب سے بے تکلفانہ رسم راہ تھا ہمیشہ ''میاں'' کہہ کر پکارتے تھے اور اس بے تکلفانہ اظہار میں جو خلوص اپنائیت اور ارادتمندی شامل ہے وہ ڈھونڈے سے نہیں ملتی ہاں ایک حضرت شیخ بشیر احمد صاحب سابق جج ہائی کورٹ کی نسبت میرا مشاہدہ ہے کہ وہ بھی بے تکلفی سے یا خوداعتمادی سے ایسی بات کرتے تھے جو سیدھی دل میں اتر جاتی تھی عاجز کو آپ سے ہم نشینی کا شرف حاصل رہا۔

میرے تینوں بھائی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے اور مجھے اکیلا چھوڑ کر۔ 9/اپریل کو دوپہر میری بیٹی نے اطلاع دی کہ قریشی صاحب فوت ہو گئے میں سیدھا الم کدے پر پہنچا وہی گھر جہاں ان گنت خوشیوں اور مسرتوں بھری محفلیں لگا کرتی تھیں۔ میر مجلس کے چہرے پر اپنے رفو شدہ دل کو تھام کر نگاہ ڈالی تو وہ گویا چین سے سو رہے تھے۔ ہمت کر کے ان کی کشادہ پیشانی پر بوسے دیئے اور میاں محمد بخش صاحب کھڑی شریف والوں کا یہ شعر میری زبان پر پھوٹا۔

میلے فیر محمدؐ قسمتاں دے
کتھے شمع تے کتھے پتنگ ہوسی

دل تھا کہ قابو میں نہیں تھا اکٹھے جینے اور مرنے کے عہد و پیمان کئے ہوئے تھے مگر جانے والی روح تو ایک مثالی قربانیاں کرنے والی اور اس نے حسنات ساری عمر جماعت کی خدمت کر کے کمائی تھیں میں نے جب اپنا بقچہ اعمال ٹٹولا وہ تو خالی محض ساری عمر دنیاداری میں گذار دی ہاں خلفاء احمدیت اور خاندان مسیح موعود کے ساتھ عقیدت اور غلامی کا دعویدار ضرور ہوں غرض میت کے قریب ایک الگ کمرے میں گم سم بیٹھا رہا مگر اندر مسلسل شکست و ریخت کا عمل جاری تھا۔ پیر فضل شاہ گجراتی جسے پنجابی زبان کا شیکسپیئر کہا جاتا ہے ان کے اشعار نے میری حالت کی کچھ ترجمانی ضرور کی کہ۔

چپ چپیتا لے گیا جہڑا کنج دلاں نوں موڑے
نہ ضامن نہ کوئی وثیقہ نہ موجود گواہی

میں کنج پہنچاں منزل اتے چارے پلے خالی
کماں پینڈا پیریں چھالے چھڈ گئے سب ہمراہی

جوں جوں اپنے اعمال کی گٹھڑی کو نیک اعمال سے خالی دیکھا تو دل دھک سے بیٹھنے لگا کیسے اس دربار عالی میں حاضری ہوگی دامن تارتار اور گناہوں سے آلودہ خدایا اس زمانے میں حضرت مسیح پاک کو ماننے کے بعد بھی حضرت مولانا برہان الدین صاحب جہلمی کے قول کے مطابق جھڈو کا جھڈو ہی رہا وہ تو روحانیت میں قابل رشک مقام رکھتے تھے میں تو واقعی جھڈو ہی ہوں ایسے میں شعراء کے دیوانوں کو کھنگھالتا ہوں اور ان من الشعر حکمة کی صداقت میرے دل میں گڑ جاتی ہے آسمانی آقا تو ذرہ نواز بھی ہے غفور رحیم بھی۔ گناہ گار ہوں مگر زندگی میں جو میرے سینے میں زخم لگے ان کی وجہ سے مظلومیت کے سہارے ہی معاف فرمادے پھر میرے مرشدوں خلفاء کرام اور سب سے زیادہ حضرت اقدس مہدی معہود کے متعلق جس قسم کی دشنام طرازی اور افترا پردازی کی گئی اس سے ہمارے سینہ وجگر چھلنی ہوئے۔ 1901ء میں حضرت مولوی عبدالرحمن صاحب اور 1903ء حضرت صاحبزادہ سید عبداللطیف صاحب اور پھر 1924ء اور 1925ء میں جس جس طرح ظلم وبربریت کے تماشے چشم فلک نے دیکھے میں نے جب بھی پڑھے تو میرے قلب وجان پر گویا خنجر چلے پھر گھٹیالیاں اور تخت ہزارہ اور مونگ اور پھر چند ماہ قبل موضع سیرے میں ہمارے مخلص بھائی محمد اشرف مہارا کو جس طرح گولیوں سے بھون دیا گیا اور پھر درندہ صفت انسان نے ٹوکے کے ساتھ اس کے ٹکڑے کئے خدا جانتا ہے کہ جب ان کا دعاؤں میں ذکر کرتا ہوں تو اشک بار ہوکر فریاد کرتا ہوں کہ اور پھر مجھے اپنی مظلومیت کی وجہ سے قادر کریم کی عفوومغفرت کی امید بندھتی ہے اور بقول شاعر

تولن والیا پنڈ گناہ دی دکھاں نو وی تول
میرا ذمہ جے عدل ترازو پھر کھائے جا جھول

خوشامد سے طبعاً نفرت رہی ہے اور اسی موضوع پر شعروں کا ایک مجموعہ میرے مجموعے میں موجود ہے حضرت سید میر محمد اسماعیل صاحب نے ایک نظم لکھی تھی جو اسی موضوع پر تھی عنوان اس نظم کا تھا ''دکھاوے کی محبتیں'' اس کے مطالعے سے ایسی بناوٹی اور جعلی محبتوں اور عقیدتوں پر ہر قاری تین حرف بھیجتا ہے ہر تمثیل کے بعد حضرت میر صاحب کا یہ شعر تو گویا شاہکار ہے کہ

ہے محبت فقط دکھاوے کی
اہل دنیا کا ہے یہی شیوہ

برادرم قریشی صاحب مرحوم کو 60/65 سال بہت قریب سے دیکھا ان میں ایسی قابل صد نفرین خصلت کا شائبہ بھی نہیں تھا نرا خلوص خالص محبت ایثار ہمدردی اور دستگیری ان کا شیوہ تھا ایسے شخص سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوجانے سے دل بہت غمگین ہے۔ بہرحال صبر ہی

کرنے کا حکم ہے دلی دکھ اپنی جگہ مگر ہم آہ و بکا کے قائل نہیں۔

محترم قریشی صاحب آخری دنوں میں پہچانتے نہیں تھے مگر میں جب بھی گیا تو پہچان کر میرے ہاتھ کو بوسہ دیتے تو میں بھی دل کی حسرتیں نکال لیتا یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ برادرم قریشی کی زندگی کے آخری دنوں میں آپ کے دونوں بیرون ملک رہنے والے بیٹے عزیزم سعید احمد اور ان کا بیٹا عزیزی رومی کینڈا سے اور عزیزی رشید احمد صاحب اور ان کی بیگم لندن سے اور عزیزم رشید احمد کا ایک بیٹا بھی زندگی میں دادا جان کو مل کر گیا تھا۔ آپا موصوفہ بیگم صاحبہ نے باوجود کبرسنی کے اور باوجود کئی علالتوں میں مبتلا ہونے کے رات دن وہ خدمت اپنے نامور خاوند کی کی جو ایک روشن مثال ہے۔ اس طرح عزیزم مجید احمد نے تو بہت طویل عرصہ تک اپنے ابا کی خدمت کی اور ایک نام پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی جناب پاک سے بہترین صلہ دے۔

ربوہ کا آخری سفر ہم نے اس دن اکٹھے کیا جب ایڈیشنل سیشن جج چنیوٹ نے سیدنا حضرت مرزا مسرور احمد صاحب کی ضمانت قبل از گرفتاری نامنظور کی اور انہیں ان کے ساتھیوں کو ایک رات ربوہ تھانے میں رکھ کر جھنگ جیل میں منتقل کیا جانا تھا۔ ہم دونوں تھانے ربوہ کے قریب پہنچے تو قریشی بھائی ڈرے کہ شاید پولیس والے ملاقات نہ کرنے دیں اس لئے امور عامہ سے مدد لی جائے میں نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ورنہ عزیزم خالد محمود صاحب میلہ R.M کو ساتھ لے کر ملاقات کر لیں گے وہ تو خیر گزری کسی نے ملاقات سے نہ روکا۔ حضرت صاحب اور اور محترم کرنل ایاز محمود صاحب اور دیگران سے کافی دیر ملاقات کی مگر یہ شعر پڑھتے پڑھتے ہی سرگودھا پہنچے۔ کہ

چلائے کوئی جا کے مزار مسیح پر
نصرت جہاں کی گود کے پالوں کو لے گئے

اس وقت یہ شعر اور کئی دوسرے اشعار حضرت نواب مبارکہ بیگم صاحبہ نے کہے تھے جب حضرت صاحب کے حضرت دادا جان اور حضرت ماموں جان جو واقعی نصرت جہاں کی گود کے پالے ہوئے تھے انہیں ناکردہ جرم میں گرفتار کر لیا گیا تھا مگر یہ ابن مسیح کوئی تھانے یا جیل میں جانے والے وجود تھے؟ برا ہو تعصب کا اور دشمنی کا۔

ربوہ کے سفر بہت ہم نے اکٹھے کئے اور ڈرائیور قریشی بھائی کا میں ہی ہوتا تھا لیکن 1984ء میں جب حضرت صاحب لندن تشریف لے گئے تو قدرتی طور پر ربوہ آنے جانے میں کمی آ گئی۔ میرے واجب الاحترام استاد حضرت چوہدری محمد علی صاحب مضطر نے جس خوبصورتی سے اس کیفیت کو بیان کیا یہ انہیں کا حصہ ہے۔

شہر کا ناز تو شہر سے جا چکا
کس لئے آئے ہو اب میاں شہر میں

لے گیا اپنے ہمراہ سب رونقیں
وہ جو تھا اک حسیں نوجوان شہر میں

آخر میں میں سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایداللہ کی نوازشات کریمانہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ میرے نزدیک سب تعزیتی پیغامات سے بڑھ کر حضور انور کا تعزیت نامہ ہے اپنے غلام صادق اور خادم وفا کیش کا ذکر خطبہ جمعہ میں بھی کیا اور پھر ہزار ہا مخلصین کے ساتھ جنازہ غیب پڑھایا جو مرحوم کی درجات کی بلندی کی روشن علامت ہے۔فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔دعا کریں مرحوم بھائی کی مغفرت کے لئے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنا خاص مقام قرب عطا فرمائے اور یہ خاکسار متواتر یہ دعا کر رہا ہے۔ہمیں تو وہ قلب وجان پر زخم لگا کر چھوڑ گیا اللہ اس کے ساتھ وافر رحمت کا سلوک فرمائے تا وہ خورسند رہے۔آمین یارب العالمین۔

ان کی جدائی میں اپنا تو یہ حال ہے کہ۔

جس طرح دیہات کے اسٹیشنوں پر دن ڈھلے
اس سکوت مضمحل گاڑی گزر جانے کے بعد

یااللہ رحم فرما اور میرا انجام بھی بخیر فرما تجھے سب زور وقدرت ہے خدایا۔

(روزنامہ الفضل 4رجون 2007ء صفحہ 3 تا5)

۞۞۞۞۞۞۞۞۞

اے بسا آرزو کہ خاک شُد

میں نے بیرونی ممالک کے سفر گذشتہ صدی کی ساتویں دہائی میں شروع کئے تھے اوّل تو میں افغانستان چار پانچ مرتبہ گیا۔پشاور سے 40ر45 منٹ کا ہوائی سفر تھا۔وہاں مجھے حضرت صاحبزادہ سید عبداللطیف صاحب،حضرت مولوی عبدالرحمن صاحب اور حضرت مولوی نعمت اللہ خان صاحب اور دیگر جان فروشوں کے نقوش پا کی تلاش رہی اور اس خونی میدان کی نشاندہی کروائی جہاں پر عرش کے مالک نے اپنی خاص تقدیر اور خاص حکمتوں کے ماتحت اس گروہ صالحین کو کمال خوشدلی کے ساتھ اپنی مقدس جانیں جان آفریں کے حضور پیش کرتے ہوئے دیکھا۔وہ ان سے راضی تو ہو گیا مگر اس پر وہ چپ تو نہ رہا اور انہی دنوں دام نقد اس ظالم قوم اور اس کے بادشاہوں کو عذاب شدید میں مبتلا کر دیا۔یہ ظالمانہ کاروائیاں 1901ء میں شروع ہوئیں اور ربع صدی تک مسلسل جاری رہیں۔کئی بے گناہوں کا خون ارض کابل نے پیا۔

آج اس پر پورے ایک سو سال گزر چکے ہیں۔ مالک الملک کے غیظ وغضب اور اس کے انتقام کے لئے کسی تاریخ کی ورق گردانی کی حاجت نہیں اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود ذوالانتقام کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ وہ اپنے پیاروں کے لئے غیرت دکھا رہا ہے۔ وہ ملک افغانیاں جو اللہ کی نظروں سے گر گیا تھا ہر روز اس دور کے راستباز اور صادق کا قول کہ ''ظالم کی پاداش باقی ہے'' کی سچائی ثابت کر رہا ہے۔ وہ تو میرے علم کے مطابق تعداد میں پانچ صلحاء تھے جنہوں نے اپنا خون بہا کر ایمان وایقان کی کھیتی کو سیراب کیا اور جو آج بھی سر سبز ہے اور قیامت تک پھول اور پھل دیتی رہے گی مگر وہ ظالم اور سفاک ملک اللہ کی چکی میں آج بھی پس رہا ہے اور اس کا کچھ باقی نہیں رہا۔ بس نشان عبرت ہی باقی ہے۔

اس کے بعد 1975ء میں سفر یورپ اختیار کیا اور پھر کئی سال مسلسل یورپ اور امریکہ جاتا رہا۔ اس سال پھر سفر یورپ کا ارادہ ہے۔ گو موانع بہت ہیں جب مغربی ممالک کے ویزے مل گئے تو ایک زبردست خواہش نے کروٹ لی کہ یہ میری زندگی کا آخری سفر معلوم ہوتا ہے راستے میں سرزمین حجاز پڑتی ہے۔ معلوم کہ حرمین شریف میں میرا داخلہ ممنوع ہے مگر سارا خطہ عرب ہی میرے مرشد کا آقا ﷺ کا مسکن ہے اور جہاں پر اللہ کا بیت عتیق ہے اس ملک میں تو قدم دھرنا منع نہیں ہے۔ مجبوراً ان مقامات مقدسہ سے دور رہ کر ہی آتش ہجر کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

چنانچہ ریاض میں ایک عزیز کو خط لکھا کہ اگر ممکن ہو تو دور یا نزدیک کہیں سعودیہ میں آنے کا بندوبست ہو جائے تو زہے قسمت۔ اس برخوددار نے جوابی فیکس کے ذریعے حامی بھری اور مجھے پاسپورٹ وغیرہ سفری کاغذات فیکس کے ذریعہ بھجوانے کو کہا جو میں نے بھجوا دیئے۔ ساتھ وضاحت کر دی کہ میرے لئے ٹیکسی اور مناسب گائیڈ کا انتظام کر دیں۔ میں آپ کی مصروفیت میں کسی صورت مخل ہونا نہیں چاہتا۔ وغیرہ

یہ پیش بندی اس لئے کر دی تا وہ اپنی کسی مجبوری یا مصروفیت کی بنا پر میری راہنمائی کرنے سے بھی دستکش نہ ہو جائے۔ اس نے ویزہ سعودی گورنمنٹ سے لے کر بھجوا دیا۔ جو کچھ دن انتظار کے بعد میں دیگر کاغذات مکمل کر کے 18 رجون 2001ء کو سعودی عرب کے آفس میں پہنچ گیا۔ کاؤنٹر پر ایک شخص بیٹھا تھا جو ضلع گجرات کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا اور بالواسطہ مجھے جانتا بھی تھا میری باری آئی تو مجھے ایک سرٹیفکیٹ سرگودھا سے لانے کے لئے کہا۔ میں نے کہا وہ دستاویز سعودی عرب بھجوائی تھی جو مجھے ویزہ دلانے کا موجب بنی۔ اب اتنا سفر کر کے سرگودھا جانا اور راتوں رات کاغذ پھر تیار کروا کر واپس آنا مشکل ہے مگر چونکہ وہ مجھے پہچانتے تھے۔ شاید اس لئے اپنے حکم کی تعمیل پر اصرار کیا۔ ان دنوں اسلام آباد، پاکستان میں جھلسا دینے والی گرمی تھی۔

میں واپس آیا رات کاغذ تیار کروانے میں گزری۔ علی الصبح پھر عازم اسلام آباد ہوا کاغذات پیش کئے تو مژدہ جانفزا سنا کہ اب

تمہارے کاغذات مکمل ہیں۔ انتظار کرو ڈھائی بجے دو پہر تک آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ لوگ آتے جاتے رہے ویزے لے کر فارغ ہوتے رہے ہم جب بھی دریافت کرتے تو جواب ملتا ابھی تمہارا کیس اوپر سے نہیں آیا۔ پھر معلوم ہوا ''ابھی کیس واپس نہیں آیا'' اب تو تشویش بڑھی۔ آخر تھوڑی دیر بعد انہی صاحب نے کہا کہ تم ''قادیانی ہو'' میں نے اثبات میں جواب دیا پھر تمہاری سعودی عرب کے ویزے کی درخواست رد کی جاتی ہے۔ میں نے کہا سعودی عرب میں میں نے جو کاغذات بھجوائے تھے اس میں کچھ چھپایا نہیں تھا پاسپورٹ پر صاف ''احمدی'' لکھا ہوا تھا۔ پھر کل سے آپ نے میرا فارم جس پر ''احمدی'' لکھا ہوا ہے دیکھ رہے ہیں تو کل ہی انکار کر دیتے۔ پھر میں نے پوچھنے کی جسارت کی کہ ریاض میں کوئی غیر مسلم نہیں جاتا جواب ملا جاتے ہیں مگر تمہیں جانے کی اجازت نہیں ہے۔

دھرے سفر کی صعوبتیں اور پھر یہ غیر متوقع لا جواب جواب سن کر بے حد دل شکنی ہوئی۔ ایک عزیز میرے ساتھ تھا۔ آگے سے سرگودھا کا ایک مجسٹریٹ بھی ہم سفر ہو گئے۔ انہوں نے بھی اور پھر سرگودھا پہنچ کر دوستوں اور اعزاء کی بھی ''تعزیت'' کا اظہار کیا۔ مگر میں جو پورے ایک مہینے سے عالم تصور میں سرزمین حجاز میں گھوم پھر رہا تھا پھر کسی کی دلداری اور غمخواری نے کچھ کام نہ کیا مگر میرے زخم دل ہرے ہی ہو جاتے رہے۔ یہ تصورات اور تخیلات کی دنیا بھی ایک لحاظ سے نعمت ہے کہ اور کچھ نہ بن پڑے تو شیریں لمحات میں مگن رہ کر دل کے بہلاوے کا کچھ سامان کر لیتے ہیں۔ ایک ماہ کے دوران کبھی میں کسی عرب افسر سے لجاجت سے درخواست کر کے اپنے دل کے ارمان نکالتا کہ مجھے حرمین شریفین سے کتنے دور تک اجازت دیں گے اور پھر دس بارہ میل دور مقام حدیبیہ کا تعین کروانے کی خواہش کرتا اور وہاں اگر میسر آئے تو قربانی کا ایک جانور ذبح کرنے کا ارادہ کرتا مجھے سعودیہ سے ویزا آ جانے کے بعد پختہ امید بندھ چکی تھی کہ اب سرزمین حبیب میں پہنچا کہ پہنچا اور کسی کے یہ شعر سوتے جاگتے زبان پر ہوتے کہ

غم کے مارو چلو وہیں پہ چلیں
بے ٹھکانوں کا جو ٹھکانہ ہے
میں سفر میں ہوں اور میری منزل
شاہ والا کا آستانہ ہے

پھر یوں تو سیدنا حضرت امام انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شاہ دوسرا تھے اور پھر ہر ٹھکانہ حضور ہی کا ٹھکانہ ہے۔ ہر بستی اور ہر شہر اور ہر ملک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہی آستانہ ہے۔ بلکہ ہر دل حضور کا آستانہ ہے مگر فاصلے کے قرب سے دل میں ایک ہیجانی کیفیت کا پیدا ہونا عین فطری معاملہ ہے۔ مجھے بھی اس کی تمنا تھی پوری نہ ہوئی اور برادرم جناب ثاقب زیروی صاحب کی اور میری بھی یہ پرانی آرزو ہے کہ۔

کبھی تو آئے گا وہ زمانہ کبھی تو ہو گا مرا بھی جانا
کہوں گا روضے پہ سر جھکا کے درود تم پر سلام تم پر

ورنہ ثاقب بھائی دور بیٹھ کر بھی وہ درود وسلام تو بھیجتے ہی رہے ہیں اور بقول برادرم مکرم ومحترم مرحوم ملک محمد اقبال ایڈوکیٹ سرگودھا کے پاکستان کے بہترین نعت گو شاعر ہیں اور سیدنا رسول عربی ﷺ کی محبت سے سرشار ہوکر اور مستی کے عالم میں شعر پڑھتے ہیں۔ میں نے لاہور سے ریاض اور ریاض سے واپسی کا سعودی ایئر لائن کا ٹکٹ بھی خرید لیا تھا۔ سیٹ بھی 30/جون کی OK کروالی تھی مگر صد حیف کہ میری کمند تمنا جب دو چار ہاتھ لب بام رہ گیا تو ٹوٹ گئی۔ ٹکٹ واپس کیا کچھ کٹوتی بھی ہوئی۔ یوں بھی تین چار دن شدید گرمی کے دنوں میں سفر میں رہا۔ اخراجات بھی بہت ہوئے مگر دل آزردہ کو اس قدر شدید رنج پہنچا کے وہ بے اختیار قادر الکل کے حضور بہہ پڑا اور اپنی بے بسی اور محرومی اور مظلومیت کا خوب نوحہ کیا۔

میرے سعودی ویزے کے فارم پر ''احمدی'' ہونے کی وجہ سے انکار والا حکم میں نے لیا جو سنبھال کر رکھا ہوا ہے میرے سفر آخرت کے ویزے کے آنے میں اب کیا دیر ہے؟ یہ ظالمانہ حکم عادل حقیقی اور حاکم عرش معلیٰ کو دکھاؤں گا۔ یہاں تو قدم قدم پر رکاوٹیں ہیں زبان وقلم پر قدغنیں ہیں۔ روز محشر تو ان ظالمانہ قوانین کے خالق مجھے نہیں روک سکیں گے۔ وہاں تو عین عدل ہوگا۔ نہ معلوم اس روز ان ظالموں پر کیا گذر رہی ہوگی وہاں تو دم مارنے کی جا نہیں اگر عادل حقیقی نے اذن بخشا تو اپنا پاش پاش جگر اور اس پر مسلسل لگنے والے زخموں کی کہانی ضرور عرض کروں گا۔

بہرحال اس صدمے سے میرے سینے کا شیشہ تڑخ گیا۔ اپنی بے بسی اور محرومی کا ملال میرے جسم وجان پر اتنا اثر انداز ہوا کہ درد و کرب کے تلخ ذائقے سارے جسم وجان پر متولی ہو گئے۔ اور بے چارگی میں ثاقب بھائی کے ہی اس شعر کا سہارا لیا کہ آج نہیں تو کل

اک موج بہالے جائے گی سب ریت پہ لکھی تحریریں
اس مالک کے ہاں دیر تو ہے اندھیر نہیں وقت آنے دو

قانون وضوابط کی رکاوٹوں کے باعث ہمت نہیں پڑتی تھی تو خاموش تھے۔ اب کامیابی کی امیدیں بندھیں اور پھر ٹوٹ گئیں کچھ دن گزرے تو دل کو تسلی دی کہ یہ پہلی ''شکست فاتحانہ'' تو نہیں ہمارے نصیبے میں شروع سے ہی ایسے غم والم رکھے گئے تھے۔ کون سا ظلم وستم ہے جو زمانے نے ہمارے لئے روا نہیں رکھا اور کون سا تیر مخالفین کی ترکش میں تھا جو ہم پر نہیں پھینکا گیا۔

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

نہ معلوم ہماری بےبسی ابھی اور کیا کیا زخم پہنچائے گی۔ میرا نہ کوئی دنیاوی مقصد تھا نہ عزیزوں سے ملاقات یا اور کوئی خواہش۔ بس ارض پاک کے ذرات کو چھونے اور انہیں بوسہ دینے کی تمنا تھی۔ صرف یہ آرزو تھی کہ **ان تھلک ھذہ العصابتہ فلن تعبد فی الارض ابداً۔ انا النبی لا کذب انا ابن المطلب۔** اور کبھی طائف کے لفنگوں نے جب میرے آقا و مرشد ﷺ کے جسد اطہر کو لہولہان کر دیا پھر بھی اسی سراپا رحمت نے **اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون** کی دعا ہی کی تھی۔ ان مقامات کی تلاش تھی جہاں پر یہ جاں گسل مناجات اور حیات بخش ابدی صداقتیں جاری ہوئی تھی۔

کاش ان روح پرور آسمانی صداؤں کی بازگشت اس وقت میرے کانوں میں گونجتی جب اس پاک زمین پر میں سجدہ ریز ہوتا پھر اس توحید پرست اور ایمان ویقین کی مضبوط چٹان کی وہ آواز میری سماعتوں کو نصیب ہوتی جو صرف اسے ہاں صرف اسے ہی سوجھی تھی اور بڑے بڑے مقربین حضور اقدس کی محبت میں ہوش وحواس کھو بیٹھے تھے مگر اس مرد قلندر نے آسمان سے نور پا کر اعلان کیا تھا کہ سنو من کان یعبد محمداً فان محمداً قد مات، ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حی لا یموت اور پھر اس زمانے کی ایجادات سے صدیوں سے قبل آسمانی اور روحانی لاسلکی کے ذریعہ سے یا ساریۃ الجبل کے نعرہ کی بازگشت سننے کے لئے بے چین تھا جو دور بہت دور اسی طرح سنا گیا تھا جس طرح آج کے سائنسی وسائل کے ذریعہ ہم دور کی آوازیں سن سکتے ہیں مگر اس زمانے میں عقل وسمجھ سے ماورا ایک غیبی وائرلیس کا سلسلہ تھا جو سیدنا حضرت عمرؓ بن خطاب کو عطا ہوا تھا۔

میں بے نوا اور بے بس ہوں لیکن یہ میرے ایمان کا حصہ ہے کہ جس طرح چودہ سو سال سیدنا رسول عربی ﷺ کا تحفہ فضاؤں میں خوشبوئیں بکھیرتا رہا اور عین چودہ صدیوں بعد صحیح صحیح اپنے ٹھکانے پر اس خوش نصیب کو وہ انمول آسمانی عطیہ موصول ہوا میں نے اس نادر پیغام کے منتہیٰ کو اور اس کے مرسل کو دیکھا اور میری خواہش تھی کہ اس کے مقام اجراء کو بھی تو اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ پھر اس مقام پاک کو دیکھنے کی خواہش کہ جس جگہ ام الکتاب نازل ہوئی اس قدر شدت پکڑ گئی تھی کہ میں اس لمحہ مبارکہ کے لئے حد درجہ بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اور ارض پاک کو دیکھنے کی امید بندھ گئی تھی کہ سعودی عرب نے ویزہ باوجود میرے احمدی ہونے کے جاری کر دیا مگر میری حرماں نصیبی کہ پاکستانی ویزا افسر نے انکار کر کے میری ساری آرزوؤں اور تمناؤں پر پانی پھیر دیا۔ اور میں ایک طرف اپنی خواہشات اور امیدوں کو دیکھتا ہوں دوسری طرف حسرت بھری نگاہوں سے ان زخموں کی طرف جو تعصّبات کے عفریت کے جبڑوں میں ہلاک ہونے والی انسانیت کے ہاتھوں اس سلوک پر جو میرے ساتھ کیا گیا نگاہ کرتا ہوں۔ تو احمد فراز کا یہ شعر میری حالت زار کا بیان بن جاتا ہے۔

دیکھو وہ میرے خواب تھے دیکھو یہ میرے زخم ہیں
میں نے تو سب حساب جاں برسرِ عام رکھ دیا

میں نے غور کیا کہ کیوں مجھے عرض پاک کو چھونے کی اجازت نہیں ملی آخر میرا قصور مجھے بتایا جائے جتنی قدغنیں قوانین نے مجھ پر لگائی ہیں انہیں بادل نخواستہ تسلیم کرتا ہوں اور اس قید میں اپنے آپ کو مقید بناتا ہوں اور ان احکام کے جائز اور ناجائز کی بحث میں نہیں پڑتا مگر یہ کیا کہ اس خطہ عرب کے طول وعرض میں کہیں بھی مجھے قدم رکھنے سے اس لئے منع کر دیا گیا کہ میں ایک عقیدہ رکھتا ہوں جس سے کسی کو اختلاف ہے اگر وہ سن لیں کہ۔

طاقتیں تمہاری ہیں اور خدا ہمارا ہے
عکس پر نہ اتراؤ آئینہ ہمارا ہے

میں نے اس غم والم کو اور اس ظالمانہ اقدام کو کچھ دن تو سینے میں چھپائے رکھا مگر پھر یہ حالت ہوگئی کہ اظہار کے بغیر چارہ نہ رہا اور میں نے اپنے آقا و مرشد کے قول میں عافیت ڈھونڈ لی کہ

میں اس آندھی کو اب کیوں کر چھپاؤں
یہی بہتر کہ خاک اپنی اڑاؤں

❁❁❁❁❁❁❁❁❁



حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی بیماری کے متعلق

آقائے قادیانی کی علالت اور ہمارا فرض

قوم احمد جاگ تو بھی جاگ اس کے واسطے
اَن گنت راتیں جو تیرے درد سے سویا نہیں

یوں تو حضرت صاحب کی طبیعت تین سال سے کمزور چلی آرہی تھی لیکن چونکہ غلبہء دین حق کے لئے شب و روز پورے انہماک کے ساتھ حضور مسلسل جدوجہد کرتے رہے نہ بیماری کی پرواہ کی نہ جسم کو جتنا آرام مطلوب تھا وہ مل سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روز بروز علالت میں اضافہ اور پیچیدگی پیدا ہوتی گئی حتیٰ کہ بلڈ پریشر، شوگر اور دل کے امراض نے پریشان کن اور فکر انگیز صورت پیدا کر دی۔

حضور کے ادب، رعب اور جلال کے آگے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ علاج کی طرف توجہ دلائے یا آرام کرنے کی گزارش کرے۔ انسان آخر انسان ہے۔ بیماریوں میں اتنی شدت پیدا ہوگئی کہ بالآخر حضور کو دو آپریشن کرانا پڑے۔ مقام شکر ہے کہ دونوں آپریشن کامیاب ہو گئے اور حضور روبصحت ہیں الحمدللہ۔ مگر حضور کو نقاہت بہت ہے۔ جب سے حضور کی علالت کی خبریں آنا شروع ہوئیں ساری دنیا میں پھیلی

ہوئی جماعت احمدیہ کے افراد دعاؤں، نوافل اور صدقات میں مشغول ہو گئے۔ یہ عاجز راقم بھی آہ و زاری کے ساتھ غریبانہ دعاؤں میں لگا ہوا ہے۔ آج اس مختصر سے مضمون کے ذریعہ دوستوں اور مخلصین کی خدمت میں مزید دعاؤں کی تحریک کرنا مقصود ہے۔

عنوان میں جو شعر لکھا ہے وہ سیدہ حضرت نواب مبارکہ بیگم صاحبہ کی ایک نہایت روح پرور اور ایمان افروز نظم سے لیا گیا ہے جو آں ممدوحہ نے سیدنا حضرت مصلح موعود کی بیماری کے دوران حضور کی شفاء یابی کے لئے دعاؤں کی تحریک کی غرض سے نہایت احسن اور اچھوتے انداز میں لکھی تھی اور اوپر والا شعر حضرت مصلح موعود کے لختِ جگر حضرت امام رابع ایدہ اللہ کی ذات ستودہ صفات پر بھی حرف بحرف صادق آتا ہے۔

گذشتہ 18 سالہ ہنگامہ خیز دور میں حضور کو پاکستان سے کیا کیا المناک خبریں ملتی رہیں قید و بند اور گرفتاریوں اور پابند سلاسل ہونے کی وحشت ناک اطلاعات پولیس کے وحشیانہ تشدد کے ''کارنامے'' بھی حضور نے سنے، قتل و غارت گری کے واقعات تو کہیں اللہ کے گھروں کو گرانے اور افراد جماعت کے گھروں کو گرانے اور جلانے کی اطلاعات کہ جس سے دل و جان پر لرزہ طاری ہو جائے حضور کو پہنچتی رہیں۔ حضور راتوں کو جاگ جاگ کر اللہ سمیع و مجیب کے حضور کس کس طرح آہ و زاری کرتے رہے اور شاذ ہی کوئی رات گزری ہو جو حضور چین سے سوئے ہوں۔ جب بھی کوئی شریف انسان تاریخ کے اس خونیں باب کو پڑھے گا تو ظالموں اور وحشیوں کی ایسی ''خدمات جلیلہ'' پر نوحہ کرے گا۔

حضور کا ردعمل تو ان بہیمانہ کارروائیوں پر حد درجہ درد انگیز ہوتا تھا کیونکہ سارے افراد جماعت کا سارا درد ایک قلب مطہر میں جمع ہو جاتا تھا۔ جو ہر احمدی تو انفرادی طور پر مصیبت جھیل رہا ہوتا تھا مگر سارے احمدیوں کے دکھوں اور دردوں کی چوٹ حضور کے جسم و جان پر پڑتی رہی اور حضور ان کا ذکر حد درجہ دردمندی اور دل سوزی سے فرماتے تو حضور کی آواز روندھ جاتی تھی۔

آج حضور کی علالت طبع پر سیدہ ممدوحہ کی روح پاک عالم بالا سے جماعت کو جھنجھوڑ کر جگا رہی ہے اور آج پھر اسی طرح جماعت کے مخلصین سے مخاطب ہے جس طرح گذشتہ صدی کی پانچویں دھائی میں اپنے نامور اور عالی مقام برادرِ اکبر کے لئے نہایت درجہ بیقراری کے ساتھ اور کمال اضطرار کے ساتھ پکارا تھا۔ کہ

قوم احمد جاگ تو بھی جاگ اس کے واسطے
ان گنت راتیں جو تیرے درد سے سویا نہیں

ہمارا تو واحد ہتھیار دعا ہی ہے حضرت مسیح موعود کا قول صادق کہ ''جو کچھ ہو گا دعا سے ہو گا'' ہمارا ماٹو ہے۔ سیدنا حضرت علی المرتضیٰ کی یہ دعا کہ **اللھم اغفر لمن لا یملک الا الدعاء** کہ اے میرے پروردگار اس کو تو بخش دے جس کے پاس سوا دعا کے اور کوئی وسیلہ نہیں ہے۔

ہر چند مجھے یقین ہے کہ جماعت احمدیہ کے کروڑوں مخلصین حضرت اقدس کی صحت و سلامتی کے لئے ہمہ تن دعا بن چکے ہیں مگر حصول ثواب کی خاطر درج ذیل چند سطور کے ذریعہ میں بھی پہلے سے جاری تحریک کو مہمیز لگاتا ہوں۔

دعا کے لئے ضروری ہے کہ حضور کے احسانات اور شخصی محاسن اور محامد کو مدنظر رکھا جائے۔حضور کی دین حق کی اشاعت اور غلبہ کے لئے انتھک مساعی جمیلہ اور جماعت کے ہر فرد کی بھلائی اور بہبودی کے لئے شب و روز حضور کی فکرمندی اور اس غرض کے لئے حضور کے عملی منصوبوں اور دعاؤں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے رہے۔حضور کے دور میں جماعت کو جو بے نظیر ترقیات اور فتوحات نصیب ہوئیں اور چار دانگ عالم میں جس طرح دینِ حق کا ڈنکا بجایا گیا توحید باری تعالیٰ اور شان محمدی، شرف انسانی، عظمت بشر، احترام آدمیت کے بارہ میں حضور کے خطابات اور تقاریر سے انسانیت کو جو وجدان اور شعور ملتا تھا اور قلب و روح کو جو ولولہ تازہ ملتا تھا یہ اور اس کے علاوہ ان گنت حضور کی خدمات دینیہ اور احمدیت کے لئے سرفروشانہ مساعی پر سب کچھ یاد کر کے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عاجزانہ مناجات کی جائیں۔

حضور کی زبان مبارک سے قرآن کریم کے معارف سنتے تو دل یقین سے لبریز ہو گیا کہ آپ کا وجود گرامی ایک معجزہ ربانی ہے ایک طرف حضور کے سنہری کارنامے آنکھوں کے سامنے اور ذہن میں مستحضر ہوں تو دوسری طرف اپنی اور ساری جماعت کی بے بسی اور مظلومیت اور کوتاہ دامنی کا احساس دماغ پر مستولی ہو تو حضور کی کامل صحت و عافیت کے ساتھ سلامتی کی ضرورت الٰہی اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ دل بے قرار ہو جاتا ہے اور انسان جس قدر بے بسی سے ہاتھ پھیلاتا ہے تو رؤف رحیم خدا بڑی تیزی سے داعی کے پاس آ جاتا ہے کہ قرآن کریم میں ”انی قریب“ کا وعدہ خود مالک الملک کا ہے۔ جو مژدہ جانفزا سب انسانوں کے لئے ہے۔

بعض اوقات اللہ تعالیٰ بظاہر دعا قبول کرنے میں تاخیر فرماتا ہے بندہ بے صبرانہ ہو کہ بعض اوقات علیم و حکیم اپنے بندے کا ذوق طلب بڑھانے اور آتش شوق بڑھانے کے لئے قبولیت دعا میں دیر کرتا ہے تو اپنے بندے کو کندن بنانے کے لئے نہ کہ تعزیر کے طور پر۔ چاہئے کہ زاویے بدل بدل کر اور لہجے تبدیل کر کر کے دعا کی جائے۔ کہ دعا ہم غریبوں بے نواؤں اور کمزوروں کا واحد سہارا اور روحانی ڈھارس ہے۔

یقین کامل ہو بے ریا توکل ہو اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا عرفان نصیب ہو اور پھر عطائے لم یزل پر ناز ہو تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی برکھا ضرور برسے گی۔ اور ہماری تشنگی اور پژمردگی اور پریشانی چشم زدن میں دور ہو جائے گی اور ہاں پھر عرض کرتا ہوں کہ اگر اس میں تاخیر بھی ہو تو رحمت، مغفرت اور اس کے فضل کی علامت ہے اس کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔

آتا ہے فقیروں پر پیار کچھ ایسا
خود بھیک دے اور خود کہے منگتے کا بھلا ہو

حضرت اقدس مسیح موعودعلیہ السلام نے دعا کی حقیقت اوراس کے اثرات کواس طرح وضاحت سے اپنی تحریرات اورملفوظات میں منکشف فرمایاہے گویا خود انگلی پکڑ کر دربارالٰہی میں پہنچادیاہےاوراس کانتیجہ یہ ہوا کہ جماعت کے مخلصین کااوڑھنا بچھونا دعاہی بن گیااور بڑے بڑے عجائبات اورمعجزات ہزارہالوگوں نے خود دیکھے۔مستجاب الدعوات بزرگوں کی تعداد ہماری جماعت میں شمار سے باہر ہے۔

حضرت چوہدری محمدظفراللہ خان صاحب تلونڈی عنایت خان ضلع سیالکوٹ کے ایک بزرگ حضرت چوہدری محمدحسین صاحب باجوہ (والد ماجد حضرت قبلہ چوہدری عزیز احمد صاحب باجوہ سیشن جج) کا ذکر فرمایا کرتے تھے کہ وہ فرماتے کوئی مشکل درپیش ہو یا کوئی حاجت ہوتواندھیرے کمرے میں اندر سے کنڈی لگا کروضوکر کے اللہ کے حضورنمازشروع کر دیتاہوں اوراتنے درداورالحاح سے عاجزی سے قادرکریم کی قدرت کا واسطہ دے کرگویااللہ تعالیٰ کے پیروں پر پڑ جاتا ہوں اورروروکرمناجات کرتا ہوں کہ تو میرا آقااور میں تیرا غلام۔اس درکو چھوڑکراورکہاں جاؤں اس دہلیز پر سے سرنہیں اٹھاؤں گا جب تک میری حاجت پوری نہ فرمااوروہیں میری مشکل کشائی ہو جاتی ہے۔

حضرت مسیح پاک فرمایا کرتے تھے ٔر گدا بننا چاہیئے یہ رویّہ ہو کہ بھیک جب تک کشکول میں نہیں پڑے گی رب کریم کے در سے نہیں جاؤں گا۔

یہ حضرت مسیح پاک کے جس رفیق کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے انہوں نے دلبستان محمدؐ سے یہ سبق سیکھااور بیاض مسیحائے محمدی سے یہ نسخہ کیمیاان کے ہاتھ آیاتھا۔

حضورکی منظوم مناجات میں یہی مضمون وضاحت سے ملتاہےاورحضورکمال رجائیت سے پورے مان سے عرض کرتے ہیں۔

خواہی بہ قہرم کن جدا
خواہی بہ لطفم رونما
خواہی بکش یا کن رہا
کے ترک آں داماں کنم

کہ میرے مولاخواہ تو مجھے جبر سے ہٹادے خواہ کرم فرما کراپنا چہرہ دکھلائے خواہ تو مجھے ماردے یارہائی بخش دے۔ہرحالت میں تیرا دامن میں نے نہیں چھوڑنا۔

حضرت مسیح موعودعلیہ السلام کودعا کرتے کرتے اللہ تعالیٰ کواس کے محبوب ترین بندے اوراکمل اوراعلیٰ اورکامل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دے کرمناجات کرتے ہیں۔

اے خدا وندم بنام مصطفیٰ
کش شدی در ہر مقامے ناصرے
دست من گیرازرِہ لطف و کرم
در مہم باش یار و یاروے
تکیہ برزورے تو دارم گرچہ من
ھمچو خاکم بلکہ زاں ھم کمترے

(ترجمہ) اے میرے خدا تجھے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دے کر عرض کرتا ہوں جس کی تو نے ہر مقام پر نصرت فرمائی۔ کہ میرا ہاتھ پکڑ لطف و کرم کے ساتھ اور میری مہمات میں میری یاوری کر۔ میرا تجھی پر توکل ہے اگرچہ میں خود تو خاک کے برابر ہوں بلکہ اس سے بھی کم تر۔ مگر حضور کو اللہ تعالیٰ پر کامل توکل تھا اور اللہ تعالیٰ حضور کی ساری امیدوں کی آماجگاہ تھا۔ عطائے خداوندی پر ناز اور مان کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں۔

تجھے دنیا میں ہے کس نے پکارا
کہ پھر خالی گیا قسمت کا مارا
تو پھر ہے کس قدر اس کا سہارا
کہ جس کا تو ہے سب سے پیارا

الغرض دعائیں سارے احباب جماعت حضرت صاحب کی صحت و عافیت کے لئے کر رہے ہیں۔ میں محبت کے ساتھ اور ادب کے ساتھ اور عاجزی کے ساتھ یہ عرض کرتا ہوں کہ جتنا بلند مقصد ہو اتنی ہی دعاؤں میں عاجزی اور استقلال اور دوام اختیار کرنا پڑتا ہے۔

جماعت کے سارے مرد بھی خواتین بھی بچے بھی بوڑھے بھی بھیک منگوں کی طرح پوری عاجزی، کمال مسکینی اور خودسپردگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کریم و مجیب کی دہلیز پر سر رکھ دیں، آنکھیں اشکبار ہوں، دامن کا بیساختہ پھیلاؤ ہو، جسم میں گدایانہ ارتعاش ہو، لہجے میں حد درجہ اضطراب ہو، اپنے گناہوں کا اعتراف بھی کریں، شافی مطلق کی قدرت کاملہ پر یقین بھی رکھیں اور التجا کریں کہ اے اللہ تو ہمارا مولا اور اور کوئی مولا نہیں اپنے بزرگ ترین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے ہم پر ترس کھا اور ہمارے محبوب امام کو کامل شفا بخش جسم و جان کی ساری توانائیاں انہیں لوٹا دے اور حضور کو تادیر سلامت رکھ کہ ہمارے سر ننگے کبھی نہ ہوں۔ اتنی آہ و زاری کریں کہ عرش کے کنگروں تک ہماری پکار پہنچے تو انشاء اللہ عرش اور فرش کے فاصلے گھٹ جائیں گے اور اللہ کریم اور رحیم ہمارے محبوب امام کو مکمل صحت عطا فرما دے گا۔

حضرت سیدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ کو جو مقام قرب الٰہی عطا ہوا تھا اس کے ذکر کی تو یہاں گنجائش نہیں ہے۔آپ کے دعائیہ اشعار جو ایک طرف سخت اضطراب کی کیفیت کو ظاہر کررہے ہیں تو دوسرے طرف قادرالکل مولا پر کامل توکل اور اس کی قدرتوں پر پختہ یقین اور حضرت ممدوحہ کے اللہ تعالیٰ پر مان کے آئینہ دار ہیں۔ پھران میں تقدیر الٰہی کے مسئلہ پر بھی نہایت ایمان افروز اور روح پرور انداز میں تھوڑے الفاظ میں مگر بڑی وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے جب اضطراب انتہا کو پہنچ جائے تو یہ دعا کریں۔

ہر آن تیرا حکم تو چل سکتا ہے مولا
وقت آ بھی گیا ہو تو وہ ٹل سکتا ہے مولا
تقدیر یہی ہے تو یہ تقدیر بدل دے
تو مالک تحریر ہے تحریر بدل دے

(غیر مطبوعہ۔محررہ یکم دسمبر 2002ء)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وہی مے ان کو ساقی نے پلادی

میرے ابا میاں عبدالعزیز صاحب نون نمبردار، رفیق ماموز مانہ

ضلع سرگودھا میں 12 گاؤں میں نون قوم آباد ہے جن میں سے سب سے اوّل شرف قبولیت حق کا میرے ابا کو نصیب ہوا۔ جہاں تک مجھے علم ہوا ہے ابا جان نے بیعت 1903ء میں کی۔ گو غالباً دستی بیعت کچھ عرصہ بعد کی پھر دوسرے نمبر پر حضرت ملک صاحب خان صاحب نون نے احمدیت قبول کی اور راہ خدا میں اپنی دولت خوب خوب خرچ کی حتیٰ کہ دو مربع نہری قیمتی اور زرخیز اراضی بھی تحریک جدید میں دے دی۔ان دونوں بزرگ نونوں کا بے حد عقیدت مندانہ اور غلامانہ تعلق سیدنا حضرت مصلح موعود سے تھا جس کی کئی مثالیں مجھے یاد ہیں مگر شاید یہ نفس مضمون سے ہٹ جانے کے مترادف ہوگا یوں یہ ایسی شیریں داستانیں ہیں کہ روح کو جلا بلکہ جسم وجاں میں ایک روشنی عطا کرتی ہیں۔

میں پہلے کچھ عرصہ قبل ابا جان کے بارہ میں ایک شذرہ ''الفضل'' میں شائع کرا چکا ہوں مگر بے حد مشفق محبت کرنے والا اور وراثت میں احمدیت کی نعمت دینے والا ہوا اور وہ باپ جس نے ماموز مانہ کے دست مبارک میں ہاتھ دے کر دین کو دنیا پر مقدم کرنے کا عہد کیا ہو اور پھر ساری عمر حتیٰ المقدور اس عہد کو دلیری کے ساتھ خود بھی نبھایا ہو اور اولاد کو بھی اس نعمت کے شیریں اور جاں بخش ثمرات چکھائے ہوں

ایسے باپ کی عنایات کا صلہ دینا کیونکر ممکن ہے اور میں خواہ کتنی قلمیں توڑوں یا کاغذ کالے کروں یہ قرض چکانا میرے بس سے باہر ہے۔ ویسے بھی محبتوں کے قرض کب کوئی چکا سکا ہے۔ میں سنجیدگی اور دیانتداری سے سوچتا ہوں کہ اگر ابا جان احمدیت کی نعمت خود اپنے ہاتھوں سے (ہاں انہیں ہاتھوں سے جو مہدی زمان کے مبارک ہاتھوں سے برکت حاصل کر چکے تھے) ہمیں عطا نہ کر جاتے تو ہم اپنی عقلوں پر تو کچھ بھی اعتبار نہیں کرتے کہ ان کے ذریعہ ہم موعود زمانہ کو پہچان سکتے اور اندھوں کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرتے۔ ایک یہ احسان اوّل مامور زمانہ کے ذریعہ قادر کریم کا اور پھر ابا جان کی رفاقت مہدی معہود کی برکت سے ہمیں جس کی موہبت ہوئی اگر ساری عمر شکر ادا کرتے گزر جائے تو اس کا شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ سچ فرمایا حضرت مہدی زماں نے کہ

اگر ہر بال ہو جائے سخن ور تو
پھر بھی ہیں شکر امکاں سے باہر

اشارتاً ذکر پہلے مضمون میں کر چکا ہوں مگر مختلف انداز میں کہ میرے دادا جان جناب میاں حافظ غلام محمد صاحب نون بڑے سخت گیر اور رعب والے انسان تھے۔ ابا جان ان سے بہت ڈرتے تھے مگر ایک دن ہمت کر کے سفر کی اجازت اور سفر خرچ جو مانگا تو دادا جان نے پوچھا کہاں جانا چاہتے ہو اس پر ابا جان نے کہا تلاش حق میں۔ اس پر دادا جان نے سفر خرچ بھی دیا اور گولڑہ شریف جانے کا بن مانگا مشورہ بھی۔ ابا کو تو قادیان جانا تھا اور سیدھے عازم قادیان ہی ہو گئے۔ ماموران الٰہی کا جذب و کشش بطور خاص عطا ہوتا ہے وہی میرے والد صاحب کو قادیان کھینچ لایا۔ حضرت مسیح موعود کے چہرہ مبارک پر نگہ پڑی تو پھر نہ لوٹی

عشق الٰہی وسے منہ پر ولیاں ایہہ نشانی

اور میرے ابا جان تو گویا وہیں لٹ گئے اب یہ علم نہیں کہ بیعت کر کے لوٹے تھے یا اپنے والد صاحب کے خوف سے فیصلہ بیعت کو مؤخر کر دیا یوں فرماتے تھے کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ شخص اپنے دعاوی میں سچا ہے۔ گھر لوٹے تو وہی میاں عبدالعزیز جو اپنے والد صاحب کے رعب تلے دبے رہتے تھے اب ان کی کایا پلٹ چکی تھی۔ اب نہ کوئی خوف رہا نہ ایمان کے معاملے میں کسی کے رعب کا تصور۔ آتے ہی اعلان کر دیا کہ میں قادیان گیا تھا اور وہاں حضرت امام مہدی کا دیدار کر آیا ہوں اور یہ وہی برگزیدہ شخص اور مامور زمانہ ہے جس کی شہادت 1894ء میں کسوف خسوف دے چکے ہیں اور یہ بات کہ حدیث میں رمضان شریف کے مہینے سورج چاند کو گرہن لگنے کو امام مہدی کی علامت بیان فرمایا گیا۔ آپ کے دادا حضرت حافظ غلام مصطفیٰ صاحب نے 1894ء میں علی الاعلان بتا دیا تھا کہ امام مہدی ظاہر ہو چکے ہیں علامات نے تصدیق کر دی ہے اور چند ماہ کے بعد آپ کے دادا جان کی تو وفات ہو گئی۔

اہل ایمان اور اہل حال یہ جانتے ہیں کہ کسی پیر فقیر کو کوئی مان لے کچھ مضائقہ نہیں مگر مامور زمانہ کو برحق تسلیم کرنے والے کا ایک زمانہ

دشمن بن جاتا ہے۔اوّل تو میرے دادا نے وسیع اراضیات اور دیگر جائیداد سے فارغ خطّی دینے کی دھمکی دی مگر ابا نے اس کی ذرہ بھر پراوہ نہ کی۔ پھر سارا گاؤں اکٹھا ہوا اور ان دنوں رات کو ایسے اجتماعات عام طور پر ہوا کرتے تھے اسی دوران دادا جان کو توحکیم وقدیر نے بلا لیا اور ''اکابر مجرمیھا'' نے ابا جان کی اس جسارت کا سختی سے نوٹس لیا۔گاؤں میں ایک مدرس حضرت سید مہدی شاہ صاحب اور میرے ابا دو ہی احمدی تھے۔

سب اس غریب الوطن ملازم پر پل پڑنے کے لئے''دلیرانہ'' اپنے نام پیش کرتے تھے جب میرے ابا کا نام آتا تو کوئی بھی مرد میدان اس بظاہرا کیلے نوجوان پر حملہ آور ہونے کی حامی نہ بھرتا۔ یہ مجمع سینکڑوں افراد کا ہوتا تھا اور میرے تایا دوست محمد بھی ان کے ہی ہم نور ہوتے تھے۔مگر میرے ابا تھے کہ بالکل لا پرواہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے ساحروں کی طرح جب وہ ایمان لا چکے تھے یہی کہا **فاقض ما انت قاض**۔

قادر کریم نے ایک رعب عطا فرمایا تھا۔آدھی آدھی رات تک منصوبے بنا بنا کر اٹھ جاتے مگر کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ آپ کے مزاحم ہوتا ایک دنیاوی وجہ یہ بھی تھی کہ کچھ آپ کے نجی ملازم تھے باقی رعیت کے لوگ آپ کی غرباء پروری اور احسانات کی وجہ سے آپ پر جان چھڑکتے تھے۔ یہی حال آپ کے مزارعین کا تھا کہ جن کے ساتھ ابا کے محبانہ سلوک کی وجہ سے کسی غیر کی بات سننے کو تیار نہیں تھے لیکن اصل محافظ وہی تھا جو آپ کے آقا و مرشد کا تھا اور جسے **یعصمک من الناس** کی نوید آسمان سے سنائی دی تھی اور حضور کے متبعین کو بھی اس سے ہی حصہ ملا تھا۔الدار میں جو داخل ہوئے ان خوش بختوں کے لئے عرش الٰہی سے حفاظت خاص کا وعدہ صادق الصمد نے عطا فرمایا تھا بہر حال ابا جان نے اسی مے سے گھونٹ پیا ہوا تھا۔جس کا عنوان میں ذکر ہے اس میں مست الست ہی آسمانی راگ الاپتے رہتے تھے۔

دلبر کی راہ میں یہ دل ڈرتا نہیں کسی سے
ھشیار ساری دنیا اک باولا یہی ہے

26 سال میں نے ابا جان کی صحبت صالحہ میں گزارے اتنا دلیر نڈر اور احمدیت کی سان پر چڑھی ہوئی ننگی تلوار میں نے کم کم ہی دیکھی بڑے بڑے بزرگ اور اولیاء اللہ جماعت میں گزرے ہیں ان کا معاملہ اور ہے۔ایک زمیندار دور افتادہ گاؤں کا رہنے والا معمولی پڑھا لکھا (ابا اخبارات اور کتب حضرت اقدس پڑھ لیتے تھے مگر لکھنا معمولی جانتے تھے) چاروں طرف اغیار، نادان اور جاہل ''علماء'' کی باتیں سننے والے مگر ابا کو کسی مخالف کی ذرا بھر پرواہ نہ تھی گھوڑے پر سوار حضرت مسیح موعود کی کوئی کتاب عموماً حقیقۃ الوحی زین پر رکھ کر دور ونزدیک اعلائے کلمۃ اللہ کرتے پھرتے تھے۔مخالفین بھی اتنی عقل تو رکھتے ہیں کہ غریب اور ناتواں پر تو فوراً چڑھ دوڑتے ہیں اور ثواب کما لیتے ہیں۔ پانی بھی نشیب کی طرف جاتا ہے مگر ایک صاحب دل پنجابی شاعر نے اس پر بھی اعتراض کرتے ہوئے لکھا اور

درست ہی لکھا۔

اپنے نالوں نیویں پاسے ایہہ ھمیشہ جاندا اے
مینوں نہیں پر چنگا لگدا ایہہ ورتارا پانی دا

ابا جان سے گاؤں کے اکثر لوگ تو بوجہ احمدیت کے سخت ناراض تھے مگر کچھ کر نہیں سکتے تھے اوران کے پیش امام بھی وہی جن کے بارہ میں اکبرالہ آبادی نے کہا تھا

کچھ شک نہیں کہ حضرت واعظ ہیں خوب شخص
یہ اور بات ہے کہ ذرا بے وقوف ہیں

غصے میں دانت پیستے رہتے ہیں مگر اپنے حلقہ میں جس کے ابا جان نمبردار تھے اپنے حسن اخلاق ہر ایک سے محسنانہ سلوک خصوصاً غرباء پروری تو ان کا خاصہ تھا۔عبادت گزار، مجسم عجز وانکسار مگر غیر اللہ کے آگے جھکنے سے قطعی انکار۔اللہ کے حضور ہر دم ہر ضرورت کو پیش کرنا اور فیض پانا اس درویش صفت مگر غیور احمدی کا روزمرہ کا معمول تھا اور اپنے حلقہ میں انہی صفات کے باعث بے حد مقبول اور ایک ثمر آور درخت کی طرح جو میٹھے پھل بھی دیتا ہے اور سایہ بھی۔

ایک دفعہ گاؤں میں مخالفت جو بڑھی تو نائی اور لوہار نے دوسرے مخالف زمینداروں کا کام کرنے سے انکار کر دیا اور ابا جان کے در کے ہی ہو کر رہ گئے۔ابا جان نے انہیں کچھ زمین دے دی کہ کاشت کر کے غلہ پیدا کرلو مگر وہ اسماعیل نائی اور عبداللہ لوہار گو اس عنایت سے خوش ہوئے مگر جب انہوں نے دوسرے لوگوں کی ''سیپ'' کرنے سے انکار کر دیا تو اس وقت انہیں اس کا کوئی لالچ نہ تھا۔دیہات میں رہنے والے لوگ جانتے ہیں کہ بہت شاذ بلکہ میرے تجربہ میں قطعاً ناممکن ہے کہ کمیں لوگ جو ہر ایک کی مزدوری کر کے روزی کماتے ہیں وہ ازخود ایک بڑے گروہ کو ایک ابا جان کی خاطر ان کا کام کرنے سے انکار کر دیں۔

مقبولیت کی یہ انتہا ابا جان اس کو احمدیت کی برکت یقین کرتے تھے اور ہرگز کوئی فخر نہیں کرتے تھے ورنہ گاؤں میں ایسی مقبولیت جسکی ہو اور کچھ لوگ جاں نثار بن جائیں تو اسے کھٹے ڈکار آنے لگتے ہیں اور وہ شخص مقبولیت اور کثرت کی بدہضمی کا بری طرح شکار ہو جاتا ہے مگر ابا جان کے اس خصوصی امتیاز نے اور زیادہ تذلّل اختیار کیا اور دعاؤں میں زیادہ انہماک بخشا کہ ان کا تو یہ تاثر تھا کہ

سب کچھ تیری عطا ہے گھر سے تو کچھ نہ لائے

(غیر مطبوعہ)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

تقریر اجتماع انصاراللہ سرگودہا 6ستمبر 1992ء

صحابہ ضلع سرگودھا

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ٥ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ٥ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ٥

(الجمعہ: 3تا5)

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

(آل عمران 111:)

مجھے انصاراللہ کی اس محفل میں کچھ عرض کرنے کا ارشاد محترم چوہدری ظفراللہ خان صاحب کے ذریعہ ہوا۔ میں ایک سفر پر جانے کی تیاری کررہا تھا مگر اس موقعہ کو غنیمت جانا اور اسے اپنی خوش بختی پر محمول کیا۔ میری آج کی معروضات کا موضوع ان آیات میں موجود ہے جو میں نے ابھی تلاوت کیں ایک تو میں دعوت الی اللہ کے متعلق کچھ بیان کروں گا اور اس بیان سے پہلے میں سرگودھا سے تعلق رکھنے والے چندایک رفقاء حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ نایاب موتی اور یہ آبدار گوہر سرگودھا کے کئی شہروں اور دیہات میں بکھرے پڑے ہیں۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ ان کے حالات کو اکٹھا کریں اور ان بیش قیمت موتیوں کو ایک مالا میں پروکر محفوظ کر لیں یہ بزرگ بھیرہ میں بھی تھے میانی اور گھوگھیاٹ میں بھی یہ سرگودھا میں بھی تھے اور کوٹ مومن میں بھی یہ چک نمبر 9 پنیار میں بھی تھے اور ادرحمہ اور ہلال پور میں بھی۔ اس کے علاوہ دسرے قصبات اور دیہات اور چکوک میں بھی ان کی تلاش کریں۔ کئی بزرگ تو وہ ہیں جنہیں تاریخ کے صفحات نے محفوظ کرلیا ہے مگر بیشتر وہ ہیں جن کی خوشبو سے سرگودھا کی فضائیں مہکیں مگر ان کے حالات سے ہم واقف نہیں ہیں مجھے یاد ہے ایک جلسہ سالانہ ربوہ پر حضرت چودھری محمد ظفراللہ خان صاحبؓ نے ''سیالکوٹ سے تعلق رکھنے والے صحابہ'' کے موضوع پر تقریر فرمائی تھی۔

میں آج اول المومنین ابوبکر ثانی حضرت مولانا نورالدین اعظم کے ذکر سے شروع کر کے ادرحمہ اور ہلال پور کے چھ صحابہ کا مختصر ذکر کروں گا مگر میں ادب سے یہ تحریک کروں گا کہ میرے اس موضوع کو صدائے عام تصور کر کے اس پر محنت سے کام کی ابتدا کی جائے اور اگر جماعت سرگودھا کیلئے ممکن ہو تو سارے بزرگوں کے مستند احوال اکٹھے کر کے شائع کرائے جائیں میرے نزدیک آج کی موجودہ

نسل احمدیت کی ذمہ داری ہے زندہ قومیں اپنے اسلاف کے اذکار کو یادرکھتی ہیں اور ان سے نور حاصل کرتی ہیں۔حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا **اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھدتیم** (میرے صحابہ ستاروں کی مثال ہیں ان میں سے جس کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے)اور حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا۔

مبارک وہ جو ایمان لایا
صحابہ سے ملا جب مجھ کو پایا
وہی ہے ان کو ساقی نے پلا دی
فسبحان الذی اخزی الاعادی

حضرت مولانا نورالدین اعظم کے متعلق حضرت مسیح موعودؑ فرماتے ہیں۔

''میں رات دن خدائے تعالیٰ کے حضور چلاتا اور عرض کرتا تھا کہ اے میرے رب میرا کون ناصر و مددگار ہے۔میں تنہا ہوں اور جب دعا کا ہاتھ پے در پے اٹھا اور فضائے آسمانی میری دعاؤں سے بھر گئی تو اللہ تعالیٰ نے میری عاجزی اور دعا کو شرف قبولیت بخشا اور رب العالمین کی رحمت نے جوش مارا اور اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک مخلص صدیق عطا فرمایا۔اس کا نام اس کی نورانی صفات کی طرح نورالدین ہے جب وہ میرے پاس آ کر مجھ سے ملا تو میں نے اسے اپنے رب کی آیتوں میں سے ایک آیت پایا اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ میری اسی دعا کا نتیجہ ہے جو میں ہمیشہ کیا کرتا تھا اور میری فراست نے مجھے بتایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے منتخب بندوں میں سے ہے......وہ میری محبت میں قسم قسم کی صلاحیتیں اور بدزبانیاں اور وطن مالوف اور دوستوں کے مفارقت اختیار کرتا ہے اور میرا کلام سننے کے لئے اس پر وطن کی جدائی آسان ہے اور ہر ایک امر میں میری اس طرح پیروی کرتا ہے جیسے نبض کی حرکت تنفس کی حرکت کی پیروی کرتی ہے۔

یہ تو حالت تھی محبوب کی اب کچھ محب کی بھی سنئے۔

جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ذکر سن کر حضرت مولانا نورالدینؓ قادیان وارد ہوئے تو حضرت اقدس کے چہرہ مبارک پر پہلی نظر پڑی تو حضور نے اپنے الفاظ میں ''میں نے کہا یہی مرزا ہے اور میں اس پر سارا ہی قربان ہو جاؤں''نور یقین سے آپ کا دل صافی ایسا پر ہو گیا جس طرح شیشی عطر سے۔حضرت مسیح موعودؑ نے کیا خوب فرمایا۔ ؎

چہ خوش بودے اگر ہریک زامت نور دین بودے
ہمیں بودے اگر ہر دل پُر از نور یقین بودے

ایک دفعہ مخالفین نے اعتراض کیا کہ مرزا صاحب نے بھولے بھالے مسلمانوں کو اپنے گرد جمع کر لیا ہے بات تو تب تھی جب غیر

مسلموں میں اسلام پھیلاتے اور غیر مسلموں کو مسلمان بناتے۔اس پر حضرت اقدس سیدنا مسیح موعودؑ نے حضرت حکیم مولانا نورالدین اعظم کو حکم دیا کہ ایک فہرست ان غیر مسلموں کی تیار کریں جو غیر مذاہب سے ہماری جماعت میں داخل ہو کر اسلام لائے ہیں۔حضرت خلیفہ اول مولانا نورالدین نے فہرست تیار کی ان لوگوں کی جو غیر مسلموں سے اسلام میں داخل ہوئے تھے اور پہلے نمبر پر جانتے ہو کہ غیر مسلم نام درج کیا وہ نام نامی سیدنا نورالدین بھیروی کا تھا۔اور پھر آگے ہندوؤں اور سکھوں میں سے مسلمان ہونے والوں کی فہرست تھی۔آپ سے دریافت کیا کہ حضرت غیر مسلموں سے اسلام میں داخل ہونے والوں کی فہرست تیار کرنے کا حکم تھا آپ نے اپنا نام کیسے لکھ دیا۔اس پر مجسم رنگ اور معرفت کے سمندر نے فرمایا کہ حضرت مرزا صاحب کو ماننے کے بعد ہی مجھے اسلام کا پتہ چلا ہے پہلے میں نام کا ہی مسلمان تھا۔اور میں نومسلم ہوں۔''مسلماں را مسلماں بز د کر دند''

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا مبارک زمانہ تھا مستورات میں بات چلی کہ حضرت مولانا نورالدین اور حضرت مولانا عبدالکریم صاحب میں سے حضور انور کا مقرب ترین اور دوست کون ہے چلتے چلتے یہ بحث حضرت سیدہ ام المومنینؓ تک ہوئی۔آپ نے فرمایا ابھی معاملہ حل ہو جاتا ہے۔حضرت اقدس اندرون خانہ تشریف لائے تو حضرت اماں جان نے کہا کہ آپ کے مقرب ترین ساتھی! اتنا ہی عرض کیا تھا کہ فوراً حضرت اقدس گویا ہوئے کہ مولوی نورالدین صاحب کے بارہ میں کوئی بات ہے۔اس طرح حضرت اماں جان نے یہ مسئلہ نہایت آسانی کے ساتھ حل کر دیا۔الغرض حضرت خلیفہ اول مولانا نورالدین جو نسب کے لحاظ سے حضرت عمرؓ کی اولاد میں سے تھے اور اپنی روحانی صفات کے لحاظ سے صدیق ٹھہرے اور حضرت ابوبکر صدیق کی طرح ہی زمانے کے مامور کو پہلی نظر پھیرتے ہی مانا اور پہلے خلیفہ بنے۔آپ 13 مارچ 1914ء کو جمعہ کے روز حالت نماز میں تھے کہ اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

اے جانے والے تجھ پہ درود و سلام ہو
ہر لحظہ تیری روح کا اونچا مقام ہو

حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے بارہ میں ایک اور ایمان افروز روایت بیان کردہ اس باب کو یہیں ختم کرتا ہوں وہ تو ایک بحر بیکراں ہے انسان اس مختصر وقت میں چند چلو ہی بھر سکتا ہے۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں حضرت حافظ مولوی نورالدین صاحب بھیرویؓ (بلکہ سرگودھوی کہوں تو شاید اس بابرکت وجود کے حلقہ میں ہونے کے ان کی جوتیوں کے پاس مجھے بھی جگہ مل جائے) حضرت مولوی صاحب سخت بیمار ہو گئے۔آقا اپنے غلام کو بار بار دیکھنے تشریف لے جاتے تھے۔ایک روز عیادت کے بعد حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنے گھر واپس تشریف لائے تو الماری سے کچھ دوائیں نکالیں۔زمین پر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔سیدہ حضرت اماں جان نے حضور کی پریشانی کو دیکھا تو پاس آ کر بیٹھ گئیں اور تسلی آمیز گفتگو کرنا شروع کی۔عرض کیا کہ بڑے بڑے عالم فوت ہو چکے ہیں مولوی برہان الدین

صاحب جہلمی فوت ہو گئے۔ مولوی عبدالکریم صاحب سیالکوٹی فوت ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ مولوی نورالدین کو صحت عطا فرمائے۔ حضرت مہدی موعود علیہ السلام نے حضرت اماں جان کی باتیں سن کر فرمایا۔

"یہ شخص ہزار عبدالکریم کے برابر ہے۔"

ضلع سرگودھا کی تاریخ احمدیت کا ذکر جہاں سے بھی چھیڑا جائے۔ یہاں سے نمایاں شخصیت آقائی حضرت نورالدین صاحب قریشی بھیروی کا نام اپنی ساری نورانیت کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آتا ہے وہی حضرت نورالدین جنہیں دیکھتے ہی سیدنا حضرت امام الزمان کے دل سے یہ صدا نکلی تھی کہ "ھذا دعائی"، یعنی یہ مردمومن میری دعاؤں کی قبولیت کا نتیجہ ہے۔ مجھے تحصیل بھلوال کے دور دور افتادہ دیہات ادرحمہ اور ہلال پور نوناں کا ذکر کرنا ہے اول الذکر گاؤں میں حضرت مولوی نظام الدین صاحب رانجھہ کے ہاں حضرت حافظ عبدالعلی صاحب اور حضرت مولانا شیرعلی صاحب پیدا ہوئے۔ یہ دونوں بزرگ زہد و اتقا، اطاعت امام اور باطنی طہارت کے لحاظ سے ارفع مقام رکھتے تھے۔ عمر میں حضرت حافظ عبدالعلی صاحب بڑے تھے کسی نے آپ سے پوچھا آپ دونوں میں سے بڑا کون ہے۔ حضرت حافظ نے جواب میں کہا کہ عمر تو میری زیادہ ہے پر "بڑا" شیر علی ہی ہے۔

میں نے ان دونوں بزرگوں کی صحبت سے صالحہ سے حصہ پایا۔ میرا وہ زمانہ نوعمری کا تھا ان خدا نما بزرگوں نے مجھے اپنا قبلہ درست کرنے میں بڑی مدد دی۔ من قبیلہ رامت کردم از طرف......۔ ایک انگریز کا قول ہے کہ میں اسلام کی حقانیت کا اس لئے قائل ہوا کہ امام غزالی جیسا محقق اسلام کو سچا سمجھتا ہے۔ میں نے صدق و صفا اور تقویٰ و طہارت اور زہد و تعبد میں بہت اعلیٰ اور بلند مقام پر پایا۔ اپنا وہی حال ہوا جیسا کسی نے کہا ہے۔ ؎

آں دل کہ رم نہ بودے از خوبر و جواناں
دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

(ترجمہ) کہ وہ دل جو خوش شکل جوانوں کی گرفت میں بھی نہ آیا۔ ایک بوڑھے نے اس دل کو ایک ہی نگہ میں اُڑا لیا۔

الغرض یہ دو بزرگ بھائی اللہ اور اس کے رسول مکی و مدنی کے عاشق صادق اور خلق خدا سے بے مثال پیار کرنے والے تھے بس ہمیں آمد نشان کا ملاں۔

شاید بہت سے دوست نہ جانتے ہوں حضرت مولوی نظام الدین صاحب چاوہ کے رہنے والے تھے ہجرت کر کے ادرحمہ آئے تھے حضرت مولانا شیرعلی صاحب اور حضرت حافظ عبدالعلی صاحب کے ننھیال موضع للہانی میں تھے۔ اور حضرت مولانا شیرعلی صاحب کی شادی موضع بدررانجھہ میں ہوئی جو گاؤں ہلال پور اور مڈھ رانجھہ کے درمیان ہے۔ ادرحمہ کے ان دو کاملین کے علاوہ حضرت میاں حسن

محمد صاحب تھے۔ والد کا نام احمد یار پیشہ بافندگی۔ نہایت غریب دنیاوی لحاظ سے بے سروسامان۔ ان کی دنیاوی جائیداد تو کچھ بھی نہیں تھی لیکن روحانی دولت سے مالا مال عشق و مستی میں سرشار قریہ قریہ گھومتے رہتے۔ اسی قسم کا کیف عطا ہوا جو سیدنا حضرت اقدس نے حضرت باوا نانک کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ

محبت کی تھی سینہ میں اک قلق
لئے پھرتی تھی اس کو دل کی جنبش
کبھی شرق میں اور کبھی غرب میں
رہا گھومتا قلق اور کرب میں

آپ کے پاس ایک گدھا تھا جس سے ''ناقہ'' کا کام لیتے تھے۔ دعوت الی اللہ کا شوق ایک تڑپ کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی جناب پاک سے رزق پہنچاتا تھا۔ وہ فقط دین حق کی اشاعت ہی کرتے تھے۔ چونکہ غریب قوم سے تعلق تھا اور حق ہمیشہ کڑوا ہی ہوتا ہے لوگ اکثر انہیں مارتے بھی تھے مگر وہ اس میں بھی ایک لذت اور سرور پاتے تھے۔ کاش بے بصیرت لوگ اس شخص کے باطنی نور کی چمکار دیکھ سکتے۔ اپریل 1908ء کی بات ہے۔ پھرتے پھراتے ایک دن ہلال پور نوناں آئے۔ مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے۔ اس وقت حضرت مولوی محمد اسماعیل صاحب بھی نماز ادا کر رہے تھے۔ حضرت میاں حسن محمد صاحب کے پاس حضرت اقدس کی ایک تصنیف تھی جو انہوں نے اپنے اور حضرت مولوی صاحب کے درمیان مسجد کی صف پر رکھ دی۔ مولوی صاحب نے نماز ختم کی تو کتاب اٹھا کر صرف چند ثانیے میں اس کے ایک یا دو صفحات پڑھ ڈالے۔ ''در کلامے تو چیزے است کہ دیگراں را دراں دخلے نیست'' کی الٰہی بشارت حضور انور کے کلام کو عطا ہوئی تھی۔ حضرت مولوی صاحب بڑے زیرک زود فہم اور نکتہ رس تو تھے ہی بس انہی دو صفحات کے سرسری مطالعہ نے کام تمام کر دیا اور صداقت کے سارے راز آن واحد میں آپ پر منکشف ہوئے۔ اسی روز اسی لمحے احمدیت قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔

میرے والد میاں عبدالعزیز صاحب نون آپ سے پہلے احمدیت قبول کر چکے تھے ان کی قبول حق کی داستان بھی بڑی ایمان افروز ہے میرے پڑدادا حضرت حافظ غلام مصطفی صاحب قرآن و حدیث کے مشہور عالم تھے حضرت خلیفہ اول نے بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ جب ماہ رمضان میں سورج اور چاند گرہن لگا تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ آنے والا امام مہدی آ چکا ہے آسمانی گواہ ظاہر ہوا گواہی دے چکے۔ لیکن ہنوز انہیں حضرت اقدس مسیح موعود کی آمد کی اطلاع نہیں ہوئی تھی۔ میرے ابا نے اس وقت اپنے دادا کی بیان فرمودہ یہ علامت پلے باندھ لی پڑدادا جان کی جلد وفات ہوگئی میرے ابا جان کو جب حضرت اقدس کے دعاوی کا علم ہوا تو آپ عازم قادیان ہوئے اور جب

اس برگزیدہ انسان پر ایک نگہ پڑی تو اسی دم والہ وشیدا ہو گئے۔

عشق الٰہی وسے منہ تے ولیاں ایہہ نشانی

پھر اور کسی دلیل کی حاجت نہ رہی۔ ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے کے ایک روایتی لاڈلے نوجوان تھے اب تو کایا پلٹ ہو گئی چند روز قیام کر کے واپس آئے تو یکسر بدل چکے تھے۔ آپ کے والد صاحب میرے دادا جان سخت مخالف تھے اور ہمارے دادا جان تھے بھی بڑے سخت گیر اس طرح حضرت مولوی محمد اسماعیل صاحب کے والد مولوی محمد بخش صاحب بھی بڑے رعب والے بزرگ تھے اور احمدیت کے مخالف اور فرماتے تھے۔ عزیز و نے اسمعیلو نوں پٹ سٹیا۔ مگر یہ وہ آگ تھی جو چھپائے نہ چھپ سکتی تھی۔ قیمتی جائیداد سے عاق کر دیئے جانے کی دھمکیاں بھی ملیں اور گھر سے نکال دیئے جانے کے الٹی میٹم بھی لیکن کیا مجال جو پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ آئے اور بزبان حال کہتے رہے۔ ؎

خو نے نہ کردہ ایم و کسے را نہ کشتہ ایم
جرم ہمیں کہ عاشق روئے تو گشتہ ایم

ترجمہ میں نے کسی کا خون کیا نہ کسی کو قتل کیا ہے میرا جرم یہی ہے ناں کہ میں ایک پیارے منہ کا عاشق ہو گیا ہوں وہ ایسے دام محبت وعشق میں گرفتار ہو چکے تھے جس سے رہائی انہیں موت سے بدتر نظر آتی تھی اور یہ گرفتاری انہیں دل و جان سے عزیز تھی۔

ہمیں اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

حضرت مولانا محمد اسماعل صاحب جو مولوی فاضل منشی فاضل کہلائے جامعہ احمدیہ کے استاد تھے اور سینکڑوں علماء ربانی کمتر کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ دینی لٹریچر کے تو گویا حافظ تھے اور حوالہ جات کے بادشاہ۔ جب آپ کے اور ہمارے امام ہمام حضرت مصلح موعود نے کوئی حوالہ طلب فرمایا تو کسی کتب خانہ کے کھنگالے کی حاجت نہ ہوتی تھی۔ بس حضرت مولوی صاحب کی موجودگی ہی کافی ہوتی تھی۔ آپ نے متعدد پر معارف تصانیف کیں جن میں سے محامد خاتم النبیین ''درود شریف'' سے آپ کے عشق رسول عربی ﷺ کی بین شہادت ملتی ہے جیسا کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ یہ شیریں ثمر اس مرد مومن حضرت میاں حسن محمد صاحب کی کاوش اور صفات کے نتیجہ میں دین حق کو میسر آیا اور میاں حسن محمد صاحب پرانے موصی تھے ان کا کتبہ قادیان کے بہشتی مقبرہ کی چار دیواری کے اندر اپنے آقا و مرشد کے قدموں میں موجود ہے۔ ہاں وہی مقدس مقام جہاں پر آسمان روحانیت کے کتنے چاند اور ستارے اور کتنے ذی جاء اور فلک رتبہ شہزادے محو استراحت ہیں۔ اے میاں حسن محمد تجھ پر سلام کہ تو نے ماریں کھائیں اور نابیناؤں کے ہاتھوں اذیتیں اٹھائیں مگر آج

تیرے مقام بلند و بالا پر فرشتے بھی رشک کرتے ہیں۔ تیرے کارناموں کا ریکارڈ حضرت باری تعالیٰ کے پاس محفوظ ہے ہمیں تو ایک حضرت اسماعیل ہلال پوری کی شکل میں تیری سعی سے جو نعمت عطا ہوئی وہ ہی کافی نظر آتی ہے وہ خدمت بارگاہ الٰہی میں مقبول ہوئی۔ حضرت مولانا اسماعیل صاحب وہ ایک شخص نہیں تھا بلکہ ایک قوم تھی۔ ایک ادارہ تھے ایک انجمن تھے۔ وہ ایک واحد شمع نہیں تھی جو روشن ہوئی بلکہ اس دیئے سے دیا جلتا گیا اور اس کے شاگردوں میں سے بڑے بڑے نامور ربانی علما پیدا ہوئے جن کے علم وفضل سے ایک جہاں جگمگا جگمگا کر رہا ہے۔ وہ خود تو اجل الی اللہ ہو گئے لیکن وہ ایسا صدقہ جاریہ چھوڑ گئے جس کا اجر انہیں قیامت تک ملتا رہے گا۔

وہ جس نے کوئے فغاں میں وفات پائی
ہزار بار ہے اُس پر سلام مے خانہ

پھر ادرحمہ میں حضرت میاں خدا بخش صاحب کو دیکھا۔ رنگ ریزی پیشہ تھا ہنس مکھ اور عشق الٰہی میں مجذوب ایسے پیارے اور دل موہ لینے والے انداز میں گفتگو فرماتے کہ علاقے کے بڑے رؤسا ان کی باتیں سننے پر مجبور ہو جاتے۔ یہ وجیہ انسان تھے ان کا باطن ان کے ظاہر سے بھی زیادہ روشن اور منور تھا ایک طرف خدا اور رسول ﷺ کے عشق میں گویا دیوانہ ہو چکے تھے تو دوسری طرف مخلوق الٰہی کے ساتھ بے حد پیار و محبت کرتے تھے آج بھی ان کا ہنستا مسکراتا چہرہ آنکھوں کے آگے پھرتا ہے۔ ایسے اعتماد کے ساتھ حق بات پہنچایا کرتے تھے کہ مخالف اس پر غور کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ جماعت احمدیہ میں علم وفضل اور تقویٰ وطہارت کے بڑے بڑے اعلیٰ نمونے موجود ہیں اور ہمیشہ رہے ہیں لیکن رفقائے کرام کی شان جدا ہے ان کا براہ راست کنکشن پاور ہاؤس سے ہو چکا تھا انہوں نے جونہی ہاتھ مامور زمانہ کے ہاتھ میں دیا۔ بجلی کی کرنٹ ان کے سینہ و دل کو منور کر دیتی تھی لاریب علم بڑی دولت ہے لیکن اس تعلق اور وصف کے آگے علم بھی گھٹنے ٹیکتا نظر آتا ہے اصل چیز وہ تعلیم کتاب اور حکمت تھی جو ان پڑھوں کو بھی عالم باعمل اور حکیم بنا گئی۔ ادرحمہ اور ہلال پور نوناں کا باہمی فاصلہ دو میل کا ہے یہ گویا دو جڑواں گاؤں تھے جن میں آسمانی نور کا انعکاس ساتھ ساتھ ہوا اگرچہ حضرت مولانا شیر علی صاحب 6 مارچ 1897ء کو بیعت کر چکے تھے ہاں عین اسی دن جس دن شاتم رسول اللہ ﷺ پنڈت لیکھرام مرزائے قادیان کی دعا سے ہلاک ہوا۔

جس کی دعا سے آخر لیکھو مرا تھا کٹ کر
ماتم پڑا تھا گھر گھر وہ میرزا یہی ہے

6 مارچ 1897ء کا دن دو لحاظ سے مبارک ٹھہرا ایک تو رب دو جہان کے منہ کی بات ایسی شان سے پوری ہوئی کہ آج قریباً ایک صدی کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود ایک طرف اس پیشگوئی کی ہیبت سے دل دہل جاتے ہیں۔ اس کی تمام جزئیات کے ساتھ پورا

ہونے سے علام الغیوب رب کی ذات کبریائی پر یقین کامل پیدا ہوتا ہے۔ دوسری طرف حضرت اقدس کو شیر علی ساجاں نثار تقوی شعار اور مرد کامل کا میسر آنا بھی بڑے برکتوں کا موجب ثابت ہوا۔ اور اس نے اپنی زندگی اور زندگی کی ساری قوتیں راہ حق میں ایسی شان سے قربان کر دیں کہ وہ ایک روشنی کا مینار ثابت ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے اس بے نفس بندے سے وہ کارنامے نمایاں کروائے جو رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔ ؎

انہوں نے عطا کی تھی جانِ حزیں
ہوا خوب انہی پر فدا ہو گئی

اختصار پیش نظر ہے تاہم یہ بیان مکمل نہیں ہوسکتا جب تک میں مہر شیر محمد صاحب آرائیں کا ذکر نہ کروں۔ یہ ہلال پور کے بے مالک مزارع تھے۔ ایک روز کوئی مولوی صاحب ہلال پور وارد ہوئے اور جیسا کہ عام طریق ہے کہ انہوں نے تقریر کی سوچتا ہوں مہر شیر محمد صاحب کتنے بلند نصیبے والا تھا۔ مولوی صاحب نے اس آیت کریمہ کو ہی موضوع بنایا جس کا ترجمہ ہے کہ مومن کافروں کے مقابلہ میں سخت اور آپس میں ترحم اور شفقت کا نمونہ ہوئے ہیں۔ مہر صاحب ہلال پور میں و نیز ملحقہ گاؤں ادرحمہ میں احمدیوں کے درمیان الفت و محبت کے نظارے دیکھا کرتے تھے غور کیا کہ اگر مومنوں کی یہ علامت ہے تو یہ تو احمدیوں میں موجود ہے اعلان عام کر دیا بے چارے مزارع ہی تھے غریب پر غصہ بھی سب کو آتا ہے۔ پھر کیا تھا ساری آرائیں برادری نے لاٹھیاں اٹھا لیں اور حملہ آور ہوئے۔ یہ 60 سال پرانی بات ہے میں 6 / 7 برس کی عمر کا تھا وہ نظارہ میری آنکھوں کے سامنے ہے بے چارے مہر شیر محمد کو زدوکوب کر رہے تھے کہ آخر میرے ابا کو کسی نے اطلاع دی وہ دوڑتے ہوئے آئے اور انہیں آتا دیکھ کر حملہ آور بھاگ گئے۔ مالک اراضی نے زمین کی مزارعت سے جواب دے کر اپنی ''مزراتی'' کا ہاتھ روک لیا۔ ابا جان نے ان کے لئے اپنی اراضی خال کرا دی اور پھر وہ بڑا لمبا عرصہ بے خوف و خطر مزارعت کرتے رہے۔ بڑے خوش الحان تھے قرآن کریم بہت خوبصورتی سے پڑھتے تھے معمولی پڑھے ہوئے تھے لیکن پھر وہ دینی کتب اور رسالہ جات بخوبی پڑھنے لگے۔ اللہ نے حکمت سکھائی اور بڑی کامیاب زندگی بسر کر کے فوت ہوئے ان کی اولاد اللہ کے فضل سے حبل اللہ کو حتی المقدور مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ ہلال پور کے ہمارے ایک عزیز بشیر احمد نون نوعمری میں داخل سلسلہ ہوئے تو ان کے دادا حافظ دین محمد صاحب لٹھ لے کر ان کے پیچھے پڑ گئے ایک دن بشیر احمد بھاگ کر ہمارے گھر آ گیا اس کے تعاقب میں چچا دین محمد صاحب بھی (وہ میرے ابا کے چچا زاد بھائی تھے) میرے ابا جان تو گھر پر نہیں تھے میں اکیلا تھا۔ میں چچا صاحب کا بہت ادب کرتا تھا آگے ہو گیا اور عرض کی کہ چچا اسے کیوں مارتے ہیں اگر احمدیت قبول کرنا جرم ہے تو میں پرانا اور بڑا مجرم ہوں پہلے مجھے ماریں میں آگے سے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ انہیں میری معذرت خواہانہ اور تابعدارانہ ادا پسند آئی اور بشیر احمد کو اس کے بعد پھر کبھی کچھ نہیں کہا۔ کچھ عرصہ اس

سے بول چال بند رکھ پھر بولنا بھی شروع کر دیا۔ بشیر احمد ائیر فورس میں بھرتی ہوا پنشن ملنے کے بعد دیارِ غیر میں خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ اللہ کے فضل سے نہایت مخلص اور ایثار پیشہ جوان ہے۔

الغرض یہ مضافات کی گدڑی کے چند لعل تھے جنہوں نے سنگلاخ زمینوں اور ریگستانوں میں پھول کھلائے۔ جسمانی تکالیف تو اٹھائیں یہ کوئی ان دیکھی مشکلات نہیں تھیں وہ جانتے تھے کہ یہ پھولوں کی سیج نہیں ہے۔

زیاں ہے عشق میں یہ جانتے ہیں ہم بھی مگر
معاملہ ہی اگر کیا ہو زیاں کے لئے

مگر آج کا دور اس لحاظ سے بھی اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ زیادہ دور کا زمانہ نہیں آج سے پورے 9 سال اور 4 ماہ قبل ایک ظالمانہ قانون بنایا گیا جس کے ذریعے تو گویا ہماری زبانوں پر تالے ڈال دیئے گئے ہیں اور حق بات کہنے پر قانون حرکت میں آ جاتا ہے۔ یہ آرڈیننس 26 اپریل 1984ء کو ایک ایسے انسان نے جاری کیا جسے ظلِ سبحانی کہلانے کا جنون تھا۔ مگر قربان جاؤں اس عالم الغیب والشہادہ خدا کے جو علیم بھی ہے قدیر ہے اور عزیز منتقم بھی ہے۔ اسی 26 اپریل کے روز مگر 81 سال قبل یعنی 26 اپریل 1903ء کو اس علیم وکلیم خدا نے بھی ایک آرڈیننس جاری کیا تھا۔ اندازہ کریں کہ یہ توارد کتنا ایمان افروز ہے اللہ تعالیٰ کو علم تھا۔ 26 اپریل 1984ء کو میری قائم کردہ جماعت کو دنیا سے مٹا دینے کی غرض سے ایک قانون بنایا جائے گا۔ اس خیر الماکرین خدا نے 81 سال قبل اس ظالمانہ آرڈیننس اجلاس کے بنانے والے کے بارہ میں حضرت مسیح موعود کو الہاماً خبر دے دی تھی۔

سنیں اللہ قادر کے منہ کی بات ''**رب انی مظلوم فانتصر فسحقهم تسحیقا**''

اے میرے رب مجھ پر ظلم کیا گیا میرا بدلہ لے اور ان کو خوب اچھی طرح پیس ڈال **فسحقهم تسحیقا** میں تکرار ہے مطلب یہ ہے کہ انہیں ایسا باریک پیس دے کہ وہ راکھ بن جائیں خاکستر ہو جائیں اور وہ راکھ بن گئے اور خاکستر ہو گئے۔

مقابل میں مرے یہ لوگ ہارے
کہاں مرتے تھے پر تو نے ہی مارے
شریروں پر پڑے ان کے شرارے
نہ ان سے رک سکے مقصد ہمارے
انہیں ماتم ہمارے گھر میں شادی
فسبحان الذی اخزی الاعادی

یہ شاندار انذاری پیشگوئی 4 سال کے قلیل عرصہ میں پوری شان کے ساتھ پوری ہوگئی۔

دوسرا الہام الٰہی 29/اپریل 1903ء کوالہام ہوا۔ **امناً من اللّٰہ الرحیم** ۔احمد مقبول ۔خدا کی طرف سے امن پانے والا ۔اللہ کی بارگاہ میں اے احمد تو مقبول ہوگا۔

پھر 30/اپریل 1903ء کوالہام ہوا۔ **فیہ خیر و برکۃ** اس کا ترجمہ بھی بتلایا کہ ''اس میں تمام دنیا کی بھلائی ہے۔''

دوستو یاد کرو کہ 30/اپریل 1984ء کو سیدنا حصرت امیر المومنین ربوہ سے رخصت ہوئے اور 29 اور 30/اپریل 1903ء کو پورے 81 سال قبل **امناً من اللّٰہ الرحیم** کی بشارت بھی دی گئی تھی جس میں سفر کے پرامن بنانے کا مژدہ تھا۔اور حضور کی ہجرت کے سفر میں **فیہ خیر و برکۃ** کہ اس میں تمام دنیا کی بھلائی ہے کی خوشخبری بھی تھی کن حالات میں سفر شروع ہوا کیا کیا خطرات تھے اور کیسے اللہ رحیم نے **امناً من اللّٰہ الرحیم** کی پیش خبری کے مطابق اسے پرامن بنادیا یہ اگر چہ ایمان افروز داستان ہے مگر یہ نہ موقعہ نہ محل۔

میں حضور کے اس سفر کے بعد یورپ گیا تو دن ہیگ اور ایمسٹرڈم بھی گیا حضور کا جہاز کراچی سے پرواز کر کے سیدھا ایمسٹرڈم اترا تھا جہاں پر احمدی احباب بڑی کثرت سے موجود تھے۔ مجھے وہاں کے امام صاحب نے تفصیل بتائی۔ ایمسٹرڈم کے ہوائی اڈے سے 1984ء کے صدر پاکستان کو یہ فون ان کے مشیر نے کیا۔(مصطفےٰ گوکل) How is it that Mirza Takir Ahmad is in Holland. خیر یہ تو امن کے ساتھ منزل مقصود پر پہنچنے کی مختصر روئیداد ہے۔اور دوسرا الہام **فیہ خیر و برکۃ** کس صفائی کے ساتھ پورا ہوا آپ میں سے ہر ایک اس کا عینی شاہد ہے اور پھر 135 ممالک میں احمدیت کے قیام اور 50 سے زائد زبانوں میں قرآن کریم کے تراجم اور پھر ساری دنیا میں گھر گھر حضرت امام ہمام کا ہر جمعہ کے روز تشریف لانا اور روحانی مائدہ تقسیم کرنا خیر وبرکت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ سچ فرمایا میرے اور آپ سب کے آقائے قادیانی نے۔

جس بات کو کہے کہ کروں گا یہ میں ضرور
ٹلتی نہیں وہ بات خدائی یہی تو ہے

احمدیت ایک بہت بڑی دولت ہے۔ میرے بھائیو اور دوستو آپ کے پاس قیمتی خزانے ہیں۔ اپنے رشتہ داروں میں اپنے دوستوں میں اور اپنے ہمسایوں میں انہیں تقسیم کرو۔ دعوت الی اللہ بہت کرو مگر **بالحکمۃ و الموعظۃ الحسنہ**۔ مولوی محمد بخش صاحب کے الفاظ میں۔

پھل ونڈ محمد دوہیں ہتھیں
بھلکے ہوسیا باغ ویران تیرا

اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوگی تمہاری دعائیں بھی بہت قبول ہوں گی۔

عزم اور ارادہ کرلیں راہیں اللہ تعالیٰ خود دکھادے گا۔استاد دامن نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا تھا۔

بندہ کرے تے کی نیں کر سکدا
منیاں وخت تے تنگ تو تنگ اوندا
رانجھا تخت ہزاریو ٹرے تے سہی
پیراں وچہ سیالاں دا جھنگ آوندا

بہت دلکش نمونے ہمارے سامنے موجود ہیں۔کون نہیں جانتا کہ حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکی کی دعائیں بہت قبول ہوتی تھیں۔خاندان حضرت مسیح موعودؑ کے افراد حتیٰ کہ حضرت مصلح موعود بھی دعا اور استخارے کیلئے مولوی صاحب کو تحریک فرماتے تھے۔ہماری تاریخ بھری پڑی ہے ان کے تبلیغی کارناموں سے اور قبولیت دعا کے معجزانہ رنگوں سے ان کے اندر ایک دعوت الی اللہ کا ایک جنون تھا۔حضرت مسیح موعود کے مبارک اشعار ان کی حالت پر پوری طرح صادق آتے ہیں۔

محبت کی تھی سینہ میں ایک خلش
لئے پھرتی تھی اس کو دل کی تپش
کبھی شرق میں اور کبھی غرب میں
رہ گھومتا قلق اور کرب میں
پرندے بھی آرام کر لیتے ہیں
مجانیں بھی یہ کام کر لیتے ہیں
مگر وہ تو اک دم نہ کرتا قرار
ادا کر دیا عشق کا کاروبار

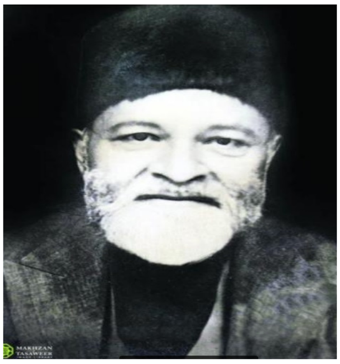
ان گنت واقعات ہیں کچھ تاریخ میں محفوظ کچھ ہندو پاکستان کی دھرتی پر بکھرے پڑے ہیں۔میں تین مرتبہ راجیکی گاؤں گیا وہاں ان کے عزیزوں سے ملا۔گاؤں کے بڑی عمر کے آدمیوں سے ملا۔اور صوفی بزرگ کے حالات سنے۔گڈھو ایک گاؤں راجیکی کے قریب واقع ہے وہاں کا واقعہ تو حیات قدسی میں موجود ہے۔حضرت راجیکی صاحب وہاں گئے۔نماز پڑھی تو اسی وقت مسجد میں بیٹھے بیٹھے پنجابی کے چند شعر زبان پر آ گئے جو حضرت مولوی صاحب نے وہاں مسجد کی کھڑکی پر لکھ دیئے۔دو شعر یہ تھے۔

ایہ بخت جاگے دلاں ستیاں دے
مہدی پاک جاں وچ جہان آئے

سرے بنھ دستار رسول والی
ساڈے سترڑے بھاگ جگان آئے
ہوئے باغ محمدی فیر تازے مالی
خاص جاں وچ بستان آئے
قسم ربدی ایہو امام مہدی
جہڑے قادیاں وچ سلطان آئے

جب حضرت مولوی صاحب مسجد سے نکل کر اپنے گاؤں کی طرف چل پڑے تو اس مسجد کے ملاں نے وہ شعر پڑھے اسے تو تن بدن میں آگ لگ گئی اور گاؤں کے چودھری کو جا کر رپورٹ کی۔اس نے وہی کیا جو اکابر مجرمیھا لیمکروا فیھا کرتے ہیں۔8 مسلح آدمی حضرت مولوی صاحب کو مارنے کیلئے پیچھے بھیج دیئے۔مولوی صاحب اپنے گاؤں پہنچ چکے تھے۔حملہ آور ناکام واپس گئے۔ دوسرے دن حضرت مولوی صاحب کے والد صاحب کا ایک مرید گڑھو گاؤں سے آپ کے والد صاحب کے پاس آیا اور اس نے واقعہ بتایا آپ کے ابا جان نے بلا کر نرمی سے ہی کہا کہ دیکھ میاں غلام رسول اپنی جان کو اس طرح خطرے میں نہ ڈالا کر۔چپ ہو رہے مگر کسی نے کہا تھا ہمارا ابھی زور چلتا ہے گر یہاں یار۔وضو کر کے گھر کے ملحق مسجد میں اندر سے کنڈی لگا کر دعا شروع کی کہ خدایا میں حق بات کرنے سے روک دیا گیا ہوں۔ادھر قتل کی کوشش کی گئی اور والد صاحب نے بھی حکماً منع کر دیا ہے۔مگر کلمہ ٔ حق کہنے اور تبلیغ کرنے سے رک نہیں سکتا بہت آہ وزاری کی فرماتے ہیں اسی دوران اللہ نے خبر دی کہ وہ زمیندار غالباً اللہ بخش نام آٹھویں دن قبر میں ہوگا۔پھر اسے اپنے گاؤں کی دو گز زمین بھی نصیب نہیں ہوگی۔یہ تو اللہ کا شیر تھا اللہ کی طرف سے خوش خبری ملی تو پھر اسے کس کا ڈر۔اس گاؤں گئے دارہ پر کچھ آدمی اکٹھے بیٹھے تھے پوچھا اللہ بخش کہاں ہے اور پھر یہ انذاری پیشگوئی وہاں سب کو علی الاعلان سنا دی۔فرماتے ہیں ان پر سکتہ طاری ہو گیا۔واپس راجیکی تشریف لے آئے۔عین آٹھویں دن اس پر قولنج کا سخت حملہ ہوا۔اور گجرات کے قریب کسی گاؤں میں قضا ہو کر وہیں دفنا دیا گیا۔

فانیوں کی جاہ و حشمت پر بلا آوے ہزار
سلطنت تیری ہے جو رہتی ہے دائم برقرار



حضرت میر محمد اسماعیل صاحبؓ

خداداری کہ چہ غم داری

اللہ تعالیٰ کی ہزاروں رحمتیں حضرت میر ناصر نواب صاحبؓ کی پاک روح پر ہوں کہ جن کی اولاد میں سے حضرت اماں جان سیدہ نصرت جہاں بیگم صاحبہؓ بھی تھیں اور جن سے ایک ایسے مقدس خاندان کی داغ بیل پڑی اور ان کی اولاد میں ایسے نایاب گوہر پیدا ہوئے جو صدیوں بعد روئے زمین پر نمودار ہوتے ہیں اور اپنی ضوفشانی سے تاریک جہانوں کو روشن اور منور کر دیتے ہیں۔ حضرت اماں جان نور اللہ مرقدھا کی سیرت کے متعلق اس وقت کچھ لکھنے کا ارادہ نہیں ہے آج ان سطور کے لکھنے کی تحریک محترم غلام نبی صاحب سابق ایڈیٹر الفضل کے ایک مضمون پڑھنے سے ہوئی جو 6 ر اکتوبر 90 کی الفضل کی اشاعت میں بعنوان ''زندگی میں موت کے متعلق تیاری'' حضرت سید میر محمد اسماعیل صاحبؓ کے متعلق شائع ہوا۔ اس مضمون میں حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحبؓ کی ایک نہایت ہی روح پرور اور ایمان افروز وصیت نقل کی گئی ہے جو حضرت میر صاحب نے اپنی وفات کے بعد غسل اور تدفین وغیرہ کے انتظامات کے متعلق سپرد قلم فرمائی تھی اس وصیت کا ایک ایک لفظ اس امر کا شاہد ہے کہ حضرت میر صاحب نے سفرِ آخرت پر روانہ ہونے کی اس طرح تیاری کی تھی جس طرح نہایت ہی مرغوب دل پسند اور مسرت آمیز سفر پر جانے کے لئے انسان خوشی خوشی تیاری کرتا ہے۔ یقین ہے کہ واقعی ندائے رحمت از درگاہ باری بشنوم ہردم ایک نوید کی صورت آپ کو عطا ہوئی تھی۔

میں نے جب 1944ء میں ٹی آئی کالج قادیان میں داخلہ لیا تو اس دوران حضرت میر صاحبؓ کی زیارت اور ملاقات کے لئے آپ کی دکان الصفہ پر حاضر ہوا کرتا تھا ابھی تک Call Bell کے الفاظ اور ان الفاظ کا مقام وہی آنکھوں کے سامنے ہے یہ Bell میری ملاقات کا ذریعہ بنی تھی

یہ کہہ کے ان کی بزم میں ہم بھی پہنچ گئے
کیا تھا جو آج یاد کیا خاکسار کو
اور ہر ملاقات کے بعد یہ حال ہوتا تھا کہ
دولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے

وہ زمانہ تھا جب دارالامان میں رفقائے کرام کافی تعداد میں موجود تھے۔ وہ نجوم تھے جن کی تقلید راہ ہدایت پر چلا دیتی تھی ہر ایک کی

نرالی شان تقوی اور ہر ایک پھول کی خوشبو دوسرے سے جدا، دامانِ نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار والا معاملہ تھا۔

حضرت میر محمد اسماعیل صاحبؓ ایک عدیم المثال صوفی ،نگاہ بلند،فراست، پاکیزہ کردار،تقویٰ کی باریک راہوں پر گامزن۔''از جہان و باز بیرون از جہان'' کی چلتی ہوئی تصویر تھے۔ان کے آقا و مرشد کی یہ خواہش تھی کہ اپنی جماعت کو دین حق کے لئے مرنا سکھادیں چنانچہ حضرت میر صاحب نے اس طرح زندگی بسر کی کہ گویا دنیا کے لحاظ سے زندہ درگور ہی ہو گئے تھے تبھی تو موت ان کے لئے کسی درد وکرب یا اضطراب کا باعث نہ تھی بلکہ وہ شاداں وفرحاں دنیا اور اس کے علائق سے اپنی جھولی جھاڑ کر اپنے خالق و مالک کی طرف سے مرے پیارے بندوں میں شامل ہو کر مری رضا کی جنتوں میں داخل ہو گا کا مژدہ سن کر اس کے حضور حاضر ہو گئے:

آج پیراہنِ ہستی بھی کیا نذرِ جنوں
آخری تھا یہی ہدیہ تیرے سودائی کا

الفضل کے متذکرہ بالا مضمون میں حضرت میر صاحبؓ کی وصیت شائع ہوئی جو نثر میں تھی حضرت میر صاحبؓ نے خدا داری چہ غم داری کے عنوان کے تحت اہل خانہ کو وصیت کے محور پر ایک نظم بھی تحریر فرمائی تھی جس کے پیش لفظ میں لکھا کہ

''یہ وصیت اگرچہ بظاہر ایک ذاتی معاملہ نظر آتا ہے تاہم اس کا مرکزی نقطہ یعنی اللہ تعالیٰ پر ہر مصیبت اور ہر حالت میں توکل رکھنا، اس سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے۔اس کے لکھنے کی یہ وجہ پیش آئی کہ اس جاڑے میں میرے دمہ کی تکلیف غیر معمولی طور پر لمبی اور سخت ہو گئی تھی یہاں تک کہ اس قدر ضعفِ قلب اس کے سبب سے لاحق ہو گیا کہ کئی دفعہ فوری طور پر موت کا خطرہ محسوس ہو جاتا تھا اور بہت سی راتیں میں نے ساری کی ساری بیٹھ کر کاٹی ہیں اسی شدتِ مرض کی حالت میں یہ نظم کہی گئی تھی''۔

یہ نظم طویل ہے اس کے چند بند پیش کرتا ہوں انہیں غور سے پڑھیں اور اس کے سامنے والے مادر وجود کے دل و دماغ میں موجزن اتھاہ گہرائیوں میں اتر کر جھانکنے کی کوشش کریں جو نہ صرف خود ہی مکمل طور پر رو بخدا اور متوکل علی اللہ تھے بلکہ اپنے پسماندگان کو بھی ایسا ہی بننے کی نصیحت فرما رہے تھے۔

نہ رونا میرے مرنے پر نہ کرنا آہ و زاری
نہ ہونا صبر سے عاری مری بیگم مری پیاری
جدائی عارضی ہے یہ ملیں گے رب تو جنت میں
جوانی پھر نہیں ہو گی نہ ٹوٹے گی کبھی یاری
خدا سے تو لگا رکھنا کہ جس پر مہربان وہ ہو

اسے کہتا ہے خوش ہو جاخدا داری چہ غم داری
مرے کمرے کو خالی دیکھ کر جی مت برا کرنا
نہ لب کانپیں نہ دل دھڑکے نہ آنسو ہوں
کلیجے کو پکڑ لینا خدا کو یاد کرلینا
کہ سچ کو پا گیا کوئی خدا داری چہ غم داری

اس نظم کا ایک ایک مصرع اس مرد باصفا کے نور قلب کی عکاسی کر رہا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک ربِ کریم اور اپنے محبوب و مطاع حضرت رسول عربی محمد ﷺ کا قرب حاصل ہونے کی خوش خبری سن چکا ہے اور اب پیاروں کے حضور حاضر ہونے کی تمنا ایک تڑپ کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ ہاں وہ فطری جذبات کا بھی پوری طرح احساس رکھتا ہے اور اپنے بعد پسماندگان کی حالت پر بھی اس کی نظر ہے وہ اپنے عزیزوں کو صبر کی تلقین بھی کرتا ہے اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے اور تقویٰ کی راہوں پر قدم مارنے کے نتیجہ میں شہر میں ثمرات کے حصول کی پیش خبری بھی سناتا ہے لیکن اپنے سفر آخرت پر روانہ ہونے کے لئے بڑے اطمینان کے ساتھ کمر بستہ ہو گیا ہے۔ یہ اللہ کے مجذوب کی ایک ایسی شان ہے جو نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ فرماتے ہیں:

یہی ہے مرضی دوئی کی یہی اس کا طریقہ ہے
زمین پر رہ چکے اتنا ہے اب زیرِ زمین باری
جنازہ جا رہا ہے ساتھ ہیں افسردہ دل بھائی
یہی ہے ریت دنیا کی ہمیشہ سے یونہی جاری
زمین ساری تکلیفیں پر پشہ سے کم تر ہیں
نوائے آسماں گر ہو خدا داری چہ غم داری
اگر تقویٰ نہ چھوڑو گی فرشتے پیر دھوئیں گے
کرے گا مرا آقا بھی تمہاری ناز برداری
مرے اللہ کا وعدہ ہے تم کو رزق دینے کا
نہ کرنا شک ذرا اس میں نہ کرنا اس سے غداری

آگے چل کر اپنے نفس مطمئنہ کے اپنے مولیٰ پر توکل اور اپنے اہل خانہ کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے گویا ایک بیش بہا نسخہ کیمیا ان کے ہاتھوں میں تھما رہے ہیں۔ فرماتے ہیں:

مجھے کیا غم ہو مرنے کا تمھیں کیا غم بچھڑنے کا
خدا دارم چہ غم دارم خدا داری چہ غم داری

اپنے عزیزوں اور پسماندگان کے لئے محبت وایثار کا اتنا پیارا اظہار اور پھر نہایت ہی دلنشیں انداز میں موعظت ایک بلند مقام اور ارفع شان کے حامل عارف باللہ ہی کر سکتا ہے ایسے پیارے وجود کی جدائی کا صدمہ تو اپنوں اور غیروں نے بھی بہت محسوس کیا۔اور وہی حال ہوا جیسے کسی نے کہا کہ

وقتِ رخصت تسلیاں دے کر
اور بھی تو نے بے قرار کیا

حضرت میر محمد اسماعیل صاحبؓ کی روحانی سرفرازی، رضا بالقضا، تقویٰ شعاری، اور بلند مقام تصوف کا کچھ ذکر آپ کے کلام کے ذریعہ کیا ہے۔وہ ان ستودہ صفات کے بحرِ بیکراں تھے انسان اس میں سے چند چلو ہی بھر سکتا ہے۔آپ کے برادرِ اصغر حضرت میر محمد اسحق صاحبؓ بھی علم وفضل میں اور روحانی بلند مرتبہ میں ایک جداگانہ شان رکھتے تھے۔اللہ اور اس کے رسول مقبول محمد ﷺ کے لئے عشق اور سوز انہیں بطور خاص عطا ہوا تھا۔روحوں کو گداز کرنے والا زورِ بیان جو انہیں ودیعت ہوا تھا وہ بہت کم کم دیکھنے میں آیا ہے۔مجھے نوعمری میں بیت الاقصیٰ قادیان میں آپ کے درس حدیث سننے کی سعادت نصیب ہوئی تھی جب درس حدیث دے رہے ہوتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے آقا مکی و مدنی ﷺ کے عشق میں ڈوب کر موتی اور جواہر نکال رہے ہیں۔وہاں صرف علمی نکات کا بیان ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ عشق کی ایک واردات ہوتی تھی اور محمدی نور کی چادر میں آپ لپٹ جاتے تھے زبان تو بظاہر حضرت میر صاحبؓ کی ہوتی تھی لیکن اس میں سوز اور گداز خاص موہبت الٰہی سے تھا

سرِ آئینہ مرا عکس ہے پسِ آئینہ کوئی اور ہے

میرا ناتواں قلم اس سراسر روحانی کیف کی جھلک دکھانے سے قاصر ہے سامعین بزبان حال یہ کہہ رہے ہوتے تھے کہ

پہنچا دیا منزل پہ اسی مردِ خدا نے

اسماعیل واسحق کی یہ جوڑی بڑی شانِ خدانمائی رکھتی تھی انہیں درد، سوز وعشق، شوق دعا اور ذوقِ رضا سے وافر حصہ ملا تھا۔یہ دونوں بھائی اپنے رب بے مثال کے در پر ایسے گرے کہ خود بھی بے نظیر ہو گئے خود حضرت میر محمد اسماعیل صاحبؓ اس حالت کا کیا عمدہ نقشہ پیش کرتے ہیں کہ

بے درد و سوز و عشق اگر وصول ہو کوئی

لے جاؤ ایسے وصل کو واپس سنبھال کے
شوقِ دعا و ذوق رجا جمع کر کہ یاں
ملتا ہے کچھ سوال پہ کچھ بے سوال کے
بن جائے گا کبھی نہ کبھی خود بھی بے نظیر
در پر پڑا رہے گا جو اس بے مثال کے

تاریخ میں حضرت میر محمد اسحق صاحبؓ کے متعلق ایک نہایت ہی ایمان افروز اور دلچسپ واقعہ لکھا ہوا کہ آپ بچپن میں سخت بیمار پڑ گئے۔ حالت تشویش ناک ہوگئی حتیٰ کہ معالجین نے بھی مایوسی کا اظہار کر دیا سیدنا حضرت اقدس بانی سلسلہ احمدیہؑ نے دعا کی تو بشارت ملی کہ خدائے رحیم وکریم تجھے سلامتی کی خوشخبری دیتا ہے میں نے یہ سورہ یاسین کی انسٹھویں آیت کا ترجمہ لکھا ہے چنانچہ اس کے فورا بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت میر صاحبؓ کوشفاء عطا فرمادی۔ پھر جب 55 سال کی عمر میں فرشتہ اجل نے خدائی حکم کے ماتحت آپ کا نام پکارا اور الرحیم کی نوبت بجنے لگی تو آپ کے بستر کے پاس حافظ محمد رمضان صاحب سورہ یاسین کی تلاوت کر رہے تھے۔ جب آپ نے وہی انسٹھویں آیت کریمہ پڑھی (ترجمہ) ان کوسلام کہا جائے گا جو رب رحیم کی طرف سے ان کی طرف پیغام ہوگا۔تو حضرت میر صاحبؓ نے آخری سانس لیا اور پاکیزہ روح اپنے مالک کے حضور حاضر ہوگئی۔ اس طرح سورہ یاسین کی متذکرہ بالا آیت بچپن میں تشویشناک بیماری کے وقت زندگی کا پیغام لائی اور جب وقت واپسیں آیا تو اسی آیت قرآنی کے مبارک الفاظ میں فرشتوں نے آپ کوخوش آمدید کہا۔

سچ ہے کہ یہ دونوں بھائی ان لوگوں میں سے تھے جنکی زندگیاں اور ممات اور قربانیاں ہر ایک چیز اللہ رب العالمین کے لئے ہوتی ہے۔ دعا ہے کہ جب ہمارا آخری وقت آئے تو اللہ تعالیٰ کی رحمتِ بے حساب ہمیں بغیر حساب ہی اپنے مقبول بندوں کے قرب میں مقام عطا فرمائے۔

میں ہوں خالی ہاتھ مجھ کو یونہی جانے دیجئے
شاہ ہو کر آپ کیا لیں گے فقیروں سے حساب

ازقلم عبدالسمیع نون

یہ سیاسی فاتحہ خوانیاں

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز ہے
ورنہ ہمیں جو دکھ ہیں بہت لا دوا نہیں

پاکستانی قوم آج جن گھمبیر مسائل سے دوچار ہے۔ ماضی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی غربت اور مہنگائی نے عوام کا جینا محال کر دیا ہے۔ یہ ملک اپنی تمام زرخیزیوں کے باوجود روز بروز غیر ملکی قرضوں میں جکڑا جا رہا ہے۔ اور حالت اس قدر ناگفتہ بہ ہو چکی ہے کہ سارے مالی وسائل اصل قرض تو کجا سود کی ادائیگی کے لئے بھی ناکافی ہو چکے ہیں۔ ایسے میں ماہرین اقتصادیات اگر سر جوڑ کر بیٹھتے اور خلوصِ نیت سے تمام درپیش مسائل پر غور کرتے۔ کوئی راہ نجات تلاش کرتے تو لِکُلّ داءٍ دواء کوئی علاج تو اس حرماں نصیب قوم کے دکھوں کا نکل ہی آتا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز ہے
ورنہ ہمیں جو دکھ ہیں بہت لا دوا نہیں

ہمارے حکمرانوں کی تو بے تدبیریاں اور شاہ خرچیاں ہی ختم ہونے میں نہیں آتیں جن سے مسائل اور مصائب میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ آئے دن اخبارات میں کسی ایم این اے۔ ایم پی اے یا سینیٹر کے کسی نہ کسی عزیز کی وفات کی خبر چھپتی ہے تو مقتدرین سپیشل جہاز یا ہیلی کاپٹر پر سوار ہو کر پسماندگان کے دیہات یا شہروں کا رخ کرتے ہیں۔ سربراہانِ حکومت جائیں تو ہر چھوٹا بڑا افسر بھی ان کی تقلید میں وہاں جا کر حاضری لگانا اپنا فرض منصبی گردانتا ہے۔

اسی طرح لکھوکھا روپیہ اس غریب قوم کا ضائع کیا جاتا ہے بعض دوروں پر خرچ تو کروڑوں کو چھونے لگتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔لاکھوں روپے کا ضیاع۔ میرے نزدیک مہنگائی اور غربت کے بوجھ تلے سسکتی ہوئی غریب قوم کو زندہ درگور کرنے کا ایک لائق صد نفریں ذریعہ ہے۔ جب کہ دونوں فریق جانتے ہیں۔ کہ کسی صاحب اقتدار کی یہ ''رسمی دعا'' مرنے والے کی مغفرت کی ہرگز کوئی ضمانت نہیں دعائے مغفرت تو گھر بیٹھے بھی ہو سکتی ہے۔ رہی تعزیت یا اظہارِ ہمدردی تو یہ خط کے ذریعہ، فون یا ریڈیائی پیغام کے ذریعہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ ہاں اگر مرنے والے کے صدمے میں آپ بہت ہی ہلکان ہیں تو پھر اپنی جیب سے خرچ کریں اور خاموشی سے اظہارِ ہمدردی کر آئیں۔ مگر اس طرح آنے جانے سے کیا حاصل؟ ایسا کرنے سے سیاست کی دوکان تو چمکنے سے رہی۔ شاید اسی لئے پارلیمنٹ کی ممبری (جواب نقد آور جنس کی صورت اختیار کر چکی ہے) کے لوازمات میں اب ''موت فوت'' کے موقعہ پر وزراء بلکہ وزیر اعظم اور صدر کی تشریف آوری

بھی ضروری ہو چکی ہے۔ اگلے روز وزیر اعظم صاحبہ ایک خاتون کے سینیٹر بیٹے کے ہاں فاتحہ خوانی کی غرض سے سرگودھا تشریف لائیں۔ وہ نمائندہ قوم مستقل رہائش راولپنڈی میں رکھتے ہیں۔ وہاں تعزیت آسانی سے ہو سکتی تھی۔ مگر ''جنگل میں مورنا چا کس نے دیکھا'' حلقہ انتخاب تو سرگودھا ہے۔ یہاں کے لوگ اگر نہ دیکھیں کہ وزیر اعظم صاحبہ تشریف لائی ہیں تو ان کے تشریف لانے کا فائدہ؟

چنانچہ ایک عرصہ تک سینیٹر موصوف راولپنڈی چھوڑ کر یہاں منتظر بیٹھے رہے بالآخر انتظار بسیار کے بعد اگلے روز کہیں یہ مراد برآئی ایک اخباری اطلاع کے مطابق وزیر اعظم صاحبہ کے اس دورہ سرگودھا پر ''95 لاکھ کا صرفہ'' تو سرگودھا کو برداشت کرنا پڑا اور ہوائی جہاز کے لاکھوں کے اخراجات اس پر مستزاد۔ پھر چونکہ یہ رسوم ناروا تکلفات میں جکڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ بالکل کھوکھلی اور غیر سنجیدہ اس لئے ایسے مواقع پر بعض لطائف بھی ہو جاتے ہیں مثلاً مولوی احسان الٰہی ظہیر بم دھماکے میں اُڑے تو جنرل ضیاء الحق (نہ جانے دل کی کون سی خلش کو رام کرنے کے لئے) بھاگم بھاگ فضاؤں میں اُڑ کر ان کی فاتحہ پڑھنے جا دھمکے۔ جرنیل صاحب نے مصنوعی خشوع سے ہاتھ اٹھائے مگر یتیم بیٹا اپنے مسلک سے چمٹا رہا اور ہاتھ نہ اٹھائے۔

ابھی گذشتہ ماہ وزیر اعلیٰ پنجاب کے والد بزرگوار فوت ہوئے تو وفات کے دوسرے ہی روز صدر مملکت سمیت بہت سے اکابرین ہیلی کاپٹر میں فضائی سفر کر کے ان کے گاؤں ''وساوے والا'' میں فاتحہ خوانی کے لئے جا پہنچے۔ میڈیا کی مجبوری تھی۔ فاتحہ خوانی کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھوں کو ٹیلی ویژن پر دکھانا پڑا۔ اخبارات کو بھی تصویر چھاپنا پڑی۔ بعض علماء کرام تو خود میاں منظور وٹو کے پاس جا کر فاتحہ پڑھ آئے حق نمک ادا کر دیا مگر واپس آ کر یہ فتویٰ بھی داغ دیا کہ ''قادیانی'' کے لئے دعائے مغفرت کی جا سکتی ہے دوسروں نے اس کا نوٹس لیا اور صدر محترم پر اعتراض کر دیا کہ انہوں نے کیوں ایسا کیا؟ ...... یہ یقیناً صدر محترم کی ذہانت و فراست کا امتحان تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ...... جب میں نے وساویوالہ میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تھے تو وٹو صاحب کے قادیانی باپ کے لئے مغفرت کی دعا نہیں بلکہ میں نے تو منظور وٹو صاحب کے لئے صبرِ جمیل کی دعا کی تھی...... اس جواب سے علماء کا سینہ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ معاملہ صدر مملکت کا تھا لہٰذا کہنا پڑا ''جا چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر''

کوئی اور ہوتا تو علماء کرام یقیناً فرماتے کہ اگر آپ نے اپنی احتیاط کی تھی تو دوسرے ہزاروں حاضرین کو بھی بروقت انتباہ کر دیا ہوتا کہ کہیں مرنے والے کے لئے ''مغفرت'' کا کوئی جملہ نہ کہہ دیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر صدر مملکت کی اقتداء میں ہاتھ اٹھانے والوں کے منہ سے لاعلمی میں کوئی لفظ متوفی کی ''مغفرت'' کا نکل گیا ہوا تو اس کا گناہ کس کی گردن پر؟ بلکہ اپنے وفادار وزیر اعلیٰ کو بھی یہ سمجھا دینا چاہیئے تھا کہ مرنے والا تمہارا باپ ضرور تھا مگر دیکھو کہیں اس کے لئے بخشش کی دعا نہ کر بیٹھنا۔ زیادہ سے زیادہ تم بھی اپنے لئے صرف صبر ہی طلب کر سکتے ہو اس کے آگے ملّا ہاتھ میں لٹھ لئے کھڑا ہے۔ اس سے بچ کر رہنا۔ ہمارے یہاں تو دعا اور مغفرت کو بھی ایک مذاق بنا دیا گیا

ہے۔ ''کلام الٰہی'' میں تو کہیں مذکور نہیں کہ ایسی تکلفات اور رسم ورِیا میں بندھی ہوئی دعاؤں کا کوئی فائدہ کسی کو پہنچا ہے۔قرآن کریم میں تو تکرار سے یہی بیان کیا گیا ہے کہ ''کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا اپنے اعمال ہی کام آئیں گے''۔انسان جب راہِ ھدیٰ سے بھٹک کرٹا مک ٹوئیاں مارتا ہے تو عجیب مضحکہ خیز صورت پیدا ہوجاتی ہے۔

اگر سوچنے کی ذرا بھی صلاحیت ہے۔اگر خیر وشر کی ذرا بھی تمیز باقی ہے تو خدارا سوچئے کہ قوم کے ساتھ یہ کیسا بے ہودہ مذاق کیا جا رہا ہے۔اس ملک کے غریب عوام کے ساتھ بہت ہوچکی اللہ کے لئے اب ان پر ترس کھایئے۔اپنی سستی شہرت حاصل کرنے کی آرزو کو لگام دیجئے کہ آپ کی یہ سستی شہرت غریب عوام کو بہت مہنگی پڑ رہی ہے۔اپنی جماعت اور اپنی حمایتیوں سے ہٹ کر کبھی اس محروم قوم کے بارے میں بھی سوچا کیجئے۔ایسے بیکار ٹسوے بہانے کی بجائے کوئی قومی کام کیجئے۔ہمارے اسلاف نے تو ہمیں یہ سبق سکھایا تھا کہ قومی کام کرتے کرتے جب کسی فرد نے کوئی خانگی مسئلہ چھیڑ دیا تو فوراً وہ دیا بجھا دیا گیا جس میں بیت المال کا تیل جل رہا تھا کہ

''خانگی باتوں میں اس کا خرچ کرنا امانت میں خیانت کے مترادف ہے''۔

(ہفت روزہ لاہور 16/اکتوبر 1995)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁



افواج پاکستان کا فتح نصیب جرنیل عبدالعلی ملک

سیدنا حضرت مرزا ناصر الدین صاحب کا مبارک دور تھا۔حضور غیرملکی دورہ پر تشریف لے گئے ہوئے تھے کہ ریڈیو پر یہ المناک خبر نشر ہوئی کہ لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک (برادر اکبر جنرل عبدالعلی ملک) اور ان کی بیگم صاحبہ جو بیرون ملک اپنے سرکاری فرائض کی ادائیگی کے سلسلہ میں گئے ہوئے تھے ایک مہلک حادثے کا شکار ہوگئے ہیں اور ان کی نعشیں فوجی ہیلی کاپٹر کے ذریعہ تدفین کیلئے ربوہ لائی جا رہی ہیں۔

پاکستانی فوج کا وہ نامور ہیرو تھا جس نے 1965ء کی جنگ میں چھمب جوڑیاں محاذ پر دشمنوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے وہ انتہائی بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ جنگی فنون کا ماہر ترین جرنیل تھا۔لیکن کسی نامعلوم ''مصلحت'' کی بنا پر اسے محاذ جنگ سے واپس بلا لیا گیا اور بیرون ملک بھجوا دیا گیا۔ ؎

تو ہی قاتل مسیحا چارہ گر بھی
تجھے کس نام سے آخر بلاؤں

سناؤں حال دل کیونکر جہاں کو
محبت کو تماشہ کیوں دکھاؤں

زبان خلق نقارۂ خدا کی صورت مسلسل یہ اعلان کر رہی تھی کہ اگر ملک اختر حسین کو چند روز کی مہلت اس محاذ پر رہ کر اپنے جنگی جوہر دکھانے کی دی جاتی تو سارا کشمیر پاکستان کا حصہ بن چکا ہوتا اور پھر دوسری طرف سے ’’اٹوٹ انگ کی غیر اخلاقی‘‘ رٹ کبھی نہ لگتی۔

آج کے میرے موضوع کے ساتھ ان واقعات کی تفصیل کا براہ راست تعلق نہیں ہے اس لئے انہیں یہیں چھوڑتا ہوں۔

لیفٹیننٹ جنرل عبدالعلی ملک صاحب اپنے پیارے بھائی اور بھاوج کی میتیں فوجی ہیلی کاپٹر میں لے کر دیگر افسران فوج کے ہمراہ ربوہ پہنچے۔ جنرل ملک صاحب فوجی وردی میں ملبوس غم واندوہ کی تصویر بنے تحریک جدید کے گیسٹ ہاؤس میں کھڑے تھے۔ میں ان دونوں بھائیوں کے بہادری کے کارناموں اور ان کی فتوحات اور ان دونوں پر اللہ تعالیٰ کے فضل اور فتح ونصرت کے نشانات کا بڑے شوق سے مطالعہ کرتا رہا تھا۔

عبدالعلی ملک صاحب سے اپنا تعارف کرایا اور اس دلدوز سانحے پر تعزیت کا اظہار کیا یہ تو پھر اس عالی ظرف باوفا اور بلند اخلاق جرنیل کے اعلیٰ کردار کا اظہار کہ جس نے مصیبت کے وقت کی چند لمحوں کی ملاقات کو مستقل دوستی کی بنیاد بنا ڈالی۔ اول خط وکتابت شروع ہوئی پھر ملاقاتیں ہونے لگیں۔

ان کی عسکری اور انتظامی اعلیٰ صلاحیتوں اور سرفروشانہ جذبہ جہاد کا ثمر قبل از وقت پنشن پر بھیج دیئے جانے کی صورت میں ملا پھر بھی صبرو شکر کر کے گھر جا بیٹھے اور بقول شاعر ؎

داستان غم کو دل ہی میں نہاں رہنے دیا
راز یہ لیکن رقیبوں نے کہاں رہنے دیا
بجلیو یہ بھی ستم کا ایک نیا انداز ہے
سارے گلشن کو جلایا آشیاں رہنے دیا

یہ تو شاذ ہی ہوتا کہ میں پنڈی اسلام آباد جاؤں اور ملاقات کے بغیر واپس لوٹوں مگر جب ریٹائر ہو گئے تو پھر اوقات فارغ تھے بلا تکلف اور طویل ملاقاتیں شروع ہوئیں۔

عدو شرے بر انگیزد کہ خیرے مادراں باشد

بہت عمدہ عقل ودانش کے مالک تھے گفتگو ایسی شیریں اور دلنشیں طریق سے کرتے تھے کہ ان کی محفل سے اٹھنا مشکل ہو جاتا تھا بہت

بڑے مدبر تھے میں نے ان کی صحبت سے بہت فائدہ اٹھایا۔ساری خصوصیات کے باوجود حد درجہ منکسر المزاج اور حلیم الطبع تھے۔ایک دفعہ سرگودھا تشریف لائے تو میرے سے پہلے ان کے ورودِ سرگودھا کا علم میجر ملک شیر احمد صاحب کو ہو گیا چنانچہ وہ سبقت لے گئے اور اس عالی وقار شخص کی میزبانی کا شرف انہیں حاصل ہوا۔ مجھے بھی وہیں طلب فرمایا گیا اس طرح میں ایک شرف سے تو محروم رہا جس کی مجھے حسرت ہی رہی البتہ ان کی دل موہ لینے والی شیریں مثالی اور محبت وشفقت سے ضرور بہرہ ور ہوا۔

میں نے پیشگی اطلاع مجھے نہ دینے کا شکوہ کیا تو بڑی دلیری سے اس ''فروگذاشت'' کو تسلیم کیا اور آئندہ میرے ہاں تشریف آوری کا وعدہ کیا وہ شخص قول اور عزم کا پکا تھا وہ چونڈہ کے محاذ پر اپنی جان کو سخت خطرے میں ڈال کر دشمنوں کے گھر پر دستک دینے اور ان کی ملاقات کرنے سے نہیں چونکا تھا اور اس ضمن میں اس نے مادر وطن سے جو وعدے کئے تھے وہ بالا حکام کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پورے کر دکھائے تھے بھلا اپنے ایک محب سے کیا ہوا عہد کیسے بھولتا چنانچہ ایک روز میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میرے کچہری کے احاطہ میں واقع چیمبر پر تشریف لائے میں نے گھر لانے کیلئے بہتیرے جتن کئے مگر انہوں نے ایسی مجبوری ظاہر فرمائی کہ خاموشی کے بغیر چارہ نہ رہا اس روز ان کی بیگم صاحبہ بھی ہمراہ تھیں جو کار میں بیٹھی رہیں۔ میں نے انہیں سلام کیا ان کے پاس میرے ساتھ دوستی اور محبت کا ایسا رنگ میں ذکر فرمایا جس کا میں ہرگز مستحق نہیں تھا سب ان کی نوازشات کا یکطرفہ بہاؤ ہی تھا۔میرے ہاں قیام اور شب باشی پر اسلام آباد میں ضروری کام پر جلدی پہنچنے کی وجہ سے رضامند نہ ہوئے لیکن یہ کہہ گئے کہ تمہارے ہاں آنے کا وعدہ تو پورا ہوا۔

1974 میں دل کے عارضے سے بیمار پڑ گئے سی ایم ایچ راولپنڈی میں داخل رہے۔ میں نے ہسپتال جا کر تو عمداً ملاقات نہ کی جب گھر تشریف لائے تو حاضر ہوا۔فرمایا دل کا دورہ خطرناک تھا ادھر میں بیمار ا ہوا ادھر میری بیوی فون پر حضرت فاتح الدین سے درخواست دعا کرنے بیٹھ گئی۔حضور نے دعائیں کیں اور اس قدر فکر مندی کا اظہار فرمایا کہ روزانہ فون کر کے رفتارِ صحت کا دریافت فرمانا شروع کیا۔فرماتے تھے اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ خدا نے چاہا تو شفایاب ہو جاؤں گا۔ چنانچہ آٹھویں روز صحیح سلامت گھر آ گئے اور ساتھ کے کمرے میں ایک مولانا جنہیں بظاہر خفیف سا حملہ ہوا تھا ان کا وہیں سے جنازہ نکلا۔

قادر ہے وہ بارگہ ٹوٹا کام بناوے
بنا بنایا توڑ دے کوئی اس کا بھید نہ پاوے

اس کے بعد 18 / 17 سال تک اللہ تعالیٰ نے مہلت عطا فرمادی۔لاریب اللہ تعالیٰ کے فضل وعنایات اور ایک بندۂ مقبول کی قبولیت کا یہ ایک درخشندہ نشان تھا ناواقف اسے ایک اتفاقیہ شفایابی کا واقعہ قرار دے تو وہ معذور ہے اسے ان رموز ربانی کا ادراک ہی نہیں ہے اور وہ اللہ والوں کے کوچہ سے ہی بے خبر ہے۔

جب کبھی اس خطرناک بیماری اوراس سے معجزانہ شفایابی کا تذکرہ ہماری باہم ملاقاتوں میں ہوتا تو جرنیل صاحب اسے ہمیشہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی دعائے مستجاب کا کرشمہ قرار دیتے اور جذبہ شکر وامتنان سے مغلوب ہوجاتے اور پھر خاموش ہوجاتے اور اگلی ساری تفاصیل اشکوں کی زبانی سنناپڑتی۔ کاش ہم بھی کسی صاحب دل محبوب الٰہی کی خصوصی دعاؤں اور توجہ کے لائق ٹھہریں تو ہمارے سارے درد رفع ہوجائیں۔ ؎

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشئہ چشمے بہ ما کنند

(ترجمہ) وہ لوگ جو اپنی ایک نظر سے خاکسار کو کیمیا بنادیتے ہیں۔ اے کاش کسی ایسے بزرگ کی نگہ کرم ہم پر بھی پڑ جائے۔

مارشل لاء کا زمانہ تھا سرگودھا میں تعینات ایک ڈپٹی مارشل لاءایڈمنسٹریٹر سے ان کے ایک دوست کا کوئی کام پڑ گیا میں ان کے ہاں گیا ہوا تھا مجھے ایک خط لکھ کر DHLA کو پہنچانے کی ذمہ داری سپرد فرمائی میں نے پوچھا کہ وہ صاحب آپ کے واقف ہیں فرمایا نہیں۔ پھر بڑے پراعتماد لہجے میں فرمایا کہ اس دشت میں میں نے صحرانوردی کی ہے امید ہے وہ مجھے جانتے ہوں گے۔ کام جائز اور آسان ہے اگر خدانخواستہ وہ نہ کرسکے تو مجھے فون کردینا میں نے شام ڈھلے مکتوب الیہ کے اردلی کو وہ چٹھی دی کہ ابھی جرنیل صاحب کو پہنچا دیں اور پھر تھوڑی دیر وہیں ریسٹ ہاؤس کے گیٹ پر میں نے توقف کیا کہ شاید مجھ سے کوئی بات پوچھنا ہو۔ بنگلہ اور گیسٹ ہاؤس کے درمیان کافی فاصلہ ہے کیا دیکھتا ہوں کہ جرنیل صاحب تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھے آرہے تھے مجھے ملے اور عبدالعلی ملک صاحب کی خیریت دریافت کی اور بڑے تعریفی انداز میں ان کا ذکر کیا مجھے تاکید کی کہ انہیں آج ہی فون کردیں کہ اس حکم کی تعمیل ہوگی پھر جب میرا اسلام آباد جانا ہوا تو مجھے ڈی ایم ایل کا جوابی خط دکھایا کہ انہوں نے کام کردیا اور پھر ملک صاحب کو مطلع بھی کردیا۔

جنرل ملک صاحب کی وفات سے چند ہفتے قبل 11 بجے دن کے قریب کوٹھی پر حاضر ہوا۔ ملاقات ہوئی مجھے اس روز بہت کمزور لگے لیکن میں نے اس کا اظہار نہ کیا۔ میں نے اس روز پشاور جانا تھا مختصر ملاقات کرنا چاہتا تھا مگر پورا ایک گھنٹہ تک اٹھنے نہ دیا۔ کبھی کبھی شعر کہتے تھے اردو ادب سے گہرا لگاؤ تھا لیکن اب کے زیادہ غزلیں کہی تھیں مجھے ان کے عکسی فوٹو دیئے۔ تب میں نے جانا کہ میدان جنگ کا بے مثال ہیرو شعروادب کی دنیا میں بھی ایک خاص مقام رکھتا ہے۔

18/20 سال سے ہمارے ملک عزیز میں جو تکفیر کا بازار گرم رہا ہے اس کا ہمیشہ درد بھرے دل سے ذکر کرتے تھے پھر فرماتے آپس میں جھگڑا کرنے کی بجائے اس معاملہ کو کیوں نہ رب علیم وخبیر پر چھوڑ دیا جائے۔ نامعلوم اس کی نظر میں کون مومن ہے اور کون کافر۔ اور بقول جناب جوش ملیح آبادی۔ ؎

جوش میں نے کب کیا تھا ادعا اسلام کا
شیخ کو کیوں فکر لاحق ہے مری تکفیر کی

اس ضمن میں علامہ اقبال کا ذکر کرتے ہوئے کہ وہ بھی اپنے دور کے علماء کے مشقِ ستم بنے رہے غالباً اسی دور کا علامہ مرحوم کا شعر ہے۔

ے

ہمارے مولوی آ جائیں جس دم اپنی آئی پر
تو منطق ان کی وقفِ فتویٰ تکفیر ہوتی ہے

الغرض وہ آخری ملاقات تھی ملکی حالات پر تبصرہ فرماتے رہے لیکن ان کی باتوں میں مایوسی کا شائبہ تک نہ تھا۔ ہمیشہ الٰہی وعدوں پر یقین رکھتے اور پُرامید رہتے۔

میرے ساتھ الوداعی معانقہ فرمانے لگے تو صدیق طاہرؔ کی اپنے سرجن سے تنبیہہ آمیز درخواست مجھے یاد آ گئی جو انہوں نے اپنے دل کے آپریشن سے قبل کی تھی۔ ع

ہمارے سرجن پیارے سرجن یہ دل ہے اس کا خیال رکھنا

چنانچہ میں نے ان کے مجروح دل کا زیادہ ہی خیال رکھا اور بانہوں میں بانہیں ڈالنے پر اکتفا کیا۔ میری یہ آخری ملاقات تھی۔ پھر ان کی بیماری کی بھی اطلاع نہ ہوئی اور وہ نایاب وہ بے مثال مجاہد اپنے سر پر اپنی قوم وملت اور مادر وطن کی شاندار خدمات کا تاج سجائے اپنے مالک حقیقی کے حضور حاضر ہو گیا۔ اللہ کریم اسے اپنے غفران کی چادر میں لپیٹ لے اور اسے اپنے پیاروں کے قرب میں جگہ دے اور اس کا دل جس پر دنیا والوں نے چرکے لگائے تھے اور وہ ان کے صدقات سے داغ داغ ہو گیا تھا اللہ تعالیٰ اس کے عوض اس کی روح کو اپنے بے پایاں فضل ورحم سے دائمی تسکین عطا فرمائے۔ اے اللہ تو ایسا ہی کر۔

میں دعا کر رہا ہوں اور قارئین کرام سے بھی دردمندانہ درخواست دعا کرتا ہوں کہ اس سرفروش اور جری جرنیل کے لئے دعا کریں کہ اللہ اسے اپنی رضوان کی بہشت میں جگہ دے۔ اور ان کے پسماندگان کو ہمیشہ اپنی حفظ وپناہ میں رکھے۔ آمین

کہ اس جانے والے نے اس قطعہ زمین کی حفاظت کی خاطر اپنی جان کی ذرہ بھر پرواہ نہ کی تھی جو ملکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے رسول عربی ﷺ کے نام کے صدقے اس کے نام لیواؤں کو عطا کیا تھا۔

میرا موصوف کی وفات کے بعد اسلام آباد جانا ہی نہیں ہوا اور ڈرتا ہوں کہ ایمبیسی روڈ پر واقع اس کی کوٹھی پر کیسے جاؤں گا جہاں وہ عظیم الشان ڈھونڈھے نہیں ملے گا جس کی ملاقات سے روحانی حظ نصیب ہوتا تھا تاہم افسردہ دل کو ذرا قرار آیا تو حاضری دوں گا اور یہ

دعا دہراؤں گا۔ ؎

مہ و انجم کے خالق پھر وہی تارے فروزاں کر
ترے آفاق پر بے رونقی معلوم ہوتی ہے

ابھی تو اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود اپنا یہی حال ہے کہ ؎

پرانی محبتیں یاد آ رہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے

(ہفت روزہ لاہور 25/اپریل 1992)



سیدنا حضرت مصلح موعودؓ کی پاکیزہ سیرت کے چند گوشے

اس کی ظاہری اور باطنی برکتیں سب دنیا میں پھیلیں گی

مذہبی قوموں کی زندگی میں عظیم اور مخلص راہنما بہت بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ اور قومی اوراق پر اپنی عظمت کے انمٹ نقوش ثبت کر جاتے ہیں۔ قومیں ان کی زندگی سے زندگی پاتی ہیں۔ لیکن ان مرنے کے بعد بھی ان کی قومیں زندہ رہتی ہیں۔ آج جس عظیم مذہبی راہنما کے ایک زریں واقعہ کا بیان کرنا مقصود ہے وہ لاکھوں میں نہیں کروڑوں میں ایک تھا۔ اور وہ "**مظھر الحق و العلا**" کہ جس کی پیدائش سے بھی تین سال قبل اس کی صفات حسنہ اور کمالات خاصہ کے خدوخال بڑی تفصیل کے ساتھ عالم الغیب والشھادۃ نے بیان فرما دیئے تھے۔ وہ تعداد میں باون ہیں۔ جوں جوں ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو حیرت ہوتی ہے کہ مصور حقیقی اور خالق کون ومکان نے ایک شخص میں کتنی حسنات اور خصوصیات جمع فرما دی تھیں۔

اور پھر کبھی 22 جنوری 1886ء سے 20 فروری 1886 تک ایک فنافی اللہ کی تنہائی میں تضرعات اور کامل اضطراری حالت میں مناجات کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ تو کبھی عالم تصور میں اس شمع کے ایک پروانے کی جان قربان کر دینے کی تڑپ کا نظارہ کرتے ہیں۔ جو جہلم سے اس شمع کی لو کی تلاش میں پھرتا پھرتا ہوشیار پور جا پہنچا تھا۔ پھر اس آقا کے ارشاد کی تعمیل میں اس کے غلاموں کی ملاقات کرانے سے معذرت کے اظہار پر اس کی دلشکنی اور پھر آسمان سے اس کی دلجوئی سے معمور آواز "کہ مہمان کا اکرام کریں" ادھر اس راہِ ہدیٰ کے مسافر کو آسمانی حکم کہ "یہیں تمہارا پہنچنا مقدر تھا" اس مکان بلکہ اس سارے شہر پر روحانی نجوم کی چمکار جس نے سارے ماحول پر

احاطہ کر رکھا تھا ایسے میں مولانا برہان الدین ؓ کی زیرگی بصیرت اور باریک بینی بھی ایک روحانی غذا مہیا کرتی ہے۔ کہ جو مختصر سی جھلک دیکھ کر دم نقد متاع جسم وجان لٹا بیٹھے۔ اور برملا پکار اٹھے۔ اس کی منزل دور بہت دور ہے۔ اس زمانے کا نقشہ الفاظ میں کھینچنا ناممکن ہے۔ کوئی صاحب حال ہو جو اس روحانی منظر کی تصویر کشی کر سکے۔

اے کاش ''سلطان القلم'' کا حقیقی وارث حضرت اماں جان ؓ کا کوئی ''بشریٰ'' پھر دنیا میں آئے۔ ایسا کبھی کوئی مبشر وجود روحوں میں انقلاب پیدا کرنے والے اس دو ماہ کے شب وروز کا نظارہ ہمیں کرادے ایک بار پھر وہ ''چاند'' زمین پر اتر کر آئے۔ یا کوئی میر محمد اسحٰق ؓ پھر دنیا میں ظاہر ہو۔ ہاں وہی جو طلسماتی بیان سے 14 صدی قبل کے زمانے پہنچ جاتا تھا۔ اور سامعین کو بھی اس مبارک محفل کے نظارے کرادیتا تھا۔

وہ نکات معرفت بتلائے کون
جام وصل دلربا پلوائے کون
ڈھونڈتی ہے جلوہ جاناں کو آنکھ
چاند سا چہرہ ہمیں دکھلائے کون

یا گردش ماہ سال ہی کوئی ایسی چال چلے جو ہمیں انیسویں اور بیسویں صدی کے سنگم میں لے جائے۔

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

حضرت مسیح موعودؑ کے اس مبارک سفر میں ہمسفری کی سعادت جن دو بلند بخت ساتھیوں کو نصیب ہوئی۔ ان کی حالت ایمانی بھی قابل صد ناز ہے۔ یعنی حضرت میاں عبداللہ صاحب سنوری ؓ اور حضرت شیخ حامد علی صاحب ؓ اللہ تعالیٰ کے فضلوں کی موسلا دھار بارش ان کو دیکھنے کی سعادت عطا ہوئی۔

سنانے والے افسانے ھما کے
کبھی دیکھے بھی ہیں بندے خدا کے
نہ واپس آیا دل اس در پہ جا کے
وہیں بیٹھا رہا دھونی رما کے

آج ہی صلح کرو

گزشتہ صدی کی چھٹی دھائی تھی۔ اس کا اوائل ہو ہوگا۔ کیونکہ حضرت مصلح موعود ؓ ابھی رتن باغ لاہور قیام فرما تھے۔ سر ملک فیروز خان

صاحب نون جو چند سال بعد وزیر اعظم پاکستان بنے۔ ان دنوں لاہور ہی میں تھے۔ وہ خان بہادر ملک صاحب خان صاحب نون سے چوتھی پانچویں پشت پر ملتے تھے۔ ملک صاحب خان نون تو بڑے فدائی اور مخلص تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی میجر ریٹائرڈ ملک سردار خان صاحب نون تھے۔ ملک صاحب خان صاحب نون کی کسی وجہ سے سر فیروز خان صاحب نون اور میجر سردار خان سے ناراضگی ہوگئی۔ اور تلخی اتنی بڑھی کہ ملک صاحب خان نے نون خاندان کی شادی غمی میں شرکت کرنا ترک کردی۔ اور افتراق خلیج اتنی وسیع ہوگئی۔ جس سے سارا نون خاندان گو یا ریزہ ریزہ ہوگیا۔ میجر ملک سردار خان صاحب اور سر فیروز خان صاحب تو شاید کسی کی بات مانتے۔ ملک صاحب خان صاحب کا خاندان میں رعب سب سے فزوں تر تھا۔ ان سے گفتگو کرنے کی کسی میں ہمت ہی نہیں تھی۔

آخر بڑی سوچ و بچار کے بعد سر فیروز خان صاحب اور میجر سردار خان صاحب کو یہ تدبیر سوجھی کہ ایک ہی شخص ہے جو ہمارے درمیان مصالحت کرواسکتا ہے۔ جو امانت دار بھی ہے۔ سچا بھی ہے۔ اور زیرک، مردم شناس اور دانش مند بھی ہے۔ اور صرف وہی ملک صاحب خان صاحب کو صلح پر مائل بھی کرسکتا ہے اور وہ ہے حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحبؓ چنانچہ یہ دونوں بھائی حضرت صاحب کی خدمت میں رتن باغ میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ بڑے بھائی ملک صاحب خان صاحب ہم دونوں سے سخت ناراض ہیں۔ اور ساری نون فیملی جو 12 دیہات کی واحد مالک ہے۔ اور جو باہم اتفاق واتحاد و یگانگت میں بے مثل تھی۔ اب پارہ پارہ ہوچکی ہے۔

حضرت صاحب نے ملک صاحب خان صاحب کو طلب فرمایا۔ اور ملک صاحب خان صاحب نے خود مجھے یہ واقعہ سنایا۔ ملک صاحب حاضر ہوئے۔ تو حضرت صاحب نے فرمایا کہ ملک صاحب بھائیوں بھائیوں میں اتنی رنجش اور ناراضگی کہ علیک سلیک بھی ختم ہوگئی ہے۔ بول چال بھی بند ہے۔ بہت نامناسب ہے۔ آپ پہلے سر فیروز خان صاحب نون کے پاس جائیں۔ اور ان سے معذرت طلب کریں۔ پھر اپنے چھوٹے بھائی میجر سردار خان صاحب سے معافی مانگیں۔ اور پھر آج ہی مجھے رپورٹ دیں۔

ملک صاحب کہتے تھے۔ کہ اس سے میرے دل میں انقباض سا پیدا ہوا۔ کہ حضرت صاحب نے باہم ناراضگی کی کوئی وجہ دریافت نہیں فرمائی نہ میری کسی زیادتی کی نشاندہی فرمائی ہے۔ اور اپنے سے چھوٹے بھائیوں کے سامنے جھکنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ مگر ملک صاحب فرماتے تھے کہ میری کیا مجال تھی کہ عذر خواہی کرتا یا تعمیل ارشاد میں ذرا تاخیر ہی کرتا۔ مجبوراً پہلے سر فیروز خان صاحب کی کوٹھی ''الوقار'' مسلم ٹاؤن لاہور پہنچا۔ ملک صاحب نے مجھے موٹر کار سے اترتے دیکھا۔ تو تیزی سے میری طرف لپکے۔ اور بڑی محبت سے میرے ساتھ معانقہ کیا۔ اور زار و قطار رو رہے تھے۔ اور کہتے جاتے تھے کہ میں قربان جاؤں میرزا محمود احمد پر جنہوں نے ہمارے سارے خاندان پر یہ احسان عظیم کیا۔ جو اور کسی سے ممکن ہی نہیں تھا۔ ملک صاحب نے معافی مانگی کہ یہی انہیں حکم تھا۔ سر فیروز خان صاحب کہتے جاتے کہ معافی کیسی۔ آپ میرے عزیز ترین بڑے بھائی ہیں۔ آپ مجھے خدا کے لئے معاف کردیں۔ اور ابھی میں

جا تا ہوں حضرت صاحب کے پاس مگر ان کا کس منہ سے شکریہ ادا کر سکوں گا۔

بھائی صاحب آپ کھانا تو آج میرے ساتھ کھائیں۔ ملک صاحب خان صاحب نے کہا کہ مجھے اس کی فرصت نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت صاحب کا حکم ہے کہ میجر سردار خان صاحب سے بھی جا کر معافی مانگو۔ اور پھر حضرت صاحب کو ابھی رپورٹ بھی دینی ہے۔ چنانچہ اس طرح ملک صاحب اپنے چھوٹے بھائی کے پاس گئے۔ اور وہ بھی خوشی ممنونیت سے بے حد مغلوب تھے۔ اور آنسوؤں کی برسات میں دونوں بھائی گلے ملے۔ اور ان کی کھانے کی درخواست بھی اسی بناء پر نامنظور ہوئی۔ کہ حضرت صاحب نے فوراً رپورٹ دینے کا حکم دیا تھا۔ اس کی تعمیل مجھ پر فرض ہے۔ چنانچہ ملک صاحب ڈیڑھ گھنٹے میں ہی اس کارروائی سے فارغ ہو کر حضرت صاحب کے ہاں پہنچے۔ اور سارا ماجرا سنایا۔ اور بصد ادب عرض کیا کہ آپ کے احکام کی من وعن تعمیل کی ہے۔ آپ اس پر بہت خوش ہوئے۔ اور ملک صاحب کہتے تھے کہ حضرت صاحب نے مجھے اپنے پاس بٹھالیا اور فرمایا کہ ملک صاحب آپ کے لئے یہ میرا حکم دل پسند تو شاید نہ ہوا ہوگا۔ کہ کسی قسم کی تحقیقات کرنے یا ناراضگی کی وجوہ معلوم کرنے کے بغیر ہی آپ کو حکم دے دیا کہ جاؤ اپنے سے عمر میں چھوٹے بھائیوں سے معافی مانگو۔ وجہ یہ تھی کہ آپ نے میری بیعت کی ہوئی ہے۔ سر فیروز خان اور میجر سردار کے ساتھ تو میرے معاشرتی تعلقات ہیں۔ وہ میرے حکم کے پابند تو نہیں۔ مگر آپ پابند ہیں۔ اس لئے آپ کو حکم دیا۔ پھر سیّدنا حضرت رسول عربی کا قول صادق ہے کہ جو شخص اپنے روٹھے ہوئے بھائی کو منانے میں پہل کرے گا وہ 500 سال پہلے جنت میں جائے گا۔ حضرت صاحب نے فرمایا کہ یہ استعارے کا کلام ہے۔ مگر بہر حال اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ پہل کرنے والا بہت پہلے جنت میں جائے گا۔ اور اس حدیث شریف کی رو سے آپ ایک ہزار سال پہلے جنت میں جائیں گے۔ تو سوچ لیں کہ یہ کس قدر فائدے اور منافع کا سودا ہوا۔ ملک صاحب فرماتے تھے۔ کہ حضرت صاحب نے ایسے پیارے اور دلکش انداز میں میرے معذرت خواہی کے واقعات کو پسند فرمایا کہ میں عش عش کر اٹھا۔ اور مجھے انشراح قلب نصیب ہوا۔ کہ واقعی حضرت صاحب کا حکم بڑی حکمتوں پر مبنی تھا۔ اس کے بعد پھر ان صاحبان کے درمیان کبھی اختلاف پیدا نہ ہوا۔ جس کا راقم خود شاہد ہے۔

ملک سر فیروز خان نون صاحب جب صدر ایوب کا مارشل لاء لگا۔ تو وزارت عظمیٰ سے فارغ ہو کر لاہور اپنی کوٹھی میں مقیم ہو گئے۔ اور قریباً ہر ہفتے مجھے فون کرتے اور سب سے پہلے پوچھتے۔ ''حضرت صاحب کی طبیعت کیسی ہے'' اور ساتھ مجھے یہ ہدایت ہوتی۔ تمہارا جب ربوہ جانا ہو تو ''حضرت صاحب'' کی خدمت میں میری طرف سے سلام اور آداب عرض کرنا نہ بھولنا۔ دوسرا سوال موصوف کا یہ ہوتا کہ سر ظفر اللہ خانؓ کب پاکستان آ رہے ہیں۔ میں عرض کرتا کہ نومبر میں تشریف لایا کرتے ہیں۔ تمہیں الفضل سے سے معلوم ہو جائے گا۔ کہتے مجھے بتا دینا میں انہیں اپنے گھر پر ملاقات کی تکلیف دوں گا۔ کیونکہ خود بیمار تھے۔ گھر سے باہر نہیں جاتے تھے۔

میں پوچھتا بھائی صاحب خان کا کیا حال ہے۔کہتے ''ٹھیک ہی ہیں'' ہاں وہ انشاء اللہ ٹھیک ہی رہیں گے۔کیونکہ وہ ورزش بہت کرتے ہیں۔اس وقت ان کی عمر 84 سال تھی۔میں نے کہا باباجی وہ اب ورزش نہیں کرسکتے۔فرماتے۔وہ چھ نمازیں باقاعدگی سے پڑھتے ہیں اس عمر میں یہ کافی ورزش ہے۔ہمیں تو یہ بھی نصیب نہیں۔

پھر جب 1965ء میں حضرت مصلح موعودؓ کی وفات ہوئی۔تو ان کے بڑے بیٹے ملک نورحیات جو ایم این اے تھے اور سرگودھا میں سکونت پذیر تھے۔انہیں فوراً حکم دیا کہ فوراً ربوہ پہنچو۔حضرت صاحب ہمارے بڑے محسن تھے۔فوت ہوگئے ہیں۔ملک نورحیات اس روز شدید کمر درد کے باعث بہت بیمار تھے۔بڑی موٹر کی عقبی سیٹ پر گاؤتکیہ رکھ کر ربوہ بیت المبارک کے گیٹ پر مجھے ملے۔مجھے بتایا کہ والدصاحب نے صبح دوبارہ فون کیا کہ تو میں نے کہا کہ میں ابھی جارہا ہوں۔تو سخت غصے میں تھے کہ اتنا بڑا شخص حضرت صاحب فوت ہوگئے ہیں تم رات کو نہیں گئے۔صبح آٹھ بجے تک بھی ربوہ نہیں پہنچے اور ملک نورحیات صاحب بتاتے تھے کہ ٹیلی فون کے ریسیور کو غصے سے اتنے زور سے پھینکا کہ چور چور ہوگیا ہوگا۔پھر ملک نورحیات نے بتایا کہ مجھے والدصاحب نے تین حکم دیئے تھے۔تم میری مدد کرو۔اول یہ کہ حضرت صاحب کا چہرہ مبارک دیکھنا ہے۔دوئم آپ کے صاحبزادگان سے اظہار تعزیت۔اور سوئم اجازت لے کر حضرت صاحب کے جنازہ میں شامل ہونا ہے۔چنانچہ میں انہیں لے کر زیارت کے لئے گیا۔اس وقت صاحبزادہ مبارک احمد صاحب بھی ساتھ تھے۔پھر انہوں نے تعزیت کی اور جنازہ میں شامل ہونے کی اجازت چاہی۔صاحبزادہ مرزا مظفر احمد صاحب بھی موجود تھے۔انہوں نے کہا کہ اجازت کی تو ضرورت نہیں مگر آپ کو شدید کمر درد کی تکلیف ہے۔آپ آرام کریں۔جنازہ سہ پہر کو ہوگا۔اتنی دیر آپ انتظار نہیں کرسکتے۔

دعا سے اولاد

یہ ذکر بھی تاریخ میں محفوظ ہوجانا چاہئے کہ ملک سر فیروز خان صاحب کی بیگم صاحبہ جو نون خاندان سے تھیں۔اور ملک صاحب خان صاحب کی بھتیجی تھیں۔انہیں ''لیڈی نون'' کہا جاتا تھا۔8 سال ان کی شادی کو ہوئے تھے۔مگر ان کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ان دنوں لارنس روڈ لاہور پر سر فیروز خان صاحب نون کی رہائش تھی۔محترمہ لیڈی نون صاحبہ پریشان تھیں۔ایک صبح اپنے ڈرائیور مسمی امیر علی کو لیڈی نون صاحبہ نے حکم دیا کہ موٹر نکالو سفر پر جانا ہے۔اور ایک نوکرانی اور اپنے خاندانی ملازم احمد شیر کلر کو ہمراہ لے کر حکم ہوا کہ امرتسر چلو۔وہاں جاکر حکم ہوا۔کہ بٹالہ کی طرف جانا ہے۔وہاں سے قادیان پہنچے۔احمد شیر کلر چند سال قبل فوت ہوئے انہوں نے مجھے یہ واقعہ سنایا۔کہ ایک بجے کے قریب قادیان یہ قافلہ پہنچا۔حضرت صاحب کے گھر بیگم صاحبہ نے پیغام بھجوایا تو نوکرانی اور بیگم صاحبہ تو حضرت صاحبہ کے گھر گئیں۔ڈرائیور امیر علی اور احمد شیر کو نیچے بٹھایا گیا۔پھر چائے اور کھانے سے تواضع ہوئی۔اور قریباً دو گھنٹے اوپر ٹھہر

کرمحترمہ بیگم صاحبہ اورنوکرانی واپس آئیں۔اورلاہورواپس آگئے۔اوپرحضرت سیدہ ام ناصر صاحبہ کے گھروہ دو گھنٹے قیام رہا۔اوراس واقعہ کے عینی شاہد صاحبزادہ مرزا مبارک احمد بھی ہیں۔انہوں نے مجھے زبانی تفاصیل بتائی تھیں۔کہ بیگم صاحبہ نے گھرآتے ہی حضرت صاحب سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔حضرت صاحب دفتر میں تھے۔نماز پڑھانے کے لئے گھر سے جانے لگے۔توسیدہ ام ناصر صاحبہ نے لیڈی نون کا بتایا۔آپ نے ان سے خیریت دریافت فرمائی۔لیڈی نون صاحبہ نے کہا کہ حضرت شادی ہوئے 8 سال ہو گئے ہیں میری گودہری نہیں ہوئی۔آپ کے ''دوست'' سرفیروز خان کا کیاہے۔وہ تواولاد کی خواہش میں ایک اورشادی کرلے گا۔میرے لئے دعا کریں۔چنانچہ حضرت صاحب نے گھر کے افراد کے ساتھ اسی وقت دعا کی۔یہ 1925 کا واقعہ ہے۔

احمد شیر کلرنے کئی بار مجھے یہ واقعہ سنایا پھراللہ کا فضل ہوا کہ 1926ء میں ملک نورحیات خان صاحب نون پیدا ہوئے۔اوراس خاندان پر جو پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔اوریاس وناامیدی کا عفریت ڈرارہا تھا۔اس پر بادصبا کا پہلا جھونکا آیا۔کہ مسرتوں اورشادمانیوں کی بھرپور بہار آئی۔یہ پہلا بچہ 4,5 ماہ کا ہوگا تو پھروہی خوش نصیب قافلہ محترمہ لیڈی نون صاحبہ کی سرکردگی میں ان کے حکم پرقادیان پہنچا۔اورحضرت کی خدمت میں ممنونیت اورخوشیوں سے سرشار ہوکر پھرگھر پرملاقات کی۔اورلیڈی نون صاحبہ نے عرض کیا کہ یہ آپ کی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔اس کے سرپراپنادست مبارک پھیریں۔کہ یہ بلندنصیبے والا ہو۔اس کے بعد ملک صاحب کے ہاں دو بیٹے ملک ظہورحیات نون اوراورملک منظورحیات نون اوردودختران بھی تولد ہوئیں۔سبھی بااقبال ہوئے مگروہ جوحضرت مصلح موعودؓ کی دعاؤں سے پیدا ہوا تھا۔اوروہ جس پروہ نگاہ صدناز پڑی۔اورجس کے سرپروہ مبارک ہاتھ لگے۔جن کے ساتھ افضال الٰہی اورنعماء آسمانی کا آنا ازل سے مقدر تھا۔

ہاں وہی جس کی یہ علامت تھی کہ قومیں اس سے برکت پائیں گی۔اوراس کی ظاہری اورباطنی برکتیں تمام زمین پرپھیلیں گی۔مالک الملک علیم وخبیر نے اس کی پیدائش سے قبل ہی شائع کروادی تھیں۔جاننے والے جانتے ہیں اورراقم نے بھی ملک نورحیات خان صاحب نون کا اس پہلو سے بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا۔وہ صورت اورسیرت میں سارے نون خاندان میں یکتا تھا۔دنیاوی لحاظ سے وہ ایک کامیاب سیاست دان جوکئی بار ایم این اے بنا اوردوتین مرتبہ مرکزی وزیر کے منصب پرفائز ہوا۔دیانتداری، راست بازی اورسخاوت اوربے ریاعبادت گزاری میں شغف اس کی خصوصیات تھیں۔وہ دوستوں کا باوفا دوست،خلیق،ملنساراورمنکسرالمزاج اورغریب پرور تھا۔ستر سال کی عمر میں وفات پا گیا۔اس کی سخاوت اورغرباءپروری اوردیگرنیک کاموں کا سلسلہ صدقہ جاریہ کی صورت ابھی مسلسل چل رہا ہے۔

ملک نورحیات خان صاحب نون حضرت حافظ مرزاناصراحمد صاحب سے کئی بار ملے۔اور سیدنا حضرت مرزاطاہراحمد صاحب میری موجودگی میں ملک نورحیات صاحب کی بہت تعریف فرماتے اورکئی بارلندن سے مجھے ارشاد ہوا کہ ملک صاحب کوآپ کا سلام

پہنچاؤں۔

ملک نور حیات صاحب نون ایم این اے تھے کہ لاہور سے ربوہ حضرت چوہدری محمد ظفراللہ خان صاحبؓ کی تقریر سننے کے لئے آئے بڑے ادب سے چوہدری صاحب سے ملے انہیں ''انکل انکل'' کہہ کر پکارتے تھے۔ لندن کے زمانے کے واقعات مزے لے لے کر سناتے رہے کہ ہم تینوں بھائی ہر اختتام ہفتہ پر ''انکل'' سے ملنے جاتے تھے اور وہ ہمیں ایک سٹور پر لے جاتے وہاں سے مختلف تحائف خرید کر دیتے تھے جبکہ ہمارے والد صاحب کہتے تھے کہ چوہدری صاحب کو تنگ نہ کیا کرو اور وہ ساری آمدنی چندوں میں اور غرباء پر خرچ کر دیتے ہیں مگر ہمیں کھانے پینے کی چیزیں ملتی تھیں اس لئے ہم خاموشی سے انکل کے پاس کھسک جاتے تھے۔

سارا نون خاندان ملک صاحب خان صاحب نون سابق ڈپٹی کمشنر کو راست گو، بہادر، عابد و زاہد اور تقویٰ شعار مانتا تھا اور خاندان کے سبھی چھوٹے بڑے ان کا بہت ادب کرتے تھے مگر صد حیف کہ ان کے ورثاء نے ان کی حسنات سے کم ہی حصہ پایا اور ایمان وایقان کی وہ مشعل جو خلافت اولیٰ میں روشن ہو کر مسلسل نور برساتی رہی تھی ملک صاحب کی وفات کے روز ہی ٹمٹمانے لگی تھی اور بالآخر بجھ ہی گئی اور وہ گاؤں جو دینی اور دنیاوی نعماء سے مالا مال ہوتا تھا۔ اس کی ساری رونقیں ختم ہو گئیں۔ نہ وسیع اراضی نہ وہ باغات اور نہ وہ اعلیٰ نسل کے مویشی اور گھوڑے رہے اور وہاں اب ہُو کا عالم ہے، سب کچھ چھن گیا ہے۔ (3۔اپریل 2001ء)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

مجلہ برموقع صدسالہ جوبلی راولپنڈی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجھے میرے واجب الاحترام بھائی جناب امیر صاحب راولپنڈی نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں جماعت احمدیہ راولپنڈی کی طرف سے صدسالہ خلافت جوبلی کے موقعہ پر شائع کئے جانے والے مجلہ کے خلفائے عظام کے بارہ میں اپنے ''تاثرات اور مشاہدات'' پر مبنی ایک نوٹ لکھ کر بھجوادوں۔ مجھے اس سلسلہ میں کئی موانع درپیش تھے۔ میں نے اول تو معذرت کی جو آں ممدوح نے بہ دلائل قویہ منظور نہ فرمائی چنانچہ اپنی ساری مایوسیوں اور پژمردگیوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے گزشتہ ایک شام اپنے رب علیم و حکیم وقدیر کے حضور التجا کی کہ میرے خدایا اس مشکل کام کو میرے لئے اپنے فضل سے سہل فرمادے گو میں اتنی روحانی اور دینی حیثیت رکھنے والے عالی مقام بزرگوں کی قد آور شخصیات کے بارہ میں قلم اٹھانے سے ہر صورت ڈرتا ہوں اور علم کے لحاظ سے میں منفی صفر ہوں مگر تیری قدرت کے آگے روک کیا ہے اور مجھ نا ہنجار سے کچھ کام لے لے اور پھر اسے اپنے کرم سے اپنی رضا کا موجب بھی بنادے۔ چنانچہ میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور کہا کہ ؎



چل میرے خامے بسم اللہ

سیّدنا حضرت مصلح موعود کے دور کی چند روح پرور یادیں

چونکہ مجھے اپنے ''مشاہدات'' تک محدود رہنے کا ارشاد ہے اس لئے سید و مرشد حضرت خلیفہ اول حضرت مولانا نورالدینؓ کے زمانہ کا ذکر ہے جو منقولات پر منحصر ہے، میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ یہاں تک پہنچا تو پھر اس احساس کمتری نے کچوکے دیئے کہ تم کم علم اور خام قلم اور عقل والے اس شخص کے بارہ میں کیا لکھ سکو گے جس کی پیدائش سے بھی تین سال قبل خدائے علیم وخبیر نے (52) باون Complex صفات سے متصّف ہونا بیان فرمایا ہے۔ ہاں اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں یہی کچھ کہہ سکتے ہو کہ ؎

تو کائنات حسن تھا یا حُسن کائنات

(1)۔ 1939 میں ابھی میں لڑکپن تھا جب حضورؓ کی سلور جوبلی حضور کی خلافت پر 25 سال کامیابی سے گزر جانے کے بعد منائی گئی اور تو زیادہ کچھ یاد نہیں سادہ سے دو شعر البتہ خوب یاد ہیں جو ایک دل سے نکلے اور سیدھے دلوں میں اتر گئے۔ شعری لحاظ سے نہ معلوم وہ کن خوبیوں کے حامل تھے مگر کچھ تو بات ہے کہ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود نہ یہ میری معمّر یادداشتوں سے محو ہو سکے اور نہ مدید مدت کے گرد و غبار اسے دھندلا سکے حضرت ڈاکٹر حشمت اللہ خان صاحب جو حضور کے ذاتی معالج تھے انہوں نے کہا

بڑا آج فضل خدا ہو رہا ہے
کہ محمود جلوہ نما ہو رہا ہے
ہزاروں ہی سجدے کریں میری آنکھیں
کہ حاصل انہیں مدعا ہو رہا ہے

چونکہ مضمون میں اختصار کو مدنظر رکھنا ضروری ہے اس لئے بغیر کسی مزید تمہید کے موضوع سخن کی طرف آتا ہوں خلفائے کرام میں سے سب سے زیادہ مؤثر بلکہ مسحور کن شخصیت آپ ہی کی تھی اور اتنا زیادہ Impact حضور کی ذات بابرکات کا ہوتا تھا جس سے چند منٹ کی بھی حضور کی ملاقات ہوتی وہ تو ہمیشہ کے لئے بندۂ بے دام ہو کر رہ جاتا۔ میں اس ضمن میں اپنے ''نون'' خاندان کے سب سے زیادہ قدآور شخصیات کے ساتھ حضور انور کے تعلقات کا اور اُن کے ساتھ گزرنے والے ایک عجیب واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ عرض کر دوں کہ یہ نون خاندان ضلع سرگودھا کے 12 مواضعات پر مشتمل ہے دو دریائے چناب کے کنارے اور باقی دیہات دریائے جہلم کے قریب

آباد ہیں۔ یہ سب تحصیل بھیرہ میں واقع ہیں۔ اور عموماً ایک ایک گاؤں کی وسیع اراضیات اور آبادیوں کا ایک ہی مالک ہوتا ہے۔ مثلاً سرفیروز خان نون سابق وزیر اعظم پاکستان موضع نور پور نون اور میجر ملک سردار خان صاحب نون سردار پور نون کے جدامجدا مالکان تھے۔ اسی طرح واحد احمدی رئیس جناب خان بہادر ملک صاحب خان صاحب نون ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر موضع ''فتح آباد'' کے مالک تھے۔ اور یہ تینوں نون رؤسا علی الخصوص سیدنا حضرت مصلح موعودؓ کے ساتھ گہرے ارادتمند اور دوستانہ تعلقات رکھتے تھے جبکہ ملک صاحب خان نون تو احمدی تھے ہی۔ اور حضور انور کے ساتھ گہری عقیدت اور حد درجہ مؤدبانہ اور عاجزانہ سلوک کے روادار تھے۔ ایک دفعہ ان تینوں میں باہم خاندانی اختلافات رونما ہو گئے جو بڑھتے بڑھتے تعصّبات اور عداوت کا رنگ پکڑ گئے۔ اور خطرہ تھا کہ یہی حال رہا تو نون خاندان جو بہت وسیع اثر و رسوخ اور سماجی تعلقات سارے ملک پاکستان اور خصوصاً پنجاب میں رکھتا ہے وہ سب پارہ پارہ ہو جائے گا اور جو بالآخر اتنے بلند و بالا خاندان کی ہلاکت پر منتج ہو گا۔

ایک طرف سر ملک محمد فیروز خان صاحب نون اور میجر ملک سردار خان صاحب نون (جنہیں علاقے میں نون خاندان کی ''پگ'' سمجھا اور جانا جاتا تھا) دوسری جانب مخلص واحد احمدی خان بہادر ملک صاحب خان صاحب نون۔ بہتیری کوششیں ہوئی مگر خاندان میں چونکہ یہ سب سے بڑی عمر کے بھی تھے اور دنیاوی بلند مراتب پر فائز رہ چکے تھے اس لئے کسی کو ان کے سامنے آنے اور بات کرنے یا سمجھانے کا ہرگز یارا نہیں تھا۔

اول الذکر دونوں حضرات نے سوچا کہ سوائے حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحبؓ کے اور کسی کے بس کا روگ نہیں ہے خصوصاً ملک صاحب خان صاحب نون سوائے حضرت مرزا صاحب کسی کی نہیں مانتے۔ چنانچہ وہ دونوں حضور کی خدمت میں رتن باغ لاہور میں حاضر ہوئے اور اپنے خاندان کے شیرازہ بکھر جانے اور ساری دنیاوی جاہ وجلال ختم ہونے کا اندیشہ ظاہر کیا اور ملک صاحب خان صاحب نون کے کسی بات نہ ماننے کا بطور خاص ذکر کیا۔ حضور نے فرمایا اچھا میں ملک صاحب خان صاحب کو بلواتا ہوں۔ میں نے یہ واقعہ اپنی ساری تفاصیل کے ساتھ جناب ملک صاحب خان صاحب نون سے خود سنا۔

بہر حال ملک صاحب بلوائے گئے یہ عرض کر دوں کہ حضور عالی مقام کا ملک صاحب بے حد ادب کرتے تھے تاہم حضور ازراہ شفقت ملک صاحب سے بے تکلفانہ، محبانہ اور مربیانہ سلوک فرمایا کرتے تھے۔ بہر حال اب آقا اور غلام آمنے سامنے تھے۔ حضور انور نے مختصر حکیمانہ حکم دیا کہ ملک صاحب اپنے عزیزوں اور برادری سے تعلقات بنا کر رکھنا چاہئیں آپ جائیں سر فیروز خان صاحب کے پاس ان سے معافی مانگیں اور پھر اپنے چھوٹے بھائی میجر ملک ملک سردر خان صاحب کے پاس جائیں اور معافی کے طلبگار رہوں اور پھر مجھے ساری رپورٹ دیں۔

ملک صاحب فرماتے تھے کہ مجھے حضور کے حکم سے گوانشراح صدر تو نہ ہوا۔ چھوٹے بھائیوں سے معافی مانگنے کا ارشاد اور ''معافی مانگنے والا وہ باغیرت اور بظاہر آن من احمدی'' مگر حضور اقدس کے خداداد رعب اور علم و آگہی کے سامنے کیا مجال جو ذرا بھی جھنجھلاہٹ ہی کا اظہار کیا ہو۔ فوراً سپر انداز ہو گئے۔ اور سیدھے سر ملک فیروز خان صاحب نون کی رہائش گاہ کوٹھی ''الوقار'' نون ایونیو مسلم ٹاؤن لاہور پہنچے اور جونہی سر فیروز خان صاحب نے انہیں دیکھا تو فوراً لپک کر اپنے روٹھے ہوئے بھائی کے گلے لگ گئے اور دونوں کی چیخیں نکل گئیں۔ سر ملک صاحب ذرا سنبھلے تو بار بار ''حضرت صاحب کے احسانات پہلے ہی بڑے تھے آج تو انہوں نے ہماری ساری قوم کو گویا خرید ہی لیا ہے۔'' کہتے جائیں اور کبھی یہ جملہ کہ ''میں مرزا صاحب کا کس طرح شکریہ ادا کروں جس نے میرا معزز مکرم اور روٹھا ہوا بھائی ملا دیا ہے''۔

دونوں بھائی بیٹھے تو جناب ملک صاحب خان صاحب نے معافی طلب کی جو کہ حضور کا ارشاد تھا۔ ملک سر فیروز خان صاحب کہیں کہ بھائی آپ مجھے معاف کر دیں مگر ملک صاحب نے اصرار کیا کہ خدا کے لئے مجھے معاف کر دو میں نے اپنے امام کو یہی رپورٹ کرنا ہے۔ پھر کھانے کا اصرار مگر ملک صاحب نے کہا کہ بھائی کھانے کا کہاں سوال اٹھتا ہے مجھے حضور کے حکم کی تعمیل میں پہلے چھوٹے بھائی ملک سردار خان صاحب نون سے معافی مانگنے جانا ہے اور پھر حضور کی خدمت میں رپورٹ بھی کرنا ہے۔ چنانچہ اپنے چھوٹے بھائی کے پاس ملک صاحب موصوف گئے اور وہاں اسی سین کی ایکشن Replay شروع اور ختم ہوا۔ وہاں سے فارغ ہو کر حسب الحکم حضور کی خدمت میں پہنچے اور رپورٹ پیش کی۔ حضور نے فرمایا ملک صاحب آپ کے دل میں آیا ہوگا کہ مجھے آج عجیب حکم نامہ ملا ہے کہ نہ تو پوچھا کہ قصور کس کا ہے اور دونوں عمر میں چھوٹے بھائیوں کے گھر معافی مانگنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ ملک صاحب نے عرض کی حضور یہ درست ہے مگر حضور کے حکم کے آگے ہماری کسی اور سوچ یا خیال کی کہاں گنجائش۔

اس پر حضور نے فرمایا کہ بیٹھ جائیں۔ دونوں بھائی میرے پاس آئے تھے اور شکوہ کیا۔ اب دو ہی صورتیں تھیں یا تو میں انہیں حکم دیتا کہ جاؤ اور اپنے بڑے بھائی ملک صاحب خان صاحب سے معذرت طلب کر و یا آپ کو حکم دوں۔

ظاہر ہے وہ میرے مرید نہیں ہیں وہ میرا حکم مانتے نہ مانتے آپ پر تو مجھے یہی امید تھی جو آپ نے کر دکھایا۔ دوسرے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو بھائی روٹھے بھائی کو منانے آئے اس کے گھر جائے اور اس طرح پہل کرے وہ 500 سال پہلے جنت میں جائے گا۔ یہ استعارہ کا کلام ہے تاہم آپ 1000 ہزار سال پہلے جنت میں جائیں گے۔ اب بتائیں کہ آپ کا جانا اور آپ کو میرا بھجوانا آپ کے لئے مفید تھا یا نہیں ملک صاحب نے عرض کیا کہ حضور کا ارشاد 100 فیصد درست تھا اور مجھے انشراح صدر ہو گیا ہے۔ جزاکم اللہ

(2) دوسرا واقعہ بھی اسی نون خاندان کا ہے جو حضرت مصلح موعودؓ کی قبولیت دعا کا چمکتا ہوا نشان ہے

سر ملک فیروز خان صاحب نون کی شادی نون خاندان کی ایک خاتون سے ہوئی تھی جسے ''لیڈی نون'' کہتے تھے شادی کے بعد آٹھ سال تک ان کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تو وہ ایک دن پریشانی اور مایوسی میں گھری ہوئی اپنے مینیجر اور نجی ملازمہ کے ساتھ قادیان حضرت صاحب کی خدمت میں جا پہنچی۔ ان کے نزول حضرت سیّدہ ام ناصر احمد صاحب کے گھر ہوا اور ان سے انہوں نے حضرت سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے فرمایا کہ ابھی حضور تشریف لانے والے ہیں ملاقات ہو جائے گی چائے وغیرہ سے ان کی تواضع فرمائی۔ اتنے میں حضور تشریف لائے۔ تعارف ہوا علیک سلیک ہوئی حضور نے خود لیڈی نون صاحبہ اور ملک صاحب کا احوال پوچھا تو اس پر لیڈی نون صاحبہ نے عرض احوال کی کہ حضرت آٹھ سال سے میری گود ہری نہیں ہوئی دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے نعمت اولاد سے نوازے۔ حضور نے فرمایا کہ انشاء اللہ دعا کروں گا۔ اس پر لیڈی نون صاحبہ نے کہا کہ ناجی میں وعدہ لینے نہیں آئی دعا کروا کر واپس جاؤں گی۔ اس پر حضور نے اسی وقت دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے آپ کی حرم اول اور اس وقت وہاں موجود حضرت مرزا مبارک احمد صاحب جو ابھی نو عمر تھے، وہ بھی اور خود لیڈی صاحبہ بھی شریک ہوئیں۔ حضور نے فرمایا کہ انشاء اللہ آئندہ بھی دعا کروں گا۔ ایک طرف لیڈی صاحب کی اضطراری حالت پھر اس کی عقیدتمندی کا اظہار کہ وہ اپنے خدام سمیت اتنا سفر کر کے قادیان پہنچی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ لیڈی صاحبہ کی دلیرانہ التجا (جس میں ان کے اضطراب کی جھلک نظر آرہی تھی) ان سب عوامل نے حضور انور کے قلب مطہر پر بھی خاص اثر کیا اور علیم وخبیر مولا کی قبولیت کا بھی خاص وقت حضور کو میسر آ گیا۔ دعا قبول ہوئی۔ یہ 1925 کا واقعہ ہے تاریخ اور مہینہ معلوم نہیں ہو سکا بہر حال 1926 میں لیڈی نون صاحبہ کی تمنا بر آئی اور ان کی آرزو پوری ہوئی اور ان کے ہاں ملک نور حیات خان صاحب نون کی ولادت جو 1964 سے مسلسل کئی بار ایم این اے اور وفاقی وزیر بنے اور بہت نیک، صالح، سخی اور پرہیز گار شخص تھے، کیوں نہ ہوتا جب وہ ابھی چار ماہ کے تھے تو جناب لیڈی صاحبہ پھر انہیں لے کر قادیان پہنچی اور حضور کے سامنے پیش کر کے کمال ادب، ارادتمندی اور عقیدت اور بھر پور خوشی سے عرض کیا کہ حضور یہ آپ کی دعاؤں کا ثمرہ ہے اس کے سر پر دستِ دعا وشفقت پھیریں اور از راہ نوازش اپنی مبارک گود میں بٹھا کر اسے برکت بخشیں۔

اب آنکھیں اس برکتوں سے معمور زمانے اور اس مبارک بستی کی گلیوں جن کو سیدنا حضرت مسیح موعودؑ کے قدوم مبارک کو چومنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی اور ہاں وہ بلند شان والا پسر موعود کہ جس کے مبارک دور کو 'بدورانش رسولاں ناز کردند'' کا شرف حاصل تھا ترستی ہیں اور پھر میں بے اختیاری اور مجبوری میں یوں بلبلاتا ہوں

کہاں ہے کہ ملوں آنکھیں اس کے تلووں سے
کہاں وہ ہے کہ گروں اس پہ مثل پروانہ

ایک اور واقعہ حضورانور کے انوار کے بحر بے کراں سے پیش کرتا ہوں اس علم وعمل اور انوار و برکات کے ذخّار سمندر سے چند چلّو ہی بھر سکتا ہوں۔ وہ تو اک تاریخ ساز متنوع صفاتِ حسنہ اور رنگ نور کی آمیزش سے ایک عبقری حیثیت کے حامل تھے۔ خود اس عاجز کے سینے میں حضور کے کئی مشاہدات محفوظ ہیں مگر یہاں اتنی گنجائش کہاں۔ حضور کو جذب و اثر کی ایک خاص کیفیت عطا ہوئی تھی اور حضور کی قوت موثرہ ہر جمعہ کے روز خاص موج پر ہوتی تھی اور کیا مجال جو کوئی شخص حضور کے خطبات سے بے نیازی کر سکے لیکن ایک جمعہ ایسا آیا (سال اور مہینہ بھولتا ہوں بہر حال 1944 اور 1946 کے دوران کی بات ہے) کہ ہم افسردہ اور پژمردہ دل کے ساتھ اس جمعہ کے روز بیت اقصیٰ قادیان میں پہنچے۔ کیوں کہ حضور کے متعلق ثقہ رپورٹیں سن رہے تھے کہ حضور بعارضہ نقرس سخت بیمار ہیں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کرسی پر حضور تشریف فرما کر چار خدام کے کندھوں پر بیت میں تشریف لائے اور فرمایا کہ میں آج بہت بیمار تھا اور چلنے پھرنے سے قطعی معذور لیکن میں نے تاریخ میں ایک واقعہ پڑھا ہوا ہے کہ ایک اسلامی جرنیل جنگ کے دوران سخت بیمار پڑ گیا تو وہ چارپائی پر لیٹے لیٹے سپاہیوں کے کندھوں پر چارپائی اٹھوائے کمان کرتا رہا اور میں بھی اسی طرح آج عزیزوں کے کندھوں پر ہی آیا ہوں حضور کا خطاب اور خصوصاً حضور کی شدید علالت کا حال دیکھ کر دل بھر آئے۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی ان آنسوؤں میں حضور کی شدید تکلیف کا احساس اور پھر بھی جماعت کی بہبودی کی خاطر اس قدر تکلیف اٹھا کر تشریف لانے کا درد بھی تھا اور حضور انور کی زیارت سے شادکام ہونے اور حضور کے روح پرور خطاب سے فیض یاب ہونے کی وجہ مسرت وانبساط بھی۔ یہ سب کچھ ملا ہوا تھا اس روز غم والم اور نشاطِ غم ایک عجیب کیف کے ساتھ مل جل گئے تھے۔

پھر اب ایک آخری ایسا واقعہ عرض کرتا ہوں جو وہ بھی میرا چشم دید اور گوش شنید ہے۔ ہوا یوں کہ 1944 اور 1946 کے دوران ایک روز کسی تقریب کی صدارت قادیان ٹی آئی ہائی سکول کے گراسی لان میں سہ پہر کو حضور نے فرمانا تھی گو کہ یہ فنکشن ہائی سکول کا تھا۔ لیکن سادہ سی تقریب تھی کسی کو وہاں جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی اور یہ حضور کے جذب و اثر اور کشش کا کمال تھا کہ یہ ممکن ہی نہیں ہوتا تھا کہ ہم حضور کی کسی جگہ (ظاہر ہے پرائیویٹ محفلوں میں تو اخلاقاً ہمارا جانا مناسب نہیں تھا البتہ پبلک تقاریب میں جہاں کسی خورد ونوش کا تکلف نہیں ہوتا تھا) وہاں ہمارے لئے ممکن نہیں تھا کہ ہم وہاں پہنچ کر حضور کے دیدار اور گفتار سے فیوض حاصل نہ کریں۔ نہ معلوم کیڑیاں کس طرح شہد کی موجودگی کو سونگھ لیتی تھیں۔ اسی طرح ہم بھی حضور انور کی موجودگی کا بھانپ لیتے تھے۔ یہ چشمہ شیریں کی علامت تھی اور وہاں سے آب بقائے دوام کے ملنے کا یقین ہوتا تھا جو کشاں کشاں وہاں اس وسیع تعلیمی میدان میں ہمیں بھی لے گیا۔

آپ دور دراز تھیں لے آون
کھچاں ٹور کے حسن عریاں دیاں

شمع بلے تے آپ ہو جان کٹھے
سدّا گھلدا اے کون پروانیاں نوں

کیا دیکھتے ہیں کہ 5,6 کرسیاں بچھی تھیں اوران کے سامنے سکول کے طلبا بیٹھے تھے ہم جتنے کالج کے طلبا پہنچ سکے وہیں جا کر بیٹھ گئے۔حضور پرنور تشریف لائے نونہالوں کوننگی زمین پر بیٹھے دیکھا تو اپنے نیچے سے کرسی سرکا دی اور خود حضور اس گرد آلود زمین پر ہی تشریف فرما ہو گئے جس سے ظاہر ہے کہ باقی حاضرین بھی کرسی نشینی سے محروم ہو گئے۔سب لوگ زمین پر بیٹھے تو گرد اٹھی جس نے ماحول کو غبار آلود کر دیا تو حضور سخت غصے میں تھے فرمایا کہ ان بچوں کو اس طرح ننگی گرد و دھول والی زمین پر بٹھانا اور خود افسران کا کرسیوں پر بیٹھنا اس سے ان نونہالوں کی عزت نفس بری طرح مجروح ہو جاتی ہے آپ لوگوں کو اس کا کچھ خیال نہیں نہ دریاں ہیں بلکہ کچھ نہیں کر سکتے تھے توصفیں ہی بچھا دیتے اور پھر اس مضمون پر حضور نے زرّیں نصائح کیں۔سکول کے استادوں کی وہ تو دوڑیں لگیں کہ وہ نظارہ دیدنی تھا۔

اب اس واقعہ میں حضور اقدس کی جس حکیمانہ مربیانہ اور ناصحانہ صفات حسنہ کا نشان ملتا ہے اس پر شاید کسی تبصرے کی ضرورت نہیں ہے ہاں ایک درخواست ناظرین کرام کی خدمت میں ضرور ہے کہ حضور کے ان اشعار کو پڑھیں اور غور فرماویں کہ جو دعا حضور نے ان اشعار میں اپنے مولا سے اپنے بارہ میں کی تھی اور یاد رہے کہ یہ دعائیہ اشعار 1944 میں حضور نے کہے تھے جب اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان اور عطایا اور کرم ایک خاص جوش میں تھے اور اس سال ایک ایسا تموّج بارانِ رحمت میں آیا ہوا تھا جس میں ہر پیاسی روح کی سیرابی کا بہ افراط سامان مہیا کیا تھا کیا متذکرہ بالا واقعہ سے ان اشعار میں حضور کی مناجات کی قبولیت کے نشانات ظاہر نہیں ہو رہے۔

لیں جائزہ عشق مرے عشق سے عاشق
دل کو میرے عشاّق کا پیمانہ بنا دے
جو ختم نہ ہو ایسا دکھا جلوۂ تاباں
جو مر نہ سکے مجھ کو پروانہ بنا دے

میرے خیال میں حضرت مصلح موعودؓ کے ذکر کو اب مجبوراً یہاں ہی ختم کرنا چاہئے۔مجلہ میں اتنی گنجائش کہاں کہ اس عقبری حیثیت اور شش جہات صفات والے بلند روحانی مرتبے والے انسان کی زندگی اور کمالات کا کچھ حصہ بھی اس میں سما سکے۔جتنا اُس بحر ذخّار میں غوطہ زن ہوں اتنے ہی نایاب گوہر اور آبدار موتی ہاتھ لگتے جائیں گے۔آخر ماہ نومبر 1965 کا دن آ گیا جب 52 سال اپنی خلافت حقّہ کے کامیابی اور کامرانی کے ساتھ گزارنے کے بعد نیرّ تاباں آخر غروب ہو گیا رہے نام اللہ کا اور حضور کی نواسی حضرت سیدہ امتہ القدوس صاحبہ نے یہ دائمی اور لازوال نوحہ لکھا۔

جس کے دم سے اجالا تھا چاروں طرف
وہ گیا تو یہاں تیرگی چھا گئی
چاند روشن ہے اب بھی افق پر مگر
میرے سورج کو کس کی نظر کھا گئی

اب میں مختصر طور پر حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب خلیفہ سوئم کے ساتھ بیتے ہوئے دنوں کی خوشگوار یادوں سے اپنے زخمی دل کو بہلاتا ہوں کہ

عمر یادِ یار میں بھی اک مزا ہے

مشکل یہاں بھی یہی درپیش ہے کہ گنجائش کم دامن تنگ اور ذکر ایسے پاک وجودوں کا جو صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا اعجاز تو ممکن ہے کوئی دکھائے مگر ایسا بیان جو ایک بلند و بالا مقام روحانی کے حامل شخصیت کے بارہ میں ہوا اور پھر اتنا مختصر ہرگز ممکن نہیں کہ اسے جامع کہا جاسکے۔

عاجز راقم کو مشاہدات پر حصر کرنے کا ارشاد ہے جو وہ بھی اپنے طول وعرض اور وسیع اثرات کے ساتھ اس قدر زیادہ ہیں کہ مجھ میں کب طاقت ہے جو انہیں جمع کر سکوں وہ تو انمول اور ان گنت بکھرے ہوئے موتی ہیں جن کا چننا دشوار اور محالات میں سے ہے اور پھر یہ مختصر سا مجلہ، اس کی گنجائش ہر دم پیش نظر ہے اور میرے قلم کے دامن کو کھینچ رہی ہے۔ ایک عرض کر دوں کہ حضور انور کا ذکر کرتے ہوئے چونکہ یہ مشاہدات کا بیان ہوگا اسلئے اس عاصی کا ذکر کا آنا بھی لابدی ہے کیونکہ مورد تو ان عنایات کا اکثر عاجز راقم بھی ہوگا۔ کس طرح یاددہانی کراؤں کہ بیچ میں میرا نام آئے گا تو میری حیثیت پھر بھی کوئی نہیں ادھر سے لطف و کرم کا تیز دھارا ہمیشہ روز افزوں چڑھاؤ پر ہی رہا اور جوں جوں آپ کا مناصب میں بلندی آتی گئی الطاف کے دھارے کے بہاؤ میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور ہمارے خس وخاشاک اسی سیلابی ریلے کی نذر ہوتے گئے۔ تمہید یہیں ختم اور نفس مضمون کی طرف آتا ہوں۔

(1) 1944ء کی ایک شام تھی اس شام ایک عجیب ماجرا گزرا جس نے اپنی فطرت کی ساری کجیاں اور انا کی دیواروں کو مسمار کر دیا۔ بیت مبارک قادیان کی چھت پر سیدنا حضرت مصلح موعودؓ مجلس عرفان میں مغرب تا عشا علم و معرفت کے موتی لٹایا کرتے تھے۔ کیا عرض کروں بڑے نصیبے والے وہ لوگ تھے جو اس مجلس عرفان میں شامل ہو کر مستفید ہوتے تھے۔ ایک شہ نشین پر کہکشاں کی صورت کچھ ستارے اور ان کے درمیان ایک ماہ منور جلوہ افروز ہوتا تھا وہ مجلس اور اس کے حاضرین جن کے آخر میں جوتیوں کی جگہ حضرت مولانا شیر علی صاحبؓ عاجزی، انکساری اور زہد وتعبد کی تصویر بنے بیٹھا کرتے تھے۔ وہ قدوسیوں کی ایک محفل ہوتی تھی۔ میں مجبوراً اس

چاندتاروں سے بڑھ کرنورانی مجلس کا کچھ ذکر کئے بغیرآگے چلتاہوں۔

میرے کانوں میں ایک آواز پڑی اوروہ آواز یوں محسوس ہورہاہے کہ آج بھی شفقتوں کارس میرے کانوں میں گھول رہی ہے۔وہ آوازتھی ’’نون ادھرآؤ‘‘ اورمیں حاضرہوگیااوریہ آوازتھی اس سراپاشفقت، بندہ نوازاورغلام پرورنافلہ محمودکی۔حکم ہواکہ میرے ساتھ چلو اورمجھےاس شخص بلندقامت کی دائمی معیت حاصل ہورہی تھی کہ جس کے ساتھ ایک قدم چلنے کوشاہِ جہاں بھی ترسے۔حضورکےہمراہ سیدہ حضرت بیگم صاحبہ اورصاحبزادہ مرزاانس احمدصاحب اوردوچھوٹی عمرکی صاحبزادیاں تھیں ایک کواٹھانے کاشرف اس عاجز کوحاصل ہو ادوسری کوحضوراقدس نے خوداٹھالیااورحضرت اماں جانؓ کی کوٹھی دارالانوارمیں واقع تھی وہاں پہنچے۔اجازت چاہی حضورنے فرمایا ’’نہیں‘‘ یہاں ہمارے ساتھ کھاناکھاؤاوریہ کمرہ تمہارا ہےاس میں شب باش ہوجاؤ۔اوراس میں کتابیں پڑی ہیں کچھ غیرنصابی کتابیں بھی پڑھاکرونصابی کتب کے کیڑے بنے رہنابھی ٹھیک نہیں اورعنایات کریمانہ کاایک اورسلسلہ شروع ہوگیا۔اورمیرایہ اعزازپھرتقسیم ملک تک قائم رہا۔اے کاش میراجب دم آخریں آئےتواسی شخص کی معیت نصیب ہوچکی ہواس دنیامیں طویل مصاحبت نصیب ہوئی سچ کہاتھاحضورکے بارہ میں برادرم حضرت ثاقب زیروی نے

روحانیت سے عشق تو انسانیت سے پیار
ایسا حسیں بشر کہ فرشتہ کہیں جسے

(2) حضرت صاحبزادہ منصوراحمدصاحب اورحضرت خلیفۃ الثالثؒ دونوں بھائی توتھے ہی۔ان کی جوڑی بچپن سے ایک مشہور ومعروف اوربےنظیر جوڑی تھی دونوں ہم عمر ہونے کے علاوہ اس عمرکے سارے نونہالان سیدہ حضرت اماں جانؓ کی زیرتربیت وزیرپرورش رہےلیکن ان دونوں بھائیوں کاخصوصی اٹوٹ تعلق انوکھاتھاجوبچپن سے کےآخرعمرتک گیا۔یہ تواس خانوادے کےسبھی افراد کی خوش بختی کہ جنس وفاجوایک نایاب جذبہ ہے وہ انہیں سیدناحضرت مسیح موعودؑ سے ورثے میں ملاتھاحضورجیساباوفاتوچودہ صدیوں نے نہ دیکھااورآئندہ بھی اس قسم کی وفاکی توقع کرناعبث ہے۔ایک دفعہ ایک آریہ نےحضورکی بارگاہ میں شایداپنےنمبربنانے کی غرض سے یہ بات کی کہ مرزاجی ہندوآپ سے بڑے بڑے مفادبھی اٹھاتے ہیں پھرجب اپنے محلے میں مل بیٹھتے ہیں توآپ کے خلاف بہت مخالفانہ اوربےہودہ باتیں بھی کرتے ہیں۔تواس مہروفاکی چٹان کاجواب سنئے۔حضورنےفرمایالالہ جی ہماری مثال تواس بیری کی سی ہے جوقطع نظراس بات کےاسےڈھیلے پڑتے ہیں پھربھی وہ بیردئے جاتی ہےاوربازنہیں آتی۔اس بےساختہ کریمانہ اور خسروانہ جواب پردل قربان ہونےکواچھلتاہےتبھی توسیدناحضرت مصلح موعودؓ نےفرمایاتھا

یاصدق محمدؐ عربی ہے یا احمدؑ ہندی کی ہے وفا

باقی تو پرانے قصے ہیں زندہ ہیں یہی افسانے دو
اورخود حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایاتھا
صرف وفا نہ چھوڑوں اس عہد کو نہ توڑوں
اس دلبر ازل نے مجھ کو کہا یہی ہے

بظاہر میں اپنے زیرنظر مضمون سے ہٹ گیا ہوں مگر یہ میری مجبوری تھی میرے پیرومرشد سیدنا حضرت مسیح موعودؑ کا ذکر آجائے تو کہاں قلم اور دل قابو میں رہتے ہیں۔

ہاں تو میں بات کرر ہا تھا حضرت ناصر اور حضرت منصور کی بے مثل جوڑی کی۔ اور یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے میں نے اس جوڑی کو اکٹھے کام کرتے بہت دیکھا ہے۔ 1946 میں حضرت چوہدری فتح محمد صاحب سیال کے M.L.A کے الیکشن کے دوران یہ دونوں صاحبزادگان ایک چھوٹی سی سیاہ رنگ کی کار میں سوار ہوکر دور ونزدیک دیہات میں جاتے تھے اور راقم کفش برداری کے لئے ہمہ وقت ساتھ رہتا اس زمانے کی کئی داستانیں ہیں جو میرے سینے میں دفن ہیں۔ یہاں سب کا اظہار ناممکن ہے۔ ان دونوں بھائیوں کے متعلق میں نے پہلے کسی مضمون میں غالباً حضرت مرزا منصور احمد کی وفات پر کسی کے یہ دو شعر لکھے تھے وہ اشعار کچھ یوں تھے۔

(1) اک دور میں چمکے تھے دو پیکر نورانی
اورتونے بجھا ڈالے اے موجِ ہوا دونو
(2) ایک رنگ گلستاں تھا ایک بوئے گلستاں تھا
ہر بات میں رکھتے تھے پھولوں کی اداء دونو

(3) مسندِ خلافت پر متمکن ہونے سے چند ماہ پہلے حضور جب صدر انصاراللہ تھے تو کسی اجتماع میں شرکت کے لئے سرگودھا تشریف لائے۔ حضرت مرزا صاحب نے پہلے ہی فرما دیا کہ حضرت صاحبزادہ صاحب کھانا دوپہر کو مجلس انصاراللہ کے ممبران کے ساتھ ہی تناول فرماویں گے البتہ سہ پہر کی چائے پر اگر کوئی صاحب حضرت میاں صاحب کو مدعو کرلیں تو میری طرف سے اجازت ہے۔ چنانچہ میں نے فوراً ہی فون پر رابطہ کیا اور درخواست کی فلاں تاریخ حضور سرگودھا تشریف لا رہے ہیں شام میرے غریب خانہ پر چائے نوش فرماویں تو حضور کا بڑا احسان ہوگا حضور نے منظور فرمالیا۔ میں نے 50,55 آدمی جن میں ایک MPA، جج صاحبان، سینئر وکلاء اور روسا ضلع کو مدعو کیا تھا حضور سب سے مل کر بہت خوش ہوئے سبھی حاضرین بھی حضور سے مل کر بہت شادکام ہوئے حتیٰ کہ ایک رئیس ابن رئیس مہر محمد اعظم صاحب لک کو میں مدعو نہ کرسکا تھا وہ میرے گھر تشریف لائے اور مجھے گیٹ سے باہر بلایا اور فرمایا کہ تم نے مجھے دعوت نہیں دی اس

لئے میں چائے تو نہیں پیوں گا البتہ صاحبزادہ صاحب سے ملنا ضروری ہے۔ میں نے انہیں بے تکلفی سے بازو سے پکڑا اندر لایا اور حضور کے روبرو پیش کر کے عرض کیا کہ حضور یہ میرے بے تکلف دوست اور بھائی ہیں بھلا انہیں بھی میری طرف سے کسی دعوت نامے کی ضرورت تھی حضور نے فرمایا نہیں اور حضور ان سے باتیں کرتے رہے اور وہ بھی دعوت میں خوشی خوشی شامل ہوئے۔ جب حاضرین اکٹھے ہو گئے تو حضور نے مجھے طلب فرمایا اور فرمایا کہ اگر اتنے معززین تمہارے گھر آ سکتے تھے تو مجھے تقریر کرنا چاہئے تو میں نے عرض کیا حضور نے خود ہی فرما دیا تھا کہ چائے تو پیوں گا مگر تقریر کوئی نہیں کروں گا۔ کیونکہ سرِ شام حضرت مصلح موعودؓ مجھے یاد فرماتے ہیں اس لئے مجھے جلدی ربوہ پہنچنا ہوگا۔ حضور نے فرمایا یہ تو ٹھیک ہے مگر اتنا چنیدہ اجتماع بھی ہر جگہ ہمیں میسر نہیں آتا۔ اور بعد میں حضرت نوابزادہ مسعود احمد خان صاحب جو اکثر زمینوں پر آتے جاتے مجھے ملا کرتے تھے انہوں نے بتایا کہ حضور نے کئی بار یہ ذکر کیا کہ نون کے گھر اتنے معزز لوگ جمع ہوئے تھے جو عام طور پر کسی جگہ ملنے مشکل ہوتے ہیں۔

(3) میرا پوتا عزیزی رضوان احمد (پسر عبدالبصیر) 1981-2-5 کو تولّد ہوا تو سب گھر والوں نے مجھے حضور سے نومولود کا نام رکھوانے کی زبانی درخواست کرنے کے لئے ربوہ بھیجا۔ میں نے مٹھائی اٹھائی ہوئی اور در دولت پر حاضر ہوا، یہ عرض کر دوں کہ جب بھی میں نے حضور کی اقتدا میں نماز پڑھی یہ شاید کبھی نہ ہوا ہوگا کہ حضور نے بعد از ادائیگی نماز مجھے اپنے ہاں نہ بلوایا ہو۔ بہرحال میں حاضر ہوا حضور کے پاس بیٹھا تھا کہ حضرت سیدہ بیگم صاحبہ باہر سے حضور کے کمرے سے گزر کر اندر تشریف لے جا رہی تھیں کہ حضور نے انہیں فرمایا کہ نون آیا ہے اس کا پوتا ہوا ہے۔ عبدالبصیر کا بیٹا اور یہ مٹھائی لایا ہے۔ حضرت آپا جان نے فرمایا میری طرف سے بھی انہیں مبارک باد دے دیں۔ اس پر حضور اٹھے اندر سے کاغذ اور قلم لائے چٹ پر لکھا ''عبدالبصیر کے بیٹے کا نام رضوان احمد مبارک ہو'' وہ نوجوان جو 8 دسمبر 04 کو اپنے خالق و مالک کے حضور پہنچ گیا۔ بہت ہی نیک فطرت، صالح نوجوان اور نرا پیار ہی پیار کا گویا مجسمہ تھا مجھے وہ اداسیوں، تنہائیوں کے اتھاہ گہری غاروں کے اندھیروں میں دھکیل کر مجھ سے روٹھ گیا اور برادرم مصلح الدین صاحب راجیکی کی طرح بے حال اور بے قرار ہو کر یہ شعر گنگنا تا رہتا ہوں

نہ ملا کوئی ٹھکانہ میری بے قراریوں کو
کہیں رو کے رات کاٹی کہیں رو کے دن گزارا
بڑے دکھ بھرے ہیں جاناں میری زندگی کے لمحے
کبھی ہو سکے تو سننا میری داستاں خدا را

(3) مہر غلام عباس صاحب (ایک غیر احمدی رئیس) کا جواں سالہ بیٹا فوت ہو گیا تو بے حد صدمہ زدہ ہوئے دونوں میاں بیوی گویا پاگل

ہو گئے۔مہر صاحب جب حضرت صاحب کے پاس جاتے تو عرض کرتے کہ آپ کے پاس بیٹھتا ہوں تو میرے ٹوٹے ہوئے دل کو قدرے قرار آجاتا ہے باہر جاتا ہوں تو پھر وہی حال۔ پھر آپ کے پاس دل کی لگی بجھانے آجاتا ہوں مگر میری بیوی کا میاں صاحب بہت برا حال ہے۔حضور نے فرمایا انہیں اپنے ساتھ لایا کرو اور وہ ہمارے گھر مستورات کے ساتھ بیٹھ کر حوصلہ پائے گی۔مہر صاحب نے عرض کیا نہ جی وہ ان پڑھ عورت کیا جانے کہ آپ کے پاکیزہ ماحول میں کیا بات کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔حضور نے فرمایا کچھ مضائقہ نہیں وہ بغیر جھجک کے ہمارے گھر آئیں انشاءاللہ انہیں بھی صبر و قرار آجائے گا۔

سوچتا ہوں کہ وہ مہر صاحب کتنے نصیبے والا تھا جسے زخمی دل پر حضرت اقدس نے گویا شفا بخش پھاہا رکھ کر زخموں کو مندمل ہو جانے کی طاقت بخشی اور میں غریب اب اکیلا بالکل تنہا رہ گیا ہوں کہاں سے حضور کو تلاش کروں جو میرے دل کے زخموں کے اندمال کا اپنی ایک نظر سے ہی بندوبست کر دیتے۔

غم گسار و بہت اداس ہوں میں
مجھ کو بہلا سکو تو آ جاؤ

میں اپنے سینوں میں تینوں گزشتہ خلفائے کرام کی انمول اور شیریں داستانوں کا ایک دفتر لئے پھرتا ہوں جوں جوں اسے چھیڑتا ہوں نئے سے نئے واقعات نکلتے چلے جاتے ہیں مگر اختصار کا حکم آگے بڑھنے سے روک رہا ہے۔



حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کے ساتھ گزری ہوئی ایک تاریخی شب اور ایک تاریخی دن

26۔اپریل 1984 کی شام ایک خبر نشر ہوئی جس سے خبر کے بانی نے اپنی جانب سے تیز دھار آلے کے ساتھ اس امن پسند جماعت پر کاری ضرب لگائی گئی تھی۔اس کی تفصیل میں کیا جانا کہ میرا زخمی دل پھر رسنے لگے گا۔حضرت مرزا عبدالحق صاحب نے اس شام نو بجے مجھے طلب فرمایا اور فرمایا کہ ابھی ربوہ جانا ہے جلد تیار ہو کر موٹر لے کر آجاؤ۔میں ہمراہ پسرم عزیز اعجاز احمد حاضر ہو گیا اور دلوں پر یہ تازہ زخم کھائے ہوئے مختصر قافلہ سوئے منزل روانہ ہوا۔راستے میں، میں نے پوچھا کہ حضرت آپ کو ربوہ پہنچا کر واپس آجانا ہے یا آپ نے واپس بھی ہمارے ساتھ تشریف لانا ہے آپ نے فرمایا تم مجھے چھوڑنے ربوہ نہیں جا رہے ہو بلکہ حضرت صاحب نے ہم دونوں کو (یعنی حضرت مرزا صاحب اور عاجز راقم کو) طلب فرمایا ہے۔چنانچہ ہم پونے دس بجے ربوہ پہنچے حضور کے در دولت پر حاضری کی اطلاع دے دی۔دس بجے میٹنگ شروع ہوئی جو رات ایک بجے تک چلتی رہی اور حضور نے فرمایا کہ یہی سب لوگ کل دس بجے دن یہاں پہنچ جاویں۔ربوہ سے کچھ ناظر صاحبان اور کچھ وکلا صاحبان اور بریگیڈیئر وقیع الزمان خان صاحب لاہور سے شاید پہلے

یہاں ہی تشریف فرما تھے بیرونجات سے ہم دونوں طلبیدہ تھے۔حضور نے TV خبروں سے ریکارڈ کر کے ساری خبر کی ٹیپ حاضرین کو 2,3 بار سنوائی اور مشورے شروع ہوئے۔

ایک صاحب کا فی الحال ذکر کروں گا حضرت ملک سیف الرحمن صاحب مفتی سلسلہ نے عرض کیا کہ حضور کل جمعہ ہے بہتر ہوگا اگر حضور خود خطبہ ارشاد نہ فرمائیں۔اس پر حضور نے فرمایا میں نے تو پہلے ہی قرآن کریم پر نشان لگا کر آیات کا انتخاب کر لیا ہے۔ میں نے کوئی متنازع بات تو نہیں کرنا۔ان آیات کا ترجمہ اور مفہوم بتا دوں گا۔اس پر میں نے گزارش کی کہ حضور میری عاجزانہ رائے یہی ہے کہ حضور خطبہ نہ دیں حضور نے فرمایا مگر اس میں حرج کیا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضور ریکارڈ شدہ ٹیپ ہم نے بھی سن لی ہے۔کیا حضور تشہد خطبہ کے شروع میں پڑھیں گے حضور نے فرمایا ہاں۔تو میں نے عرض کیا دین حق کے ساتھ وابستگی کی یہ شہادت کافی ہے۔ جو ہم احمدیوں کے لئے جرم قرار دیا گیا۔اس پر بحث تو خیر حضور فرماتے رہے۔آخر میں حضور نے اتنا تو مان لیا کہ اچھا میں بیت میں نہیں یہاں آپ لوگوں کو جمعہ پڑھا دوں گا میں نے اس پر پھر جسارت کی اور دو سوال اٹھائے کہ حضور خفیہ والوں نے آپ سے پوچھا تو آپ نے بتا دینا ہے کہ یہ کلمات میں نے پڑھے تھے تو پھر وہی بات ہوئی اور دوسری جماعت میں پہلے بہت افواہیں اور اندیشے گشت کر رہے ہیں حضور کا اگر بیت اقصیٰ جمعہ کی ادائیگی کے لئے تشریف نہ لے گئے تو احمدی بے چاروں کو تو جو حال ہوگا اس کا قیاس کر کے بھی دل لرزنے لگتا ہے۔ بہر حال اس پر بحث جمعہ کے روز صبح دس بجے تک کے لئے ملتوی فرما دی گئی اور ہم واپس سرگودھا پہنچ گئے۔ اور پھر دس بجے ربوہ اور دوپہر 12 بجے کے قریب حضور نے ازراہ نوازش یہ حقیر رائے مان لی کہ اچھا کوئی اور خطبہ دے اور نماز جمعہ پڑھائے میں بیت میں جا کر اُسی امام صاحب کی اقتدا میں نماز ادا کرلوں گا۔

چنانچہ مولوی محمد بشیر شاد صاحب جو غالباً ایرانی نیشنل تھے انہوں نے خطبہ جمعہ دیا اور نماز پڑھائی۔حضور جب تشریف لا کر پیچھے صف میں بیٹھے تو لوگوں کی دکھ، درد اور غم واندوہ سے چیخیں نکل گئیں۔ وہ دن ایسے تھے کہ ساری جماعت احمدیہ رنج والم اور مستقبل میں سنگین خطرات اور کئی قسم کے اندیشوں سے گھری ہوئی تھی۔حالات گو حد درجہ گھمبیر خطرات اور عواقب کی نشاندہی کر رہے تھے مگر اللہ تعالیٰ پر کامل توکل کرنے والا امام جماعت اور اسی پر بھروسہ کرنے والی جماعت پھر بھی قادر مولا پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔گو نہیں دنیاوی کسی سہارے یا امداد کی امید نہیں رہی تھی۔سربراہ مملکت خود جماعت کو نیست و نابود کرنے کے درپے ہو تو خیر کی امید کرنا عبث۔نہ معلوم پنجابی کے شاعر استاد دامنؔ نے کن حالات پر دل گرفتہ ہو کر یہ اشعار کہے تھے مگر ہمارے 1984 کے واقعات پر اطلاق پاتے ہیں۔استاد نے کہا تھا

او دس کھاں ربّا جہاں دیا میں ڈبڈا ڈبڈا جاں

میں اوتھے ڈھونڈ ھاں پیار نوں جتھے پتراں کھانی ماں
جتھے قیدی ہوئیاں بلبلاں جتھے باغیں بولن کاں

سیدنا ومرشدنا حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب 30/اپریل 84ء کو ہجرت کر کے لندن پہنچے۔ یہیں پر آپ نے اپنا ہیڈ کوارٹر مقرر فرمالیا اور دعوت وارشاد کا کام مشرق سے بھی زیادہ مغرب سے شروع ہوا۔ اور اگر کہیں کہ مغرب سے نیا سورج طلوع ہوا تو اس میں ہرگز کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ پاکستان میں احمدیوں پر ظلم وستم کا ایک نیا باب کھل گیا۔ احمدیوں کو طویل قید وبند کا سامنا کرنا پڑا۔ جابجا احمدی شہیدوں کی قطاریں لگ گئیں۔ سزائے موت کی کوٹھڑیوں میں ان کا بسیرا ہونے لگا تو وہ نازک اور مطہر دل درد والم سے بھر گیا۔ وہ پاکیزہ دل سنگ وخشت یا فولاد سے بنا ہوا تو نہیں تھا اس پر جب اتنے بوجھ پڑے تو خاموشی سے بیٹھ گیا۔ پاکستان سے جو قافلے الوداعی دیدار یار کے لئے اور نماز جنازہ میں شرکت کے لئے گئے ان میں سے ایک میں عاجز راقم اور حضرت مرزا عبدالحق صاحب بھی تھے۔ جو بہت ہی سبھی لوگوں کی طرح غم زدہ تھے۔ دوران طویل پرواز چونکہ ایر کرافٹ کی بہت نشستیں خالی تھیں۔ میں ان کے پاس (مرزا صاحب کے پاس) جا بیٹھا تو فرمانے لگے اس المیے پر کوئی شعر ہوا ہے میں نے عرض کیا کہ حضرت میں نہ شاعر نہ متشاعر میں تو شعروں کا انتخاب کر کے اپنے مضامین میں لکھا کرتا ہوں۔ چنانچہ میں نے یہ شعر سنائے جو اس غم واندوہ کے لمحات میں مسلسل میرے دل وجان پر دستک دے رہے تھے۔

کِلکِ الم طراز ذرا دیکھ بھال کر
کس سانحے کا ذکر ہے اتنا خیال کر
سن تو بھی ہم نشینی ذرا دل سنبھال کر
کاغذ پر رکھ رہا ہوں کلیجہ نکال کر
پرواز کون کر گیا پَر تولتا ہوا
خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

حضرت مرزا صاحب نے فرمایا یہ تو اسی سانحے کے متعلق لگتا ہے کسی نے کہے ہیں۔ بہرحال سوگواروں کے قافلے شمال وجنوب اور مشرق ومغرب سب سے اکٹھے ہوتے رہے۔ اور حضور کو نہ صرف احمدیوں نے بلکہ دیگر شرفا نے بھی ارادتمندی اور عقیدتمندی سے نہایت عزت واحترام سے الوداع کہا اور برطانوی حکومت کا انداز تو حد درجہ قابل تعریف اور قابل رشک تھا۔ اصل تو چھوڑ جانے والی روح اس قدر پاکیزہ تھی اور اپنوں اور غیروں کے دلوں کو اس محبت اور عرفان وآگہی کے ساتھ فتح کر لیا ہوا تھا کہ سبھی اس کے اٹھ جانے

سے غم واندوہ میں گویا ڈوب گئے۔ حضور کی زندگی بھی قابل صد رشک تھی اور حضور کی موت بھی ایک مقدس درویش شہزادے کی موت تھی اور یہ شعر حضور کی ذات بابرکات پر ہی صادق آتا ہے کہ

زندہ اسلام کو کیا تو نے
حق و باطل دکھا دیا تو نے
جی کے مرنا تو سب کو آتا ہے
مر کے جینا دکھا دیا تو نے

صد حیف کہ وہ دردمند دل رکھنے والا پاک وجود ہاں وہی جس کی آمد کی 1944 میں حضور مصلح موعودؓ کو خوش خبری عرش الٰہی سے عطا ہوئی تھی جو حضور نے ہم غریبوں کو سنا دی تھی۔ وہی مطہر قلب جو اپنے پاکستانی خدام کے مصائب اور قید و بند اور بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں جکڑے جانے اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے جا بسیرا کرنے سے خون کے آنسو بہاتا رہا جسے ان دنوں اپنی سر پیر کی گویا خبر نہیں رہی تھی اور دن بھی رات بھی اسیران راہ مولیٰ کے سارے دکھوں کو گویا اپنے پاک سینے میں جمع کر کے کبھی تو اپنی اداسیوں کا یوں انوکھے انداز میں اظہار فرماتے اور یورپ سے پاکستان آنے والے کے پلے یہ درد بھرا پیغام بندھاتے ؎

دیارِ مغرب سے جانے والو دیارِ مشرق کے باسیو ں کو
کسی غریب الوطن مسافر کی چاہتوں کا سلام کہنا

اے کاش دشمن بدنہاد یہ حقیقت سمجھ لیتا اور حد سے نہ بڑھتا کہ ؎

دنیا میں گرچہ ہوگی سوقسم کی برائی
پاکوں کی ہتک کرنا سب سے بڑا یہی ہے

اور اپنے ہر لاجواب خطاب میں اسیران راہ مولیٰ کا ذکر کر کے حضور کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو جاتا۔ حضور کی دلفگار آہیں آخر ثمر آور ثابت ہوئیں اور چشم فلک نے کئی نظارے دیکھے۔ مثلاً آپ کے باپ دادا نے تو مردے زندہ کئے تھے جب کہ آپ نے مقتول دشمن کو بھی زندہ کر کے دشمنان حقیقت کی سراسر جھوٹ بولنے والی اور افترا پرداز اور فتنہ ساز زبانوں کو ایسا بند کیا کہ تاریخ میں کم کم مثالیں اس کی ملیں گی۔ اُدھر مغرب میں حضور اپنے خدام کے سخت ابتلا کے دنوں میں مشکلات پر اور مصائب پر مسلسل تڑپ رہے تھے اِدھر خدام نے بھی حضور کے فراق و ہجر اور غریب الوطنی کے دکھ کو کم محسوس نہ کیا اور اس قسم کے نغمے الاپنے لگے۔

نہ درد فرقت کا نام لینا نہ چشم تر کا پیام کہنا

مقام صبر و رضا سے ان کو جب ہمارا سلام کہنا
جو حال پوچھیں وہ زخم دل کا یہی بتانا کہ مندمل ہے
دوائے دل بن کے خود جو آتے ہو دل میں تم صبح و شام کہنا
وہ اک دعا جو کہ ٹال دیتی ہے اذنِ حق سے قضائے مبرم
اسی کا مدت سے منتظر ہے غلام ابن غلام کہنا

نادان عدو کو کیا علم کہ حضور کی دعائیں اور حضور کی اقتدا میں غلامان احمدیت کی صدائیں کیا انقلاب لائیں گی۔ نہ انہیں یہ علم تھا کہ اس شخص کے مقدس دادا جان نے جو مامور زمانہ تھے، یہ انتباہ کیا ہوا تھا جسے ایک صدی گزر چکی اور جو خبر اس انتباہ میں تھی وہ سیدنا حضرت مصلح موعودؓ کی مبارک زندگی میں بھی ہیبت ناک جلوے ظاہر کرتی رہی اور پھر حضرت سیدنا ناصرالدینؒ کی آہ نے بھی سرو قد بین الاقوامی شہرت رکھنے والوں کو تختہ دار پر الٹ دیا۔ وہ خدا اب بھی خاموش نہیں رہے گا اور اپنے اس مقدس ''میرزا'' کے زمانے میں بھی قہری تجلّی دکھا کر اپنا شان عالی اور قدرت نمائی کا مظاہرہ کرے گا اور اس کے منہ آنے والے کو بھسم کر کے نشان عبرت بنائے گا۔ وہ انتباہ مسیح پاک کے اس شعر میں ڈھونڈ یئے کہ

زآہِ زمرہ ابدال بایدت ترسید
علی الخصوص اگر آہ 'میرزا' باشد

وضاحت کی ضرورت نہیں یہ وارننگ پڑھ کر خود ہم پر بھی لرزہ طاری ہو جاتا ہے کیونکہ یہاں حضرت مسیح پاک نے صرف اپنی ذات بابرکات پر مختص ہی ''زمرہ ابدال'' اور ''میرزا'' نہیں فرمایا بلکہ اپنے سارے جانشینوں کو جو ''مغل برلاس'' تھے سبھی کو آہ سے ڈرتے رہنے کی تنبیہ فرمائی ہے ورنہ جہاں خود حضور انور نے صرف اپنا ذکر کیا ہے وہاں تو سخت مشکل اور سنگین خطرات میں بھی جب آریہ لوگ حضور پر لیکھرام کو قتل کرنے کا الزام لگا کر حضور کو گرفتار کرنے اور قتل کروا دینے کے منصوبے بنا رہے تھے تو عرش الٰہی سے جو آواز حضور سنتے تھے مثلاً واللہ یعصمک من الناس اور پھر اسی پر توکل کرتے ہوئے حضور نے اپنے پاک سینے پر ہاتھ رکھ کر اعلان کیا تھا اور خوف یا ڈر تو اس قلب و مطہر کے قریب بھی نہ پھٹکا تھا کہ

جس کی دعا سے آخر لیکھو مرا تھا کٹ کر
ماتم پڑا تھا گھر گھر ''وہ میرزا یہی ہے''

اس شعر میں اور اوپر والے شعر میں ''میرزا'' کا ذکر ہے مگر میرے ناقص ذوق کے مطابق پہلے شعر میں سارے ''میرزا'' حضور کے جانشین شامل فرمائے اور آخری شعر میں صرف اپنا نام اقدس لے کر ساری ذمہ داری خود حضور نے اپنے ذمہ لے لی۔ اس لئے کہ رات

بھر قادر وتوانا مولا سے ہر قسم کی مدد، نصرت اور حفاظت کے مژدے سنتے تھے تبھی تو دھڑلے سے یہ دعویٰ کیا کہ

سخت دل ہیں ہم کسی کے بغض کی پرواہ نہیں
دل قوی رکھتے ہیں ہم درددوں کی ہے ہم کوسہار

حرف آخر۔خلفائے ثلاثہ کے قدموں میں بیٹھنے کے مواقع بھی میرے نصیب میں لکھے تھے اور واقعات بھی میرے مجروح سینے میں بے شمار ہیں جو ایک دفتر ہے مگر اب اسی پر ختم کرتا ہوں۔ یار زندہ صحبت باقی۔

دخت کرام

حضرت صاحبزادی سیدہ امتہ الحفیظ بیگمؓ صاحبہ

میں نے حضرت سیدہ امتہ الحفیظ بیگم صاحبہؓ کے بلند و بالا روحانی مقام کے متعلق باوجود اپنی علمی بے مائیگی کے کچھ لکھنے کا ارادہ کیا کہ موصوفہ کی زندگی میں، میں آپ کی مادرانہ شفقت اور الطافِ کریمانہ کا بطور خاص مورد رہا اور آپ کی دعاہائے مستجاب سے ان گنت فیوض حاصل کئے لیکن ان ساری نوازشات کا دھارا ایک طرفہ ہی چلتا رہا اور میں جواباً کوئی بھی خدمت سرانجام نہ دے سکا نہ ہی میں اس کا اہل تھا بے مائیگی کا یہ عالم اور پھر ذوق وشوق اور عقیدت کا تلاطم کا یہ حال کہ اپنی اس حقیر سی کاوش کے لئے عنوان کے ہر لفظ اور الفاظ کا ہر مجموعہ جو بھی ذہن میں آتا اس بلند مقام اور ارفع شان والے وجود کے مرتبہ سے فروتر ہی دکھائی دیتا۔

بالآخر حضرت مسیح موعودؑ کے الہام ''دخت کرام'' کی طرف ذہن منتقل ہوا۔تو ان دو الفاظ کی جامعیت اور معنویت نے میرا مسئلہ حل کر دیا۔اور پھر یہ حقیقت سمجھ آئی کہ

خدا کے قول سے قول بشر کیونکر برابر ہو
وہاں قدرت یہاں در ماندگی فرق نمایاں ہے

چنانچہ میرے اس مختصر سے مضمون کا عنوان حضرت سیدہ موصوفہ کا الہامی نام دخت کرام ہی تجویز ہوا۔ ان سطور سے ایک طرف تو سیّدنا افضل الرسل علیہ وعلی آلہ صلوٰۃ کے اس ارشاد کی تعمیل مطلوب ہے کہ اذکروا موتاکم بالخیر تو دوسری طرف حضرت موصوفہ کے احسانات کا تذکرہ کرکے آپ کے بلندی درجات کے لئے دعا کی تحریک کرنا مقصود ہے۔تا اس طرح ہی احسانات کے بوجھ کو کسی قدر ہلکا کرسکوں۔اپنی تو یہ حالت ہے کہ حضرت مسیح موعودؑ کی اس آخری نشانی کی جب بھی یاد آتی ہے۔(اور یہ یاد اکثر آتی ہے) تو آنسوؤں کی

برسات ساتھ لاتی ہے۔ یہی حال حضور اقدس کی بڑی صاحبزادی حضرت سیّدہ مبارکہ بیگمؓ صاحبہ کا ہے۔ان کے احسانات کا بھی قرض ابھی میرے ذمہ ہے۔کبھی توفیق ملی تو کچھ لکھوں گا۔

اس خانوادے کے کسی فرد کا ذکر کرنا چاہیں تو 14 سو سال قبل کی (صرف) صادقین ﷺ کی وہ پیش خبری سامنے آجاتی ہے جس میں چودھویں صدی میں امام مہدی کے متعلق فرمایا کہ یتزوج ویولدله کہ وہ شادی بھی کرے گا۔اور اس کی اولاد بھی ہوگی۔امام مہدی کی شادی اور اس کی اولاد خاص امتیازی نشان کی حامل ہوگی تو یہ پیش گوئی بنتی ہے ورنہ قریباً ہر آدمی شادی کرتا ہے اور اس کی اولاد بھی ہوتی ہے اگرچہ اس میں استثنٰی بھی ضرور ہوتے ہیں۔پھر حضرت اقدس محمد الرسول ﷺ کا یہ فرمانا کہ 1400 برس بعد آنے والا امام مہدی صاحب اولاد ہوگا۔یہ اس اولاد کے عالی مرتبت ہونے کی پیشگوئی ہے۔اس موقر جریدہ کے کالم شاید اتنی گنجائش نہ رکھتے ہوں کہ میں پہلے تیزوّج کی صداقت کا ذکر کروں اور پھر یولدلہ کی تفصیل بیان کروں۔تاہم اگر غور کریں تو اللہ کے قادر الکل۔علوم الغیب والشہادۃ ہونے اور حضرت رسول مقبول ﷺ کے بلند اور ارفع مقام محبوبیت حاصل ہونے اور حضرت مرزا غلام احمد بانی سلسلہ احمدیہ کے اس پیشگوئی کے حرفاً و معناً مصداق کامل ہونے پر حق الیقین پیدا ہوتا ہے۔یتزوّج کے متعلق تو بانی سلسلہ احمدیہ کو خود الہام ہوا کہ

ہرچہ باید نو عروسی راہم ساماں کنم
و آنچہ مطلوب شما باشد عطائے تو کنم

اور اولاد کے متعلق تو حضور کو بہت الہامات ہوئے ایک ایک کے متعلق اللہ تعالیٰ نے بشارتیں دیں چنانچہ فرمایا

مری اولاد سب تیری عطا ہے
ہر اک تیری بشارت سے ہوا ہے
اور پھر فارسی زبان میں بشارت ہوئی
زو درگاہ خدا مرادے بصد اعزاز مے آید
مبارک بادت اے مریم کہ عیسٰی باز مے آید

اگرچہ اولاد کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے بشارت سے نوازا تھا لیکن حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے خود بھی اپنی اولاد کے لئے بہت دعائیں کیں جو نثر اور نظم دونوں اصناف میں ملتی ہیں۔ایک چھوٹے سے شعر میں ایک بیش بہا خزانہ اولاد کے لئے مانگتے نظر آتے ہیں

تری قدرت کے آگے روک کیا ہے
وہ سب دے ان کو جو مجھ کو دیا ہے

اس آخری مصرعے میں اپنی اولاد کے لئے جو کچھ مانگا گیا ہے اس انتہا مانگنے والے سے بڑھ کر دینے والا ہی جانتا ہے۔ہم تو اس کی کنہ تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ **نعم الطالب و المطلوب**

یہ ایک شریں، دلنواز اور روح پرور داستان ہے یہاں تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں۔حضرت سیدہ امتہ الحفیظ بیگم صاحبہؓ سب بہن بھائیوں سے چھوٹی تھیں۔آپ کے بڑے بھائی سیّدنا محمود احمد صاحب نے جب قرآن کریم ختم کیا تو حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے ''آمین'' کی تقریب منعقد فرمائی۔اور اس موقعہ پر ایک نظم لکھی جس کا مطلع تھا

حمد و ثنا اُسی کو جو ذات جاودانی
ہمسر نہیں اس کا کوئی نہ کوئی ثانی

یہ نظم 1897 میں طبع ہوئی۔پھر حضرت مرزا بشیر احمد صاحب، مرزا شریف احمد صاحب اور حضرت سیّدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ کے ختم قرآن شریف کے موقعہ پر ایک اور مبارک تقریب پیدا ہوئی اور مسیح دوران نے اس موقعہ پر بھی ایک نظم لکھ جو 1901 میں اشاعت پذیر ہوئی۔لیکن حضرت سیدہ امتہ الحفیظ بیگم صاحبہؓ نے جب قرآن کریم ختم کیا یعنی 1911 میں تو اس وقت آپ کے والد گرامی وفات پا چکے تھے اور آپ کی ختم قرآن کی آمین آپ کے بڑے بھائی سیدنا حضرت فضل عمرؓ نے کروائی اور اپنے مقدس باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس مبارک موقعہ پر ایک نظم لکھی جس کا پہلا شعر یوں ہے۔

خدا سے چاہئے لو لگانی
کہ سب فانی ہیں پر وہ غیر فانی

نظم طویل ہے آگے چل کر حضرت مصلح موعودؓ فرماتے ہیں

حفیظہ جو مری چھوٹی بہن ہے
نہ اب تک وہ تھی اس میں رنگیں
ہوئی جب ہفت سالہ تو خدا نے
یہ پہنایا اسے بھی تاج زریں
کلام اللہ سب اُس کو پڑھایا
بنایا گلشن قرآں کا گلچیں

کیا مبارک خاندان تھا کہ جن کی ساری خوشیاں اور مسرتیں قرآن کریم کے مبارک دور سے ہی شروع ہوئیں اور یہ خانوادہ ساری عمر

قرآن کریم کے گرد ہی طواف کرتا رہا اور انہوں نے ساری مرادیں اسی کلام سے پائیں۔ اس خاندان کا بانی جو سلسلہ احمدیہ کا بھی بانی تھا۔ خود اس کی ابتدا اور انتہا اسی بے مثل ام الکتاب سے عبارت تھی۔ اور اس نے اس سلسلہ میں اپنے پاکیزہ جذبات کی ترجمانی کچھ یوں کی تھی۔

جمال وحسن قرآن نور جان ہر مسلمان ہے
قمر ہے چاند اوروں کا ہمارا چاند قرآن ہے

پھر فرمایا

دل میں یہی ہے ہر دم تیرا صحیفہ چوموں
قرآں کے گرد گھوموں کعبہ میرا یہی ہے

اے جماعت احمدیہ کے بزرگو اور دوستو! جماعت کے مقدس بانی کی اس معاملہ میں بھی پوری تقلید کریں کہ اپنے بچوں کو قرآن کریم کی تعلیم سے منور کرنے سے ہی تعلیم کی ابتدا کریں۔ یہ ''برتھ ڈے'' منانے والی رسوم یک قلم ترک کردیں کہ دین حق اور احمدیت میں ان کا کوئی نام ونشان نہیں ملتا۔ ہاں! بچوں کے ختم قرآن کے موقعہ پر ''آمین'' کی تقریب برپا کیا کریں کہ یہ مبارک روائت اپنے آقا کی ہے اسے زندہ رکھیں کہ سب خیر اسی میں ہے۔

حضرت بانی جماعت احمدیہ کو 10 رمئی 1904 کو الہام ہوا ''دخت کرام'' یعنی کریم والدین کی بیٹی۔ اور اسی خوشخبری کے مطابق حضرت صاحبزادی امتہ الحفیظ بیگم صاحبہؓ مورخہ 25 جون 1904 کو تولد ہوئیں۔

اور پھر وہ دخت کرام 83 برس کے قریب طویل عمر پاکر اللہ کے حضور حاضر ہوگئیں۔ اور جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ آپ حضرت مسیح ومہدی کی اولاد مبارکہ میں سے آخری وجود تھیں جو گویا حضرت مسیح پاک کے ''الدار'' کو ایک لحاظ سے خالی کر گئیں۔ تبھی تو جناب عبدالمنان ناہیدؔ نے لکھا

صبا قادیان کو بھی جا کر سنا
کہ آج اس کا ''الدار'' خالی ہوا

دفن ہو چکیں تو کسی کا شعر میری زبان پر تھا

اندر بھی زمین کے روشنی ہو
مٹی میں چراغ رکھ دیا ہے

اے بنت مسیحا تری نسبت تری ولادت سے قبل علیم وخبیر خدا نے جو خبر دی تھی اس میں تیری شان بیان ہوئی تھی تیری ساری زندگی ''دخت کرام'' کے مختصر مگر جامع الہام کی تفسیر تھی۔ تیرے آباء بھی کریم تھے تو بھی کریم ثابت ہوئی۔ اس جماعت کے بے شمار مرد وزن اس امر کے شاہد ہیں کہ تو نے اپنی کریمانہ صفات کا خوب اظہار کیا کیونکہ ''کرم'' کی صفات تو تجھے گھٹی میں ملی تھیں۔ تو زخمی اور مایوس دلوں کی ڈھارس تھی۔ دنیا کے ستائے ہوؤں اور گرفتارانِ بلا کے لئے ایک محفوظ قلعہ تھیں۔

اے مبارک خاتوں تری پیدائش بھی مبارک تھی اور تیری 83 سالہ ساری حیات بھی مبارک اور تیری رحلت بھی مبارک۔ جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو اپریل 1980 کی ایک شام کا دلدوز واقعہ میری آنکھوں کے سامنے شاہد ناطق بن کر آن کھڑا ہوا ہے۔ میری بڑی بہن کا بیٹا مسمّی محمد زبیر میو ہسپتال میں داخل تھا اس کے ٹیسٹ ہوئے تو اسی شام مجھے فون پر اطلاع ملی کے اس کے مثانے میں خطرناک قسم کا سرطان ہے۔ جسے لاہور کے کم علم ڈاکٹروں نے نشتر لگا کر اس زہر کو سارے جسم میں پھیلا دیا ہے اوّل تو سیّدنا حضرت حافظ ناصر احمد صاحب کی خدمت اقدس میں ان تاریخی الفاظ میں تار دیا کہ nothing can be done for Mohammad Zubair Prayers Requested اور پھر اسی درخواست کے ساتھ اپنی مادرِ مہرباں کی کوٹھی ''بیت الاکرام'' میں حاضر ہوا۔ مری حالتِ غیر پر مشفقانہ نگہ ڈالی تو ترس آیا اور اسی وقت دعا کی آئندہ مسلسل دعا کرتے رہنے کا وعدہ فرمایا۔ بہت اعتماد کے ساتھ فرمایا کہ محمد زبیر انشاء اللہ صحت یاب ہو جائے گا۔ دوائی بھی تجویز فرمائی وہ دوائی میں لے کر لاہور پہنچا اور شروع کروادی۔ نہ معلوم ''دخت کرام'' کے مبارک اور پر اعتماد الفاظ میں کیا برکت تھی کہ یوں محسوس ہونے لگا کہ ساری مصیبت ٹل گئی ہے۔ مریض جسے 105 درجے کا بخار مسلسل رہا تھا۔ ہوش وحواس ختم تھے۔ خون اور پیپ جاری تھی۔ ڈاکٹروں کے بورڈ نے لاعلاج قرار دے دیا تھا۔ دل دھڑک رہے تھے کہ کسی بھی لمحے بری خبر آجائے گی۔ لیکن شافی کامل نے سیدنا ومحبوبنا حضرت خلیفۃ المسیح الثالث اور دخت کرام اور تمام دوسرے بزرگوں کی مناجات کو شرف قبولیت بخشا اور محمد زبیر مذکور گویا موت کے منہ سے محفوظ ومامون باہر آ گیا۔ **فالحمدللہ علی ذالک**۔ چند روز بعد میں جو میو ہسپتال لاہور کے یورالوجی وارڈ میں محمد زبیر کو دیکھنے گیا تو وہ چارپائی پر تکیہ لگا کر بیٹھا تھا بخار اتر چکا تھا۔ خون اور پیپ غائب۔ بھوک عود کر آئی تھی۔ اور وہ اپنے سامنے سیّدہ حضرت نواب مبارکہ بیگم صاحبہؓ کی کتاب درّ عدن رکھ کر یہ نغمہ الاپ رہا تھا کہ

اے محسن و محبوب خدا اے مرے پیارے
اے قوّت جاں اے دل محزوں کے سہارے
مایوس کبھی تیرے سوالی نہیں پھرتے
بندے تیری درگاہ سے خالی نہیں پھرتے

ہر آن ترا حکم تو چل سکتا ہے مولیٰ
وقت آ بھی گیا ہو تو وہ ٹل سکتا مولیٰ
تقدیر یہی ہے تو یہ تقدیر بدل دے
تو مالکِ تحریر ہے تحریر بدل دے

شافی مطلق نعم المجیبین خدا نے اسے نئی زندگی عطا فرمائی اب پونے نو سال کا عرصہ ہوتا ہے اس کی صحت بہت اچھی ہے

اگر ہر بال ہو جائے سخن ور
تو پھر بھی ہیں شکر امکاں سے باہر

حضرت سیدہ موصوفہ کا وجود ایک سائبان کی مانند تھا۔ جس کی یک رنگی چھاؤں تلے ہزاروں لاکھوں نفوس پناہ لیتے تھے۔ اور انہیں اللہ تعالیٰ نے کمال حوصلہ عطا فرمایا تھا کہ کبھی اکتاہٹ یا بیزاری کا اظہار نہیں فرماتی تھیں۔

ایک دفعہ میں اپنی چھوٹی بیٹی امتہ الحفیظ کو ہمراہ لے کر ''بیت الکرام'' ربوہ حاضر ہوا۔ ایک طرف یہ خواہش کہ میری بچی کو زیارت اور ملاقات کی سعادت حاصل ہو تو دوسری طرف حضرت سیدہ موصوفہ کی علالت طبع کے باعث طبیعت میں جھجک کہ ہم آپ کے آرام میں مخل نہ ہوں۔ لیکن وہ تو اس جلیل القدر باپ کا لخت جگر تھی جسے ابتدا ہی میں **یاتون من کل فج عمیق** کا نصیحت آموز مژدہ سنا گیا تھا کہ بہت کثرت سے لوگ آئیں گے اور اس میں یہ اشارہ کرنا بھی مقصود تھا کہ کہ زائرین کی کثرت سے اکتانا نہیں اور ایک دنیا گواہ ہے کہ اس عالی ظرف شخص کو وسیع حوصلگی، غرباء پروری، بلند اخلاقی اور مہمان نوازی کی صفات اس قدر فراوانی سے ودیعت ہوئی تھیں کہ جن کی نظیر آپ کے مطاع و پیشوا حضرت رسول عربی ﷺ کی ذات گرامی کے سوا اور کہیں نہیں ملتیں۔

حضور کی سیرت نگاروں نے ایسی بے شمار مثالیں تحریر کی ہیں جن میں سے بعض میرے ذہن میں اس وقت بھی مستحضر ہیں لیکن مجھے یہ ضرور احساس ہے کہ میرے جیسا ہر جہت سے کام اور کم مایہ انساں کب تک اس بحر بیکراں کی صفات حسنہ کا کچھ بھی بیان کرسکتا ہے۔ قلم عاجز ہے

دل نادم تھی طرز بیان میری

خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

جملہ معترضہ طویل ہو گیا ہے لیکن ؎ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

الغرض میں نے ملے جلے جذبات و احساسات کے ساتھ اپنی بیٹی کو اجازت لے کے اندر بھجوا دیا تو ان موصوفہ نے باوجود شدید ضعف

اورعلالت کے حد درجہ شفقت اور رافت سے پیش آئیں۔ بچی کو دعاؤں دیں اس کے سر پر اپنے مبارک ہاتھ پھیرے۔ ملازمہ کو شربت پلانے کا حکم دیا اور آئیندہ حاضر ہوتے رہنے کا ارشاد بھی

تحیّر میں تھا دل کیا مہربانی یوں بھی ہوتی ہے
مقدّر کی طرف سے میزبانی یوں بھی ہوتی ہے

میں دولت کدّہ پر حاضر ہوتا تو اکثر و بیشتر تحریری درخواست دعا اندر بھجوا کر واپس آجاتا اگر ذرا بھر وہاں توقف کرتا تو اندر بیٹھنے کا حکم مل جاتا لیکن میں اس سے اجتناب ہی کرتا کہ تکلیف کا باعث نہ بنوں

میری درخواستوں کے بھی حساب ممکن نہیں اور اس مسیحا صفت کی نوازشات والطاف بھی بیروں از شمار ہیں۔ مجھے موصوفہ کی دعائے مستجاب سے جو فیوض و برکات نصیب ہوئیں ان میں سے کچھ تو میری نگہ میں ہیں اور نہ معلوم اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعاؤں کے صدقے مجھ پر کتنے ایسے کرم فرمائے جن کا ادراک میں اپنی کم نگاہی اور کوتاہ بینی کے باعث کر ہی نہی سکتا۔

میں اس مختصر مقالے کے ذریعہ حضرت سیدہ امتہ الحفیظ بیگم صاحبہؓ کی سوانح نگاری کی جسارت نہیں کر رہا میرا تو یہ مختصر مضمون تحریر کرنے سے یہ غرض ہے کہ اس عظیم روحانی شخصیت کے اخلاق فاضلہ خصوصاً بلند مقامِ قرب الٰہی کا کچھ بیان کرسکوں جسکی خود میری اور دیگر قارئین کے ایمان وایقان کی قوتیں بیدار ہوں۔ اور تمام جماعت احمدیہ کے مرد وزن یہ جان لیں کہ ہمارے اسلاف نے جن بلند روحانی گھاٹیوں کی سیاحت کی۔ اور ہم لوگ جو انہیں کے روحانی وارث ہونے کے دعویدار ہیں ہم پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

نیز اس محسنہ قوم کے لئے دل سے دعائیں نکلیں کہ اے مسیح دوراں کی دختر جسے تیرے دربار سے ''دخت کرام'' کا لقب عطا ہوا تھا وہ اپنے بزرگ باپ کی آخری نشانی تھی اس کا وجود ماہتاب کی مانند تھا جس سے بہتوں نے ٹھنڈک اور روشنی حاصل کی۔

کئی سالوں سے یہ دھڑ کا لگا ہوا تھا کہ یہ انمول نعمت ہمارے ہاتھوں سے گئی کہ گئی۔ موصوفہ کی صحت وعافیت کے لئے ہم مناجات بھی کرتے رہے جب تک تو نے چاہا اس سراپا شفقت وایثار وجود کو ہمارے درمیان رکھا اور ہم اپنی اپنی بساط کے مطابق اس سے فیض یاب ہوتے رہے اب وہ پیکر روحانیت ہم میں موجود نہیں ہے اپنی محرومی کے باعث ہم دل شکستہ ضرور ہیں مگر کیا مجال جو شکوہ کا ایک لفظ بھی منہ پر لاویں اور اس کے سوا کچھ نہیں کہتے کہ نرضی بمایرضی بہ اللہ پر

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

اے ہمارے آسمانی آقا ہماری طرف سے انہیں اجر جزیل عطا فرما اور سیدہ موصوفہ کو اپنی رحمت سے حضرت رسول ہاشمی ﷺ کے

قرب میں مقام عطا فرما کہ تیرے کرم و عطا کی کوئی حد بس نہیں۔

اب تو حضرت مسیح موعود کے رفقا بھی چند ایک ہیں وہ بھی چراغ سحری ہیں۔ ایک طرف یہ ساری محرومیاں ہیں لیکن تیری ذات جاودانی اور پیہم کرم فرمائی ان سب پر غالب اور محیط ہے۔ ایسا رحم فرما کہ ہمارے اسلاف کی دعائیں ہمارے حق میں قبول ہوں اور اپنی ستاری اور عفو کے دامن میں پناہ دے دے آمین۔

میری یہ حقیر سی کاوش ذرّہ نواز رب کے رحم اور فضل کے ڈھونڈنے کا بہانہ ہی تو ہے ورنہ اس دوران مجھے اپنے علم اور قلم کی خامیوں کا بھرپور احساس ہوتا رہا (امید کرتا ہوں کہ قارئین کرام صرفِ نظر فرماویں گے) میرے جیسے بےنوا سے بھلا کیا سیرت بیان ہو سکے گی اس بزرگ اور عالی منصب وجود کی۔ جس کی پیدائش سے پہلے مسیح الزماں کو علیم و خبیر خدا نے خوش خبریاں دی تھیں۔ میں تو ان کے اخلاق فاضلہ اور روحانی مقامات عالیہ کی ایک معمولی سی جھلک ہی پیش کر سکا ہوں۔ اور وہ بھی نامکمل

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

8/اکتوبر کے زلزلہ کی تباہی کا آنکھوں دیکھا حال اور نشان عبرت

امسال آٹھ اکتوبر کو شمالی علاقہ جات اور آزاد کشمیر میں قیامت خیز زلزلہ آیا۔ اس کے نتیجہ میں جو تباہی اور بربادی ہوئی اس کی تفصیل میں تو نہیں جاؤں گا۔ ایک تو اس سانحہ کو 60/65 روز گزر گئے ہیں اور الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا میں بہت تفاصیل آ چکی ہیں۔ اور یوں بھی یہ ایسا ناخوشگوار بلکہ دلدوز واقعہ ہے کہ اس کا صفحہ قرطاس پر لانے کی ہمت بھی نہیں۔ الامان الحفیظ۔ صحرانوردی کا مجھے شوق بچپن سے ہے۔ کبھی شمالی علاقہ جات تو کبھی کابل پھر ہندوستان کے دور دراز کے علاقے اور پھر یورپ اور امریکہ تو ہر سال ہی جاتا رہا۔ کیونکہ بقول حسن نثارؔ

بیج کس نے بو دیئے مجھ میں مسافت کے حسن
چلنا سیکھا تھا کہ پاؤں میں سفر اگنے لگے

میں شمالی علاقہ جات بہت جایا کرتا تھا۔ خصوصاً بالاکوٹ تو بوجوہ میرے لئے دلکشی اور دلچسپی کا موجب تھا۔ اور پھر ایک زمانہ آیا کہ میرے لئے اس شہر کی دلکشی تو ختم ہوگئی۔ اور وہ شہر میرے لئے بےوفائی اور غداری کا مکروہ نشان بن گیا۔ مگر اس حالت میں بھی میں وہاں

گیا۔اور میرے دونوں پوتے اور پوتی جو اس وقت چھوٹی عمروں کے تھے میرے ہمراہ تھے۔ہم نے ہوٹل سے کھانا کھایا۔اور عزیزان ہمرائیاں کو بھی وجوہات بتا کر تاکید کردی کہ پانی بھی پی لیں۔ وہاں سے نہیں مانگنا۔ گو وہ لوگ واقف کار تھے۔مگر انہیں کوئی زحمت نہیں دینی۔ رات پڑ چکی تھی۔ ان لوگوں نے بھی ہمارے تیور بھانپ لئے تھے۔ تاہم خوردونوش کا کہا۔مگر ہمیں ضرورت بھی نہیں تھی۔ اوران لوگوں کی بے وفائی اور محرومی کے باعث ہم ان کے ساتھ بے تکلفی کا بھی کوئی اظہار نہیں کرنا چاہتے تھے۔بیٹی کو تو ان کی خاتون نے اندر بلالیا تو اس کے ہاتھ میں حضرت سیّد صاحبزادہ عبداللطیف ؓ آف خوست کے سوانح پر مشتمل کتابچہ تھا۔جو اس خاتون نے بصدمنّت اس سے طلب کیا کہ اس بزرگ شخص کے ساتھ مجھے بہت گہری عقیدت ہے۔اور بس

قیام والے کمرے میں 3/4 چارپائیاں پڑی تھیں۔کپڑے کچھ ہمارے پاس تھے۔گرمی کا موسم تھا۔رات گزاری اور علی الصبح وہاں سے چل کر مظفر آباد پہنچے۔وہاں ایک ہوٹل میں چند گھنٹے قیام کیا۔کپڑے وغیرہ بدلے۔ناشتہ کیا اور سوئے مری روانہ ہوگئے۔اس کے بعد اب 8,7 نومبر کی درمیانی رات میں اسلام آباد میں تھا۔مارگلہ ٹاور وہاں سے قریب ہی تھا۔پورا ایک مہینہ قبل برادرم چوہدری مسعود احمد طالب پور بھنگواں والے اس ٹاور میں اپنے فلیٹ میں شب باش ہوئے تھے۔اور صبح 8.50 پر وہ ٹاور ریت کے گھروندوں کی طرح زمین بوس ہوگیا۔ اور میرا دیرینہ دوست جس کے ساتھ 1944 میں ٹی آئی کالج قادیان میں تعارف ہوا تھا۔پھر ہوسٹل میں اکٹھے رہے۔وہ بھی اس سانحہ میں ہمیشہ کے لئے میرا ساتھ چھوڑ گیا۔نومبر کی 7,8/ اکتوبر کی رات کو مجھے دو وجوہات کی بناء پر ایک چوٹ سی دل پر لگی جو ساری رات محسوس ہوتی رہی۔ایک تو یہ حسرت کہ کاش 7,8/ اکتوبر کی رات میں یہاں ہوتا۔اور اپنے دوست کو کھینچ کر یہاں اپنی جائے رہائش پر (اپنے عزیز کی کوٹھی) لے آتا۔تو وہ سجیلا جوانِ رعنا (جسے میں نے بڑھاپے میں دیکھا ہی نہیں۔اس کی جوانی کی شبیہ ہی آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے) موت کے محشر آفرین جبڑے سے بچ نکلتا اے کاش۔

گذشتہ 7/8 دسمبر کی رات بھی میں اسی کوٹھی کے اسی کمرے میں تھا کہ علی الصبح 8 دسمبر کو مجھے ایک وحشتناک خبر ملی تھی۔ جو بعد میں پتہ چلا کہ پوری خبر مجھے دل کہ ناہمواری کے باعث نہیں سنائی گئی تھی۔ وہ بھی میرے لئے قیامت صغریٰ سے کم نہیں تھی۔ بہرحال جوں توں رات بسر کی۔اورانہیں دو واقعات نے مجھے زبردست تحریک کی کہ میں بالاکوٹ جاؤں۔اور اپنی آنکھوں سے اب بالاکوٹ کی حالت دیکھوں۔ جہاں موت نے ننگا ناچ کیا تھا۔جنہوں نے کبھی بالاکوٹ کو شاد اور آباد دیکھا تھا۔ چنانچہ بھلا ہو عزیز چوہدری حاجی مرید احمد صاحب کا جنہوں نے میری راہنمائی کی اوران گنت فون پنڈی، اسلام آباد کر کے ایک صاحب کا موبائل فون حاصل کرلیا تھا۔ جو بالاکوٹ میں آدھے سے زیادہ خاندان گنوا کر اور سارا اثاثہ البیت وہیں ملبے میں دفن چھوڑ کر ایبٹ آباد میں پناہ گزین ہوا تھا۔

چنانچہ میں ایبٹ آباد پہنچا۔اس شہر کی حالت کا سرسری معائنہ کیا۔چند پلازے گرے پڑے دیکھے۔نہ معلوم کتنی جانوں کے ضیاع کا

موجب بنے ہوں گے۔اور پھرفون کر کے اپنے آنے کی اطلاع دی۔جو مجھے کرایہ کے مکان میں لے گئے۔جہاں وہ رہائش پذیر ہوئے تھے۔اس مکان کے کمرے خالی۔ایک کمرے میں ایک خاتون اور بچے اور ایک میں مرد۔فرش پر میٹ ڈال کر وہیں پر کھانا اور وہیں پر سونا۔میرے لئے چار پائی کا بندوبست کیا ہوا تھا۔مگر میں نے اسی فرش پر ایبٹ آباد 8/9 کی درمیانی خنک رات بسر کرنے کو ترجیح دی۔

علی الصبح ان کے بھائی منصور کو میں نے اپنے ہمراہ تیار کیا۔اور ہم پہلے مانسہرہ اور پھر بالا کوٹ ڈیڑھ بجے دن پہنچ گئے۔معلوم ہوا کہ اس صبح یعنی 9 / 11 کو بھی زلزلہ آیا تھا۔اور ایک پہاڑی گر کر سڑک کو بلاک کر چکی تھی۔اور وہاں فوجی کرینیں راستہ بنانے میں مصروف تھیں۔10,15 منٹ کے بعد وہ پہاڑ کا بہت بڑا ٹکڑا ایک طرف بہ مشکل سرکایا گیا۔اور دو دو میل تک رکی ہوئی ٹریفک رینگنا شروع ہوئی۔یہ مقام بالا کوٹ کے بالکل قریب تھا۔گاڑی کو وہیں ایک پٹرول پمپ جو وہ بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا تھا، پر چھوڑا۔اور اوپر پتھروں پر چلنا شروع کیا۔جو میرے لئے بہت خاصا مشکل تھا۔مگر ہانپتے کانپتے ہم ایک ٹوٹے پھوٹے گھر میں گئے۔جس کی دیواریں اور چھت سب پھٹ چکے تھے۔تاہم وہاں کے صاحب خانہ نے ہمیں ایک کمرہ میں بٹھایا چائے پیش کی۔جو میرے لئے پینا مشکل تھی۔دوسرے ساتھی نے پیالی پی لی۔اور وہ گھر ایک ایڈووکیٹ مبارک احمد خان نعمانی صاحب کا تھا۔جو خود مکان کی تلاش میں مانسہرہ گئے ہوئے تھے۔ملاقات نہ ہوئی وہاں ایک خاتون نے ہمیں بتایا کہ قیامت کا نمونہ ذرا اوپر جائیں، تو نظر آئے گا۔چنانچہ ہم اوپر کیا گئے کہ مکمل تباہی اور بربادی نے ہمارا استقبال کیا۔ وہاں کے سینکڑوں یا شاید اس سے بھی زیادہ مکانوں میں سے ایک بھی نہیں بچا تھا۔اور ان میں رہنے والوں میں سے شاذ ہی کوئی جان بچا سکا ہو۔حتیٰ کہ قبرستان کی قبریں بھی الٹی پڑی دیکھیں۔وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین ہمیں اونچا اٹھا کر نیچے گرا رہی ہے۔اسی کا نتیجہ ہے کہ مکان تو زمین کے ساتھ مل گئے۔قبریں بھی اکھڑا اکھڑ کر اوندھے منہ گری ہوئی دیکھیں۔

مجھے بتایا گیا کہ بازار کی حالت تو قیامت صغریٰ نہیں بلکہ قیامت کبریٰ ہے۔وہاں پر اچھے اچھے ہوٹل تعمیر ہو چکے تھے۔جو بعض کئی منزلہ تھے۔اور اب وہاں ملبے کے ڈھیروں کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا۔جس گھر میں ہم 1981/1982 میں گئے تھے۔اور جنہوں نے امام الزمان کا نام بڑی گستاخی سے لیا تھا۔اور میں نے بھی ان سے بہت باتیں کی تھیں۔جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔تاہم انہیں ان کے بزرگوں کے حالات و واقعات اور قربانیاں انہیں یاد دلائیں۔مگر کچھ اثر ان پر نہ ہوا۔وہ تو فرعون موسیٰ کے ساحروں سی بھی غیرت نہ دکھا سکے۔جنہوں نے جب حق کو پہچان لیا۔تو فرعون کی دھمکیوں سے کہ تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ دوں گا۔لیکن ساحر اس دھمکی سے بھی کچھ خوف زدہ نہ ہوئے اور ''لا ضیر'' کا نعرہ مستانہ بلند کر دیا۔جب دیکھا ان کی فطرت صحیحہ مر چکی ہے۔ہم نے بھی وہاں سے بھاگنے میں عافیت سمجھی۔وہ گھرانہ صفحہ ہستی سے مکمل مٹ چکا تھا۔اور اس گھر سے 5 نعشیں برآمد ہوئیں۔باپ، بیٹا، اس بیٹے کی بیوی

اوراس کا بیٹااورایک اورلڑکا۔ کہتے تھے کہ والدصاحب کی نعش پانچویں دن بسیار تلاش اورکوشش کے بعدغسل خانہ سے ملی۔کم وبیش یہی حال سبھی گھروں کا تھا۔

خیمہ بستی دیکھی۔روٹی لینے کے لئے لمبی قطاریں مردوں اورعورتوں کی۔اور مجھے تواس دن بھی وہ خیمے سردی کی رکاوٹ کے لئے ناکام نظرآرہے تھے۔اب توبارش اور برفباری کا سلسلہ شروع ہوگیاہے۔اوران خیمہ بستیوں کی حالت زاراخبارات اورٹیلی ویژن پر دکھائی جارہی ہے۔میرے لئے تین وجوہ کی بناپر یہ 8/اکتوبر کا سانحہ زیادہ عبرتناک بن چکا تھا۔

ایک میں یہاں وضاحت کردوں کہ ہرایک شخص کے لئے الگ ایک قیامت ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والوں اورانبیا کی صداقت پریقین کرنے والوں کے لئے بھی ایک قیامت ہوتی ہے کہ وہ ان کو ہلاک اور برباد کرنے کے لئے نہیں بلکہ ایک نئی جہت ترقی اورکامیابی کی عطا کرنے کے لئے آتی ہے۔جبکہ اللہ اوراس کے رسولوں کے منکروں کی قیامت تباہی اور بربادی لاتی ہے۔جیسے تاریخ اسلام میں ہے کہ حضرت سعید بن عامرحضرت عمرؓ کے زمانہ میں حمص کے گورنر تھے۔جوتنخواہ ملتی وہ غریبوں میں تقسیم کردیتے۔نہایت تنگی ترشی سے گزارہ تھا۔حضرت عمرؓ کواس کا علم ہواتو بہت روئے اور پھرایک ہزار دینار کی تھیلی قاصد کودے کرحضرت سعیدؓ کے پاس بھیجا۔گھرآئے تو بہت افسردہ تھے۔انااللہ پڑھا بیوی نے پوچھا کہ کیاہوا۔حضرت امیرالمومنین فوت ہوگئے۔فرمایااس سے بھی بڑی قیامت آگئی ہے۔کہ دنیامیرے گھرآئی ہے یہ بہت بڑافتنہ ہے۔اور پھرسارے دینارخرچ کرکے ہی انہیں اطمینان کا سانس لیا۔

ایک تو''8'' کے ہندسے سے مجھے بہت وحشت ہوتی ہے۔یہ ایک ذوقی میرا ذاتی مسئلہ ہے۔جس کی شائدکوئی دینی یاروحانی بنیادنہ ہو۔مثلاً گزشتہ عیسوی کا سن''8'' ہی تھا۔جس روزایک صاحب دل کے قول کے مطابق وقت صبح ہی سورج غروب ہوگیا تھا۔یہ بھی ایک محشرآفرین روزاورسال ثابت ہوا۔مگرایک دائمی قدرت اس کے نتیجہ میں عطاہوئی جسے کبھی فنانہیں۔اس لئے گواس دن کا سانحہ بہت ہی دلفگاراورگویا ہماری ہستی پرایک زلزلہ وارد کرگیا تھا۔مگرہم اللہ کے فضل وکرم سے اس زلزلہ کے نتیجہ میں بربادنہیں ہوئے بلکہ دوسری قدرت نے سنبھالا دیا۔اورہم ترقی کی راہوں پرمسلسل گامزن ہیں۔

پھر 8مئی 1959 کا روز میری اپنی ذات کے لئے قیامت بن طلوع ہوا تھا۔جب میرے اباجو 1903 یاایک روایت 1907 کے رفقا میں شامل تھے۔اچانک مجھے اکیلا چھوڑکر اپنے خالق کے قدموں میں جابیٹھے۔میں بالکل ایک نوخیز اور ہرلحاظ سے خام لڑکا تھا۔گھر خالی تھا۔والدہ صاحبہ پہلے فوت ہوچکی تھیں۔بہنیں بڑی تھیں۔دورونزدیک اپنے اپنے گھروں میں آباداورمیں اوراباد ونوں اس گھر میں۔ 5/6دن بعد میرایونیورسٹی کا امتحان تھا کہ یہ سانحہ پیش آگیا۔میرے لئے بے حد صبرآزما مگر یہ بھی اللہ کی رحمتوں کے نزول کا موجب ضرورہوا الحمدللہ۔تفصیل کا موقع نہیں۔

پھر ''8'' دسمبر 1965 کا دن وہ تو گویا یوم محشر سے زیادہ صد ہزار خوف اور وحشتیں ساتھ لایا تھا۔ 52 سال کا عرصہ حضرت مصلح موعودؓ نے گزارا۔ بہت تھوڑے لوگ تھے جنہوں نے خلافت اولیٰ کا زمانہ اور پھر 1914 میں خلافت ثانیہ کا آغاز دیکھا۔ ہم تو بعد کی پیداوار ہیں۔ ہمیں اس ہولناک انقلاب آفریں قیامت کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ جو ہماری زندگی میں پہلی بار برپا ہوئی۔ اور مجھے وہ چاندنی رات یاد ہے جب ہم بیت مبارک کے گیٹ پر دلوں کی دھڑکن اور آنکھوں سے بہنے والے سیلاب اور کپکپاتے اور لرزتے اور سخت بے تابی، بے چینی، اضطراب اور غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے کھڑے تھے۔ محترمہ صاحبزادی امتہ القدوس صاحبہ نے سچ کہا تھا کہ

اس کے دم سے اجالا تھا چاروں طرف
وہ گیا تو یہاں تیرگی چھا گئی
چاند روشن ہے اب بھی افق پر مگر
میرے سورج کو کس کی نظر کھا گئی

حضرت مصلح موعودؓ کے جماعت احمدیہ کے ساتھ تعلقات کی نوعیت یکسر بے مثل اور مختلف تھی۔ وہ جس کی پیدائش سے بھی 3 سال قبل وحی الٰہی میں اس کی صفات حسنہ بیان ہوئی تھیں۔ وہ شخص ہزاروں لاکھوں دلوں کو جیت کر اپنے آسمانی آقا کے پاس چلا گیا۔ اور میرے جیسا انسان سمجھتا تھا کہ اس کے بعد ہماری زندگی کیونکر بسر ہوگی۔ مگر پھر آسمان سے حبل اللہ اتری۔ اور ہم نے اس کو تھام کر اپنی برستی آنکھوں کو ٹھنڈا کیا۔ اور دھڑکتے دلوں کو قرار اور لرزتے قدموں کا ثبات مل گیا۔ یہ بھی ایک قیامت تھی مگر اس کا ایک لحاظ سے اثر دیرپا نہ تھا۔ اور یہ بھی مبارک ہی ثابت ہوئی۔

پھر ''8/9'' کی ایک اور رات آئی۔ حضرت حافظ ناصرالدین صاحب کو بھی اپنے رب کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ آپ کا وجود بہت ہی مبارک اور الٰہی بشارتوں کا مظہر تھا۔ اس نے اپنے زمانے میں جو سترہ برس کا تھا ہمیں دن حق کی اشاعت کے لئے لاانتہا کام کیا۔ وہی جس کو آسمان سے یہ انمول مائدہ عطا ہوا تھا۔ کہ

جان و مال و آبرو حاضر ہیں تیری راہ میں

اور یہ وہی پاک وجود تھا جس کے بارہ میں محترم چوہدری انور حسین صاحب شیخوپورہ والے نے ایک بڑے بزرگ کا قول بتایا تھا کہ میں نے آسمان پر ''میاں ناصر احمد'' لکھا دیکھا ہے یہ 1965 سے پہلے کی ہے۔ اور LOVE FOR ALL HATRED FOR NONE کو تو جو یورپ اور امریکہ، کینیڈا بلکہ ساری دنیا میں قبولیت عطا ہوئی ہے۔ اپنوں میں بھی اور غیروں میں بھی۔ وہ بہت بڑی علامت ہے۔ اس کے ولی اللہ ہونے کی ہے۔

پھر میرا ایک ذاتی سانحہ وہ بھی 8ر دسمبر گزشتہ برس پیش آیا۔ اس نے بھی ہماری ہستی کی بنیادوں کو گویا ہلا کر رکھ دیا۔ اسی طرح بقول مؤرخ احمدیت کے حضرت سیّد حافظ مختار احمد شاہ جہاں پوری بھی 8ر جنوری 1963 کو فوت ہوئے تھے۔ اور اس کے علاوہ بھی کئی بزرگ مثلاً فتح حامد علی صاحب 8ر ستمبر 1919 اور حضرت شیخ نور احمد صاحب ریاض ہند پریس والے 8ر جون 1928 کو فوت ہوئے۔ دوسری اہمیت ''8'' تاریخ کے سانحہ عظیمہ کی یہ ہے کہ 7/10 کو مونگ ضلع منڈی بہاؤالدین فجر کی عبادت کے وقت دوران عبادت ''8'' احمدیوں کا گولیوں سے ظالمانہ طور پر شہید کر دیا گیا۔ اور 14 شدید زخمی ہوئے۔ ایک تو پھر ''8'' کا ہندسہ ہمارے دلوں کو زخمی کرنے کے لئے موجود اور ظالمانہ وحشت انگیز واقعہ کے بعد 28 گھنٹے کے اندر ہی قادر مطلق نے زمین کو تہ و بالا کر دیا۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے ہمارے دلوں پر تو ان دونوں دنوں کے ہولناک اور اندوھناک سانحات نے ایسے گہرے زخم لگائے ہیں کہ اگر خدا کا فضل شامل نہ ہوتا تو دل ان مغموم و ہموم سے پھٹ چکے ہوتے۔

میں تو مر کے خاک ہوتا گر نہ ہوتا تیرا لطف
پھر خدا جانے کہاں یہ پھینک دی جاتی غبار

''علماء'' میں یہ بحثیں چلی ہوئی ہیں کہ کوئی صاحب فرماتے ہیں یہ ''عذاب الٰہی'' ہے دوسرے کے نزدیک یہ ''انعام الٰہی'' ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو آزماتا ہے۔ اور تیسرے عالم دین تو بہت آگے نکل گئے ہیں اور دور کی کوڑی لائے ہیں نہ یہ عذاب ہے نہ انعام۔ تم نے سائنس بھی نہیں پڑھی۔ یہ تو زمین کی تہوں کے نیچے پلیٹیں ہوتی ہیں۔ ان میں مدّت مقررہ کے بعد جنبش ہوتی ہے۔ جسے تم زلزلہ کہتے ہو۔ گناہ ثواب کا ان زمینی حرکتوں سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ میں تو عالم دین نہیں اس لئے ان ''عقلمندوں'' اور ان ''دانشمندوں'' پر کیا جرح کروں۔ مگر بھائیو! یہ جو قرآن کریم میں انبیا کی مخالفت میں بستیوں کو الٹا دینے کا ذکر کئی مقامات پر آیا ہے۔ اور موتفکت الٹی ہوئی بستیوں کو کہتے ہیں تو یہ نظارے ان گنہ گار آنکھوں نے 9 نومبر کو بالاکوٹ میں دیکھے اور بے اختیار میرے منہ سے نکلا ''الموتفکت''۔ گویا علماء کرام کو اور خصوصاً موخرالذکر ''عالم'' کو ذرا بھی خوف نہیں کہ یہ گناہوں کی شامت ہے۔ اور کہ یہ آسمانی کوڑا ہے۔ جو برسا ہے۔ اور بستیوں کو الٹا دیا گیا ہے۔ لاکھوں مر گئے کروڑوں روپے مالیت کے سامان دفن ہو گئے۔ ہزاروں بلکہ ایک لاکھ کے قریب زخمی اور اپاہج ہوئے پڑے ہیں۔ اور ان صاحب کو اس عبرت کے خوفناک سیلاب میں سے ایک قطرہ بھی نصیب نہیں۔ یہ قرآن مجید کو نہیں پڑھتے۔ سورۃ ہود میں ذکر ہے۔ اسے نہیں پڑھا کہ گویا ایک گونج دار عذاب نے انہیں پکڑ لیا۔ اور وہ گھروں میں گھٹنوں کے بل پڑے رہ گئے۔ اور ظالم عالم یہ آیت سورۃ الشعرا کیوں تیری نظروں سے اوجھل ہو گئی کہ ڈرائے جانے والوں پر جو بارش ہم نے برسائی وہ بہت بری تھی۔ آپ تو آرام سے کہہ دیں گے کہ سمندر سے بخارات اٹھتے ہیں۔ جو بادل بنتے ہیں۔

اور بارش برس پڑتی ہے۔اس میں عذاب کا کیا سوال؟ کلام الٰہی میں اس کو ساء منظر المنذرین کہا گیا ہے۔ان علما سے یہ گزارش ہے کہ

چھوڑ دو وہ راگ جس کو آسمان گاتا نہیں
وہی احمد فراز والی بات سچ ہے کہ
جام و سبو کی آبرو اہل ہوس کے ہاتھ ہے
جب سے خطیب و محتسب شہر میں معتبر ہوئے

اوراس سے قبل علامہ اقبالؒ بھی ان عالموں کے بارہ میں کیا خوب کہہ گئے ہیں

مجھ کو سکھا دی ہے فرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملاں ہیں کیوں ننگِ مسلمانی

اور

اور ملا کی نظر نور فراست سے ہے خالی
بے سوز ہے مے خانہ صوفی کی مے ناب

’’8‘‘ اکتوبر 1907 یعنی اس سانحہ سے پورے 98 برس قبل یہ قرآنی آیت پر ماموز مانہ کوالہام ہوئی۔جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم کسی کوعذاب نہیں دیتے جب تک کوئی ڈرانے والا نہ بھیج دیں۔

افسوس یہ ہے کہ بجائے عبرت حاصل کرنے کے گناہوں اور جرائم میں کیا زلزلہ زدگان اور کیا بیرونجات کے لوگ پہلے سے بڑھ رہے ہیں۔مثلاً جس روز میں بالاکوٹ گیا اسی روز روزنامہ ’’اوصاف‘‘ میں یہ خبر جلی حروف میں چھپی کہ بالاکوٹ اور مانسہرہ کے تحصیل ناظم اور ضلعی ناظم کو جو امداد ملتی ہے وہ صرف اپنے ووٹران میں تقسیم کر دیتے ہیں۔اور دوسرے بھوکے ننگے مر رہے ہیں۔پھر یہ خبر بھی پریس میں آئی تھی کہ آزاد کشمیر کے دو وزراء کے گھر سے 500 خیمے برآمد کئے گئے۔اور دیگر افسران نے اپنے گھروں میں ٹرکوں میں جو اشیاء گئی تھیں وہ ساری کی ساری اپنے گھر میں رکھ لیں۔اسی طرح بچوں اور عورتوں کے اغواء کے واقعات بھی اخبارات میں چھپے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں عوام کا اس میں کم قصور ہے۔علما جو اس کو معمول کی زمینی حرکت قرار دے کر اپنے علّامہ ہونے کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔عوام کا گناہ ان کے سر ہے۔کاش وہ خود بھی اور دوسروں کو بھی یہ سمجھاتے کہ لوگو یہ اللہ تعالیٰ حلیم و کریم کی ناراضگی کے باعث ہوا ہے۔ راتوں کو اٹھو اور شور محشر برپا کر دو۔تا اس قادر کریم کا جوش رحم میں آئے۔اور آئیندہ ہمیں اس مصیبت سے محفوظ رکھے۔اب تو یہ حالت

ہے قریباً ہر روز زلزلے کے جھٹکے آتے ہیں۔ مجھے بالاکوٹ میں بتایا گیا تھا کہ ایک امیر شخص جو وزیر رہ چکا ہے۔ اس نے اس علاقہ کے سارے بڑے بڑے شہروں میں عالی شان ہوٹل تعمیر کئے تھے۔ بالاکوٹ والے ہوٹل تو 8/اکتوبر کو ہی برباد اور زمین بوس ہو گئے تھے۔ سارے سامانوں اور ہلکاروں سمیت۔ ناران میں ایک ہوٹل جو 4,3 منزلہ تھا وہ 8/اکتوبر کو بچ گیا تھا مگر جو زلزلہ 5 نومبر کو آیا اس میں وہ بھی گر کر تباہ ہو گیا ہے۔ اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

یہ عالم کہلانے والے عجیب مٹی سے بنے ہیں۔ کہ عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے۔ اور نیست و نابود کر دیتا ہے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ چونکہ میری چمڑی بچی ہوئی ہے۔ اس لئے یہ معمول کا گویا پیار ہے۔ کچھ خوف نہ کرو اور یہ غم اور نہ ڈرنے اور تائب ہونے کی ضرورت نہیں۔ بھلا سائنسی عمل بھی ڈرنے سے اور توبہ کرنے سے رک سکتا ہے؟ میں نے 8,9 نومبر کی سردرات ایبٹ آباد میں کمرے میں فرش پر گزاری۔ میں پونے چار بجے اٹھا۔ میرے کمرے میں تین نوجوان تھے۔ ایک زخمی اور دو صحیح سلامت۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ مگر وضو کیا۔ اور نوافل ادا کئے۔

پھر اذان ہوئی تو عبادت کی۔ مگر کیا مجال جو کافی دن چڑھ آنے سے قبل ان میں سے کسی نے بھی کروٹ لی ہو۔ میرا اٹھنا اور عبادت کرنا تو گویا کوفے میں اذان کی طرح تھا۔ کاش نیند کے ان ماروں کو اب تو اللہ کے حضور کے گڑ گڑا کر معافی مانگنے کی طرف توجہ ہوتی تا یہ سلسلہ کہیں ختم ہونے کو آتا۔ ایک عارف باللہ نے تو اللہ کے حضور آہ وزاری کی تھی کہ گویا عرش کے کنگروں کا ہلا دیا تھا۔ اور کہا تھا۔

پھر چلے آتے ہیں یارو زلزلہ آنے کے دن
زلزلہ کیا اس جہاں سے کوچ کر جانے کے دن
تم تو ہو آرام میں پر اپنا قصّہ کیا کہیں
پھرتے ہیں آنکھوں کے آگے سخت گھبرانے کے دن
کچھ خبر لے تیرے کوچہ میں کس کا شور ہے
کیا میرے دلدار تو آئے گا مر جانے کے دن

مجھ سے اگر کوئی اختصار پسند طویل بحث سے پہلو چھڑاتے ہوئے یہ سوال کرے کہ تمہیں احمدیت نے کیا دیا۔ تو اور جوابات کے علاوہ یہ جواب بھی بڑا جامع ہے کہ ''دعا'' کیونکہ اس میں مانگنے کا سلیقہ بھی موجود ہے۔ اور قادر اور حی و قیوم خدا پر کامل یقین بھی شامل ہے۔ اور یہ بھی کہ اس کی قدرتوں اور رحم و کرم کی کوئی انتہا نہیں۔ اور یہ بھی کہ ہمارا زندہ جاوید خدا ہے۔ اور ہر آن معجزہ نمائی کی طاقت رکھتا ہے۔

لوگو سنو کہ زندہ خدا وہ خدا نہیں

جس میں ہمیشہ عادت قدرت نما نہیں

اور

اے سونے والو جاگو کہ وقت بہار ہے
اب دیکھو آگے درپہ ہمارے وہ یار ہے
کیا زندگی کا ذوق اگر وہ نہیں ملا
لعنت ہے ایسے جینے پر گر اس سے ہیں جدا

جلسہ سالانہ اور ہم

ہم تو بچپن سے ہی سفر کے شوقین تھے۔ پہلے گھوڑے پھر لوہے کے گھوڑے (سائیکل) پر اور پھر قادیان کے سفر میں ریل گاڑی اور پھر جب اللہ وہاب نے موٹر کار عطا فرمائی تو گویا پاکستان کے طول وعرض کی پیمائش کر ڈالی۔ پاکستان ہے کتنا کراچی سے خیبر تک اور یہ سفر بار ہا کیا۔ شاعر حسن نثار نے اپنے بارے میں شعر لکھا تھا مگر ہم جیسوں کی تصویر کشی بھی ساتھ ہی کر دی کہ

بیج کس نے بو دئے مجھ میں مسافت کے حسنؔ
چلنا سیکھا تھا کہ پاؤں میں سفر اگنے لگے

(1) یہ بہت پرانا قصہ ہے کہ چلنا سیکھا تو ابا نے انگلی پکڑی اور قادیان کی راہ دکھائی۔ یہ جلسہ سالانہ کو موقعہ تھا میرے ابا ''رفیق'' تھے انہوں نے 1903 میں اپنا ہاتھ اس ہاتھ میں دینے کی سعادت حاصل کی تھی کہ جس کے ہاتھ میں ہمہ وقت نور آسمانی کی رو بجلی کی رو کی مانند دوڑتی رہتی تھی۔ اور جس کو اس دست مبارک صد مبارک لمس نصیب ہو جاتا وہ یکسر ایک مختلف انسان بن جاتا تھا۔ مسلمان را مسلمان باز کردند کے مفاہیم دھانی کے سمندر میں سے ایک لحاظ سے وہ خوش بخت بھی ''باز'' بن جاتا نہ پڑھے لکھے کی کوئی قید، نہ عالم فاضل ہونے کی کوئی شرط۔

یہ نور کی برقی رو ایک لمحے میں اس شخص کی زندگی میں ایک حسین روحانی انقلاب لانے کا موجب بن جاتی۔ اس سلسلہ میں اپنے شواہد اور مشاہدات کا احوال کا کچھ بھی تو ذکر نہیں کر سکتا گو یہ تذکرہ لذّت آفرین اور روح پرور ہوگا مگر ڈرتا ہوں کہ اس کی زد میں الفضل کے کالموں کی جغرافیائی حد آ جائے گی۔

(2) میں ذکر رہا تھا کہ 6 سال کی عمر کا طفلک تھا کہ ابا جان نے جلسہ سالانہ قادیان کی چاٹ لگانے کی غرض سے ریل کا پہلا سفر کرایا۔ حضرت مصلح موعودؓ کے شباب کا زمانہ تھا۔ ہمیں حضور کے بیان فرمودہ معارف کی سمجھ تو نہیں آتی تھی لیکن اس جذب وکشش کی کیفیت یاد ہے۔ جس کی وجہ سے ہمہ وقت اس ماہتاب سے زیادہ پرنور چہرے پر نگاہیں جمی رہتیں۔ اور یہ اولیاء اللہ کی ایک خاص نشانی ہوتی ہے سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ 1991 میں قادیان تشریف لے گئے تو ہوا خوری کے لئے ہر روز مختلف جہات میں شہر سے باہر تشریف لے جاتے۔ ایک سردار صاحب اپنی کوٹھی کے باہر کھڑے تھے اور اپنا چھوٹا بچہ اٹھایا ہوا تھا وہ حضور انور کی طرف لپکا تو حضور نے اسے پیار کیا تو وہ معصوم بچہ بھی حضور کے چہرہ پر برستے نور کا والا وشیدا ہو گیا۔ اگلی صبح حضور جب ادھر سے نہ گزرے تو وہ بچہ روتا چیختا چلاتا رہا کہ ''وہ'' آج کیوں نہیں آئے۔

وہ بچہ معصوم تو تھا پر اسے نادان نہیں کہہ سکتے کہ یہ وہی نادر اور نایاب جنس تھی جو 110 سال قبل لالہ ملاوامل اور لالہ شرمپت کو حاصل ہوئی تھی ایک آریہ نے شاید حضرت اقدس مسیح موعودؑ کا قرب پانے کی غرض سے جب دوسرے غیر مسلموں کی شکایت کی کہ مرزا جی یہ لوگ آپ سے فائدے بھی اٹھاتے ہیں اور جب اپنے حلقہ میں اپنے ہم مذہبوں کے پاس جاتے ہیں تو آپ کے خلاف باتیں بھی کرتے ہیں۔ ہمارے سید و مرشد نے کیا لازوال صداقتوں پر محمول پیارا جوب دیا فرمایا لالہ جی ہماری مثال تو ایک بیری کی سی ہے کہ لوگ اسے ڈھیلے اور پتھر بھی مارتے ہیں پھر بھی بیر دیئے جاتی ہے اور وہی پتھر مارنے والے ہی کھاتے بھی ہیں۔ غرض وہ میرے بچپن کے سنہرے دن اور نورانی راتیں اب کہاں۔

یہ قادیان کے جلسہ سالانہ کی مبارک ابتدا تھی گویا میں کہہ سکتا ہوں کہ جلسہ سالانہ کی محبت میری گھٹی میں پڑی تھی اور یہ میرے ''رفیق'' والد محترم کا اور ان گنت احسانات کے ساتھ بہت بڑا احسان۔ اور پھر 1946 تک باپ اور بیٹے نے کبھی اس مبارک اجتماع میں حاضر ہونے میں ناغہ نہ کیا۔ شعور میں پختگی آتی گئی اور پھر تو ایسا چسکا پڑا کہ دنیا کی کوئی طاقت اس سے ہمیں دور نہ رکھ سکی۔ جلسہ سالانہ میں شمولیت کے لئے ہر قسم کی تیاری ایک ماہ بلکہ اس سے قبل شروع ہو جاتی اور یہ تیاری کے شب وروز بھی عجیب کیفیت میں گزرتے۔ قادیان میں کیا دیکھا اور کیا سنا اور وہ کیا طاقت تھی جس نے ہمیں دارالامان کی محبت والفت میں جکڑ دیا۔ یہ بیان کرنے کی طاقت نہ میری زبان میں ہے نہ قلم میں۔ دریا کو کوزے میں بند کیا جا سکتا ہوگا مگر یہ مجھ سے تو ممکن نہیں البتہ ایک قلندر شاعر نے نہایت اختصار کے ساتھ اور خوبی کے ساتھ اس کیفیت کو یوں بیان کیا تھا۔

قادیان ہم عمر قیدی ہیں تیرے
دھوپ میں اپنی کٹے یا چھاؤں میں

ہتھکڑی اس کی کشش کی ہاتھ میں
اور زنجیر محبت پاؤں میں

(3) بھائیو! قادیان میرا شہرِتمنا ہے یہ مبارک بستی جتنی سطح زمین پر ہے اس سے زیادہ میرے سینے میں بستی ہے اس کا ذکر اس قدر مختصر کر کے آگے جانا گو میری طبیعت پر گراں گزر رہا ہے مگر مجبور ہوں کہ میں نے قادیان سے لاہور اور لاہور سے ربوہ اور ربوہ سے لندن تک سفر کرنا ہے۔ صرف 1946 کے جلسہ سالانہ کے دوران موسلا دھار بارش کا نظارہ ایسا تازہ ہے جیسے کل کی بات ہو۔ میرے محبوب استاذ المحترم میری جان، اس زمانے کے ہمارے کالج کے پرنسپل اور بعدازاں میرے سیّد و آقا حضرت مرزا ناصر احمد صاحب بارانِ رحمت سرما میں بھیگ رہے تھے اور عزم کی چٹان بنے کھڑے تھے کہ سیدنا حضرت مصلح موعودؓ نے جلسہ ختم ہونے کا اعلان فرما دیا۔

تقسیم ملک کے بعد ایک جلسہ سالانہ لاہور میں جودھا بل بلڈنگ کے ساتھ ایک کھلے میدان میں اور ایک جلسہ سالانہ غالباً کہ غیر مسلموں کے مندر کے احاطے میں ہوا۔ پھر سیّدنا حضرت مصلح موعودؓ نے پہلا جلسہ ماہ اپریل 1949 میں ربوہ کے چٹیل مگر گرد و غبار سے اٹے ہوئے بے آب و گیاہ جنگل میں کیا اور حضور انورؓ نے قرآنی آیات کی نہایت سوز سے تلاوت فرمائی جس میں ذکر تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ محترمہ کو بے آب و گیاہ جنگل میں چھوڑا تھا اور کہ اے علیم خدا تو جانتا ہے جو ہم چھپاتے ہیں یا جو ہم ظاہر کرتے ہیں۔ حضور کا وہ خطاب اس ماحول میں ہمارے لئے بے حد ایمان افروز ہونے کے علاوہ امید افزا بھی تھا۔ نہ گرمی کا احساس نہ گرد و غبار کا جس میں گویا انسان سارے کا سارا چھپ جاتا تھا نہ اس سے کوئی اکتاہٹ یا جھنجھلاہٹ۔

ہاں! یہ فکر ضرور رہتا کہ اتنی گرد میں حضرت صاحب کی طبع حساس اور صحت پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔ رہنے کی کوئی جگہ نہیں مگر ہم یکسر بے فکر۔ کوئی سواری نہیں مگر کچھ فرق نہیں پڑتا ہم اپنی مختصر سی فیملی کے ساتھ شامل جلسہ۔ جب جلسہ ختم ہوتا تو پیدل چل کر احمد نگر کے نواح میں ایک ڈیرے پر قیام کرتے ڈیرہ بھی کیا تھا ایک کچا کوٹھا اور ایک نلکا۔ اس کوٹھے کی چھت پر ہم سو جاتے اور وہ شریف لوگ نیچے۔ دنیاوی اور بشری حاجات تک کو تین طلاقیں دے کر وہاں آئے تھے۔ نہ معلوم کھاتے کیا تھے۔ اور کہاں سے مگر یہ سب ثانوی ضروریات تھیں۔ بس حضرت مصلح موعودؓ کی نفیری کی آواز میں مست الست یہ شب و روز ایسے مزے سے گزرے کہ محلّات میں رہنے والے امراء جنہیں عیش و عشرت کے سارے سامان میسر ہوں انہیں وہ سرور و لذت کہاں نصیب ہوگی۔ جو ہمیں اس کچے کوٹھے کی چھت پر ربوہ پیدل آنے جانے میں نصیب تھی۔ رہنے میں ہرگز کوئی دشواری نہ آئی بلکہ انمول خوشیاں نصیب ہوئیں۔ اور روحانی حظ جو نصیب ہوا اس کی وجہ سے ایک روحانی نشے میں یہ دن گزرے۔ کیونکہ ایک ساقی ہمیں مسلسل مئے پلاتا رہتا تھا۔ وہ نظارہ ایک عجیب مشاہدہ تھا۔ بھلانا بھی چاہیں تو کیونکر بھلا سکتے ہیں۔

(4) ربوہ میں پھر باقاعدہ جلسہ سالانہ شروع ہوا ہمارے امام ومطاع اور ہمارے محبوب آقا مٹی کے کچے گھروندوں میں رہتے تھے حتیٰ کہ حضرت سیدہ اماں جانؓ کے لئے بھی مٹی کا کچا گھر نہ بجلی نہ پانی نہ کوئی اور سہولت نام کی شے میسر تھی۔ کیسے وہ شب وروز بسر ہوتے تھے؟ مصنوعی روشنی کی تو وہاں ضرورت ہوتی ہے جہاں ظلمت ہو وہاں تو رشک صد آفتاب و ماہتاب جلوہ افروز تھا اس زمانے میں سرگودھا کے ایک غیر از جماعت ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب جو میڈیکل سپرنٹنڈنٹ تھے۔ سیدنا حضرت مصلح موعودؓ کو بھی غالباً دیکھنے جایا کرتے تھے۔ لیکن حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمدؓ صاحب کو تو یقیناً ان کے زیر علاج رہے اور انہیں ڈاکٹر صاحب کی زبانی مجھے ان گارے کے کچے جھونپڑوں اور ان میں رچی بسی خوشبوؤں اور ان کے نامور باسیوں کا احوال معلوم ہوا کہ ان کے کچے کوٹھوں میں ایسی صاف شفاف اور ستھری رہائش۔ ہر شے کمال قرینے سے رکھی ہوئی کہ بڑے بڑے عالی شان محلات میں رہنے والے بھی ان کچے کوٹھوں اور ان کے مکینوں پر رشک کریں۔ وہ ڈاکٹر صاحب ہمارے ایک لحاظ سے فیملی ڈاکٹر تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ جناب ڈاکٹر صاحب مکان کی خوبصورتی مکینوں سے ہوتی ہے۔ اچھے خوبصورت مکان میں عمدہ فرنیچر دھرا ہو۔ قیمتی قالین بچھے ہوں مگر کوئی راندہ بارگاہ الٰہی اس میں رہتا ہو۔ اس کے درودیوار پر نحوست ہی برس رہی ہوگی لیکن ڈاکٹر صاحب کو بھی ان کچے گھروں میں وہ برکتیں اور شگفتگی اور خوشبوؤں کی ایسی لپٹیں محسوس ہوئیں جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا مگر اس بظاہر بے سروسامانی میں بھی اعلائے کلمۃ اللہ کی دھن سوار تھی اور کام میں ذرا بھر کمزوری یا جھول پیدا نہ ہوئی سچ کہا تھا ہمارے سردار و مرشد سیدنا مصلح موعودؓ نے کہ

جن کو سمجھی تھی برا دنیا وہی تیرے ہوئے
شیر کی مانند اٹھے ہیں وہ بپھرے ہوئے
نام تیرا کر رہے ہیں ساری دنیا میں بلند
جاں ہتھیلی پر دھرے سر پر کفن باندھے ہوئے
تیرے بندے اے خدا سچ ہے کہ کچھ ایسے بھی ہیں

یہ ذکر کر رہا تھا کہ ربوہ میں جلسہ ہائے سالانہ شروع ہوئے اور ہم اپنی فیملی سمیت بلکہ لواحقین سمیت ہمیشہ ہر سال بلاناغہ شامل ہوتے رہے یوں بھی ہلال پور گاؤں سے اور یا پھر شہر سرگودھا سے جہاں ہم 1954 میں منتقل ہو چکے تھے۔ ربوہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ بہت ہی قریب تھا گو دیار محبوب کی دوری یا قربِ منزل عشاق کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی۔

اسی کیفیت میں 1983 تک کے جلسہ ہائے سالانہ آئے اور گزر گئے۔

(5) جب حاسدوں نے لاکھوں کے قریب شیدائیوں کے اجتماع اور اس کی برکات سے مستفید ہوتے دیکھا تو آتش زیر پا ہو گئے۔

اور ایک آگ بھڑک اٹھی جو تطلع علی الافئدہ بن گئی۔مطالبات پر مطالبات پھر دہرائے جانے لگے۔اور ظالم صیاد نے ان پر پرامن اور زمانے بھر کے شہد تیار کرنے والی شہد کی مکھیوں کے چھتے پر بھرپور وار کیا اور انہیں منتشر کرنے کی بھرپور اور آخری کوشش کرڈالی کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔حالانکہ وہ شفاء اللناس بنانے میں مصروف تھیں۔اور اس ضروری کام میں مصروف جو اوحی الی النحل کے آسمانی فرمان کے مطابق انہیں سونپا گیا تھا۔لیکن انہوں نے اپنے چھتے کی بربادی کا نوحہ نہ کیا، نہ ہمت ہاری اور پھر ایک اور مقام پر جمع ہوکر اپنے مفوضہ فرائض میں جُت گئیں۔اور وہاں انہیں بہتر فضائیں اور ماحول میسر آیا اور وہ بڑی بڑی مہمات سر کر کے عالی شان کامیابیاں حاصل کرنے لگیں۔حسّاد کہاں کہاں اور کس کس ملک میں اور کس کس براعظم میں ان کا تعاقب کر سکتے تھے ان برق رفتاروں کا پیچھا کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔

(6) سیدنا حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب 1984 کے اپریل کے آخری روز لندن پہنچے اسی سال جولائی کے آخری عشرے میں اپنے محبوب آقا کے نقشِ پا کی تلاش میں ہم بھی لندن پہنچ گئے۔عصر کے وقت بیت فضل میں ندائے نماز کی آواز کان میں پڑی تو چونکہ ہم اس سے کچھ عرصے سے محروم کردئے گئے تھے یوں محسوس ہوا کہ ہم نومولود ہیں اور یہ پہلی ندا کی دلکش آواز ہے جو ہمارے کانوں میں کیا پڑی کہ ساون ہماری آنکھوں میں ٹھہر گیا۔ مجھے وہ یادگار نماز عصر اور اس کے سارے نظارے یاد ہیں۔یہ بھی حسین اور شیریں یاد کیونکر بھلے کہ ہم دوسری صف میں بائیں جانب اپنے خیال میں خلوت میں چھپے بیٹھے تھے کہ حضرت صاحب نماز پڑھ کر واپس تشریف لے جانے لگے تو اس عاصی وخا کی پر نگہ محبوب پڑگئی تو حضور دوسری قطار میں خاکسار کی طرف تشریف لائے اور از راہ بندہ نوازی ہم آغوشی سے سرفراز فرمایا اور خیریت پوچھی اس ہم آغوشی سے ہمارا سینہ جو ہجر میں سلگتا ہوا اور قلب وجگر جو ہجر کی سوزشوں سے جل بھن رہے تھے ان سب کی ساری کی ساری آگیں بجھ گئیں اور اطمینان اور قرار کی دولتیں پھر سے میرے دل وجان میں لوٹ آئیں۔ ؎

اگر ہر بال ہو جائے سخن ور
تو پھر بھی شکر امکاں سے باہر

فجزاہ اللہ ورفعہ اللہ فی اعلی علیین

(7) 1984 کے اسی سفر کے دوران ایک وزیر صاحب بھی لندن گئے ہوئے تھے ہمارا ایک معروف ڈاکٹر صاحب کے گھر جو ہم دونوں کے پرانے واقف کار تھے وزیر صاحب تو ان کے گرائیں بھی تھے۔شاید کوئی عزیز داری بھی ہو،ہم اکٹھے ہوئے وزیر صاحب سے میری پرانی یاد اللہ تھی پھر سرگودھا کے وہ بھی رہنے والے تھے۔باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ مرزا صاحب نے کیونکر اس زمانے کے حاکم اعلیٰ کو......(کم نظر) کہہ کر غصہ دلایا جو ایک آرڈیننس پر منتج ہوا اور آپ لوگوں کے لئے مشکلات پیدا ہوگئیں۔وزیر صاحب کے

والد محترم اور تایا جان ایک زمانے میں احمدی کہلاتے تھے اور یہ حضرت خلیفۃ المسیح الاول ؓ کے روحانی برکات کے باعث تھا۔ میں نے کہا کہ بھائی صاحب آپ کو غلطی لگی ہے ہمارے حضرت صاحب نے تو کبھی کسی کو بھی برے نام سے نہیں پکارا خواہ جتنا بڑا دشمن ہو مگر وہ مصر رہے میں نے مزید کریدا تو کہنے لگے تم نے 1983 کے جلسہ ربوہ میں شرکت کی تھی تو اس میں جو مرزا صاحب کی نظم پڑھی گئی تو اس میں کیا کہا گیا تھا؟ مجھے حضور کی وہ مشہور نظم یاد تھی مجھے سمجھ آ گئی کہ وزیر صاحب کو اس شعر پر اعتراض ہے کہ

خون شہیدان امّت کا اے ''کم نظر''
رائیگاں کب گیا تھا کہ اب جائے گا
ہر شہادت تیرے دیکھتے دیکھتے
پھول پھل لائے گی پھول پھل جائے گی

میں نے وزیر صاحب کو بہتیرا سمجھایا کہ کم نظر سے مراد کوتاہ نگاہی یا کم بصیرتی ہے۔ اور کلام الٰہی میں جو آنکھوں پر غشاوہ پڑنے کا ذکر بھی انہی مضمون میں ہے کہ یہ لوگ بے بصیرت ہیں سچ ہے اقتدار اندھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔ بہرحال یہ تو ایک لطیفہ بھی ہے مگر اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دور کے کرسی نشین جس مٹی کے بنے ہوئے تھے ان میں عقل و دانش، عدل و انصاف اور رحم و مرّوت کے ذرّات سرے سے شامل ہی نہیں تھے۔ انہوں نے وہی کہا جو حضرت شعیب علیہ السلام کو اس دور کے دھوکہ خوردہ، مغرور اور وڈیروں نے کہا تھا کہ ''ہم تمہیں اور تمہارے پیروکاروں کو ملک سے نکال دیں گے''

(8) حضرت امام چہارم تو وطن چھوڑ گئے آپ کے جانے کے بعد جلسہ ہائے سالانہ کا تو ذکر بھی کیا بچوں کے کھیل کود کے اجتماع بھی حکماً روک دئے گئے۔ جلسہ سالانہ کے نہ ہونے سے ہم جیسے روحانی بھوکوں کو تو فاقوں پر فاقے آنے لگے ورنہ ایک دھقان کی طرح ہر ماہ دسمبر میں گویا سال بھر کے لئے غلہ جمع کر لیتے تھے ہم اس سے یکسر محروم کر دئے گئے۔ اوپر سے حکومت کی شہ پر ہم غریبوں پر یوں بھی عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا گھروں کو لوٹا اور جلایا گیا اور عبادگاہوں کی بے حرمتی کی گئی جو پسند آئی اس پر حکومت کی لاٹھی کے زور پر خود قبضہ کر لیا۔ زمین اپنی فراخی کے باوجود کچھ عرصہ کے لئے ہم پر تنگ کر دی گئی۔ ہم پہلے مختلف مراکز میں چھوٹے سکیل پر جلسہ کر کے اپنی تنگ دامانی اور فاقہ مستی کا مداوا کرتے رہے۔

بالآخر قادر کریم کو ہم پر ہماری نارسائی اور بے نوائی پر ترس آیا اور حضرت صاحب جو خود ہماری تکالیف اور مصائب سن سن کر مجسم مناجات بن چکے تھے کی دعاؤں کو سنا اور MTA کی شکل میں ایک متاع بے بہا ایسی عطا فرمائی جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ جس کے ذریعہ ہر ڈیرہ پر اور ہر گاؤں اور ہر شہر اور ہر ملک اور ہر براعظم میں دنیا کے کناروں تک ہمارے مطاع و مرشدی دل نشین آواز

اور وہ بھی دلربا شخصیت کے ساتھ دن میں کئی کئی بار نظر آنے لگی اور اس طرح ہجر کے تاروں اور سوختہ دلوں کو قرار آ گیا۔ اس کا جتنا شکر کریں کم ہے۔

حسد کی آگ سے کس کس کا گھر جلاؤ گے
کہ اہل عشق تو سارے جہاں میں رہتے ہیں

میں نے شروع میں ذکر کیا تھا کہ سیاحت کا شوق بچپن سے ہی تھا پہلے بڑی مشکل سے قادیان کا ویزا یہاں سے ملتا تھا تو ایک دفعہ امرتسر سے اللہ عزیز وقدیر نے سامان ویزے کا مہیا فرما دیا۔ دوسری دفعہ میں دہلی گیا۔ تو وہاں جو افسر ویزہ دینے پر مامور تھا جب اس نے میرا سنا کہ سرگودھا سے وکیل آیا ہے تو اس نے کہا ویزہ قادیان کا بہت مشکل ہے مگر میرے وطن سے آئے ہو۔ کم از کم کتنے وقت کا قادیان کا ویزا دوں میں نے کہا 2 گھنٹے کا ہی دے دیں۔ تو اس نے مہربانی سے تین دن کا ویزا دے دیا۔ پھر 1965 کی جنگ کے بعد انڈیا آنا جانا بھی تقریباً بند ہو گیا۔ تو میری صحرانوردی کے شوق نے ایک اور راہ نکالی۔ سفر قریب کا ملک بھی غیر اور اس ملک کے ساتھ میری دلی وابستگی بھی دیرینہ۔ یہ تھا ملک افغانستان۔ میں نے وہاں جانا شروع کیا تو 7 / 8 بار گیا اور ایک مہینے میں دو بار بھی گیا۔ سفر بھی سہل تھا پشاور تک کار میں اور آگے فضائی سفر پونے گھنٹے۔ اس سفر نے بھی مجھے بہت کچھ سکھایا۔ ایئر پورٹ پر اترتے ہی 1901 میں حضرت مولوی عبدالرحمان صاحبؓ اور 1903 میں حضرت شاہزادہ سید عبداللطیف صاحبؓ۔ اور پھر 1924 کے جاں نثاروں نے گویا مجھے اس سرزمین پر خوش آمدید کہا۔ چرخی پل کے قریب بدنام زمانہ جیل اور وہ میدان جواب خالی نہیں تھا جہاں پر حضرت سید صاحب کو سنگسار کیا گیا۔ وہاں پر میرے پاس کیا تھا۔ جو ان پاک روحوں کے قدموں میں نچھاور کرتا ہاں! آنکھ کے پانی نے وہاں بھی ساتھ دیا الحمدللہ۔ ایک صاحب نے مجھے فون کیا کہ میرا نام فلاں ہے غالباً حبیب اللہ خان اور کہ حضرت مولوی عبدالحلیمؓ کا پوتا ہوں اور ''پشتنی تجارتی بانک'' میں ڈائریکٹر ہوں آج سرکاری ڈیوٹی پر بیرون ملک جا رہا ہوں ورنہ آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ اور کہ جب وہ کراچی سرکاری دورہ پر گئے تھے تو وہ حضرت خلیفہ ثالثؒ کی زیارت اور ملاقات کی غرض سے ربوہ بھی گئے تھے۔ افسوس کہ دونوں طرف حسرت ہی رہی، ملاقات نہ ہو سکی۔ ان سفروں میں عشاق الٰہی کی جانیں قربان کرنے والوں کی شیریں یادیں آئیں اور آتی ہی رہیں اور یہ اس ملک کے سفروں میں قیمتی متاع تھی جو کہ میرے ہاتھ لگی۔ الحمدللہ

وہ زمانہ ظاہر شاہ بادشاہ کا تھا اس سے تخت چھینا گیا اور کچھ ملک میں افراتفری شروع ہوگئی پھر ہم نے بھی جانا چھوڑ دیا اور پھر 1975 میں دیار مغرب کا رخ کیا۔ ان دنوں ایک پارک میں جلسہ سالانہ برطانیہ ہوا کرتا تھا۔ جس کے روح رواں حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحبؓ ہوا کرتے تھے۔ ان کی تقاریر سنیں ریکارڈ کیں اور جلسہ ہائے UK میں کئی بار شامل ہوا۔ کیونکہ کچھ سالوں

کے ناغہ کے ساتھ قریباً ہر سال ہی لندن چلا جاتا تھا وہاں برادر عزیز ودود احمد صاحب جو میرے بزرگ بھائی حافظ مسعود احمد کے برادر اصغر ہیں، رہتے تھے ان کا گھر اپنا گھر تھا اور وہی ہمارے سکہ بند میزبان تھے۔ ان کی بلکہ سارے خاندان کی بے تکلف اور بے ریا محبت اور وفا نے ہمارے دل کو موہ لیا اور میرے پیارے بھائی ڈاکٹر حافظ صاحب تو ہم سے ہاتھ چھڑا گئے۔ اللہ تعالیٰ عزیز بھائی ودود احمد صاحب اور اب تو میرا پیارا منصور احمد (ڈونا) بھی بمعہ اہل وعیال وہیں لندن میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہے ان سب کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں اور برکتوں سے ہمیشہ نوازتا رہے۔ یہ حضرت بھائی محمود احمد صاحب رفیق مسیح موعود علیہ السلام کے مبارک اور ثمر آور درخت کی پھل دار شاخیں ہیں یہ سارا خاندان ہی ایک سے ایک بڑھ کر وفا ومحبت کا پتلا ہے۔ میرے لئے حضرت آپا آمنہ اور انکے میاں حضرت مولانا نذیر احمد صاحب مبشر مجسم دعا تھے اور حافظ بھائی تو ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ تہجد کی نماز میں تمہارا بہت اونچا نام لکھا ہوا ہے۔ یہ تینوں اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو چکے ہیں اور میں حضرت مصلح موعود کا مقدس شعر گنگناتا رہتا ہوں۔

مرا رب سکون میرے واسطے زاری کے
درگہ ربّی میں میرا جائے کون

اللہ قادر وکریم میرے ان محسنوں کو بیش از بیش نعما روحانی سے نوازتا رہے اور اعلیٰ علیین میں ان کا مقام ہو اور جوان کے اور میرے عزیز زندہ سلامت ہیں انہیں میری طرف سے جزائے خیر دے کہ میں کب طاقت رکھتا ہوں کہ کسی کے احسانوں کا بدلہ دے سکوں۔

جلسہ ہائے سالانہ 2006 سے 2009 تک (اور میری عدم شمولیت کا دُکھ)

اب لندن میں میری بڑی بہن کی بیٹی عزیزہ سلیم اختر اور اکلوتا بیٹا عزیزم بشارت احمد چوہدری سکونت پذیر ہیں۔ سال شروع ہوا تو ان کی طرف سے بار بار تقاضے کہ ماموں جان ضرور آنا بلکہ میری بھانجی عزیزہ نصرت جو ناروے میں مقیم ہے اس کا بھی پر زور اصرار کہ ہم نے بھی جلسہ پر لندن کا پروگرام بنایا ہے آپ بھی آئیں مگر عمر کی کہنگی اور دل کی ناگفتگی دیگر دونوں کے ساتھ تو ہمارا سمند عزم بھی رک گیا اور ہم نے بالآخر ارادہ ملتوی کر دیا۔ ان دنوں جو امنگیں اور آرزوئیں پیدا ہوا کرتی تھیں۔ پھر ان کی تکمیل کے مزے اڑاتے تھے۔ اور جلسہ سالانہ میں شمولیت کے ساتھ حضرت مسیح پاک کی دعاؤں سے محرومی کا خیال آتا تو دل بیٹھنے لگتا۔ پھر MTA کے ذریعہ شمولیت سے ہی اپنی مجبوریوں اور کمزوریوں کے باعث دل کو بہلاتے رہے۔ لیکن ساری اس سفر کے خوشیوں اور تمناؤں کا Climax تو حضرت صاحب سے دست بوسی اور اگر قسمت یاوری کرے تو ہم آغوشی نصیب ہوتی ہے تو ہم بھی ہمدوش ثریا اپنے آپ کو سمجھتے۔

یہ سارے آبگینے ٹوٹ گئے تو بے اختیار حضرت مصلح موعودؓ کے ان شعروں سے اپنے دل سے تعزیت کر لی۔

دل مایوس سینہ میں اندھیرا چاروں جانب میں
میرے دلدار ہم پر بند ہیں سب وصل کی راہیں
سوا اس کے کہ اب خود آپ ہی کچھ لطف فرمائیں
ورنہ یہاں تو نظر آئیں تمناؤں کی چاروں سمت میں قبریں

اب کے سارا انحصار MTA پر ہی تھا مگر ان دنوں بجلی کی آنکھ مچولی کا ہر دم خطرہ رہتا مگر الحمدللہ جلسہ کے دنوں میں بجلی اور محکمہ بجلی والوں نے بھی وفا کی اور قادر کریم نے ہی انہیں ہدایت دی کہ یہ آخری ہتھیار ہم سے ان دنوں میں نہ چھینا۔

یوں بھی میرا پرانا تجربہ ذاتی تو یہ رہا ہے کہ جب بھی خلیفۃ المسیح الرابعؒ کو اور اب انی معک یامسرور کے مصداق حضرت صاحب سے ملاقات کر کے باہر آتا تو اپنے بعض عزیزوں سے بھی اظہار کیا کہ اس معاملہ میں MTA بھی ڈنڈی مار جاتا ہے وہ نور کہاں دکھا سکتا ہے جو ہم اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھ کر آئے ہیں۔

یار نال ہو گئی ملاقات میری
ملاقات ایہہ پر کامیاب نہ رہی
میں آ گیا حسن دے رعب تھلے
مونہوں عرض کجھ کرن دی تاب نہ رہی

اب میرے جیسا بندہ جس میں نہ کوئی ہنر ہے نہ کمال۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ بھی میرے گھر پر تشریف لائے اسی طرح حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحبؒ تو دوبار اس غریب خانے پر تشریف لائے۔ خواتین مبارکہ میں سے حضرت سیّدہ مہر آپا صاحبہ، حضرت سیدہ باجی امتہ الرشید بیگم صاحبہ اور ان کے ساتھ دیگر خواتین مبارکہ بھی تشریف لائیں۔

وہ مہ رخ آ گئے خود پاس میرے
لگائے چاند مجھ کو بے بسی نے

ایک دفعہ میں نے جرات کر کے حضرت امّی جان (حضرت سیدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہؓ نے مجھے بیٹا بنا لیا تھا زہے قسمت مدظلھا) کو بھی میں نے گذارش کر دی کہ میرے اس ظلمت کدے پر تشریف لاویں تو یہ بھی بقعہ نور بن جائے۔ آپ نے وعدہ فرمالیا مگر پھر بیماری اور نقاہٹ نے انہیں مہلت نہ دی۔ مگر میں کہتا پھرتا تھا کہ

آنے کو وہ تیار تھے میں خود ہی کچھ شرما گیا
ان کو بٹھاوں میں کہاں دل میں صفائی تک نہیں

پھر آخر میں بلا اطلاع اور بغیر پیشگی پروگرام سیدنا وامامنا ومحبوبنا حضرت صاحبزادہ مرزا مسرور احمد صاحب بمعہ بیگم صاحبہ کے، جب میں نے دل کی رفوگیری کروائی تو میری حالت صحت دریافت کرنے آگئے۔تب میں نے جانا کہ میری بیماری بھی بڑی پرحکمت اور برکتوں والی تھی۔حضرت مسیح پاکؑ کی اولاد میرے عزیز از جان حضرت مرزا منصور احمد صاحبؓ کا لخت جگر اور''بادشاہ آیا'' کے مصداق حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد صاحبؓ کا پوتا اور سید ومرشد حضرت مصلح موعودؓ کا نواسہ اس پرتقصیر کی بیمار پرسی کے لئے تشریف لائے تو مولانا حسرت موہانی کا شعر میرے لبوں پر کھیلنے لگا کہ

صحتیں لاکھوں میری بیماری غم پر نثار
جس میں اٹھائے بار ہا ان کی عیادت کے مزے

حضرت صاحب کی خدمت میں مودبانہ گزارش ذاتی

اے میرے مشفق ومہربان آقا ہرگز اس قابل نہیں تھا کہ اس وقت کے ناظر اعلیٰ جو چند ماہ بعد ہی مسند خلافت حقّہ پر متمکن ہونے والے تھے اس نابکار کے گھر بیمار پرسی کے لئے تشریف لاتے میرے آقا اگر جسم وجان آپ کی اس نوازش پر قربان کردوں تو پھر بھی آپ کی تشریف آوری اور حضرت سیدہ بیگم صاحبہ کے میرے گھر میں قدم رنجہ فرمانے کا حق شکریہ ادا نہیں ہوسکتا۔آقا اسے قریباً 7 سال کا عرصہ گزر گیا ہر روز یہ احسان تازہ ہے اور بلا ناغہ ہر روز آپ کے لئے مہمات دینیہ میں شاندار کامیابیوں کے لئے غریبانہ مناجات کرتا ہوں اور حضور کے دونوں بلکہ تینوں مقدس پیش روؤں کے احسانات بھی تازہ بہ تازہ ہیں ان کے درجات کی بلندی کے لئے پرنم آنکھوں سے دعائیں کرتا ہوں۔میرے پیارے آقا حضور کے احسانات اس عاجز پر پے در پے موسلا دھار بارش کی طرح ہورہے ہیں آپ کو یہ اعلیٰ صفات، بندہ پروری، غلام نوازی اور پردہ پوشی کی آپ کے آباءواجداد سے ورثے میں ملی ہیں۔آپ کس عالی مقام باپ کے بیٹے اور کس بادشاہ لقب دادے کے پوتے اور''نور آتا ہے نور''،مصلح موعودؓ کے نواسے اور حضرت مسیح پاکؑ کے ساتھ **انی معک یامسرور** کے آپ مصداق ہیں

میرے محسن آقا آپ کو یہی زیب دیتا ہے کہ احسان پر احسان ہم غریبوں پر کرتے جائیں۔بادشاہوں نے کب کہ، بھیک منگوں کے کشکول کو دیکھا کہ اس میں کیا ہے آقا میں تو خالی ہاتھ پر اتنا ضرور ہے۔ ؎

اپنے آقا کی طرف ہی دیکھنا

ہم غلاموں کا یہی دستور ہے
ہم وفا دار امام وقت ہیں
چار پشتوں سے یہی منشور ہے

میرے آقا دعا کریں کہ حضور کے اس ناچیز غلام کی جلسہ سالانہ میں عدم شمولیت کے باوجود حضرت مسیح پاک کی جلسہ میں شامل ہونے والوں کے لئے دعاؤں سے حصہ ملے۔ دل میں بہت کچھ بھرا ہے مگر نوک قلم پر نہیں آ رہا۔ ویسے بھی

بے زبانی ترجمان شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیش یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں
مسیح موعود کا راج دلارا ایک درویش شہزادہ
آہ حضرت صاحبزادہ مرزا وسیم احمد بھی چل بسے
وہ جو تیرا عاشق زیر تھا
تہِ خاک اس کو دبا دیا

افسوس کہ لاکھوں کے محبوب اور مطلوب حضرت صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب کو اجل کے ہاتھوں نے اچک لیا اور وہ دار فانی سے دارِ بقا کی طرف کوچ کر گئے ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

یہ چل چلاؤ کی ریت اسی وقت سے جب پہلا ذی روح اس دھرتی پر آیا تھا تو علیم وخبیر خدا نے اس کے آنے کے ساتھ ہی جانے کا بھی ازلی ابدی قانون وضع فرما دیا تھا۔ وقت کے پیغمبر خدا کو بھی اور اپنے وقت کے سکندر کو بھی، کسی کو بھی اس سے مفر نہیں۔ عالم پناہ اور تاجدار بھی رخصت ہوئے اور ستم زدگان روزگار بھی چلے گئے اس گھاٹی کو عبور کرنا ہر ایک کے لئے ضروری ٹھہرا۔ لیکن ہر شخص کی موت موت میں بڑا فرق اور امتیاز ہے۔ ایک شخص بچھڑ جاتا ہے تو پسماندگان اس کی حسین یادوں کو عمر بھر نہیں بھولتے اور وہ سوگوار کر جاتا ہے لیکن ادھر اللہ کے حضور اس کے حاضر ہونے پر ملائکۃ اللہ شادمانیوں کے جشن مناتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جو شخص ہمیں ہمیشہ ہمیش کے لئے چھوڑ گیا اس کی یادیں ہمیں کبھی نہیں چھوڑتیں۔ آخر یہ کیا ماجرہ ہے؟

دل مضطر کو سمجھایا بہت ہے
مگر وہ شخص یاد آیا بہت ہے

جناب صاحبزادہ صاحب کی وفات ایک زندہ دل پاک نفس اور ایک وضع دار اور اتقا کے نہایت عمدہ نمونے کی وفات تھی وہ سب کو

محبت دینے والے ہنس مکھ انسان تھے۔ جب سامنے آتے تو خلوص اور مہر وفا کا ایک عطر فشاں جھونکا دل میں اتر جاتا تھا۔

بہت دن ہو گئے کہ ہمارا بہت ہی پیارا اور محبوب صاحبزادہ ہم سے بچھڑ گیا اس کے چلے جانے سے دردوالم کی ایسی کیفیت دل ودماغ پر طاری رہی کہ باوجود خواہش اور کوشش کے آپ کے بارہ میں کچھ بھی نہیں لکھ سکا۔ پہلے بھی شاید کہیں اظہار کر چکا ہوں کہ یہ ایک بے چارگی اور بے بسی کا عالم ہوتا ہے کہ اپنے پیاروں کی وفات پر ان کا ذکر خیر سپرد قلم وقرطاس کرنا میرے لئے ایک دردوکرب کے دریا کی طوفانی لہروں سے نبرد آزما ہونے کے برابر ہے۔ ایسے میں میرا قلم اپاہج کی طرح چلنے سے معذور اور ذہن ودماغ کی قوتیں مسلوب ہو کر بالکل جواب دے جاتی ہیں۔ اب کے بھی یہی ہوا کہ بہت ہی پیارے صاحبزادہ صاحب کے ہجر وفراق کا غم اور پھر کبھی انہیں دنیا میں نہ ملنے کا دکھ بڑھ گیا۔ اور اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے وہی من موہنی صورت آنکھوں کے سامنے رہتی اور لکھنے اور لکھانے کا ہوش ہی نہ رہا۔ ممکن ہے کہ یہ میری کیفیت مجھ سے بھی خاص ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اور اس کا غالب امکان بھی ہے کہ میری معمّر اور بوڑھی صلاحیتوں کے باعث میری یہ معذوری ہو جو بھی اس کا موجب یا باعث ہے میں بالکل معطل ہو کر رہ گیا ہوں اور کئی دن اس بیخ وبن میں گزر گئے پھر قدیر وعزیز رب سے عاجزی سے توفیق مانگی اس کے آگے ہاتھ جوڑے، آنسو بہائے کہ خدایا راج دلارے کا کچھ ذکر کرنا چاہتا ہوں جو میرے موجودہ قلب حزیں کے بہت قریں تھا یہ تو سخت ناشکری اور ناسپاسی ہوگی اگر حضرت ممدوح کا کچھ بھی ذکر خیر نہ کر سکوں جس نے ہمیں ساری عمر اپنی بے لوث محبتوں، وفاؤں اور ان سے بڑھ کر اپنی دعائے مستجاب سے نوازا۔ کب تک آج سے کل اور کل سے پرسوں پر ملتوی کرتا رہوں گا انسان ضعیف البنیان کی اپنی حالت اور خصوصاً میری حالت تو صحیح طور پر اس شعر میں بیان ہوئی ہے کہ

صبح تک شاید نہ میں ہوں اور نہ یہ ساز حیات
ڈوبتے جاتے ہیں تارے بیٹھتا جاتا ہے دل

(2) گو میں حضرت صاحبزادہ صاحب مغفور کو قادیان کے زمانہ طالب علمی میں ہی جانتا پہچانتا تو تھا مگر یوں اپنے آپ کو متعارف کرانے کی ہمت وجرات نہ ہوئی۔ یہ احساس کمتری مجھ پر غالب رہا کہ صاحبزادگان کے علّو مرتبت اور عالی نسبی کا خیال تو کرو یہ میرے سردار اور مرشد حضرت مصلح موعودؓ کے صاحبزادگان اور حضرت اقدس مسیح الزماں کے پوتے ہیں۔ تم اپنی قدر اور اوقات پہچانو تمہاری کیا حیثیت ہے ایاز قدر خود بشناخت۔ پھر ایک وقت آیا کہ جب حضرت صاحبزادہ صاحب نے بغیر میرے کسی قسم کے استحقاق کے خود ہی اپنی محبتوں اور شفقتوں کا رخ اس عاجز کی طرف کر دیا اور وقت گزرنے کے ساتھ اس میں پھر ایسی تیزی آئی کہ جس نے میری ہچکچاہٹوں اور میری مرعوبیت کی ساری دیواروں کو مسمار کر دیا اور مجھے اپنے قریب آنے کا حوصلہ عطا فرما دیا اور میں نے محسوس کیا کہ حضرت مہدی

دوراں کی تیسری نسل کے نوخیز اور نونہال یوں جگمگا رہے ہیں جیسے تاروں کے جھرمٹ میں چاند روشن ہوتا ہے ان میں سے مجھے زیادہ متاثر کرنے والی شخصیتیں تو اب اپنے آسمانی آقا کے حضور حاضر ہو چکی ہیں۔ جن میں سیدنا حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحبؒ، حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب جن کے ساتھ اول الذکر سیدی کی وجہ سے قادیان میں قیام کے زمانے میں کھل کر تعارف ہو گیا تھا۔ حضرت صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب، حضرت صاحبزادہ مرزا منور احمد صاحب اور حضرت صاحبزادہ مرزا مظفر احمد صاحب اور اب چند سال قبل سیدنا حضرت مرزا طاہر احمد صاحبؒ اور پھر چند ماہ قبل حضرت صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب گویا ہم سے روٹھ گئے۔ یہ سب صاحبزادگان اپنے مقاصد عالیہ سے اور نصب العین کے ساتھ غیر مشروط وفاداری اور استواری کا ثبوت دے گئے۔ یہ سب حضرت مصلح موعودؓ کی پر حکمت تربیت اور سیدہ حضرت اماں جانؓ کی مبارک گود کا زمانے بھر سے جدا اور انوکھا مہدوی شرف تھا جس نے گویا انہیں کندن بنا دیا تھا۔ فوت شدہ صاحبزادگان کا پہلے ذکر چکا ہوں آج حضرت صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب میرے موضوع سخن ہیں جنہیں ایک امتیاز خاص اور اعزاز اس مقدس نگری کی دربانی اور ''الدار'' کی حفاظت کا ان کے مقدس ابّا جان نے سونپا تھا اور اس میں کیا شک ہے کہ سیدی و مرشدی حضرت مصلح موعودؓ کو ایک خاص وصف آسمانی آقا نے یہ عطا فرمایا تھا کہ ہر مقام اور مرتبہ کے لئے صحیح انسان کی شناخت اور اس کو اس کی صلاحیتوں کے مطابق ذمہ داری سونپنے کا تھا۔ اور نگری وہ جس کی بابت یہ نوید نازل ہوئی تھی کہ **انی احافظ کل من فی الدار**۔ اس وسیع حوصلے والے صاحبزادے نے جس بے جگری، دلیری اور کمال حکمت و دانائی اور خداداد فراست سے حفاظت مرکز احمدیت کے فرائض سرانجام دیئے وہ تاریخ کا زریں ابواب ہیں اور ہر راقم تاریخ سنہری الفاظ سے ہی انہیں رقم کرے گا۔ جسے جو بھی پڑھے گا عقیدتمندی اور خلوص کے ساتھ حضرت صاحبزادہ صاحب کو ہدیہ عقیدت و تبریک پیش کرے گا۔ حضرت ممدوح جس بلند حوصلگی کے ساتھ خاندانی وقار اور عظمت اور دعاہائے مستجاب، روحانی تمکنت اور حکمت بالغہ کو شامل کر کے رنگ و نور کے ایسے مناظر دکھائے کہ سبھی حضرت مصلح موعودؓ کے اعلیٰ انتخابی نگہ پر قربان ہونے لگے۔

(3) کیا حال ہے قادیان کا اور قادیان والوں میں رہنے والوں کا۔ یہ معلوم کرنے اور مقدس مقامات پر دعائیں کرنے کی غرض سے ویزا بھارتی ہائی کمیشن سے مانگا تو انہوں نے قادیان کے سوا اور سارے شہروں کا ویزا دے دیا۔ مگر اس افتاد نے بھی میری ہمت کو شکست دینے کی بجائے گویا مہمیز کا کام کیا اور میں قادیان کی نیت سے پھر بھی عازم بھارت ہوا۔ پہلا پڑاؤ میرا امرتسر تھا وہاں سے ایک صاحب دل افسر نے مجھے تین دن کا ویزا دارالامان کا دینے کی حامی بھری اور ایک گھنٹے کے اندر ہی قادیان میں تین یوم قیام کا اجازت نامہ میرے ہاتھ میں جونہی آیا میں سیدھا بٹالہ اور وہاں سے گاڑی کے ذریعہ قادیان شریف پہنچا۔ یہ 1961 کی بات ہے۔ دور سے منارۃ المسیح کی بلندیوں نے میرے جذبات میں گویا تلاطم پیدا کر دیا۔ کیونکہ 1947 میں کالج میں موسم گرما کی تعطیلات ہوتے ہی اپنے گاؤں

چلا آیا تھا جہاں میرے معمر والدین بے تابی سے میرا انتظار کر رہے تھے مگر اس وقت کیا معلوم تھا کہ پھر آنے والے ستمبر کیا 14 سال کا طویل عرصہ اس مقدس بستی کے گلی کوچوں سے یکسر محروم رہنا پڑے گا۔ جس کی خاک نے مسیحا کے قدم چومے تھے اور جہاں پر خود مسیح ومہدی اور آپ کے رفقا محو استراحت ہیں اور جہاں پر دیگر مقامات مقدسہ میں گویا ہماری جان تھی اور ملکی قوانین نے ہمیں بزور ان کی زیارت کرنے اور ان میں دعائیں کرنے اور اپنے رب سے معافی مانگنے سے روک لیا تھا۔

یہ محض تائید ونصرت ربّی سے ہی ممکن ہوا جو گویا میرے ہمرکاب تھی ورنہ قدغن بہت سخت تھی۔ وہاں ان دنوں حالات دگرگوں تھے درویشاں کرام گویا بتیس دانتوں میں زبان کی طرح تھے۔ مگر اللہ کی مدد اور نصرت کے شامل حال ہونے اور اس پر کامل توکل توان کی پیشانیوں سے عیاں تھا۔ حضرت صاحبزادہ صاحب کوان کی تعلیم وتربیت کا فکر تھا۔ مقامی متعصب ہندوؤں اور سکھوں سے بھی امن وآشتی کے ساتھ نبرد آزما تھے پھر انجمن کی جائیدادوں کی واپسی کے لئے صوبائی اور وفاقی حکومتوں سے مسلسل رابطے کی کوشش اور پھر عدالتی کاروائیوں کی طویل جنگ غرض یہ کہ اس وقت امیر مقامی کے دست وبازو بن کر حضرت صاحبزادہ چومکھی لڑائی لڑ رہے تھے۔ ہم جیسا تھوڑے دل والا کوئی ہوتا تو ایسے گھمبیر حالات میں جان کی بازی ہار جاتا مگر وہ بڑے جگرے والا جی دار شخص تھا بہادری اور شجاعت تو اسے مقدس باپ دادا سے ورثے میں عطا ہوئی تھی۔ وہ کس اولوالعزم باپ کا بیٹا اور کسی مقدس دادا کا پوتا تھا۔ خصوصاً دادا وہ جورات سرہانے پر سر رکھتا تو اس کا مالک اسے تسلی دلاتا کہ میں تیرے ساتھ ہوں تجھے دنیا والے جو کہتے ہیں کہتے رہیں میں تیری حفاظت کروں گا۔ پھر اسے کسی کے تعصّب کا یا عداوت کا یا دھمکیوں سے کیا خوف ہوسکتا تھا۔ تبھی تو اس نے کہا تھا اور سچ کہا تھا کہ ؎

سخت جان ہیں ہم کسی کے بغض کی پرواہ نہیں
دل قوی رکھتے ہیں ہمدردوں کی ہے ہم کو سہار

قوی دل رکھنے والے اپنے جد امجد کا یہ حقیقی وارث تھا اور اس کا دل بھی قوی تھا زمانے بھر کی یورشوں اور معاندانہ سے نہ ڈرا اور نہ خوف کھایا۔ دل مطمئن چہرے پر ہمیشہ دلنواز مسکراہٹ اور روحانیت میں گوندھی ہوئی بشاشت ہر وقت کھیلتی رہتی تھی۔ جس میں دشمنوں کے دل کو موہ لینے اور جیت لینے کی قوت موجود ہوتی تھی یہ جذب وکششِ روحانی کی ایک خاص کیفیت ہوتی ہے جو اہل اللہ کو خاص طور پر عطا ہوتی ہے۔

(4) پھر 1964 میں بھارتی ویزے کے ساتھ دہلی جانکلا اور پھر وہاں ایک افسر نے جس کو میں نے اپنا تعارف کرایا تو اس نے کہا کہ تقسیم ملک سے قبل میں ملتان میں مجسٹریٹ تعینات تھا سرگودھا کے وکیل کو اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے بھی تھوڑے وقت کا ویزہ دیتا ہوں۔ اور یہ بھی تین دن کا تھا۔ میں اسی روز بھاگم بھاگ قادیان کے لئے روانہ ہوا۔ اب کے دونوں ممالک میں رقابت اور آویزش

میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اور باہم بداعتمادی کی فضا تھی۔ مجھے قادیان کے درویشان کرام نے بتایا کہ اکیلے تمہارا سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے تاہم مالک الملک نے مجھے بخیریت قادیان پہنچایا اور پھر واپس پاکستان فالحمدللہ

قادیان کے دریشوں کو ان گھٹن اور سخت خطرناک ایام میں بھی مطمئن اور ہشاش بشاش ہی دیکھا۔ کوئی ظاہری طاقت تو ان کے پاس نہیں تھی مگر قدیر وعزیز کی غیبی طاقتوں پر انہیں مکمل بھروسہ تھا۔ الٰہی بشارتوں پر ایمان کے ساتھ ساتھ مرکز احمدیت پاکستان میں سیدنا حضرت مصلح موعودؓ اور دیگر بزرگان علی الخصوص نبیوں کے چاند کی دعائیں بھی انہیں پہنچ رہی تھیں۔ قرآن کریم کی یہ بشارت تو ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتی تھی کہ جو ربنا اللہ کہتے ہیں اور پھر استقامت اختیار کرتے ہیں۔ انہیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی حزن اور یہ بشارت انہیں ملائکۃ اللہ خود دیتے ہیں۔

ان اللہ کے بندوں کے ماتھے کا جھومر خود فرزند مسیح تھا۔ جو بقول حضرت ثاقب زیروی انگاروں کو بھی گلزار بنا کر کھیلتے ہیں اور جب کوئی زخم انہیں لگے تو انکے چہروں پر افسردگی یا مایوسی نہیں نظر آتی بلکہ پھولوں کا تبسم ان کے چہروں پر لہرانے لگتا ہے۔ الغرض جو طمانیت اور سکینت ان قادیان کے باسیوں کے چہروں پر دیکھی وہ دیکھنے کی ہی شے ہے نہ قلم میں بیان کرنے کی طاقت نہ زبان میں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فضل کیا کہ قادیان اور بیرونجات کی قیمتی جائیدادیں بھی انہیں لوٹا دی گئیں۔ جس سے ان کی مالی حالت بہتر ہوگئی ورنہ پہلے تو ان کا اس آسمانی ''نان'' پر ہی گزارا تھا۔ جو انکے پیشوا اور خود ان کے لئے نازل ہوا تھا اور وہ اس پر خوش بھی تھے اور وہ ان کے لئے بہت بھی تھا۔ 1965 میں جنگ چھڑ گئی اور دونوں ممالک برسر پیکار ہو گئے۔ مگر انی حافظ کل من فی الدار کے جلوے وہ ہر روز دیکھتے تھے حضرت مسیح موعودؑ کا ایک نام ابراہیم بھی ہے تو ہر قسم کی آگ حضور کے لئے اور حضور کے عقیدت مندوں کے لئے بردًا و سلامًا ہو گئی۔ اور حضرت صاحبزادہ صاحب تو درویش بھی تھے۔ اور نبیرہ حضرت مسیح موعود بھی تھے۔ اور یہ دوسرا اشرف آسمانی ایسا تھا جس کا ماپ اور تول ناممکن ہے اور طول وعرض کی پیمائش لاحاصل۔

(5) مجھے الفضل کی تنگ دامانی کا بھی خوف رہتا ہے۔ اس لئے قلم کو روک کر رکھتا ہوں گو حضرت مرزا عبدالحق صاحب کے بارہ میں میرے مضمون پر میرے محسن آقا ومطاع ایدہ اللہ تعالیٰ نے لکھا تھا کہ لگتا ہے تمہیں الفضل کے صفحات کا زیادہ خیال رہتا ہے (مفہوم) جس سے مجھے زیادہ لکھنے کی مہمیز بھی ملی۔

بہرحال میں الفضل کے خوف ہراس سے بچ بچا کر سال 1989 کی ایک یادگار آدھی رات کا ذکر کرتا ہوں جو طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود اب تک میری سہو ونسیان کے باوصف اس طرح میرے قلب وذہن میں تازہ ہے گویا آج کی ہی یہ بندہ پروری ہے۔

بہت عرصہ ملکی حالات کے پیش نظر قادیان نہ جا سکا 1989 میں خوش قسمتی سے ویزا مل گیا اور پھر اس بستی کی زیارت اور مقامات

مقدسہ پر دعائیں کرنے کی آرزوئیں پوری ہونے کی امید لگی جو زمین سے زیادہ میرے دل حزیں میں آباد رہتی ہے اور خواہش یہی ہے کہ ہمیشہ یہ اسی جگہ بستی رہے لاہور سے اٹاری سمجھوتہ ٹرین پر اور وہاں سے بسوں کے قافلہ کو آدھی رات کے قریب قادیان کے قریب پہنچا تو نہ پوچھیں مینارۃ المسیح کی روشنیاں دیکھ کر دل کی کیا حالت ہوئی اب تک کی غیر حاضری کے قلق اور آج کی حاضری کی خوشی میں آنسوؤں کی جھڑی لگی اور پرانا زمانہ قادیان میں رہنے کا یاد آیا اور نہ جانے کیا کیا یاد آیا۔

اس بستی کے ساتھ ہر ایک کی جذباتی وابستگی ہے اسی طرح میری بھی دل بستگی ہے رات ڈھلے ایک کمرہ ایک درسگاہ کی دوسری منزل پر ہمیں ملا۔ ہم تین ساتھی تھے میں نیچے اترا کہ اس بازار کا نظارہ تو کروں جس میں شاید مجھے حضرت سید محمد سرور شاہ صاحبؓ لمبا چغہ پہنے اور ہاتھ میں چھڑی لئے بیت مبارک کی طرف آتے نظر آئیں یوں تو یہ مشکل تھا مگر چشم تصور سے یہ سب گزرے ہوئے زمانے کے نظارے دیکھ لئے۔ حضرت مولانا شیر علی صاحبؓ کو ''بیت مبارک'' آتے اور جاتے دیکھا یہ ایک مستقل سفر تھا جو آپ کیا کرتے تھے اور یہ ہی آپ کی دائمی منزل تھی الغرض میں ان نظاروں میں کھو گیا ذرا آگے بڑھا تو حضرت صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب کو دیکھا کہ بغلوں میں ہاتھ ڈالے ننگے فٹ پاتھ پر بیٹھے تھے اور دریافت فرما رہے تھے کہ مہمانوں کو کھانا مل گیا ہے اور پھر ساتھ ہی ہندو سکھ ڈرائیوروں اور کلینروں کا بھی فکر اور ہاں وہاں ایک بار خود حضرت مصلح موعودؓ کو اکیلے بغیر کسی پہرے دار کے جاتے بھی دیکھا تھا اور حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمدؓ صاحب اور حضرت ''بادشاہ'' لقب شبیہ مبارک اپنے مقدس والد کی ہو بہو حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمدؓ صاحب کو تصوراتی آنکھوں سے دیکھا اور اس جگہ کی نشان دہی بھی قادیان میں قیام کے زمانے میں بزرگوں سے کروائی ہوئی تھی جہاں پر ایک مفسد دشمنِ حقیقت نے حضرت موصوف ''شاہ'' پر لاٹھیوں سے حملہ کیا اور حسن رہتاسی نے اس پر ایک نظم لکھی تھی جس کا یہ شعر نہ بھولا ہے نہ بھولے گا انشاءاللہ

او لاٹھی والے مت اترا
ہاں ڈر جا اس کی لاٹھی سے
وہ لاٹھی ایسی لاٹھی ہے
جس لاٹھی میں آواز نہیں

اور پھر حضرت صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب کو سردی کے ہاتھوں مجبور ہو کر بغلوں میں ہاتھ دبائے جو دیکھا تو قریباً ایک صدی پرانا آپ کے مقدس دادا جان کا واقعہ یاد آ گیا۔ مہمان نوازی کیسے کرنا چاہیئے اس کے باریک معانی اور مفاہم حضرت اقدس کے اس واقعہ سے صحیح طور پر معلوم ہوتے ہیں۔ کہ مہمان آ گئے ہیں تو اپنے ''لخت جگر ہے میر امحمود بندہ تیرا'' کا بستر بھی مہمانوں کے لئے بھجوا دیا اور ابھی

ایک اور بستر چاہیئے تھا تو حضور انور نے اپنا بستر بھی مہمانوں کے لئے بھجوا دیا کسی خادم نے پہچان لیا کہ اوہ ہو یہ حضور اقدس کا بستر اٹھالائے ہو واپس دے آؤ۔ اس پر حضور انور نے فرمایا اور یہ مکالمہ انبیا ہی کی شان ہے۔ کہ محمود پر تو میں نے اپنا چغہ ڈال دیا ہے اور وہ سو بھی گیا ہے یہ بستر مہمان کے لئے لے جاؤ اسے تکلیف نہ ہو میرا کیا ہے مجھے تو زیادہ نیند بھی نہیں آتی اور بغلوں میں سردی کی شدت سے ہاتھ ڈالے بیٹھے تھے جب سے یہ واقعہ پڑھا اور سنا ہے اور دل چاہتا ہے کہ حضور کے پائے اقدس پر قربان ہو جائے اور حضور اقدس کی پاک روح سے مخاطب ہو کر عرض کرتا ہوں اے رسول اکرم ﷺ کے فرزند ارجمند یہ کیسے طویل رات جو یخ بستہ تھی کٹی ہوگی۔ حضرت ''محمود'' معصوم چغہ میں کیسے شدت کی سردی میں سو سکے ہونگے اور حضور نے خود 16,17 گھنٹے کیسے بغیر بستر کے گزارے ہوں گے۔ ہر بار جب یہ واقعات سنتا یا پڑھتا ہوں تو سینے سے دل اچھل کر حضرت اقدس کے قدموں کی تلاش کر کے اس پر نچھاور ہونے کو تڑپتا ہے **فداہ نفسی و امی و ابی**۔ نہ جانے میرا راہوار خیال کہاں کہاں تک گیا۔ یہ اس بستی کی دلربا اور انوکھی تہذیب تھی جس کے بانی نے خود اپنے عمل سے اس حسین و دلنواز تہذیب کی بنیادیں کھڑی کی تھیں۔ پھر میں ہمت کر کے حضرت صاحبزادہ صاحب سے جاملا گو سفر کی مشکلات کے باعث میری ہی صورت قابل شناخت نہیں رہی تھی مگر حضرت موصوف بھی شناخت کے ماہر ترین فرد تھے اور خاندانوں کے خاندان سے بڑی گہرائی سے واقفیت رکھتے تھے۔ معانقہ سے سرفراز فرمایا تو یقین جانیئے میری ڈیڑھ دن کی تھکاوٹ اور پژمردگی اور افسردگی کافور ہوگئی۔ اور بشاشت چہرے پر آگئی۔ کیوں نہ آتی ایک صاحب دل مسیحا نفس سے ہم آغوش جو ہوا تھا۔ کہاں ٹھہرے ہو میں نے بتایا تو ساتھ دو خدام کھڑے تھے انہیں حکم دیا کہ ان کا سامان میرے گھر لے چلو۔ میں نے کہا کہ میرا ایک ساتھی بھی ہے۔ فرمایا اسے بھی اور تیسرا ساتھی عزیزم چوہدری سیف اللہ وڑائچ تھے وہ کب بخشنے والے تھے وہ بھی ساتھ آ گئے مگر ''الدار'' میں بھی کبھی کسی نعمت دینی دنیاوی کی کمی ہوئی ہے۔ اس کی ضمانت تو خدائے قدیر و عزیز نے خود دی ہوئی تھی۔ ہر قسم کی آسائش اور بہترین خوراک اور بہترین رہائش کی سہولت۔

پھر اگلی شام کو حضرت صاحبزادہ صاحب ہمارے کمرے میں تشریف لائے خیریت دریافت فرمائی نیز یہ بھی کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف بتا دیں۔ یہ بھی اپنے مقدس دادا جان اور والد دلربا اور قلوب کو فتح کرنے والا پیارا سوال تھا۔ اس کے بعد فرمایا ہم ''پاکستان'' کو تعارفی تقریر کا حق نہیں دیتے ہم نے کہا آپ بہتر سوچ رکھتے ہیں فرمایا پاکستانی تقریر کرتا ہے تو پاکستان میں جورو ستم کے قصے چھیڑ دیتا ہے جو مجھ پسند نہیں۔ میں نے بھی صاد کیا کہ یہ کیا بات ہوئی کہ مار پاکستان میں پڑے اور چیخ بھارت میں آ کر نکلے فرمایا پھر کل تم 15 منٹ کی تقریر کرنا میں نے کہا۔ جزاکم اللہ۔ میں نے عزیزم ڈاکٹر مدثر احمد صاحب جو میرے ساتھ تھے انہیں 15 منٹ کی تقریر لکھوا دی اور پھر دیکھا کہ زیادہ وقت کی نہ ہو اور اس کی نوک پلک سنوار کر دوسرے روز تقریر کر دی۔ حضرت صاحبزادہ صاحب نے

اپنی آخری تقریر میں میری تقریر پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔اور پھر ہر سال یہ امر طے تھا کہ میری تقریر ہوگی اور مجھے یہ اعزاز بخشا جاتا رہا کہ حضرت مصلح موعودؓ کے سٹیج پر کھڑا ہونے کا شرف تو عطا ہوا، ورنہ میں کیا اور میری تقریر کیا۔کیا بعید اس پر ذرہ نواز کی مغفرت اور بخشش سے کہ قادیان کے روحانی اجتماع میں میرے ٹوٹے پھوٹے الفاظ ہی کو نواز دے۔ ؎

ایک مرد فارسی کے تصدق مجھے نواز

(6) اوپر میں نے حضور کی نسل طیّبہ کا ذکر کرتے ہوئے حضور انور کے تینوں پسران کا ذکر کیا ہے بڑے تو سیدنا حضرت محمود احمدؓ صاحب تو وہ تھے جن کی پرانے صحیفوں میں بشارتیں موجود ہیں۔خود حضور انور کے الہامات میں تینوں کی پیدائش کی خوش خبریاں ہیں منجھلے حضرت صاحبزادہ صاحب کو تو ایک الہام الٰہی میں ''چاند'' بھی کہا گیا تھا اور چھوٹے حضرت صاحبزادہ صاحب ''شاہ'' ۔مگر اپنی حالت ہے کہ ان تینوں میں سے جس کو دیکھا تو یہ شعر لبوں پر کھیلنے لگتا اور یہ میرے اختیار میں نہیں تھا سراسر بے اختیاری کی کیفیت تھی کہ

تیرے چہرے کا نور اصلی ہے
چاند کی روشنی ادھاری ہے

چاند نے تو سورج سے روشنی گویا ادھار لی ہے مگر اے پسر مہدی موعود تیرے چہرے کا نور اصلی ہے

(7) یہ مقدس بستی جس کی دربانی کا شرف حضرت صاحبزادہ کو حاصل ہوا وہاں وہ مہدی و مسیح محو استراحت ہے اور اس کے حواری بھی۔ وہ موعود جس کی نسبت سیدنا و مولانا حضرت امی لقب ﷺ نے 14 صدیاں قبل سلام کا تحفہ ارسال فرمایا تھا۔اس انوکھے اور منفرد اعزاز پر ایمان افروز حیرت ہوتی ہے کہ 14 سو سال تک وہ مقدس اور موقّر سلام فضاؤں میں لہراتا اور خوشبوئیں بکھیرتا رہا اور اس نے فضاؤں کو اپنے نور سے معمور رکھا۔ بالآخر چودھویں صدی ہجری میں حضرت مہدی کو یہ نوروں بھرا لاجواب تحفہ سلام موصول ہوا۔ اور اس نورانی تحفہ نے حضور کو زمین سے اٹھا کر ہمدوش ثریا بنا دیا تھا۔اور حضور نے یہ نغمات الاپنا شروع کر دئے تھے۔

دیکھو خدا نے ایک جہاں کو جھکا دیا
گم نام پا کے شہرہ عالم بنا دیا
جو کچھ مری مراد تھی سب کچھ دکھا دیا
میں اک غریب تھا مجھے بے انتہا دیا
اک قطرہ اس کے فضل نے دریا بنا دیا
میں خاک تھا اسی نے ثریا بنا دیا

یہ اس ''غریب'' اور ''خاک'' کی آواز تھی جو چاردانگ عالم میں پھیل گئی اور ہم اس کے ثمرات دیکھ رہے اور چکھ بھی رہے ہیں۔ حضرت صاحبزادہ صاحب نے اشاعت دین میں بہت میدان مارے اور کارہائے نمایاں سرانجام دئے اور ان کے جانشین ان کے نقوش قدم پر چل کر دیکھیں گے کہ کہاں کہاں انہوں نے بیج بوئے اور کئی تو اب تناور درخت بن چکے ہیں۔

(8) اگر یہ پوچھو کہ یہ انقلاب روحانی کیسے اور کیونکر رونما ہوا تو طویل بحثوں اور مشکل دلائل کی بجائے اگر میں یہ کہوں کہ ایک لفظ میں بیان کرسکتا ہوں تو وہ پیارا اور انقلاب آفرین لفظ ''عشق'' ہے ''عشق حقیقی'' نے یہ سب کچھ کر دکھایا میرا علم کیا اور میری مجال کیا میں نے تو حضور اقدس اپنے مرشد و پیشوا کے کلام سے خوشہ چینی کر کے ہی یہ نتیجہ نکالا ہے۔حضور فرماتے ہیں

کون چھوڑے خواب شہر میں کون چھوڑے اکل و شرب
کون لے خار مغیلاں چھوڑ کر پھولوں کے ہار

اور سنو

عشق ہے جس پہ طے ہوں سارے جنگل پرخطر
عشق ہے جو سر جھکا دے زیر تیغ آبدار

اور حضور انور کا یہ فارسی شعر تو اس مضمون کو پوری طرح کھول کر بیان کر رہا ہے۔

من نہ دارم مایۂ کردارِ ھا
عشق جوشیدو از و شہ کارہا

ترجمہ (میں کردار کو سرمایہ نہیں رکھتا عشق نے جوش مارا اور اس سے یہ سارے کام ہو گئے)

حضرت صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب تک کا ذکر کرتے کرتے آج آپ کے منبع و مصدر اور آپ کے حضرت مقدس دادا جان آپ کے سرچشمہ تک بات کا پہنچنا لازم تھا یا میری مجبوری۔

(9) مجھ عاجز پر حضرت صاحبزادہ صاحب کے الطاف کریمانہ اور نوازشات خسروانہ کچھ تو اوپر بیان ہو چکا مگر یہ نوازشات ہر سال ہی ہوتی رہیں اور میں اپنی بہوؤں کے ساتھ ہمیشہ آں ممدوح کے لطف و کرم کے طفیل ''الدار'' میں ہی ٹھہرتا اور اس مائدہ سے جو الدار میں 100 برس پہلے نازل ہوا اس سے کام و دھن بھی مستفید ہوتے رہے۔ وہاں پر بھی وہ کمرہ تھا جہاں 1889 میں حضرت مصلح موعودؓ کی ولادت باسعادت ہوئی تھی۔ بلکہ وہی حضرت اقدس مسیح موعودؑ کی ولادت کا بھی کمرہ دیکھا اور اس میں نفل پڑھنے کی توفیق بھی ملی جہاں حضور انور 1835 میں پیدا ہوئے تھے۔ اسی طرح آپ کے گھر الدار میں قیام کی برکت سے آپ سے اکثر ملاقات کا شرف حاصل

ہوتا رہا۔ جب سیدنا حضرت مصلح موعودؓ کی جائے ولادت کی نشان دہی ہوئی تو اس اولوالعزم عارف باللہ کا بلند مقام آنکھوں میں گھومنے لگا۔ ایک روز ہم ناشتے کی میز پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے 8/10 مہمان ہونگے تو حضرت صاحبزادہ صاحب بھی تشریف لائے آپ کو کھانسی ہورہی تھی آپ کے بیٹے صاحبزادہ مرزا کلیم احمد صاحب نے سرگوشی کی حالت میں مگر حد درجہ ندامت اور پشیمانی سے بتایا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے ابا نے پانی مانگا تو میں نے غلطی سے ٹھنڈا پانی پیش کر دیا اسی کی وجہ سے ابا کو کھانسی ہورہی ہے۔ اطاعت اور حسین تہذیب وتکریم والد کے اسلوب بھی کوئی اس مقدس خانوادے سے سیکھے۔

حضرت صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب ہمارے گاؤں ہلال پور میں آمد اور ہمارے لئے عید کی خوشیوں سے بڑھ کر مسرتیں

1994 میں ہم نے ہلال پور میں اپنی جگہ ایک ''بیت'' کی تعمیر شروع کی مخالفین کا آتش زیر پا ہونا قدرتی امر تھا اور یہ متوقع بھی تھا اور ہم نے پیش قدمی بھی حسب استطاعت کر لی تھی۔ چنانچہ بڑا شور وغوغا ہوا۔ قد آدم اشتہار بھلوال سب ڈویژن کے قصبات اور دیہات میں چسپاں کئے گئے کہ فلاں جمعہ کے روز ہم برزور اس بیت کا قبضہ مرزائیوں سے حاصل کر لیں گے ہم نے اپنی مقدور بھر تیاری کی حضرت صاحب کو دعا کے لئے فیکس ارسال کیں اور مقررہ جمعہ کے روز ہم بیت کے دفاع کے لئے خدام حاضر ہو گئے۔ اللہ قادر وعزیز نے فضل کیا گاؤں ہلال پور سے کسی نے باہر سے آئے ہوئے مفسدوں کا ساتھ نہ دیا اور وہ بھی مایوس ہو کر چلے گئے اور قسم کھا کر گئے کہ پولیس سے یہ عبادتگاہ گروائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا کہ یہ عبادتگاہ جس میں مرزائی عبادت کرتے ہیں پلید ہوگئی ہے اسے عدالت کے حکم سے گرا کر یہاں FilthDepot (روڑی) بنادی جائے۔ مقدمہ 3 سال چلا بالآخر ایک اللہ کے بندے جج نے اسے خارج کرنے کی ہمت پائی۔ خس کم جہاں پاک

فضاؤں کو نحوستوں سے پاک کرنے کے لئے اول تو حضرت صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب تشریف لائے بلکہ آپ دوسری مرتبہ بھی تشریف لائے جزاہم اللہ تعالیٰ

کچے گھڑے نے جیت لی ندی چڑھی ہوئی
مضبوط کشتیوں کو سہارا نہیں ملا

میرا ارادہ اور منصوبہ یہ تھا کہ حضرت اقدس مسیح ومہدی کی نسل طیبہ کے جتنے بزرگ تشریف لاسکیں انہیں دعوت دی جائے تا ہمارے گاؤں سے نحوست کے سائے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوں اور مبارک انفاس کے نوروں سے ہماری فضائیں بھی معمور ہوں۔ اسی غرض کیلئے حضرت صاحبزادی امتہ الرشید بیگم صاحبہ مع دیگر خواتین مبارکہ بھی تشریف لائیں۔ حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب سے بھی گزارش کی آپ نے صحت کی بحالی پر وعدہ کیا مگر آپ کی وفات ہوگئی۔ ہم اس برکت سے محروم

رہے۔ پھر موجودہ حضرت صاحب سے التماس کی آپ نے کسی فراغت کے دن وعدہ کیا مگر میری درخواست اور حضرت صاحب کے وعدے کے وقت قدرت ہماری سوچوں اور ارادوں پر ہنس رہی ہوگی کہ یہ شخص تو بڑے عالی منصب پر فائز ہونے والا ہے تم کہاں اس کوردیہہ میں اسے لے جانے کی تمنا کر رہے ہو۔ کئی ملکوں کے بادشاہ اس کی میزبانی کر کے فخر اور ناز کریں گے۔ البتہ صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب، صاحبزادہ مرزا غلام احمد صاحب، مولانا چوہدری سلطان محمود صاحب انور اور مولانا ابوالمنیر نورالحق نے اپنے قدوم سے اسے ضرور برکت بخشی۔ جزاھم اللہ

یہاں اس سلسلہ میں میرا بیان نامکمل اور ادھورا رہے گا اگر میں حضرت صاحبزادہ مرزا مظفر احمد صاحب کا ذکر نہ کروں جو میرے ساتھ محض للہ پیار کرتے تھے۔ کہیں سے انہوں نے سنا کہ اس نے ''دارا'' ''بارہ دری'' اور گھر بنایا ہے اور ''بیت الاحمدیہ'' بھی وہیں تعمیر کی ہے تو واشنگٹن (میری لینڈ) امریکہ سے آپ نے مجھے خط لکھا کہ میں نے سنا تم نے اچھی جگہ بنائی ہے میرا پاکستان آنا ہوا تو میں بھی ہلال پور آنا چاہتا ہوں۔ مگروائے افسوس کہ آپ اس کے بعد زندگی میں پاکستان تشریف نہ لاسکے اورآپ کی میت 31 جولائی 2002 کو پاکستان پہنچی تو اس رات لاہور میں میری اوپن ہارٹ سرجری ہو رہی تھی اور میں آپ کی آخری زیارت اور جنازہ میں شمولیت سے بھی محروم رہا اور ساری زندگی کے آپ کے احسانات اور پیار ومحبت کا صلہ جو دو مٹھی مٹی آپ کی لحد پر ڈال کر دینا چاہتا تھا۔ اس سے بھی معذور ومحروم رہا۔

ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا حضرت صاحبزادہ کے اس احسان عظیم کا اس عاجز کے ظلمت کدہ کو کس طرح اس درویش شاہزادے نے اپنے آبائی نوروں سے بھر دیا تو پھر دوسرے صاحبزادگان کا ذکر چھڑ گیا اور بظاہر میں نفس مضمون سے بھٹک گیا مگر دوستو یہ بات نہیں اور نہ یہ میرا اختیاری معاملہ ہے یہ سبھی سیدنا حضرت مسیح ومہدی کے راج دلارے ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے پھول ہیں ایک کا ذکر کریں تو دوسرے کا ساتھ ہی تذکرہ چھڑ جاتا ہے کیونکہ ان سب کی خوشبوئیں شاید مختلف ہوں مگر جنس پاک ایک ہی ہے۔

جب حضرت صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب کے ربوہ آنے کی نوید ملی تو میں نے آپ سے ہلال پور تشریف لانے کی درخواست داغ دی۔ گو میں جانتا تھا کہ آں موصوف کے لئے شاید قانونی روک ہو مگر میری التجا اتنی عاجزانہ اور مضطرانہ تھی کہ آپ نے ازراہ کرم فوراً ہاں کر دی اور میں نے اپنے عزیز دوست ملک لیاقت حیات خان صاحب رئیس آف لاوہ کو انہیں ربوہ سے ہلال پور تشریف لانے کی زحمت دی جو موصوف نے بڑی خوشدلی اور ارادت مندی سے قبول کرتے ہوئے علی الصبح ہی اپنی نئی کار لے کر ربوہ پہنچ گئے (اور گو وہ باقاعدہ جماعت احمدیہ میں شامل نہیں ہیں مگر جماعت کے بزرگوں کے عارف باللہ ہونے اور سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کے تو خاص طور پر عقیدتمند تھے اور ہیں) جب وہ ربوہ پہنچے تو حضرت میاں صاحب نے مجھے فون کیا کہ یہاں سے 15/16 افراد خواتین اور بچے ہلال پور

جانے کے خواہش مند ہیں۔تو میں نے عرض کیا کہ جتنے افراد اس مقدس خانوادے کے تشریف لائیں میرے لئے اتنی ہی زیادہ خوشی کا موجب ہوگا سب کو ضرور لائیں۔ چنانچہ حضرت میاں صاحب اور حضرت آپا جان اس کار میں اور دوسری خواتین مبارکہ اور غالباً ایک دومرد اور دو بچے ایک ویگن میں تشریف لائے۔

نواحی جماعتوں ادرحمہ اور تخت ہزارہ سے بھی لوگ آپ کی زیارت اور ملاقات کے لئے تشریف لائے ہوئے تھے آپ نے جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمایا اور نمازیں پڑھائیں اور اس عاجز نے اس مبارک قافلے کا استقبال خوشی اور مسرت کے آنسوؤں سے کیا اور جو استقبالیہ حضرت صاحبزادہ کی خدمت میں پیش کیا اس ان شعروں سے شروع کیا۔

اگر کیڑی کے گھر نارائن آئے
تو سمجھو اس پر رحمت کے ہیں سائے
خدا کی ذات کا ہے یہ بھی جلوہ
دکھائے وہ جسے چاہے دکھائے

اگر میں کہوں کہ وہ ہمارے لئے عید کا دن تھا تو اس میں ہرگز کوئی مبالغہ نہیں کیونکہ عید کے روز تو بعض دفعہ غموں بھری خوشیاں ہوتی ہیں مگر اس روز کی شادمانی اور مسرت میں غم واندوہ کی کوئی آمیزش نہیں تھی۔ سیدنا حضرت رسول عربی ﷺ کے عاشق صادق کا یہ فرزند زادہ تو اس بستی سے آیا تھا جس میں میں نے بچپن میں پناہ لی تھی اور جہاں میں نے نوروں کی برسات خود ان پر تقصیر آنکھوں سے برستی دیکھی۔ یہ وہ بستی ہے جس کے گلی کوچوں جس کی عبادتگاہوں اور جس میں حضرت مہدی اور اس کے حواری کی آخری آرام گاہ اور اس میں ''الدار'' یہ سب کھلی بانہوں سے ہر آنے والے کو دعوت نظارہ دے رہے ہیں اور ان میں ایسی کشش اور جذب کی طاقت ہے کہ بقول غالبؔ

گل خود بخود پہنچے گوشہء دستار کے پاس

اہل اللہ کو جذب وکشش کی خاص طاقتیں ودیعت ہوتی ہیں اور اس زمانے میں یہ آسمانی قوتیں سیدنا حضرت مہدی موعودؑ کو بطور خاص عطا ہوئی تھیں۔جس کی مثالیں اس وقت ذہن میں مستحضر ہیں لیکن طوالت کا خوف ان کے بیان میں مانع ہے۔ میں اس مقدس بستی کا ذکر کرتے ہوئے پھر بے خود ہو گیا اور قلم پر کنٹرول نہ رکھ سکا مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بستی جتنی روئے زمین پر ہے اس سے بڑھ کر ہر احمدی کے دل میں آباد ہے۔اور راقم کا حال بھی کچھ ایسا ہے۔

بہرحال حضرت صاحبزادہ صاحب موصوف نے جو ایک دن ہلال پور میں گزارا وہ ہمیں یہ یقین عطا کر گیا کہ اتنے مقدس انفاس کی

چند گھنٹوں کی آماجگاہ احمدیت کے اس پودے کی آبیاری کرنے کے لئے بہت ہے جو میرے قابل صد رشک رفیقِ حضور ابا نے اس صدی کے ابتدائی سالوں میں اپنے دل میں بویا تھا اور پھر مخالفین اور معاندین کی کوئی یورش اس پر اثر انداز نہیں ہوئی۔ اور ہم اسی مقدس پودے کے ثمرات کھا کر زندہ ہیں اور خواہ ہم عملی میدان میں بہت کمزور ہیں تاہم حقیقی معنوں میں یہ بڑے ناز سے کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ''پدرم سلطان بود'' بجا کہ یہ مقولہ عموماً مقام ذم میں ہی استعمال ہوتا ہے مگر اس میں کیا شک ہے کہ جن خوش بختوں کے باپ نے اس زمانے کے مامور کو اس زمانے میں مانا اور شناخت کیا جب کفر کے فتاوی کی اس پر بوچھاڑ ہو رہی تھی اور کوئی نہ جانتا تھا کہ ہے قادیان کدھر۔ اور جب وہ بزرگ سیدنا وسیدھم کے مبارک ہاتھ میں ہاتھ دے کر آئے تو اپنوں اور پرایوں کے بائیکاٹ اور جور وستم کی کچھ بھی پرواہ نہ کی اور کمال استطاعت اور جوانمردی سے تکالیف کو سہتے رہے اور اف تک نہ کی ان کی اولاد خواہ اس عاجز جیسی بھی تر دامن والی ہو تو پدرم سلطان بود کی ندا گو راہِ راست سے بھٹکے ہوئی اولاد کیلئے کچھ جائے فخر نہیں ہے تاہم اس خدارسیدہ مورث کے لئے بہرحال مقام مدح ہے۔

حضرت صاحبزادہ صاحب اور حضرت آپا جان حرم حضرت صاحبزادہ صاحب ہمارے لئے بے حد فضلوں اور برکتوں کا موجب بنے جن کا بیان بھی ممکن نہیں ہے۔ وہ چند گھنٹے عجیب ایک کیف ہمیں عطا کر گئے جو حضرت صاحبزادہ صاحب اور آپ کے رفقاء نے ہمارے ہاں گزارے اور اب بھی یاد کر کے عجیب قسم کا سرور محسوس کرتا ہوں اور حق یہ ہے کہ بقول حضرت علیم مرحومؒ

یہ محبت تو نصیبوں سے ملا کرتی ہے
کہ چل کر خود آئے مسیحا کسی بیمار کے پاس

(اگر شعر میں کسی لفظ کی کمی بیشی ہو تو معذرت)

بہرحال آخر آپ نے واپس جانا تھا الوداع کی گھڑیاں قریب آرہی تھیں اور بالآخر آپ برادرم ملک لیاقت حیات خان صاحب کی کار میں اور دوسرے افراد قافلہ ویگن میں سوار عازم ربوہ ہوئے اور ہماری یہ حالت زار کہ ؎

بس ایک بار وہ آیا اور اس پہ یہ عالم
کہ جیسے آیا نہیں ہزار بار گیا

راقم عاجز اوائل دسمبر 2004 میں ایک جانکاہ صدمہ سے دوچار ہوا حضرت صاحبزادہ صاحب کو بھی اس کا علم ہوا پھر میں 23 دسمبر 2004 کو جب قادیان پہنچا اور مغرب کی نماز کی ادائیگی کے لئے برادر عزیز چوہدری عظمت حیات صاحب ایڈووکیٹ اور عزیزم چوہدری ندیم احمد صاحب کی معیّت میں بیت مبارک گیا۔ مغرب اور عشاء کی نمازوں کے بعد حضرت صاحبزادہ صاحب

موصوف کے پاس سبھی لوگ ملاقات کے لئے باری باری حاضر ہورہے تھے۔آپ کرسی پر تشریف فرما تھا جب راقم اس مسیحانفس صاحبزادہ صاحب کے قریب ہوااورشاید میرے دردوغم اوررنج والم کو جومیرے چہرے پر مرقوم تھا پڑھ لیا ہوگا تو قدرے مشکل سے کرسی سے اٹھ کر مجھے گلے لگالیا۔تعزیت فرمائی نیز یہ بھی کہ پرسوں جمعہ کے روز عزیزم رضوان احمد صاحب کا جنازہ غائب پڑہائیں گے۔ یہ نہ پوچھیں کہ میرے سینے میں درد واندوہ کی آگ جو بھڑک رہی تھی اس پر آپ کے ہم آغوش ہونے پر اورآپ کا جنازہ غائب پڑھنے کے وعدہ فرمانے سے ہی کیسے اور کیونکر گویا پانی پڑ گیا کیوں نہ ہوتا کہ وہ اس عالی مقام مسیح ومہدی کالخت جگر تھا جس نے بقول حضرت ثاقب زیروی ؎

اک نگہ کی اور میں نے سمیٹ لیں
ساری جہاں کی نعمتیں اس ایک نگہ میں

جس نے ہزاروں مردوں کونئی زندگی دلادی تھی اوریہی دستور حضورانور صاحبزادہ حضرت مصلح موعودؓ اورحضور کی اولادمیں بھی حسب مراتب چلاآرہاہے جس کاایک شاہد راقم خودموجود ہے۔تفصیل کی گنجائش نہیں مختصراً یہ کہ مان ہائیم جرمنی کے مقام پر سیدنا حضرت صاحبزادہ مرزاطاہرؒ سے بصدادب ومنت التماس کی میں بھی اپنے سینے میں ایک دل صد چاک لے کرآیاہوں جسے ماہرین نے ناقابل علاج قراردیاہے۔اس کی رفوگیری بھی ممکن نہیں ہے۔بس آپ کی نگہ کرم کا محتاج ہوں جو مجھ پر بھرپورنگاہ پڑی اورمیں وہیں مان ہائیم کے جنگل میں مبارکبادوں کے تحائف وصول کرنے میں جت گیا۔اورواپسی پرلاہورمیں اسی لاعلاج قراردئے جانے والے دل کی مرمت ایسی ہوئی کہ قدرت خداوندی نے اپنے محبوب بندے کی نگہ کرم اوردعاؤں کے صدقے مجھے اب 5 سال تک توسیع بخش دی۔ اوریہ عاجز عاصی بھی ''منسوخ شدہ زندگی'' کامژدہ جوآقائی وسیّدی حضرت اقدس مسیح ومہدیؑ کوسیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ کے متعلق آسمان سے نازل ہواتھا۔ان آقاؤں کے جوتیوں کے تلوں کی حیثیت بھی نہیں رکھتااس سے فیض یاب ہوا۔اس پر اپنے محی اوقیوم رب کریم کا جتنا شکرادا کروں کم۔الحمدللہ ثم الحمدللہ

حرف آخر

ہرچند کہ میرا یہ مضمون حضرت صاحبزادہ صاحب مرحوم کی سیرت بیان کرنے کی کاوش نہیں ہے اورمجھ جیسے تہی دامن اورخام علم رکھنے والے سے یہ ممکن ہی نہیں وہ کام کوئی اہل دل اورصاحب علم وعمل شخص کرے گا جوآپ کی 60 سالہ درویشانہ زندگی پر پھیلے ہوئے آپ کے سنہری کارناموں کو یکجائی طور پر بیان کرکے آپ کی صحیح طور پرتصویرکشی کرسکے گا۔میرے یہ ٹوٹی پھوٹی عبارت تومیرے صرف دومقاصد کے لئے ہے ایک توحضرت ممدوح کیلئے دعاطلبی میری غرض ہے کہ قارئین الفضل آپ کے اعلیٰ علیّین میں مقام پانے اورآپ کی حضرت

بیگم صاحبہ اور اکلوتے بیٹے صاحبزادہ مرزا کلیم احمد صاحب سلمہ ربہ کے دین و دنیا میں حسنات کے حصول کے لئے اور اسی طرح آپ کی دختران کرام کے ہر خیر پانے اور ہر شر سے محفوظ رہنے کے لئے دعائیں کریں اور یہ عاجز خود کر رہا ہے اور دوسری میری غرض اپنے لئے دعاؤں کی التماس کرنا ہے کہ مجھے میرا مولا کریم اپنے رحم اور فضل سے معاف فرماوے اور میری برائیوں، غفلتوں اور گناہوں سے صرف نظر فرماتے ہوئے انجام بخیر فرمادے اور میرے بعد میری نسل بھی احمدیت کے ساتھ عاشقانہ تعلق قائم رکھے۔

ایں است کام دل اگر آید میسّرم

اس شاہزادے ہاں سیدی ومحبوبی ومرشدی حضرت مصلح موعودؓ کے جگر کے ٹکڑے کے لئے آخر میں چند اشعار اس پاک روح کی خدمت میں پیش ہیں

برگ سبز است تحفہ درویش
اور اس تہی دامن کے پاس کیا ہے
سر میں رفاہ عام کا سودا لئے ہوئے
دل میں خلوص دل کا تقاضا لئے ہوئے
ہونٹوں پہ ایک طلسم مسیحا لئے ہوئے
وہ بوئے گل کے تولنے والا چلا گیا
محبوب خاص و عام تھا جانِ دلخراش تھا وہ
اپنے جلو میں فرد نہیں انجمن تھا وہ
میٹھے وہ بول بولنے والا چلا گیا
موتی خیرد کے رونے والا چلا گیا

آہ ملک نذر محمد ٹوانہ بھی ہمیں چھوڑ گئے

(مجنوں جو مرگیا ہے تو جنگل اداس ہے)

یہ فرمان خداوندی کتنا سچا اور آزمودہ ہے کہ اس دنیا کی ہر شے فانی ہے

ویبقیٰ وجہ ربك ذوالجلال والاکرام

بھائی نذر محمد صاحب ٹوانہ بھی 9 ستمبر 1999 کو داغ مفارقت دے گئے۔ ہر چند کے یہ چل چلاؤ کی ریت ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ خدا کا پیغمبر بھی اور وقت کا سکندر بھی ظل سبحانی بھی اور تاجدار بھی اور زمانے کے ستم رسیدگان بھی کسی کو اس سے مفر نہیں ہے سبھی نے یہ جام چکھنا ہے۔ اس گھاٹی کو سبھی نے عبور کرنا ہے۔ موت اٹل ہے۔ مگر ہے بہت تلخ حقیقت سب ہی چند گز لٹھے اور دو گز زمین کے حقدار ٹھہرے۔ وہاں کی محمودی یا ایازی نہیں سب برابر ہیں۔ زندگی کے افق پر ہزاروں لوگ ابھرتے ہیں اور پھر ڈوب جاتے ہیں۔ مگر یہ ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتا کہ اس دنیا سے اٹھ جانے کے بعد بھی اس طرح جگمگاتے رہیں جس طرح ستاروں کے جھرمٹ میں چاند روشن ہوتا ہے۔ ٹوانہ صاحب کی موت ایک فرد کی موت نہیں۔ دیرینہ حسین روایات کا امین ہم سے بچھڑ گیا۔ اس گئے گزرے دور میں جہاں بادصبا کا جھونکا بھی کمینہ فطرت لوگوں کی نحوست سے ہمارے تک آتے آتے بادِ صرصر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایک بلند کردار، وفا پیشہ اور مجسّم اخلاص و محبت اور درد مند دل رکھنے والے شخصیت ہم سے روٹھ گئی۔ جس کی یادیں ساری عمر بھلائے نہیں بھولیں گی۔

یہ وہ دور ہے جس میں ہر شے میں کھوٹ ہے حتیٰ کہ محبت اور عشق بھی کھوٹے ہیں۔ میرا اس شخص سے تعارف قریباً نصف صدی قبل ہوا۔ میں نے انہیں قریب ہو کر دیکھا تو بلند حوصلگی کے ساتھ ساتھ ذہن رسا، انسان دوستی اور محبت و وفا میں یکتا پایا۔ پھر تو ہم نے جلد جلد باہمی یگانگت اور قرب کی منزلیں طے کر لیں۔ بے شمار سفر اکھٹے کئے۔ ہمارے سارے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہونے لگے۔ اور میں نے محسوس کیا کہ باریک باریک نکتے کو فوراً سمجھ لیتے۔ اور معاملے کے مخفی گوشوں پر بھی ان کی نگہ ہوتی۔ ان کی رائے پختہ اور جچی تلی ہوتی تھی۔ ان کے قیمتی مشورے سے اپنا قبلہ درست کرنے میں مجھے بہت مدد ملی۔

انہیں موذی مرض لاحق تھا جس کا علاج ہنوز انسانی عقل و دانش سے باہر ہے۔ آخری بار ایک تقریب ہمارے ہاں 23/3/98 کو تھی۔ بالکل صحت مند تھے۔ اس تقریب کی ان کی تصویر میں نے اپنے پاس رکھ لی تھی مگر اسے دیکھ کر زخم پھر ہرے ہو جاتے ہیں ؎

اے میرے چارہ گرو اس کا کوئی علاج ہے تو بتاؤ

جسم میں درد کی شکایت ہوئی۔ڈاکٹروں نے اپنی سمجھ کے مطابق علاج شروع کیا۔مگر کچھ افاقہ نہیں ہوا۔یوں چلتے پھرتے تھے۔ہم کم فہم بھی نہ سمجھ سکے کہ یہ شخص جو اپنی صفات حسنہ کی وجہ سے لاکھوں میں ایک تھا ہمیں تنہا چھوڑ کر جلد سفر آخرت پر روانہ ہونے والا ہے۔ جب تکلیف بڑھی تو ان کے اور میرے چھوٹے بھائی ملک خیر محمد صاحب ٹوانہ کی چھٹی حس نے غالباً خطرے کو بھانپ لیا تھا اور راولپنڈی ہمراہ لے گئے۔ڈاکٹروں نے دیکھتے ہی شدید خطرہ جان محسوس کر لیا۔مگر ٹیسٹ ہوئے اور موذی مرض کا انکشاف ہوا۔کمزوری روز بروز بڑھتی گئی۔28 نومبر 1998 کو میری پوتی کی شادی تھی۔فون پر دکھی دل کے ساتھ شمولیت سے معذرت کی اور لرزتی ہوئی آواز میں تسلی دیتے رہے مگر ہم انہیں ایسے جذباتی موقعہ پر غیر حاضر پا کر کہتے رہے۔

جو باعث رونق تھے وہ موجود نہیں
میں سوچ رہا ہوں کہ یہ اب کس کا نگر ہے

قریباً ایک سال کا عرصہ بستر پر ہی رہے میں اکثر ملنے جاتا تھا۔ان کے لئے غریبانہ مناجات کرنے کی بھی توفیق ملی۔مگر تقدیر مبرم تھی نہ ٹلی پر نہ ٹلی۔مجھے ان کی بیماری کا احوال معلوم کر کے دل پر ایسی چوٹ لگی تھی کہ جونہی میں سجدے میں سر رکھتا۔آنسوؤں کا سیلاب اٹھ آتا۔اور میری سجدہ گاہ تر ہو جاتی۔اور میں مضطرب ہو کر دعا کرتا رہا کہ۔

تجھ کو تیرا ہی واسطہ پیارے
میرے پیارے کو دے شفا پیارے

اللہ تعالیٰ مالک الملک اور ہم اس کے در کے بھکاری۔وہ جو چاہے کرے چاہے تو ہماری جھولی میں خیرات ڈال دے ورنہ اپنے در کے گداگر کو کسی اور طرح سے نواز دے۔ہم نے ہر حال میں اسی سے مانگنا ہے۔یہ در چھوڑ کر اور کہاں جائیں

ہمارا کام ہے کرنا دعا کا
پھر آگے چاہے وہ مانے نہ مانے
اگر مانے تو اس کا کرم ورنہ
وہ جانے اور اس کا کام جانے

روز بروز حالت بگڑتی جارہی تھی۔سبھی اللہ کے دربار میں ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔اور شافی مطلق سے دعا مانگ رہے تھے۔گو ہم سب محسوس کر رہے تھے کہ آخری وقت قریب سے قریب تر آتا جارہا ہے۔مگر پھر بھی مانگنے میں کمی نہ کی۔وہی بات ہوئی جیسا کہ ایک

شاعر نے کہا ہے کہ

ملک الموت کو ضد ہے کہ جان لے کے رہوں
سر بسجدہ ہے مسیحا کہ میری بات رہے

مرحوم کے چھوٹے بھائی ملک خیر محمد صاحب ٹوانہ گجرات میں تعینات ہیں۔ قریباً ہر روز فون کر کے خیریت دریافت کرتے۔ مگر انہوں نے تو ماہر ڈاکٹروں کا فیصلہ سنا ہوا تھا۔ انہیں کسی صورت چین نہ آتا۔ تو چند گھنٹوں کے لئے اپنی سرکاری گوناگوں مصروفیات سے دامن چھڑا کر سرگودھا پہنچ ہی جاتے۔ ظاہر ہے یہ ملاقاتیں کسی طرح شادمانی یا اطمینان کا موجب تو نہیں ہوتی تھیں بچھڑ کر افسردگی میں اضافہ ہی ہوتا ہوگا۔ مگر اس سے بچنا بھی انکے لئے ناممکن تھا۔ اس دوران ان کی والدہ ماجدہ کی وفات کا سانحہ پیش آ گیا۔ اس کے بعد میں ملاقات کے لئے گیا۔ تو ماں کی ماںتا سے محرومی کی وجہ سے آزردہ خاطر تھے اور پھر یہ قلبی قلق بھی تھا کہ والدہ کے سفر آخرت میں شامل نہ ہو سکے۔ بلکہ آخری بار چہرہ کی زیارت سے بھی محروم رہے۔

پھر چند ماہ قبل چھوٹے بھائی کی صاحبزادی کی شادی میں شریک نہ ہونے کا بھی شدید احساس تھا۔ ادھر ملک خیر محمد صاحب ٹوانہ نے بھی ان کی غیر حاضری کو اس شدت سے محسوس کیا کہ اس تقریب میں بڑی مشکل سے ضبط کر سکے۔ حتیٰ کہ ہم نے بھی اس کی اندرونی حالت کو ان کے چہرے سے پڑھ لیا تھا۔ چاروں بھائیوں میں یکرنگی اور محبت اور ایثار مثالی ہے۔ مگر نذر محمد صاحب مرحوم اور چھوٹے بھائی ملک خیر محمد میں تو ایک بے مثال عاشقانہ رنگ کی محبت والفت تھی۔ عندالملاقات چھوٹے بھائی اپنے مرحوم بڑے بھائی سے جس عقیدت سے ملتے تھے میں ہمیشہ کہتا تھا کہ کاش ساری دنیا کے بھائیوں میں ایسا ہی عشق ومحبت ہو تو یہ دنیا بہشت کا نمونہ بن جائے۔

دوسرے بھائی بھی بار بار ملنے آتے۔ مرحوم کو اگرچہ یہ نہ بتایا گیا کہ انہیں کس مہلک بیماری کا سامنا ہے۔ مگر ان کا دل بھی بجھ چکا تھا۔ وہ جان گئے تھے کہ انجام بہت قریب ہے۔ جب بھی ملاقات ہوتی تو ہم بظاہر ان کو خوش کرنے کی باتیں سناتے۔ مگر دونوں جانب کے دلوں کو صبر وقرار نے خداحافظ کہہ دیا ہوا تھا۔ اور ہم بزبان حال یہ کہتے ہوئے ان کے ہاں جاتے تھے کہ

غنیمت جان لو مل بیٹھنے کو
جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

وفات سے ہفتہ عشرہ قبل ملک خیر محمد صاحب مجھے ہمراہ لے کر ان کے گھر ملنے گئے۔ میں ان کی دگرگوں حالت دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتا تھا۔ اس لئے آخری 3,2 مہینے میں عزیز محمد منصور سے ہی طبیعت پوچھنے پر اکتفا کرتا تھا۔ چنانچہ جب ملک خیر محمد صاحب ٹوانہ کے ساتھ گھر پر پہونچے تو میں ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھ گیا۔ ملک ملے تو انہوں نے میرا بھی بتایا۔ اس روز بولنے کی طاقت بھی چھن چکی

تھی۔ ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اسے بلالو۔ چنانچہ میں حاضر ہو گیا۔ میں نے ان کے نحیف ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اسے بے اختیار بوسے دیئے۔ وہی ہاتھ جو ساری عمر مجھے حوصلہ اور سہارا دینے کے لئے متحرک رہتے تھے۔ اور وہ ہاتھ جو ان کی معاملہ فہمی اور وسیع اور بےلوث دوستیوں اور یارانوں کی وجہ سے بڑے مضبوط بلکہ زبردست تھے۔ آج بے جان نظر آرہے تھے۔

طاقت گویائی باقی نہیں رہی تھی۔ مگر آنکھوں نے وہ کام کیا جو زبان نہیں کرسکتی تھی۔ ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ان میں بےبسی کا اظہار بھی تھا۔ پرانی صحبتیں بھی یاد آرہی ہوں گی۔ نہ معلوم انکے دل پر کیا کیا گزر گئی۔ مگر میں نے سمجھا کہ وہ مجھے آنسوؤں کی زبان سے یوں مخاطب ہو رہے ہیں

بزم یاراں الوداع شہر نگاراں الوداع
اے سواد مہرتاباں دوستداراں الوداع

میں چند ثانیئے بیٹھ کر خدا حافظ کہہ کر اس حال میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں جا بیٹھا کہ دل درد و غم سے بھر گیا تھا۔ نظر نظر میں انہوں نے دل کو موہ لیا تھا کیونکہ

وہ جان ہی گئے ہمیں ان سے پیار ہے
آنکھوں کی مخبری کا مزہ ہم سے پوچھیے

میں سوچتا رہا کہ انسان کتنا بےبس ہے۔ یہ جوانمرد جس کی شاہسواری خصوصاً پولو کے کھیل میں مہارت کا ایک زمانہ گواہ ہے۔ اور جو کئی غیر ملکوں میں اپنی مردانگی اور جراتوں اور مہارتوں کے جھنڈے گاڑ آیا تھا۔ آج زبان میں ہلنے کی سکت نہیں اور ہاتھ میں جنبش نہیں۔ یہ وہی ہاتھ تھے جو بڑے بڑے منہ زور گھوڑوں کو رام کر لیتے تھے۔ اور یہ وہی زبان تھی جس سے نکلا ہوا ہر ہر لفظ خواہ نیزہ بازی کے مقابلوں میں ہو یا شکاری کتوں کی دوڑوں کے مجمع میں ججی کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے اس پر اعتمادی سے ادا ہوتا تھا کہ اسے حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔ اور کسی کو انگلی اٹھانے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ ہر چند کہ کھیل کود کے مشغلے ہوتے تھے۔ مگر ایک لمبے عرصہ تک ججی کے فرائض پر فائز رہنا ان کی دیانتداری، انصاف پسندی اور معاملہ فہمی پر ایک بولتا ہوا گواہ ضرور ہے۔ اس کے علاوہ برادری اور دوستوں میں مصالحت کنندہ کے طور پر بھی ان کا نامِ نامی حق گوئی کی وجہ سے ضلع بھر میں معروف تھا۔

میرا یہ مختصر سا مقالہ ملک نذر محمد خان صاحب ٹوانہ کی عبقری صفات اور حسنات کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ آج جب دل درد سے لبریز ہو کر چھلکنے لگا تو میں نے کاغذ کا سہارا لیا کہ

ہم ان پہ لکھ کر ان کو پڑھ کر کرتے ہیں گزر اپنا

بھلا ہو کاغذوں کا جو ہمارے کام آتے ہیں

اگر غم واندوہ بند سینہ میں بھرے رہیں اور اظہار کی کوئی راہ نہ ہو تو انسان اندر سے ریزہ ریزہ ہو جائے۔ جب ایسی گھٹن ہو جائے تو اندر کا غم واندوہ صفحہ قرطاس پر بکھیرنے سے سینے کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اسی غرض سے میں نے ٹیڑھے لفظوں میں اپنی داستانِ غم لکھی ہے۔ اور وہ باہمت اور بہادر شخص جس کی زندگی کے سمندر میں کئی جوار بھاٹے آئے مگر کیا مجال جو اس شخص کے خاندانی وقار اور عظمت اور ورثے میں ملی ہوئی داد و دہش میں کوئی کمی آئی ہو۔ ہم سب جس سانحہ کے وقوع پذیر ہونے سے ڈرتے تھے اب وہ آن پہنچا تھا۔ 9 ستمبر جمعرات کے روز بھائی نذر محمد کی زندگی کا آخری ورق الٹایا گیا۔ اور وہ جری اور عظیم سپوت قوم و ملک جس کو انسانیت سے پیار تھا۔ ہاں! وہی عالی نسب شخص جس نے تاریکیوں کے پر کاٹے جو ظلمتوں کو نڈھال کرتا رہا۔ اور اپنے آس پاس روشنیاں بکھیرتا رہا۔

وہ محفلوں کی رونق اب خموش پڑا تھا۔ ہاں وہی میرا دلدار اور دلربا اور غمخوار جو جب بھی سامنے آتا تھا۔ (اور اکثر مجھ پر یہ لطف و کرم رہا وہ بہت میرے پاس آتا تھا) تو محبت و خلوص، ایثار اور وفا کا عطر فشاں جھونکا دل میں اتر جاتا تھا۔ اب ہجر و فراق اور تنہائی اور اداسی کے گھپ اندھیرے میں میرے قلب و دل پر متولی ہو گئے تھے۔ یہ دن کا وقت تھا مگر مجھے اس روشن دن میں بھی تارے نظر آ رہے تھے۔

وہ میرا دوست میرا آشنا میرا محبوب
وہ جس کے ساتھ محبت کا کاروبار کیا

یوں تو مرحوم بھائی کے دوستوں کی فہرست بہت طویل تھی۔ جن میں ایچی سن کالج کے ان کے ہم عصر بہت تھے۔ رؤسا میں بڑی عزت و تکریم سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ مگر مہر خداداد خان لک اور ملک نور حیات خان نون مرحوم کے ساتھ انہیں خاص قلبی گہرا تعلق تھا۔ ملک نور حیات خان نون فوت ہوئے تو بہت دکھ درد کا اظہار کرتے رہے۔ ہم اکٹھے ہی تعزیت کے لئے نور پور نون بھی گئے۔ ان کی وفات بھائی نذر محمد کی دل شکنی کا موجب ہوئی۔ مگر مہر خداداد خان صاحب جنازہ میں تشریف لے گئے تھے۔ چک نمبر 58 شمالی میں جو سرگودھا سے 15 میل کے فاصلہ پر ہے۔ ان کی تدفین ہوئی۔ اور ہم اس عبادت گزار اور پاکباز شخص ہاں اس گہر آبدار کو منوں مٹی تلے دبا آئے۔

لاریب چک 58 شمالی کا راستہ باغات میں سے گزرتا ہے۔ اور وہاں مرحوم و مغفور کے چہیتے چھوٹے بھائی کے باغات اور ان کے درمیان کوٹھیاں اور بارہ دری اور وسیع خوبصورت گراسی لان جو ہمیشہ میرے لئے دلکشی اور دلفریبی کا موجب ہوتے تھے۔ مگر اس روز وہ خود بھی سب سوگوار نظر آ رہے تھے۔ نہ وہ گل بوٹے دل کو فرحت پہنچا رہے تھے نہ خوبصورت عمارتیں اور دلکش روشیں میرے دل کو بہلانے کا موجب بن سکیں۔

کلیاں سونی گل بھی سونے ہرغنچہ بے جان ہوا
پتہ پتہ ڈالی ڈالی شجر شجر ویران ہوا
گاؤں کے رستے انجانے سے لوگ بھی بدلے بدلے ہیں
تجھ بن ساجن مجھ سے اپنا سایہ بھی انجان ہوا

دورونزدیک سے بہت لوگ جنازے میں بھی شریک ہوئے تھے۔اور 11 ستمبر ہفتہ کے روزتوان گنت لوگوں کا اجتماع عظیم تھا۔جس سے ہمارے مرحوم بھائی کے وسیع تعلقات اور بےلوث اخوت، ہردلعزیزی کی شہادت ملتی تھی۔مرحوم ومغفور کا اکلوتا بیٹا عزیزی محمد منصور دردوغم میں ڈوبا ہوا تھا۔اسی طرح ان کے بہن بھائی، بھتیجے سبھی ہمدردی اورتعزیت کرنے والوں میں گھرے ہوئے تھے۔مگر میں نے سمجھا کہ اس دلدوز سانحہ کے متاثّرین میں راقم الحروف خودکسی سے کم نہیں ہے۔یوں میں نے سب سے اظہار ہمدردی اوردلجوئی کیا۔مگر پھر مجھے اپنے آپ سے بھی تعزیت کرنا پڑی۔اور میرا قلب مہجور شایداس کا سب سے زیادہ مستحق تھا۔

جنازہ ملک خیر محمد صاحب کی چک 58 والی کوٹھی کے وسیع لان میں پڑھا جا چکا تھا۔اورلوگ چہرہ دیکھ رہے تھے کہ میں بھی آخری دیدار کے لئے حاضر ہوا۔میں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کرالوداع کہا۔مگروہ باہیں جو مجھے پیار کرنے کے لئےکھل جایا کرتی تھیں۔اب کے نہ کھلیں تو یہ حسرت میرے سینے میں پھانس کی طرح اٹک گئی۔چہرہ پر ایک گونہ طمانیت کھیلتی نظرآئی جو بتارہی تھی کہ بہترمقام سے بلاوا آ گیاہے۔ اوراس دنیا میں جسم و روح کوجوطویل مصائب جھیلنا پڑے تھے ان سے نجات پا کر روح کوتسکین نصیب ہوگئی ہے۔اورموت کی وادی میں اس طرح خوش دلی سے جاداخل ہوئے۔جس طرح دن بھر کی مشقت کا ٹوٹا ہوا راہی ایسی منزل پر پہنچ جائے جہاں اس کے عزیزواقارب اسے خوش آمدید کہنے کے منتظر ہوں۔اور جہاں اس کی روح کوچین اورقرار نصیب ہو۔

میں خودبھی دعا کرتا ہوں اورقارئین کرام سے بھی دردمندانہ درخواست کرتا ہوں کہ دعا کریں اللہ ان سے عفواورمغفرت اوروافر رحمت کا سلوک فرمائے اوران کے پسماندگان کا حافظ ونگہبان رہے۔اپنی حالت تو یہ ہے کہ

گزر تو جائے گی تیرے بغیر بھی لیکن
بہت اداس بہت بے قرار گزرے گی

تقریر جلسہ یوم مسیح موعود سرگودہا 23/ مارچ 1992ء

خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب ڈپٹی کمشنر

اذکروا موتاکم بالخیر

بانکی ٹور کسے دی اُتے میں آج قلم اٹھانی چاہناں
اے طاوس خیال میرے دے تُوں آج پیلاں پائی جا

آج مختصر نوٹ جس ''سلطان'' کے بارہ میں لکھنا چاہتا ہوں وہ مغل برلاس خاندان کا ایک چشم و چراغ تھا۔ اس کے والد مقدس و بزرگوار تو بچپن سے ہی اسلام کی راہ میں فریفتہ ہو چکے تھے اور اپنی زندگی اور موت مالک الملک کے ہاتھ میں دے کر ایک لحاظ سے فارغ اور دوسرے لحاظ سے ایسی جنگ سہیڑ چکے تھے جو ساری عمر انہیں جھوٹے مذاہب اور عقائد کے خلاف لڑنا پڑی۔ مگر یہ ''سلطان'' وجوہ اس روحانی جنگ میں شامل نہ ہوا۔ گو خون میں غیرت تھی دل پاک خیالات کی آماجگاہ تھا لیکن عملاً وہ سرکاری ملازمت اختیار کر کے اور پھر اس میں ترقی پر ترقی کر کے ایک طرف ''خان بہادر'' کا خطاب حاصل کر چکا تھا تو دوسری طرف ڈپٹی کمشنر کے موقّر اور عالی منصب پر فائز ہو چکا تھا اور اس طرح اپنے مقدس باپ نے جو شیطان اور شیطانی تحریکات کے خلاف جنگ لڑنے کیلئے جو سپاہ تیار کی تھی اس میں وہ شامل نہ ہوا اور اس روحانی تسبیح کے دانوں میں شامل ہونے کی سعادت اپنے والد مقدس کی حیات تک محروم رہا۔ البتہ اپنے چھوٹے بھائی کے زمانے میں اس کی ملی غیرت اور فطری راست روی نے مجبور کیا کہ وہ برادرِ خورد کے دست حق پرست پر ہاتھ رکھ کر ان کی شامل سپہ روحانی ہو گیا اور اپنی آخرت سنوار گیا۔ گو آخری عمر میں یہ بھید اُن پر کھلا کہ ضلع کی بادشاہی ہو یا کسی ملک کی یہ دنیاوی بلند مناصب یا بادشاہت ملک روحانی کی شاہی کے ہم پلہ کہاں؟ بھائی تو چھوٹا تھا عمر میں مگر وہ بہت بڑا شخص جس کی گزشتہ صحیفوں میں بھی تصویر کشی کی گئی تھی اور اس زمانے کے موعودؑ نے اس کی پیدائش سے بہت سال قبل علیم وخبیر سے خبر پا کر اس کی ساری صفات بیان کر دی تھیں اور ہم نے بلکہ ایک دنیا نے دیکھا کہ وہ عین انہی نوشتوں کے مطابق آیا اور اس کے تقدس کے پرتو ایک دنیا پر رحمت کی گھٹا بن کر چھا گئے اور مسلسل قریہ بہ قریہ اور ملک بملک وہ رحمت کے بادل برستے جا رہے ہیں اور اب تو دنیا کے کناروں تک بموجب نوید الٰہی وہ بارانِ رحمت پہنچ کر دنیا کے بیشتر ممالک کو سیراب کر چکی ہے۔ خود اس موعود نے دنیاوی بادشاہت اور روحانی منصب کا فرق یوں بیان فرمایا تھا کہ

تیرے در کی گدائی سے بڑا ہے کونسا درجہ
مجھے گر بادشاہت بھی ملے تو میں نہ لوں ساقی

اور پنجابی کے ''شکسپیئر''، پیر فضل شاہ گجراتی اسے یوں بیان کرتے ہیں۔

بھلا رکھے سکندر تے کی رکھے میرے حسن دے بادشاہ نال نسبت

گھوڑے زمیں نمانی تے اُوس پھیرے اسہاں دلاں دے شہر تسخیر کیتے

اردو زبان والوں کی سہولت کیلئے اس شعر کا مفہوم چند الفاظ میں بیان کر دیتا ہوں کہ ''سکندر بادشاہ'' کے متعلق مشہور تھا کہ اس کا گھوڑا جہاں تک دن بھر میں دوڑتا جاتا تھا وہ علاقہ اس کی مملکت میں شامل ہو جاتا تھا جبکہ انہوں نے یعنی اللہ والوں نے دلوں کے شہروں کو فتح کیا۔ دونوں میں کوئی نسبت نہیں۔

بہر حال آج کے موضوع ''خان بہادر میرزا سلطان احمد'' کے متعلق بیان کی طرف عود کرتے ہوئے آتا ہوں کہ یہ بلند مقام ''میرزا'' ہمارے اس پنجاب بلکہ وسطی پنجاب کی خوش قسمتی کے ادھر بھی یہ متعین رہے۔ مثلاً ایک (چوہدری) میاں محمد بخش صاحب رانجھہ تحصیلدار تھے انہوں نے خود ایک تحقیق کے دوران بالمشافہ مجھے یہ بیان کیا کہ میں ان کے ماتحت غالباً پنڈ دادن خان میں تحصیلدار تھا اور مرزا سلطان احمد صاحب SDM تھے یہ عہدہ بعد میں اسسٹنٹ کمشنر (AC) کہلایا اور اب جنرل مشرف کی عملداری میں اس عہدے کی مٹی پلید ہوئی نہ کوئی AC رہا نہ کوئی ڈپٹی کمشنر اور نہ کمشنر۔ جس تحقیق کا میں نے اوپر اشارہ کیا ہے اس کی مختصر تفصیل بھی ایمان و روح کی افزائش کا موجب ہوگی اس لئے اس کا بیان بھی ضروری ہے۔

ہوا یوں کہ جس زمانے میں (1940ء تا 1944ء) ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی سکول بھلوال میں زیر تعلیم تھا تو (چوہدری) میاں سلطان احمد رانجھہ صاحب رئیس واں میانہ سے شناسائی ہوئی وہ بھلوال میں سب رجسٹرار تھے۔ مجھے کہنے لگے کہ تمہارا گھرانہ تو بڑے اہل اللہ لوگوں کا گھرانہ تھا اور میں ان کا مقلد ہوں اور ان کی میری دل میں بہت عزت ہے مگر تمہارے والد صاحب (جنہوں نے 1903ء میں حضرت امام مہدی علیہ السلام کی بیعت کی تھی) سب کچھ ضائع کر دیا۔ میں نے کہا کہ نہ جناب انہوں نے سب کچھ پا لیا۔ ضائع کچھ نہیں کیا۔ غرض یہ بحث چلتی رہتی ان کا مکان ہمارے بورڈنگ ہاؤس کے قریب تھا مجھے ہر سہ پہر کو بلا لیتے اور یہ بحث چلتی رہی۔ وہ دنیاوی اور دینی علم سے واجبی سی واقفیت رکھتے تھے لیکن یوں بحث ختم کر کے مجھے معذرت خواہانہ انداز میں کہتے کہ عزیزم اگر کوئی بات تمہیں اچھی نہ لگی ہو تو دل میں نہ رکھیں وغیرہ۔ اسی بحث کے دوران انہوں نے کہا کہ مشرقی پنجاب کے تمہارے مرکز میں تو سودا بازی ہوتی ہے اور مثال یہ دی کہ ایک الیکشن میں میجر سردار خان نون کو امداد کرنے کا تمہارا مرکزی فیصلہ ہو گیا لیکن جب (ان کے کزن) میاں محمد بخش صاحب سابق تحصیلدار قادیان گئے اور ایک ''تھیلی'' پیش کی تو آدھا حصہ ووٹوں کا ان کے حق میں ہو گیا۔ میں نے کہا کہ میاں صاحب یہ جھوٹا بہتان ہے وہاں پیسے ٹکے کی تجارت نہیں ہوتی آئینہ دیکھیں تو اپنا چہرہ ہی نظر آتا ہے۔ مگر میں نے چاہا کہ مجھے اس واقعہ کی

تحقیقات کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ میں میاں بخش صاحب کے گاؤں گیا جو ہمارے گاؤں سے 10 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ پتہ چلا کہ میاں صاحب سرگودھا گئے ہیں اور اپنے بیٹے چوہدری محمد علی صاحب ایڈووکیٹ کے مکان پر مقیم ہیں۔ سواری بائیسکل عام طور پر استعمال ہوتی تھی میں اگلی صبح بائیسکل پر ہلال پور سے سرگودھا جا پہنچا اور میاں صاحب سے یہ سوال کیا کہ آپ کو کیسے پہلے حکم میں ترمیم کر کے ایک حصہ ووٹوں کا وعدہ ہوا تھا انہوں نے مجھ سے پوچھا تمہیں آج کیا ضرورت پڑی ہے کیونکہ اس الیکشن کو کئی سال گزر چکے تھے تو میں نے انہیں میاں سلطان احمد کے الزام کا بتایا تو وہ طیش میں آ گئے اور کہا کہ ''وہ جھوٹ بول رہا ہے'' میں وہاں گیا تو وہاں میرا تعلق مولوی شیر علی صاحب رانجھہ سے تھا جنہیں اپنا ''ماموں'' کہہ کر مخاطب ہوتا تھا یا مرزا سلطان احمد صاحب خان بہادر سے جو میرے افسر رہ چکے تھے چنانچہ میری رہائش مرزا سلطان احمد کے ہاں رہی جہاں میں نے ایک شاہی مہمان خانہ اور شاہی میزبانی کے مزے اٹھائے۔

میں نے ماموں شیر علی صاحب سے عرض کیا کہ ماموں جان میری سفارش کریں انہوں نے پرائیویٹ سیکرٹری سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ فیصلہ تو میجر سردار خان نون کے حق میں ہو چکا ہے۔ ماموں جان مولوی صاحب مجھے بہت چاہتے تھے انہوں نے حضرت صاحب سے کہا کہ میرا بھائی محمد بخش رانجھہ آیا ہوا ہے مگر فیصلہ پہلے ہی میجر سردار خان نون کے حق میں ہو چکا ہے ''میں اب سرگودھا میں تو نہیں جا سکوں گا'' حضرت مولانا شیر علی صاحب کی یہ ''تحدی'' کام کر گئی اور حضور نے فیصلہ میں مولوی صاحب کی خاطر یہ ترمیم کر دی کہ پرانی آبادی کے لوگ میاں محمد بخش رانجھہ کو سپورٹ کریں اور چکوک کے لوگ میجر سردار خان نون کو۔ اس پر میں نے کھلا سوال کیا کہ اس پر آپ نے کوئی روپیہ بھی خرچ کیا تو انہوں نے کہا کہ ''جھوٹے پر لعنت ہے وہاں روپیہ تو چلتا ہی نہیں ہے جس نے کہا ہے بکواس کہا ہے''۔ میں یہ روایت بعد تحقیقات پلے باندھ کر بھلوال میاں سلطان احمد کے پاس آیا اور سارا واقعہ بیان کیا تو وہ بہت شرمندہ ہوئے اور کوئی جواب نہ دے سکے اور بغلیں جھانکنے لگے۔ میاں محمد بخش صاحب رانجھہ نے مزید اس روز مجھے بتایا تھا کہ میرے SDM خان بہادر مرزا سلطان احمد بڑے پارسا، نیک، دیانتدار اور مدبر افسر تھے جب کبھی کسی ماتحت کو یا افسر کو مخاطب کرتے تو ہر حکم اور روبکار میں ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' اس کی پیشانی پر تحریر فرماتے گو یہ انگریزوں کا دور تھا مگر یہ کلمہ شریف تو گویا ان کی گھٹی میں پڑا تھا بہت دیر تک ان موصوف کے اوصاف کریمانہ بیان فرماتے رہے۔

میاں محمد بخش رانجھہ صاحب کا ذکر آیا تو ان کے دونوں صاحبزادوں کی یاد بھی تازہ ہو گئی۔ بڑے تو میاں محمد علی رانجھہ ایڈووکیٹ تھے اور چھوٹے میاں نوازش علی رانجھہ صاحب بہت بڑے زمیندار اور بڑے زیرک اور ذہین تھے میرے ساتھ بڑا برادرانہ سلوک رکھتے تھے۔ آخری عمر کا بیشتر حصہ سرگودھا میں اپنی رہائشی کوٹھی خرید کر گزارا۔ اکثر ملاقات رہتی تھی۔ آخری عمر میں بہت کمزور ہو گئے تھے میرے گھر تشریف لائے تو مجھے کہا کہ بڑے مرزا صاحب کی کوئی تصویر تمہارے گھر میں ہے تو میں نے اثبات میں جواب دیا تو اس

کمرے میں میرے ساتھ آئے جس میں بڑا فوٹو پڑا تھا۔غور سے دیکھا تو برملا چلا کر کہا کہ ''کون بد بخت اس شخص کو کاذب کہتا ہے'' اس کے تو منہ پر نوروں کی بارش برستی مجھے نظر آ رہی ہے ''خدا کی قسم یہ شخص سچا ہے۔'' میاں نوازش علی صاحب کچھ عرصہ قبل فوت ہو گئے افسوس کہ ان کے بعد ان کی اولاد کے ساتھ کوئی راہ ورسم باقی نہیں رہی جبکہ دونوں بھائیوں کے ساتھ بلکہ ان کے بھی والد کے ساتھ یادگار زمانہ گزرا جب انہیں یاد کرتا ہوں تو میں ایک کسک سی محسوس ہوتی ہے اور بقول پیر فضل شاہ گجراتی اپنی یہی حالت ہے کہ

میں درد ہجراں وچ شور پاواں بے شک میںنوں تے ناصح آکھ سکدا ئے
کون اکھیاں نو آکھے نہ روؤ دل نوں کون آکھے اونہوں یاد نہ کر

میں بھٹک کر کہیں سے کہیں جا پہنچا ذکر تو حضرت مرزا سلطان احمد صاحب خان بہادر کا کرنے کا بیٹھا تھا مگر چونکہ ان کے اوصاف کا میرے پاس براہ راست راوی میاں محمد بخش صاحب رانجھہ تحصیلدار ہی تھے ان کا ذکر کیا تو اسی رو میں بہہ گیا اور کچھ دور چلا گیا۔آخر میں ایک ذکر تو ہفتہ وار موقر رسالہ ''لاہور'' لاہور کی وساطت سے کرنا ہے بھائی حضرت ثاقب زیروی صاحب کے زمانے میں ایک ''لاہور'' کی اشاعت میں مضمون خان بہادر موصوف کے بارہ میں تھا مگر وہ مضمون آپ کی ادبی کاوشوں پر مشتمل تھا۔اس میں یہ ذکر تھا کہ آپ ''قلم کے بادشاہ تھے اور حقیقی ''سلطان القلم'' کے صحیح جانشین بھی تھے۔مختلف رسائل میں آپ کے لاجواب ادبی مضامین شائع ہوتے تھے جسے بڑے بڑے صاحب قلم لوگ بڑے رشک سے پڑھتے تھے اور تعریف کرتے تھے حضرت ثاقب بھائی نے ان ادیبوں کے نام بھی اس اشاعت میں گنوائے تھے جو یاد نہیں غالباً ابوالکلام آزاد وغیرہ کا نام آپ کے مداحوں میں شامل تھا۔

آخر میں ایک زریں واقعہ تحریر کر کے اس بیان کو ختم کرتا ہوں جو آپ کی ملازمت کے دوران پیش آیا۔ضلع تو بھولتا ہوں کونسا تھا جہاں آپ افسر مال تھے اور آپ کا Boss یعنی ڈپٹی کمشنر گورا تھا۔آپ کسی علاقے کا دورہ کر کے سیدھے اس کے گھر پہنچے شائد کوئی فوری نوعیت کا واقعہ ہو گا۔ان دنوں کاروں کا تو رواج نہیں تھا دوسرے افسران گھوڑوں پر سفر کیا کرتے تھے حضرت خان بہادر صاحب بھی گھوڑے سے D.C ہاؤس میں اترے چپڑاسی نے بڑھ کر گھوڑا پکڑا اور یہ D.C کے گھر کے دفتر میں گئے نہ معلوم گورے D.C کو کیا سوجھی کہ اس نے چھوٹتے ہی یہ سوال کیا کہ ''مرزا صاحب سنا ہے آپ اپنے والد کا مخالف ہے'' تو اس حقیقی ''سلطان'' خان بہادر نے برجستہ جواب دیا جو خون مقدس کا ایک شاہکار اور ابوی غیرت کا ایک بہترین نمونہ تھا اور تا قیامت رہے گا اس کے ایک ایک حرف سے اعلیٰ خاندانی غیرت کی خوشبو کی لہریں پھوٹ پھوٹ کر قلب و ذہن کو گویا آج بھی معطر کر رہی ہیں اور یہ ایک نرا جملہ ہی نہیں تھا بلکہ اس میں غیرت پدری اور مقام پدری کے انمول اسباق ہیں۔کاش آج کے زمانے میں یہ آب زر کے لکھے جانے والے مختصر سے جملہ کو حرز جان بنایا جائے وہ پر مغز اور جرات مندانہ جواب آپ بھی سنیں اور حظ اٹھائیں۔آپ نے اپنے گورے ڈپٹی کمشنر جو آپ کا اولین Boss تھا

یہ دندان شکن جواب دیا کہ

''کون حرامزدہ کہتا ہے کہ میں حرام زادہ ہوں''

اس پر D.C گورے کا رنگ فق ہوگیا اور بے حد مرعوب ہوا کہ مرزا صاحب آپ تو بہت Serious ہوگئے ہیں آپ نے کہا کہ جسے کہا جائے کہ تم اپنے والد کے مخالف ہو اس سے بڑی گالی اور کوئی نہیں ہوسکتی اور میں اسے ہرگز ہضم نہیں کرسکتا تھا۔ واضح ہو کہ مغل حضرت مرزا سلطان احمد صاحب کا یہ موقف رہا جب تک بیعت نہ کی کہ ابا جان روحانیت کی دنیا کے باسی اور میں دنیا دار۔ اِن کے ساتھ قدم نہیں ملاسکتا وہ اس راہ میں بہت تیز رفتار ہیں۔ اس لئے میں بہت پیچھے اور وہ بہت آگے ورنہ اختلاف باپ بیٹے کا کہاں۔

اے مرزا سلطان احمد تم پر سلام کہ تم نے اس مشینی دور کی مردنی حالت میں جان ڈال دی ہوتی کاش کوئی اسے سامنے رکھے اور اس پر عمل کرے، اے کاش۔

فقط عبدالسمیع نون

بسم اللہ الرحمن الرحیم

احباب کرام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج مین ابتداء میں ایک اہم امر کی طرف اشارہ کروں گا اور پھر اسی کے متعلق اپنا مقالہ بھی پیش کروں گا۔ زندہ قومیں اپنی تاریخ کو یاد رکھا کرتی ہیں اسی ضمن میں حضرت اقدس رسول اکرم ﷺ کے کئی ارشادات ہیں مثلاً حضور ﷺ نے فرمایا ''اپنے حسب نسب کو یادرکھا کرو''۔

یہ تاریخ کا وہ حصہ ہے جو ہر انسان سے متعلق ہے اور اس فرمان کو مدنظر رکھنا چاہئے۔

باپ دادا اور ان کے باپ دادا اور اسی طرح ماں اور اس کی ماں اور اوپر 5/6 پشتوں تک تو ہر شخص کو اپنے آباء واجداد کا علم ہونا چاہئے۔ مگر آج اس مادی دور میں اس فرمان نبوی کو بھلا دیا گیا ہے اور بمشکل دادا کا نام آتا ہوگا اور بس۔ اس طرح حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''اذکروا امواتا کم بالخیر'' کہ فوت شدگان کا ذکرِ خیر کیا کرو۔ الفضل میں اس حصہ پر عمل خوب ہورہا ہے اور یہ آپ نے تجربہ کیا ہوگا کہ نہایت ہی مبارک اور روح پرور سلسلہ ہوتا ہے۔

میں نے ابتداء میں تاریخ کا ذکر کیا ہے کہ اپنی تاریخ کو یادرکھنا ضروری ہے ہماری احمدیت کی تاریخ میں علاوہ ہمارے آئمہ اور شہدائے احمدیت بزرگوں کے کئی مخالفین کا ذکر کرنا بھی بعض دفعہ تاریخ کو یادرکھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً عبداللہ آتھم بھی ہماری

تاریخ کا حصہ ہے۔امریکن الیگزنڈر ڈوئی بھی احمدیہ تاریخ کا حصہ ہے۔مولوی محمد حسین بٹالوی اور مولوی ثناءاللہ اور مولوی نذیر حسین بھی اور اگران کا نام زندہ رہنا ہے تو احمدیت کی برکت سے۔اس لئے اللہ کی قدرت کا ایک درخشندہ نشان عبداللہ آتھم کے ساتھ وابستہ ہے۔تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت اور منجانب اللہ ہونے کا ایک روشن نشان ڈوئی کی ہلاکت پر ظاہر ہوا۔مولوی محمد حسین بٹالوی اور مولوی ثناءاللہ اور دوسرے سینکڑوں معاندین ایک سوسال سے زائد عرصہ کے دوران ناکامی اور نامرادی سے ہلاک ہوتے گئے۔تو 6 ؍مارچ 1897ءکو پنڈت لیکھرام حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تیغ بران سے کاٹا گیا اور سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر اعلان کیا کہ

جس کی دعا سے آخر لیکھو مرا تھا کٹ کر ماتم پڑا تھا گھر گھر وہ مرزا یہی ہے

اسی طرح پنڈت لیکھرام بھی احمدیت کی تاریخ کا حصہ بن گیا۔حضرت مسیح موعودؑ اور غلامان احمدیت کی فتوحات آسمانی اور تائیدات کی داستان طویل ہے اور معاندین اسلام اور دشمنان احمدیت کی ہلاکت اور نامرادی اور روسیاہی کا قصہ بھی بہت لمبا ہے۔اور دوستو یہ قصے اور کہانیاں نہیں ہیں ایک نشان 7 ؍ستمبر 1974ءکو بھی ظاہر ہوا جب ایک آمر جس نے خود اپنی زبان سے اعتراف شراب خوری کیا تھا کہ تھوڑی سی شراب پیتا ہوں،90 سالہ مسئلہ حل کر دیا۔یہ بھی ایک نشان آسمانی تھا جو احمدیت کی تائید میں ظاہر ہوا۔اس میں حیرانگی کی کوئی بات نہیں کہ یہ نشان کیا تھا،اصدق الصادقین اور سب سچوں کے سردار حضرت رسول اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ سارے 72 فرقے ایک طرف اکٹھے ہو جائیں گے اور ایک فرقہ اکیلا دوسری جانب اور وہ جماعت نجات پانے والی ہوگی۔یہ واقعہ کھل کر سچا ثابت ہوا تو 7 ؍ستمبر 74ءکو۔اس لئے یہ بھی ایک نشان تھا احمدیت کی صداقت کا۔پھر اس آمر کا جو حال ہوا وہ بھی احمدیت کی تاریخ کا ہی ایک روشن باب ہے۔5؍اپریل 1979ءکے پھانسی کے واقعہ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے 24؍اگست 1902ءکے اس کشف کو سچا ثابت کر دیا کہ

”میں نے دیکھا کہ ایک بلی ہے اور گویا کہ ایک کبوتر ہمارے پاس ہے وہ اس پر حملہ کرتی ہے بار بار ہٹانے سے باز نہیں آتی تو آخر میں نے اس کا ناک کاٹ دیا ہے اور خون بہہ رہا ہے پھر بھی باز نہ آئی تو میں نے اسے گردن سے پکڑ کر اس کا منہ زمین سے رگڑنا شروع کیا بار بار رگڑتا تھا لیکن پھر بھی سر اٹھاتی جاتی تھی تو آخر میں نے کہا کہ آؤ اسے پھانسی دیدیں“۔

اور پھر 5؍اپریل 1979ءکو آدھی رات کے وقت اسے پھانسی دے دی گئی۔90 سالہ مسئلہ حل نہیں ہوا بلکہ 77 سالہ کشف سچا ثابت ہوا اور ہم نے گواہی دی کہ مرزا غلام احمد قادیانی مامور ربانی تھا اور خدا اس سے ہم کلام ہوتا تھا۔آسمانی نشانات تو ہر روز ظاہر ہو رہے ہیں مگر بعض ایسے عظیم الشان ہوتے ہیں جو بھلائے نہیں بھولتے۔23؍مارچ 1889ءکو جماعت کی بنیاد رکھی گئی اور 5؍اپریل

79ء کو یعنی نوے سال بعد آمر بد انجام کو پہنچا۔ نوے سال اس طرح ہوئے اور یہ مسئلہ تھا جو حل ہو گیا۔ ورنہ 1889ء سے 1974ء تک تو 85 سال بنتے ہیں۔

پھر 26 اپریل 1984ء کو ایک نشان ہم نے دیکھا جاہلوں اور بے وقوف دشمنوں نے خوشیاں منائیں کہ اب احمدیت کی کامیابی رک جائے گی۔ ہمارا خدا گواہ ہے کہ 26 اپریل 84ء کے بعد اب دسمبر 95ء آ گیا ہے ہم نے ان گنت نشانات احمدیت کی صداقت کے دیکھے۔ 26 اپریل کا دن بڑا اہم ہے اس روز ایک آرڈیننس جاری کیا گیا کہ ہم احمدی اللہ اور رسولؐ کا نام نہیں لے سکتے۔ اذان بند، مسلمانوں کی طرح نماز پڑھنا جرم، مسلمانوں کی سی کوئی عبادت یا حرکت کرنا ہتھکڑی کو دعوت دینا ہے قیدیں اور جرمانے۔ ہمارا الفضل بیچارہ تو قرآن، اسلام، مومن کے الفاظ بھی نہیں لکھ سکتا۔ یہ سب 26 اپریل 84ء کی پیداوار ہے مگر دیکھو اور غور سے سنو 81 سال قبل عین 26 اپریل کے دن اللہ جبار قہار جو منتقم بھی ہے ذو عذاب شدید بھی ہے اس نے بھی ایک آرڈیننس جاری کیا تھا۔ 26 اپریل 1903ء کو حضرت مسیح قادیانی کا الہام ہوا تھا کہ ”رب انی مظلوم فانتصر فسحقهم تسحيقا“۔ (ترجمہ) اے میرے رب میں مظلوم ہوں میری مدد فرما اور یہ بھی معنے ہیں کہ میرا بدلہ لے اور انہیں اچھی طرح پیس ڈال۔ یعنی اس طرح باریک پیس کہ کچھ بھی باقی نہ رہے راکھ ہو جائیں۔

اور پھر آپ سب نے دیکھا کہ بستی کمال بہاولپور کے قریب 17 اگست 1988ء کو C-130 جہاز کے پرخچے اڑ گئے ہر شے جل کر راکھ بن گئی تھی **فسحقهم تسحيق** لفظاً لفظاً اور معناً معناً پورا ہوا۔ اس فوجی آمر کا تو کچھ باقی نہ رہا پچھلے دنوں اس کا صاحبزادہ امریکہ گیا ہوا تھا تو وہاں اس نے جواء کھیلا اور لاکھوں ڈالر ہار کر خیر سے بدھو گھر کو لوٹے۔ اور ادھر مسیح ومہدیؑ کا بیٹا حضرت طاہر ومطہر جن کا پاکستان سے بحفاظت نکلنا بھی الٰہی حکم اور تائید سے تھا اور ایک چمکتا ہوا نشان (اس کی خبر حضرت مسیح موعودؑ کو الہاماً دی گئی تھی کہ آپؑ کا ایک خلیفہ کس طرح خطرناک حالات میں ہجرت کرنے پر مجبور ہو گا اور میں اسے سلامتی اور امن کے ساتھ فرشتوں کے پہرے میں منزل مقصود پر پہنچاؤں گا۔ اس کے مقدس باپ نے دعا دی تھی کہ)

ہر گام پر فرشتوں کا لشکر ہو ساتھ ساتھ ہر ملک میں تمہاری حفاظت خدا کرے

اور پھر حضرت امام طاہر کے قدم کامیابیوں اور کامرانیوں نے بڑھ بڑھ کر چومے اور منزلوں نے خوش آمدید کہا یہ ایک ایسی تاریخ ہے جو آنکھوں نے دیکھی اور کانوں نے سنی مگر بیان کرنے کے لئے

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

قرآن کریم کی اشاعت کی اور خوب اشاعت کی۔ تراجم شائع کئے تو یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو بری بڑی امیر حکومتوں سے نہ ہو سکا نہ

ان کی قسمت میں یہ سعادت لکھی تھی۔ یہ سعادت اسی کو نصیب ہوئی جسے اپنے ملک میں بدبختوں نے اپنے آپ کو مسلمان کہنے پر بھی قید میں ڈال دینے بلکہ ہلاک کر دینے کی سازش تیار کی ہوئی تھی۔ حضرت صاحب کا 5 صفحات کا ایک خط جو حضور کا اپنا قلمی ہے اور 1984ء میں حضور نے لندن سے لکھا تھا جس میں ساری تفصیلات اس منحوس منصوبے کی درج ہیں جو احمدیت کے خلاف اور خلیفہ وقت کے خلاف تیار ہوا۔ اس خط کی ایک فوٹو کاپی میرے پاس ہے لاہور سے ایک احمدی سیشن جج صاحب دیکھنے اور پڑھنے کے لئے تشریف لائے تھے جو میں نے انہیں پڑھا دی تھی۔ جب ایسے خطرناک منصوبے زمین پر بن رہے تھے تو آسمان پر بھی ایک سکیم تیار ہو رہی تھی۔ یہاں احمدیت کو ختم کر دینے کی سازشیں تیار ہو رہی تھیں اور عرش پر احمدیت کے جھنڈے ملک بہ ملک اور براعظم بہ براعظم گاڑ دینے کے پروگرام تیار ہو رہے تھے۔

عزت وذلت یہ ترے حکم پر موقوف ہیں ترے فرماں سے خزاں آتی ہے اور باد بہار

زمین ہار گئی اور آسمان جیت گیا اور ہمیشہ وہی لوگ فتح پاتے ہیں جنکا آسمان کے ساتھ تعلق ہو۔ حضرت مسیح موعودؑ نے آسمانی ہونے کا اعلان کیا تھا جو ایک دعویٰ بھی ہے اور ایک پیش خبری بھی۔ فرمایا

ہم تو بستے ہیں فلک پر اس زمیں کو کیا کریں آسمان کے رہنے والوں کو زمیں سے کیا نقار

میں نے بات شروع کی تھی کہ اپنی تاریخ کو ہمیں یاد رکھنا چاہئے پھر آگے کڑی سے کڑی ملتی گئی اور حق یہ ہے کہ

حکایت لذید بود دراز تر گفتم

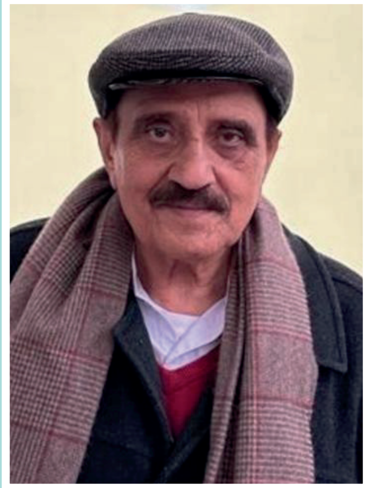
ہماری تاریخ مخالفوں سے بھی بنی ہے اور احمدیت کے خادموں نے بھی تاریخ بنائی ہے۔ آج میرا ارادہ ہے کہ احمدیت کے لاتعداد اور ان گنت جاں نثاروں اور فدائیوں میں سے اپنی جان کا نذرانہ اللہ کے حضور پیش کرنے والے کابل کے شہداء کا کچھ ذکر کروں کہ جس کا جوں جوں مطالعہ کیا جائے روح کو ایک روشنی اور ایمان کو تازگی نصیب ہوتی ہے میں نے شہیدان احمدیت کا مطالعہ یہاں بھی اپنی طاقت اور کم علمی کے باوجود کیا ہے اور میں نے سرزمین کابل میں بھی 6/7 دفعہ جا کر شہیدان امت کے حالات کو پڑھنے اور اسے محسوس کرنے میں ایمانی لذت محسوس کی ہے۔

اے احمدی دوستو اور بزرگو شہیدان احمدیت کو کبھی نہ بھولنا اور بار باران کا ذکر دہراتے رہنا کہ اس میں ہمارے لئے بہت برکتیں اور قلب وروح کی زندگی ہے۔

(اجتماع انصاراللہ ضلع سرگودھا نیوسول لائن سرگودھا مورخہ 1-12-95)

۞۞۞۞۞۞۞۞۞

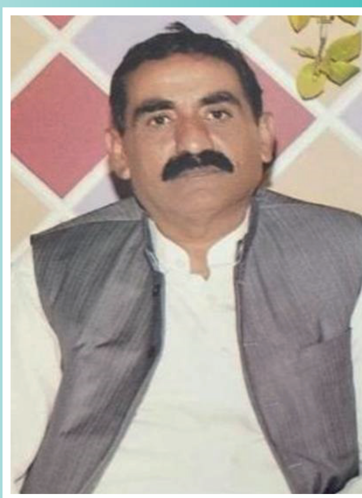
مندرجہ ذیل احباب نے اس کتاب کی تدوین ترتیب و اشاعت میں خصوصی تعاون فرمایا ہے۔



میاں عبد البصیر نون



میاں اعجاز احمد نون



میاں اشفاق احمد نون



بشارت احمد چدھڑ



طاہر مہدی امتیاز احمد وڑائچ مربی سلسلہ



حافظ مظفر احمد صاحب

تعارف

مصنف کتاب انمول یادیں

میاں عبدالسمیع نون ایڈووکیٹ سرگودھا



محترم میاں عبدالسمیع نون 1926 کو ہلال پور (نون) ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے ۔آپ کے والد محترم میاں عبدالعزیز نون رفیق بانی جماعت احمدیہ تھے۔آپ نے 1903ء میں بیعت کی سعادت حاصل کی۔میاں عبدالسمیع نون صاحب نے ابتدائی تعلیم گاؤں ہلال پور سے اور میٹرک امتیاز کے ساتھ بھلوال سے پاس کیا۔ ایف اے قادیان اور بی اے اور ایل ایل بی لاہور سے پاس کیا۔اور سرگودھا میں لاء کی پریکٹس شروع کر دی۔ جماعت کی سخت مخالفت کے باوجود ہلال پور میں آپ نے بیت احمدیہ کی تعمیر بھی کی مختلف جماعتی عہدوں پر خدمات کی توفیق ملی۔تحریک جدید کے مجاہدین اوّل میں سے بھی تھے۔ قائم مقام امیر ضلع سرگودھا اور نائب امیر کے علاوہ آپ کئی سال قضاء بورڈ مرکزیہ کے بھی اعزازی ممبر رہے۔آپ بہت ہی اچھے دوست نواز، مہربان، پرخلوص انسان ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین انشا پرداز بھی تھے۔ 8 جنوری 2011ء میں آپ کی وفات ہوئی۔آپ نے اپنے محبوں کا ذکر خیر اس کتاب میں بہت ہی اچھے انداز میں کیا ہے۔

(بشارت احمد چدھڑ)

ANMOL YADEIN

Mian Abdul Sami Noon

Advocate Sargodha